پنجاب میں اُردو

حافظ محمود خاں شیرانی

ترتیب و تدوین مع اضافات

محمد اکرام چغتائی

پنجاب میں اُردو

حافظ محمود خاں شیرانی

ترتیب و تدوین مع اضافات
محمد اکرام چغتائی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4399 Mahmud Khan Shirani, Hafiz
Punjab mein Urdu/ Hafiz Mahmud Khan Shirani, Edited with additions by M. Ikram Chaghatai.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2005.
792pp.
Index Included
1. History - Urdu Literature - Punjab. I. Title.

2005

نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1767-9

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan. Phone 7667970

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز لاہور

محمود خاں شیرانی کے محبِ خاص

پروفیسر حافظ محمد اقبال

اور ان کے نامور فرزند

ڈاکٹر داؤد رہبر

کے نام

فہرست

حصہ اول

حصہ دوم

(پنجاب اور اردو — پس منظر، قبل از 1928ء)

حصہ سوم

(پنجاب میں اردو.......... تحقیق مزید)

حصہ چہارم

(حافظ محمود شیرانی............شخصیت، علمی و تحقیقی آثار)

حصہ پنجم

(پنجاب میں اردو.........تنقید و تبصرہ)

☆☆☆☆

پیش گفتار

اردو میں ادبی تحقیق کا آغاز برصغیر پر انگریز حکمرانوں کی ''فروغِ علوم مفیدہ'' کی پالیسی ہی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یوں تو انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول سے دہلی کالج میں اس پالیسی پر عملدرآمد شروع ہو چکا تھا' لیکن اس کے متوقع ثمرات سے بہرہ مند ہونے سے قبل ہی 1857ء کا حادثہ فاجع رونما ہو گیا اور سب کیا دھرا لاحاصل ثابت ہوا۔ جونہی حالات رُو بہ اصلاح ہوئے' تو بالخصوص شعبۂ تعلیم میں سابقہ ادھوری پالیسیوں کے نفاذ کے لیے ازسرِنو عملی اقدام اٹھائے گئے۔ انہی میں ''علوم مفیدہ'' کی اشاعت اور اسے مقبولِ عام بنانے کی پالیسی بھی شامل تھی' لیکن اب نئے داخلی اور خارجی تقاضوں کے باعث دہلی کے بجائے لاہور کو ترجیح دی گئی اور رفتہ رفتہ ''دہلی نشاۃ ثانیہ'' (بقول سی۔ ایف۔ اینڈریوز) کا مرکز بھی اسی شہر کی جانب منتقل ہو گیا۔ نئی درس گاہیں' دانش گاہیں' علمی و ادبی ادارے اور انجمنیں قائم ہوئیں۔ خوش قسمتی سے تعلیم و تدریس کے ان مراکز کو نامور سربراہان اور جانے پہچانے اربابِ علم و فضل کا تعاون نصیب ہو گیا اور دیکھتے دیکھتے علم و دانش کی یہ تربیت گاہیں دن دگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگیں۔ بعض مصلحتوں کے تحت مغربی علوم کو متعارف کرانے پر زیادہ توجہ مبذول کی گئی' لیکن اس کے ساتھ ساتھ علومِ شرقیہ کی درخشندہ روایات کو فراموش نہیں کیا گیا۔ علمی اور تعلیمی سطح پر مشرق و مغرب کے سنگم کے استحکام کے لیے مساعی بارآور ثابت ہوئیں۔ ڈاکٹر لائٹنر (م-1899ء) اور پھر وولنر (م-1936ء) نے اپنی بلند پایہ انتظامی اور علمی صلاحیتوں کے باعث ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ تشنگانِ علم و ادب نے خوب سیر ہو کر اپنی پیاس بجھائی اور فکر و دانش کی تاریخ میں انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔ ان درس گاہوں کے فارغ التحصیل جن خوش بخت اصحاب کو اعلیٰ تعلیم کی غرض سے انگلستان کی عالمی شہرت یافتہ دانش گاہوں میں جانے کا موقع نصیب ہوا' انہوں نے وہاں کی علمی روایات سے مقدور بھر استفادہ کیا اور بالآخر وہ برصغیر کی علمی اور فکری تاریخ میں مسندِ اعلیٰ پر فائز ہو گئے۔ ایسی ہی بلند پایہ ہستیوں میں علامہ محمد اقبال' شیخ عبدالقادر' ڈاکٹر مولوی محمد شفیع' پروفیسر حافظ محمد اقبال اور حافظ محمود خاں شیرانی شامل ہیں۔

حافظ محمود شیرانی (1880-1946ء' ولادت و وفات در ٹونک) کا آبائی تعلق پنجاب سے نہیں تھا لیکن ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت' ادبی ذوق کی آبیاری اور میدانِ تحقیق میں معرکہ آرائیاں مجموعی طور پر لاہور ہی کی علمی فضا کی مرہونِ منت ہیں۔ برسوں پر محیط قیامِ انگلستان نے بھی ان کے ذوقِ تحقیق و جستجو کو جلا بخشی۔

علی گڑھ اور لاہور کے علمی حلقوں کے روحِ رواں پروفیسر آرنلڈ (م-1930ء) کی سرپرستی اور ہمکاری، ہندوستانی احباب کی صحبت اور مسلمانوں کے تاریخی اور ادبی مصادر کے معروف ناشر لوزک اینڈ کمپنی کی ملازمت نے انہیں ایک ایسی راہ سجھائی، جس پر وہ عمر بھر گامزن رہے۔ ابتدائی ایام میں شعر و شاعری کا ذوق غالب رہا لیکن جب وہ یورپ کے کتاب خانوں میں محفوظ مسلمانوں کے تہذیبی آثار اور یورپ کی تاریخ استشراق کے قابلِ اتباع پہلوؤں سے متعارف ہوئے تو ان کے ذوقِ تحقیق و مطالعہ نے ایک ایسی سمت اختیار کی، جو آگے چل کر ان کی اصل پہچان بن گئی۔

شیرانی مرحوم نے جس ڈھب سے اپنی پوری زندگی بسر کی اور شعبۂ علم و ادب میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ان پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہی یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ وہ عظیم شخصیات کی طرح تمام عمر یک مقصدیت کے اصول پر سختی سے عمل پیرا رہے۔ انہوں نے اپنے ایامِ جوانی میں بدیسی ماحول میں رہتے ہوئے جو مقصدِ حیات اپنانے کا فیصلہ کیا، زندگی بھر اس سے سرِمو تجاوز نہیں کیا۔ تحقیق و تدقیق کے کٹھن مراحل ہوں یا تدریسی مصروفیات یا روزمرہ کے معمولاتِ زندگی، ان سب میں شیرانی ایک سچے اور کھرے اسکالر ہی نظر آتے ہیں۔ لگن، اپنے واحد مقصدِ حیات سے گہری وابستگی اور گردونواح کے شور شرابے سے لاتعلق ڈھیروں قلمی و مطبوعہ کتابوں کے بیچ میں فرش پر بیٹھے بیٹھے ایسی علمی اور تحقیقی نگارشات قلمبند کر گئے کہ بحیثیت عالم ان کی شہرت بامِ عرش تک جا پہنچی اور وہ جدید ادبی تحقیق کے بانیوں اور اولیں معلّمین میں شمار کیے جانے لگے۔

بعض اصناف ادب کی مانند اردو میں تحقیق اور کسی حد تک تنقید کی تاریخ کچھ زیادہ پرانی نہیں۔ مدتوں سے روایت و درایت کے اصول متعین تھے اور ان کی افادیت بھی مسلمہ تھی، لیکن ادب میں اسناد کے ان اصولوں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا اور زیادہ تر تذکراتی اور تقریظی و توصیفی اندازِ فکر کا غلبہ رہا۔ جدیدیت کی ہوا چلی، تو بات کچھ آگے بڑھی۔ تنقید و تحقیق میں مغربی اصولِ اسناد کو بھی برتا جانے لگا، لیکن یہ عبوری دور قریب قریب نصف صدی تک چلا اور پھر اپنی اصل ڈگر پر رواں دواں ہو گیا۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو اردو میں ادبی تحقیق کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے میں محمود شیرانی نے مجتہدانہ کردار ادا کیا اور ان کے عالمانہ قلمی آثار مشرق و مغرب کے اصولِ تحقیق کا مثالی نمونہ قرار پائے۔

دراصل محمود شیرانی ایک روایت شکن محقق ہیں۔ فطرت نے ان کے مزاج کو ایسے سانچے میں ڈھال دیا تھا کہ وہ کسی مستند ثبوت کے بغیر عرفِ عام میں مصدقہ تاریخی اور ادبی حقائق کو من و عن تسلیم کرنے سے گریزاں رہے۔ اثبات کی نسبت نفی کا عمل زیادہ کٹھن، وسعتِ نظر یا وسعتِ مطالعہ کا متقاضی ہے۔ تشکیک اور انکار، جو تحقیق کے مبادیاتی اصول سمجھے جاتے ہیں، حقیقت کے متلاشیوں کو تلاش و جستجو کی صبر آزما راہوں پر روانہ کر دیتے ہیں اور وہ بڑی کٹھنائیوں سے ان ہفت خوانوں کو طے کر کے گوہرِ مراد حاصل کرتے ہیں۔ گو انگلستان کی آزاد فضاؤں نے نوجوان محمود شیرانی کے شعری ذوق کو مہمیز کیا اور وہ ''محمود خاں شیرانی ٹونکی'' کے نام کے تحت نظمیں کہنے لگے[1]۔ اسی دور یعنی بیسویں صدی عیسوی کے بالکل اوائل میں ان کی ایک اردو نظم ''ٹیپو

سلطان'' کے عنوان کے تحت شائع ہوئی؟، جس کے تعارفی نوٹ میں مدیر رسالہ نے محمود شیرانی کی اسی افتادِ طبع کی جانب ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

''[یہ نظم] ہمارے دوست حافظ محمود صاحب شیرانی منشی فاضل نے لکھی ہے۔ داد دیں گے۔ آپ ان دنوں انگلستان میں مقیم ہیں اور انگریزی لٹریچر سے آشنائی پیدا کر رہے ہیں..... شیرانی صاحب کو ٹیپو سلطان کے بارے میں کئی انگریز مؤرخوں سے اختلاف ہے' مگر ایسے معاملات میں آزادیٔ رائے کا دخل بجا ہے۔''

یہی ''اختلاف'' یا بالفاظِ دیگر ''لا'' ان کی تحقیقات کا نقطۂ آغاز ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ رجحانِ طبع راسخ ہوتا چلا گیا اور بالآخر شعبۂ علم و ادب میں ان کی ایسی دھاک بیٹھ گئی کہ اُس دور کے ثقہ اربابِ علم و دانش بھی اپنے قلم کو جنبش دینے سے قبل شیرانی کی موجودگی کا احساس رکھتے تھے۔ وثوق سے یہ کہنا مشکل ہے کہ شیرانی صاحب ''لا'' سے ''اِلّا'' کے مقام تک پہنچے یا نہیں' کیونکہ ان کا آخری مقالہ (''تنقیدِ آبِ حیات'') بھی ابتدائی منزل ہی کی نشاندہی کرتا ہے' لیکن یہ ذہنی اُپج ان کی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کا بیّن ثبوت ہے۔ غالباً جادۂ تحقیق میں ''اثبات'' کا مقام عنقا ہے اور اس راہ کا مسافر ''لا'' کی لاٹھی ہی کے سہارے اپنی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ ہمارے معدودے چند محققین میں شیرانی صاحب ہی ایسے محقق ہیں' جن کے تمام تحقیقی سرمائے میں ''اختلاف'' نمایاں عنصر ہے' لیکن یہ ''اختلاف'' شخصی ہے نہ کسی دنیاوی مصلحت یا ذاتی غرض مندی سے آلودہ ہے۔ یہ ''اختلاف'' کاملاً عالمانہ رنگ لیے ہوئے ہے اور شیرانی صاحب کی وسعتِ نظر کا منہ بولتا ثبوت ہے اور یہی شیرانی صاحب کے کمالِ تحقیق کی معراج ہے۔

محمود شیرانی کی کتب و مقالات پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہی درج ذیل نمایاں خصوصیات کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

(الف) وہ اپنے موضوعِ تحقیق سے متعلقہ کسی تحریری و زبانی روایت یا واقعہ کو معتبر مصادر کی کسوٹی پر جانچے بغیر قبول نہیں کرتے۔ اس ضمن میں وہ زیادہ تر معاصر' قریب العصر قلمی آثار اور مصنف کی تحریر سے اخذ کردہ اندرونی شہادتوں پر اعتماد کرتے ہیں۔ ان کی مخطوطہ شناسی ضرب المثل ہے اور سینکڑوں خطی نسخے ان کی ذاتی ملکیت تھے۔ انہوں نے اپنے نادر الوجود ذاتی کتاب خانہ کے علاوہ بعض قریبی علم دوست احباب کے قلمی ذخائر سے بھی استفادہ کیا اور یوں کسی زباں زدِ خاص و عام روایت یا واقعہ کو ساقط الاعتبار قرار دینے کے لیے قابلِ اسناد مآخذ (قلمی و مطبوعہ) کو بنیاد بنایا۔

(ب) محقق کے لیے کتابیاتی گرفت کا مضبوط ہونا اولیں شرط ہے' یعنی زیرِ تحقیق موضوع پر جو کام ہو چکا ہو' اس سے مکمل آگاہی اور اس کا بالاستیعاب مطالعہ لازم ہے۔ شیرانی صاحب کی سبھی تحریروں میں یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ قیامِ یورپ کے دوران میں علومِ شرقیہ کے مغربی منابع پر انہیں کامل دستگاہ حاصل تھی اور وہ بھی ان کی تنقید و تنقیص سے مبرا نہیں رہے۔ مشرق و مغرب کے اہم بنیادی مآخذ اور ان کے

مندرجات سے کما حقہٗ آگاہی "پرتھوی راج راسا" اور "فردوسی پر چار مقالے" سے عیاں ہے۔

(ج) محمود شیرانی صاحب ادب کو تاریخ سے الگ نہیں سمجھتے۔ انہوں نے مختلف ادبی شاہکاروں کے تجزیے اور محاکمے میں اس دور کے حالات و واقعات کو بھی پیش نظر رکھا ہے، جس میں وہ صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوئے۔ کسی واقعہ کے بطلان یا عدمِ صحت کے بارے میں انہوں نے زیادہ تر معاصر اور معتبر تاریخی کتب پر انحصار کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ قلمی اور مطبوعہ تواریخ کے علاوہ دیگر ذرائع معلومات مثلاً مسکوکات، کتبات اور لغات سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ مخطوطہ شناسی کے علاوہ ان کی سکہ شناسی بھی امر مسلمہ ہے اور ہمارے اربابِ تحقیق میں صرف شیرانی صاحب ہی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ نہ صرف ان دونوں شعبوں میں کامل درک رکھتے تھے بلکہ ہندوستان کی اسلامی مملکتوں کے ہزاروں سکے ان کی ذاتی ملکیت تھے۔ افسوس کہ ان کے مخطوطات تو کسی حد تک محفوظ ہو گئے، لیکن ان کا اہم ترین ذخیرہ مسکوکات ناقدریٔ زمانہ کے سبب منتشر ہو گیا۔

(د) شیرانی صاحب کا اندازِ زیست اول تا آخر ایک مخلص اور حقیقی اسکالر جیسا تھا۔ صلہ و ستائش کی پرواہ کیے بغیر وہ شب و روز اپنے تحقیقی مشاغل میں مصروف رہے۔ ان سے قبل ہماری تحقیق کو جس نے ابھی گھٹنوں کے بل چلنا سیکھا تھا، اپنے پاؤں پر کھڑا کیا اور اسے نئی راہوں سے آشنا کرایا۔ ان کی نظر میں تحقیق کی راہ میں کوئی پڑاؤ نہیں اور اس پر چلنے والا ہر لحظہ نت نئے حقائق کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ یہ بھی ایک ایسی "کائنات" کے مترادف ہے، جہاں "دمادم کن" کی صدا آتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کبھی اپنی کسی تحریر کو حرفِ آخر نہیں سمجھا اور جوں جوں انہیں نئی معلومات حاصل ہوتی گئیں، اپنے تحریر کردہ مقالات میں قطع و برید اور اضافے کرتے رہے۔ بحیثیت محقق ان کے اس وصف کے اور تو اور، قاضی عبدالودود بھی معترف ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ شیرانی صاحب کی "ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ ابتدائی زمانے میں اگر کچھ غلطیاں ان سے ہوئیں تو انہیں چھپانے کی کوشش نہیں، بلکہ خود ہی ان کی تصحیح کی۔"[3]

(ہ) شیرانی صاحب نسلاً پٹھان تھے اور شکار کا جنون کی حد تک شوق رکھتے تھے۔ تحقیق کے میدان میں بھی تیر و تفنگ سے لیس وہ اسی جوش و جذبے سے شکار کرتے تھے۔ وہ "صیدِ زبوں" کے بجائے "یزداں" پر کمند پھینکنے کے قائل تھے، لیکن اپنی کمین گاہ کی حفاظت سے بھی غافل نہیں رہتے تھے۔ خسرو سے منسوب "خالق باری"، "دیوان معین الدین اجمیریؒ"، "تنقید شعر العجم" اور "فردوسی پر چار مقالے" ان کے ایسے ہی اہداف کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ذاتی پسند و ناپسند سے بالاتر ہو کر انہوں نے صدیوں کی بے بنیاد روایات کو تحقیق کی سان پر چڑھا کر جو نتائج مرتب کیے، ان کو جرأت اور پورے تیقن کے ساتھ علمی دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔

☆ ☆ ☆ ☆

شیرانی صاحب پنجاب میں پیدا ہوئے، نہ پنجابی ان کی مادری زبان تھی۔ اردو ان کا ذریعۂ اظہار رہی۔ ان کی ابتدائی منظومات اور نثری تحریریں اسی زبان میں لکھی گئیں، لیکن علمی اور تحقیقی اعتبار سے وہ اردو زبان و ادب سے لاتعلق رہے۔ درحقیقت ان کی تحقیقات کا محور و مرکز فارسی ادبیات تھا، چنانچہ ان کا پہلا تفصیلی

مقالہ ''قابوس نامہ'' کے عنوان کے تحت شائع ہوا[4]۔ اس دور میں ان کا اہم ترین موضوع ''شاہنامہ فردوسی'' تھا اوراس کے مختلف پہلوؤں پران کے تحقیقی انکشافات منظرِ عام پرآنے لگے تھے۔ علاوہ ازیں برصغیر کی فارسی زبان و ادب میں خدمات پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ''تنقید شعرالعجم'' کا ایک ایک صفحہ اس کا شاہد ہے۔ بنظر غائر دیکھا جائے تو 1928ء ('' پنجاب میں اردو'' کا سنِ اشاعت) سے قبل شیرانی صاحب نے کسی ایسے موضوع پر قلم نہیں اٹھایا' جس کا تعلق براہ راست اردو زبان وادب سے ہو۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے کن وجوہ کے باعث فارسی سے متعلق ''بزرگ ترین'' موضوعات کے بجائے اردو زبان کو اپنا موضوعِ تحقیق بنایا اور وہ بھی پنجاب کے حوالے سے' جہاں کے وہ رہنے والے نہیں تھے۔ اس سوال کے جواب کے لیے یہاں ان محرکات کا بالاختصار ذکر ضروری ہے' جن کے زیرِ اثر'' پنجاب میں اردو'' معرضِ وجود میں آئی۔

(الف) بیسویں صدی عیسوی کی ابتداء ہی سے پنجابی اور اردو کی بحث چل پڑی تھی اور اخبارات و جرائد میں اہلِ قلم نے بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیا تھا۔ اس دوران میں صوبہ پنجاب میں پنجابی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی تجویز پیش کی گئی تو پنجاب بھر کے بہی خواہانِ اردو نے اس تجویز کی مخالفت میں الگ محاذ قائم کرلیا اور اپنی تحریروں میں پنجاب کی اردو خدمات کا ذکر کرنے لگے۔ راقم نے اپنے مقالہ '' پنجاب میں اردو (مزید تحقیق'') میں' جو زیرِ نظر مجموعہ میں شامل ہے' ان نزاعی مباحث کا تفصیلی ذکر کیا ہے' اس لیے یہاں اجمالاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید پنجابی اور اردو کی لسانی بحثوں نیز پنجاب کی فروغِ اردو کی مساعی کے ذیل میں اس موضوع پر ایک جامع کتاب تیار کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی ہو۔

(ب) شیرانی صاحب کی اس کتاب سے چند سال قبل '' دکن میں اردو'' اشاعت پذیر ہوئی تو اس کے مؤلف نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے اس کا ایک نسخہ ہدیۃً علامہ اقبال کو بھجوایا۔ علامہ نے اس علمی کاوش کو پسند کرتے ہوئے اپنے مکتوب (بابت 7 مئی 1925ء) میں اس بات کا بھی ذکر کردیا کہ:

> '' اردو زبان اور لٹریچر کی تاریخ کے لیے جس قدر مسالہ ممکن ہو' جمع کرنا ضروری ہے۔ غالباً پنجاب میں بھی کچھ پرانا مسالہ موجود ہے۔ اگر اس کے جمع کرنے میں کسی کو کامیابی ہوگئی تو مورخ اردو کے لیے نئے سوالات پیدا ہوں گے۔''[5]

علامہ اقبال اور شیرانی صاحب قریب قریب ہم عصر تھے اور ان کے مابین قیامِ انگلستان کے زمانہ سے دوستانہ مراسم چلے آرہے تھے۔ ممکن ہے' پنجاب میں اردو کے قدیم آثار کا کھوج لگانے اور انہیں علمی دنیا کے سامنے لانے کی ذمہ داری علامہ موصوف ہی کے کہنے پر شیرانی صاحب کو سونپی گئی ہو یا ان کی یہ تجویز شیخ عبدالقادر کی وساطت سے شیرانی صاحب کو پیش کی گئی ہو۔ ظاہر ہے وہ شیخ صاحب کی بات کو بھی ٹال نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ ان کے قریبی احباب میں شامل تھے' ان کی ابتدائی شعری تخلیقات کو اپنے مجلّہ ''مخزن'' میں شائع کیا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شیخ صاحب ہی کی سفارش پر انہیں اسلامیہ کالج (لاہور) میں ملازمت حاصل ہوئی تھی۔ یہ امر بھی قرینِ قیاس ہے کہ ان دونوں بارسوخ شخصیات کی فرمائش پر عبداللہ یوسف علی' پرنسپل اسلامیہ

کالج' نے شیرانی صاحب کو یہ کام سونپا ہو یا اسے بعجلت ممکنہ تیار کرنے کے لیے دباؤ ڈالا ہو۔

(ج) شیرانی صاحب مخطوط شناسی کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ بلاشبہ ان کی ترجیح اول فارسی قلمی نسخوں کا حصول تھا' لیکن وہ اہم اردو اور پنجابی خطی نسخے بھی خریدتے رہتے تھے۔ قلمی نوادر کی جمع آوری کے انہی مراحل میں متعدد ایسی بیاضیں بھی ان کے ہاتھ لگیں' جن میں قدیم اردو کے نمونے منقول تھے۔ علاوہ ازیں پرانی تواریخ' ملفوظات اور لغات کا عمیق مطالعہ کرتے ہوئے بعض ایسے الفاظ اور مختصر فقرے بھی ان کی نظر سے گذرے' جو اردو کی قدامت اور پنجابی سے ان کی لسانی مشابہت یا صوتی قربت کی غمازی کرتے تھے۔ نجی قلمی ذخیرہ کے علاوہ ان کے بعض احباب (بالخصوص غلام دستگیر نامی' پروفیسر سراج الدین آذر' مولوی محبوب عالم اور قاضی فضل حق) کے مملوکہ قلمی نسخوں سے پنجاب میں اردو کے مختلف ارتقائی مراحل کے بارے میں مفید معلومات فراہم ہوئیں۔ وہ اپنے مزاج اور مخصوص انداز سے اس موضوع یعنی پنجاب میں اردو پر جامعیت کے ساتھ کام کرنے کا ارادہ رکھتے تھے' لیکن بعض افراد کے مسلسل تقاضوں کے سبب انہیں اس کتاب کو جلد لکھنا پڑا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے نام اپنے ایک مکتوب (بابت 2 اپریل 1929ء) میں وہ اس صورت حال کی یوں وضاحت کرتے ہیں:

> "'پنجاب میں اردو' کے متعلق آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے' ان کے لیے آپ میرا شکریہ قبول کیجئے۔ عبدالحق صاحب کے تبصرے نے تو مجھ کو سخت مایوس کیا ہے بلکہ میں اس کو بیداد سمجھتا ہوں۔
>
> آپ کے اعتراضات ایک حد تک بجا اور درست ہیں۔ میں عجلت میں تھا۔ بالخصوص پرنسپل عبداللہ یوسف علی کی تاکید کی بناء پر مجھ کو یہ کتاب قبل از وقت شائع کرنی پڑی ہے اور کئی موقعوں پر اس میں اجتہادی یا دوسری قسم کی غلطیاں بھی موجود ہیں۔ تاہم میں خیال کرتا ہوں کہ ضروری یا تازہ مواد کے متعلق میں نے کافی اطلاع دے دی ہے۔ میں نے جس ذخیرہ پر زیادہ تر اعتماد کیا ہے' وہ اکثر قلمی ہے جو خود میرے پاس ہے یا دیگر احباب کے مجموعہ کتب سے علاقہ رکھتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: 'بعض چیزیں اس قدر اہم اور کام کی ہیں کہ ان کے ساتھ اگر ان کے واقعیت کے ثبوت اور پتے بھی دیئے جاتے تو وہ تھوڑی سی تشنگی باقی نہ رہتی جو اس وقت میں محسوس کر رہا ہوں'۔
>
> آپ کا یہ جملہ تشریح کا محتاج ہے۔ مہربانی کر کے آپ مجھ کو اطلاع دیجئے کہ وہ کون سے ضروری مقامات ہیں جہاں میں نے اپنے حوالے نہیں دیئے ہیں۔ مجھ کو پنجابی اردو مصنفین کے مخطوطات میں دلچسپی ہے۔ اگر ان کے متعلق آپ کوئی تفصیلی اطلاع بہم پہنچائیں گے تو میں بے حد شکر گذار ہوں گا۔ بالخصوص تالیفات کے متعلق جو ببلیوتیک ناسیونال میں آپ بتاتے ہیں۔"[6]

(د) بقول میر تقی میر شاعری کا مقصد تو کچھ اور تھا' لیکن بالآخر یہی ان کا "فن ٹھہرا۔" کچھ ایسی

ہی صورت حال سے شیرانی صاحب بھی دوچار ہوئے۔ برسوں بعد بعض خاندانی معاملات سلجھانے انگلستان سے واپس آئے۔ ارادہ یہی تھا کہ انہیں نپٹا کر واپس چلے جائیں گے' لیکن انہی دنوں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی اور واپسی کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ جنگ ختم ہوئی تو مالی وسائل کی کمیابی کی وجہ سے یورپ لوٹنا ممکن نہ رہا۔ روزگار کی فکر دامنگیر ہوئی' تو مقالہ نویسی کا آغاز ہوا۔ لاہور آئے تو شیخ عبدالقادر سے دیرینہ مراسم مددگار ثابت ہوئے اور اسلامیہ کالج میں مدرس فارسی تعینات ہوئے۔ اس زمانے میں ان کے مقالات برصغیر کے مؤقر ادبی رسائل میں شائع ہونے لگے۔ ایک روایت کے مطابق ڈاکٹر مولوی محمد شفیع انہیں اورینٹل کالج لانا چاہتے تھے' چنانچہ انہی کی کوشش پیہم سے اردو کی ایک اسامی نکل آئی' لیکن اس پر شیرانی صاحب کی تقرری کے لیے ضروری تھا کہ ان کی کسی ایسی علمی کاوش کو پیش کیا جائے' جو اردو سے متعلق ہو' چنانچہ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ان سے ''پنجاب میں اردو'' لکھوائی گئی۔ یہ روایت درست ہو یا نہ ہو' لیکن یہ طے ہے کہ اس کے بعد یہ موضوع شیرانی صاحب کی تحقیقات میں مرکزی حیثیت اختیار کر گیا اور انہوں نے ایسے مقالات سپردِ قلم کیے' جو فنِ تحقیق کی آبرو قرار پائے۔

''پنجاب میں اردو'' وسط 1928ء میں شائع ہوئی' لیکن بعض قرائن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے متذکرہ صدر محرکات کے سبب 1926ء کے اواخر یا 1927ء کی ابتداء سے یہ کتاب لکھنا شروع کر دی تھی۔ ان کے ایک شاگرد رشید مولوی محمد عبداللہ (ڈاکٹر سید محمد عبداللہ) اس زیر تالیف کتاب کی اطلاع ان الفاظ میں دیتے ہیں:

> ''اسلامیہ کالج لاہور کی انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام مشہور محقق پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب ایک کتاب بعنوان ''پنجاب میں اردو'' مرتب فرما رہے ہیں۔ یہ کتاب عنقریب شائع ہو جائے گی۔ اس میں ممدوح نے اصل مآخذ سے ثابت کیا ہے کہ اردو کا اصل وطن پنجاب ہے۔ اس کتاب کے شائع ہونے سے تاریخ ارتقاء اردو اور تذکرہ شعراء میں بہت بڑا اضافہ ہوگا۔''[7]

''پنجاب میں اردو'' کے مندرجات کی اہمیت کے پیش نظر اہل علم اس کا بیتابی سے انتظار کر رہے تھے' اسی لیے اس کا اِکا دُکا باب کتاب کی اشاعت سے قبل شائع بھی کر دیا گیا[8]' لیکن اس کے منظر عام پر آتے ہی شیرانی صاحب کے نظریے کے معتقد و منتقد دونوں گروہوں نے اپنی آراء کا کھل کر اظہار کیا۔ مؤلف نے ایک محقق' ماہر لسانیات اور مورخ کی حیثیت سے کتاب رقم کی تھی اور دلائل و براہین کی بنیاد مستند قلمی مصادر پر رکھی تھی' اس لیے بیشتر علمی حلقوں کی جانب سے پذیرائی ہوئی۔ اس کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز مولوی عبدالحق نے اٹھائی' جس پر شیرانی صاحب نے بھی ناپسندیدگی کا اظہار کیا' جیسا کہ ان کے درج بالا مراسلے بنام محی الدین قادری زور سے ظاہر ہوتا ہے۔ پنجاب کے لکھاریوں نے بھی مولوی صاحب کے اعتراضات کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا' چنانچہ پنڈت ہری چند اختر نے یوں اپنا ردعمل ظاہر کیا:

''پروفیسر محمود شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' جس وقت شائع ہوئی تھی، ہم نے لکھ دیا تھا کہ اردو کے ادبی حلقوں میں ہنگامہ خیز ثابت ہوگی، کیونکہ اس میں مصنف نے ناقابل تردید دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ اردو اصل میں پنجاب کی پیداوار ہے۔ گویا اس کا ماضی اور مستقبل پنجاب ہی سے وابستہ ہے۔

ہمارا خیال تھا کہ وہ لوگ جو زبان کو اپنے صوبے، اپنے شہر، اپنے محلے اور اپنے دیوان خانے ہی تک محدود رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، اس کتاب کی تردید میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیں گے، لیکن معلوم ہوا کہ شیرانی صاحب کے زبردست دلائل نے ان کو کچھ وقت کے لیے بالکل ساکت نہیں کر دیا تو شش و پنج میں ضرور ڈال رکھا ہے لیکن تابہ کے۔ آخر انجمن ترقی اردو دکن کے قابل ناظم اور رسالۂ اُردو کے فاضل مدیر مولوی عبدالحق بی۔ اے سے نہ رہا گیا اور موصوف نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے شیرانی صاحب کے دلائل کو ناکام کہہ کر گویا پنجابیوں کے پنجے سے یو پی کی چھنی ہوئی دولت کو واپس لے لیا ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب قابل آدمی ہیں اور ہم خوش ہیں کہ پنجاب میں اردو کی تردید میں پہلے پہل ان ہی نے قلم اٹھایا کیونکہ ان کی ذات اس بحث کے دوران میں معقولیت کی ضامن ہو سکتی ہے۔

بہرحال یہ بحث بہت دلچسپ اور طولانی ہے......''[9]

شیرانی صاحب کے نظریے کے اولیں ناقد مولوی عبدالحق تھے، لیکن یہ امر لائق توجہ ہے کہ جس انجمن کے وہ سیکرٹری تھے، اس کے حوالے سے ''پنجاب میں اردو'' کی اشاعت سے ایک سال بعد اُس دور کی ایک فاضل اور مقتدر شخصیت نواب صدر یار جنگ بہادر محمد حبیب الرحمٰن خاں نے اپنے خطبہ ''ادبیات اردو کی تاریخ ترقی'' کے آخر میں فرمایا کہ:

''اسی سلسلے میں یہ تجویز شاید بے جا نہ ہوگی کہ اس اجلاس شعبہ اردو کی یادگار میں پنجاب میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم ہو، جو متفقہ کوشش سے پنجاب میں اردو کی قدیم نشو و نما کی تحقیقات کرے اور پروفیسر شیرانی نے جس کام کا آغاز ''پنجاب میں اردو'' لکھ کر کر دیا ہے، اس کو انجام تک پہنچائے۔''[10]

نواب موصوف کی تجویز کو فی الفور علمی جامہ پہنایا گیا اور خواجہ عبدالوحید کی سربراہی میں لاہور میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کر کے جائزہ زبان اردو (پنجاب) کا کام شروع ہوا۔ 1934ء میں یہ جائزہ اختتام پذیر ہوا، جس میں شیرانی صاحب کا ایک مقالہ بھی شامل ہے۔ حال ہی میں خواجہ عبدالوحید کے فرزند اور نامور محقق مشفق خواجہ کی مساعی سے یہ جائزہ پہلی بار چھپ کر قارئین تک پہنچا ہے۔

اسی سال یعنی 1929ء ہی میں ملا رموزی نے ''پنجاب میں اردو'' پر مختصراً یوں تبصرہ کیا ہے:

''اب ان متعدد و متضاد روایتوں کی تاریخ یا ان میں اضافہ کرنے والی ''پنجاب میں اردو'' نام کی وہ کتاب ہے جسے ایک غیر پنجابی فاضل مولوی پروفیسر محمود شیرانی نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ زبان اردو سب سے پہلے پنجاب میں پیدا ہوئی یا پنجابی زبان سے نکلی۔ اس کتاب کے نام سے بظاہر تو اتنا ہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں زبان اردو کو صرف ''پنجاب زادی'' ثابت کیا ہوگا' مگر اصلیت اس سے زیادہ بصیرت افروز ہے اور وہ یوں کہ اس میں زبان اردو کی ایسی عمدہ تاریخ بھی شامل ہے' جس کی ملک کو شدید ضرورت تھی۔''[11]

☆ ☆ ☆ ☆
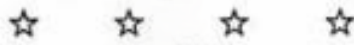
زیرِ نظر کتاب درج ذیل پانچ حصوں میں منقسم ہے:

حصہ اول: ''پنجاب میں اردو'' کا مکمل متن شائع کیا گیا ہے' جس کی بنیاد اس کتاب کی اشاعت اول (1928ء) پر رکھی گئی ہے۔ متعدد اشاعتوں کے علاوہ اُتر پردیش اردو اکادمی (لکھنؤ) سے اس کی عکسی طباعت اور مقتدرہ قومی زبان (اسلام آباد) کی جانب سے اس کا نسخ ٹائپ میں بھی ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ صحت متن کے نقطۂ نظر ان سب کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

حصہ دوم: شیرانی صاحب سے قبل اس موضوع یعنی پنجاب اور اردو پر اخبارات و جرائد میں بہت کچھ لکھا گیا' جس کی تفصیل راقم کے مشمولہ مقالے میں درج ہے' لیکن یہاں صرف چند منتخبہ مضامین کو شامل کیا گیا ہے' تاکہ اس پس منظر کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آ جائے' جس کے تحت ''پنجاب میں اردو'' لکھی گئی۔

حصہ سوم: جیسا کہ شیرانی صاحب کی محولہ بالا مکتوب (بنام ڈاکٹر زور) سے پتا چلتا ہے کہ کتاب لکھنے کے لیے جتنی مدت درکار تھی' وہ انہیں میسر نہ آ سکی۔ اس عجلت کے باعث جو کمیاں اور کوتاہیاں راہ پا گئیں' مؤلف کو ان کا پورا احساس تھا' چنانچہ ان کمیوں کو پورا کرنے اور فروگذاشتوں کی تصحیح کی غرض سے وہ ''پنجاب میں اردو'' کی اشاعت (1928ء) کے بعد بھی وقتاً فوقتاً مقالات لکھتے رہے۔ ایسے چند مقالات اس حصے میں شامل کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں پنجاب کے ادبی اور تہذیبی ورثہ کے محافظ ہم عصر احباب مثلاً پروفیسر قاضی فضل حق (1887-1939ء)[12]' غلام دستگیر نامی (م-1381ھ) وغیرہ اور ان کے بعض علم دوست تلامذہ شیرانی صاحب کی فراہم کردہ معلومات میں اضافہ کرتے رہے۔ تصحیحات و اضافات کا یہ سلسلہ شیرانی صاحب کی وفات (1946ء) کے بعد بھی چلتا رہا اور اب تک جاری ہے' لیکن اس حصے کو ''کلیات اشرف (اردو کلام)'' پر ختم کر دیا گیا ہے' جو بیسویں صدی عیسوی کے آخری سال یعنی 2000ء میں طبع ہوا۔ (باہتمام ڈاکٹر عارف نوشاہی۔ مرتبہ سید شرافت نوشاہی: 1907-1983ء)۔ کتاب کی ضخامت کے پیش نظر بعض مطالعات کو شامل

نہیں کیا جا سکا' لیکن ان کا حوالہ آخر میں ''مآخذ'' کے تحت دیا گیا ہے۔

حصہ چہارم: یہ حصہ محمود شیرانی کی شخصیت اور ان کے آثار علمیہ کے تنقیدی اور تحقیقی تجزیوں پر مبنی ہے اور ان میں سے بیشتر ان کے احباب' تلامذہ اور علماء کے تحریر کردہ ہیں۔ شیرانی صاحب کے ایک ہندو شاگرد کی یادداشتوں پر مشتمل انگریزی مضمون کتاب کے آخر میں درج کیا گیا ہے۔

حصہ پنجم: ''پنجاب میں اردو'' کے شائع ہوتے ہی شیرانی صاحب کے نظریے کی حمایت اور تردید میں اخبارات و رسائل میں کثرت سے مضامین لکھے گئے۔ ان سب کی شمولیت ایک الگ کتاب کی متقاضی ہے' اس لیے یہاں صرف چند تنقیدی اور تبصراتی تحریروں پر اکتفا کرنا پڑا۔

محمود شیرانی فنِ تحقیق کے اس اساسی اصول پر سختی سے کاربند رہے کہ موضوع سے متعلقہ تمام مآخذ پر مضبوط گرفت ہونی چاہیے۔ گہرے مطالعے کے بعد ان کے اسناد کی درجہ بندی کی جائے اور پھر اپنے مؤقف یا نظریے کی درستی کے لیے مستند ترین مصادر ہی کو ترجیح دینی چاہیے۔ دیگر تالیفات کی طرح انہوں نے ''پنجاب میں اردو'' کو بھی اسی اصول کے تحت قلمبند کیا۔ اس وقت تک دستیاب مآخذ پر ان کی گہری نظر تھی۔ مزید یہ کہ وہ اپنے اور احباب کے قلمی ذخائر سے بھرپور استفادہ کرتے رہتے تھے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ اپنے موضوع پر جامع تصنیف ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد انہیں نئی معلومات حاصل ہوتی رہیں اور ان کی بنیاد پر انہوں نے جو مقالات تحریر کیے' وہ حقیقت میں ''پنجاب میں اردو'' ہی کے تکملے ہیں۔ یہ کتاب یقیناً اردو تحقیق میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے' لیکن اس کے ساتھ ادبی محققین اور ماہرین لسانیات کو اس موضوع پر مزید ٹھوس کام کرنے کی دعوت بھی دیتی ہے۔ شیرانی صاحب کی رحلت کے بعد پنجاب میں اردو کے قدیم آثار کی تلاش جاری رہی' لیکن یہ زیادہ تر شعراء کے سوانحی کوائف اور ان کے نمونۂ کلام تک محدود رہی۔ اس تمام دریافت شدہ ذخیرے کے پیش نظر ''پنجاب میں اردو'' کے کم از کم لسانی پہلوؤں کا پھر سے تقابلی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ایسے مطالعہ سے شیرانی صاحب کے نظریے کی وسیع تناظر میں پرکھ قدرے آسان ہو جائے گی اور ان کے دلائل و براہین کو مزید تقویت حاصل ہوگی' لیکن بظاہر اس کٹھن کام کے لیے شیرانی مرحوم جیسے سچے' کھرے' دنیاوی جھمیلوں سے الگ تھلگ رہنے والے گوشہ گیر محقق کی ضرورت ہے' جو شاید موجودہ تشہیری دور میں بآسانی میسر نہ آسکے۔ شیرانی مرحوم کی جانشینی کے دعویدار تو بہت ہوں گے' لیکن عقابوں کے نشیمن زاغ و زغن کے تصرف میں آجائیں تو امید کی کرنیں ماند پڑ جاتی ہیں۔

آخر میں محمود شیرانی کے پیروکار' معروف ایران شناس اور اردوئے قدیم (مرتب ''کتاب نورس'') کے شناور ڈاکٹر نذیر احمد کے ایک مضمون کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

> ''شیرانی صاحب کی تحقیق راہ ہدایت کی شمع ہے۔ انہوں نے موجودہ نسل کی رہنمائی کے لیے بہت کافی سامان اکٹھا کر دیا ہے۔ ان کے اور ان کے رفقاء کے ذریعے تحقیق کی ایک زبردست روایت قائم ہو چکی ہے۔ ہمارے محققین و نقادان کا

فرض ہے کہ اس روایت کو آگے بڑھائیں۔ ان کے زمانے میں لاہور میں ایسے عالم اور دانشور جمع ہو گئے تھے کہ یہ شہر اسلامی علوم والسنہ کا سب سے بڑا مرکز ہو گیا تھا۔ آپ حضرات کی ذمہ داری ہے کہ اس کی مرکزیت کو نہ صرف برقرار رکھیں بلکہ اس کو مزید تقویت بخشیں۔ یہی کوشش شیرانی کی سب سے بڑی یادگار ہوگی۔ اگر آپ شیرانی اور ان کے رفقاء کے راستے پر نہ چل سکے تو تاریخ آپ کی کوتاہی کو کبھی معاف نہ کرے گی۔ اس تاریخ ساز شخصیت کے لیے سب سے بڑا خراجِ تحسین یہی ہے کہ آپ تحقیق کی اس روایت کے حامل بن جائیں، جس کے بنانے میں ان کا زبردست ہاتھ ہے۔ میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جدید دور کا کوئی محقق یا نقاد ہندو پاکستان میں ایسا نہیں ہے، جس کو شیرانی کی تحریر سے رہنمائی نہ ملی ہو۔"[13]

محمد اکرام چغتائی

لاہور

3 جولائی 2005ء

حواشی

1- دیکھیے ان کی نظم بعنوان "گناہ" (بہ تقلید حضرت آغا شاعر دہلوی) در: مخزن (جون 1902ء) ص 23-33۔

2- در: مخزن، بابت مارچ 1905ء، ص 53-57

3- رک: حافظ محمود شیرانی، پٹنہ 1982ء، ص 11

4- در: مخزن، بابت مئی تا اکتوبر 1920ء (بالاقساط)

5- رک: کلیات مکاتیب اقبال مرتبہ سید مظفر حسین برنی، جلد دوم، دہلی 1999ء (1991ء)، ص 587

6- دیکھیے مکاتیب حافظ محمود شیرانی مرتبہ مظہر محمود شیرانی، لاہور 1981ء، ص 203-204

7- در: مخزن، بابت جون 1927ء، زیر عنوان "اخبار علمیہ"، ص 64

8- مثلاً "قدیم اردو پر پنجاب کا اثر" (در: مخزن، بابت مئی 1928ء، ص 9-18)

9- در: مخزن، بابت ستمبر 1928ء، ص 4

10- ایضاً، بابت فروری 1929ء، ص 17

11- ایضاً، بابت مئی 1929ء، بذیل "شذرات و اشارات"، ص 14

12- روزنامہ "پیسہ اخبار" (لاہور)، بابت 30 جولائی 1939ء

13- اردو (کراچی) "شیرانی نمبر" جلد 56 شمارہ 4 (1980ء)، ص 125 "فارسی زبان و ادب سے متعلق پروفیسر محمود شیرانی کی تحقیقات (ایک جائزہ)"۔

انتساب

آج کل پنجاب میں اردو زبان اور اس کے علم و ادب سے جو غیر معمولی دلچسپی نظر آتی ہے' اس کی تعمیر میں سب سے زیادہ میرے دیرینہ مخدوم خان بہادر سر شیخ عبدالقادر بی اے بیرسٹرایٹ لا ممبر پنجاب لیجس لیٹو کونسل کی خدمات زبان و ادب کا حصہ ہے' اس لیے میں اس ناچیز تالیف کے انتساب کے لیے جواز اول تا آخر پنجاب اور اردو کے باہمی تعلقات کے تذکروں سے لبریز ہے' آپ ہی کے نام نامی کو طغرائے عنوان بنانے کی عزت حاصل کرتا ہوں!

محمود شیرانی

عرضِ حال

اس تالیف میں اردو زبان کی قدامت پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے' خصوصاً ان مسائل پر جن کی رو سے پنجاب اس زبان کی ابتدا اور اس کی نشو ونما کا گہوارہ مانا جاسکتا ہے۔

اردو زبان کے آغاز کا سرزمینِ پنجاب سے منسوب ہونا کوئی نیا نظریہ یا عقیدہ نہیں ہے۔ اس سے پیشتر پنڈت کیفی (بعقیدۂ خود مذاق کے طور پر) اور شیر علی خاں صاحب سرخوش اپنے پُرلطف تذکرہ ''اعجازِ سخن'' میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ مگر اس کتاب میں اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ نظر ڈالی گئی ہے۔

اس تالیف کا نام اس کے آخری باب ''پنجاب میں اردو'' کی رعایت سے رکھا گیا ہے جو تمام و کمال پنجاب کے اردو گو شعرا کے ذکر واذکار سے مملو ہے۔

یہاں مجھے اس شکریے کے اظہار سے بھی عہدہ برآ ہونا ہے جو اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں بعض حضرات کی معاونت کی طرف سے مجھ پر عاید ہوتا ہے۔

اس فہرست میں سب سے پہلا نام میرے ''کالج تاش'' دوست پروفیسر سراج الدین آذر ایم اے کا ہے' جن کے نفیس کتب خانے کا دروازہ ہمیشہ میرے لیے کھلا رہا اور جن کی نادر کتابوں سے اس سلسلے میں مَیں نے بہت کچھ مفید مطلب سرمایہ اخذ کیا ہے۔ ان کے بعد مجھے مولوی محبوب عالم صاحب مالک و مدیر ''پیسہ اخبار'' جناب شیر علی خاں صاحب سرخوش' جناب غلام دستگیر صاحب نامی' میاں حفظ الرحمٰن صاحب منہاس اور عبدالسبحان صاحب بی۔اے کا ذکر کرنا ہے جن کی قیمتی امداد کا شکریہ میری دلی مسرت اور خوش وقتی کا باعث ہے۔

اسلامیہ کالج' لاہور

محمود شیرانی

مقدمہ

جب پرنسپل عبداللہ یوسف علی نے مجھ سے اردو کے آغاز و قدامت کے موضوع پر لکھنے کے لیے ارشاد کیا تو میں نے ان سے عرض کی تھی کہ ''مضمون اگرچہ دلچسپ ہے' لیکن اس پر ہماری موجودہ معلومات کی روشنی میں قلم اٹھانا قبل از وقت معلوم ہوتا ہے اور صحیح اطلاعات کی بہم رسانی کے لیے شاید ابھی ایک عرصہ درکار ہوگا!''

اردو کی قدامت

ہم اردو کے آغاز کو شاہجہاں یا اکبر کے دربار اور لشکر گاہوں کے ساتھ وابستہ کرنے کے عادی ہیں' لیکن یہ زبان اس زمانے سے بہت زیادہ قدیم ہے' بلکہ میرے خیال میں اس کا وجود انھی ایام سے ماننا ہوگا جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں۔ اردو کی قدامت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ گجرات و دکن میں اس زبان میں دسویں صدی ہجری کی ابتدا یعنی بابر کی آمد کے قبل سے ادبیات کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے اور فارسی لغات کی شہادت سے جو نویں صدی ہجری میں ہندوستان میں لکھی جاتی ہیں' صاف واضح ہوتا ہے کہ اردو زبان ان ایام میں' تمام اسلامی ہندوستان میں سمجھی جاتی تھی۔ یہ لغات نگار اس کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ہندی سے ان کا مقصد یہی زبان ہے جسے ہم اُردو کہتے ہیں۔

بھاشا کا تعلق اردو سے

ہم اردو کو برج بھاشا کی بیٹی سمجھتے رہے ہیں! لیکن جب ان دونوں زبانوں کی صرف ونحو اور دوسرے خط وخال اور خصائص پر غور کیا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے راستے مختلف ہیں۔ اردو جہاں اپنے اسما و افعال کو الف پر ختم کرتی ہے' برج واؤ پر ختم کرتی ہے۔ برج میں جمع کا طریقہ بہت سادہ اور سہل ہے' لیکن اردو میں بہت پیچیدہ ہے۔ اردو میں مرکب الفاظ کا مع توابعات کے بہت رواج ہے' بھاشا میں یہ بات موجود نہیں ہے' اس لیے اردو کو بھاشا سے کوئی تعلق نہیں' ان میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں ہے بلکہ بہنوں بہنوں کا ہے!

اردو کا ارتقا کس زبان سے ہوا؟

کہا جاتا ہے کہ مغربی ہندی' جس کی برج بھاشا' ہریانی' راجستھانی' پنجابی اور اردو شاخیں ہیں' قدیم پراکرت سوراسینی کی یادگار ہے' لیکن جس زبان سے اردو ارتقا پاتی ہے' وہ نہ برج ہے' نہ ہریانی اور نہ قنوجی ہے بلکہ وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ ہمیں بہ تحقیق معلوم نہیں کہ جب مسلمان دہلی میں آباد ہوئے' اس وقت اس علاقے میں کیا زبان بولی جاتی تھی؟ آج دیکھا جاتا ہے کہ دہلی کے قریب ہی تین زبانوں میں یعنی ہریانوی' برج اور راجستھانی کا سنگم ہوتا ہے اور گریرسن نے تو صاف دہلی کو ہریانوی زبان کے علاقے میں شامل کر دیا ہے مگر راقم کی رائے میں ہریانوی کوئی علیحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہے' بلکہ وہ پرانی اُردو ہے یعنی وہی ہے جو گیارھویں صدی ہجری میں خود دہلی میں بولی جاتی تھی۔ اس میں اور اردو میں بہت کم فرق ہے۔ اگر ہم اس کو اردو نہ مانیں تو اردو کی شاخ ماننے میں تو ہمیں عذر نہیں ہونا چاہیے۔ بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ زبان اسلامی دور میں دہلی کے اثرات میں بنتی ہے۔

مسلمانوں کی آمد کے وقت دہلی کی زبان

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ دہلی میں مسلمانوں کی آمد کے وقت کون سی زبان بولی جاتی تھی؟ وہ راجستھانی ہوگی یا برج!! اس میں شک نہیں کہ آج دہلی' میرٹھ' مظفر نگر' سہارنپور یا دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ دوآبے میں اردو بولی جاتی ہے' لیکن اب سے تین صدی پیشتر اس علاقے کی یہ زبان نہ تھی' بلکہ یہاں برج کا طوطی بول رہا تھا! مغلوں کی آمد کے وقت گنگوہ ضلع سہارنپور میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی (متوفی 945ھ) باوجودیکہ ایسے علاقے سے تعلق رکھتے تھے جہاں آج اردو مادری زبان ہے' لیکن وہ اپنے ہندی اشعار میں ایسی زبان لکھتے ہیں جو برج کے مماثل ہے۔ علیٰ ہذا مخدوم بہاءالدین برناوی' برناوہ ضلع میرٹھ کے ہیں لیکن ان کے ہندی اشعار قطعاً برج میں ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ دوآبے میں برج زبان ہی مستعمل تھی۔ اردو نے ان علاقوں سے رفتہ رفتہ برج کو خارج کر دیا ہے' جس طرح ہریانہ کے علاقے سے!

یہ بات ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ امیر خسرو دہلی کی زبان کو ''دہلوی'' لکھتے ہیں۔ ابوالفضل بھی ''آئینِ اکبری'' میں اس کو ''دہلوی'' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اب شیخ باجن (متوفی 912ھ) بھی اس کو ''دہلوی'' کہتے ہیں اور جو نمونہ اس زبان کا دیتے ہیں، وہ قطعاً اردو ہے۔

اردو دہلی میں کس طرح پہنچتی ہے؟ کیا پنجاب سے؟

اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے' بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی میں جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب

سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں۔

اس نظریئے کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم شہادت یا سند نہیں' لیکن سیاسی واقعات' اردو زبان کی ساخت نیز دوسرے حالات' ہمیں اس عقیدے کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

شہادتِ لسانی اور اردو' ملتانی' پنجابی کی مماثلت

اس کے متعلق شہادت لسانی کافی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اپنی صرف ونحو میں ملتانی زبان کے بہت قریب ہے۔ دونوں میں اسماوافعال کے خاتمے میں الف آتا ہے۔ دونوں میں جمع کا طریقہ مشترک ہے۔ یہاں تک کہ دونوں جمع کے جملوں میں نہ صرف جملوں کے اہم اجزاء بلکہ ان کے توابعات وملحقات پر بھی ایک ہی قاعدہ جاری ہے۔ دونوں زبانیں تذکیروتانیث کے قواعد، افعال مرکبہ وتوابع میں متحد ہیں۔ پنجابی و اردو میں ساٹھ فیصد سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں۔

پنجابی اور اردو کا اشتراک

آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی کتب تاریخ ولغات کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ ہندوستان لاکھ کو" لک" پاگ کو" پگ" کھانڈ کو" کھنڈ" بھانڈ کو" بھنڈ" ماٹ کو" مٹھ" آنب کو" انب" مونگ کو" منگ" گاڑی کو" گڈی" گڑیا کو" گڈی" تالاب کو" تل" بڑی جھیل کو" دھنڈ" اور چقندر کو" گونگلو یا گانگلو" کہتے ہیں۔ اہلِ پنجاب اُنہی الفاظ کو آج بھی لکھ، پگ، کھنڈ' بھنڈ' مٹھ' انب' منگ' گڈی' گڈی' دھنڈ اور گونگلو بول رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کا وہ عنصر جو قدیم سے ان میں مشترک تھا' رفتہ رفتہ اردو زبان سے خارج ہوتا رہا ہے۔

ایسے افعال و الفاظ مثلاً آکھنا' لوڑھنا' انپڑنا' پچھانا' سننا' لانا (لگانا) کھڑنا' سڑنا (جلنا) پانا (ڈالنا) لڑنا (ڈسنا) بندھنا (باندھنا) منگنا (مانگنا) نسنا (بھاگنا) کھیر (دودھ) نال' ول' یائے مخلوط التلفظ " ویں" قسم کا امر" سی" قسم کا مستقبل وغیرہ جو آج صرف پنجابی میں رائج ہیں' دکنی اور قدیم اردو میں عام طور پر مستعمل تھے۔

اسی طرح اردو کے محاورات" دن دہاڑے"" ہلنا جلنا"" چپ چپاتا"" مانگنا تانگنا"" بال وال" وغیرہ میں اردو خواں ان کے جزو ثانی کو تابع مہمل کہنے کے عادی ہیں مگر پنجابی زبان میں یہ الفاظ بامعنی ہیں اور آج بھی استعمال میں آرہے ہیں۔

ادھر اردو کی اضافت کا" کے" کی اگرچہ فی زمانہ اردو کے ساتھ مخصوص ہے' پنجاب کے دیہات و قصبات میں بعض دیگر اسماء کے ساتھ اب بھی موجود ہے۔ الغرض یہ امور اردو اور پنجابی زبانوں کے اشتراک

قدیم کے بین دلائل ہیں۔

پنجاب پر بیرونی وسیاسی اثرات

علاوہ بریں پنجاب، ہندوستان کی خوش قسمتی یا بدقسمتی کی کنجی بنا رہا ہے اور شمالی اطراف سے ہندوستان پر ہر عہد اور ہر زمانے میں حملے ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ مسلمان بھی شمال ہی کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ان کی ابتدائی بستیاں سندھ اور ملتان میں قائم ہوتی ہیں۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں صفاریوں اور سامانیوں کی بنا پر مغربی پنجاب اور سندھ میں ایرانی اثر فروغ پانے لگتا ہے۔

ملتان اور اس کے اطراف میں فارسی کا دور

حتیٰ کہ چوتھی صدی ہجری کے عرب سیاح لکھتے ہیں کہ ملتان و منصورہ میں فارسی بولی جاتی ہے۔ یہ سیاح یہاں کے بعض شہروں اور دریاؤں کے نام فارسی طرز میں لکھتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایرانی تمدن کے اثرات ان اطراف میں بہت وسعت اختیار کر چکے تھے۔

پنجاب پر ایرانی تمدن کا اقتدار

چوتھی صدی کے اواخر سے محمودی حملوں کا آغاز ہوتا ہے اور تمام پنجاب آل ناصر کے زیر اقتدار آجاتا ہے۔ آل غزنہ کی حکومت تقریباً ایک سو ستر سال تک رہتی ہے۔

غزنوی دور میں مسلمانوں کی نئی زبان

اگر آل غزنہ سے پیشتر مسلمانوں کو کسی ہندی زبان کے اختیار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تو اس عہد میں جو خاصہ دراز ہے وہ پنجاب میں کوئی نہ کوئی زبان سرکاری، تجارتی، معاشرتی اغراض سے اختیار کر لیتے ہیں جس کو غوریوں کے عہد میں جب دارالسلطنت لاہور سے دہلی جاتا ہے، اسلامی فوجیں اور دوسرے پیشہ ور اپنے ساتھ دہلی لے جاتے ہیں۔

پنجاب کی نئی زبان کا مرکز ثقل دہلی میں منتقل ہوتا ہے

دہلی میں یہ زبان برج اور دوسری زبانوں کے دن رات کے باہمی تعلقات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی ہے اور رفتہ رفتہ اردو کی شکل میں تبدیل ہوتی جاتی ہے۔

پنجاب کا اردو کے ساتھ تعلق اسی کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ بعد کے زمانے میں بھی سیاسی

اسباب اس تعلق میں تجدید پیدا کرتے رہتے ہیں۔ تغلق آٹھویں صدی میں سید اور لودھی نویں صدی ہجری میں ایسے خاندان ہیں جو خاص پنجاب سے نکل کر دہلی آتے ہیں۔ ان کے لشکر پنجاب اور پنجابیوں سے تعلق رکھتے ہیں' اس لیے کوئی تعجب نہیں اگر ان نو واردوں نے دہلی کی زبان پر اور اثر ڈالا ہو۔

ساتویں صدی ہجری میں اس زبان کی حالت

ساتویں صدی ہجری میں اس میں وہ خصوصیات نظر آتی ہیں جو ایک طرف اس کو پنجابی سے اور دوسری طرف برج سے ممیز کرتی ہیں۔ شیخ فرید الدین گنج شکرؒ (متوفی 664ھ) اور مادر مومناں کے درمیان اردو میں جو گفتگو ہوئی' اس کے دو فقرے ہم تک پہنچے ہیں۔ مادر مومناں نے کہا تھا "خوجا برہان الدین بالا ہے۔" شیخ نے جواب میں فرمایا "پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے۔"

آخری فقرے میں "کا" اور "ہوتا ہے" ایسے الفاظ ہیں جو اس جملے کو پنجابی اور برج سے مختلف کر دیتے ہیں۔

آٹھویں صدی ہجری کا ایک اور فقرہ جو فیروز شاہ تغلق 752ھ وفات 790ھ کے حملہ سندھ سے تعلق رکھتا ہے۔ "تاریخِ فیروز شاہی" میں شمس سراج عفیف یوں نقل کرتے ہیں۔ "برکت شیخ تھیا' اک موا اک نہا۔"

دہلی سے اردو ہندوستان کے مختلف حصوں میں پہنچتی ہے

اسلامی سلطنت چونکہ دہلی پہنچ کر بہت جلد مرکزی حیثیت اختیار کر لیتی ہے' اس لیے یہ زبان اسلامی لشکروں' مہاجروں اور نو آبادکاروں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے ہر گوشے میں پہنچ جاتی ہے۔ خلجی اس کو گجرات اور دکن پہنچاتے ہیں۔ محمد تغلق جب آٹھویں صدی ہجری میں دہلی کو اجاڑ کر دولت آباد کو آباد کرتا ہے تو یہ زبان دکن میں مسلمان نو آبادکاروں کی زبان بن جاتی ہے۔ گجرات و دکن میں دسویں صدی ہجری سے اس میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ گویا دکن و گجرات میں اردو کے علیحدہ علیحدہ مرکز قائم ہو جاتے ہیں۔ اہلِ گجرات اس کو نویں صدی ہجری میں "زبان دہلوی" کے نام سے یاد کرتے ہیں' لیکن آنے والی صدی میں "گجری" یا "گوجری" کہنے لگتے ہیں۔ اسی طرح دکن میں پہلے پہل یہ زبان "زبانِ ہندوستان" کہلائی۔ بعد کو "دکنی" کہنے لگے۔ اہلِ دہلی بارہویں صدی کے آخر سے اس کو "ریختہ" کہنے لگے' جو در اصل موسیقی کی اصطلاح تھی۔ بعد میں کلام مخلوط بدو زبان کے معنی دینے لگی اور پھر نظم ہندی پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔

اردو کی ہر دلعزیزی

شاہانِ گجرات اردو میں بات چیت کرتے تھے۔ چنانچہ محمود شاہ بیگڑہ کا یہ فقرہ تاریخ میں محفوظ ہے

''نچی بیری سب کوئی جھوڑے۔'' بابر اس کی ہر دلعزیزی دیکھ کر اس میں ایک مصرعہ لکھتا ہے ''مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی۔'' اگر مغلوں کا حملہ ہندوستان میں سدِ راہ نہ بنتا تو اس میں شک نہیں کہ اردو بہت جلد فارسی کو ہٹا کر ہندوستان کی درباری زبان بن جاتی۔ فیروز شاہ تغلق کے بعد سے ایک دم سے فارسی پر زوال آتا ہے اور تغلق' سید اور پٹھان اردو ہی اختیار کر لیتے ہیں۔ محمد شاہ تغلق لفظ ''کھڑا کھڑی'' کے تلفظ کو اصلی دہلوی اور غیر دہلوی باشندوں کی شناخت کے لیے معیار [1] مقرر کرتا ہے۔ سوریوں کو فارسی سے سخت دشمنی تھی۔ اکبر کے عہد میں برہموں کے طفیل اردو میں سنسکرت کے الفاظ روشناس کیے گئے' لیکن بعد کو یہ طریقہ متروک ہو گیا۔ عالمگیر کے عہد سے دیکھا جاتا ہے کہ طبائع کا عام رجحان اردو کی طرف ہوتا جاتا ہے' اگرچہ اس کے اسباب سے ہم ناواقف ہیں۔

شمالی ہندوستان میں اردو کا مرکز

شمالی ہندوستان میں دکن سے ایک صدی بعد تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے مگر ابتدائی منازل میں اس کی رفتار بہت سست ہے۔ دہلی میں محمد شاہی دور میں اردو کا مرکز قائم ہونے سے پیشتر یہ زبان دہلی کے مضافات اور اضلاع میں ادبی حیثیت اختیار کرتی ہے۔ شمالی ہند کے مصنفین میں سب سے پیشتر محمد افضل پانی پتی (یا جھنجھانوی) ہیں جو 1035ھ میں بعہد جہانگیر وفات پاتے ہیں۔ ان کا ''بارہ ماسہ'' بہت مشہور ہے۔ یہ تصنیف جس میں فارسی اثرات بہت نمایاں ہیں' برج کے اثرات سے بھی خالی نہیں ہیں۔

ہریانوی زبان کا مرکز

اُدھر ہریانی زبان کے علاقے میں اردو گیارہویں صدی ہجری میں (بعہدِ عالمگیر) اپنا قدم جمالیتی ہے۔ جھجر کے محبوب عالم عرف شیخ جیون متعدد تصنیفات اس زبان میں یادگار چھوڑتے ہیں' جن میں ''دردنامہ محمدؐ'' سب سے اہم ہے۔ ان کی دوسری تصنیفات ''محشر نامہ'' ''خواب نامہ پیغمبر'' ''دہیز نامہ بی بی فاطمہ خاتون'' کے نام ہم تک پہنچے ہیں۔ اسی عہد میں عبدالواسع ہانسوی' جو فارسی کی مشہور قواعد ''دستور العمل فارسی'' کے مصنف ہیں' بچوں کے لیے ''نصاب سہ زبان'' لکھتے ہیں جس میں ذریعہ تعلیم یہی زبان ہے۔

بعہدِ عالمگیر کی ایک یادگار تحریک

عالمگیر کے عہد کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس عہد سے کچھ عرصہ پیشتر ایک نئی تحریک وجود میں آتی ہے' جس کے ماتحت بچوں کی تعلیم کا ذریعہ ہندی زبانیں بن جاتی ہیں۔ عالمگیر کے عہد میں یہ تحریک عام ہو جاتی ہے اور بے شمار کتابیں بچوں کی تعلیم کے لیے لکھی جاتی ہیں' جن میں اکثر و بیشتر منظوم ہوتی ہیں۔ یہ سلسلہ ہندوستان کے اکثر صوبوں میں جاری رہتا ہے' مثلاً دہلی' دکن اور پنجاب۔

ہریانی زبان اوراس کی حالت

ہریانی زبان دراصل ایک قسم کی اردو ہے جو گیارہویں صدی ہجری میں شاید اردو سے اس قدر مختلف نہیں تھی جس قدر کہ آج دیکھی جاتی ہے کیونکہ زمانہ مابعد میں جبکہ ہریانی اپنی اصل حالت پر قائم رہی اُردو میں دہلی کے محاورے اور شعراء کے تصرفات کی بنا پر کثیر تغیرات واقع ہوئے اور موجودہ اردو اسی اصلاح شدہ شکل کا نام ہے۔ ہریانی علاقوں میں تصنیفات کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے لیکن اس کے ادبیات کے متعلق ہماری موجودہ معلومات بہت محدود ہیں۔ حضرت شاہ غلام جیلانی رہتکی مصنف "چوپایہا" (متوفی 1235ھ) اور مولوی محمد رمضان مصنف "آخرگت" و "بلبل باغ محمد" (1226ھ) اور انور رہتکی (جو اسی صدی کے منصفِ دوم سے علاقہ رکھتے ہیں) کے نام اور تصنیفات سے پتا چلتا ہے کہ محبوب عالم کی تحریک اس علاقے میں برابر جاری رہی ہے۔ اگر ہریانی کی قید کو اڑا دیا جائے تو اور مصنفین بھی اس فہرست میں جگہ پا سکتے ہیں مثلاً میر جعفر زٹلی نارنولی جو عہدِ عالمگیر و فرخ سیر کے مشہور ہزال ہیں اور امام بخش تھا تیسری مصنف "معجزۂ نبی" جو بارہویں صدی کے بزرگ ہیں اور دلمیر میواتی جنھوں نے اپنا دیوان بہادر شاہ بادشاہ دہلی کی خدمت میں بھیجا تھا۔

پنجاب میں اردو کا نیا مرکز

پنجاب میں اردو کا نیا مرکز قائم ہوتا ہے۔ یہاں کے مصنفین میں سب سے مقدم مولانا عبدی ہیں جو 1074ھ میں بعہد عالمگیر "فقہ ہندی" تصنیف کرتے ہیں۔ "فقہ ہندی" کی اردو بالکل پنجابی نما ہے اور جملوں کی بندش بھی پنجابی طرز کی ہے۔ یہ تصنیف ہریانہ کرنال اور میوات کی زبان سے مختلف ہے۔ بارہویں صدی میں قصبہ بٹالہ (ضلع گورداسپور) میں اردو کا خاصا چرچا رہا ہے۔ یہاں اردو کی تحریک شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی (متوی 1151ھ) کے مبارک ہاتھوں سے پروان چڑھتی ہے۔ ان کے پیر بھائی شیخ نور بھی اس میں حصہ لیتے ہیں۔ شیخ فاضل الدین کے فرزند شاہ غلام قادر (متوفی 1176ھ) اردو مثنوی موسومہ بہ "رمز العشق" کے مصنف ہیں اور شاہ فقیر اللہ بھی اپنی اردو مثنوی 1204ھ میں اس کے تتبع میں لکھتے ہیں۔ بارہویں صدی کے نصفِ آخر میں پنجاب میں متعدد بزرگ ایسے نظر آتے ہیں جو اردو میں نظمیں لکھتے ہیں۔ شیخ محمد جان شیخ نصیر الدین محمد غوث بٹالوی نامدار خاں دت دلشاد پرسروری (پسروری) غلام قادر جلالپوریہ اور رام کشن کے نام اس ذیل میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ بٹالہ کی تحریک کا اس عہد کی دہلی میں اردو کی تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگرچہ دونوں مرکز قریب قریب ایک ہی زمانہ میں قائم ہوتے ہیں۔ پنجاب میں اردو نظم کا زیادہ رواج رہا ہے اور نثر نسبتاً کم ملتی ہے۔ تاہم نثر کے نمونے موجود ہیں۔ مثلاً کتاب "ہزار مسائل" اور رسالہ "سلوتری" جن کے مصنفین کا سراغ تا حال نہیں مل سکا ہے۔

اردو کا آخری، لیکن سب سے زبردست اور شاندار مرکز دہلی ہے جو ولی اورنگ آبادی کے اثرات میں قائم ہوتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد وہاں سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے کلکتے پہنچ کر عام ہو جاتا ہے۔

ہندی السنہ پر مسلمانوں کے احسانات

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندی السنہ کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کے بارے میں بھی چند کلمات اضافہ کر دیے جائیں۔ ایک ایسے زمانے میں جبکہ مسلمانوں پر برادرانِ وطن ہر قسم کے الزامات و اتہامات عائد کرنے کے عادی ہو رہے ہیں' ان کی تاریخ کو توڑ مروڑ کر مسخ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ان کے احسانات کو جو انہوں نے ہندوستان پر کیے' گلدستۂ طاقِ نسیاں بنایا جا رہا ہے' یہ بیان کرنا بالکل بے موسم معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلمان ہی ہیں جنہوں نے برادرانِ وطن سے پیشتر ہندی زبانوں کی تہذیب و ترقی پر توجہ دی ہے۔ اس ملک کے شمال و مغرب کی زبانوں یعنی پشتو' سندھی' کشمیری اور پنجابی کا قریب قریب تمام ادبی سرمایہ مسلمانوں کی کوششوں کا ممنون احسان ہے۔ بنگالی زبان اور اس کے ادبیات کو فروغ دینے والے مسلمان ہیں۔ برج' قنوجی اور اودھی کی ترقی میں بھی مسلمانوں نے خاصا حصہ لیا ہے۔ کبیر' قطبن اور محمد جائسی' تلسی داس اور سور داس سے پیشتر میدان میں آتے ہیں۔

اردو املا اور رسم الخط

آخر میں اردو املا کے متعلق چند الفاظ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ فارسی خط زمانہ قدیم سے ہندی اصوات اور ہندی السنہ کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ابتدا میں خط نسخ نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے لیے مخصوص تھا۔ چنانچہ پشتو' سندھی اور پنجابی آج بھی نسخ میں لکھی جاتی ہیں۔ عالمگیر کے بعد شمالی ہند میں نستعلیق رائج ہو گیا۔ خاص ہندی اصوات کے لیے علیحدہ علیحدہ علامات مقرر کی گئی ہیں اور مختلف زمانوں میں مختلف طریقوں سے لکھی جاتی ہیں۔ مثلاً ٹ' ڈ' ڑ پر پہلے تین تین نقاط' بعد میں چار چار نقاط لگائے جانے لگے۔ گجرات میں بارہویں صدی کی ابتدا میں ان پر ضرب "×" کی علامت لگائی جاتی تھی اور الف ممدودہ دو الف کی شکل میں لکھا جاتا تھا۔ نویں صدی ہجری میں گاف کے نیچے تین نقطے لگائے جاتے تھے' بعد میں اوپر لگانے لگے۔ ہائے مخلوط التلفظ کا استعمال بھی دیرینہ ہے۔ اردو کا آخری الف لاحقہ بتقلید فارسی "ہ" کی شکل میں لکھا جاتا تھا مثلاً لبھوڑہ' چونہ' سہرہ' کنہ' ہیرہ۔ اسی طرح مالوہ' بنگالہ اور بگلانہ وغیرہ۔

عہد عالمگیری میں ایک ترمیم

عالمگیر کے عہد میں فضائل خاں کے عرض کرنے پر کہ ہندی رسم الخط میں اسم و کلمہ کے آخر میں "ہ"

نہیں آیا کرتی بلکہ الف ہوتا ہے جسے کانا کہا جاتا ہے اور الف ہی کی طرح تلفظ کیا جاتا ہے' اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایسے الفاظ کو الف کے ساتھ لکھا جائے۔ عالمگیر نے یہ تجویز پسند کی اور حکم دے دیا کہ آئندہ ایسے کلمے الفاظ کے ساتھ لکھے جائیں یعنی مالوہ کو مالوا' بنگالہ کو بنگالا' وقس علیٰ ہذا۔ اس فرمان کی تعمیل نہ صرف شاہی دفاتر اور ٹکسالوں میں ہوئی بلکہ اردو خواں لوگوں نے بھی یہی املا اختیار کر لیا اور آئندہ لبھوڑا' چونا' سہرا' بجنا اور ہیرا لکھا جانے لگا۔

الف لاحقہ کے استعمال پر اردو اور پنجابی کا اشتراک

الف لاحقہ اردو میں ایسا الف ہے جو اکثر خاتمے کی غرض سے بڑھا دیا جاتا ہے۔ اردو اور پنجابی اس الف پر اس قدر مُصر ہیں کہ جہاں کہیں یہ حرف موجود نہیں ہے' اصل کلمہ میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ غیر زبانوں کے الفاظ پر بھی یہ عمل جاری رہتا ہے۔ مثلاً مرغ سے مرغا۔ یہی حالت نیول بھنوڑ' کویل اور بھوس کی ہے جو نیولا' بھوزا' کوکلا اور بھوسا بنا لیے گئے ہیں۔

حاشیہ:

1۔ سلطان فیروز شاہ تغلق 752ھ و 790ھ نے اپنے عہد میں ایک لاکھ سے زیادہ غلام جمع کیے تھے جو زیادہ تر مشرقی ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے۔ فیروز شاہ کے جانشینوں کے عہد میں یہ لوگ اس قدر طاقتور ہو گئے تھے کہ سیاسی معاملات میں دخیل ہو کر ملک میں فتنہ و فساد برپا کرنے لگے۔ ناصر الدین محمد شاہ 792ھ و 795ھ نے تنگ آ کر دہلی سے ان کا اخراج عام کر دیا اور حکم دے دیا کہ تین دن کے اندر اندر شہر خالی کر دیں۔ اگر اس کے بعد نظر آئیں تو قتل کر دیے جائیں۔ اس سخت حکم کے باوجود اس جماعت کے متعدد ارکان دہلی ہی میں مقیم رہے اور جب گرفتار ہوئے تو اپنے آپ کو دہلی کا اصل باشندہ بیان کیا۔ محمد شاہ نے اصلی دہلوی اور پوربی و بنگالی کی شناخت کے لیے ان سے لفظ ''کھرا کھڑی'' کہلوایا۔ چونکہ مشرقی ہند کے لوگ ہائے مخلوط التلفظ کے ادا کرنے میں عام ہندوستانیوں سے مختلف ہیں اس لیے یہ غلام دہلویوں سے آسانی کے ساتھ پہچان لیے گئے اور تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

اردو

لفظ اردو ایران میں مغول عہد کی یادگار ہے اور منصف قرن ششم میں فارسی زبان میں رائج ہو جاتا ہے۔ اس کے معنی امراء و سلاطین کی فرودگاہ یا کیمپ ہیں۔ تاریخوں میں سب سے پیشتر یہ لفظ "جہاں کشائے جوینی" میں ملتا ہے، جس سے دو اقتباس یہاں درج کیے جاتے ہیں:

"و ہر سال کہ قوبے شخصے را برق رسد قبیلہ و خانہ او را از میان خیلاں بیروں کنند تا مدت سہ سال و بار دوے شہزادگان در نتوانند آمد" (ص 162۔ جلد اول) "تمامت پادشاہزادگان در خدمت و بندگی قاآن بیرون اردو سہ نوبت آفتاب راز انو زدند و باز درا ندرون اُردو آمدند و مجلس لہو و طرب آراستند" (ص 148۔ جلد اول)

ہندوستان میں اس لفظ کا استعمال بابر کے عہد سے ہونے لگا ہے۔ "تزک بابری" سے ذیل کی مثال ملاحظہ ہو:

"در وقت رسیدن نزد بامیان چادر ہائے اوروق مارا کہ عقب ماندہ بودمی بینند مارا خیال کردہ زود بری گردند۔ بہ اردوے خود رسیدہ ہیچ چیز تقید نشدہ کوچ می کنند۔"
(ص 116۔ طبع ملک الکتاب)

مگر زبان کے معنوں میں اس کا استعمال چنداں قدیم نہیں ہے۔ اس کو رواج میں آئے سو سوا سو سال کا عرصہ کم و بیش گذرتا ہے۔ ادبیات میں سب سے پیشتر میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے یہ نام اختیار کیا۔ چنانچہ "نوطرز مرصع" تالیف 1213ھ کا یہ فقرہ:

"اور یہ جو کوئی حوصلہ سیکھنے زبان اردوے معلی کا رکھے گا، سو مطالعہ اس گلدستہ نگاریں کے سے ہوش اور شعور فحوائے کلام حاصل کرے گا۔"

میر امن نے بھی تحسین کی تقلید میں یہی نام رکھا۔ چنانچہ "باغ و بہار" 1217ھ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"حقیقت اردو کی زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے۔" (ص 4)

اس کے بعد یہ لفظ عام ہو گیا۔ "دریائے لطافت" تصنیف 1223ھ میں میر انشا اللہ خاں اور قدرت اپنے تذکرے میں اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔

انشا کہتے ہیں:

''بالجملہ زبان اردو مشتمل است بر چند زبان یعنی عربی و فارسی و ترکی و برجی وغیرآں۔''

قدرت کہتا ہے:

''کہ شما زبان دکھنی را گذاشتہ ریختہ را موافق اُردوے معلی شاہجہاں آباد موزوں بکنید۔''

مولوی اکرم علی ''اخوان الصفا اُردو'' تالیف 1225ھ میں لکھتے ہیں:

''رسالہ اخوان الصفا کہ انسان و بہائم کے مناظرہ میں ہے، تواس کا زبان اردو میں ترجمہ کر لیکن نہایت سلیس کہ الفاظ مغلق اس میں نہ ہوویں۔''

غازی الدین حیدر والیٔ اودھ کے دور میں محمد بخش مجہور ''نورتن'' کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

''اگر چہ اس نالائق رو خلائق نے سابق میں انشاء گلشنِ نوبہار غیرت گلزار اور انشائے چار چمن دل لگن پر از قصص دلفریب و فسانہائے عجیب بعبارت رنگین اور مضمون نو آئین زبانِ اُردو میں تحریر و تسطیر کی ہیں۔''

حاجی نعمت اللہ اپنی تفسیر سورہ یوسف میں تحریر کرتے ہیں:

''غرض اس فائدوں کی امید پر بیچ لکھنے ترجمہ ہندی از روئے کتاب احسن القصص کے مشغول ہوا اور وجہ نزول اس سورت متبرکہ کے اور عجوبات اور لطائفات کہ بیچ سمجھ نادان کے آئے اپنی زبان روزمرہ کے میں جمع کی اور مقید زبانِ اردو کا ہوا۔''

وجہ تسمیہ

اسی کی وجہ تسمیہ کے متعلق صاحب ''ظہیر الانشا'' لکھتے ہیں:

''چوں بازار اردو ترکی و فارسی اردو گویند ضرورتِ استعمال ایں زبان مرکب در بازار ہا ضرور تر شد خصوصاً در بازار خاص پادشاہی کہ بہ تعظیم نام بازار خاص اردوے معلی بود۔ لہٰذا نامزد تازہ مرکب نیز اردوے معلی قرار یافت تا ایں کہ بانقراض ازمنہ آں تخصیص آداب شاہی باقی نماند آں التزام لفظ معلی ہم نماند فقط اردو باقی ماند پس وجہ تسمیہ اُردو ہمیں است و اسم با مسمیٰ ریختہ است یعنی زبان عربی و فارسی دریں ریختہ اند۔''
(منقول از جلوہ خضر)

میر امن کی بھی قریب قریب یہی رائے ہے۔ کہتے ہیں:

"آخر امیر تیمور نے، جن کے گھرانے میں اب تک نام سلطنت کا چلا آتا ہے
ہندوستان لیا۔ ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا۔ اس واسطے شہر
کا بازار اردو کہلایا...... جب حضرت شاہجہاں صاحب قران ثانی نے قلعہ مبارک اور
جامع مسجد اور شہر تعمیر کروایا......اور شہر کو دارالخلافت بنایا۔ تب شاہجہاں آباد مشہور ہوا۔
اگرچہ دلّی جدی ہے۔ وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے اور وہاں کے بازار کو اردوئے
معلّی خطاب دیا۔" (ص 4)

سرسید احمد خاں بھی اپنی تصنیف "آثار الصنادید" میں انہی بزرگوں کے ہم آواز ہیں:

"اور جو کہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروّج تھی۔ اس واسطے اس کو زبان
اردو کہا کرتے تھے اور بادشاہی امیر اُمرا اسی کو بولا کرتے تھے۔ گویا کہ ہندوستان کے
مسلمانوں کی یہی زبان تھی۔ ہوتے ہوتے خود اس زبان ہی کا نام اردو پڑ گیا۔"

مؤلف "فرہنگِ آصفیہ" کہتے ہیں:

"چونکہ اوّل اوّل اس کی شاہجہانی لشکر سے ابتدا ہوئی' لہٰذا اس کا نام بھی اردو پڑ
گیا۔ قلعہ معلّی کے لاہوری دروازہ کے سامنے اردو بازار کے نام سے ایک بازار بھی آباد
ہوگیا جو بلاقی بیگم کے کوچے اور چاندنی چوک کی سڑک کے جنوبی پہلو پر واقع تھا۔"

اردو بازار

ان بیانات میں قریب قریب اکثر اساتذہ اس امر پر متفق ہیں کہ دہلی کے اردو بازار کی بنا پر اس زبان کا نام اردو زبان ٹھہرا۔ ان کا یہ خیال ممکن ہے کہ صحیح ہو۔ یہاں اردو بازار کے متعلق چند الفاظ کہنے ضروری ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دہلی میں ایک بازار کا نام اردو بازار تھا جو قلعے سے ملحق تھا' لیکن اس کا پہلا نام لاہوری بازار تھا۔ "آثار الصنادید" میں سید احمد خاں خونی دروازے کے ذکر کے بعد کہتے ہیں:

"اور اس کے آگے بڑا بازار جس میں چاندنی چوک وغیرہ سب بازار شامل ہیں
مگر اگلے زمانہ میں یہ بازار لاہوری یا اردو بازار کہلاتا تھا...... یہ بازار قلعہ کے لاہوری
دروازے سے فتح پوری تک ہے۔ اس بازار کے پہلے حصہ کو تو اردو بازار کہتے ہیں اور
اس کے آگے جہاں ترپولیہ اور کوتوالی ہے' وہ اسی نام سے مشہور ہے اور اس کے آگے
چاندنی چوک کہلاتا ہے اور اس کے آگے فتح پوری کا یہ بازار ہے۔ چالیس گز کے عرض
سے بیس گز اِدھر اور بیس گز اُدھر بیچ میں سرتا سر نہر جاری ہے اور گرد نہر کے دو رستہ
درخت لگے ہوئے ہیں۔"

صاحب ''سیر المتاخرین'' اسی بازار کے بیان میں فرماتے ہیں:

''غرض اس بازار میں دو طرف دکانیں گول کرسی دار بہت موزوں وخوش قرینہ ہیں اور اس کے سقف و بام پر بالا خانے یک منزلہ اور دو منزلہ اور بیچ میں اس کے دو سڑکوں کو سنگ ریزہ اور بجری سے ایسا پختہ و مصفا کیا ہے کہ آدمیوں کا منہ اور عمارت کا چہرہ اس میں مثال آئینہ کے دکھائی دیتا ہے۔ ہر روز اس پر آب پاشی ہوتی ہے۔ اہل گزر کی روح تازی ہوتی ہے اور مابین دونوں سڑکوں کے نہر جاری ہے اور کناروں پر سر درختی ہے کہ اس کی ہیئت مجموعی جدول بین السطور کتاب نظر آتی ہے۔''

(ص 503)

لاہوری دروازے کی رعایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں اس بازار کا نام لاہوری بازار تھا۔ بعد میں معسکر کی رعایت سے اردو بازار کہلانے لگا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ بازار 1857ء میں برباد کر دیا۔ چنانچہ مرزا غالب ''اردوئے معلیٰ'' میں میر مہدی کے نام ایک خط لکھتے ہیں:

''واہ رے حُسنِ اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا اردو بازار نہ رہا۔ اردو کہاں۔ دلی کہاں' واللہ اب شہر نہیں کیمپ ہے چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔'' (ص 1184 اکمل المطابع)

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''تم اردو کے مرزا قتیل بن گئے ہو۔ اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے تھے' رود نیل بن گئے ہو۔'' (ص 174)

تعجب ہے کہ اردو ایک بازار کا نام ہونے سے زبان کا نام اردو رکھ دیا گیا' لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کوئی قدیم نام نہیں ہے' نہ قدما اس کا ذکر کرتے ہیں' نہ شعرا اس سے واقف ہیں' نہ تاریخوں میں اس کا ذکر آتا ہے۔ اس کی قدامت کی تائید میں البتہ ایک بیان ملتا ہے جو حکیم شمس اللہ صاحب قادری نے ''اردوئے قدیم'' میں دیا ہے۔ وہو ہذا:

''موید الفضلاء سے (جو فارسی کی ایک مستند لغت ہے اور بابر کی آمد سے ایک عرصہ پہلے سلطان ابراہیم کے عہد میں لکھی گئی) ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان میں اسلامی لشکر گاہیں اردو کہلاتی تھیں اور زبان اردو کو اہل اردو کی زبان کہا کرتے تھے۔ چنانچہ کتاب مذکور میں ایک مقام پر تحریر ہے:

'در زبان اہل اردو خون خرابا نامند''

یہ بیان میں خیال کرتا ہوں حکیم صاحب ممدوح نے نولکشور کی مطبوعہ ''موید الفضلاء'' سے لیا ہے لیکن یہ نسخہ اگرچہ مالکان مطبع اس کو مصنف کا دستخطی بیان کرتے ہیں' مصنف کے عہد سے بہت بعد کا نوشتہ ہے۔

جب قلمی نسخوں سے اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو اس میں سینکڑوں الفاظ ایسے ملتے ہیں جو قلمی نسخوں میں موجود نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نول کشور نے کوئی ایسا نسخہ چھاپا ہے جس میں کسی غیر شخص نے بعد میں بہت کچھ اضافہ کر دیا ہے۔ مثلاً لفظ برسم کی تشریح میں وہ کہتا ہے:

''وفقیر گوید کہ ایں لغت را از مجوسے کہ در دین خود بعنایت فاضل بود و آ روشیر نام داشت و در عہد محمد اکبر شاہ از کرمان بہندوستان آمدہ بود تحقیق نمودم۔'' (ص 159)

اب یہ بیان صاحب ''موید الفضلاء'' کا نہیں ہو سکتا' اس لیے کہ وہ اپنی تصنیف 925ھ میں ختم کر چکا ہے اور یہ شخص اکبر کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت زندہ نہیں تھا۔ دوسرے یہ جملہ یعنی ''درزبان اہل اردو خون خرابا نامند'' مجھ کو ''موید الفضلاء'' کے قلمی نسخہ میں نہیں ملا اور کوئی تعجب نہیں۔ اگر مطبع نول کشور کے مصحح نے اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہو۔ اردو سلاطین کے لشکر گاہوں کو کہتے تھے۔ اس معنی میں مغلیہ عہد کے تمام مورخ اس لفظ کا استعمال کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اکبر کے بعض ایسے سکوں پر جو اثنائے سفر لگائے جاتے تھے' اکثر اوقات ''ضرب اردوئے ظفر قرین'' ہوتا تھا۔ اس کے بعض مسی سکوں پر ایک طرف ''اردوئے ظفر قرین'' اور دوسری طرف ''ضرب الف فلوس'' ہوتا تھا۔

جب ہم تحسین کے پیشروؤں کی تصنیفات دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگ اردو اور اردوئے معلی کے نام تک سے روشناس نہیں۔ استعمال میں لانا کجا' وہ اس کو ہندی کے نام سے پکارتے ہیں یا ریختہ کے نام سے۔ چنانچہ میر جعفر زٹلی جن کا عہد عالمگیر سے لے کر فرخ سیر کے دور تک ہے' اس کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ اپنی تصنیف ''زٹل نامہ'' کے خاتمہ میں جو شامل کلیات ہے' لکھتے ہیں:

''اگرچہ سبھی کوڑہ و کرکٹ است　　　ہندی و رندی زباں لٹ پٹ است''

شاہ حاتم اپنے ''دیوان زادہ'' میں جو 1169ھ کی یادگار ہے' اپنے متعلق لکھتے ہیں:

''در شعر فارسی پیرو صائب است و در ریختہ ولی را اُستادی داند'' (از فہرست اشپرینگر۔ ص 611)

میر اثر اپنی مثنوی میں جو بی زمانہ ''خواب وخیال'' کے نام سے مشہور ہے اور 1153ھ اس کی تاریخ تصنیف ہے' لکھتے ہیں:

ایک تو ریختہ ہے سہل زباں　　　دوسرے جب کہ ہو بشوخی بیاں

دیگر: فارسی سو ہیں ہندوی سو ہیں　　　باقی اشعار مثنوی سو ہیں

دیگر: ریختہ نے یہ تب شرف پایا　　　جب کہ حضرت نے اس کو فرمایا

مرتبہ ریختہ کا اور ہوا　　　معتبر فارسی کے طور ہوا

مرزا سودا ''تنبیہ الغافلین'' میں حوالۂ قلم کرتے ہیں:

"وخدا عالم است ایں چند بیت ریختہ از قبیل قصیدہ و غزل بچہ سبب حسن قبول یافتہ است۔"

نثر کے علاوہ نظم میں بھی وہ ریختہ ہی رکھتے ہیں۔ چنانچہ بعض امثال:

تو نے وہ سودا زبان ریختہ ایجاد کی
پڑھ کے اک عالم اُٹھاتا ہے ترے اشعار فیض
(ص227)

دیگر:

ریختہ اور بھی دنیا میں رہے اے سودا
جیسے دیوے جو کبھو کاوش دوراں مجھ کو
(ص250)

دیگر:

کہنے لگے ریختہ جو کوئی سودا کی طرح
اس پہ زمیں سے ہوتا لوح و قلم واہ واہ

دیگر:

سخن کو ریختہ کے پوچھے تھا کوئی سودا
پسند خاطر دلہا ہوا یہ فن مجھ کو

دیگر:

شعر نا موزوں سے تو بہتر ہے کہنا ریختہ
کب کہا میں نقل کر مضموں کسی کا ریختہ
بے حیائی ہے یہ کہنا سن کے میرا ریختہ
خون معنٰی تا رفیع باد پیا ریختہ
آبروئے ریختہ از جوش سودا ریختہ
(ص356)

دیگر:

ریختہ کی جو وہ کہے ہے غزل
لفظ و معنی میں کم ہے اس کے خلل
(ص370)

یہی حالت میر تقی میر کی ہے۔ میں ان کے کلیات سے ذیل کی بعض امثال یہاں حوالہ قلم کرتا ہوں:

گفتگو ریختہ میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے
(ص131)

دیگر:

مضبوط کیسے کیسے کہے ریختے و لے
سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں
(ص445)

دیگر:

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختے کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے
(ص139)

قائم فرماتے ہیں:

قائم۔ میں ریختہ کو دیا خلعت قبول
ورنہ یہ پیش اہل ہنر کیا کمال تھا

اور جرأت:

کہہ غزل اور اس انداز کی جرأت اب تو
ریختہ جیسے کہ اگلی تری مشہور ہوئی

سید غلام علی عشرت ''پدماوت'' اردو مصنفہ 1211ھ کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

''انہوں نے قصہ راجہ رتن سین اور پدماوت کا کہ زبان پوربی میں تصنیف مولانا ملک محمد جائسی کا ہے زبان ریختہ میں تصنیف کرنا شروع کیا۔''

شاہ عبدالقادر دہلویؒ اپنے ترجمہ ''قرآن پاک'' 1205ھ میں فرماتے ہیں:

''اول یہ کہ اس جگہ ترجمہ لفظ بہ لفظ ضروری نہیں کیونکہ ہندی ترکیب عربی سے بہت بعید ہے۔ اگر بعینہ وہی ترکیب رہے تو معنی مفہوم نہ ہوں۔ دوسرے یہ کہ اس میں زبان ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف کی کہ عوام کو بے تکلف دریافت ہو۔''

یہی نہیں بلکہ ریختہ اور ہندی کا استعمال میر امن کے دور کے بعد تک ہوتا رہا ہے۔ مولوی خرم علی ''نصیحت المسلمین'' تالیف 1238ھ میں لکھتے ہیں:

''بندہ خرم علی کے دل میں آیا کہ اس شرک کی برائی قرآن شریف سے ثابت کیجیے اور ہر آیت کا ترجمہ ہندی زبان میں صاف صاف بیان کریئے تا کہ ہر ایک کو فائدہ عام ہو۔''

ردِ سماع میں ایک رسالے کا ترجمہ 1246ھ میں کیا گیا تھا' اس میں سے فقرۂ ذیل ملاحظہ ہو:

''لیکن عام اس کی فہمید سے عاجز تھے۔ اس لیے ریختہ زبان میں اس کے ترجمہ کرنے کا اتفاق ہوا۔''

غالب فرماتے ہیں:

ریختہ کے تمہی استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

(دیگر) شیفتہ ''گلشنِ بے خار'' میں لکھتے ہی:

''تذکرہ ترتیب یافتہ مشتمل بر اشعار موزونان فصاحت گستر ریختہ گویان بلاغت طراز بغایت مختصر۔''

ریختہ کی وجہ تسمیہ

ریختہ کی وجہ تسمیہ میں ہمارے تذکرہ نگاروں نے حسبِ معمول عجیب عجیب خیال آرائیاں کی ہیں۔ منشی درگا پرشاد صاحب نادر ''خزینۃ العلوم'' میں کہتے ہیں:

''ریختہ بمعنی گرے ہوئے کے ہیں۔ پس جو زبان اپنی اصلیت سے گر جائے' اس کو زبان ریختہ بولتے ہیں۔ چنانچہ جیسے فارسی زبان میں عربی کے لغت شامل ہوئے اسے زبان ریختہ فارسی کہتے ہیں۔ اسی طرح حسب تقریر بالا زبان ریختہ ہندی کو زبانِ اردو سمجھتے ہیں۔'' (خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم' ص 49 مفید عام' لاہور 1879ء)

حضرت آزاد ''آب حیات'' میں فرماتے ہیں:

''اس زبان کو ریختہ کہتے ہیں کیونکہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے' جیسے دیوار کو اینٹ' مٹی' چونا' سفیدی وغیرہ پختہ کرتے ہیں یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں گری پڑی پریشان چیز۔ چونکہ اس میں الفاظ پریشان جمع ہیں' اس لیے اسے ریختہ کہتے ہیں۔''

صاحب ''جلوۂ خضر'' کا بیان ہے:

''اس زبان کا نام ریختہ شاہجہاں کے وقت میں رکھا گیا۔ چونکہ ریختہ گچ کو کہتے ہیں' پختگی کے لحاظ سے اس کو ریختہ کہنے لگے۔''

ہمارے مخدوم حضرت سرخوش ''اعجازِ سخن'' میں رقم فرما ہیں:

''اگر چہ لفظ ریختہ کے فارسی میں کئی معنی ہیں مگر زبان کے تعلق میں فطرتاً اس سے ٹوٹا پھوٹا یا شکستہ ہی مراد لی جا سکتی ہے۔''

ریختہ کے معنی

ان بیانات میں ریختہ کے پہلے معنی گرے پڑے اور پریشان کے بتاتے ہیں۔ فارسی میں بے شک یہ معنی مستعمل ہیں مثلاً شکست و ریخت یا شکستہ و ریختہ' لیکن یہاں یہ معنی قطعاً ناموزوں ہیں۔ دوسرے معنی چونہ سفیدی وغیرہ کے دیے ہیں۔

اصطلاحِ عمارت

اس میں شک نہیں کہ ریختہ تعمیرات کی ایک اصطلاح ہے جس کا اطلاق عمارت پختہ و سنگین' برخلاف عمارت گلیں و چوبیں پر ہوتا ہے' اس لیے اس کا استعمال چونہ اور استرکاری پر بھی ہونے لگا' جس سے عمارت پختہ و مضبوط ہو جاتی ہے۔

شمس سراج عفیف اپنی ''تاریخ فیروز شاہی'' میں حصار فیروزہ کی آبادی کے بیان میں اس کی خندق کی تعمیر کے متعلق کہتے ہیں:

''بعد از مرتب شدن حصار خندق کاویدند ایں چنیں کہ بعد از تہ خندق و باہر دو بازوئے خندق ریختہ برآوردند و بالائے بازوہائے خندق کنگرہ بستند۔'' (ص 126)

دوسرے مقام پر یہی مورخ بیان کرتا ہے:

''دریں پنج کروہ آبادانی از ہر یک کروہ بکروہ کردہ بود خلائق بے علائق خانہا ریختہ و گچ کردہ برآوردہ۔'' (ص 135)

تیسرے مقام پر یہ لفظ یوں آیا ہے:

''آں عمارت بصنعت کاریگراں اہل مہارت و بصارت از سنگ گھر سنگ (یا کھرسل) با چونہ ریختہ برآوردہ'' (ص 310)

چوتھے موقع پر یہ فقرہ ملتا ہے:

''الغرض در ہر محلے و مقامے کہ عمارت کردہ ہم از ریختہ برآوردہ و از جنس چوبینہ برائے نام نے نگر ہمیں تختہائے در۔'' (ص 331)

ان چاروں فقروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ریختہ کے معنی پکی تعمیر کے لیے گئے ہیں' برخلاف کچی تعمیر

کے جو مٹی یا لکڑی کی ہو۔ یعنی ریختہ ایسی تعمیر ہے جو چونہ پتھر سے تیار ہو۔ سودا ایک مقام پر کہتے ہیں:

ہر بیت رکھے ہے یہ غزل ایسی ہی مضبوط
سودا کوئی جوں ریختہ کے گھر پہ کرے گچ

دوسرے مقام پر کہتے ہیں:

مظہر کا شعر فارسی اور ریختہ کے بیچ
سودا یقین جان کہ روڑا ہے باٹ کا
آگاہ فارسی تو کہیں اس کو ریختہ
واقف جو ریختہ کے ذرا ہووے ٹھاٹ کا
سن کر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ ہے یہ
اور ریختہ بھی ہے تو فیروز شاہ کی لاٹ کا

لیکن زبان کے سلسلے میں ریختہ کے یہ معنی بھی نامناسب ہیں۔

مصدر ریختن

ہمیں یاد ہے کہ ریختن فارسی زبان میں متعدد معنوں میں آتا ہے اور معنوں سے قطع نظر وہ (1) بنانے ایجاد کرنے (2) کسی چیز کو قالب میں ڈھالنے نئی چیز بنانے اور (3) موزوں کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے۔

مثال اول نظیری:

وانگہ از الماس بہر جان ما
تیغ ابرو ریخ مژگاں ریختند

(دیگر) باقر کاشی:

شاید از عہدۂ غمہائے تو آیم بیروں
تنے از روئے بریزم ولے از خارہ کنم

مثال معنی دوم:

برائے ریختن توپ تازہ شد تعیین
بشاہراہ عقیدت زصدق شد پویاں

(دیگر) نظیری:

ہر طرف رنگے بگل بسرشتہ شد
قالب گبر و مسلماں ریختند

اسی سے ریختہ گر نکلا ہے جو چیزوں کو ڈھالتا اور بناتا ہے۔ سعید اشرف:

خود بخود بادۂ عیش از قدحم می ریزد
گوئیا جام مرا ریختہ گر ساختہ است

مثال معنی سوم:

مصرع زلف بتاں جو بر زبان شانہ ریخت
موشگافان را کلید گفتگو دندانہ ریخت

یہی حالت مصرع ریختہ و معنی ریختہ کی ہے۔ اس کا اطلاق ایسے مصرع یا معنی پر ہوتا ہے جو بے تکلف ذہن میں آجاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ مصرع موزوں و معنی موزوں کے معنی دیتا ہے۔ ملاطغرا:

داریم چوں شانہ صبر تا روئے دہد
چوں مصرع زلف مصرع ریختہ

یہیں سے وہ محاورہ نکلا ہے "فلاں ریختہ ایں کار ست" یعنی اس کام کے لیے موزوں ہے۔ شغف:

می سوزم و می گدازم و می گریم
چوں شمع شغف ریختہ ایں کارم

ریختہ موسیقی کی اصطلاح

آخری معنی کے اثرات میں ریختہ نے ساتویں قرن ہجری میں ہندوستان میں نئے معنی پیدا کر لیے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب امیر خسرو دہلوی نے ایرانی اور ہندی موسیقی کے اتحاد سے ایک نئی چیز تیار کی اس کے لیے انہوں نے بعض نئی اصطلاحات مثلاً قول، ترانہ، معروفی، صوت، بسیط، دو بحر، چہار اصول، نقش، فارسی اور غزل وغیرہ وغیرہ وضع کیں۔ اسی سلسلے میں انہوں نے ریختہ کی اصطلاح بھی وضع کی۔ اس اصطلاح سے موسیقی میں یہ مقصد قرار پایا کہ جو فارسی، خیال ہندوی کے مطابق ہو اور جس میں دونوں زبانوں کے سرود ایک تال اور ایک راگ میں بندھے ہوں، اس کو ریختہ کہتے ہیں۔ ریختہ کے لیے کسی پردے کی قید نہیں ہے۔ وہ ہر پردے میں باندھی جاتی ہے۔ میری اطلاع کا ماخذ "کتاب چشتیہ" ہے جو مخدوم علاء الدین ثانی برناوی نے 1065 ہجری میں تصنیف کی ہے۔ اس کتاب کا اصل نسخہ بحالت تباہ راقم کو مل گیا ہے۔ مخدوم علاء الدین جانشین ہیں، خاتم التارکین حضرت شیخ بہاء الدین برناوی متوفی 1030ھ کے، جو فن موسیقی میں امیر خسرو کے بعد ہندوستان میں بے نظیر مانے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ "راگ درپن" میں فقیر اللہ نے موسیقی دانوں میں سب سے پیشتر آپ ہی کا ذکر کیا ہے۔ مخدوم علاء الدین اپنے پیر و مرشد مخدوم بہاء الدین کی سند پر امیر خسرو کی خدمات موسیقی کے ذکر ریختہ کے متعلق کہتے ہیں:

''واصطلاح دیگر آنکہ ہرفارسی کہ بامضمون خیال ہندوی مطابق باشد والفاظ ہردو زبان رادر یک تال ویک راگ بربست نموده باشد وانضمام واتصال داده سرایند آں راریختہ گویندوایں ریختہ رادر ہرپردہ می بندندوذوق ولذتے افزوں می دہد۔''

اس عبارت میں خیال کسی شرح کا محتاج نہیں کیونکہ اب بھی موسیقی میں اس کا رواج ہے۔ رہی فارسی اس کے لیے مخدوم علاء الدین فرماتے ہیں:

''فارسی اصطلاحی آں رانام نہند کہ یک بیت رابا تاناتلی مقروں ساختہ بربست کنند۔''

گویا ریختہ کا اطلاق ایسے سرود پر ہوتا تھا جس میں ہندی اور فارسی اشعار یا مصرعے یا فقرے جو مضمون' تال اور راگ کے اعتبار سے متحد ہوتے تھے' ترکیب دے دیئے جاتے تھے۔ اس کی مثال میں امیر خسرو کی وہ غزل بتائی جاسکتی ہے' جس کا مطلع ہے:

زحال مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
چوتاب ہجراں ندانم اے جاں نلیھو کاہے لگائے چھتیاں

شیخ بہاء الدین حاجی بن معزالدین متوفی 912ھ شیخ رحمت اللہ گجراتی کے مرید تھے۔ باجن تخلص تھا اور فارسی و ہندی میں شعر کہتے تھے۔ انہوں نے اپنی ایک تالیف میں جو مریدوں کی ہدایت اور اپنے مرشد کے حالات میں لکھی ہے' فقراتِ ذیل کو ریختہ کے نام سے یاد کیا ہے:

یہ صوفی سر الٰہی ایں مرتبہ دارد شاہی
یہ مظہر عین خدائی
دراں مجلس کہ مظہر عین خدا باشد آنجا عین شین خدا باشد
آنجا بارد رحمتہ اللہ
آنجا ساقی رسول اللہ آنجا ہمہ اللہ باشد نہ غیر اللہ

شیخ باجن اس سرود کو ریختہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میں انہی کی تصنیف سے ایک اور مثال دیتا ہوں:

باجن یہ وہ روپ نہوئے جو کوئی بکھانے
بکھانے آپ کو جیوں سبہ کوئی جانے
آں نرویست کہ من وصف جمالش دانم
ایں حدیث از دگراں پرس کہ من حیرانم
باش تا جاں بروو در سر آں یار لطیف
کہ بکارے بہ ازیں کار نیاید جانم

شیخ جمالی عہد ہمایوں و شیر شاہ کے شاعر ہیں۔ ان کے نام پر یہ ریختہ مشہور ہے جو بعض تذکروں اور

بیاضوں میں امیر خسرو کی طرف منسوب ہے:

...... ہر دو تیرا کتا ہے
موتیا شد بر در تو ستا نہ ہے
خوار شدم زار شدم لت گیا
در رہ عشق تو کر تا ہے
گرچہ بدم گفت رقیب کتن
اس کا کہا مت کرو یہ جتا ہے
گاہ شگفتہ کہ جمالی تو بیۃ
تہم کرو کیا اپنا کرم پچتا ہے

شیخ سعدی دورِ اکبری کے ایک بزرگ ہیں جن کو غلطی سے عوام شیخ سعدی شیرازی مانتے ہیں۔ ان کا ریختہ اکثر تذکرہ نویسوں نے نقل کیا ہے۔ میں مقطع پر قناعت کرتا ہوں:

سعدی کہ گفتہ ریختہ در ریختہ در ریختہ
شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

گویا اس عہد تک ریختہ کے معنی گیت کے لیے جاتے تھے۔ ہندی موسیقی کی سرپرستی چونکہ اکثر سلاطین و مشائخ نے کی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ متعدد فارسی اصطلاحات اس میں داخل ہو گئی ہیں۔ چنانچہ ریختہ بھی ہندی موسیقی میں موجود ہے۔ ہندی زبان میں ہم ریختہ کی سرگذشت سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ تاہم اس قدر یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ ریختہ وضع ہونے سے عنقریب بعد ہی ہندی موسیقی میں پہنچ گیا ہے۔ حتیٰ کہ بعض ریختے شاہ کبیر داس کی طرف منسوب ہیں۔ ہندی لغات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی شعراء نے بحر مضارع مثمن اخرب مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن کا نام ریختہ رکھ دیا ہے۔ جس کی مثال ذیل میں عرض ہے:

سن لے یشودا رانی' تو لال کی بڑائی
سب لوک لاج وا نے' یمنا میں دھو بہائی
بھوریں ہی میں گئی جو' جل بھروے کاج بہینا
پیچھے سوں آ' اچانک' ان موندے میرے نینا
ڈرپی میں ہائے کو ہے' تب بولے نیڈے بینا
ہوں تو رہی اکیلی' وا سنگ گوال سینا
تب سب نے ہاہو کر کے تاری مری بجائی

ہس ہس کے چھیل موسوں کروے ٹھٹھولی
یہ چھب تمہارے مکھ کی اب کاسوں جاوے تولی
نرکھے کبھی بدن کو کبھوں وہ چھووے چولی
میں تو سیج کی ماری وا سوں کچھو نبولی
پن بہیاں میری ٹنکی گگری دھرن گرائی

انگیا کے بند تورے چندری شڈاک پھاری
ولری کے نرکھو یکوں گل بہیاں میرے ڈاری
یہ سب کپال دیکھیں مگ ٹھاڈے پرکھ ناری
تاہوں پہ نام میرؤ لے کر سناوے گاری
گرجن میں میری وا نے یا دوہ کری ہنسائی

کبھوں کہے پیاری تو کیوں اکیلی ہوئی
کے گھر میں تیرے پت کی تو سوں بھی لرائی
تو چل بھون ہمارے کرمو سوں مترتائی
بدھنا نے موری توری جوری بھلی بنائی
نادان وا کی باتیں سن کے میں ات لجائی

(برج بہار۔ ص43و44)

بعض وقت مصرع کے آخری رکن فاعلاتن میں سبب خفیف گرا کر فاعلن لے آتے ہیں۔ ''راس رتناولی'' میں ایسی متعدد مثالیں میری نظر سے گذری ہیں۔ قدیم زمانے میں ریختہ صرف بحر مضارع ہی میں محدود نہ تھا بلکہ اور بحروں میں بھی لکھا جاتا تھا۔

ریختہ بمعنی کلام منظوم

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد ریختہ نے موسیقی سے نکل کر عمومیت حاصل کر لی اور اس کا اطلاق ایسے کلام منظوم پر ہونے لگا' جس میں دو زبانوں کا اتحاد ہو۔ چنانچہ شیخ باجن' شیخ جمالی اور شیخ سعدی کے ہاں ریختہ کا یہی مفہوم ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ریختہ ایسی نظم ہوتی تھی جس میں ہندی' فارسی کے اشعار یا فقرے متحد ہوتے تھے۔ یہاں ایک مثال بارھویں قرن ہجری کے ریختہ کی دی جاتی ہے جو خواجہ حافظ کی مشہور غزل کی تضمین ہے۔ ریختہ:

سوکھ چین کے منڈل موں، سبھ جا کرو پکارا
دل می رود زدستم صاحب دلاں خدا را
اکھیاں نے جھڑ لگایا، رسوا کریں گی آخر
دردا کہ راز پنہاں، خواہد شد آشکارا
اے رگ تک من وے دل کی مراد یوں ہے
باشد کہ باز بینم، آں یار آشنا را
دو دن کی زندگانی مت کر جفا کسی پر
نیکی بجائے یاراں، فرصت شمار یارا
تن من کیا ہے لوہو، لوہو کیا ہے پانی
دلبر کہ در کف او، موست سنگ خارا
اکثر گناہ کرکے، اب ہو رہے ہیں تائب
اے شیخ پاک دامن، معذور دار ما را
اندر سرائے گلشن، بلبل پکارتی ہے
ہات الصبوح ہیوا، یا ایہا السکارا
محتاج یک نظر کا، دربار پر کھڑا ہوں
روزے تفقدے کن، درویش بے نوا را
دنیا کا فکر مت کر، کہتا میں خواجہ حافظ
کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدا را

ریختہ کی قسمیں:

میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں ریختہ کی چار قسمیں کی ہیں:

(1) یہ ہے کہ ایک مصرع ہندی ہو اور ایک مصرع فارسی، جیسی تضمین بالا۔

(2) یہ ہے کہ نصف مصرع ہندی ہو اور نصف فارسی۔

(3) یہ ہے کہ اس میں فارسی کا عنصر حرف و فعل کی صورت میں ہو۔

(4) وہ ہے، جس میں صرف فارسی کی ترکیبیں پائی جائیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم میر صاحب کی اپنی اپج ہے اور عام طور پر رائج نہیں تھی۔ ریختہ کی غزلوں میں یہ تقسیمیں مخلوط شکل میں عام طور پر ملتی ہیں۔

گیارہویں صدی میں ریختہ کا اطلاق بالعموم اُردو نظم پر ہونے لگا۔ چنانچہ ذیل کی غزل بھی ریختہ ہے:

جاناں رحم فرماؤناں، یا مجہ بلایا آؤناں
اِیتا بھی کیا ترساؤناں، یا مجہ بلایا آؤناں
تیرے فراقوں دن رین، لہو سیں ہیں انجھونیں
کب لگ یہ مہ برساؤناں، یا مجہ بلایا آؤناں
کیتا کہوں اے ناترس یک یک گھڑی گزری برس
بیگی خبر کہلاؤناں، یا مجہ بلایا آؤناں
پیارے شتابی کر دوا، خون غریباں نہیں روا
مجہ جیو کوں بچاؤناں، یا مجہ بلایا آؤناں
ہے دل منیں یہ آرزو، یک روز اپنے روبرو
اے جانِ من ہتلاؤناں، یا مجہ بلایا آؤناں
یہ حسن ہے دن چار کا، جوں پھول ہے گلزار کا
آخر کو ہے کملاؤناں، یا مجہ بلایا آؤناں
اِیتا نہ ہو بیباک توں، آخر ہے مُشت خاک توں
کچھ حق سیتی شرماؤناں، یا مجہ بلایا آؤناں
یہ دل جلے کا قول ہے، ہر یہ سخن بے مول ہے
مطلب حقیقی پاؤناں، یا مجہ بلایا آؤناں
کہتا ہوں اب چہلا حرف، رحمت جو کرتی ہوئے تو کر
پیچھے عبث پچھتاؤناں، یا مجہ بلایا آؤناں

یاد رہے کہ اس عہد میں ریختہ نظم کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کو نثر کے ساتھ یا زبان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ استاد ولی کے ہاں اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ ذیل میں بعض امثال حوالۂ قلم ہیں:

(1) ولی تجھ حسن کی تعریف میں جب ریختہ بولے
سنے تو اس کوں جان و دل سوں حسان عجم آکر
(2) امید مجہ کو یو ہے ولی کیا عجب اگر
اس ریختہ کوں سن کے ہوں معنی نگار بند
(3) یوں ریختہ ولی کا جا کر اسے سنایو
رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کی مانند

اور سراج اورنگ آبادی:

اے سراجؔ منتخب دیوان کے سب ریختے
خامۂ مژگان خوباں سے ہیں لائق صاد کے

میر تقی میر کے ہاں بھی بعض اوقات اسی مفہوم میں آیا ہے۔ امثال:

(1) پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں
(ص77)

(2) سر سبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ
ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ
(ص190)

(3) کچھ ہند ہی میں میرؔ نہیں لوگ جیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دوانا دکن تمام
(ص211)

(4) دوانا ہو گیا تو میرؔ آخر ریختہ کہہ کر
نہ کہتا تھا میں اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں
(ص87)

(5) ترک بچہ سے عشق کیا تھا ریختے کیا کیا میں نے کہے
رفتہ رفتہ ہندوستان سے شعر مرا ایران گیا
(ص376)

اشعار بالا میں ریختے کے معنے شعر و سخن (ہندی) یا کلام منظوم کے لیے گئے ہیں۔ ریختہ کہنا مترادف ہے سخن گفتن کا۔ جب دہلی میں ولی کے اثرات میں اردو شاعری کا رواج ہوا تو ریختہ دکن سے یہی معنی ساتھ لایا ہے۔

اگرچہ شمال میں اردو گو شعرا گیارہویں صدی ہجری میں موجود تھے۔ مثلاً محمد افضل جھنجھانوی متوفی 1035ھ اور جعفر زٹلی لیکن قدمائے اردو نے ریختہ گوئی کا سہرا دکن ہی کے سر باندھ دیا ہے۔ اکثر نے ولی کے تتبع میں شعر گوئی کی ہے۔ چنانچہ شاہ حاتم اپنے لیے کہتے ہیں:

''در شعر فارسی پیرو مرزا صائب است و در ریختہ ولی را اُستاد می داند۔''

میر تقی میر کہتے ہیں:

خوگر نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ کہنے سے
معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا
(ص164)

قائم کا بیان ہے:

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

میر حسن کا قول ہے:

''باید دانست کہ ریختہ اوّل از زبان دکن رواج یافتہ۔''

''کلیاتِ سودا'' کے دیباچے میں ان کے ایک شاگرد کا بیان ہے:

''بعد از انقضائے دورۂ فارسی گویاں نوبت بادشاہی ملک سخنوری ریختہ ہندی بولی دکنی و ناجی و آبرو وغیرہ رسید۔''

شاہ گلشن نے جو مشورہ ولی کو دیا ہے قدرت نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''شما زبان دکنی را گذاشتہ ریختہ را موافق اردوئے معلیٰ شاہجہان آباد موزوں بکنید۔''

ریختہ بمعنی اردو

ریختہ سے مراد اگرچہ ولی اور سراج کے ہاں نظم اُردو ہے لیکن دہلویوں نے بالآخر اس کو زبان اردو کے معنی دے دیئے اور یہ معنی قدرتاً پیدا ہو گئے اس لیے ان ایام میں اردو زبان کا تمام تر سرمایہ نظم ہی میں تھا۔ جب نثر پیدا ہو گئی تو یہی اصطلاح اس پر ناطق آ گئی۔ اس طرح ریختہ قدرتاً اردو زبان کا نام ہو گیا۔

اردو کے اور نام

اردو کے نام ریختہ کے علاوہ اور بھی ہیں۔ مثلاً شیخ باجن متوفی 912ھ اس کو زبان دہلوی کے نام سے یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

زبان دہلوی

''صفت دنیا بزبان دہلوی گفتہ۔'' اس سرخی کے ذیل میں انہوں نے اشعار ذیل لکھے ہیں جو اردو اشعار کا قدیم ترین نمونہ مانے جا سکتے ہیں۔

دوہرہ:

یہ فتنی کیا کے یہ ملتی ہے جب ملتی ہے تب چھلتی ہے (بین اوّل)
اوّل آن چھل بہت چھلائے آن چھوترے ہر بہتی کمائے
آن رو کر بہت رلائے
یہ فتنی کیا کے یہ ملتی ہے جب ملتی ہے تب چھلتی ہے (بین دوم)
آن بہت کھیرے پارے جے اس بلکے وے ان چھارے
جے رہے اس تجے تارے
وے نجانے اس تجے پارے جے اس کارن چتنہ ترسنہ
جے چکہ ملے تو اس ستہ بلسنہ
یہ فتنی انھوں تپاوے چکہ پاس انہوں نہ آوے
جے اس کدہیں نہ لوریں
جے چکہ ملے تو بہی اس چھور نہ جے دیکھہ اس تجے بھاگے (تخلص یا
نیلج ان ستہ لاگے
دیکھ باجن یہ تو جھوتی منہ میتی چت ایچی
یہ اہے ایسی وچی
یہ فتنی کیا کے یہ ملتی ہے جب ملتی ہے تب چھلتی ہے

یہ اشعار میں نے ایک ایسے نسخے سے لیے ہیں جو سخت غلط ہیں اور بارہویں صدی کے خاتمے کے قریب لکھا گیا ہوگا۔ باجن پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو کو زبان دہلوی کے نام سے یاد کیا ہے۔

گوجری

ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ اہالی دکن نے اردو کا نام دکنی رکھا۔ اہالی گجرات نے اس کا نام گجراتی یا گوجری رکھ دیا۔ لطف یہ ہے کہ خود ان ممالک کے باشندے اس کو ان ناموں سے پکارتے رہے۔ شیخ محمد خوب نے مثنوی ''خوب ترنگ'' 986ھ میں لکھی ہے۔ اس تصنیف کی زبان گجراتی کے مقابلے میں زیادہ تر اردو کے ذیل میں داخل ہے' لیکن شیخ اس کو گجراتی بولی کہتے ہیں۔ شعر

جیوں دل عرب عجم کی بات
سن بولی' بولی گجرات

اسی طرح شاہ علی محمد جیوگام دھنی کی ''جواہر اسرار اللہ'' کو اس کا مرتب شیخ حبیب اللہ قریشی الاحمدی

گوجری کہتا ہے۔ چنانچہ دیباچے میں لکھتا ہے:

''دربیان توحید و اسرار بالفاظ گوجری بطریق نظم فرمودہ۔ دریں مختصر آوردہ وجمع کردہ۔''

محمد امین نے اپنی مثنوی ''یوسف زلیخا'' بعہد عالمگیر 1109 ہجری میں نظم کی ہے۔ باوجودیکہ وہ صاف دکنی اردو میں لکھ رہا ہے مگر وہ اس کو گوجری زبان کے نام سے یاد کرتا ہے۔ چنانچہ:

سنو مطلب اہے اب یو امیں کا — لکھی گوجری منے یوسف زلیخا
ہر یک جاگے ہے قصہ فارسی میں — امیں اس کوں اُتاری گوجری میں
کہ بوجھے ہر کدام اس کی حقیقت — بڑی ہے گوجری جگ بیچہ نعمت

دکنی

اہالی دکن دکنی کہتے رہے۔ اس کی متعدد امثال بہم پہنچائی جاسکتی ہیں' لیکن میں صرف ایک مثال پر قناعت کرتا ہوں۔ مثلاً شاہ ملک بیجاپوری رسالہ ''احکام الصلوٰۃ'' تالیف 1077ھ کے خاتمے میں کہتے ہیں۔

یو مسلیاں کوں دکھنی کیا اس سبب
فہم کرکے دل میں کریں یاد سب

پرانے مغربی مصنفین کبھی اس کو ''لینگویج آف انڈوستان یا ہندوستان'' اور بعد میں ''ہندوستانی'' کہنے لگے۔ ہمارے ہاں عام خیال یہ ہے کہ انگریزوں نے یہ نام دیا ہے' لیکن امر واقع یہ ہے کہ خود ہمارے اسلاف اس کو زبانِ ہندوستان یا بولی ہندوستان کہتے رہے۔

زبانِ ہندوستان

مولانا وجہی کتاب ''سب رس'' میں جو بقول مولوی عبدالحق صاحب 1040ھ کے عنقریب بعد تصنیف ہوئی ہے' اردو کو ''زبان ہندوستان'' کہتے ہیں:

''آغاز داستان۔ زبان ہندوستان۔ نقل۔ ایک شہر تھا۔ اس کا ناؤں سیستان۔''
(رسالہ 'اردو' اورنگ آباد' ص 25' حصہ شانزدہم)

ہندی یا ہندوی

اردو کا سب سے قدیم نام ہندی یا ہندوی ہے۔ اس کی ایک پرانی مثال وہ ہے جو حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق متوفی 902ھ کے رسالہ ''خوش نغز'' میں ملتی ہے۔ میراں جی فرماتے ہیں:

ہیں عربی بول کیرے ۔۔۔ اور فارسی بہو تیرے
یہ ہندی بولوں سب ۔۔۔ اس ارتو کے سبب
یہ بھاکا بھلسو بولی ۔۔۔ پن اس کا بھاوت کھولی
یوں گر لکھ چند پایا ۔۔۔ تو ایسے بول چلایا
جے کوئی چھیں خاصے ۔۔۔ اس بیاں کیرے پیاسے
وے عربی بول نجانے ۔۔۔ تا فارسی پچھانے
یہ ان کو بچن ہیت ۔۔۔ سنت بوجھیں دیت
یوں دیکھت ہندی بول ۔۔۔ پر معنی تپ تول

(رسالہ ''اردو'' ص185 'حصہ بست وششم)

اردو کا آغاز

سب سے پہلے میں وہ آراء نقل کر دیتا ہوں جو ہمارے مصنفین نے اردو کے آغاز اور قدامت کے متعلق دی ہیں۔ میر امن کا بیان ہے:

''جب اکبر شاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آ کر جمع ہوئیں' لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین' سودا سلف' سوال جواب کرتے ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔''

(باغ و بہار۔ ص3)

سرسید کہتے ہیں:

''جب کہ شہاب الدین شاہجہاں بادشاہ ہوا اور اس نے انتظام سلطنت کا کیا اور سب ملکوں کے وکلاء نے حاضر رہنے کا حکم دیا اور دلّی کو نئے سرے سے آباد کیا اور قلعہ بنایا اور شاہجہاں آباد اس کا نام رکھا۔ اس وقت شہر میں تمام ملکوں کے لوگوں کا مجمع ہوا۔ ہر ایک کی گفتار رفتار جدا تھی۔ ہر ایک کا رنگ ڈھنگ نرالا تھا۔ جب آپس میں معاملہ کرتے' ناچار ایک لفظ اپنی زبان کا' دو لفظ اس کی زبان کے' تین لفظ دوسرے کی زبان کے ملا کر بولتے اور سودا سلف لیتے۔ رفتہ رفتہ اس زبان نے ایسی ترکیب پائی کہ یہ خود بخود ایک نئی زبان ہو گئی۔''

''ظہیر الانشا'' کے مصنف کا قول:

''ہرگاہ سریر سلطنت از جہانگیر متجاوز شدو نوبت شاہجہاں بادشاہ رسید اینجا کہ بسبب مصاحبت و معاشرت علمائے دین فی الجملہ خودداری و تشرع غالب بود ایں زبان ریختہ معجون مرکب بسبب آمد و رفت تاجران ہر دیار در بازار بضرورت خرید و فروخت و معاملات داد و ستد ضروری الاستعمال شد تا زبان یکے بفہم دیگرے درآید۔''

(منقول از جلوۂ خضر)

امام بخش صہبائی رسالہ ''قواعدِ اُردو'' میں فرماتے ہیں:

''شاہجہاں آباد تیموریہ خاندان کے شاہجہاں نے آباد کیا۔ اس وقت فارسی کے بعض الفاظ اور ہندی کے اکثر لفظوں میں کثرتِ استعمال کے سبب تبدیل و تغیر واقع ہوا اور خلا ملا سے جو بولی مروج ہوئی اس کا نام اُردو ٹھہرایا۔''

(ماخوذ از خزینۃ العلوم)

شمس العلماء محمد حسین آزاد کی رائے ہے:

''مسلمان بھی اب یہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے اور اس زبان کو کس شوق اور محبت سے بولتے تھے۔ شاید بہ نسبت ہندوؤں کے فارسی، عربی لفظ ان کی زبان پر زیادہ آجاتے ہوں گے اور جتنا یہاں رہنا سہنا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا، اتنا ہی روز بروز فارسی ترکی نے ضعف اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہوگا۔ رفتہ رفتہ شاہجہاں کے زمانہ میں کہ اقبال تیموری کا آفتاب عین اوج پر تھا، شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دلی دار الخلافہ ہوئی۔ بادشاہ اور ارکانِ دولت زیادہ تر وہاں رہنے لگے۔ اہلِ سیف، اہل قلم، اہل حرفہ اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اردو بازار لشکر کو کہتے ہیں۔ اُردوئے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اردو ہو گیا۔''

(آبِ حیات، ص 20، 1887ء)

یہ بیانات جو ہمارے تذکرہ نگار ایک دوسرے سے نقل کرتے آئے ہیں، حقیقت سے بہت دور ہیں۔ ہمیں ان کو صرف بزرگوں کے تبرک کے طور پر تسلیم کرنا چاہیے ورنہ کیا اکبر اور شاہجہاں سے پیشتر دلی نہ تھی یا ہندو اور مسلمان نہ تھے یا لوگ سودا سلف نہیں لیتے تھے یا مختلف قومیں ایک جا رہ سہہ کر کاروبار کرنا نہیں جانتی تھیں۔ پھر اکبر یا شاہجہاں کے عہد کے ساتھ کیا خصوصیت ہے کہ اردو کی بنیاد رکھی جائے۔ شاہجہاں نئی دلی کا قلعہ 1057ھ میں تیار کرتا ہے۔ محمد افضل پانی پتی متوفی 1035ھ شاہجہاں آباد کے آباد ہونے سے بہت پہلے اپنا دوازدہ ماہہ یا بارہ ماسہ اردو میں تصنیف کرتا ہے۔ دکن میں اردو ادبیات کا سلسلہ اکبر بادشاہ کی تخت نشینی سے پچاس سال قبل شروع ہو جاتا ہے اور یہ بزرگ ہیں کہ شاہ جہاں آباد کے سنگ بنیاد کے ساتھ ساتھ اردو کی بنیاد ڈال رہے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ بابر اپنے ترکی دیوان میں ایک شعر ایسا لکھ جاتا ہے، جس کا ڈیڑھ مصرعہ اردو ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

مج کا نہ ہوا کج ہوس مانک و موتی

فقرا ہیغہ بس بولغو سید در پانی و روتی

(گل رعنا)

اردو برج سے نکلی

اصل یہ ہے کہ اردو کی داغ بیل اسی دن سے پڑنی شروع ہو گئی ہے جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر توطن اختیار کر لیا ہے۔ ہمارے مصنفین کا ایک اور مزعومہ خیال یہ ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔ کوئی اسے برج کی بیٹی بتاتا ہے اور کوئی اس کے دودھ سے اس کی پرورش کرتا ہے۔ میں تمثیلاً بعض کے بیانات یہاں حوالۂ قلم کرتا ہوں۔

آزاد فرماتے ہیں:

''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے' لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ ہی آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے۔''

حکیم شمس اللہ صاحب قادری رسالہ ''تاج'' (اردو قدیم نمبر) میں یوں گویا ہیں:

''مسلمانوں کے اثر سے برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ داخل ہونے لگے جس کے باعث اس میں تغیر شروع ہوا جو روز بروز بڑھتا گیا اور ایک عرصے کے بعد اردو زبان کی صورت اختیار کر لی۔''

اس موقعہ پر ہمارے مورخ یہ امر فراموش کر جاتے ہیں کہ مسلمانوں کے تعلقات ہندوستان اور اہل ہند کے ساتھ پرتھی راج کی شکست اور فتح دہلی کے زمانے سے شروع نہیں ہوتے' بلکہ ان واقعات سے کئی صدی پیشتر سے ابتدا پاتے ہیں۔ وہ عربوں کی فتح سندھ و ملتان اور غزنوی خاندان کی فتح پنجاب کو مطلق فراموش کر جاتے ہیں۔ سندھ و ملتان پر مسلمان پہلی صدی سے قابض تھے۔ پنجاب پر ان کا قبضہ معز الدین محمد سام کی آمد سے ایک سو ستر سال پہلے سے تھا۔ سندھ و پنجاب میں ہندو مسلم اقوام سب سے پہلے ملتی جلتی ہیں' اس لیے اگر انہیں ایک عام زبان کی ضرورت ہوئی تو ان ممالک میں پیش آئی ہوگی اور اردو کو ان ممالک میں وجود میں آنا چاہیے۔

عربوں نے جب ایران فتح کیا تو سیاسی اور سرکاری اغراض کے لیے ایران کی مختلف زبانوں سے ایک زبان کو چن لیا۔ یہ زبان مشرقی ایران میں بولی جاتی تھی۔ اگرچہ ہم غلطی سے اس کو خطۂ فارس کی طرف منسوب کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح جب مسلمان سندھ و پنجاب پر قابض ہو گئے تو یہاں بھی یہی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی اگر سندھ میں نہیں تو پنجاب میں یقیناً کوئی نہ کوئی زبان اختیار کرنی پڑی ہے۔

جب ہم اردو کے ڈول' اس کی ساخت اور وضع قطع کو دیکھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا

ڈھنگ اور ہے اور برج بھاشا کا رنگ اور ہے۔ دونوں کے قواعد وضوابط اور اصول مختلف ہیں۔ اردو برج بھاشا کے مقابلے میں پنجابی بالخصوص ملتانی سے مماثلت قریبہ رکھتی ہے۔ برج سے چند ترمیمیں قبول کر لینا یا الفاظ کا مستعار لینا دوسری بات ہے' لیکن جہاں برج سے اس نے الفاظ مستعار لیے ہیں وہاں برج پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے۔ اور برج پر کیا موقوف ہے' ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی اردو کے پرتو سے خالی نہیں۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اگرچہ اردو زبان بین الاقوامی ضروریات کی بنا پر وجود میں آئی' لیکن بہت جلد وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی عام زبان بن گئی۔ اس نے ستلج پار ہو کر مسلمانوں کا دامن پکڑ لیا۔ مسلمان سپاہی' اہل بمیر وعملہ' دستکار و پیشہ ور' مزدور و فقیر' درویش و مسافر کا ساتھ دیا۔ دکن' گجرات' بنگال و بہار جہاں کہیں وہ گئے' یہ ان کے ساتھ رہی اور ساتھ ہی بسی۔ ابتدا میں وہ عوام و غیر تعلیم یافتہ طبقے کی زبان تھی۔ آخر میں اس کی ہردلعزیزی دیکھ کر تعلیم یافتہ طبقے نے بھی اس کی طرف توجہ کی۔

دہلی اور پنجاب کے تعلقات

پیشتر اس کے کہ ہم اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں' مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً مسلمانی عہد کے تاریخی واقعات پر بالخصوص جو دہلی اور پنجاب کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں' ایک نظر ڈالتے چلیں۔

عرب سیاحوں کا بیان

پہلی صدی ہجری کے اواخر میں محمد بن قاسم کی فتوحاتِ سندھ اور ملتان کو اسلامی قلمرو میں شامل کر دیتی ہیں اور اسلامی تہذیب و تمدن ان ممالک میں شائع ہو جاتے ہیں' لیکن تیسری صدی سے صفاریوں کی فتوحات کی بنا پر ایرانی اثرات بھی پھیل جاتے ہیں۔ اس عہد کے سیاحوں کا بیان ہے کہ یہاں کے باشندے ہندو اور مسلمان عراقی لباس پہنتے تھے۔ ہندو بھی شلوار کا استعمال کرتے تھے اور داڑھیاں رکھتے تھے۔ چوتھی صدی کے سیاح اصطخری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ملتان و منصورہ کے باشندے فارسی اور سندھی دونوں زبانیں بولتے تھے۔ موجودہ بلوچستان کے ایک حصے کا نام ایرانیوں نے توران رکھ دیا تھا۔ اس کے حاکم نشین شہر کا نام قصدار یا قزدار تھا۔ یہی شہر فارسی کی مشہور شاعرہ رابعہ بنت کعب القصداری کا تھا جس نے استاد رودکی متوفی 329ھ سے مشاعرات کیے ہیں' وطن تھا۔ ایرانیوں نے درۂ قرم کے پاس ایک شہر کا نام کرمان اور گندھارا کا نام قندھار رکھ دیا تھا۔ ملتان کے ریگستان کو دشت قبچاق' دریائے سندھ کو جیحون' مہران اور سند رود اور دریائے چناب کو جندرود یا جمد رود کہتے تھے۔ مسعودی منصورہ کے قریب ایک شہر کا نام دوشاب بتاتا ہے جو ظاہر ہے کہ فارسی الاصل ہے' بلکہ انہوں نے اپنے وطن کے پانچ دریاؤں کی یاد میں پانچ دریاؤں کے درمیانی علاقے کا نام بھی پنجاب رکھ دیا تھا۔

فارسی پر ہندی کا اثر

اس کے برخلاف خود فارسی زبان میں ہمیں ایسے الفاظ ملتے ہیں جو اسی عہد میں فارسی پر ہندی اثرات کی گواہی دیتے ہیں مثلاً لفظ بت جو بودھ کی بگڑی شکل ہے یا کوتوال جو ٹھیٹ ہندی یعنی کوٹ والا بمعنی مالک قلعہ تھا۔ یہ لفظ ''شاہنامہ' فردوسی'' میں بھی موجود ہے' چنانچہ:

چو آگاہ شد کوتوال حصار بر آویخت با رستم نامدار

صاحب ''شرف نامہ'' لکھتے ہیں:

''واز شیخ واحدی محقق است کہ لفظ ہندی است کہ بخراسان فارس مشہور شدہ۔''

ہیلاج کی بابت بھی صاحب ''شرف نامہ'' کی یہی رائے ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''ایں لفظ ہندی است کہ مستعمل در پارسی شدہ۔''

اور لفظ بیلک کی تشریح میں کہتے ہیں:

''تیر شکاری دو شاخہ ایں لغت ہندی است کہ مستعمل در پارسی شدہ۔''

لکھن یعنی لنگھن (روزۂ ہندواں) منوچہری کے ہاں ملتا ہے۔ شل یعنی سیل ہندی ہے اور فرخی کے ہاں ملتا ہے:

بگونہ شل افغانیاں دو پرہ و تیز چو دستہ دستہ بہم تیر ہائے بے سوفار

چندن فرخی اور منوچہری کے ہاں آتا ہے' جسے آج کل ہم صندل کہتے ہیں۔ برشکال (ورس کال) یعنی برسات کا موسم ہندی لفظ ہے' مسعود سعد سلمان کے ہاں موجود ہے:

برشکال اے بہار ہندوستان اے نجات از بلائے تابستان

ان چند امور میں سے جو میں نے اوپر درج کیے ہیں' واضح ہوتا ہے کہ ہندی اور ایرانی تمدن کا سنگم سندھ و ملتان میں غزنوی عہد سے پیشتر ہو چکا تھا۔

غزنوی عہد

غزنوی دور میں سلطان محمود غزنوی 388ھ و 421ھ نے 413ھ میں لاہور پر قبضہ کر کے پنجاب کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اس شہر کو جس کا جدید نام محمود پور رکھا گیا' اپنے والی کا صدر مقام بنا دیا' جس کے ماتحت فوج کی بڑی تعداد رہتی تھی۔ مفتوحہ علاقہ مختلف ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ مثلاً جالندھر' جہلم' ملتان' سندھ وغیرہ۔ سپاہ میں زیادہ تر ترک' افغان' خلج اور ہندی تھے۔ فوج کی تعداد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ابو النجم زریر شیبانی کے پاس جو سلطان ابراہیم غزنوی 450ھ و 492ھ کے عہد کا سپہ سالار ہند تھا' چالیس ہزار فوج

تھی۔ اس کے ماتحتوں کی فوجیں اس کے علاوہ ہیں۔ الغرض مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد محمود کے وقت ہی سے پنجاب میں آباد ہوگئی تھی۔ غزنوی سلطنت اگرچہ ایران وخراسان میں سلجوقیوں کے بڑھتے عروج کے سامنے اپنے مقبوضات یکے بعد دیگرے کھو رہی تھی' لیکن ہندوستان میں ان کی طاقت ترقی پر ہے۔ ہانسی سلطان مسعود شہید نے فتح کی۔ غزنوی عہد کے والیانِ ہند کے حالات وکارناموں پر اگرچہ پردہ پڑا ہوا ہے' لیکن ابوالفرج رونی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالنجم زریر شیبانی کے کارناموں نے سلطان محمود کے دور کا احیاء کر دیا تھا۔ وہ ایک طرف بارسی (بنارس) دوسری طرف سومنات پر چھاپہ مارتا ہے۔ تانیسر (تھانیسر) والوں کو مغلوب اور قنوج کو زیر کر چکا ہے۔ میرٹھ پر اس کا قبضہ ہے اور چونکہ انگلی والیٔ دہلی نے میرٹھ کو تباہ کر دیا ہے' وہ انتقاماً دہلی پر حملہ کی تیاریاں کر رہا ہے۔ یکایک سلطان ابراہیم غزنوی کی ہندوستان میں آمد نے اس کے ارادے کو معرضِ التوا میں ڈال دیا ہے۔ زریر جس کی تقصیرات کا ہمیں کوئی علم نہیں' باغی اور غدار قرار دیا جاتا ہے اور ایک جنگ کے بعد گرفتار ہو کر قتل کر دیا جاتا ہے۔ ابوالنجم کا جانشین شہزادہ سیف الدولہ محمود آگرہ فتح کرتا ہے۔ سلطان مسعود ثالث 492ھ و508ھ کے زمانے میں سرتی غزنویوں کے مقبوضات میں داخل ہو جاتا ہے۔ ان امور سے ظاہر ہے کہ آل غزنہ کے مقبوضات ہندوستان میں برابر وسیع ہوتے رہے۔

لاہور مسلمانی مرکز

مسلمانوں کی یہ کثیر تعداد جو تجارت' فوجی وسرکاری خدمت کی غرض سے پنجاب میں ان ایام میں آباد تھی' پنجاب ہی کو اپنا وطن تصور کرنے لگی تھی۔ لاہور اس عہد کے مسلم ہندوستان کا مرکز بن گیا تھا۔ پنجاب ان کی نگاہ میں ایک فتح کردہ ملک نہیں تھا' بلکہ وہ اس پر وطن کی حیثیت سے نظر ڈالنے لگے تھے۔ خواجہ سعد سلمان شہزادہ مجدود کے خزانچی بن کر بعہد سلطان مسعود شہید ہندوستان آئے۔ ان کے فرزند خواجہ مسعود شاعر مشہور ہیں۔ یہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ یہیں نشو ونما اور تعلیم وتربیت پائی۔ وہ اپنے حبسیات میں لاہور کو مادر وطن کے نام سے پکارتے ہیں۔ چنانچہ:

اے لاہور ویحک بے من چگونہ — بے آفتاب تاباں روشن چگونہ
تا ایں عزیز فرزند از تو جدا شدہ است — با درد او بنوحہ و شیون چگونہ
تو مرغزار بودی و من شیر مرغزار — با من چگونہ بودی و بے من چگونہ

دوسرے مقام پر کہتے ہیں:

رسید عید و من از روئے حور و دلبر دور — چگونہ باشم بے روئے آں بہشتی حور
چو یاد شہر لہاوور و یار خویش کنم — مباد کس کہ شد از یار و شہر خویش نفور

ایک اور جگہ جب کہ جس سے رہائی کی امید منقطع ہو جاتی ہے' کہتے ہیں:

کار اطلاق من چو بستہ بماند — کہ ہمیں ایزدش بگشاید
مر مرا حاجتے ہمی باشد — وز دلم خارشے ہمی زاید
تحملے باید از خداوندم — کہ ازو بوے لوہور آید
کہ ہمیں ز آرزوے لوہاور — جان و دل در تنم ہمی ناید

مسعود رازی

لاہور کے سب سے پہلے شاعر ابوعبداللہ روزبہ بن عبداللہ النکتی اللہوری ہیں' جو مسعود شہید کے مداح ہیں۔ مسعود رازی سلطان محمود اور سلطان مسعود شہید کے عہد کا شاعر ہے۔ ذوالحجہ 430ھ کے جشن مہرگاں کے موقع پر اس نے سلطان مسعود کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس میں سلجوقیوں کے بڑھتے اقتدار کی روک تھام کے لیے سلطان کو نصیحت کی تھی۔ یہ نصیحت [1] سلطان پر گراں گذری۔ شاعر سے ناراض ہوا اور سزا دہی کے لیے اسے ہندوستان بھجوا دیا۔ 18 جمادی الآخر کے جشن نوروز مناتے وقت شاعر کے دوستوں نے اس کی شفاعت کی۔ سلطان نے شاعر کا قصور معاف کر دیا۔ اس کے قصیدے پر تین سو دینار صلہ دیے اور ہزار دینار مشاہرہ بھی معاملات جہلم پر مقرر کر دیا' لیکن حکم دیا کہ ہندوستان ہی میں رہے۔ [2]

ابوالفرج رونی

استاد ابوالفرج رونی اسی شاعر کا فرزند ہے' رونی منسوب ہے رونہ کی طرف جو لاہور کا ایک موضع بیان کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابوالفرج نے اپنی تمام عمر لاہور ہی میں گذاری۔ ضرور تاً ایک آدھ مرتبہ اس نے غزنین کا سفر کیا۔ حتیٰ کہ جو قصائد اس نے سلطان ابراہیم اور اس کے فرزند سلطان مسعود ثالث کی مدح میں لکھے ہیں' ایسے موقع پر لکھے ہیں' جب یہ سلاطین ہندوستان آئے ہیں۔

شیخ اسماعیل

علماء میں سب سے مقدم شیخ اسماعیل لاہوری متوفی 448ھ ہیں' جو جامع علوم ظاہری و باطنی تھے۔ آپ سادات بخارا سے ہیں اور لاہور کے پہلے واعظ 395ھ میں بخارا سے لاہور تشریف لائے اور یہیں آباد ہو گئے۔ آپ کی مجالس وعظ میں مخلوق کثرت سے جمع ہوتی تھی۔ ہندو ہزاروں کی تعداد میں آپ کے وعظ سن سن کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے پہلے جمعہ میں ڈھائی سو دوسرے میں پانچ سو اور تیسرے میں ایک ہزار ہندو مشرف بہ اسلام کیے۔

مشائخ کے سلسلے میں ابی الحسن بن عثمان الجلابیؒ صاحب ''کشف المحجوب'' ہیں جو 465ھ میں انتقال

فرماتے ہیں اور لاہور ہی میں مدفون ہیں۔ فی زمانہ داتا گنج بخش" کے نام سے مشہور ہیں۔ شاہ یوسف ایک بلند پایہ بزرگ ہیں اور 550ھ میں وفات پاتے ہیں۔ ان کے علاوہ شیخ فخر الدین حسین زنجانی لاہوری' سید احمد توختہ ترمذی لاہوری' سید یعقوب صدر دیوان زنجانی لاہوری کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بزرگ قرن ششم ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔ خاندان غزنہ کے دو بادشاہ خسرو شاہ متوفی 555ھ اور خسرو ملک متوفی 583ھ لاہور ہی کو اپنا دار السلطنت بنا لیتے ہیں۔

باوجودیکہ اس عہد کی تاریخ مفقود ہے' ان چند ناموں سے جو اوپر درج ہیں' یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ لاہور ان ایام میں ایک بارونق اسلامی شہر اور مرجع علم و فضل و ادب بن گیا تھا۔

آل غزنہ کی حکومت ہندوستان میں کم و بیش ایک سو ستر سال تک رہی ہے۔ اس عرصے میں مسلمان اور ہندو اقوام کی یکجائی سے ایک نئی زبان کا پیدا ہو جانا لازمی بات ہے۔ سرکاری ضروریات کی بنا پر بھی شاہی عہدے داروں اور ملازمین کے لیے اس ملک کی زبان سے واقف ہونا ضروری تھا۔ آخر غزنویوں کے قبضے میں تمام پنجاب' سندھ اور ملتان تھا۔ ہانسی' سرستی اور میرٹھ تک ان کے قبضے میں تھے' بلکہ یوں کہیے دہلی کے قریب تک پھیلے ہوئے تھے۔ اتنے بڑے علاقے کے مالی و ملکی انتظام کے لیے عمال کو اس ملک کی زبان سیکھنی ضروری تھی۔ چونکہ لاہور ہند کا دار السلطنت تھا' اس لیے ظاہر ہے کہ اس خطے کی زبان کو اس عہد کی حکومت اور مسلمانوں نے ترجیح دی ہوگی۔ یہ خیال کرنا کہ جب تک مسلمان پنجاب میں آباد رہے' انہوں نے کسی ہندی زبان سے سروکار نہ رکھا اور جب پنجاب سے دہلی گئے تب برج بھاشا اختیار کی۔ ایک ناقابل قبول خیال ہے' جو عقل و درایت کے منافی ہے' اس لیے کہ ان کو نہ صرف سرکاری ضروریات کی بنا پر ایسی زبان کی ضرورت تھی بلکہ خود مسلمانوں کی اقوام کو بھی ایک دوسرے سے تبادلہ خیالات کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ تعلیم یافتہ گروہ کے لیے یہ مشکل فارسی نے حل کر دی تھی' لیکن ان کا غیر تعلیم یافتہ طبقہ جو ان کی آبادی کا جزو اعظم تھا' فارسی سے قطعاً نابلد تھا۔ یہ مسلمان چونکہ تازہ ولایت تھے' انہوں نے اس کا نام ہندی رکھ دیا۔

ابوریحان البیرونی

خود غزنویوں نے شروع ہی سے ہندی زبان کی طرف توجہ دی تھی۔ ان میں ابوریحان محمد بن احمد البیرونی قابل ذکر ہے' جو ابتدا میں ابوالعباس مامون خوارزم شاہ کے دربار سے تعلق رکھتا تھا' لیکن مامون کے قتل کے بعد 408ھ میں سلطان محمود کے ساتھ غزنی چلا آیا۔ البیرونی محمود کے غزوات میں شریک رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک عرصے تک اس کا قیام لاہور اور ملتان میں رہا ہے۔ اس نے ہندی اور سنسکرت زبان سیکھی اور ہندوؤں کے مذاہب اور علوم مثلاً ہیئت' نجوم و ریاضی' جغرافیہ و طبیعیات پر کما حقہٗ عبور حاصل کیا۔ عربی سے سنسکرت میں اور سنسکرت سے عربی میں متعدد کتابیں ترجمہ کیں۔ عربی میں جو ترجمہ کیں' ان

کے نام شنکیا اور تنچلی ہیں' لیکن البیرونی کی سب سے ضروری کتاب ''تاریخ الہند'' ہے' جو اہل ہند کے اس عہد کے علوم کی قاموس ہے۔

ہندی زبان کے ترجمان

محمود کے زمانے میں ہندی زبان کے ترجمانوں کی ایک جماعت غزنی میں مقیم تھی۔ ان میں تلک ہندی اور بہرام کے نام ہم تک پہنچے ہیں۔ تلک دراصل ایک حجام تھا۔ ہندی اور فارسی زبانوں میں بخوبی ماہر تھا۔ کشمیر میں تربیت پائی تھی۔ خط ہندی اور فارسی نہایت اعلیٰ لکھتا تھا۔ ترجمانی سے ترقی کر کے ہندو افواج کے سپہ سالار (غزنیں میں ہندو فوج بھی رہا کرتی تھی) سندر کی وفات پر سلطان مسعود شہید نے اسے سپہ سالار بنا دیا تھا۔ تلک نے بالآخر اس قدر عروج پایا کہ سلطان نے نیال تگین سپہ سالار ہند کی سرکوبی کے لیے جو باغی ہو گیا تھا' تلک ہی کو مقرر کیا اور تلک نے ہندوستان آ کر اور کئی شکستیں دے کر نیال تگین کو قتل کر دیا۔

کوئی تعجب نہیں اگر خود سلطان محمود ہندی زبان سے کسی قدر آشنا ہو' کیونکہ جب 413ھ میں مہم میں سلطان کالنجر پہنچتا ہے۔ ننداکالنجر کا راجہ سلطان کی مدح میں ہندی شعر لکھ کر بھیجتا ہے۔ سلطان فضلائے ہندو عرب کو یہ اشعار دکھاتا ہے اور سب ان اشعار کی توصیف میں رطب اللسان ہوتے ہیں۔ سلطان ان اشعار سے اس قدر خوش ہوتا ہے کہ صلے میں نندا کو پندرہ قلعوں کی حکومت کا پٹہ لکھ دیتا ہے' جن میں کالنجر بھی شامل تھا۔

بدقسمتی سے اس عہد کی تاریخ پر ایسا پردہ پڑا ہوا ہے کہ ہم ان ایام کے سیاسی حالات سے بھی بخوبی واقف نہیں۔ چہ جائیکہ معاشی' اقتصادی اور ادبی پہلو کے حالات ملیں' لیکن ہمیں یقین کرنا چاہیے کہ پنجاب کے میدانوں میں مسلمان حملہ آور بہت جلد سیاسی منافرت کے باوجود ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر رہنے بسنے اور ان کے ساتھ اختلاط و ارتباط قائم کرنے لگے ہیں۔

حکیم سنائی

حکیم سنائی متوفی 547ھ کے متعلق ہم اسی قدر جانتے ہیں کہ وہ صوفی شاعر ہیں' لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان بھی آئے ہیں اور کسی قدر ہندی زبان سے بھی واقف ہیں۔ ایک شعر میں پانی کے لفظ کو اس طرح استعمال کر گئے ہیں' گویا کہ فارسی زبان کا لفظ ہے:

نہ در آں معدہ خردۂ میدہ   نہ درآں دیدہ قطرۂ پانی

عثمان مختاری

عثمان مختاری غزنوی بھی ہندوستان آئے ہیں۔ انہوں نے والیٔ سندھ اور محمود روباہی والیٔ ہند کی

مدح میں قصائد لکھے ہیں۔ ایک موقع پر بازار سے ایک غلام خریدتے ہیں۔ اس کے ذکر میں ایک شعر میں دو ہندی لفظ باندھے گئے ہیں۔ اس قصیدے کا مطلع ہے:

یکے غلامکے ہندی خریدم از بازار بداں بہا کہ ز گفتار آنم آید بار

اور وہ شعر یہ ہے:

ز من بدیدے بادے بجستہ گفتے چوں نگس بدیدے بر من نشستہ گفتے مار

اس شعر میں چوں اور مار دونوں ہندی لفظ ہیں۔

خواجہ مسعود سعد سلمان

لیکن یہ خواجہ مسعود سعد سلمان ہیں جن کے متعلق متقدمین و متاخرین متفقاً کہتے ہیں کہ وہ ہندی میں بھی صاحب دیوان تھے۔ مجھ کو ان کی ہندی شعر گوئی کے متعلق شبہ تھا' کیونکہ جہاں وہ اپنی فارسی و عربی زبان دانی پر اپنے قصائد میں فخر کرتے ہیں' وہاں ہندی کا ذکر نہیں کرتے۔ مثلاً:

مرا بداں تو کہ در پارسی و در تازی بنظم و نثر ندارد چو من کس استقلال

دوسرے موقع پر گویا ہیں:

کس از بپارسی وتازی امتحان زدے مرا مبارز میدان امتحاں شدے

تیسرے موقع پر کہا ہے:

بریں ہر دو زباں در ہر دو میداں بگردونم رسیدہ کامرانی
بجود آرد بہ پیش خاطر من روان رودکی و ام ہانی

لیکن جہاں محمد عوفی کہتا ہے:

''وا ورا سہ دیوان ست یکے بتازی و یکے بپارسی و یکے بہندی''

(لباب الالباب۔ محمد عوفی' صفحہ 246 جلد دوم)

عوفی کے ساتھ امیر خسرو بھی فرماتے ہیں:

''پیش ازیں از شاہان سخن کسے را سہ دیوان نبود مگر مرا کہ خسرو ممالک کلام مسعود سعد سلمان را اگرچہ ہست اما آں سہ دیوان در عبارت عربی و فارسی و ہندوی است' و در پارسی مجرد کسے سخن را سہ قسم نکردہ جز من کہ دریں کار قسام و عادلم۔''

(دیباچہ غرۃ الکمال' صفحہ 66)

اس لیے ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ خواجہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے مگر بدقسمتی سے ان کا ہندی کلام دستبرد زمانہ کے ہاتھوں شاید ہمیشہ کے لیے برباد ہو گیا۔ خواجہ سعد سلمان برابر ساٹھ سال تک ہندوستان میں

رہے۔ خواجہ مسعود یہیں پیدا ہوئے اور یہیں رہے۔ مسعود ثالث کے عہد میں مقطع جالندھر تھے۔ قصدار میں بھی رہے۔ لاہور ان کا وطن ہے اور جس محبت کے ساتھ وہ اس وطن کا ذکر کرتے ہیں' ان اشعار سے ظاہر ہے جو اس سے پیشتر نقل ہو چکے ہیں' اس لیے اگر انہوں نے اپنے وطن کی زبان میں اشعار لکھے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ خواجہ کے دیوان فارسی میں بعض ایسی باتیں موجود ہیں جن کو ہندوستان کا پرتو مانا جا سکتا ہے۔

(1) فارسی زبان میں بارہ ماسہ کی صنف کی نظموں کا رواج نہیں ہے اور نہ سنسکرت میں ایسی نظمیں موجود ہیں۔ ادھر اردو' پنجابی اور ہندی میں اب سے بیس سال قبل تک بارہ ماسوں کا بکثرت رواج تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ خواجہ نے دوازدہ ماہہ لکھنے میں جسے غزلیات شہوریہ کے نام سے یاد کرتے ہیں' پنجابی کی تقلید کی ہے یا بارہ ماسے خود اُنہی کی ایجاد ہے۔ ہندی میں سب سے قدیم بارہ ماسہ وہ ہے جو کبیر کی طرف منسوب ہے۔ ہندی کے بارہ ماسوں میں ایک ہجراں دیدہ عورت کی کہانی بالعموم دی جاتی ہے' جو خود اپنے فراق کی داستانِ الم حسرت ناک الفاظ میں سناتی ہے۔ خواجہ مسعود کے ہاں دوازدہ ماہہ صرف مدحیہ ہے اور مہینے کی خوشگواری کا ذکر کر کے شراب کی دعوت دی جاتی ہے۔ اس شہوریہ میں ان کا ممدوح شاہ ارسلان بن مسعود متوفی 512ھ ہے اور ہر مہینے کی غزل کی بحر مختلف ہے۔

(2) دوازدہ ماہہ کے ساتھ غزلیات ایامیہ اور غزلیات اسبوعیہ کا ذکر بھی مناسب ہے۔ غزلیات ایامیہ میں ہر غزل فارسی ماہ کے دنوں کے نام پر لکھی گئی ہے اور بدستور ارسلان بن مسعود کی مدح میں ہے۔ غزلیات اسبوعیہ ہفتے کے دنوں کے نام پر ہیں اور حسب معمول ارسلان کی مدح میں ہیں۔

(3) انہوں نے قطعات شہرآشوب بھی لکھے ہیں جن میں پیشہ وروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ امیر خسرو نے بھی شہرآشوب لکھا ہے۔ سنا جاتا ہے کہ سنسکرت میں بھی اس قسم کی نظمیں ہوتی ہیں۔

اس قسم کی نظمیں فارسی ادبیات میں موجود نہیں ہیں اور خواجہ مسعود ان امور میں تمام شعرائے ایران سے منفرد ہیں۔ کیا اس کو ہندوستان کا اثر تسلیم کیا جائے یا خواجہ کی ایجاد مانا جائے۔ خواجہ نے ایک شعر میں ایک ہندی محاورہ بھی استعمال کیا ہے:

چو غدر ابر بغرید کوس محمودی   بر آمد از پس دیوار حصن مارا مار

سلطان معز الدین محمد بن سام 582ھ میں لاہور فتح کرتا ہے اور آل ناصر کا آخری تاجدار خسرو ملک قید ہو کر سلطان غیاث الدین کے پاس غور پہنچا دیا جاتا ہے۔ فاتح دہلی کی سمت بغرضِ تسخیر نگاہ ڈالتا ہے۔

ترائن کی جنگ میں رائے پتھورا کی شکست کے بعد مسلمانوں کا قبضہ اجمیر پر ہو جاتا ہے۔ قطب الدین ایبک 602ھ میں دہلی اور میرٹھ پر قابض ہو جاتا ہے۔ دہلی کے قبضے کے بعد پایہ تخت لاہور و کہرام سے تبدیل ہو کر دہلی آ جاتا ہے۔ جس طرح ہماری یادداشت میں انگریزی حکومت نے کلکتہ سے دہلی تبدیل کر لیا' یہی صورت اس وقت بھی پیش آئی' لیکن اس تبدیلی میں اور اُس تبدیلی میں بے حد فرق ہے۔ آج صرف اسی قدر ہوا ہے کہ وائسرائے ہند کلکتہ کے بجائے دہلی میں رہنے لگے اور نئی عمارات ان کے دفتر کے لیے بنادی گئیں' لیکن ان ایام میں اس تبدیلی کا مطلب تھا کہ لاکھوں انسان پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی اور اس کے نواح میں آباد ہو گئے۔ تمام فوج اور اہلِ دیوان مع ان کے متعلقین اور قبائل کے ہجرت کر کے چلے آئے۔ ہمیں اس عہد کی معاشرت کا یہ پہلو یاد رکھنا چاہیے کہ انسان مختلف قبائل میں منقسم تھے۔ حکومت کا تعلق براہ راست قبیلے سے نہیں ہوتا تھا' بلکہ قبیلے کے رئیس کے ساتھ تھا۔ رئیس قبیلہ کی حرمت و وقعت قبیلے کے ارکان کی تعداد اور وجاہت پر منحصر ہوتی تھی۔ ایک قبیلہ جس قدر طاقتور ہے' اس کے مطابق اس کے سردار کی عزت ہے۔ حکومت اپنی فوجیں انہی قبیلوں سے بھرتی کرتی تھی اور قبیلے کا سردار ہی اکثر ان کا افسر ہوا کرتا تھا۔ سلطنت غزنی کی فوجوں میں زیادہ عنصر ترکوں' خلجیوں' افغانوں اور ہندوؤں کا تھا۔ لمغان کی وادیوں میں جیپال کی شکست کے بعد خلج اور افغان قومیں جو افغانستان کے پہاڑوں میں آباد تھیں' ناصر الدین سبکتگین کی مطیع ہوئیں اور کثیر تعداد میں اس کی فوج میں بھرتی ہو گئیں۔

خلج

خلج ان ایام میں افغانوں سے زیادہ طاقتور تھے اور افغانوں کی ہمسائیگی میں آباد تھے۔ ان کی اصل ترک ہے۔ غلاموں کے عہد میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم ساری کی ساری ہندوستان کی طرف ہجرت کر آتی ہے اور مختلف مقامات میں آباد ہو جاتی ہے۔ پرانے زمانے میں خلجی پور نام کے بیسیوں قصبے اور موضعے نظر آتے ہیں۔ قیاس میں آتا ہے کہ اسی قوم کے آباد کردہ ہوں گے۔ یہی لوگ بہار و بنگال فتح کرتے ہیں۔ جہاں ایک علیحدہ سلطنت کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ بنگالہ میں ان کی سلطنت اگرچہ دیرپا ثابت نہیں ہوئی' لیکن سیاسی لحاظ سے وہ اس قدر طاقتور تھے کہ غلاموں کے بعد تخت ہندوستان کے یہی وارث بنتے ہیں اور مالوہ میں علیحدہ سلطنت قائم کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے اصل وطن افغانستان میں خلجیوں کا نام نہیں سنا جاتا۔ خلجی کس زمانے میں اسلام لائے' تاریخ اس بارے میں خاموش ہے۔

افغان

افغان ہندوستان کے مغربی پہاڑوں میں دریائے سندھ تک آباد تھے۔ البیرونی ایک مقام پر ان کو

افغانوں کے نام سے یاد کرتا ہے۔ دوسرے مقام پر ہندو لکھتا ہے۔ ابوالفرج رونی افغانوں اور جاٹوں کو مشرک کہہ رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے افغان ان ایام میں تابع اسلام نہیں تھے۔ سیاسی اعتبار سے افغان ہر زمانے میں اہمیت رکھتے تھے۔ سلطان محمود نے دو مرتبہ ان کی گوشمالی کی ہے۔ مسعود شہید نے ان کے خلاف فوج بھیجی ہے۔ مسعود ثالث نے بھی ان کو سزا دی ہے' لیکن ہندوستان میں اگرچہ فوجوں میں ہمیشہ بھرتی ہوتے تھے' تغلقوں کے عہد میں وقعت حاصل کرتے ہیں۔ اگرچہ خلجیوں کی طرح افغان بڑی تعداد میں ہندوستان کی طرف ہجرت نہیں کرتے' تاہم ایک معتد بہ تعداد ان کی ہر زمانے میں یہاں موجود رہتی ہے۔ دہلی سے چار کوس کے فاصلے پر افغان پور ایک قصبہ تھا جو غلاموں کے زمانے میں آباد ہوا تھا اور اس میں افغان ہی آباد تھے۔

خطۂ پنجاب کے باشندے اپنے قد وقامت اور طبعی جرأت کی بنا پر فوجی خدمات کے لیے بہت موزوں اور مناسب تھے' اس لیے سلطان محمود نے جو فوج ہندوؤں سے منتخب کی' وہ تمام پنجابی تھی۔ اس کے جانشین بھی پنجابی فوجیں رکھتے تھے۔ جب دہلی کی طرف مہاجرت ہوئی تو ایک بڑی تعداد ان پنجابیوں کی بھی تھی۔

ملتانی سوداگر

انہی ایام میں ملتانی لوگ بھی جوق در جوق جا کر دہلی میں آباد ہو گئے ہیں۔ ان میں سے بعض تجارت کرتے ہیں' ممالک غیر سے براہ راست ان کے تعلقات تھے۔ تاریخ میں سب سے پہلے ان ملتانیوں کا ذکر غیاث الدین بلبن کے عہد میں ملتا ہے۔ وہ ساہوکارہ کا کام بھی کرتے تھے۔ امراء و رؤسا کو روپیہ قرض دیا کرتے تھے اور اپنی دولت مندی کے لیے ضرب المثل تھے۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں وہ سلطنت کے معاملات میں بھی دخیل ہیں۔ بعض ان میں سے بڑے بڑے عہدوں کے مالک ہیں۔ مثلاً الپ خاں امیر ملتانی' ملک عین الملک ملتانی اور خواجہ حمید الدین ملک التجار ملتانی' جو بعد میں قاضی شہر دہلی بنا دیے گئے اور ملک فضل اللہ ملتانی۔ بعض مشاہیر علماء اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے جن کے فضل و شہرت کی بنا پر تاریخ میں ان کے نام مذکور ہیں۔ مثلاً مولانا محب ملتانی قدیم اور مولانا شہاب الدین ملتانی' سرائے عدل علاء الدین کے کپڑے کی منڈی تمام تر ملتانی تاجروں کے قبضے میں تھی۔ سلطنت نے بیس لاکھ روپیہ' کپڑے کا نرخ ارزاں کرنے کے لیے یکمشت ان کو عطا کیا تھا۔

جب معز الدین اور اس کے والی قطب الدین ایبک نے چند سال کے عرصے میں اجمیر' ہانسی' سرتی' کہرام' میرٹھ' دہلی' بدایوں' قنوج' بنارس' نہروالہ' تھنکیر' گوالیر' کالنجر' اودھ اور مالوہ فتح کر لیے تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس نئے علاقے کے انتظام کے لیے ان کو کس قدر آدمی درکار ہوئے ہوں گے کیونکہ ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر شہر میں ان کو اپنی چھاؤنی رکھنی پڑی ہوگی۔ چاروں طرف طاقتور ہندو راجہ موجود تھے جن کو قدرتاً مسلمانوں سے عداوت تھی۔ اس لیے ہمیں ماننا پڑے گا کہ ان ایام میں شمال سے لوگ بڑی تعداد میں ہجرت

کر کے ہندوستان کی طرف چلے گئے ہیں اور ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ لاہور چونکہ پرانا دارالسلطنت تھا' اس لیے ضروری ہوا کہ یہاں کے لوگ تبدیل دارالسلطنت کے وقت بتقریب ملازمت وتجارت ودیگر خدمات زیادہ تعداد میں جائیں۔

قطب الدین ایبک کے ساتھ جو لوگ ہجرت کر کے دہلی آ گئے ہیں' اگرچہ یوں تو ان میں مختلف اقوام شامل تھیں مثلاً ترک' (جو بڑے عہدوں پر ممتاز تھے) خراسانی جو مناصب دیوانی پر سرفراز تھے' خلج' افغان اور پنجابی' لیکن ان میں زیادہ تعداد موخرالذکر کی تھی جو فوجی اور دیوانی خدمات کے علاوہ زندگی کے اور پیشوں اور شعبوں پر بھی متصرف تھے۔ اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے کہ سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط سے اگر کوئی نئی زبان نہیں بنی تھی تو غزنوی دور میں جو ایک سو ستر سال پر حاوی ہے' ایسی مخلوط یا بین الاقوامی زبان ظہور پذیر ہو سکتی ہے اور چونکہ پنجاب میں بنی ہے' اس لیے ضروری ہے کہ وہ یا تو موجودہ پنجابی کے مماثل ہو یا اس کی قریبی رشتہ دار ہو۔ بہرحال قطب الدین کے فوجی اور دیگر متوسلین پنجاب سے کوئی ایسی زبان اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوتے ہیں جس میں خود مسلمان قومیں ایک دوسرے سے تکلم کر سکیں اور ساتھ ہی ہندو اقوام بھی اس کو سمجھ سکیں اور جس کو قیام پنجاب کے زمانے میں وہ بولتے رہے ہیں۔

دہلی میں آباد ہونے کے بہت جلد بعد ان نو آبادکاروں میں ہندی زا اہل کمال پیدا ہونے لگتے ہیں۔ تاج الدین سنگ ریزہ جو التمش (633ھ) اور اس کے اسباط کا مداح ہے' دہلی کا پہلا شمر نورس ہے' جو ہمیں معلوم ہے۔ وہ اپنے کمال اور ہندوستان زائی کے متعلق ایک شعر میں گویا ہے:

مولد و منشا بہیں در خاک ہندوستاں مرا
نظم و نثرم بیں کہ با آبِ خراساں آمدہ است

ایک شعر میں دو ہندی لفظ سیر اور من باندھ گیا ہے۔ وھو ہٰذا:

خیز از مے قدیم مرا سیر کن بر طل
بگذر ازیں حدیث کہ یک سیر و یک من است

پنجاب کی اہمیت

غلاموں اور ان کے جانشین خلجیوں کے دور میں پنجاب کو اس عہد کی سیاسی وجوہ کی بنا پر زبردست اہمیت مل گئی تھی یعنی چنگیزی مغلوں کے حملے بار بار ہند پر ہوتے تھے۔ ان حملوں کی روک تھام کے لیے سلاطین دہلی حکومت ملتان و دیپالپور کے لیے اکثر تجربہ کار و بہادر سپہ سالار یا ولی عہد سلطنت کو نامزد کرتے تھے جو ایک بڑی فوج کے ساتھ ہر وقت ان کے مقابلہ کے لیے تیار رہتا تھا۔ چنانچہ شمس الدین التمش نے اپنے فرزند رکن الدین فیروز شاہ کو ریاستِ لاہور دی۔ ناصر الدین محمود نے شیر خاں کو جو ایک مشہور جنگ آزما تھا' پنجاب کا

حاکم بنایا۔ غیاث الدین بلبن نے اپنے ولی عہد سلطان محمد شہید کو ایالت ملتان ولاہور دی۔ چنانچہ مغلوں کے ہاتھ سے یہ شہزادہ جنگ میں مارا گیا۔ اس کا فرزند شہزادہ کیخسرو اس کا جانشین بنایا جاتا ہے۔ جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے اپنے ولی عہد ارکلی خاں کو حاکم لاہور و ملتان وسندھ مقرر کیا تھا۔

غازی ملک تغلق

علاء الدین کے عہد میں ملک ہزبر الدین ظفر خاں اور بعد میں غازی ملک تغلق والیٔ پنجاب ہوئے۔ اوّل الذکر مغلوں کے ہاتھوں ہی سے شہید ہوتا ہے۔ غازی ملک تغلق کو پنجاب کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ بقول ابن بطوطہ وہ اتراک قرونہ سے تھا۔ بقول فرشتہ اس کا باپ ملک تغلق' غیاث الدین بلبن کا غلام تھا اور پنجاب کے جاٹوں میں اس نے شادی کی تھی جس سے غازی تغلق پیدا ہوا۔ اس طرح غازی ملک پنجابی ہے۔ ان ایام میں ہندو اپنی بیٹیاں مسلمانوں کو دے دیا کرتے تھے۔ اس خاندان نے اکثر شادیاں ہندوؤں میں کی ہیں۔ فیروز شاہ تغلق کی ماں بھی رانا مل بھٹی والیٔ ابوہر کی دختر تھی۔ غازی ملک کا تمام وقت پنجاب میں گذرا اور قطب الدین مبارک شاہ کے آخر عہد تک والیٔ دیپالپور رہا۔ اس عرصے میں مغل حملہ آوروں سے بیس مرتبہ اس نے جنگیں کیں اور ہر جنگ میں ان کو ہزیمت دی۔ جب خسرو نمک حرام نے غداری کر کے خلجی خاندان کے تمام افراد کو قتل کر دیا اور خود تخت دہلی پر قابض ہو گیا' غازی ملک کی رگِ حمیت حرکت میں آئی۔ وہ ایک بڑی فوج کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھا اور خسرو نمک حرام سے اپنے آقاؤں کے خون کا بدلہ لے کر عام خواہش کے مطابق 728ھ میں بادشاہ ہندوستان بن گیا اور غیاث الدین تغلق کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوا۔ یہ اس کے افعالِ شریفہ کا انعام تھا کہ غازی کو تخت ہندوستان مل گیا' لیکن ہمارے لیے سب سے زیادہ دلچسپی کا امر یہ ہے کہ غیاث الدین پنجابیوں کے لشکر کے ساتھ دہلی میں داخل ہوتا ہے جس نے وہاں آباد ہو کر دہلی کی زبان پر بے حد اثر ڈالا ہو گا اور دہلی کے کوچہ و بازار میں ہر طرف پنجابی اور پنجابی بولنے والے نظر آتے ہوں گے۔ جب نارمنوں کی فتح نے انگریزی زبان پر ایک نہ مٹنے والا اثر ڈالا اور ہمیشہ کے لیے اس کی رفتار کو بدل دیا تو ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دہلی پر ان پنجابیوں نے کس قدر اثر ڈالا ہو گا جو دیپالپور سے اُٹھ کر دہلی آباد ہونے کے لیے آ گئے تھے۔ اگرچہ دہلی کے مسلمان اس سے پیشتر بھی کوئی ایسی ہی زبان بول رہے تھے' جو ان دیپالپوریوں کی زبان کے بہت قریب تھی۔

تغلقوں کے عہد میں دہلی میں جس قسم کی زبان بولی جاتی تھی' اگر ہم کو اس کے نمونے دیکھنے ہیں تو قدیم دکنی اردو کے ادبیات دیکھنے چاہئیں جو اس زبان کے بہت قریب ہیں۔ دکنی زبان میں شعر و شاعری کا آغاز اور اواخر قرنِ نہم سے شروع ہو جاتا ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ اس عہد تک بعض تصنیف ہم کو مل جاتی ہیں۔ ان میں سب سے قدیم میراں جی شمس العشاق کی تصنیفات ہیں۔

دکن میں اردو

خلجیوں نے دکن سب سے پہلے آباد کیا اور اردو مسلمانی فتوحات کے ساتھ وہاں پہنچ گئی' لیکن یہ غیاث الدین کا فرزند محمد تغلق 752ھ ہے جو دہلی کی زبان کو دولت آباد پہنچاتا ہے۔ محمد تغلق کو عالمگیر کی طرح دکن سے بے حد شغف تھا۔ شہزادگی کے زمانے میں بچشم خود دیکھ آیا تھا۔ ورنگل اس نے دوبارہ فتح کیا ہے۔ دولت آباد کے قدرتی استحکام نے اس کے دل پر بے حد اثر ڈالا۔ یہ شہر اس کے نزدیک دارالسلطنتِ ہند کے لیے زیادہ مناسب اور مرکزی تھا۔ وہاں سے دہلی' گجرات' لکھنوتی' ستگانو' سنارگانوں' تلنگانہ' معبر' دھور' سمندر اور کنپلہ وغیرہ ایک مسافت پر آجاتے تھے' اس لیے 728ھ میں ایک صبح اس نے یہ اعلان کر دیا کہ رعایائے دہلی مع ان قصبات کے لوگوں کے جو دہلی سے چار چار کوس کے اندر واقع تھے' تمام و کمال' امیر و غریب' پیر و جوان مع زن بچہ کنیز و غلام دولت آباد کی طرف کوچ کریں۔ شہر و نواحی کو یہ ہوشربا حکم ملا اور حکم کے ملتے ہی اس کی تعمیل شروع ہوگئی۔ شاہی فرمان اس قدر سخت تھا کہ شہر و قصبہ کے انسان تو انسان بلی کتے تک فراموش نہیں ہوئے تھے۔ ان ایام میں دہلی کے گرد و اطراف میں بے حد قریات و قصبات آباد تھے۔ لوگ اپنی زمینیں' جائداد اور آباد گھر چھوڑ کر تعمیلِ فرمان میں روانۂ دکن ہوئے۔ سلطنت نے مسافروں کی سہولت کے لیے کسی قدر انتظام بھی کیا اور زادِ راہ بھی محتاجوں اور بے استطاعتوں کو ملا' لیکن دہلی کی آرام طلب اور خانہ دوست رعیت کو یہ سفر راس نہ آیا اور بہت سے راستے میں تلف ہوگئے۔ چند سال کے بعد سلطان نے فرمان عام جاری کر دیا کہ جس کا جی چاہے دہلی چلا جائے اور جس کا جی چاہے دولت آباد میں رہے۔ اس حکم پر بعض صاحبِ استطاعت واپس چلے گئے' لیکن ایک بڑا حصہ مرہٹواڑی ہی میں رہ پڑا اور آباد ہو گیا۔ اس طرح دہلی کی زبان دکن پہنچ گئی۔ محمد تغلق کے آخر زمانۂ سلطنت میں امیرانِ صدہ نے دکن میں بغاوت کر دی۔ موت نے بادشاہ کو اتنی مہلت نہ دی کہ باغیوں کی سرکوبی کرتا۔ 748ھ میں حسن گنگو علاء الدین شاہ کے نام سے بادشاہِ دکن بن گیا اور تقریباً دو سو سال تک بہمنی خاندان دکن میں حکومت کرتا رہا اور 933ھ میں ختم ہوا۔ یہ پہلا افغان خاندان ہے جو ممالک ہند میں سریر آرا ہوتا ہے۔ بہمنیوں کی میراث پانچ سلطنتوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ (1) عماد شاہی جسے 980ھ میں نظام شاہی برباد کرتے ہیں۔ (2) نظام شاہی جنہیں اکبر کی فوجیں 1004ھ میں فتح کر لیتی ہیں۔ (3) برید شاہی جو 1018ھ تک حکمرانی کرتا ہے۔ (4) عادل شاہی' ان کو 1097ھ میں عالمگیر فتح کر لیتا ہے۔ (5) قطب شاہی 1098ھ میں عالمگیر ان کا علاقہ اپنی قلمرو میں شامل کر لیتا ہے۔ جو سلطنتیں ان میں طاقتور اور ممتاز تھیں اور جن کے زمانے میں اردو ادبیات کو فروغ ہوتا ہے' قطب شاہی اور عادل شاہی ہیں۔ تین سو پچاس سال کے بعد ان علاقوں کا دہلی کے ساتھ الحاق ہوتا ہے۔ اس زمانے میں دہلی سے دکنیوں کا براہ راست کوئی تعلق نہیں رہا اور نتیجہ یہ نکلا کہ دکنی اردو متعدد امور میں جو بعض صرف و نحو سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض

محاورہ سے مختلف ہوگئی۔ اسی امتیاز کے ظاہر کرنے کے لیے اہلِ علم نے ایک کا دکنی اور دوسری کا نام اردوئے معلّٰی رکھ دیا لیکن یہ فرق ان زبانوں میں کیوں آ گیا۔ اس کا جواب یہی ہے کہ دکنی تغلقوں کے عہد کی زبان کی جو دہلی میں بولی جاتی تھی تقلید کر رہے ہیں۔ ادھر اردو زبان دہلی میں آنے والے سیاسی واقعات اور ماحول سے برابر متاثر ہوتی رہی اسی لیے ایک یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ تغلقوں کے زمانے سے پیشتر ہی اردو ایک علیحدہ اور مستقل زبان بن چکی تھی اور اس نے اپنی صرف ونحو کے قواعد علیحدہ مقرر کر لیے تھے۔ ممالک گجرات اور دکن دوسرے الفاظ میں بمبئی پریسیڈنسی (علاوہ سندھ) اور مدراس پریسیڈنسیوں کی زبان میں بہت کم فرق ہے اور جو فرق ہے اس قابل نہیں کہ بیان کیا جائے۔ اس کی وجہ بھی تاریخی ہے۔ خلجی گجرات کو دوبارہ فتح کرتے ہیں لیکن محمد تغلق کے جانشین سلطان فیروز شاہ متوفی 790ھ کے بعد گجرات نے دکن کی تقلید کر کے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور تقریباً دو سو سال تک گجرات دہلی سے علیحدہ رہا۔ 980ھ میں جلال الدین اکبر نے دوبارہ اس کو فتح کیا۔ جس قسم کی اردو گجراتیوں نے تغلقوں سے سیکھی تھی وہ اسی پر قائم رہے۔ اس کے علاوہ دکن اور گجرات ہمسایہ ممالک ہیں اور ان میں تعلقات بھی قائم تھے۔ قصہ مختصر یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر گجرات اور دکن میں ایک ہی زبان رائج ہے۔ گجراتی اردو میں بھی دسویں صدی سے تصنیفات شروع ہونے لگی تھیں۔

سید خضر خاں

پنجاب ایک مرتبہ اور خضر خاں کی صورت میں دہلی پر حملہ کرتا ہے۔ خضر خاں ملک سلیمان کا فرزند ہے جس کو ملک مردان دولت نے اپنا پسر خواندہ بنایا تھا۔ ملک مردان دولت ملتان کا حاکم تھا۔ اس کی وفات پر اس کا فرزند صلبی ملک شیخ جانشین ہوا جس کی وفات پر ملک سلیمان حاکمِ ملتان بن گیا۔ اس کے بعد اس کا فرزند خضر خاں فیروز شاہ تغلق کے حکم سے حاکمِ ملتان بنا دیا گیا۔ جب سارنگ خاں نے اس سے ملتان چھین لیا خضر خاں تیمور کے حملہ 801ھ کے ایام میں امیر سے دہلی میں جاملا۔ امیر نے اس کی خدمات پسند کر کے ملتان و پنجاب کی حکومت پھر اس کے حوالے کر دی۔ خضر خاں اپنے آخری حملے میں جو 816ھ میں کیا گیا تھا دہلی پر قابض ہو گیا۔ اس حملے کے تفصیلی حالات معلوم نہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ خضر خاں کے ساتھ اس وقت ساٹھ ہزار سوار تھے۔ ذوالحجہ سنہ مذکور میں حملہ ہوا اور 15 ربیع الاول 817ھ میں دولت خاں لودھی نے جو دہلی پر قابض تھا ہتھیار ڈال دیئے۔ خضر خاں کی تمام فوج پنجاب سے تعلق رکھتی تھی جس طرح کہ وہ خود پنجابی تھا اور جب وہ بادشاہ بن گیا ہے تو ظاہر ہے کہ دہلی کی زبان پر پنجاب کا اثر مجدداً ہو گیا ہوگا۔

بہلول لودھی

لودھی پٹھان بسلسلۂ تجارت ہندوستان آتے رہتے تھے۔ ان میں ملک بہرام اپنے بھائی سے

ناخوش ہو کر ملتان چلا آیا اور بعہد فیروز شاہ تغلق ملک مردان دولت حاکمِ ملتان کے ہاں ملازم ہو گیا۔ اس کے پانچ فرزند ہوئے' ملک سلطان شاہ' ملک کالا' ملک فیروز' ملک محمد اور ملک خواجہ۔ باپ کی وفات پر پانچوں بھائی ملتان ہی میں آباد رہے۔ جب خضر خاں حاکم ملتان بن گیا' ملک سلطان شاہ اس کے ہاں ملازم ہو گیا اور کچھ عرصے میں افغانوں کی ایک جماعت کی افسری حاصل کر لی۔ خضر خاں کی ملو اقبال خاں کے ساتھ جو جنگ ہوئی' اس میں سلطان شاہ نے غیر معمولی بہادری دکھائی۔ وہ دشمن کی صفیں چیرتا ہوا ملو اقبال خاں تک پہنچ گیا اور اس کا سر کاٹ لایا۔ اس خدمت کے صلے میں خضر خاں نے اس کی قدر دانی کی اور اسلام خاں کا خطاب دے کر سرہند کی حکومت عنایت کر دی۔ اسلام خاں کے بھائی اس کے ہمراہ رہے اور ملک کالا جو بہلول کے باپ کا نام ہے' پرگنہ دورالہ کا حاکم بن گیا۔ ملک کالا کی بیوی پورے دنوں سے تھی۔ عین اس وقت مکان کی چھت گری جس کے نیچے دب کر وہ فوت ہو گئی۔ اس شبہ میں کہ کہیں بچہ زندہ ہو' مرحومہ کا پیٹ چاک کیا گیا۔ دیکھا تو بچہ زندہ و سلامت تھا۔ اس کا نام بہلول رکھا' ویسے ملو کہا کرتے تھے۔ ملک کالا نیازی افغانوں کی جنگ میں مارا گیا اور یتیم بہلول اس کے چچا اسلام خاں کے پاس پہنچا دیا گیا۔ سن رشد کے قریب بہلول نے ایک جنگ میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے۔ اس پر اسلام خاں نے اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر دی۔ اب اسلام خاں اس قدر طاقتور ہو گیا تھا کہ بارہ ہزار افغان جن میں اکثر اس کے خویش اور ہم قوم تھے' اس کے ملازم تھے۔ اپنی وفات پر اسلام خاں نے فرزندانِ نرینہ چھوڑنے کے باوجود ملک بہلول کو بروئے وصیت اپنا جانشین بنا دیا۔ اب اسلام خاں کی فوج کی تین ٹولیاں بن گئیں۔ ایک ٹولی بہلول کے تابع تھی۔ دوسری ملک فیروز برادر اسلام خاں کی اور تیسری قطب خاں خلف اسلام خاں کی۔ بہلول اپنی حسنِ تدبر سے رفتہ رفتہ دوسری جماعتوں کو توڑ کر طاقتور بن گیا اور سلطنت دہلی کا کبھی باغی اور کبھی مطیع رہ کر 855ھ میں بادشاہ دہلی بن گیا۔ اگرچہ اس کے لشکر میں زیادہ تعداد افغانوں کی تھی' لیکن یہ افغان وہ تھے جو زیادہ تر پنجاب میں آباد تھے۔

ان چند مختصر بیانات سے (جو میں نے اوپر عرض کیے ہیں) بخوبی واضح ہوتا ہے کہ سیاسی نقطۂ نظر سے پنجاب کا اثر دہلی پر ہر عہد میں نمایاں رہا ہے۔

یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ سیاسی واقعات کا اثر زبان پر بہت گہرا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ہم اردو اور پنجابی زبانوں کی صرف و نحو' ان کے قواعد اور عام ہیئت کا مقابلہ کرتے ہیں تو یہ اثر قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے اور دونوں زبانوں کی مماثلت کا راز صریح طور پر آشکار ہو جاتا ہے۔ آئندہ باب میں اسی مسئلے پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

حواشی:

1- مسعود رازی کے اشعار یہ ہیں:

مخالفان تو موران بدند مار شدند
بر آر زود ز موران مار گشتہ دمار

مدہ زمان شاں زیں پیش و روزگار مبر　　　　کہ اژدہا شود از روزگار پابد مار

(تعلیق صفحہ 744)

2- مسعود جس کا تخلص مسعودی ہے ہندوستان میں بزمانہ امارت سیف الدولہ محمود 470ھ کے قریب وفات پاتا ہے۔ ابوالفرج اس کا فرزند ایک قصیدے میں سیف الدولہ محمود سے اپنے باپ کی تنخواہ پر تقرری کا ملتمس ہے۔

کز وجو ہے کہ داشت مسعودی　　　　کند آنرا ملک بداں تعیین

پنجاب

پنجاب اگرچہ میانداب کا ہمسایہ ملک ہے' لیکن رسم ورواج اور اوضاع واطوار میں اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہندو اقتدار کے دور میں میاندابیوں اور پنجابیوں میں چشمک رہی ہے اور میانداب جو اپنے سنسکرت کے تمدن پر نازاں تھا' پنجاب کو وحشی ملک تصور کرتا رہا ہے۔ مہابھارت اور پتنی کے بعض اشاروں سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے لوگ کسی باقاعدہ نظام کے ماتحت نہ تھے' نہ ان کا کوئی بادشاہ تھا۔ وہ ہمیشہ جنگ و فساد میں مبتلا تھے۔ ان کے ہاں برہمن نہیں تھے۔ تمام پنجاب چھوٹے چھوٹے رئیسوں میں منقسم تھا جو ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے۔ باشندے ویدوں کا احترام نہیں کرتے تھے اور نہ دیوتاؤں پر قربانیاں چڑھاتے تھے۔ وہ بالکل وحشی اور غیر مہذب تھے۔ شراب پیتے تھے اور ہر قسم کا گوشت کھانے کے عادی تھے۔ ان کی عورتیں قد وقامت کی بڑی' رنگ کی پیلی اور اخلاقاً گندی ہوتی تھیں۔ کئی کئی شوہر رکھتی تھیں۔ ایک شخص کا وارث اس کا فرزند نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی بہن کا لڑکا ہوتا تھا۔ یہ بیانات دشمنوں کی قلم سے ہیں اور بہت ممکن ہے ان میں صداقت کا عنصر بہت کم ہو۔

بہرکیف اسلام کی آمد پر پنجاب کی حالت میں ایک انقلاب رونما ہوتا ہے اور اہل پنجاب حلقہ' بگوشِ اسلام ہو کر دینی و دنیاوی ترقی کرتے ہیں۔ ابھی مسلمانوں کو دہلی میں آباد ہوئے ایک صدی بھی نہیں گذرنے پائی ہے کہ ہم دہلی کے دربار میں پنجاب کے بعض مشاہیر امراء وفضلا دیکھتے ہیں۔ اگرچہ اس عہد کی تاریخ کے فقدان نے ہمارے لیے یہ امر ناممکن کر دیا ہے کہ کوئی مکمل بیان اس عہد کے مشاہیر پنجاب پر دیا جائے لیکن یہاں میں بعض ایسے اسماء درج کرتا ہوں جو خاکِ پنجاب سے ہیں اور اتفاقیہ اس زمانے کی تاریخ میں ان کے نام مل جاتے ہیں۔

مشاہیر پنجاب

ساتویں صدی میں اگرچہ پنجاب دار السلطنت ہند نہیں رہا تھا' تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب کے شہروں میں مقتدر ہستیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ مثلاً ملک عین الدین علی شاہ کوہ جودی۔ یہ بلبن اور کیقباد کے عہد میں امیر تھے۔ ملک تاج الدین کہرامی اور ملک نصیر الدین کہرامی اسی زمانے کے امراء میں داخل ہیں۔ سامانہ سے

سید عزیز اور سید معین الدین ممتاز اور زہد و اتقاء و علو و نسب میں شہرۂ آفاق تھے۔ قاضی رکن الدین بھی سامانہ کے باشندے ہیں اور جید علمائے وقت میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا رکن الدین سنامی اور مولانا ضیاء الدین نامی خلجیوں کے عہد کے علماء سے ہیں۔ موخر الذکر محکمہ احتساب کے افسر تھے اور صوفیا کے خلاف تھے۔ انہوں نے اپنی تصنیف یادگار چھوڑی ہے۔ مولانا علاء الدین لاہور کے باشندے اور اپنے زمانے کے ممتاز علماء میں محسوب تھے۔ قصور سے مولانا سراج الدین پیدا ہوتے ہیں' جو فضل و کمال سے متصف تھے۔ ملتان میں شیخ بہاء الدین زکریاؒ اور اجودھن میں شیخ فرید الدینؒ مشہور تر از آفتاب ہستیاں ہیں۔ ان کا خاندان علم و فضل' تصوف' عرفان کے لیے صدیوں مشہور رہا ہے۔ اگرچہ مغلوں کے حملوں نے پنجاب کو عرصے تک دم نہیں لینے دیا اور اس کی ترقی کی رفتار کو روک دیا' لیکن اسی نقصان سے پنجاب کو یہ فائدہ پہنچا کہ اس نے تین خاندان ہندوستان کو ایسے دیئے جنہوں نے تخت دہلی پر بیٹھ کر پورے دو سو برس تک ہندوستان پر حکومت کی۔ اس معاملے میں ہندوستان کا کوئی صوبہ پنجاب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

پنجابی اور لہندا

ملک پنجاب کی زبان آج کل پنجابی کے نام سے موسوم ہے۔ امیر خسرو اس کو لاہوری کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ابوالفضل ملتانی کہتا ہے۔ مغربی مورخین نے شمالاً و جنوباً ایک خط کھینچ کر مشرقی و مغربی پنجابی میں اسے تقسیم کر دیا ہے۔ مشرقی حصے کی زبان کا نام پنجابی رکھا ہے اور مغربی حصے کی زبان کا نام لہندا۔ پنجابی کو وہ مغربی ہندی میں شامل کرتے ہیں اور لہندا کو بیرونی دائرہ میں داخل کر کے سندھی اور کشمیری کا رشتہ دار مانتے ہیں۔ اہل پنجاب یہ فرق تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا بیان ہے کہ پنجابی اور لہندا ایک ہی چیز ہے۔ مغربی اور مشرقی زبان میں جو فرق ہے' وہ اصولی نہیں ہے بلکہ تدریجی اور ضلع ضلع کی مقامی خصوصیات کی بنا پر پیدا ہوتا چلا گیا ہے اور یہ تقسیم ہر حال میں ناجائز ہے۔

پنجاب اگرچہ پانچ دریاؤں کا ملک ہے' لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ صوبے کی زبان انہی دریاؤں کے مابین محصور ہے بلکہ وہ ان دریاؤں سے چھلک کر دونوں طرف پھیل گئی ہے۔ اِدھر دریائے گھگھر تک آ گئی ہے' اُدھر دریائے سندھ پار کر گئی ہے۔ ایک اہم مغربی عقیدہ یہ ہے کہ پنجابی زبان کی ہمسایہ ہندوستانی زبان جو مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے' ایک زمانے میں تمام مشرقی پنجاب پر پھیل گئی ہے اور اس صوبے کی اصلی زبان لہندا کو ہٹاتی ہوئی یا اس پر چھاتی ہوئی دریائے چناب تک پہنچ گئی' بلکہ بعض اوقات اس کا اثر تھل تک محسوس ہوتا ہے۔ ہند میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سیاسی واقعات کا بہاؤ شمال سے زیادہ تر جنوب کی طرف رہا ہے۔ سیاسی واقعات نیز مغلوں کے دباؤ کے زیر اثر آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں بڑے بڑے گروہ پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی اور اس کے نواح میں آباد ہوتے رہے ہیں۔ بارہویں صدی میں سکھ

پنجاب سے نکل کر اردو، بانگڑ وہ اور بیکانیری علاقوں میں گھس جاتے ہیں۔ ان واقعات کے سامنے ہندوستانی زبان کے شمال کی طرف بڑھنے اور لہندا کو پیچھے دھکیلنے کا کوئی مناسب موقع نظر نہیں آتا۔

پنجابی کے مصنفین

پنجابی میں شعروادب ایک معتدبہ مقدار میں موجود ہے جس کا اکثر حصہ مسلمان دماغوں کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ خواجہ مسعود سعد سلمان کے بعد پنجابی کے پہلے شاعر شیخ فریدالدین مسعودؒ متوفی 664ھ ہیں۔ سکھوں کا بیان ہے کہ وہ فریدالدین ابراہیم ہیں جو گورونانک کے معاصر ہیں۔ ان کے کلام کا کسی قدر حصہ اتفاق سے سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب میں محفوظ ہے۔ دوسرے شاعر گورونانک صاحب ہیں جن کا جپ جی سکھوں میں بہت مقبول ہے۔ شاہ حسین متوفی 1008ھ نے ایک کافی اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ پنجاب کے علماء نے بے شمار کتابیں اور رسالے اس نظر سے تصنیف کیے ہیں کہ مسلمان جماعت کا غیر تعلیم یافتہ طبقہ احکامِ دین، روزے، نماز اور مسائلِ شرعیہ سے ضروری واقفیت حاصل کر سکے۔ ایسی کتابیں اکثر اوقات مختصر نظم کی شکل میں ہوتی تھیں تاکہ لوگ آسانی سے یاد کر سکیں۔ جاہل طبقے کے لیے یہ طریقہ، تعلیم مسلمانوں نے ہندوستان کی باقی زبانوں میں بھی اختیار کیا ہے۔ پنجابی میں ایسی تالیفات کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ اگرچہ بہ تحقیق معلوم نہیں کہ یہ سلسلہ کس زمانے سے شروع ہوتا ہے، لیکن اس کے قدیم ہونے میں کوئی شک نہیں، کیونکہ اکبری عہد کی ایسی تالیفات اب بھی موجود ہیں۔ ان میں مولانا عبدی ابن محمد ساکن باتو کا ''رسالہ مہتدی'' سب سے مقدم ہے جو 997ھ کی تصنیف ہے:

نو سے ورہے ستانویں جاں گزرے وچ شمار
پچھے ہجرت مصطفیٰ تدن تہیا طیار

مولوی عبداللہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں جو جہانگیر کے عہد سے شروع کر کے شاہجہاں کے آخر ایام تک برابر چالیس سال تک تصنیف و تالیف کی پہلی تصنیف ''تحفہ'' 1025ھ میں اور آخری کتاب ''خیرالعاشقین'' 1064ھ میں ختم ہوتی ہے۔ خلاصہ 1034ھ میں، انواع العلوم 1044ھ میں، خیرالعاشقین کلاں 1054ھ میں اور سراجی 1058ھ میں نظم ہوئیں۔ مولانا عبداللہ کے حالات زندگی سے ہم ناواقف ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ انہوں نے علومِ دین اور فقہ کی زبردست خدمت کی ہے۔ مولوی عبداللہ کے مقلدین میں علاماں ناجی (غلاماں ناجی۔ کذا) اور درویش محمد ہیں۔ فقہی رسائل دونوں نے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ علاول بن درویش محمد نے ''مسائل فقہ'' لکھے۔ مولانا عبدالکریم نے 1086ھ ''نجات المومنین'' تصنیف کی۔ 1054ھ میں فقیر شاعر نے ''نورنامہ'' کو نظم کیا۔

عالمگیر کے عہد سے بچوں کی تعلیم کے لیے متعدد کتب نصاب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جن میں

ذریعۂ تعلیم پنجابی زبان ہے۔ کھرل رائے سنامی نے 1105ھ میں ''ایزد باری'' اور امید نے 1106ھ میں ''اللہ باری'' تالیف کیں۔ ''فارسی نامہ'' عبدالرحمان بن محمد قاسم قصوری کی یادگار ہے۔ ''رازق باری'' اور ''واحد باری'' کا ذکر وارث شاہ علیہ الرحمۃ اپنی مثنوی ''ہیر رانجھا'' میں کرتے ہیں۔ ''نصاب ضروری'' کے مالک خدا بخش ہیں۔ 1220ھ میں گنیش داس ''صنعت باری'' پر قلم اٹھاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب نے بچوں اور غیر تعلیم یافتہ گروہ کی تعلیم کا انتظام اور مقامات سے بہتر کیا تھا۔

نیم مذہبی تصنیفات میں احوال الآخرت' معراج نامے' نور نامے' وفات نامے' جنگ نامے وغیرہ قسم کی کتابوں کا بہت وسیع سلسلہ موجود ہے۔ طب میں بھی بعض کتابیں تصنیف اور بعض ترجمہ ہوئی ہیں۔ مثلاً دارالشفا' ترجمۂ قانونچہ' مجربات اکبری وغیرہ۔

قصص و افسانہ کے سلسلے میں ہیر و رانجھا کا قصہ بے حد مشہور ہے۔ مقبل نے محمد شاہی عہد میں اور وارث شاہ علیہ الرحمۃ نے 1180ھ میں اس افسانے کو نظم کر کے ایک غیر فانی شہرت حاصل کر لی ہے۔ ان کے مقلدین میں فضل شاہ نے زیادہ نام پیدا کیا۔ سوہنی مہینوال کے قصے پر سید فضل شاہ' مشتاق رضا اور غمناک نے طبع آزمائی کی ہے۔ سسی پنوں کو ہاشم' سید فضل شاہ' مولوی غلام رسول' احمد یار اور بوٹا نے علیحدہ علیحدہ نظم کیا ہے۔ فضل شاہ نے لیلیٰ مجنوں کی نظم لکھ کر اپنا نام کیا ہے۔ یوسف زلیخا کا قصہ پنجاب میں بہت مقبول رہا ہے۔ متعدد شعراء نے اس کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ مثلاً پیراں دتہ' محمد سعید اور مولوی غلام رسول' لیکن سب سے قدیم عبدالحکیم کی یوسف زلیخا ہے جو 1018ھ میں حلیۂ نظم پہنتی ہے اور راقم سطور نے آئندہ اوراق میں اس سے بہت مدد لی ہے۔ عبدالحکیم اوچہ تحصیل احمد پور کے باشندے ہیں' جو بہاولپور کے علاقے میں واقع ہے۔ عبدالحکیم نے یہ مثنوی اپنے علاقے کی زبان میں جو ملتانی کے نام سے مشہور ہے' لکھی ہے اور نواب بہاول خاں کے نام پر معنون کی ہے۔

صوفی شعراء میں حضرت بلھے شاہ متوفی 1171ھ اور علی حیدر متوفی 1191ھ شہرت خاص رکھتے ہیں۔ بلھے شاہ کی کافیاں صوفی حلقوں میں بے حد مقبول ہیں۔ پنجابی میں ''قصص الانبیاء'' اور ''شاہ نامہ'' جیسی کتابیں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں۔ جنگ نامے پنجابی ادبیات کی ایک اور صنف ہیں جن میں شہید کربلا اور ان کی جنگوں کا ذکر ہے۔ ان میں مقبل کا ''جنگ نامہ'' سب سے قدیم ہے جو 29 جلوس محمد شاہی مطابق 1159ھ۔1160ھ میں لباس نظم پہنتا ہے۔ اس کے علاوہ بارہ ماسے اور سی حرفیاں پنجابی ادب کی خصوصی شاخ ہیں' جواب بالکل متروک ہیں۔ سی حرفی گجراتی اردو میں بھی ملتی ہے اور شاہ علی جیوگام دھنی کے ''جواہر اسرار اللہ'' میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظمیں بھی بارہ ماسوں کی طرح قدیم ہیں۔

پنجابی اور اردو

گذشتہ صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ پنجابی اور اردو اپنی صرف ونحو میں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ یہاں اس بحث پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے۔

(1) مصدر کا قاعدہ دونوں زبانوں میں ایک ہے یعنی علامت ''نا'' امر کے آخر میں اضافہ کر دی جاتی ہے۔ قدیم زمانے میں اس کا رسم الخط دونوں زبانوں میں ''ناں'' تھا۔ بارہویں صدی کے اختتام کے قریب ایسے نون غنہ کو ترک کر دیا جاتا ہے اور دیگر الفاظ سے بھی خارج کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً سیں، کوں، ستیں وغیرہ جو بعد میں سے، کو اور سیتی بن جاتے ہیں۔

(2) تذکیر و تانیث کے قواعد دونوں زبانوں میں ایک ہیں یعنی:

(1) اکثر ایسے الفاظ جو ''الف'' پر ختم ہوتے ہیں، تانیث کی حالت میں ''ی'' پر ختم ہوتے ہیں، مثلاً بکرا، بکری، گھوڑا، گھوڑی، چنگا، چنگی، کالا، کالی، بوٹا، بوٹی۔

(الف) جب اسم مذکر حروف علت کے سوا حرف صحیح پر ختم ہو تو دونوں زبانوں میں تانیث کے لیے ''نی'' یا ''انی'' اضافہ کر دیتے ہیں۔

مذکر	مونث پنجابی	مونث اردو
مغل	مغلانی	مغلانی
لوہار	لہارن۔ لوہاری۔ لوہارنی	لوہاری۔ لوہارن
دیور	دیرانی	دورانی
اونٹ	اونٹنی	اونٹنی
نٹ	نٹنی	نٹنی
فقیر	فقیرنی	فقیرنی
زمیندار	زمیندارنی	زمیندارنی
ڈوم	ڈومنی	ڈومنی
سید	سیدزادی	سیدانی

(ب) اگر مذکر "ی" پر ختم ہو تو مونث میں "ی" نون سے بدل جاتی ہے:

مذکر	مونث پنجابی	مونث اردو
میراثی	میراثن	میراثن
تیلی	تیلن	تیلن
قریشی	قریشن	
موچی	موچن۔ موچیانی	موچن
بھائی	بھین	بہن
قصائی	قصائن	قصائن
جوگی	جوگن	جوگن
درزی	درزیانی۔ درزن	درزن
نائی	نائین	نائن
قاضی	قضیانی	قضیانی
دھوبی	دھوبن	دھوبن
کھتری	کھترانی	

"نی" لاحقہ تانیث جو ہم زمیندارنی، فقیرنی، ڈومنی وغیرہ میں دیکھتے ہیں، درحقیقت پنجابی میں عام علامت تانیث ہے جو عورت کو خطاب کے لیے ابتدا میں لائی جاسکتی ہے مثلاً "نی کڑیے" (اے لڑکی) "نی شیر محمد دی ماں" (اے شیر محمد کی ماں)

(3) اعلام و اسما اور اسمائے صفات دونوں زبانوں میں الف پر ختم ہوتے ہیں، جبکہ برج بھاشا میں واو مجہول پر ختم ہوتے ہیں۔ جیسے:

پنجابی	اردو	
منڈا	لڑکا	
گھوڑا	گھوڑا	
کتا	کتا	
نیولا	نیولا	("خالق باری" میں نیول ملتا ہے۔ مصرع "کژدم بچھو راسو نیول" لیکن اردو نے اپنا قاعدہ مستمر جاری کرکے نیولا بنادیا۔)
نکا	چھوٹا	

وڈا	بڑا
کھبا	الٹا
سجا	سیدھا
اُچا	اونچا

(4) اسماء صفات' تذکیر و تانیث اور جمع و واحد میں اپنے موصوف کی حالت کے مطابق ہوتے ہیں۔ مثلاً۔

اردو: (1) اونچا گھوڑا (2) میرا لڑکا (3) چھوٹی لڑکی (4) بڑے لڑکے (5) دوڑتے گھوڑے سے (6) چھوٹی لڑکیاں۔

پنجابی: (1) اُچا گھوڑا (2) میرا منڈا (3) نکی کڑی (4) وڈے منڈے (5) دوڑدے گھوڑے توں (6) نکیاں کڑیاں۔

برج میں اس موقع پر اونچو گھوڑا اور میرو چھورا لائیں گے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اور پنجابی فقروں میں اسمائے صفات ان کے موصوفوں کے مطابق ہیں یعنی جب موصوف غیر منصرف ہے تو اس کا اسم صفت بھی غیر منصرف رہا' جیسے پہلے تین جملوں میں دیکھا جاتا ہے۔ چوتھے یا پانچویں جملے میں چونکہ موصوف منصرف ہو گئے ہیں یعنی اپنی اصلی عملی حالت لڑکا اور گھوڑا کو چھوڑ کر لڑکے اور گھوڑے بن گئے ہیں' اس لیے ان کے اسما صفات بھی منصرف ہو کر اپنے موصوفوں کی حالت قبول کر کے بڑے اور دوڑتے بن گئے۔ اہل برج اس موقع پر "بڑے لڑکا" اور "دوڑتے گھوڑا سے" لائیں گے جو اردو اور پنجابی کے خلاف ہے۔ یہ فرق اگرچہ بظاہر خفیف ہے' لیکن نہایت اہم ہے۔ چھٹے فقرے میں دیکھا جاتا ہے کہ پنجابی میں جبکہ صفت موصوف باہم متحد ہیں' اردو میں باہم مطابق نہیں۔ چھوٹی واحد ہے اور لڑکیاں جمع میں ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو میں یہ بے ضابطگی میر و سودا کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ اردوئے قدیم میں "چھوٹی لڑکیاں" ہی بولتے تھے جو پنجابی کے عین مطابق ہے:

احمد دکنی:

سوچاووں سے پالیاں سو بالیاں نکھیاں   وفا شرم انو تھے سکیاں سب سکیاں

(5) خبر تذکیر و تانیث' واحد و جمع میں اپنے مبتداء کے موافق آتی ہے:

اردو: (1) یہ بات بھلی نہیں (2) یہ باتیں بھلی نہیں۔

پنجابی: (1) ایہ گل چنگی نہیں (2) ایہہ گلاں چنگیاں نہیں۔

اردو کے دوسرے جملے میں دیکھا جاتا ہے کہ خبر اپنے مبتداء کے مطابق نہیں۔ باتیں جمع ہے اور بھلی واحد' جب کہ پنجابی میں مبتداء اور خبر دونوں جمع ہیں۔ یہ جدت طرازی اسی زمانہ اصلاح سے تعلق رکھتی ہے'

جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ پرانی اردو میں یہ جملہ یوں لکھا جاتا ہے "یہ باتیں بھلیاں نہیں" بلکہ "یہ باتاں بھلیاں نہیں" جو پنجابی سے بالکل موافق ہے۔ سودا کہتے ہیں:

دوانہ ہو گیا سودا تو آخر ریختہ پڑھ پڑھ
نہ میں کہتا تھا اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

(6) فعل تذکیر و تانیث و واحد جمع میں اپنے فاعل کے مطابق ہے:

اردو: (1) گھوڑا آیا (2) گھوڑے آئے (3) عورت آئی (4) عورتیں آئیں۔

پنجابی: (1) گھوڑا آیا (2) گھوڑے آئے (3) بڈھی آئی (4) بڈھیاں آئیاں۔

چوتھے جملے میں بڈھیاں غیر منصرف ہے جو بالکل درست ہے۔ اردو کے جملے میں اسے عورتاں سے منصرف کر کے عورتیں بنا لیا گیا ہے۔ پرانی اردو میں یہی جملہ یوں لکھتے "عورتاں آئیاں" ایک مثال سودا کے کلام میں موجود ہے:

گتھی نکلیں ہیں لخت دل سے تار اشک کی لڑیاں
یہ انکھیاں کیوں مرے جی کے گلے کی ہار ہو پڑیاں

(7) اضافت اپنے فاعل کی تذکیر و تانیث اور واحد جمع کے مطابق ہوتی ہے:

اردو: اس میں کوٹھریاں رنگ برنگی ہیں۔ بعضیاں چاندی کی۔ بعضیاں یاقوت سرخ کی اور بعض زمرد کی اور بعض زبرجد کی اور بعض جواہرات سفید کی۔

پنجابی: اودے وچہ کوٹھریاں رنگ برنگیاں ہیں۔ بعض چاندی دیاں، بعض یاقوت سرخ دیاں، تے بعضیاں زمرد دیاں، تے بعضیاں چٹے جواہرات دیاں نے زبرجد دیاں۔

یہاں اعتراض وارد ہوتا ہے کہ کوٹھریاں جمع میں ہیں اور اضافت "کی" واحد ہے، لیکن یہاں پھر اردو نے اپنے قواعد کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ بارہویں صدی ہجری میں یہی جملہ یوں لکھا جاتا تھا:

"اور اس میں کوٹھریاں رنگ برنگی ہیں۔ بعض چاندی کیاں، بعض یاقوت سرخ کیاں اور بعض زمرد کیاں اور بعض زبرجد کیاں اور بعض جواہرات سفید کیاں۔" (منقول از کتاب ہزار مسائل)

مثال دیگر اردو: یوں نو دہزار باتاں اللہ کیاں ہور محمد کیاں ہویاں (معراج العاشقین، حضرت گیسو دراز)

پنجابی: انج نوے ہزار باتاں اللہ دیاں ہور محمد دیاں ہویاں۔

مثال دیگر اردو: "قیامت کی نشانیاں کتنی ہیں اور کیسی ہیں یا رسول اللہ۔"

قدما کی زبان میں یہ جملہ یوں ہے:

"قیامت کیاں نشانیاں کتنیاں ہیں اور کیسیاں ہیں یا رسول اللہ۔" (از ہزار مسائل)

محمد امین دکنی:

گگن کی گردشاں ہیں کئیں طرح کیاں
کدہیں غم کیاں ہیں اور کدہیں فرح کیاں
(یوسف زلیخا)

(8) ماضی مطلق دونوں زبانوں میں ایک ہے:

اردو: وہ آیا۔ وہ آئے۔ تو آیا۔ تم آئے۔ میں آیا۔ ہم آئے۔ وہ آئی۔ وہ آئیں۔ تو آئی۔ تم آئیں۔ میں آئی۔ ہم آئیں۔

پنجابی: اوہ آیا۔ اوہ آئے۔ تو آیا۔ تسی آئے۔ میں آیا۔ اسی آئے۔ اوہ آئی۔ اوہ آئیاں۔ تو آئی۔ تسی آئیاں۔ میں آئی۔ اسی آئیاں۔

جمع مونث کے صیغوں میں جو فرق پنجابی اور اردو میں ملاحظہ ہوتا ہے، وہ متاخرین کی اصلاحی کوشش کا نتیجہ ہے جس نے قدما کے قاعدوں کو بالکل درہم برہم کر دیا۔ وہ ان صیغوں کو یوں بولتے تھے:

وہ آئیاں۔ تم آئیاں۔ ہم آئیاں۔

محمد امین دکنی:

مصر میں خوب صورت بیبیاں تھیاں   انوں سنیاں زلیخا کی سو باتاں

(9) ماضی قریب فعل مداوی کی تصریف سے بنتی ہے۔ یہاں پنجابی اور اردو میں کسی قدر اختلاف ہے:

مذکر اردو: وہ آیا ہے۔ وہ آئے ہیں۔ تو آیا ہے۔ تم آئے ہو۔ میں آیا ہوں۔ ہم آئے ہیں۔

مذکر پنجابی: اوہ آیا اے۔ اوہ آئے نے۔ تو آیا ایں۔ تسی آئے او۔ میں آیا آں۔ اسی آئے آں۔

مونث اردو: وہ آئی ہے۔ وہ آئی ہیں۔ تو آئی ہے۔ تم آئی ہو۔ میں آئی ہوں۔ ہم آئی ہیں۔

مونث پنجابی: اوہ آئی اے۔ وہ آئیاں نے۔ تو آئی ایں۔ تسیں آئیاں او۔ میں آئی آں۔ اسی آئیاں آں۔

(10) ماضی بعید بھی تو ابع کی تصریف سے بنتی ہے۔

مذکر اردو: وہ آیا تھا۔ وہ آئے تھے۔ تو آیا تھا۔ تم آئے تھے۔ میں آیا تھا۔ ہم آئے تھے۔

مذکر پنجابی: اوہ آیا سی۔ اوہ آئے سن۔ تو آیا سیں۔ تسی آئے سو۔ میں آیا ساں۔ اسی آئے ساں۔

مونث اردو: وہ آئی تھی۔ وہ آئی تھیں۔ تو آئی تھی۔ تم آئی تھیں۔ میں آئی تھی۔ ہم آئی تھیں۔

مونث پنجابی: اوہ آئی سی۔ اوہ آئیاں سن۔ تو آئی سیں۔ تسی آئیاں سو۔ میں آئی ساں۔ اسی آئیاں ساں۔

قدیم اردو میں اسی ماضی کی تصریف یوں تھی:

وے آئیں تھیاں یا آئیاں تھیاں

محمد امین دکنی:

نشانیاں دیکھیاں تھا سو بتائیاں　　　وے سب دائی کے آگے کہہ سنائیاں

دیگر محمد امین دکنی:

بھی جنت کی جلوں کیاں چوٹیاں تھیاں
لٹاں موتیاں کی اُس میں گونتھیاں تھیاں

(11) ماضی ناتمام میں بڑا فرق یہ ہے کہ پنجابی میں جہاں دال ہے اردو میں تے بن گئی ہے:

مذکر اردو: وہ مارتا تھا۔ وہ مارتے تھے۔ تو مارتا تھا۔ تم مارتے تھے۔ میں مارتا تھا۔ ہم مارتے تھے۔

مذکر پنجابی: اوہ مارداسی۔ اوہ ماردے سن۔ تو مارداسیں۔ تسی ماردے سو۔ میں مارداں ساں۔ اسی ماردے ساں۔

مونث اردو: وہ مارتی تھی۔ وہ مارتی تھیں۔ تو مارتی تھی۔ تم مارتی تھیں۔ میں مارتی تھیں۔ ہم مارتی تھیں۔

مونث پنجابی: اوہ ماردی سی۔ اوہ ماردیاں سن۔ تو ماردی سیں۔ تسی ماردیاں سو۔ میں ماردی ساں۔ اسی ماردیاں ساں۔

(12) ماضی احتمالی دونوں زبانوں میں بالکل ایک ہے۔

مذکر اردو: وہ کھاتا ہو۔ وہ کھاتے ہوں۔ تو کھاتا ہو۔ تم کھاتے ہوؤ۔ میں کھاتا ہوؤں۔ ہم کھاتے ہوں۔

مذکر پنجابی: اوہ کھاندا ہووے۔ اوکھاندے ہون۔ تو کھاندا ہوویں۔ تسی کھاندے ہوؤ۔ میں کھاندا ہوواں۔ اسی کھاندے ہوئیے۔

مونث اردو: وہ کھاتی ہو۔ وہ کھاتی ہوں۔ تو کھاتی ہو۔ تم کھائی ہوؤ۔ میں کھاتی ہوؤں۔ ہم کھاتی ہوں۔

مونث پنجابی: اوہ کھاندی ہووے۔ اوہ کھاندیاں ہوون۔ تو کھاندی ہوویں۔ تسی کھاندیاں ہوؤ۔ میں کھاندی ہوواں۔ اسی کھاندیاں ہوئیے۔

(13) مضارع دونوں زبانوں میں ایک ہے۔

مذکر اردو: وہ آئے۔ وہ آئیں۔ تو آئے۔ تم آؤ۔ میں آؤں۔ ہم آئیں۔

مذکر پنجابی: اوہ آوے۔ اوہ آون۔ تو آویں۔ تسی آؤ۔ میں آواں۔ اسی آئیے۔

پرانی اردو میں بھی آوے اور آویں ہی مستعمل تھا۔ آنا دراصل آونا تھا۔ اس سے مضارع آوے اور آویں تھیں۔

(14) فعل حال کی تصریف دونوں زبانوں میں ایک ہی اصول پر ہے۔ ماضی ناتمام کی طرح یہاں بھی دال اور تے آپس میں بدلتی ہیں۔

مذکر اردو: وہ کرتا ہے۔ وہ کرتے ہیں۔ تو کرتا ہے۔ تم کرتے ہو۔ میں کرتا ہوں۔ ہم کرتے ہیں۔

مذکر پنجابی: اوہ کرداا ے۔ اوہ کردے نے۔ تو کرداایں۔ تسی کردے او۔ میں کرداں آں۔ اسی کردے آں۔
مونث اردو: وہ کرتی ہے۔ وہ کرتی ہیں۔ تو کرتی ہے۔ تم کرتی ہو۔ میں کرتی ہوں۔ ہم کرتی ہیں۔
مونث پنجابی: اوہ کردی اے۔ اوہ کردیاں نے۔ تو کردی ایں۔ تسی کردیاں او۔ میں کردی آں۔ اسی کردیاں آں۔
پرانی اردو میں مونث کی گردان زیادہ قریب تھی۔
اردوئے قدیم: وہ کرتی ہے۔ وہ کرتیاں ہیں۔ تو کرتی ہے۔ تم کرتیاں ہو۔ میں کرتی ہوں۔ ہم کرتیاں ہیں۔
مثال: ''واسطے مردوں کے ہے حصہ اس چیز سے کہ کماتے ہیں اور واسطے عورتوں کے حصہ ہے اس چیز سے کہ کماتیاں ہیں۔'' (ترجمہ قرآن از شاہ رفیع الدین صاحب)
مثال: ''ایسی ایسی اوجھڑیں باہم چلتیاں ہیں کہ دیکھنے والوں کی مارے ہیبت کے جانیں نکلتیاں ہیں۔'' (آرائش محفل تالیف 1220ھ صفحہ 26)
(15) مستقبل کا اصول دونوں زبانوں میں ایک ہے یعنی واحد و جمع میں گا اور گے کے اضافے سے بنتا ہے۔
مذکر اردو: وہ آئے گا۔ وہ آئیں گے۔ تو آئے گا۔ تم آؤ گے۔ میں آؤں گا۔ ہم آئیں گے۔
مذکر پنجابی: اوہ آوے گا۔ اوہ آون گے۔ تو آویں گا۔ تسی آؤ گے۔ میں آواں گا۔ اسی آواں گے۔
قدیم اردو میں آوے گا اور آویں گے بولتے تھے' لیکن فصحائے متاخرین جن کی اصلاحات کا کسی قدر تماشا ہم گذشتہ سطور میں دیکھ چکے ہیں آئے گا اور آئیں گے کہلانا پسند کرتے ہیں۔ جمع مخاطب کی واؤ شاید انہیں نظر نہیں آئی ورنہ وہ بھی اصلاح کی قربان گاہ پر چڑھادی جاتی اور ہم آج ''تم آئیگے'' بولتے ہوتے۔ کم از کم اس صورت میں یکسانیت تو ہاتھ سے نہ جاتی۔
مونث اردو: وہ آئے گی۔ وہ آئیں گی۔ تو آئے گی۔ تم آؤ گی۔ میں آؤں گی۔ ہم آئیں گی۔
مونث پنجابی: اوہ آوے گی۔ اوہ آون گیاں۔ توں آویں گی۔ تسی آؤ گیاں۔ میں آواں گی۔ اسی آواں گیاں۔
قدیم اردو میں یوں گردان ہوتی تھی:
وہ آوے گی۔ وہ آویں گیاں۔ تو آئے گی۔ تم آؤ گیاں۔ میں آؤں گی۔ ہم آویں گیاں۔
مثال: اور جنت والے لوگ جس چیز پر نظر کریں گے' پیالیاں اس چیز کیاں بھر کر اوپر منہ اوس نیک بخت بندے کے لگیں گیاں اور آپ سے ہٹ جائیں گیاں۔

دیگر: ''بعد اس کے حوریں بہشت کیاں اپنے ہاتھ میں مالش کر کر اٹھاویں گیاں و بعجز و انکسار سے دعا مانگیں گیاں۔'' (ہزار مسائل)

محمد امین دکنی:

تھی معلوم' تقدیر اس کے تئیں ہاں — کہ کیا کیا مشکلیں آ گل پڑیں گیاں

(16) امر کا قاعدہ اردو و پنجابی میں ایک ہے۔

اردو: دیکھ۔کھا۔لا۔دے۔پی۔نکل۔جا۔

پنجابی: دیکھ۔کھا۔لا۔دے۔پی۔نکل۔جا۔

جمع مخاطب میں تعظیماً دونوں زبانوں میں ایک واؤ اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

اردو: جاؤ۔کھاؤ۔آؤ۔اٹھو۔چلو۔

پنجابی: جاؤ۔کھاؤ۔آؤ۔اٹھو۔چلو۔

(الف) مصدر بمعنی امر دونوں زبانوں میں مستعمل ہے۔

اردو: پرکھنا۔سرکنا۔آنا۔جانا۔یاد رکھنا۔بھول نہ جانا۔سلام کہنا وغیرہ۔

پنجابی: پرکھناں۔سرکناں۔آوناں۔جاوناں۔یاد رکھناں۔

عبدالحکیم:

مگر یک طور میں تھوں یاد رکھناں
کمینے تے اصیلاں کوں پرکھناں

(ب) اردو میں امر کے بعد ''یے'' بڑھا کر مضارع اور امر کا مفہوم ادا کرتے ہیں۔ یہ دستور پنجابی میں بھی موجود ہے۔

اردو: مصرع — سنتا ہی نہیں میری دیوانہ کو کیا کہیے

غالب:

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

میر صاحب:

داد فریاد جا بجا کریئے — شاید اس کے بھی دل میں جا کریئے

پنجابی۔وارث شاہ:

جدوں عشق دے کم نوں ہتھ لائیے پہلاں رب دا نام وہائیے جی
پھر نبی رسول پیغمبراں نوں دم دم درود پہنچائیے جی

(ج) اس صورت میں بعض اوقات ''ی'' ''جیم'' سے بھی بدل جاتی ہے اور ''جے'' بنالیا جاتا ہے اور یہ شکل بھی دونوں زبانوں میں موجود ہے۔

اردو۔میر تقی میر:

ملا یا رب کہیں اس صید افگن سر بسر کیں کو
کہ افشاں کیجئے خوں اپنے سے اس کے دامن دیں کو

پنجابی۔عبدالحکیم:

اکھن یارو کائی تدبیر کیجے کدی باہر مریجے یار دیجے

(یوسف زلیخا۔ص 34)

دکنی اردو میں یہی ''جے'' نون غنہ کے ساتھ بھی ملتی ہے:

محمد امین:

اپن گردن اوپر نا خون لیجیں ہے یہ مطلب پدرسوں دور کیجیں

ایضاً:

پچھیں سونگا اپن اس کر کہ لیجیں سمجھ کر دل بہتر یو کام کیجیں

مغربی مصنفین کہتے ہیں کہ ''یے'' پنجابی میں اردو سے آئی ہے' لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ پنجابی کی مضارع اور ماضی احتمالی میں یہ شکل پہلے سے موجود ہے اور صیغہ جمع متکلم میں ملتی ہے۔ پھر اسے اردو سے لینے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابتدا میں یہ صرف جمع متکلم کا صیغہ تھا' بعد میں اس کا استعمال جمع مخاطب اور واحد مخاطب پر بھی تعظیماً ہونے لگا۔

(17) ''گا'' پنجابی میں حال کے معنی بھی دیتا ہے۔ اردو میں اگرچہ اب تحریر میں متروک ہے' لیکن عوام بولتے ہیں۔ پرانے کلام میں موجود ہے۔

مذکر اردو: وہ ہے گا۔ وہ ہیں گے۔ تو ہے گا۔ تم ہو گے۔ میں ہوں گا۔ ہم ہیں گے۔

مذکر پنجابی: اوہ ہے گا۔ وہ ہیں گے (ہنگے)۔ تو ہیں گا۔ تسی ہو گے۔ میں ہاں گا۔ اسی ہیں گے (ہانگے)

مونث اردو: وہ ہے گی۔ وہ ہیں گی۔ تو ہے گی۔ تسی ہو گی۔ میں ہوں گی۔ ہم ہیں گی۔

مونث پنجابی: اوہ ہے گی۔ اوہ ہیں گیاں۔ تو ہیں گی۔ تم ہو گیاں۔ میں ہاں گی۔ اسی ہاں گیاں۔

میر تقی میر:

ابر اُٹھا تھا کعبے سے اور جھوم پڑا میخانے پر
بادہ کشوں کا جھرمٹ ہے گا شیشے اور پیمانے پر

(18) دعائیہ اردو اور پنجابی میں ایک ہی طریق پر ہے:

اردو: تجھے سانپ ڈسے۔

پنجابی: تینوں سپ لڑے۔

(19) لازمی و متعدی کا دونوں زبانوں میں وہی اصول ہے اور متعدی بالواسطہ کا بھی وہی قاعدہ ہے۔

اردو: سیکھنا۔ سکھانا۔ سکھلانا۔ اٹھنا۔ اٹھانا۔ اٹھوانا۔ جگنا۔ جگانا۔ جگوانا۔ گلنا۔ گلانا۔ گلوانا۔

پنجابی: سکھنا۔ سکھاونا۔ سکھلاونا (سکھالنا)۔ اٹھنا۔ اٹھاونا۔ اٹھواونا۔ جگنا۔ جگاونا۔ جگواونا۔ گلنا۔ گالنا۔ گلواونا۔

اردو: ٹوٹنا۔ توڑنا۔ تڑوانا۔ جلنا۔ جلانا۔ جلوانا۔ پگھلنا۔ پگھلانا۔ پگھلوانا۔

پنجابی: ٹٹنا۔ توڑنا۔ تڑواونا۔ جلنا۔ جالنا۔ جلاونا۔ پگھلنا۔ پگھالنا۔ پگھلواونا۔

اردو میں بھی "جالنا" "بالنا" وغیرہ کا رواج تھا جو اب متروک ہے۔

احمد دکنی:

کتیا توں جلے ہور جالے منجے   تیا کیا گلے ہور گالے منجے

(20) معروف و مجہول کا وہی طریقہ ہے۔ پنجابی میں بھی "جانے" کی تصریف سے مجہول بنایا جاتا ہے۔

اردو: لڑکی ماری گئی۔ لڑکا مارا گیا۔

(21) ندائیہ میں دونوں زبانیں متفق ہیں۔

اردو: اے لڑکو۔ او لڑکیو۔ اے لڑکے۔ اے بھائیو۔ او بے رحم۔ او گدھے۔

پنجابی: اے یاؤ منڈیو۔ اے یائی کڑیو۔ او منڈیا۔ اے بھراؤ۔ او بے رحم۔ او کھوتیا۔

(22) نفی کے وہی معمولی کلمے مثلاً نہ۔ نا۔ ناں۔ نہیں۔ نیں۔ ناہی۔ ناہیں۔ پنجابی میں بھی آتے ہیں، جو ایک زمانے میں اردو میں بھی مستعمل تھے۔

جس موقع پر اردو میں نہ کرو اور نہ جاؤ کہیں گے، ایسی جگہ اہل پنجاب نا کرو اور نا جاؤ کہیں گے۔ مثلاً عبدالحکیم کہتے ہیں:

ولیکن ایہ خیانت نہ کریاں   ایہو ٹکا متھے اپنے نہ لیساں

دیگر:

اسی گل تے مرا دل نا کھڑوسی   جو میتھوں ایہ سخن مولی نہ ہوسی

گویا ''نا'' زیادہ تر تاکید کے لیے آتا ہے۔ دکنی میں بھی یہی ''نا'' موجود ہے۔ احمد دکنی قطب شاہی:

جو بندیاں تھے نا ہوے گنہ کا ظہور — تو کس دھات ہوے نام تیرا غفور

دیگر:

رہا یوں سکی ساتھ موحیط ہوے — جو نا دودھ پیوے خوشی سوں نسوے

پنجابی میں اس کی ایک شکل ''ناں'' بھی ہے' جو دکنی اردو میں بھی ملتی ہے۔ محمد امین دکنی:

کیوسف کی جگہ میں کیوں موا ناں — اے قاتل باگہ میرا کیوں ہوا ناں

دیگر:

اکیلی ایک ساعت چھوڑتی ناں — شفقت دل ستی دے توڑتی ناں

(23) امدادی افعال کے ذریعے سے مختلف مقاصد کے اظہار کے لیے افعال مرکب بنا لینے کا طریقہ دونوں زبانوں میں رائج ہے۔ اردو میں اس کے لیے افعال آنا' ہونا' چکنا' لگنا' سکنا' بیٹھنا' پڑنا' دینا' لینا' ڈالنا' جانا' کرنا' چلنا' کھانا وغیرہ زیادہ مستعمل ہیں۔ ان میں سے اکثر افعال پنجابی میں بھی یہی مطلب دیتے ہیں۔ میں بعض کی مثالیں دیتا ہوں۔

(1) سکنا۔ وارث شاہ:

کی صفت ہزارے دی کر سکاں گویا بہشت زمیں تے آ گھتیائے

عبدالحکیم: بہشتاں نوں بنا بیٹھے نکانہ

(3) بھج جانا (4) میں کم کر چکیاں ہاں (5) بالک رون لگیا (6) اوہ ہسدا رہندا اے (7) منڈا چلا گیا۔

عربی و فارسی الفاظ کی ترکیب سے' جس طرح اردو میں بے شمار مصادر بنا لیے گئے ہیں' پنجابی میں بھی اسی طرح بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً روشن کرنا' قربان کرنا' خاموش کرنا' ہوش آنا' مقصود پانا' داغ پانا' گرفتار ہونا' حیران ہونا' سیر کرنا' آرام پانا' شور کرنا' فرمان دینا وغیرہ۔

گزشتہ سطور کے مطالعے سے ہم پر یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ اردو اور پنجابی کی صرف کا ڈول تمام تر ایک ہی منصوبے کے زیر اثر تیار ہوا ہے۔ ان کی تذکیر و تانیث اور جمع اور افعال کی تصریف کا اتحاد اسی ایک نتیجے کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے' دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے اور جب سیانی ہو گئی ہیں' تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے۔ ان زبانوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے' وہ اکثر اس وقت واقع ہوا ہے' جب اردو کی پرورش شعراء اور تعلیم یافتہ طبقے نے دہلی اور لکھنؤ میں شروع کی ہے۔ انہوں نے اپنی دانست میں اردو کی اصلاح کی۔ مگر اکثر موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ ان کی اصلاح اور ترمیم کے اصول نے ایک صرفی کے نقطۂ نظر سے زبان کے قواعد میں ابتری اور برہمی پیدا کر دی

ہے۔ قدیمی اصول جن پر زبان کی تعمیر ہوئی تھی' جامع' مفید اور کار آمد تھے۔ پرانی جمع کے قاعدے کو انہوں نے بالکل بیکار اور باطل کر دیا۔ اقلیم زبان سے حروف علت ونون غنہ کے اخراج میں ہم ان سے متفق ہو سکتے ہیں لیکن افعال و اسماء سے جمع مونث کے ترک کرنے میں ہرگز ہرگز حق بجانب نہیں۔ اس نے زبان سے موسیقیت اور خوش آہنگی کے ایک بڑے عنصر کو برباد کر دیا ہے۔ کیا کوئی شخص مرزا سودا کے ان اشعار کی خوشنوائی سے انکار کر سکتا ہے جو پرانی طرز میں لکھے گئے ہیں:

خاک و خوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں
اے فلک باتیں تیری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں
وہ رہا دست تاسف کے تئیں ملتا ہوا
جن نے وہ انکھیاں خمار آلودہ ملیاں دیکھیاں

اردو میں قدیم زمانے میں مرفوعی' منصوبی اور مجروری حالتوں کے لحاظ سے تین شکلیں رائج ہوئیں۔ یعنی غماں' غموں' غمیں' پاساں' پاسوں' پاسیں' فکراں' فکروں' فکریں' پچھاں' پچھوں' پچھیں' راتاں' راتوں' راتیں' کدہاں' کدہوں' کدہیں' جدہاں' جدہوں' جدہیں وغیرہ۔

لیکن بعد میں ان کے استعمال میں بے قاعدگی ہونے لگی اور حالت نصبی و مرفوعی و جارہ میں لوگ خلط ملط کرنے لگے حتیٰ کہ قاعدہ بالکل ٹوٹ گیا۔ آج مونث کے علاوہ مذکر اسماء کے ساتھ کبھی یہ تینوں حالتیں نہیں ملتیں۔ جیسے لڑکیاں' لڑکیوں' لڑکییں۔ اسی طرح ہم کی شکل' ہماں' ہموں اور ہمیں ہونی چاہیے لیکن ہماں نہ آج ملتا ہے' نہ پرانے شعراء میں۔ ہموں متاخرین نے متروک کر دیا' لیکن پرانے شعراء میں ملتا ہے۔ محمد امین کہتے ہیں:

تو ہم اک باگ کو ماریں گے دس ل ہموں کو کیا تمہیں بوجے ہو کاہل

دیگر:

ہموں نے دیکھ اس کو گھاؤ کھائی بدن اوپر چھریاں ہاتھوں لگائی

ہمیں خدا کے فضل سے آج بھی زندہ و سلامت ہے۔ علیٰ ہذا۔ غماں' غموں اور غمیں میں متاخرین نے غماں اور غمیں دونوں کو مجبوراً لاستعمال کر دیا۔ غموں آج تک جیتا ہے۔ غماں گذشتہ صدی میں ترک ہوا' جس کی مثال کی کوئی ضرورت نہیں۔ رہا غمیں' اس کی مثال سنیے۔ محمد امین:

توں اول پی پچھوں دے دے امیں کو امیں پی کر بھلاوے سب غمیں کو
غمیں جاوے نکل کر خرمی آوے تیری امداد سیتی مرتبہ پائے

راتاں کچھ عرصہ قبل ترک ہوا ہے۔ راتوں اور راتیں آج بھی جی و قائم ہیں' مگر پاساں' پاسوں' پاسیں آج بالکل مردود ہیں۔ ان کی یادگار باقی رہ گئی ہے۔ اسی طرح کدہاں' کدہوں' کدہیں' جدہاں' جدہوں'

جد ہیں اردو سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ ان امور سے یہ امر منکشف ہوتا ہے کہ زبان کا دائرہ روز بروز تنگ اور محدود ہوتا جا رہا ہے۔

آمدم برسر مطلب' ابھی تک ہم نے صرفیانہ طریق پر دونوں زبانوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ذیل میں ہم ایسے مواد پر نظر ڈالیں گے جو دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو اور پنجابی میں عام ہے۔ ہم نے اس غرض سے مروّجہ اردو سے اعراض کر کے ایسے نمونوں کو لیا ہے جو قدیم اردو سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا اکثر حصہ آج متروک الاستعمال قرار دیا گیا ہے۔ دوسری طرف وہی مواد پنجابی زبان میں بجنسہٖ یا کسی قدر تغیر کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔ اس مطلب کے لیے میں نے دکنی اردو کو لیا ہے' جس کے ادبیات کی قدامت اردو میں مسلّم ہے۔

(۱) سب سے پیشتر ان زبانوں کی وحدت و جمعیت کے قواعد کے متعلق ہمیں کسی قدر اور جاننے کی ضرورت ہے۔ ان زبانوں کی جمع کا اثر تمام جملے پر محیط ہے۔ وہ نہ صرف جملے کے فاعل بلکہ اس کے متعلقات یعنی اسمائے صفات' اضافات' حالیہ ضمائر افعال اور توابعات تک پر آمر ہوتا ہے۔ اس کی طاقت کے اندازے کے لیے ہم ذیل کا جملہ ناظرین کو پیش کرتے ہیں:

مرنے والی لڑکیوں کی مائیں روتی روتی کہتی تھیں۔

پنجابی میں یہی فقرہ آج یوں لکھا جائے گا۔

مرن والیاں کڑیاں دیاں ماواں روندیاں روندیاں کہندیاں سن۔

اُردوئے قدیم میں اس طرح لکھا جاتا:

مرنے والیاں لڑکیاں کیاں مائیاں روتیاں روتیاں کہتیاں تھیاں۔

گویا پورا جملہ جمع کا گلدستہ بن گیا ہے۔ میں بعض مثالیں اور یہاں درج کرتا ہوں:

عبدالحکیم پنجابی:

کیتو سو قید تے زخمی ہزاراں   تے قیدیاں زخمیاں لایاں قطاراں

دیگر:

بی بی سدیاں غلاماں سی ہزاراں   جو کھڑیاں ہر طرف لایاں قطاراں

احمد دکنی قطب شاہی:

گیاں تھیاں آسماں اوپر دے ڈالیاں   انو پھرتے فرشتے مثل چڑیاں

ایضاً:

تری اور بوت جہاں جہاں باجتیاں تھیاں   نفیراں کی آوازاں گاجتیاں تھیاں

اس قاعدے کی دکن اور پنجاب کے ساتھ خصوصیت نہ تھی بلکہ دہلی کے فصحا بھی اسی رنگ میں لکھتے تھے۔ میں یہاں سودا کا ایک اور شعر نقل کرتا ہوں:

جب لبوں پر یار کے مسی کی دھڑیاں دیکھیاں
جوں زحل کی ساعتیں اس دل پہ کڑیاں دیکھیاں

(2) پنجابی میں آ' جا کھا وغیرہ امر کے علاوہ ایک اور امر ہے' جو معمولی امر کے آخر میں ''ئیں'' یا ''ویں'' کے لانے سے بنتا ہے' جیسے آویں' جاویں' لاویں' کھاویں' ڈالیں وغیرہ۔

پنجابی شاعر عبدالحکیم کہتے ہیں:

الٰہی معرفت اپنی دسائیں شفیع ساڈا رسول اللہ کرائیں

دیگر:

جدوں کنعان شہر اندر سدھاویں پھر یک رات دے تائیں نہ جاویں

جہاں تک معلوم ہے' امر کی یہ شکل خاص پنجاب کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسری زبانوں میں نہیں ملتی' لیکن بہت کم لوگ اس امر سے واقف ہیں کہ قدیم اردو میں بھی یہ شکل موجود تھی۔ چنانچہ محمد امین دکنی:

امین دل میں خدا کا عشق راکھیں مجازی عشق کوں سب کا ڑنا کھیں

دیگر:

مرے محبوب کو عزت سوں لائیں براق جنتی اوپر بٹھائیں

(یوسف زلیخا)

محمد خوب اپنی مثنوی ''خوب ترنگ'' تالیف 986ھ میں لکھتے ہیں۔

جوں مجنوں تھا لیلی شاں ووں مجنوں مت کریں گماں

دیگر:

یہ لیلیٰ کا پہلا چال خوبیں سمجھیں نہیں اتال

شاہ میراں جی شمس العشاق متوفی 902ھ:

ایسا کیرا کرب نر اکھیں جے توں ہوی سورا
مان راکھ مرشد ملا دے جس ہے گیان سپورا
(''اردو'' حصہ بست وششم۔ ص 177)

(3) ''گا'' قسم کے مستقبل کے علاوہ جو پنجابی اور اردو میں عام ہے' پنجابی میں ایک اور مستقبل ہے جو ''سی'' کی تصریف سے بنتا ہے۔ اس کا تعلق زیادہ تر لہندا یا ملتانی سے ہے۔ اس مستقبل کا صیغہ واحد غائب دکنی میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ احمد دکنی قطب شاہی:

کدھیں سیج سک سنگ ملسی نہ منجھ کدھیں من کمل پھول کھل سی نہ منجھ
(لیلیٰ مجنوں)

ولی دکنی:

کہا ہے زہر کا تاثیر اس میں
نہ چل سی کچھ مرا تدبیر اس میں

(روضۃ الشہدا۔ص39)

بقول مولوی عبدالحق صاحب کتاب ''سب رس'' مولانا وجہی نے 1040ھ کے لگ بھگ تیار کی ہے۔اس میں فقرہ ذیل ملتا ہے:

جس میں عشق کا کچھ درد اس کتاب کو سینے پر تے ہلاسی نا اس کتاب بغیر اپنا وقت بہلاسی نا۔

مولوی عبدالحق صاحب نے رسالہ ''اردو'' حصہ بست و ششم میں میراں جی شمس العشاقؒ کی تصنیفات پر ایک مضمون لکھا ہے۔اس میں شعر ذیل ملتا ہے:

توں جس کو بھاوے جوڑ نا جاسی یہ گن چھوڑ

''سی'' کی جس قدر مثالیں ملتی ہیں سب صیغہ واحد غائب میں ہیں۔یہ مستقبل ہندوستان کی کئی زبانوں میں ملتا ہے۔مثلاً گجراتی' مارواڑی' جے پوری' نیماڑی اور ملتانی جس کی تصریف حسب ذیل ہے:

گجراتی: ہوں مارس' تو مارسے' تے مارسے' ہم مارسوں' تمے مارسو' تیو مارسے۔

مارواڑی جیسلمیری: ہوں مارس' تو مارس' او مارسے' مھے مارساں' تھے مارسو' او مارسے۔

جے پوری: ہوں مارشوں' تو مارشی' او مارشی' بھے مارشاں' تھے مارشو' او مارشی۔

(بعض علاقوں میں سین مہملہ کے ساتھ بولا جاتا ہے)

نیماڑی: ہوں مارس' تو مارس' وو مارسے' ہم مارساں' تم مارسو' وو مارسے۔

ملتانی: میں مریساں' تو مریسیں' او مریسی' اساں مریسوں' تو ساں مریسو' او مریسن (مریسیں)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سی قسم کا مستقبل دکنی زبان میں کہاں سے لیا گیا ہے۔ہماری نظر میں قدرتاً گجراتی زبان پر پڑتی ہیں جو ہمسایہ زبان ہے' لیکن گجراتی میں یہ صیغہ بیائے مجہول ہے (یا ''شے'' بیائے مجہول جیسا کہ سورت میں بولتے ہیں) اور دکنی میں بیائے معروف ہے' اس لیے گجراتی سے ماخوذ نہیں۔بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راجپوتانہ سے آیا ہو' کیونکہ مولوی عبدالحق صاحب نے اس کی جو اور شکلیں دی ہیں' یہ ہیں:

ہمیں نا کرسیں' نا دیکھسوں' کرسوں' کہسوں (ص 543۔رسالہ ''اردو'' حصہ بست و ہفتم) اور ''جواہر اسرار اللہ'' شاہ علی جیو گام دھنی میں یہ شکلیں ہیں۔

واحد غائب: کریسو = کرے گا (کھولے گھونگھٹ گل لاوے تھندرا کیسو تپتا سیناں) کریسو باتاں = باتیں کرے گا۔جاسی = جائے گا۔ملاسی = ملائے گا۔

واحد حاضر: دیکھسی توں = تو دیکھے گا۔تو کرسی = تو کرے گا۔

واحد متکلم: جان ندیسوں = جانے نہ دوں گا۔ دھرسوں = دھروں گا۔ ملے سوں = ملوں گا۔ ملوں سو = ملوں گا۔ کروں سو = کروں گا۔ میں سو = میں ہوں۔

احمد دکنی:

تجھے نت من مت سوں شادی شراب
برہ کی خماری سے میں سو خراب

(4) ''کھڑ'' اردو میں عام طور پر آتا ہے۔ اس سے کھڑا ہونا اور کھڑا رہنا وغیرہ مصادر بنا لیے گئے ہیں اور محاورے بھی بنائے ہیں۔ اہل لغات اس کا مآخذ پراکرت کا ''کھڈواؤ'' بتاتے ہیں۔ اس توجیہ کے بجائے میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کو پنجابی مصدر ''کھڑنا'' کی ماضی یا اسم مفعول مان لیا جائے۔ ''کھڑنا'' کے معنی پنجابی میں رکنا اور ٹھہرنا ہیں۔ پچھلے معنی کے اشعار ملاحظہ ہوں:

عبدالحکیم:

کہیا یک سن اساڈی گال کھڑ کے کہیا کوئی نہیں میں نال کھڑ کے

دیگر:

بی بی سدیاں غلاماں کی ہزاراں جو کھڑیاں ہر طرف لایاں قطاراں

دکنی میں اکبری عہد کے شعرا میں یہ مصدر موجود ہے۔ احمد دکنی:

کہاں قیس سوں تجھ نسبت کھڑے جو اتھی ہماری شرم بیہیں پڑے

دیگر:

اگر اپنی حد سے پر کٹ پڑے پچھانے جدہاں کام آ کر کھڑے

افسوس ہے کہ ایسا مفید اور کارآمد مصدر ہماری زبان سے متروک ہو گیا۔

(5) ''تھا'' اس غریب کو لغات نگاروں نے مصدر ''ہونا'' کا پسر خواندہ بنا دیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ یہ ''ہونا'' کی ماضی ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ ہونا کی ماضی ''ہوا'' ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہاں وہ بھی ہے اور یہ بھی۔ سنسکرت اور پراکرت کی ٹٹی کی آڑ میں خدا جانے ہم سے کیا کیا قبولوایا جا رہا ہے' لیکن ایک موٹی سی بات یہ ہے' کیا یہ ضروری ہے کہ ہر لفظ سنسکرت کے مآخذ سے نکالا جائے۔ اب میں بجائے اس کے کہ ''تھا'' کو ''ہونا'' کے گلے باندھوں اور پھر ہونا کو سنسکرت ''بھو'' سے استخراج کروں' یہ زیادہ موزوں سمجھتا ہوں کہ اس کو ملتانی زبان کے مصدر ''تھیونا'' (بمعنی ہونا) کا ماضی مان لوں۔ تھیونا کی ماضی تھیا آتی ہے۔ اردو والوں نے اسے یائے اشمام سمجھ کر اڑا دیا اور تھا بنا لیا۔ تھیا اس قدر قدیم ہے کہ ہندی کا سب سے قدیم جملہ جو ہمیں تاریخ میں ملتا ہے' اس میں موجود ہے۔ وہ جملہ یہ ہے:

''برکت شیخ تھیا اک موا اک نہا''

(تاریخ فیروز شاہی من شمس سراج عفیف۔ ص 321)

اس جملے میں ایک خوبی یہ ہے کہ اسے سندھی بھی کہا جا سکتا ہے' پنجابی بھی اور اردو بھی۔ سندھ پر محمد تغلق 752ھ ابھی حملہ کر ہی رہا تھا کہ فوت ہو گیا۔ فیروز شاہ نے اپنی تخت نشینی کے بعد سندھ پر حملہ کیا' لیکن فوج میں قحط اور جانوروں میں وبا پھیل گئی۔ اس بنا پر وہ سندھ کا محاصرہ چھوڑ کر براہِ ریگستان گجرات روانہ ہو گیا۔ اس وقت ہمارا مورخ لکھتا ہے کہ سندھیوں نے یہ جملہ کہا۔ اس جملے کا مطلب ہے کہ شیخ کی برکت سے ہمارا ایک دشمن مر گیا اور ایک بھاگ گیا۔

پنجابی سے دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں۔

مولوی عبداللہ:

اول صفت ثناء ربے نوں رب تھیں بعد رسولؐ　　پڑھو صلواتاں حضرت بھیجو دائم تھیو قبول

(نص فرائض۔ ص5)

دیگر:

حضرت سایہ زمیں نہ پوندا حکمت بجھ کیا　　مت سایہ تے کو پیر دھرے سایہ منع تھیا

(نص فرائض۔ ص6)

(6) پنجابی میں بعض مصادر کی ماضی خلاف قاعدہ آیا کرتی ہے۔ مثلاً کرنے' لینے' دینے اور پینے کی ماضی کیتا' دیتا' لیتا اور پیتا بھی آتی ہے' جو واحد جمع اور تانیث کی صورت میں ملتی ہے۔ برج بھاشا' راجستھانی اور اودھی میں بالکل غیر مستعمل ہے' لیکن قدیم اردو میں کثرت کے ساتھ ملتی ہے۔ پنجابی کی مثالیں دینا فضول ہے' اس لیے کہ آج بھی اس ماضی کا رواج عام ہے لیکن میں اردو کی مثالیں دیتا ہوں:

احمد دکنی:

اگیانی ولے گیان سیتیں جواب　　دیتا ہور کیتا ادب سوں خطاب

دیگر:

فرشتے جو آدم کوں سجدہ کیتے　　سو یہ مان آدم بچن تھے لیتے

(لیلیٰ مجنوں)

محمد امین:

نبی جاگے انہوں نے عرض کیتی　　بڑائی رب نے تم کوں آج دیتی

دیگر:

جو کچھ تم نے لیا سو ہم نے لیتا　　جو کچھ تم نے کیا سو ہم نے کیتا

(یوسف زلیخا)

برج بھاشا اور دیگر زبانوں میں اس کے مقابلے میں کینا' دینا اور کینو' دینو وغیرہ ملتا ہے۔ مثلاً سوداس:

دھنپتی ہوڑ کرت آپس میں شیام کھلونا کیتوری
سورداس پر بھو برہم ستاتن ست ہتکاری دود لیتو ری

اور محمد جائسی:

سونس کے راج رجالیں دیتہاں　　　　میں ورن کارن تپ کیتہاں

لطف یہ کہ یہ شکل بھی اردو میں رائج ہے۔ اگرچہ دکنی میں نہیں ملتی۔ محمد افضل جھنجھانوی:

بہت مدت ہوئی آون نکینا　　　　نہ کاگت ہی کسی کوں لکھ ندینا

(بکٹ کہانی)

(7) پنجابی میں قاعدہ ہے کہ غیر زبان کے آخر میں اکثر ایک یائے زائدہ اضافہ کر دیا کرتے ہیں' جس کے بظاہر کوئی معنی نہیں ہوتے' جیسے نظر سے نظری اور حیات سے حیاتی۔ چنانچہ عبدالحکیم:

میں تیرے دامن اندر دست پایا　　　　تیرے جیہا کوئی نظری نہ آیا

دیگر:

آہی ہک رات خوش وانگوں حیاتی　　　　پیا وچ زندگی عالم سماتی

دکنی میں بھی یہ دستور موجود ہے۔ محمد قلی قطب شاہ متوفی 1020ھ:

کہو رات کن سات کیتی ہیں باتاں　　　　کہ چوتا ہے تم میں تھے رنگ خماری

احمد دکنی قطب شاہی شاعر دربار محمد قلی قطب شاہ:

تجھے نت من مت سوں شادی شراب　　　　برہ کی خماری تھے میں سو خراب

(لیلیٰ مجنوں)

محمد امین:

غمی دے کر خوشی کوں مار کاڑے　　　　زمانہ یوں ہٹ عالم کوں پاڑے

ایضاً:

ہماری موت اور ان کی حیاتی　　　　اگر ہوتی تو مجھ کوں اے خوش آتی

ایضاً:

غروری کا پیالہ جن پیا ہے　　　　انے اپنے سر اوپر دکھ دیا ہے

ایضاً:

اگر یہ موت مجھ دیتا الٰہی　　　　انے یوسف کے تئیں دیتا پناہی

(یوسف زلیخا)

ولی دکنی:

یہ خاک کربلا کی ہے نشانی
تو مہرخ ہوئے گا جس میں نہانی

(روضۃ الشہادتین)

یہ قاعدہ اردو میں بہت دیر تک رہا ہے حتیٰ کہ خواجہ آتش کے ہاں بھی ملتا ہے۔ چنانچہ:

بہار گلستاں کی ہے آمد آمد خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

اور اب بالکل متروک ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اہل اردو اس ''ی'' کی کیا توجیہ بیان کرتے ہیں۔

(8) مانگا تانگا اور مانگے تانگے ایک محاورہ ہے اور اردو میں بالعموم مستعمل ہے۔ اس کے لیے اہل لغات کہتے ہیں کہ:

''مانگا تانگا۔ صفت۔ اول بمعنی مانگا ہوا۔ دوم تابع مہمل۔ قرض لیا ہوا۔ ادھار لیا ہوا۔ مستعار لیا ہوا۔ عاریتاً لیا ہوا۔'' (فرہنگ آصفیہ)

اور مانگے تانگے کے لیے کہا ہے:

''مانگے تانگے۔ تابع فعل۔ مانگے مونگے۔ مانگ لانگ کر۔ مستعار لے لوا کر۔ ادھار لے لوا کر' جیسے مانگے تانگے کام چلے تو بیاہ کرے بلا' یعنی کام جب ہی چلتا ہے' جب اپنی گرہ سے صرف کیا جائے۔'' (فرہنگ آصفیہ)

ہمارے لغت نگار تانگا اور تانگے کو تابع مہمل کہتے ہیں اور مجھے نہیں معلوم ان کے پاس اس کے کیا وجوہ ہیں۔ میں نے کئی دوستوں سے جن کا پایہ اردو میں بلند ہے' دریافت کیا۔ بعض نے کہا تانگا مہمل ہے اور بعض نے کہا کہ عبارت میں موسیقیت پیدا کرنے کے لیے ایک ہم وزن مصنوعی لفظ گھڑ لیا گیا ہے۔ قصہ مختصر اردو میں ایسے بیسیوں الفاظ ہیں' جن کو ہمارے اہل لغات نے بے معنی سمجھ کر تابع مہمل کی ذیل میں داخل کر دیا ہے۔

جب ہم پنجابی پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ بامعنی ہے اور مصدر تانگنا سے مشتق ہے اور مانگنا کا مرادف ہے۔ عبدالحکیم:

نہیں لیکن کسے دی تانگ اوسنوں عزیز مصر لائی سانگ او سنوں

دیگر:

سنائی عشق تیری بانگ او سنوں رہے ہر دم تساڈی تانگ اوسنوں

اور فعل کی مثال میں یہ شعر:

زلیخا جے زلف دی تار تانگے کہے یوسف پھری اے کال تانگے

(یوسف زلیخا)

(9) اسی طرح چپ چپاتے اور چپ چپاتا ہے' جس میں چپاتے کو اہل اردو تابع مہمل مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چپاتا محض حسنِ کلام کے لیے بڑھا دیا گیا ہے اور بے معنی ہے' لیکن جب پنجابی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بامعنی لفظ ہے کیونکہ اس زبان میں برخلاف اردو کے وہ علیحدہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ عبدالحکیم:

جدن یعقوب اس گل نوں پچھاتا　　　　عذر آکھن کنوں ہویا چپاتا

چپاتا' چپ کا مترادف ہے۔

(10) دن دہاڑے ایک اور محاورہ ہے۔ اہل اردو دہاڑے کو تابع مہمل مانتے ہیں اور حسب معمول غلطی پر ہیں۔ دہاڑا در حقیقت پنجابی لفظ ہے اور دن کے معنی دیتا ہے اور اردو کے برخلاف تنہا مستعمل ہوتا ہے۔ عبدالحکیم:

آیا چوتھے دہاڑے قافلہ گھیر　　　　شہر مدین کنوں اس کھوہ دے پھیر

(11) اسی طرح ہلنا جلنا اور ہل جل وغیرہ ہیں۔ اس میں اردو خواں جلنے کو ہلنے کا تابع مانتے ہیں جس کے کوئی معنی نہیں بتاتے۔ حالانکہ پنجابی میں ''جلنا'' چلنے کے معنی میں آتا ہے اور آج بھی مستعمل ہے۔ قدمائے اردو اس لفظ سے واقف تھے۔ امیر خسرو فرماتے ہیں:

من کہ بر سر نمی نہادم گل　　　　بار برسر نہاد و گفتا جل

یہ محاورے ان ایام کی یاد دلاتے ہیں' جبکہ مسلمان لاہور سے کوچ کر کے دہلی جا کر آباد ہو گئے ہیں اور اپنی زبان میں دہلی کی زبان کا پیوند لگا رہے ہیں' کیونکہ یہ محاورے ہندی الفاظ اور ان کے مرادف پنجابی الفاظ سے مل کر بنتے ہیں۔ اسی قسم کے اور محاورے بھی ہیں' جیسے برتن بھانڈا' ایا باسن بانڈا' گورا چٹا' بھلا چنگا' موٹا جھوٹا' سنڈا مسنٹڈا۔

(12) یائے مخلوط قدیم زبانوں میں اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں ملتی ہے۔ چنانچہ اُردو میں متروک ہے اور پنجابی میں اب بھی بدستور موجود ہے۔ اب وہ صرف دو چار الفاظ میں ملتی ہے۔ جیسے کیا اور کیوں وغیرہ۔ یائے مخلوط افعال و الفاظ میں بکثرت آتی تھی اور حرف ماقبل کے ساتھ مخلوط ہو کر تلفظ میں آتی تھی۔ مثلاً لکیا' منگیا' ہویا' پڑیا' رہیا' جلیا' چڑیا (چڑھا)' کہیا' لیائی' چلیا' بڑیاں کا (بڑوں کا)' جانیا' چھوٹیا' لکھیا' مانیا' سنگیاریا (سنگھار) دیکھیا وغیرہ۔

اس قاعدے کا دونوں زبانوں میں اس قدر زور رہا کہ غیر زبانوں کے الفاظ پر بھی اس کا اجرا ہونے لگا۔ مثلاً دنیا' دریا اور خیال کی ''ی'' حرف سابق کے ساتھ ضم ہو کر بولی جاتی تھی۔ عبدالحکیم پنجابی:

دنے راتیں گذاریں اس طرح نال　　　　نہ ہووس دور دل سوں یار دا خیال

احمد دکنی:

جو لیلیٰ دیکھی مائی تھے یو غضب اوتھی وکہ دریا آگ کی موج تب

دیگر:

یہی ہے میرا حال سرو کال میرے حال کا خیال سٹ دیوا تال

اور محمد امین دکنی:

دیتے دیتے جب اس کا مال کھوٹا خلیق سیتی تب اس کا خیال چھوڑا

بلکہ خیال کا لفظ خود میر نے اسی تلفظ کے ساتھ استعمال کیا ہے:

عشق برے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا
دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

میر صاحب نے حسبِ روایت مولانا آزاد خیال کی ''ی'' کے متعلق یہ عذر پیش کیا ہے:

''آپ بموجب اپنی کتابوں کے کہیں گے خیال کی ''ی'' کو ظاہر کرو پھر کہیں گے کہ ''ی'' تقطیع میں گرتی ہے مگر یہاں اس کے سوا جواب نہیں کہ محاورہ یہی ہے۔''
(آبِ حیات)

(13) پنجابی زبان کی ایک عالمگیر خصوصیت یہ ہے کہ تمام ایسے الفاظ کہ جن میں ثانی حرف علت ہو، بہ تخفیف حرف علت تلفظ کیا جاتا ہے۔ مثلاً کان، ناک، ہاتھ اور لات پنجابی لہجہ میں کن، نک، ہتھ اور لت بن جاتے ہیں یا یوں کہنا چاہیے کہ ایسے الفاظ میں برج بھاشا میں پہلے حرف کے بعد حرف علت کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً پگ پنجابی۔ بھاشا میں جا کر پاگ بن گئی۔ اردو میں جو پنجابی اور بھاشا کے بین بین ہے، اس قاعدے کا اثر بہت نمایاں ہے اور دونوں زبانوں کا مقلد ہے۔ کبھی برج کی تقلید کرتی ہے اور کبھی پنجابی کی اور کبھی دونوں کی مثلاً اردو میں جگنا بھی بولتے ہیں اور جاگنا بھی، لیکن اکثر موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ اردو کا میلان زیادہ تر پنجابی قاعدے کی طرف ہے۔

بھاشا	پنجابی	اردو	بھاشا	پنجابی	اردو
بیاکل	بکیل	بکیل	کھیال	کھیڈ (کھیل)	کھیل
چاچا	چچا۔ چاچا	چچا	ہاسا۔ ہانسی	ہاسا	ہنسی
کاپوت	کبوتر	کپوت	چاکھنا	چکھنا	چکھنا
راہے	رہے	رہے	ماکھی	مکھی	مکھی
باندر	باندر	بندر	سانپ۔ سرپ	سپ	سانپ
باجنا	بجنا	بجنا	دہاتورہ	دھتورہ	دھتورہ
پاٹی	پٹی	پٹی	کاچا	کچا	کچا

بھانگ	بھنگ	بھنگ	ناہر	نہر	متروک ہے
ماچھر	مچھر	مچھر	پاتھر	پتھر	پتھر
پاکا	پکا	پکا	کاندھا	کندھا	کندھا
چھاڈو	چھڈو	چھوڑو	آگ	اگ	آگ
کھاٹا	کھٹا	کھٹا	جھوٹ	جھوٹھ	جھوٹ
سانج۔ساچ	سچ	سچ	تاکڑی	تکڑی	تکڑی
گاندھی	گندھی	گندھی	پاگ	پگ	پگڑی
گھانٹی	گھنٹی	گھنٹی	کانچلی		کینچلی
بادل	بدل	بادل۔بدل	بلائی	بلی	بلی
ہاڈی	ہڈی	ہڈی	آگے	اگے	آگے
پاچھے	پچھے	پیچھے	مائی	مٹی	مٹی
لادنا	لدنا	لادنا۔لدنا	کھاٹ	کھٹ	کھاٹ
کھانڈ	کھنڈ	کھانڈ	بھانڈ	بھنڈ	بھانڈ
مانگنا	منگنا	مانگنا	مونگ	منگ	مونگ
ٹوٹنا	ٹٹنا	ٹوٹنا	پاکنا	پکنا	پکنا
جانواسہ	جوانسہ	جوانسہ	لاکڑی	لکڑی	لکڑی
ساجی	سجی	سجی	آچھا	اچھا	اچھا
کھچڑی	کھنچڑی	کھچڑی	کانکر	کنکر	کنکر
آنڈا	آنڈا	انڈا	چال	چول	چاول
ماٹ	مٹ	ماٹ	چالنی		چلنی
چاکی	چکی	چکی	کال	کل	کل
تاتا	تتا	تتا	ڈھانکنی	ڈھکنی	ڈھکنی
پانسلی	پسلی	پسلی	پوتلی	پتلی	پتلی
چھاج	چھج	چھاج	آنب۔آم	انب	آم
جاموں	جموں	جامون	ٹھیکری	ٹھکری	ٹھکری
پھول	پھل	پھول	ٹیکا	ٹکا	ٹیکا
چولھا	چلھا	چولھا	تال	تل۔تلا	تال۔تالاب

گاڈی	گڈی	گاڑی	جاٹ	جٹ	جاٹ
ماسہ	مسا	مسا	موکی	مکی	مکی
ہاٹ	ہٹ	ہاٹ	مول	مل	مول
اوکھلی	اکھلی	اوکھلی	جھاگ	جھگ	جھاگ
ریچھ	رچھ	ریچھ	کانگھی	کنگھی	کنگھی
اون	اُن	اون	آنگن		آنگن
بوڑھا	بڈھا	بڈھا	کام	کم	کام

(14) اے۔ایہ۔اوہ اسمائے اشارہ و بعید کے لیے پنجابی کے ساتھ مخصوص ہیں اور آج بھی رات دن بولے جاتے ہیں۔ دکنی اردو میں دونوں موجود ہیں اور وہی مقصد ادا کرتے ہیں۔ پنجابی کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔ دکنی کی ذیل میں عرض ہیں:

محمد امین:

کدہیں روتی کدہیں ہستی رتی او ‏ ‏ ‏ ‏ کدہیں چپ اور کدیں باتیں کیتی او

دیگر:

کدہیں ہستے کے تیئں غمگیں کرے او ‏ ‏ ‏ ‏ کدہیں غمگیں کے دل شادی بھرے او

دیگر:

نہیں پھرتے اسے کچھ لاگتی بار ‏ ‏ ‏ ‏ کدھوں اے یار ہے کدھوں اے اغیار

دیگر:

کہے اک گال میرے دیکھ تازہ ‏ ‏ ‏ ‏ نہیں اے گال کچھ محتاج غازہ

(15) حالت مجروری میں پنجابی میں کسی لفظ کے آخر ''وں'' بڑھا دیتے ہیں۔ مثلاً پچھوں ہاتھوں یعنی پیچھے سے اور ہاتھ سے۔

عبدالحکیم:

پچھوں اس تھیں کڑی بیہوش ہو کے ‏ ‏ ‏ ‏ سوتی نہ ذرہ توڑے روئے دھو کے

دکنی میں بھی یہ قاعدہ موجود ہے۔ مثلاً:

محمد امین:

بٹی کا حال دیکھا آ کے نظروں ‏ ‏ ‏ ‏ کمر گئی ٹوٹ اس دہشت کی فکروں

حالت ظرفیہ میں ''یں'' لفظ کے آخر میں پنجابی میں لگا دیا جاتا ہے۔ مثلاً عبدالحکیم:

رہا ہر فرد پیغمبر دا جایا ‏ ‏ ‏ ‏ ولے یوسف رہا بختیں سوایا

دکنی اردو میں بھی یہی دستور تھا:

محمد امین:

بہت آرام تھا ساری خلق کوں　　نماری کوئی اُس رات پلک کوں

(16) بعض خلاف قیاس جمع دکنی میں ملتی ہے' جو پنجابی کے بہت مطابق ہے۔ مثلاً سات کی جمع ستیں۔ دو کی جمع دوہوں اور برس کی جمع براں (برساں؟) پنجابی میں یہ جمع یوں آتی ہے۔ ستے' دوہوں اور دریاں۔ احمد دکنی جو محمد قلی قطب شاہ کے دربار کے شاعر ہیں' لکھتے ہیں:

جو احمد کرے آس دہر بن سنگار　　سو اب شہ تھے پائے ستیں سنگار

دیگر:

رتن شعر کے ہیں دوہوں جگ امول　　دوہوں جگ چھپاؤں رتن رول رول

اور محمد امین دکنی:

وو دوزخ کی اگن کون رب نے دھوئی　　گئیں لاکھوں وراں جل میں ڈبوئی

(17) جب ہم مصدر کو منصرف کرنا چاہتے ہیں تو اردو میں قاعدہ ہے کہ مصدر کے آخری حرف الف کو "ی" سے بدل دیتے ہیں۔ مثلاً نکلنا سے نکلنے' جانا سے جانے وغیرہ بنا لیتے ہیں۔ یہ قاعدہ پنجابی میں بھی موجود ہے۔ مثلاً عبدالحکیم:

لب اوس دے تر بھوں خون کھاونے توں　　کرے لب خندہ دل ور چاونے توں

لیکن پنجابی میں زیادہ رائج طریقہ یہ ہے کہ مصدر کے آخری الف کو اسی مطلب سے گرا دیا جاتا ہے' مثلاً کہن لگیا (کہنے لگا)۔ رون لگیا (رونے لگا)۔ مارن لگیا (مارنے لگا) وغیرہ۔

عبدالحکیم:

پچھے اس دے لگے گوہر وساون　　تصدق سر زلیخا دے کراون

دیگر:

ہویا کنعاں دے وچہ کال ظاہر　　لگی نکلن خلق دی جان باہر

اب قدیم اردو اس قاعدے میں بالکل پنجاب کی ہموا ہے۔ محمد افضل جھنجھانوی متوفی 1035ھ:

اگر غم ہے تے میری اگن کا　　کرو کچھ فکر پیارے کے ملن کا

(بکٹ کہانی)

ولی دکنی:

کروں کیا وقت نیں ہے اب ملن کا　　نکچھ فرصت ہے اب باتاں کرن کا

(روضۃ الشہادتین)

دیگر:

لگا دل جوں لوالا جل میں کاپن لگا جوں نرسوں ناری منہ کو ڈہا پن

محمد امین:

رہی اس بات سوں عاجز ہو وائی زلیخا کے اگل بولن نپائی

(18) اکثر ایسے مصادر ہیں جو پنجابی اور اردو میں مشترک ہیں' لیکن یہاں بعض ایسے مصادر کا ذکر کیا جائے گا جو فی زمانہ اردو میں متروک ہیں اور پنجابی میں رائج ہیں۔

(الف) آکھنا: کہنا اور بیان کرنا اور دریافت کرنا' پنجابی میں رائج ہے' لیکن پرانی اردو میں یہ مثال:

محمد امین دکنی:

حقیقت سب تیری میں تجھ کوں آکھی نہیں اس ہی بہتر چھانی میں راکھی

(ب) سڑنا' پنجابی میں جلنے کے معنی میں آتا ہے۔ پرانی اردو میں رائج تھا۔

محمد افضل جھنجھانوی (متوفی 1035ھ):

ارے آساں نجانوں عشق کرناں تمن اس آگ موں ہرگز نہ سڑنا

(بکٹ کہانی)

(ج) لوڑنا: ضرورت ہونا' پنجابی میں بالعموم آتا ہے۔ پرانی اردو میں موجود تھا۔

احمد دکنی:

کرے ایک نیکی تو دے دس ثواب جو لوڑے زیادہ یے دے بے حساب

(لیلیٰ مجنوں)

(د) انپڑنا: پہنچنا۔ دکنی کی مثال۔ احمد دکنی:

جو قاصد کیرے ہاتھ نامہ چڑیا جو نوفل کے نیڑے ترت انپڑیا

(ہ) پچھانا: پہچانا۔ پنجابی میں آج بھی پے کے بعد چھ لاتے ہیں۔ پرانی دکنی اس بارے میں پنجابی کے دوش بدوش ہے۔ محمد امین:

ستارے سعد اور سب نحس جانوں سورج اور چاند کی گردش پچھانوں

دیگر:

پڑے جس کے سو سر اوپر سو جانے مگر وہ حق تعالیٰ سب پچھانے

شاہ میراں جی شمس العشاق "شرح مرغوب القلوب" میں فرماتے ہیں:

"ہور یگانہ ہوا سالک انپڑتوں۔ باج توبہ بندگی کرنا یوں ہے جوں جھالاں کا پانی جھوٹ ہے۔ اے بندگی بی جھوٹ ہے۔ خدا کا پچھانت باج۔" (رسالہ

''اردو'' حصہ بست ششم۔ ص89)

(و) سٹنا: پھینکنا' ڈالنا اور چھوڑنا۔ پنجابی میں آج بھی موجود ہے اور بطور فعل وامدادی فعل رائج ہے

لیکن احمد دکنی:

سوجیوں عشق کے بند میں جا پڑیا   نپٹ گیان سٹ کر جنگل پکڑیا

دیگر:

مجھے لوگ کہتے کہ سٹ دے پرت   پرت چھوڑ دینی کسے ہے سکت

محمد قلی قطب شاہ:

پنکھی سٹے ہیں سب پراں رو رو بھرائے سمندراں
چھوڑے ہیں سب اپنے گھراں دیکھو تو زاری واے واے

(ز) لبھانا: تلاش کرنا' دریافت کرنا۔ عبدالحکیم پنجابی کہتے ہیں:

کہا ہک جو کوئی کھو ہا لبھاویں   اسی وچ چاہ یوسف نوں سٹاویں

دکنی میں انہی معنوں میں آتا ہے۔ محمد امین:

یقیں جو کوئی اللہ بن لبھاوے   مراداں وے کبھی جگ میں نہ پاوے

(ح) لانا: لگانا۔ آج بھی پنجابی میں ملتا ہے اور دکنی سے یہ مثال۔ احمد دکنی:

بھوون کے ناموس کوں آگ لائی   سبس برس کا ننگ مائی ملائی

اور محمد افضل جھنجھانوی:

سکھی کیسی سکھی پیہ نیایا   کوئل نے انب پر چھڑ شور لایا

(ط) پانا: ڈالنا۔ پنجابی میں آج بھی موجود ہے اور پرانی اردو سے یہ مثالیں۔ محمد امین:

خدانے یوں انہوں کے دل میں پایا   عزیز مصر نام اپنا بتایا
تمہیں دل اس فکر کے بیچ نہ پاؤ   اٹھو جیوں آئے تیوں پھر کے جاؤ

(ی) لڑنا: پنجابی میں سانپ کے ڈسنے کے لیے آتا ہے۔ آج بھی کثرت سے بولا جاتا ہے۔ دکنی میں بھی انہی معنوں میں آتا ہے۔ احمد دکنی کہتے ہیں:

جیسے کیس کالی سنپولی لڑے   نہ اترے سہ جگ منتر پڑھے
(لیلیٰ مجنوں)

(ک) نسنا: پنجابی میں بھاگنے کے معنی دیتا ہے۔ کسی قدر اختلاف کے ساتھ دکنی میں بھی ملتا ہے' احمد دکنی کہتے ہیں:

جولیدان آئے فقیراں وراس   چلی سب فقیری جگت چھوڑ نھاس

محمد امین دکنی:

بلا کر لائے چاکر شاہ کے پاس   کہا مایا چرا کر جاتے ہیں ناس

ولی دکنی:

دونوں ہاتاں آپس کے کھو گیا او
تنگ نھاسن لگا ہے سنگ بچہ او

میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہ یاد رہے کہ ان مصادر میں سے بعض ممکن ہے کہ برج یا گجراتی وادودھی میں مل جائیں' لیکن سب بحیثیت مجموعی نہیں ملتے' اس لیے ہم اس قیاس میں حق بجانب نہیں ہیں کہ اردو نے ان مصادر کو برج یا دیگر زبانوں سے لیا ہے' بلکہ ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ یہ اس ذخیرۂ زبان سے تعلق رکھتے ہیں جو مسلمان ابتدا میں پنجاب سے لے کر آئے ہیں۔

(19) میں یہاں بعض ایسے الفاظ کا ذکر کروں گا جو پنجابی اور اردو میں مشترک ہیں' اگرچہ اردو میں اب مستعمل نہیں۔

(الف) ول۔ پنجابی میں طرف کے معنی دیتا ہے۔ دکنی میں اس کی ترکیب سے دولاں بمعنی دو طرفہ آتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ جو اکبر کا معاصر ہے' اپنے ایک قصیدے میں لکھتا ہے۔

دسے فانوس کے درمیانے تھوں یوں جوت دیوے کا
سوتیوں دستا دولاں میں تھے ہیویاں کا برن سارا

(ب) نال۔ ساتھ۔ پنجابی میں آج بھی موجود ہے۔ اردو میں بالعموم رائج تھا۔ محمد افضل متوفی 1035ھ:

بسا یہ تخت اوپر ناریاں رے   پیا کے نال بیٹھی ساریاں رے

محمد امین دکنی:

ہنسے بولے خوشی ہو کے ہموں نال   ہموں اس کو بھی راکھے خوش و خوشحال

دیگر:

انے بھی سات خوشے نیل کنچال
اتے بھی سات سوکھے تھے انوں نال

(ج) کان پنجابی میں بمعنی "واسطے و لیے" آتا ہے اور دکنی میں بھی یہی معنی دیتا ہے۔ عبدالحکیم پنجابی:

سوزاں نے اسے تائیں لیایا کھاہ   میں ہاں حیران اوسے کان اے شاہ

احمد دکنی قطب شاہی:

سو کچھ مان مانس کو کیتا عطا   جو سب کو اسی کان پیدا کیتا

دیگر:

جت میں سدا برہ کا دکھ دکھوں مرے کان جھگڑا روا کیوں رکھوں

(د) کیچڑ کو پنجابی میں چکڑ کہتے ہیں۔ دکنی میں بھی چکڑ آتا ہے۔ احمد دکنی قطب شاہی:

بڈھے جو رکت ہو چکڑ میں پڑے پنکھی جو سٹے کاٹ سوتر پڑے

دیگر:

پچھاڑی جو کھا کر آبی بی بڑیا رکت ہور مائی چکڑ میں پڑیا

(ہ) گھیو پنجابی میں گھی کو کہتے ہیں۔ پرانی اردو میں یہ لفظ بھی آتا ہے۔ میر جعفر زٹلی عہد عالمگیر و شاہ عالم کے مصنف ہیں اُن کے ہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ

ترسے ہمیشہ گھیو کو سمجھائے راکھے جیو کو

جیسا پپیہا پیو کو یہ نوکری کا خبط ہے

(و) چوہڑا بمعنی خاکروب پنجابی لفظ ہے۔ میر جعفر کے ہاں یہ لفظ بھی ملتا ہے:

دبے پر کیا چوہڑے کو سلام نہ پوچھا حلال اور نہ پوچھا حرام

(ز) کھیر: ملتانی میں دودھ کے معنوں میں آتا ہے۔ قدیم اساتذہ دکن بھی اسی معنی میں لاتے ہیں۔ میراں جی شمس العشاق:

تھاں دیکھنیں لاگا بالک لکھ نہ آوے کھیر جس کے انگو بھرم نہ جاوے اس کیوں کہنا پیر

دیگر:

راج دہن کو دیویں مان کر تیوں فقیر جرم نہ چاکھے تاک جب وہ کیا بوجھیں کھیر

(20) یہاں ایسے الفاظ مذکور ہیں جو پنجابی لہجے میں اردو میں مستعمل رہے ہیں۔

(الف) منگنا: پنجابی لہجے میں ہے۔ اردو میں ہم مانگنا کہتے ہیں۔ دکن میں یہی لہجہ رائج ہے۔ احمد دکنی:

سرفراز کرنے منگیا توں منج خداوند اس کا جزا دے تجے

اور محمد امین دکنی:

زلیخا نے شکر رب کا کیا تب جو میں تجھ کو منگا سو مجھ دیا سب

(ب) بندنا: باندھنا۔ پنجابی لہجے میں بندنا یا بنھنا ہے۔ اہل دکن بھی بندنا بولتے تھے۔

مثلاً ''معراج العاشقین'': ''کعبہ کونیت بندنا میراج''

(ج) ہسنا: پنجابی میں بتخفیف نون غنہ آتا ہے یعنی ہسنا۔ اہل دکن بھی ہسنا بولتے تھے۔ محمد امین دکنی:

سوتب یعقوب کے یوں دل میں آیا یوسف کو نیند بھیتر کن ہسایا

دیگر:

یوسف جاگے تو تب پوچھا پدر نے　　　　سپن بھتیر ہسایا تجکوں کن نے

(د) ٹٹنا: ٹوٹنا۔ پہلا پنجابی ہے اور دوسرا اردو۔ اہل دکن نے دونوں طرح سے لکھا ہے۔ احمد دکنی:

پرت جوڑ وہ دوے دل جو جوڑے　　　　نہ ٹوٹے جو آکاس ٹٹ کر پڑے

(ہ) پٹی: پاٹی بمعنی تختی ولوح۔ دکنی پنجابی لہجے میں پٹی لکھتے ہیں۔ احمد دکنی:

پرت حرف تین تن سب کریٹی　　　　کہاں گود میں دھر سکے وہ پٹی

(و) ہتھ: ہاتھ۔ اہل دکن پنجابی طرز میں لکھتے ہیں۔ محمد قطب شاہ:

حضرت نبی کے گیسوواں دونوں اماماں کے پگاں

جبریل جھلاوے اپ ہتاں آرات ساری وائے وائے

(ز) بھکا: بھوکا۔ محمد قلی پنجابی لہجے میں باندھتا ہے:

دونو رویدے بی بی کے آخر دیکھو کیوں دکھ دکھے

لہو میں پڑے پیاسے بھکے دیکھو یہ خواری وائے وائے

(ح) ڈبنا: ڈوبنا۔ دکنی پنجابی لہجے سے بھی واقف ہیں۔ احمد دکنی:

جو ڈبتا نکلتا دسے جگ میں سور　　　　سو شرق پھرا ہوویں نزدیک دور

(ط) بھین: بہن۔ دکنی بھین ہی لکھتے ہیں۔ محمد امین:

چلے تب بھین کے گھر کو خوش حالی　　　　بھین دو کھ دوبل اس صاحب نے ٹالی

(ی) حکیم یوسفی دسویں صدی ہجری کے مشہور مصنف ہیں۔ طب ان کا میدان ہے۔ جس میں کئی تصنیف یادگار چھوڑیں۔

سید مسعود حسن رضوی ایم۔ اے لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی اپنے مضمون ''اردو کے منظوم لغت'' (''خیابان لکھنؤ'' بابت جنوری 27ء) میں حکیم یوسفی کے ایک قصیدے کا ذکر کرتے ہیں جو ''قصیدہ در لغات ہندی'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس قصیدے میں کل چوالیس ابیات ہیں، جن میں سے چند سید صاحب نے اپنے مضمون میں نقل کیے ہیں۔ وہاں سے میں دو شعر یہاں نقل کرتا ہوں:

جیب و کن آمد زبان و گوش داری ریش داں

موچ را می خواں بروت و کانہ کور و بہرہ کر

ہست پیشانی متہ سینہ چتی دست است ہت

موہ روی و چل رواں شو بیت بنشیں دک نگر

ان اشعار میں یہ الفاظ پنجابی لہجے میں ہیں:

کن ۔ متہ ۔ چتی ۔ ہت ۔ موہ ۔ وک = کان ۔ ماتھا ۔ چھاتی ۔ ہاتھ ۔ منہ ۔ دیکھ ۔

(ک) ہور: اور ۔ یہ عاطفہ آج بھی پنجابی میں مستعمل ہے ۔ اردو سے خارج ہو گیا ہے' لیکن قدمائے اردو کے استعمال میں عام طور پر تھا ۔ محمد قلی قطب شاہ 1030ھ:

سمدور ہے یک ہور ندیاں سو ہزاراں   باتاں سو کروڑاں ہیں و لے ٹیک رتن ہے

(ل) لوک: لوگ ۔ پنجابی میں کاف ہے اور اُردو میں گاف' لیکن اردوئے قدیم میں کاف ہی تھا ۔ چنانچہ شاہ برہان الدین جانم متوفی 990ھ:

جو ہوویں لوک عوام   بے مرشد بے قیام

احمد دکنی:

جو لیلیٰ کے لوکاں سنی یہ خبر   سنواری صدر ترت سنگار گھر

(م) جوک: جونک ۔ اہل دکن پنجابی لہجے میں لکھتے رہے ہیں ۔ محمد امین دکنی:

لگے بھوکوں سے مرنے وے سبھی لوک   مریں یو نکلے کہ جوں بھوکے مریں جوک

(س) پنجابی اور اردو میں بعض حروف آپس میں تبدیل ہو جایا کرتے ہیں ۔ مثلاً پنجابی کی ''واؤ'' اُردو میں ''بے'' سے بدل جاتی ہے:

پنجابی	اردو	پنجابی	اردو	پنجابی	اردو
وکنا	بکنا	وچھانا	بچھانا	وری	بیری
وال	بال	وٹا	بٹہ	ورتنا	برتنا
ورتاوا	برتاوا	ویاج	بیاج	وبھٹ	بیھٹ
واگاں	باگاں جمع باگ	ویٹر	بیٹر	وچارا	بچارہ (بیچارہ)
وچار	بچار	وجلی	بجلی	وگھہ	بیگھہ
وکانا	بکانا	وسنا	بسنا	وین	بین
وگاڑ	بگاڑ	واری	باری	ورف	برف
وار	بار	ور	بر	والا	بالا
والی	بالی	وچ	بیچ ۔ بچ	وچنا	بچنا
وکاؤ	بکاؤ	ولّا	بلّا	ویر	بیر
وساکھ	بیساکھ	وسرنا	بسرنا	وس	بس (زہر)
وات	بات	وٹی	بٹی		

(ع) پنجابی کی ''ہے'' اردو میں ''سین'' سے بدل جاتی ہے:

کیہا	کیسا	جیہا	جیسا	کہیں	کسی
اوہ	اوس	ایہہ	اس	ورہ	برس
ترہیہ	ترس	ورہیا	برسا	ورہدا ہے	برستا ہے
سوہرا	سسرا	پچایس	پچسا	تیہہ	تیس
ویہہ	بیس	چالیہ	چالیس	گھاہ	گھاس
		سرہوں	سرسوں		

(ف) پنجابی کی "ہے" اردو میں "الف" سے بدل جاتی ہے۔

پنجابی	اردو	پنجابی	اردو	پنجابی	اردو
ہک	ایک	ہور	اور	ہسوار	اسوار

(ص) پنجابی کی "دال" اردو میں "تے" سے بدل جاتی ہے:

پنجابی	اردو	پنجابی	اردو
دہاگا	تاگا	ماروا	مارتا

(ق) بعض الفاظ میں حروف مقدم موخر ہو جاتے ہیں۔

پنجابی	اردو	پنجابی	اردو	پنجابی	اردو
کوڑا	کڑوا	پھڑنا	پڑھنا	چکڑ	کیچڑ
پچھان	پہچان	بھین	بہن	اناچک	اچانک
		سہرند	سرہند		

قدیم اردو پر پنجاب کا اثر

اردو پر قدیم زمانوں میں پنجابی لہجہ غالب تھا۔ اس کا ثبوت دینا موجودہ حالات میں بہت دشوار ہے' اس لیے کہ ان ابتدائی زمانوں کے' جبکہ مسلمان ہجرت کر کے دہلی میں آباد ہوئے ہیں' نیز اس کے بعد کی تین صدیوں تک کے کوئی کتابی نمونے ہم کو نہیں ملتے' نہ ہم کو یہ علم ہے کہ اس عہد کی برج اور پنجابی میں کیا فرق تھا۔ الغرض برج پنجابی اور اردو کے نمونوں کی عدم حاضری سے ہمارا کام بہت مشکل ہو گیا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جب مسلمانوں کا کثیر گروہ قطب الدین ایبک کے ساتھ شمال سے ہجرت کر کے دہلی آیا ہے تو اپنے ساتھ پنجاب سے کوئی نہ کوئی زبان ضرور لے گیا ہے۔ آیا یہ زبان موجودہ پنجابی کے مماثل تھی یا اس کی کوئی شاخ تھی جواب معدوم ہے۔ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ بہر حال یہ زبان برج اور اس کی ہمسائیگی میں ایک عرصہ دراز تک رہنے سہنے کے باعث بدلنی شروع ہوئی ہے۔

برج اور موجودہ پنجابی کا اصولی فرق گذشتہ سطور میں دکھا چکا ہوں۔ پنجابی کے اکثر الفاظ میں حرف علت کو جب کہ حرف ثانی واقع ہو' گرا دیا جاتا ہے۔ اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ہم فارسی کی تصنیفات اور تاریخوں کی ورق گردانی کرتے ہیں جن میں اتفاقیہ ہندی لفظ آ جاتے ہیں اور ان الفاظ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں پنجابی کا دہلی کی زبان پر خاصا اثر تھا۔ مثلاً پہلا ہندی لفظ جس پر ہماری نظر پڑتی ہے' لک' یعنی لاکھ ہے۔ چنانچہ فارسی خواں اب تک لک ہی بولتے ہیں۔ قطب الدین ایبک کو لک داتا کہا جاتا تھا۔ اب لک پنجابی لہجے میں ہے۔

اردو میں چارپائی کو ہم کھاٹ کہتے ہیں۔ پنجابی لہجے میں اگر اس کو لکھا جائے تو کھٹ ہو گا۔ اب مولانا ابراہیم فاروقی صاحب ''شرف نامہ'' نویں صدی ہجری کے مصنف جو بنگالہ کے رہنے والے ہیں' لکھتے ہیں:

''کت بالفتح تخت میاں بافتہ' ہند کھت نامند''

مولانا فخر الدین مبارک قواس غزنوی جو ہندوستان میں فارسی لغات نگاروں کے باوا آدم ہیں اور عہد علاء الدین خلجی کے شاعر ہیں' اپنی فرہنگ میں اسی لغت کے لیے کہتے ہیں:

''کت۔ تخت ہندوان باشد میاں بافتہ''

تاریخ ''سیر الاولیا'' میں جو تغلقوں کے عہد کی تصنیف ہے' یہ لفظ ہمیں بار بار ملتا ہے اور ہر بار

کھت کی شکل میں ملتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ایام میں اہلِ دہلی کھاٹ کو کھٹ کہتے تھے یعنی پنجابی لہجے میں بولتے تھے۔

پاگ بمعنی پگڑی ایک اور بھاشا کا لفظ ہے۔ اس کی پنجابی شکل پگ ہے۔ اب امیر خسرو دہلوی باوجودیکہ دہلی میں پرورش پاتے ہیں اور مسلمانوں کو دہلی میں آباد ہوئے اس وقت تک ایک صدی گذر گئی ہے تاہم پگڑی کو پنجابی شکل میں ''پگ'' لکھتے ہیں۔ چنانچہ:

اے دہلی والے بتان سادہ   پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

ضیاء الدین برنی کی ''تاریخ فیروز شاہی'' ص 241 پر ملک فخر الدین کھنڈ اور ملک رکن الدین انبہ کے نام نظر آتے ہیں۔ ان ناموں میں کھنڈ اور انبہ عرفی یا تمیزی نام ہیں۔ اس عہد میں کچھ اسی قسم کے عرف ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک امیر ''ہرن مار'' کے نام سے منسوب تھا۔ دوسرا امیر ''تورا بانڈ'' کہلاتا تھا۔ اب بھاشا میں کھنڈ کو کھانڈ اور انبہ کو انب یا آم کہتے ہیں' لیکن ان امراء کے ناموں کے ساتھ کھنڈ اور انبہ مذکور ہونے سے واضح ہوتا ہے کہ اس عہد کے مسلمان کھانڈ کو کھنڈ اور آم کو انب پنجابی لہجے میں کہتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان ایام میں دہلی کے مسلمانوں میں پنجاب کا لہجہ غالب تھا۔ کھنڈ اور قند کا مآخذ ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔

ہم برج بھاشا کے لہجے کے مطابق اردو میں نقال کو بھانڈ کہتے ہیں' لیکن ہمارے اسلاف پنجاب کے لہجے میں بھنڈ کہتے تھے اور اس سے ''بھانڈ پن'' کا مفہوم ادا کرنے کے لیے ''بھنڈائی'' بنالیا ہے۔ چنانچہ ضیا برنی کہتا ہے:

> ''از بخن مسخرگاں و بھنڈائی بھنڈاں' بوالعجبی بازیگراں و بے شرمی ناداشتاں کہ از اطراف ممالک بدرگاہ رسیدہ بودند و در اطراف سراپچہائے سلطانی بازی می کردند و ہنرہائے خود می نمودند و داد بخن می دادند و ناداشتی و بھنڈائی را بنہایت می رسانیدند۔''
> (تاریخ فیروز شاہی۔ ص 163)

یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ ان ایام میں دہلی پر پنجابی لہجہ غالب تھا۔ اسی مصنف کے ہاں ایک اور مقام پر یہ عبارت ہے:

> ''در چندیں مواضع برہ چوترہ بندانیدہ بودند و چھپر انداختہ و چاہ ہا کاوانیدہ و مٹہ ہا وسبو ہا پر آب و آفتابہ ہائے گلیں مرتب داشتہ و بوریا ہا فراز کردہ۔''

مٹہ پنجابی میں ماٹ یا گول کو کہتے ہیں۔ ضیا برنی کے ہاں یہ فقرہ بھی آتا ہے:

> ''و آخر کہ احمد ایاز را لرزہ در اندام افتاد و دلش در باک شد و زہرہ ترقیدن گرفت و از شدت خوف و غلبہ ہراس پگ در گردن انداختہ و سر مخلوق را برہنہ کردہ در پیش درگاہ سلطانی آمد۔'' (تاریخ فیروز شاہی۔ ص 545)

ہم دیکھتے ہیں کہ برنی بھی امیر خسرو کی طرح پگڑی کو پگ ہی لکھ رہا ہے۔ یہ یاد رہے کہ پگ بھاشا میں پاؤں کے معنی میں مستعمل ہے۔ اس تاریخ میں ایک اور موقع پر یہ فقرہ آتا ہے۔

''و درختان کھرنی و جموں و خرمائے ہندوی و بڑل و سنبل و پیپل و کل نہال خواہند کرد۔'' برنی یہاں ''جموں'' پنجابی طرز میں لکھ رہا ہے۔ ہم آج کل بھاشا کی تقلید میں جامن یا جامون کہتے ہیں۔

''تاریخ فیروز شاہی'' میں شمس سراج عفیف فیروز شاہ تغلق کے شکار کے ذکر میں فقرۂ ذیل لکھتا ہے:

''وہ بھینس اگر در تلے و دھندے ماہی بودے۔ شہنشاہ فرمودے کہ آں دامہائے گراں کہ بالائے پیل بار کردہ ے بردند آں دامہا دراں تل و دھند انداز ند۔'' (ص 328)

اس فقرے میں تل اور دھند پنجابی ہیں'' تل'' تال یعنی تالاب کی پنجابی شکل ہے۔ ''خالق باری'' میں تال آتا ہے:

رایت لواء نیزہ بودا سپر است ڈھال　　　لب آب ندی حوض دگر سرور است تال

ڈھنڈ ملتانی لفظ ہے جو بڑے اور گہرے تالاب اور جھیل کے معنی دیتا ہے۔ اب یہ لفظ ایسا ہے کہ آج پنجاب میں بھی عام طور پر لوگ اس سے واقف نہیں ہیں اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ دہلی میں ان ایام میں بولا جا رہا تھا تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ پنجاب کا اثر دہلی پر کس قدر زبردست ہوگا۔

ہم آج کل دیوچہ کو جونک با نون غنہ بولتے ہیں۔ پنجابی تکلم کے مطابق جیسا کہ اس سے قبل عرض کر چکا ہوں' یہ لفظ جوک ہے۔ اہل دکن بھی جوک کہتے تھے۔ دکن کے علاوہ باقی اردو خواں دنیا بھی جوک کہتی تھی' چنانچہ صاحب ''شرف نامہ'' ابراہیم فاروقی قرن نہم ہجری کے بنگالی مصنف کہتے ہیں۔

''دیوچہ۔　ہندش　جوک　گویند۔''

آج ہم جونک بولتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ بعد میں بھاشا کے اثرات میں ہم نے یہ لہجہ اختیار کیا ہے۔

صاحب ''شرف نامہ'' کلاوہ کی تشریح میں کہتے ہیں:

''کلابہ　و　کلاوہ'　ہند　''اٹی'' ''نامند''۔

اب اٹی پنجابی ہے۔ برج میں آنٹی ہے۔ اردو میں غالباً دونوں لہجے رائج ہیں' یعنی وہ اٹی بھی کہتے ہیں اور آنٹی بھی۔ البتہ برج کے لہجے میں اتنی اصلاح کر دی ہے کہ آنٹی کے مد کو ترک کر دیا ہے۔

گاڑی کو پنجابی میں گڈی کہتے ہیں۔ صاحب ''شرف نامہ'' کہتے ہیں:

''گردوں'　چرخ'　ہند　گڈی　خوانند''۔

یہاں پھر صاحب ''شرف نامہ'' پنجابی لہجے میں لکھ رہے ہیں۔ اسی طرح گڑیا کے واسطے مصنف موصوف کہتے ہیں:

''لهفت 'لعبت دختر گاں و آں صورت کہ از جامہ سازند۔ ہند گڈی گویند۔''

گڈی پنجابی میں گڑیا کو کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس عہد میں عام مسلمان اس لفظ کو پنجابی لہجے میں بول رہے تھے۔

چقندر کے ذکر میں بھی مصنف فرماتے ہیں:

''سبزہ ایست مثل ترب کہ آنرا شلغم گویند۔ ہندش گانگلو نامند۔''

اہل پنجاب آج بھی شلغم کو ''گونگلو'' کہتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ صاحب ''شرف نامہ'' بنگالہ کے رہنے والے ہیں اور انہیں پنجاب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بنگالہ میں آج کل شلگم ہی کہتے ہیں۔ جب اس عہد کے مسلمان عام طور پر گانگلو کہہ رہے ہیں' تو کیا یہ پنجاب کا اثر اردو پر ظاہر نہیں کرتا۔ بعد کے اثرات میں ہم نے گونگلو ترک کر دیا ہے اور شلغم کہنے لگے۔

بنو ماش کے ذکر میں مصنف حوالہ قلم کرتے ہیں۔

''بنو ماش بالضم'' نام غلہ کہ بہندش منگ نامند۔''

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''مزور آشامے است کہ مریض را دہند۔ چنانچہ دریں ولایت مثلاً از برنج و منگ آشام سازند در خراسان از شکر و نار دہند۔''

اس عہد تک گویا مونگ کو پنجابی طرز میں مسلمان منگ کہتے رہے' لیکن صاحب ''موید الفضلاء'' جو دسویں صدی ہجری کے مصنف ہیں' اس کو صاف مونگ لکھتے ہیں اور جب سے اب تک ہم مونگ ہی بولتے آئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس لفظ کے متعلق دسویں صدی میں مقامی لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔

اہل پنجاب سیسہ کو سکا کہتے ہیں۔ چنانچہ ''نصاب ضروری'':

ارزیز قلعی سرب ہے سکا سطبر ٹھلا باریک نکا

اور ہم آج اردو میں سیسہ بولتے ہیں' چنانچہ ''اسمائے فارسی'':

آنک سرب سیسہ کو جانو رانگے کو ارزیز بکھانو

لیکن حکیم یوسفی جو دسویں صدی ہجری کے پہلے ربع کے مصنف ہیں' اپنی تصنیف ''ریاض الادویہ'' میں آنک کا ہندی مرادف سکہ بتاتے ہیں۔ ان کے کچھ عرصہ بعد صاحب ''موید الفضلاء'' آنک کی تشریح کے وقت دونوں لفظ یعنی سکہ و سیسہ دیتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اہل اردو اہل پنجاب کی طرح ابتدا میں سکہ کہتے رہے' بعد میں سیسہ کہنے لگے اور سیسہ ہی آخر کار غالب رہا۔

اردو میں برج لہجے سے پنجابی کا سخت مقابلہ رہا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی وقت میں ایک لفظ دونوں لہجوں میں بولا جا رہا ہے۔ مثلاً بادل اور بدل۔ بازار اور بزار۔ چھاج اور چھج۔ صاحب ''شرف نامہ''

864ھ۔879ھ آ ژخ کے بیان میں لکھتے ہیں:

''ہندمساخوانند۔''

لیکن صاحب ''موید الفضلاء'' 925ھ اسی لفظ کے ذکر میں کہتے ہیں:

''ہندماسہ گویند۔''

اور ہم آج مساہی بولتے ہیں۔ یہاں گویا پنجابی لہجہ غالب رہا۔ ''تاریخ فیروز شاہی'' میں جموں بہ لہجہ پنجابی آیا ہے' لیکن ''موید الفضلاء'' الوسیہ کے بیان میں اس کا ہندی مترادف جامن دیتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی جامن یا جامون بولا جاتا ہے۔ یہاں دیکھا جاتا ہے کہ برج کا لہجہ غالب رہا۔ اسی طرح اشترخار کے ذکر میں صاحب ''شرف نامہ'' کہتے ہیں:

''وہنداوراجوانسہ گویند''۔

لیکن مصنف ''موید الفضلاء'' کا بیان ہے کہ ''ہندش جانواسہ گویند''۔ ہم آج جوانسہ یا جواسہ کہتے ہیں اور پنجابی لہجے کے مقلد ہیں۔

لفظ ''درائے'' کے متعلق صاحب ''ادت الفضلاء'' 882ھ کا بیان ہے کہ

''اہل ہندآنراگھنٹی گویند''۔

ہم آج گھنٹی کہتے ہیں۔ صاحب ''شرف نامہ'' کے ہاں اور ایسے الفاظ ملتے ہیں جو برج لہجہ میں ہیں۔ مثلاً تسمہ کے بیان میں پاٹی' شخار کے ذکر میں ساجی' شتک کی تشریح میں ہنچکی اور تشی کے بیان میں ''ساہی'' علیٰ ہذا ''چپاتی''۔ آج ہم ان الفاظ کا تلفظ پنجابی لہجے کے موافق پٹی' سجی' ہچکی' سہی اور چپاتی کرتے ہیں۔

حکیم یوسفی نے ''ریاض الادویہ'' میں منجملہ اور ہندی الفاظ کے جو ہندی اور پنجابی میں مشترک مانے جاتے ہیں' یہ الفاظ بھی دیے ہیں:

''لانی۔انب۔تماہ۔کونج۔انڈا۔آملی۔آرنڈ۔ماکھی۔کانچلی۔بلائی۔ہاڑ۔ساجی۔''

ان میں پہلے چار تو خالص پنجابی ہیں۔ باقی تمام برج کے لہجے میں ہیں' جن کو آج ہم انڈا۔آملی۔ ارنڈ۔مکھی۔کینچلی۔بلی۔ہڈی۔سجی۔ بہ لہجہ پنجاب ادا کرتے ہیں۔

میں ''خالق باری'' سے اور مثالیں دیتا ہوں۔ مثلاً

''ماٹی۔پاتھر۔چالنی چاکی۔کال۔تاتا۔ڈھانکنی۔چاکھ۔ماکھی۔مانچھر۔کانکر۔ہانسی۔پوتلی۔پانسلی۔''

جنھیں آج ہم پنجابی لہجے میں مٹی۔پتھر۔چلنی چکی۔کل۔تتا۔ڈھکنی۔چکھ۔مکھی۔مچھر۔کنکر۔ ہنسی۔پتلی۔پسلی کہتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بالکل ممکن ہے کہ پرانی برج میں اور پنجابی میں کوئی فرق نہ ہو اور برج میں حرف علت کا اظہار بعد کی نشو ونما ہو۔ اس کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ پنجابی میں یہ قاعدہ یعنی حرف علت کی

تخفیف تقریباً مسلمانوں کی ہند میں آمد کے وقت بھی موجود تھا۔ عرب سیاحوں نے بعض ہندی الفاظ کا ذکر کیا ہے جن میں انب اور زط بھی شامل ہیں۔ پنجاب میں انب آج بھی بولا جاتا ہے۔ باقی رہا زط' یہ پنجابی لفظ جٹ کی معرب شکل ہے۔ اُردو میں برج کی تقلید میں جاٹ بولتے ہیں۔ یہ ایک جنگجو قوم کا نام ہے' جو ان ایام میں سندھ اور پنجاب میں کثرت سے آباد تھی۔ ایرانی بتقلید پنجاب جٹ کہتے ہیں۔ چنانچہ ابوالفرج رونی:

گرد افغان وجت برغبت و حرص — پرہ زد موکب سوار ملک

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ قدیم زمانوں میں پنجاب کا اثر اردو پر بہت نمایاں تھا' لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا' یہ اثر رفتہ رفتہ زائل ہو گیا۔

سطور آئندہ میں برج بھاشا کی بعض خصوصیات درج کی جاتی ہیں تاکہ قارئین کرام اردو' پنجابی اور برج زبانوں کے فرق کو معلوم کرسکیں اور یہ رائے قائم کرسکیں کہ آیا اردو پنجابی کے قریب ہے یا برج کے۔

برج بھاشا

دراصل ضلع متھرا کی زبان ہے جہاں سے نکل کر اس نے بہت وسعت اختیار کرلی ہے یعنی جنوب میں تمام ضلع آگرہ، اکثر علاقہ ریاست بھرت پور، دھولپور اور قرولی مغربی علاقہ، ریاست گوالیر اور مشرقی علاقہ ریاست جے پور میں پھیلی ہوئی ہے، شمالاً گڑ گانوہ کے مشرقی حصے میں، شمال مشرق میں دوآبہ، بلند شہر، علی گڑھ، ایٹہ، مین پوری میں اور گنگا پار، بدایوں، بریلی اور ترائی پرگنہ، نینی تال میں بولی جاتی ہے اور مختلف مقامات پر مختلف نام رکھ دیئے گئے ہیں۔ مثلاً مشرقی علاقے میں جہاں قنوجی زبان سے اس کا اتصال ہوتا ہے، انتر بیدی کہا جاتا ہے۔ گوالیار کے شمال مشرقی گوشہ میں جو دچھور کے متوازی ہے اور جہاں سیکرواڑ راجپوت آباد ہیں، سیکرواڑی، قرولی کے میدانی علاقہ اور بعض علاقہ گوالیار میں چمبل پار جادو بانی کہتے ہیں، اس لیے کہ اس علاقے میں اس نام کی راجپوت قوم آباد ہے۔ بھرت پور کے جنوبی علاقے قرولی خاص اور مشرقی علاقے جے پور میں جو ڈانگ کے نام سے موسوم ہے، ڈانگی کہتے ہیں اور پھر اس کی مقامی تین قسمیں ہیں یعنی ڈونگر واڑا، کالی مال اور ڈہانگ بانگ۔ علاقہ نینی تال میں اس کا نام بھکسا ہے۔ قدیم زمانے سے برج بھاشا نے شاعری کی گود میں پرورش پائی ہے اور ہندوستان کے بعض مشہور شاعر اسی زبان میں لکھتے رہے ہیں۔ وٹھل ناتھ، سور داس، نابھ داس، دیودت اور بہاری لال بے حد مشہور ہیں۔ (گریرسن)

اہل مغرب نے اس زبان کی یہ حد بندی شاید درست کی ہو، لیکن مسلمانوں نے اس کو بہت وسعت دے دی تھی۔ وہ اس کو بھاکا یا بھاشا کے نام سے یاد کرتے رہے اور بھاکا کی ذیل میں انہوں نے قنوجی، اودھی اور بندیلی کو بھی داخل کرلیا تھا، بلکہ اس کا میدان اس سے بھی وسیع تھا، یعنی مشرقی اور مغربی ہندی اس کے دامن میں آجاتی تھی۔ مسلمانوں کا یہ نقطۂ نظر عجیب رہا ہے۔ وہ ہندوستان کی ہر زبان کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں، عام اس سے کہ پنجابی ہو، برج ہو یا پوربی، اُردو ہو یا مارواڑی اور بنگالی۔ آج ہندوؤں نے بھی ہندی کے ذیل میں برج، قنوجی، اودھی، بندیلی، مارواڑی وغیرہ زبانوں کو شامل کرلیا ہے۔ بھاشا شاعری کی زبان تھی اور اس میں ہر ہندی شاعر عام اس سے کہ اودھی ہو گجراتی، مالوی یا بہاری، شعر لکھتا تھا۔ اگرچہ اس کے اشعار میں اس کی وطنی زبان کی خصوصیات زیادہ غالب ہوتی تھیں۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمانوں کے لیے جہاں فارسی شاعری اور ادب کی زبان تھی، اسی طرح بھاشا موسیقی کی زبان تھی۔ اہل

اسلام کی شعر دوستی نے بھاکا کی شاعری کو بہت کچھ تقویت دی ہے۔ انہی کے زمانے سے اس زبان میں شعر و ادب پیدا ہوتے ہیں۔ گویا اہل اسلام کے پاس تین زبانیں تھیں۔ اوّل فارسی جس میں وہ شعر و ادب تاریخ و انشا لکھتے رہے۔ دوسری اردو جس کو اپنے ساتھ پنجاب سے لے گئے۔ تیسری بھاکا یا بھاشا جس میں موسیقی اور شعر لکھتے رہے۔ خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں فارسی پر زوال آنے لگا۔ آئندہ قرون میں عام توجہ بھاشا کی طرف منعطف ہوگئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں عام ہندی گو شعراء پیدا ہو گئے۔ بھاشا میں کثرت سے شعراء ہوئے ہیں، جن میں صوفی و غیر صوفی شامل ہیں، لیکن موجودہ نسلوں کی عدم اعتنا سے ان کے کلام کا اکثر حصہ ضائع ہو گیا ہے اور جو کچھ باقی ہے وہ بھی عنقریب معدوم ہو جائے گا۔ برج بھاشا کوئی قدیم نام نہیں ہے۔ قدما اس کو گوالیاری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

برج کی بعض خصوصیات

برج میں مصدر "یو" یا "وو" یا "نو" آخر میں لگانے سے بنتا ہے۔ مثلاً:

ہوئیو = ہونا

بوجھوو = بوجھنا

چلنو = چلنا

اسما و افعال اور اسمائے صفات کے آخر میں ایک واؤ مجہول اضافہ کر دیا جاتا ہے جس موقع پر اردو اور پنجابی میں الف ملتا ہے۔ مثلاً:

اپنو = اپنا

تھاریو = تمہارا

چلیو = چلا

یا واؤ معروف بڑھا دیا جاتا ہے جیسے:

بست سے بستو

غلام سے غلامو

شیطان سے شیطانو

مستقبل کے اردو پنجابی لاحقہ "گا" کے بجائے "گو" آتا ہے۔ مثلاً: مارنگو = ماروں گا' لیکن زیادہ رائج شکل "مارہوں" یا "مارے ہوں" = ماروں گا "مارے ہیں" = (ہم) ماریں گے "مارہے" یا "مارے ہے" = (تو یا وہ) مارے گا "مارہو یا ماریہو = (تم) مارو گے "مارہیں" یا "مارے ہیں" = (وہ) ماریں گے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح مصدر کی علامت "نو" اسی طرح مستقبل کی علامت "گو" اردو سے لی گئی ہے۔ ہے کی گردان اردو' برج اور پنجابی میں یکساں ہے۔ صرف یہ فرق ہے کہ واحد متکلم میں برج میں "ہوں" یا واؤ مجہول اردو میں یا واؤ معروف "ہوں" اور پنجابی میں واؤ الف سے بدل کر "ہاں" بن گیا اور جمع غائب میں "ہن" بن گیا۔

تھا کی تصریف میں پنجابی اور اردو کسی قدر اختلاف کے ساتھ متفق ہیں' لیکن برج میں مختلف ہے یعنی واحد مذکر "ہو" واحد مونث "ہی" جمع مذکر "ہے" اور جمع مونث "ہیں"۔

ماضی ناتمام میں ''ہو'' بجائے ''تھا'' لاتے ہیں مثلاً ''میں مارتا تھا'' کے بجائے ''میں مارے ہو'' وغیرہ کہتے ہیں۔ حال و استقبال میں بہت کم فرق ہے۔ ''ہوں ماروں ہوں'' ''میں مارتا ہوں'' وغیرہ یا ''ہوں مارت ہوں'' وغیرہ لاتے ہیں۔ جمع کے لیے بالعموم اسم کے آخر میں ایک نون اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً موتی' اور دن' گھاٹ' کان' بات' چور' گوال اور گائے کی جمع موتن' اورن' دنن' گھاٹن' کانن' باتن' چورن' گوالن اور گائن ہے' مصرع

کانن میں موتن کو چوگنڈا' گل پھولن کو ہار

ظرف کے لیے ایک' یا' اسم کے آخر میں لاتے ہیں۔ جیسے گھر سے گھرے یعنی گھر میں ''ن'' ''نی'' اور ''نوں'' بغرض جارہ آخر میں لگا دیتے ہیں۔ مثلاً بھوکن' بھوکنی اور بھوکنوں یعنی بھوک سے۔ علامات جارہ میں کا اور کے کی جگہ ''کو'' آتا ہے' مثلاً گل پھولن کا ہار یعنی گلے میں پھولوں کے ہار۔ گھوڑن کو یعنی گھوڑوں کا۔ مجہول کا کم رواج ہے۔ لاحقہ ''نے'' اکثر اوقات افعال لازمی کے ساتھ (برخلاف اردو اور پنجابی کے) مستعمل ہوتا ہے۔ مثلاً لھوڑے بیٹا نے چلیو۔ یعنی چھوٹا بیٹا چلا۔ نے کے استعمال میں بے ضابطگی سے ظاہر ہے کہ وہ اردو اثرات میں برج میں پہنچتا ہے۔ واؤ اکثر اوقات میم سے بدل جاتی ہے' جیسے مہاں = وہاں۔ چرامنو = چراونا یعنی چراتا۔ آمنو = آوتا یعنی آتا۔ منامن = مناون یعنی منانا۔ جامیں = جاویں۔ رومتی = روونی یعنی روتی۔ بامن = باون۔ مالدہ = والدہ۔ اردو کے اثرات میں اسما کی تصریف کا استعمال برج میں ہونے لگا ہے' لیکن بے قاعدہ اور غلط۔ غلط اردو میں جہاں ''چھوٹے لڑکے کا'' کہیں گے' اہل برج اس کی جگہ ''لوہڑے چھورا کو'' کہیں گے۔ اس میں بے قاعدگی یہ ہے کہ اہل اردو اسم کی تصریف کی خاطر اس کے اسمائے صفات و دیگر متعلقات کو پنجابی کی طرح منصرف کرتے ہیں۔ یہاں برج میں اسم ''چھورا'' کو منصرف نہیں کیا' اور اسم صفات لوہڑے کو منصرف کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اہلِ اُردو اسی جملے کو ''لوہڑے چھورے کا'' لکھیں گے۔ اس سے ہمیں قیاس لگا لینا چاہیے کہ تصریف کا قاعدہ اردو سے گیا ہے۔ یہی حالت ''کنواں میں'' اور ''کالے گھوڑا کو زین'' کی ہے۔ اردو میں جمع الف اور نون کے اضافے سے بنتی ہے۔ برج نے بھی اس قاعدے کو اردو سے لیا ہے' لیکن اس کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔ افعال کا پیچیدہ طریقہ جو اردو اور پنجابی میں افعال مرکب یا توابعات کے الحاق سے ہوتا ہے' برج اس سے بڑی حد تک آزاد ہے۔

اردو کی ''لام'' برج میں ''رے'' سے بدل جاتی ہے۔ مثلاً جلنا = جرنا۔ یہ بھی یاد رہے کہ ''ڑے'' اردو میں کثرت سے آتی ہے۔ اس کے برخلاف برج میں بہت کم مستعمل ہے۔ اردو کی ''ڑے'' یا تو رائے مہملہ سے بدل جاتی ہے مثلاً لڑی = لری۔ لڑائی = لرائی۔ جوڑی = جوری۔ پھاڑنا = پھارنا یا ''ڈال'' سے بدتی ہے۔ جیسے بڑا = بڈا۔ گاڑی = گاڈی۔ گوڑ = گوڈ۔ گاڑنا = گاڈنا۔

شہر دہلی میں اگرچہ اردو بولی جاتی ہے' لیکن آس پاس کے دیہات میں ہریانی زبان موجود ہے' جو

دراصل اُردوئے قدیم کی ایک شکل ہے۔ یہ نظریہ کہ اردو برج سے نکلی ہے' اس عقیدے پر مبنی ہے کہ قدیم زمانوں میں دہلی میں برج زبان بولی جاتی تھی' حالانکہ آج دہلی برج کے علاقے سے فاصلے پر واقع ہے۔ مسلمانی عہد سے پیشتر ممکن ہے کہ دہلی میں برج کا رواج ہو' لیکن اردو پر برج کے اثرات کی توجیہ اور طرح سے کی جا سکتی ہے۔ سکندر لودھی کے عہد سے شاہجہاں کے زمانے تک آگرہ لودھیوں' سوریوں اور مغلوں کا پایہ تخت تھا جو عین برج کے علاقے میں واقع ہے۔

مسلمان اور ہندی زبانیں

امیر خسرو اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں ہندوستان کی مفصلہ ذیل زبانوں کا شمار کرتے ہیں:

(1) سندھی (2) لاہوری (3) کشمیری (4) ڈوگری (5) دھور سمندری (6) تلنگی (7) گجراتی (8) معبری (9) گوڑی منسوب بہ گوڑ۔ قدما گوڑ کو لکھنوتی کہتے تھے' پٹھان گوڑ۔ مغلوں نے جنت آباد نام دیا (10) بنگالی (11) اودھی (12) دہلوی (13) سنسکرت جو عربی کے سوا تمام زبانوں سے افضل ہے۔

کسی قدر ترمیم کے ساتھ یہ تقسیم آج بھی صحیح مانی جاتی ہے۔ ان زبانوں کو ہندوستان کی قدیم پراکرتوں کی یادگار مانا جاتا ہے' لیکن ان میں ادب و شعر مفقود تھے۔ البتہ گیت اور سرود کا رواج تھا' جو عوام کی زبان زد تھے اور یہ مسلمان ہیں جنہوں نے سب سے پیشتر ان زبانوں کی طرف توجہ دی ہے اور شاعری کا ان میں رواج دیا۔

مسلمانوں کی آمد سے پیشتر سنسکرت زبان ہندوؤں کی مذہبی' علمی' درباری اور ادبی زبان تھی۔ برہمن راجاؤں کے درباروں میں حاوی تھے اور مذہب و علوم انہی کی حفاظت میں تھے۔ درباروں میں سنسکرت اور سنسکرت بولنے والوں کا گذر تھا۔ عوام الناس میں تعلیم عام نہیں تھی اور نہ اس دیوبانی زبان کی تحصیل کی ان کو اجازت تھی۔ وہ صرف برہمنوں کی میراث تھی۔ رعایا میں تجارت پیشہ لوگ اپنے لیے اسی قدر تعلیم ضروری سمجھتے تھے کہ بہی کھاتا اور حساب جان سکیں' ورنہ باقی رعایا جاہل مطلق تھی۔ دیسی زبانیں جن کے بولنے والوں کی تعداد کروڑوں تھی' عام کسمپرسی کی حالت میں تھیں۔ نہ ان میں ادب تھا نہ شعر۔ برہمن جو ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ تھا' سنسکرت کے ہوتے ہوئے عام پراکرتوں کی طرف کیوں توجہ کرتا۔ ان زبانوں کی ترقی یا ان میں علوم و فنون کا رواج اس فرقے کے مقاصد کے عین مخالف تھا۔ راجا اور پرجا پر اس کا اقتدار اس قدر عظیم تھا کہ دنیا کا کوئی مذہب اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ برہمن کے بغیر دین و دنیا کا ہر کام بند تھا۔ اس کی صدارت کے بغیر عبادت اور پرستش دشوار تھی۔ موت زیست' شادی غمی میں اس کی شرکت لازمی تھی۔ ان کا معالج وہ تھا' نجومی وہ تھا' وزیر وہ تھا' مشیر وہ تھا' مدبر وہ تھا اور مقنن وہ تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ کونین میں نجات انسانی کا مختار کار وہی تھا۔ اِدھر راجا قبضے میں تھے اور اُدھر دیوتاؤں پر تصرف تھا۔ برہمنوں نے نہ صرف جماعتی آزادی کو معطل کر دیا تھا' نہ صرف

عوام الناس پر تعلیم کا دروازہ بند کر دیا تھا بلکہ ضمیر انسانی کی حریت کو بھی اپنے طاقتور قوانین سے ہمیشہ کے لیے مفلوج کر دیا تھا۔ صدیاں اس ابدی سکوت اور سکون میں گذر گئیں۔ آخر بودھ جی مہاراج آئے اور انہوں نے اپنے مت کی تلقین عوام الناس کی زبان میں شروع کی۔ اس طرح پالی زبان نے کچھ ہی عرصے میں بے حد ترقی کر لی اور بودھ مت والوں کی مذہبی زبان بن گئی۔ کئی صدی بعد برہمنوں نے اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کر لیا اور بودھ مت کا ہندوستان سے اخراج کر دیا اور ایک مرتبہ اور تمام ہندوستان میں برہمنوں کا دور دورہ ہو گیا۔

سنسکرت اور برہمنوں کے اقتدار کے زمانے میں ظاہر ہے کہ کوئی دیسی زبان ترقی نہیں کر سکتی تھی اور نہ اس کے لیے کوئی ایسا موقع تھا' لیکن مسلمانوں کی آمد عظیم الشان تغیرات کا پیش خیمہ ہے۔ جس کے دنبال میں اقتصادی' معاشی' تمدنی اور لسانی انقلاب رونما ہوئے۔ مسلمان فاتحانہ حیثیت سے آئے اور بہت جلد اس سرزمین کو اپنا وطن تصور کرنے لگے۔ انہوں نے ممالک خارجہ کی تجارت کا دروازہ اس ملک پر کھول دیا۔ بیسیوں نئی صنعتیں مثلاً کاغذ سازی' پشمینہ سازی' زین سازی' نعلبندی' باغبانی' فن حلوائی' قالین سازی' پارچہ بافی' طب یونانی' فن تعمیر' کاشی کاری' آئینہ سازی' بیطاری' دارو سازی' کشتی گیری' شال بافی وغیرہ وغیرہ کی ترویج دی۔ زندگی کے ہر شعبے اور فن کو نمایاں ترقی دی۔ فنون لطیفہ کی سرپرستی کی۔ مختلف کھانوں اور اچاروں کو رواج دیا۔ قسم قسم کے عطریات کی ایجاد کی۔ شعر دوستی اور ادب پرستی مسلمانوں کی قومی خصوصیت ہے۔ چنانچہ جب وہ ہندوستان میں آباد ہو گئے اور ملکی زبان سمجھنے اور بولنے لگے' ان کی یہ قومی خصوصیت بروئے کار آئی اور وہ اس ملک کی زبانوں میں دلچسپی لینے لگے۔ ہندوستان کے شمال و مغرب کی زبانیں جن میں پشتو' کشمیری' سندھی اور پنجابی شامل ہیں' اکثر مسلمان شعراء کی مرہون منت ہیں۔ برج' اودھی' گجراتی اور بنگالی زبانوں میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے بھی ایک معقول حصہ لیا ہے۔

میرا یہ بیان کہ ہندی زبانوں کے ادبیات مسلمانوں کے ہندوستان میں قیام کا نتیجہ ہیں' ایسے حلقوں میں جہاں برج کی شاعری اور ''پرتھی راج راسا'' کی قدامت میں یقین کیا جاتا ہے' ناقابل قبول ہوگا کیونکہ ایک عرصے سے برج اور راسا کا نام ہماری روایات میں گونج رہا ہے' لیکن اگر واقعات کو اچھی طرح پرتالا جائے اور اس امر کو بھی مدنظر رکھا جائے کہ ہندو قوم تاریخ میں ہمیشہ کمزور رہی ہے اور آج بھی اس کی تحقیقات قدیم ادبیات ہندی کے متعلق الجھی اور پریشان ہونے کے علاوہ زیادہ تر ظنی واقعات پر مبنی ہے تو میرے مطالب کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

یہاں میں اپنے دعوے کی تائید میں جناب دنیش چندر سین بی۔ اے کی ''تاریخ ادبیات بنگال'' سے ایک اقتباس جو زیادہ تر خلاصے کی شکل میں ہے' ناظرین کو پیش کرتا ہوں:

> ''بنگالی زبان کے ادبی پایہ تک ارتقا حاصل کرنے کے متعدد اسباب ہیں۔ ان میں سب سے پیش پیش بلاشائبہ اشتباہ مسلمانوں کی فتح بنگال ہے۔ اگر ہندو راجا

بدستور سابق مختار اور حکمران رہتے تو بنگالی زبان کے لیے دربار تک رسائی حاصل کرنا ایک دشوار امر تھا۔ ان پٹھانوں نے تیرہویں صدی میں بنگال کو تسخیر کر لیا۔ ان کے سلاطین نے بنگالی زبان سیکھی اور اپنی کثیر التعداد ہندو رعایا کے ساتھ جن پر حکمرانی کرنے کے لیے وہ آ بسے تھے' قریبی تعلقات قائم کر لیے۔ جب ان سلاطین نے سنسکرت کے مشہور رزمیوں رامائن اور مہابھارت کا ذکر سنا جو ہندوؤں کی مذہبی اور منزلی زندگی کی تشکیل میں عجیب و غریب اثر رکھتے تھے تو قدرتاً ان کو شوق ہوا کہ ان نظموں کے موضوع سے آگاہی حاصل کریں۔ انہوں نے چند عالموں کو بنگالی زبان میں ان کے ترجمے کرنے کا حکم دیا' جس زبان کو وہ اب بولتے اور جانتے تھے۔ مہابھارت کا بنگالی ترجمہ ناصر شاہ والیٔ گوڑ کے حکم سے ہوا' جس نے 1325ء تک پورے چالیس سال سلطنت کی تھی۔" (ص 10و11)

جب بنگالی زبان کے ادبیات کا سنگ بنیاد مسلمانوں کے ہاتھ سے رکھا جاتا ہے جس کا ہم کو اب تک کوئی علم نہ تھا تو یقین کر لینا چاہیے کہ دوسرے علاقوں میں جو اہل اسلام کے زیر نگیں تھے' انہوں نے دیسی زبانوں کی ترویج میں ضرور حصہ لیا ہے۔ اس کا ثبوت پیش کرنا کوئی دشوار نہیں ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ بھاشا کے میدان میں مسلمانوں کے نام ہندو شعراء سے اقدم ہیں۔ ہندی کا پہلا بڑا شاعر کبیر ہے جو نویں صدی ہجری سے تعلق رکھتا ہے۔ ہندو شعراء زیادہ تر دسویں صدی میں پیدا ہوتے ہیں' جیسے تلسی داس اور سور داس۔ کبیر سے پیشتر بھی مسلمان شعراء موجود تھے۔

مسلمانوں میں ہندی شعراء کے سرتاج خواجہ مسعود سعد سلمان المتوفی 515ھ ہیں۔ ان کا ہندی کلام اگرچہ دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں رہا' لیکن بارہ ماسہ سب سے پیشتر انہی نے لکھا ہے۔ چنانچہ فارسی میں ان کا شہور بہ یا دوازدہ ماہہ اب تک محفوظ ہے۔ چونکہ پنجاب میں مسلمانوں کے تعلقات دہلی کے مقابلے میں زیادہ قدیم ہیں' اس لیے مسلمانوں نے اسی ملک کی زبان میں سب سے پہلے شعر گوئی کی بنا رکھی۔ مشائخ و صوفیا نے سب سے پیشتر دہلی و پنجاب میں ہندی کی سرپرستی کی ہے۔ ان کا تعلق عوام الناس سے براہ راست تھا' اس لیے دیسی زبانوں کی تربیت انہی سے شروع ہوتی ہے۔ ان اہل اللہ میں ہم بعض مشہور بزرگوں کے نام دیکھتے ہیں' مثلاً شیخ فرید الدین مسعودؒ متوفی 665ھ' شیخ نظام الدین اولیاؒ متوفی 725ھ' امیر خسروؒ متوفی 725ھ' شیخ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتیؒ 724ھ۔ انہوں نے شیخ نظام الدین اولیاؒ سے ہندی دوہروں میں مشاعرات کیے اور مبارز خان کے ارادۂ سفر کے وقت ذیل کا ہندی دوہا مع اس کے ترجمہ فارسی کے' خان کے پاس بھیجا تھا:

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روے
بدھنا ایسی رین کو بھور کدھی نا ہوے

شعر فارسی:

من شنیدم یار من فردا روو راہ شتاب　　یا الٰہی تا قیامت بر نیاید آفتاب

(دیباچہ فرہنگ آصفیہ)

اسی جماعت نے ہندی موسیقی کی تہذیب وترقی میں بھی بڑا حصہ لیا ہے۔ جہاں فارسی موسیقی قول و ترانہ وغیرہ کے وہ دلدادہ تھے، ہندی موسیقی سے بھی ان کی خانقاہیں خالی نہیں تھیں۔ وہ سنسکرت تک کے نغمات سننے کے عادی تھے۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی متوفی 666ھ اس فن میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ ملتانی دھناسری انہی کی ایجاد ہے۔ امیر خسرو نے فارسی اور ہندی موسیقی کو پیوند دیا۔ سلطان حسین شاہ جونپوری 905ھ نے سترہ راگ ایجاد کیے۔ نایک بخشو نے بہادری راگ، نایکی کلیان اور نایکی کانہڑا وضع کیے۔ درباری کانہڑا میاں تان سین کی یادگار ہے۔ شیخ عطاء اللہ الملقب بہ شیخ رتن فن موسیقی میں ممتاز پایہ رکھتے تھے۔ شیخ بہاء الدین برناوی متوفی 1030ھ اس فن میں کامل واکمل تھے۔ ساز خیال اور ساز کھڑس کے موجد ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ متوفی 1035ھ فن موسیقی میں نایکی کا درجہ رکھتا تھا۔ باز بہادر والیٔ مالوہ اس فن میں بے نظیر مانا گیا تھا۔ موسیقی میں مسلمانوں نے اس قدر ترقی کی تھی کہ اس فن پر جس قدر نفیس کتابیں لکھی گئی ہیں، اکثر مسلمان مصنفین نے لکھی ہیں۔ بنگال میں اس فن کی تمام تر تصنیفات مسلمان دماغوں کا نتیجہ ہے۔

سلاطین و امراء و عُمّال نے ہندی کی سرپرستی میں کچھ کم حصہ نہیں لیا ہے۔ ناصر الدین والیٔ لکھنوتی متوفی 726ھ بنگالی میں مہابھارت کا ترجمہ کراتا ہے۔ اسی صدی میں فیروز شاہ خلجی 790ھ سنسکرت سے بعض کتابیں ترجمہ کرواتا ہے۔ سلطان زین العابدین والیٔ کشمیر متوفی 877ھ کئی زبانوں میں ماہر تھا۔ وہ تبتی زبان بھی بے تکلف بولتا تھا۔ ایک طرف جہاں اس نے مہابھارت اور راج ترنگنی کا ترجمہ کرایا، دوسری طرف فارسی اور عربی کتابوں کا بھی کشمیری زبان میں ترجمہ کروایا۔ ودیاپتی شاعر غیاث الدین والیٔ بنگالہ کا مداح ہے۔ ہندی زبانوں کی سرپرستی میں علاء الدین حسین شاہ والیٔ بنگال متوفی 925ھ کا نام آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس کا دربار ہندی اور بنگالی شعراء سے آباد تھا۔ قطبن نے اپنی تصنیف ''مرگاوتی'' جس کا ذکر آئندہ آئے گا، 909ھ میں اسی بادشاہ کے نام پر معنون کی ہے اور مالادھر داسو ساکن کلنگرام اسی بادشاہ کے حکم سے مہابھارت کا بنگالی زبان میں ترجمہ کرتا ہے۔ ابھی اس کے دو باب ہی ترجمہ کیے تھے کہ بادشاہ نے شاعر کو 1480ء میں گزراج خاں کا خطاب دے دیا۔ اسی حسین شاہ کے سپہ سالار پراگل خاں کے حکم سے جو ناظم چٹا گانگ بھی تھا، گوندر پرمیسور نے مہابھارت کا دوسرا ترجمہ بنگالی زبان میں شروع کیا۔ ترجمہ ختم ہونے نہیں پایا تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ اس کے فرزند چھوٹے خاں نے جو باپ کا قائم مقام ہوتا ہے، سری کرنانندی کو اسی کام پر مقرر کیا اور ترجمہ ختم ہوگیا۔

قاضی محمود گجراتی متوفی 920ھ ہندی کے زبردست شاعر تھے۔ ان کے اشعار مجالس حال وقال کو

ایک عرصہ دراز تک گرماتے رہے۔ ملک محمد جائسی نے شیر شاہ سور کے نام پر ''پدماوت'' لکھی اور دوسری متعدد تصنیفات اپنی یادگار چھوڑیں۔ شیخ دانیال چشتی نویں صدی ہجری میں پیدا ہوتے ہیں اور ایک سو گیارہ سال عمر پا کر 994ھ میں رحلت کرتے ہیں' ہندی کے اعلیٰ شاعر تھے۔ شیخ عثمان غازی پوری نے چترا ولی کا عشقیہ افسانہ لکھا۔ قطبن' ملک محمد جائسی اور شیخ عثمان غازی پوری نے عام مذاق کی تصنیفیں لکھ کر ہندی شاعری کو عالمگیر مقبولیت کی شاہراہ پر گامزن کر دیا تھا' لیکن افسوس ہے کہ بعد کے آنے والے شعراء نے اس کو مذہبی رنگ میں رنگ دیا۔ تلسی داس اور سورداس نے زبان کو مذہبی تنگنائے میں محصور کر کے مناقب سری رام چندر و سری کرشن کے لیے وقف کر دیا۔ پچھلے شاعر جو آئے اور جن میں اکثر ہندو تھے' تلسی داس اور سورداس ہی کے نقش قدم پر جادہ پیما ہوئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ ہندی شاعری مذہب کی جکڑ بندیوں سے کبھی آزاد نہ ہو سکی اور سرگذشت کرشن و رام چندر کے بیان پر اس کی تمام جدوجہد ختم ہو گئی۔

اکبر کے دربار میں متعدد ہندو شاعر موجود تھے' جن کی تنخواہیں اور جاگیریں بھی تھیں۔ اس کا فرزند شہزادہ دانیال ہندی کا قابل شاعر تھا۔ عبدالرحیم خانِ خاناں فن شعر میں بلند پایہ رکھتا تھا۔ اس کا دربار فارسی و ہندی شعراء کا مرجع تھا۔ زہری اور بانا کوی اکبر کے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ بانا کوی کو جس کا نام مشہور یا بھانٹ تھا' بادشاہ نے راؤ کا خطاب اور جاگیر عطا کی تھی۔ ''کلی چرتر'' اس نے عبدالرحیم خان خاناں کے اشارے سے لکھی تھی۔ تان سین نے اپنی کتاب ''سنگیت سار'' اسی عہد میں تالیف کی۔

کیشو مشرا اور پوکھر دونوں جہانگیر کے دربار کے شعراء کے زمرے میں داخل تھے۔ اسی عہد میں طاہر نے کتاب ''کوک سار'' 1030ھ میں تصنیف کی۔ سندر داس گوالیاری اور سرومنی شاہجہاں کے عہد کے شعراء ہیں۔ سرومنی نے شاہجہاں کے ارشاد سے ''اروشی'' نام کی منظوم لغت تیار کی۔ سندر داس کو شاہجہاں نے ''مہا کوی راجہ'' کا خطاب دیا تھا۔ ویدک میں ایک کتاب ''پران سکھ'' نامی 1064ھ میں وجود میں آئی۔ جگناتھ کلاونت کو شاہجہاں نے خطاب ''کبرائے'' عنایت کیا۔ بادشاہ کے نام پر بارہ دھرپد اس نے مختلف نغموں میں تیار کیے جو بادشاہ کو بہت پسند آئے۔ شاہی حکم سے وہ روپیوں میں تولا گیا' ان کا وزن چار ہزار پانچ سو روپیہ ہوا اور یہی روپیہ اس کو انعام میں مل گیا۔

شیخ پیر محمد سلون متوفی 1074ھ ہندی و فارسی میں عمدہ اشعار لکھتے تھے' شیخ جنید موہانی چشتی متوفی 1078ھ عربی' فارسی و ہندی کے اعلیٰ شاعر تھے۔ داراشکوہ کے ہاں متعدد ہندی خواں ملازم تھے' جن کا کام ہندی زبان میں ترجمے کرنا تھا۔ ''سار سنگرہ'' جو دوہوں کی بیاض ہے' اسی کے حکم سے مدوّن ہوئی۔

سترہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں دولت قاضی نے ''لور چندرانی'' بنگالی نظم لکھنی شروع کی۔ قاضی کی بے وقت وفات کی وجہ سے یہ نظم ختم نہ ہو سکی۔ علاول ایک مسلمان شاعر نے 1656ء میں اس کی تکمیل کی۔ عبدالحکیم نے قصہ یوسف زلیخا کو اسی زبان میں نظم کیا۔ دولت وزیر بہرام نے لیلیٰ مجنوں کی مثنوی لکھی۔ محمد اکبر

نے ''یمین جلال'' ''ایک عشقیہ افسانہ پر قلم اٹھایا۔ کبیر محمد نے ''رنگ مالا'' شمشیر علی نے ''ریجوان ساہا'' (رضوان شاہ) اور شمس الدین صدیق نے ''بھاؤ لابھ'' تصنیف کیں۔ بنگالی زبان میں بے شمار مصنفین گذرے ہیں جنہوں نے مسلمانی بنگالی نیز ہندو بنگالی میں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

عالمگیر کا دربار اگر چہ شاعروں سے خالی نظر آتا ہے' لیکن اس کا لاڈلا فرزند اعظم شاہ ہندی زبان سے بے حد الفت رکھتا تھا۔ نواز ایک مسلمان شاعر نے اعظم شاہ کی خواہش سے 1680ء میں ''شکنتلا ناٹک'' لکھی۔ اس شہزادے کے فرمان سے مختلف گویوں نے مل کر بہاری شاعر مشہور کی ''ست سئی'' کی تدوین کی۔ یہ نسخہ اشاعت اعظم شاہ کے نام سے مشہور ہے۔

دیوا شاعر شاہ عالم اول 1124ھ کے دربار سے متعلق تھا۔ ایک اور شاعر عالم نامی اس بادشاہ کا ملازم خاص تھا۔ ہندوؤں کی روایت ہے کہ عالم دراصل برہمن تھا' کسی مسلمان عورت کے عشق میں مبتلا ہو کر مسلمان ہو گیا۔ عالم نے ایک تصنیف ''عالم کیلی'' جس میں رادھا اور کرشنا کے واقعات درج ہیں' اپنی یادگار چھوڑی۔ قاسم پسر واجد نے کیشوداس کی ''رسک پریا'' پر ایک نفیس شرح لکھی۔

سری پت بھٹ ایک گجراتی ایودھیا برہمن تھا۔ اس نے سید ہمت خاں نواب الہ آباد کے نام پر ''ہمت پرکاش'' ہندی ویدک میں بعہد عالمگیر 1676ء میں نظم کی۔ ایک شاعر بلبیرا نے ہمت خاں مذکور کی فرمائش پر فن عروض میں ''پنگل من ہرن'' 1741 بکرمی میں تصنیف کی۔ سید محمد سعید المخاطب بہ سید میراں بھیک چشتی صابری عہد عالمگیر کے بزرگ ہیں' ان کا انتقال 1131ھ میں ہوتا ہے۔ ہندی زبان کے قابل شاعر تھے' قوال ان کے اشعار ابھی تک گاتے ہیں۔ انہی کے مرید محبوب عالم عرف شیخ جیون ہیں' ہریانہ کی زبان میں ان کی تصنیف ''دردنامہ محمد'' ہے۔ ''محشرنامہ'' بھی انہی کی یادگار ہے۔

یعقوب خاں نے بندیلی زبان میں کتاب ''رس بھوشن'' لکھی۔ ''نکھ سکھ'' مرزا عبدالرحمٰن نے عہد فرخ سیر میں تالیف کی۔ سید پہاڑ خلف سید حمزہ ''رس رتناگر'' ایک طبی تالیف کے مصنف ہیں۔ شیخ سلمان ایک ''معراج نامہ موسوم بہ ''خالق نامہ'' کے ناظم ہیں۔ شیخ خوش محمد قادری نوشاہی متوفی 1127ھ فارسی و ہندی کے مقبول شاعر تھے۔

خود محمد شاہ بادشاہ دہلی متوفی 1161ھ ہندی زبان کا شاعر تھا۔ اس کی تصنیفات سے ایک بارہ ماسہ اب تک موجود ہے۔ اعظم خاں نے اس کے حکم سے ''سنگار درپن'' 1786 بکرمی میں تالیف کی۔ آنند گھن شاعر مشہور محمد شاہ کا ملازم تھا۔ امیر خاں محمد شاہی دیوی کوی کا مربی تھا۔ صورت مسرا سی عہد میں نصر اللہ خاں محمد شاہی کا ملازم تھا۔ عالم' فیض اور اکرم' غلام نبی اور نور خاں بھی ہندی شعراء کے زمرے میں منسلک ہیں' لیکن ہم ان کے زمانوں سے ناواقف ہیں۔ فیض غالباً محمد معظم فیض ہیں جو فارسی و ہندی کے زبردست شاعر تھے اور سنسکرت کے فاضل' انہوں نے ''لیلاوتی'' کا سنسکرت سے دوبارہ ترجمہ کیا ہے۔ ڈیڈوانہ کے رہنے والے ہیں

اور قاضیوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا زمانہ عہد محمد شاہی ہے۔ ان کا فارسی دیوان اور کچھ مثنویاں طبع ہو چکی ہیں۔

آخر میں ''رس خاں'' کا نام بھی داخل کیا جاتا ہے' جس کو ہندو مذہباً ہندو بیان کرتے ہیں' کبھی ان کو ایک ساہوکار بچہ کا عاشق کہتے ہیں' کبھی کسی ہندو عورت کا شیدا بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح بعض اس کو سید کہتے ہیں' بعض پٹھان۔ شاہی خاندان کا اس کو ممبر بتایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ رس خاں ایک روز ''بھاگوت'' پڑھ رہا تھا' اس کے دل میں خیال آیا کہ جس شخص پر ہزاروں گوپیاں عاشق تھیں' اس سے عشق کرنا چاہیے۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس کی معشوقہ نے طعنہ دیا کہ ''جیسا تم مجھ کو چاہتے ہو' اگر اس کو چاہتے جس کی ہزار گوپیاں عاشق ہیں تو تم کتنے پاگل ہو جاتے۔'' قصہ مختصر رس خاں نے پربھو کا مقام دریافت کیا' اس سے کہا گیا کہ وہ برج میں رہتا ہے۔ اس پر وہ برج چلا گیا۔ وہاں کرشن نے اپنے دیدار اسے دیئے' اس طرح رس خاں کرشن کا نام لیوا ہو گیا۔ اس کا زمانہ حیات اس کی نظم ''پریم پاٹ کا'' سے معلوم ہوتا ہے کہ 1671 بکرمی تھا۔ رس خاں کے زمرے میں علی خاں' شیخ نبی' میر احمد' تاج خاں اور پیر زادی بی بی کے نام بھی شامل کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے واقعات حیات ہندی بھگت مالاؤں میں مل سکتے ہیں۔ ہندو نے ان کو اپنی جماعت میں تسلیم کر لیا ہے۔

پرتھی راج راسا

''سیتھا چندرکا'' میں ہندی شعراء کے ذکر میں لکھا ہے:

''کہا جاتا ہے کہ گیارہویں شتک کے انت تک اپ بھرنش کا پرچار تھا۔ اس کے اوپرانت وہ ہندی کے رنگ میں ڈھلنے لگی۔ کوی چند ہند بھاکا کے آدکوی ہیں۔ ان کے پہلے بھی کچھ کوی ہو گئے ہیں' جن میں قطب علی' سائیں دان چارن فیض' اکرم کوی کا نام دشیکھ الیکھیو گئے ہے۔ پرنتو ہندی بھاکا کے آدیم پرورکوی چند بردائی ہیں' ان کے پہلے کے کویوں کے نہ تو کوئی کاوی کہلانے یوگے اوتم گرنتھ ملتے اور نہ ان کی بھاکا ہی ٹکسالی اتھواواستوک ہندی کہی جاسکتی ہے۔''

اس بیان کی رو سے چند بردائی کو ہندی کا سب سے پہلا شاعر مانا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ چند پرتھی راج کا وزیر اور شاعر تھا اور ''پرتھی راج راسا'' اسی کی طرف منسوب ہے۔ 588ھ میں پرتھی راج ترائن کے میدان میں سلطان معزالدین محمد سام سے شکست کھا کر مارا جاتا ہے اور مسلمانوں کا قبضہ اجمیر و دہلی پر ہو جاتا ہے۔ ''راسا'' اس عہد کی تصنیف بتائی جاتی ہے' لیکن ''راسا'' ایک مشتبہ تصنیف ہے' اس کے متعلق بہت کچھ اختلاف آراء ہے۔ بعض اس کو چند کی اصلی تصنیف مانتے ہیں اور بعض ایک مجہول تالیف خیال کرتے ہیں۔ باخبر اصحاب کی یہ رائے ہے کہ راسا سولہویں یا سترہویں صدی میں کسی نے چند کے نام پر تصنیف کر دی ہے' چنانچہ مہامہوپادھیا کیسراج شیامل دان جی کی یہی رائے ہے (ہندی نورتن۔ ص 520) برخلاف اس کے ہندی نورتن اس کی اصلیت کے حق میں ہیں۔

راسا سے واقف کاروں کی یہ رائے ہے کہ اس میں دس فیصد فارسی اور عربی الفاظ موجود ہیں جو بجائے خود بدگمانی کے لیے ایک زبردست دلیل ہے' کیونکہ اجنبی زبانوں کے الفاظ کی اس کثرت کے ساتھ دہلی یا اجمیر کی زبان میں آمیزش ایسے ابتدائی زمانے میں قریب قریب ناممکن ہے۔ اس کے بیانات بھی اس قدر لغویت سے لبریز ہیں کہ یہ کتاب بحیثیت کتاب تاریخ ہمارے احترام کی مستحق نہیں' مثلاً یہ بیان کہ شہاب الدین کا بھائی حسین نامی تھا۔ شہاب الدین کی بیوی سے ناجائز تعلقات رکھتا تھا' جب شہاب الدین کو ان تعلقات کی خبر ہوئی تو حسین اپنی پیاری جان لے کر پرتھی راج کے پاس بھاگ آیا' یا یہ کہ پرتھی راج نے شہاب الدین کو مختلف موقعوں پر سات مرتبہ شکستیں دیں' گرفتار کیا اور روپیہ لے کر چھوڑ دیا۔ نیز یہ کہ شہاب الدین پرتھی راج کا مطیع و محکوم تھا۔ یہ بیانات

اس قدر لغو ہیں کہ ہمیں ان کی تردید میں کوئی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ صرف اس قدر جاننا کافی ہے کہ حسین نام کا کوئی شخص معزالدین محمد بن سام کا بھائی نہیں تھا۔ اس کا صرف ایک بھائی تھا جو غیاث الدین محمد بن سام کے نام سے غور کا بادشاہ تھا اور معزالدین محمد بن سام اس کے نائب اور سپہ سالار کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی طرح یہ خیال کہ پرتھی راج نے سلطان موصوف کو سات مرتبہ شکستیں دیں اگرچہ ابوالفضل نے ہندو بیانات کی تقلید میں لکھ دیا' قرین عقل و قیاس نہیں' کیونکہ جب ہم شہاب الدین کے کارناموں کو سال وار دیکھتے ہیں تو ان فرضی شکستوں کے لیے اس کی سوانح حیات میں کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اس لیے یہ بیان بھی صداقت سے معرا ہے۔

راسا میں آتشیں اسلحوں کا ذکر بھی موجود ہے' جو ''راسا'' کے مفروضہ زمانے سے کئی صدی بعد ہندوستان میں رائج ہوتے ہیں' ڈوسن صاحب کہتے ہیں کہ:

> ''راسا کے 150 ویں چھند میں تاتار خاں شہاب الدین کو مسلح ہونے اور آتشیں اسلحہ کی تیاری کے لیے کہتا ہے' 257 ویں چھند میں توپوں اور ان کی آوازوں کا ذکر آتا ہے' 416 ویں چھند میں رائے گووند کا قتل زنبورک کے ذریعہ سے جو شترنال کا دوسرا نام ہے' بیان کیا جاتا ہے۔''

ہمیں ان بیانات کی اتنی ہی وقعت کرنی چاہیے جتنی بی بی چمو کے امیر خسرو کو حقہ پلانے کے قصہ کی۔ نہ سلطان معزالدین کے عہد میں توپیں تھیں اور نہ زنبورک' نہ اس کے عہد میں تاتار خاں کے نام یا خطاب کا کوئی شخص تھا۔ تاریخ ہند میں سب سے قدیم شخص جو اس خطاب کا مالک ہے' محمد ارسلان تاتار خاں ہے جو غیاث الدین بلبن متوفی 686ھ کے عہد کا امیر ہے۔

یہاں ایک اور امر قابل غور ہے کہ شہاب الدین سلطان محمد بن سام کے بچپنے کا نام ہے جو اس کے بادشاہ بنائے جانے پر ترک کر دیا گیا اور معزالدین محمد بن سام اختیار کر لیا گیا۔ اب اس نام سے وہ اپنی مدت سلطنت میں مشہور رہا ہے۔ اس کے سکوں پر بھی یہی نام ہے۔ اس کے عہد کے مورخین صاحب ''تاج المآثر'' و ''طبقات ناصری'' اسی نام سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ بعد کی تاریخوں مثلاً ''تاریخ فیروز شاہی'' میں بھی معزالدین کے نام سے مشہور ہے' لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ راسا میں بار بار اس کو شہاب الدین غوری کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس پہیلی کا حل یہی ہے کہ اکبری عہد کے مورخین زیادہ تر اس کو شہاب الدین کے نام سے پکارتے آئے ہیں' چنانچہ بعد کے مورخین نے یہی نام اختیار کر لیا' اس لیے اگر ''راسا'' کا مصنف سلطان معزالدین کا درحقیقت معاصر ہوتا تو وہ قطعاً شہاب الدین نہ لکھتا بلکہ معزالدین لکھتا۔

''راسا'' میں توپ و بندوق کا ذکر' دس فیصد غیر ہندی الفاظ کی اس آمیزش اور دیگر بیانات کی لغویت وغیرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایسے زمانے میں لکھی گئی ہے' جب کہ توپ و بندوق ہندوستان میں عام طور پر استعمال ہونے لگی ہیں اور فارسی و عربی الفاظ ہندی زبان میں شامل ہو چکے ہیں۔

امیر خسرو

(وفات 725ھ)

ادبی دنیا کے آفتاب عالم تاب ہیں اور خاکِ ہند۔ اب تک ان کے اوصاف و کمالات کا انسان پیدا نہیں کر سکی ہے۔ وہ ایک طرف فارسی کے زبردست ناظم و ناثر ہیں' دوسری طرف عربی و سنسکرت میں دستگاہِ کامل رکھتے ہیں۔ متعدد امور کی ایجاد انہی کی طرف منسوب ہے۔ ہندی اور ایرانی موسیقی کی تدوین کر کے اپنی ایجادوں سے اس کو مالا مال کر دیتے ہیں۔ جہاں فارسی پر ان کے احسان ہیں' وہاں ہندی بھی ان کے چشمہ ٔفیض سے سیراب ہوئی ہے۔ ان کی تصنیفاتِ نظم ونثر کی تعداد ننانوے بتائی گئی ہے۔ اشعار کی تعداد چار لاکھ اور پانچ لاکھ کے درمیان کہتے ہیں۔ جس قدر فارسی میں ان کا کلام ہے' اس سے کہیں زیادہ ہندی میں بتایا جاتا ہے' لیکن امیر نے ''غرۃ الکمال'' میں اپنی ہندی نظموں کا ذکر بدیں الفاظ میں کیا ہے:

''جزوے چند نظم ہندوی نیز نثر دوستان کردہ شدہ است' اینجا ہم بدیگرے بس کردم و نظر برنداشت کہ لفظ ہندوی در پارسی لطیف آوردن چنداں لطفے ندارد مگر بضرورت آنجا کہ ضرورت بودہ است آوردہ شد۔''

آخری فقرے میں اشارہ ہے ان الفاظ و فقرات ہندی کی طرف جو امیر گاہ گاہ اپنے اشعار میں لکھ گئے ہیں' لیکن امیر کے ہندی کلام کا اب تک پتہ نہ چل سکا۔ گذشتہ صدی کے تذکرہ نگاروں نے جو نمونہ ٔ کلام دیا ہے' میں یہاں نقل کیے دیتا ہوں۔ از قسم شہر آشوب:

تیلی پسرے کہ می فروشد تیلے | از دست و زبان چرب او واویلے
خالے بہ بش دیدم و گفتم کہ تل است | گفتا کہ برو نیست دریں تل تیلے

یہ عین ترجمہ ہے ''ان تلوں میں تیل نہیں'' کا۔ ہندوستان کا قاعدہ ہے کہ گوجریاں دودھ دہی وغیرہ لے کر گلی گلی آواز دیتی پھرتی ہیں۔ ''لیو دہی لیو دہی'' امیر کے عہد میں بھی یہی دستور تھا' فرماتے ہیں:

گجری تو کہ در حسن و لطافت چو مہی | آن دیگ دہی برسر تو چتر شہی
از ہر دو لبت قند و شکر میریزد | ہر گاہ بگوئی کہ ''دہی لیو دہی''

دیگر:

زر گر پسرے۔ چو ماہ پارا　　کچھ گھڑیے سنواریے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست　　پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

اشعار ذیل بھی صنف شہر آشوب سے تعلق رکھتے ہیں:

رفتم بہ تماشہ بکنار جوئے　　دیدم بلب آب زن ہندوئے
گفتم صنما چیست بہائے مویت　　فریاد بر آورد کہ "در در موئے"

"در در موئے" فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں پڑھا جاتا ہے۔ فارسی میں یہ معنی ہیں کہ ایک ایک موتی کا ایک ایک بال ہے۔ ہندی میں یہ مطلب ہے کہ مردار دور ہو۔ "فرہنگ آصفیہ" میں ذیل کا قطعہ شہر آشوب امیر کے نام پر دیا ہے:

ہندو بچۂ ہیں کہ عجب حسن دھرے چھے
بر وقت سخن گفتن مکھ پھول جھرے چھے
گفتم ز لب لعل تو یک بوسہ بگیرم
گفتا کہ ارے رام ترک کائیں کرے چھے

اس قسم کی نظمیں جن میں پیشہ وروں کا قطعات کی شکل میں ذکر ہو شہر آشوب کہلاتی ہیں۔ مولانا محمد امین چڑیا کوٹی جنھوں نے "جواہر خسروی" میں امیر کا شہر آشوب مرتب کیا ہے، فرماتے ہیں:

"سنسکرت اور ہندی بھاشا میں اس قسم کی نظمیں میری نظر سے گذری ہیں۔ دیپی وا کیرولاس گوپال کوی نے اسی طرز پر نظم کیا ہے جس میں تمام پیشہ وروں کے نام اور ان کے کام نظم میں بیان کیے ہیں، غالباً اسی طرز کو حضرت امیر خسرو نے فارسی زبان میں لا کر ایک جدت اور فارسی لٹریچر میں نیا اضافہ کیا ہے۔"

میں یہاں اس قدر اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس معاملہ خاص میں امیر خسرو سنسکرت بھاشا کے مرہونِ منت معلوم نہیں ہوتے کیونکہ خواجہ مسعود سعد سلمان سب سے پیشتر فارسی میں ان نظموں کا رواج دیتے ہیں اور "مقطعات شہر آشوب" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ تمثیلاً خواجہ کے شہر آشوب سے یہاں ایک آدھ نمونہ حوالۂ قلم کر دیا جاتا ہے:

در حق دلبر خباز بگفت

آنکہ او بر دکاں زبس خوبی　　ہمچو خورشید بر سپہر آمد
شد فراز تنور چوں دل من　　با دومہ رفت و بادو مہر آمد

صفت یار بربطی گفتہ

بتا زہرۂ آسمان جمالی | چو زہرہ یمن برتو فرخندہ فالی
کنار تو خالی نباشد زبربط | ز بربط نباشد بلے زہرہ خالی

ذیل کی نظم بھی امیر کی طرف منسوب ہے:

ز حال مسکیں مکن تغافل دو رائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارد اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف روز وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو ذرہ حیراں، چو شمع سوزاں ز ہجراں ماہ گشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیج پتیاں
بحق ان روز فضل محشر کہ داد مارا فریب خسرو
سمیپ من کے ورائے لاکھوں جو جان پانوں پیا کی کھتیاں

وہ گئے بالم وہ ندیو کنار
آپے پار اتر گئے ہم تو رہے اروار
بھائی رے ملاحو ہم کوں پار اتار
ہاتھ کا دیوں گی مندرا گل کا دیوں ہار
دیکھ میں اپنے حال کوں روون زار زار
بی گن وتنا بہت ہیں ہم ہیں اوگنہار
بابل بیجی میں ونج کوں تاندا کو پھول
ہوچھا ونجہ وہا جیا نا لایا مول
چکوا چکوی دو جنے ان کوں مارو نہ کو
اوہ مارے کرتار کے رین بچھوڑی ہو
سیج وچھتی دیکھ کے رووں ہوں دن رین
پیا پیا کرتی میں پھروں پل بھر سکھ نہ چین
سبہ ناریں سو سکھ سیویں کنتاں کو گل لا
میں دو کھیاری جنم کی دوکھی گئی بہا

تازی چھوٹا دیس میں قصبے پڑی پکار
دروازے دیتے رہ گئے نکس گئے اسوار
گوری سوئے پلنگ پر مکھ پر وارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجہ پڑی چو دیس

(از بیاض مملوکہ پروفیسر سراج الدین آذر ایم اے
پروفیسر اسلامیہ کالج۔ لاہور)

ذیل کی غزل ایسی بیاض سے نقل کی جاتی ہے جو تیرہویں صدی ہجری کی ابتدا میں لکھی گئی ہے:

جب یار دیکھا نین بھر دل کی گئی چنتا اتر
ایسا نہیں کوئی عجب راکھے اسے سمجھائے کر
جب آنکھ سے اوجھل بھیا تڑپن لگا میرا جیا
حقا الٰہی کیا کیا آنسو چلے بھر لائے کر
توں تو ہمارا یار ہے تجھ پر ہمارا پیار ہے
تجھ دوستی بسیار ہے یک شب رہو تم آئے کر
جاناں طلب تیری کروں دیگر طلب کس کی کروں
تیری جو چنتا دل دھروں اک دن ملو تم آئے کر
میرا جو من تم نے لیا تم نے اٹھا غم کوں دیا
غم نے مجھے ایسا کیا جیسا پتنگا آگ پر
خسرو کہے باتاں عجب دل میں نہ لاوے کچھ غضب
قدرت خدا کی ہے عجب جب جیو دیا گل لائے کر

(از بیاض پروفیسر سراج الدین آذر ایم۔ اے)

میں نے اس غزل کو یہاں لکھ تو دیا ہے' لیکن یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ امیر خسرو اس کے مالک ہیں۔

خالق باری

یہ وہ خوش قسمت کتاب ہے جو بالاتفاق حضرت امیر خسرو دہلوی کی طرف منسوب ہے۔ تذکرہ نگاروں نے اس کے متعلق حسب معمول مبالغے سے کام لیا ہے۔ مولوی محمد امین صاحب چڑیا کوٹی فرماتے ہیں کہ ''اس میں کئی ہزار اشعار تھے۔'' اور مولوی محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی اور اپنے تخیل کی رنگینی سے کام لے کر یہ فقرہ بھی اضافہ کر دیا ہے کہ ''وہ ایک بھٹیاری کے لڑکے کے لیے لکھی گئی تھی۔'' لیکن اگر تحقیق سے کام لیا جائے تو یقین ہے کہ یہ بیانات بے اصل ثابت ہوں۔ یہ بات تو عقل میں آتی ہے کہ بچوں اور مبتدیوں کے لیے جو کتابیں لکھی جاتی ہیں بالعموم مختصر اور رسالے کی شکل میں ہوتی ہیں' مثال حامد باری' رازق باری' واحد باری' اللہ باری' ایزد باری' صمد باری اور قادر نامہ وغیرہ جو سب اسی ''خالق باری'' کی طرز میں ہیں۔ یہ رسالے اکثر اوقات بچوں کو حفظ کرائے جاتے تھے اس لیے ضروری تھا کہ مختصر ہوں۔

یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''خالق باری'' کو امیر خسرو کی طرف منسوب کرنے کے لیے ہمارے پاس کیا وجوہ ہیں۔ ''کلیات خسرو'' کے سلسلے میں ایک جلد موسوم بہ ''جواہر خسروی'' بھی علی گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں امیر کے متفرق کلام کے علاوہ مولوی محمد امین صاحب چڑیا کوٹی نے ''خالق باری'' کو نہایت محنت اور تحقیق کے ساتھ مرتب کر کے شامل کر دیا ہے۔ اس کے دیباچے میں مولانا ممدوح ذیل کے بعض وجوہ کی بنا پر خالق باری کو امیر کی تسلیم کرتے ہیں:

> (1) ''جیتل کا لفظ اس کتاب میں ملتا ہے جو حضرت امیر کے زمانے تک ایک ہندی سکہ تھا اور آپ کے قریب عہد میں متروک ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ تاریخ میں اس عہد کے بعد اس کا نام بھی نہیں ہوتا ہے۔''

میں اس کے متعلق اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ لفظ جیتل ہر زمانے میں ملتا ہے' مثلاً ''آئین اکبری'' میں جہاں اکبری عہد کے سکوں کا ذکر کیا گیا ہے' ابوالفضل جیتل کو ایک فرضی سکہ اور دام کا پچیسواں حصہ مانتا ہے۔ مہابت خاں عہد عالمگیر کا ایک امیر ہے' وہ ایک عرضداشت میں جو سرتا پا شکایت سے مملو ہے' لکھتا ہے:

> ''مدار کار بر قاضی و قاضی بر شوت راضی' در غزنی وقندھار اشتہار یافتہ کہ مطریاں باستقبال فرمان می شتابند و نرخ حسب الحکم موقوف بر دو جیتل افتادہ و اسد خاں کہ ہنوز

بوئے شیر از دہانش نرفتہ وزیر اعظم ودستور معظم فرمودند۔''

آنند بن ہیمراج گوالیری نے فنِ سیاق میں ایک رسالہ موسوم بہ ''خلاصۃ السیاق'' 1115ھ مطابق 47 جلوس عالمگیری میں تصنیف کیا ہے۔ اس میں جیتل کا لفظ عام طور پر ملتا ہے۔ چونکہ یہ رسالہ چھپا نہیں' اس لیے یہاں ایک دو فقرے نقل کر دیے جاتے ہیں:

''دستور معلوم کردن دام ہا بہ حساب فی من' باید کہ مبلغ نرخ من را با دامہا ضرب نماید و حاصل ضرب را جیتل دانستہ پنجاہ جیتل یک تنگہ بگیرد مثلاً فی من بیست تنگہ: قیمت پنج دام می باید' پس بیست را با پنج ضرب دادیم' حاصل ضرب یک صد جیتل بیامد واز یں دو تنگہ بر قسیم قیمت پنج دام معلوم شد۔''

''اگر کسے پرسد فی من دہ تنگہ است دو آثار را چہ باید' باید کہ آثار را با تنگہائے نرخ من ضرب دہد و حاصل ضرب را جیتل دانستہ بر چہل جیتل مقرر نماید' پس یک بہلولی قیمت دو آثار معلوم شد۔''

شیخ جنید کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو:

چو دزد اندر کمیں باشد کرے جو نیند بنجارا
نباشد سود یک جیتل گوادے مول بھی سارا

جس زمانے میں جیتل کا سب سے زیادہ چرچا رہا ہے' وہ امیر خسرو کے عین بعد ہے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق 752ھ و 790ھ نے اپنے عہد میں جیتل (ایک تنگہ کا پچاسواں حصہ) کی تقسیم جس میں نیم جیتل اور دانگ جیتل شامل ہے' کر دی تھی۔ چنانچہ مولانا شمس سراج اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

''سلطان فیروز شاہ فرمان فرمودہ کہ مہر نیم جیتل کہ آنرا ادہ گویند کہ مہر دانگ جیتل کہ آنرا تنگہ گویند وضع کنند تا غرض فقراء ومساکین حاصل شود۔''

جیتل کے لیے ہر عہد کی مثالیں بہم پہنچائی جا سکتی ہیں' لیکن میں بخوفِ طوالت انہی امثال پر قناعت کر کے مولوی صاحب کے دوسرے استدلال کو بیان کرتا ہوں:

(2) ''محاورات قدیم مثلاً'' میں تجھ کہیا' '' ''تو کت رہیا'' ''باد اڑانی'' (ہوا چلی) ''آکھنا (دیکھنا)'' ''چاو (شوق)'' وغیرہم الفاظ کی گواہی سے ''خالق باری'' کا زمانۂ تصنیف عہد خسروی میں قطعی طور پر مقرر اور متعین ہو سکتا ہے۔''

یہ دلیل بھی مضبوط نہیں ہوتی' کیونکہ میں تجھ کہیا' تو کت رہیا' آج بھی ہندوستان کے دیہات میں بولے جاتے ہیں' آکھنا پنجابی زبان میں کہنے اور دریافت کرنے کے معنوں میں آج بھی آتا ہے۔ ''باد اڑانی'' کے معنی خدا جانے مولانا نے ''ہوا چلی'' کیسے لکھ دیے کیونکہ مصرع خاک دھول' باد اوڑانی کا تعلق

ڈھول کے ساتھ ہے، یعنی ایسی ڈھول جسے ہوا اڑا سکے۔ بہر حال ان میں کوئی بھی ایسا محاورہ نہیں جو محاوراتِ قدیمہ کی فہرست میں شامل کیا جا سکے۔ تیسری وجہ مولانا نے مفصلۂ ذیل دی ہے:

(3) ''اس میں شک کرنے کے بہت کم وجوہ ہیں کہ ''خالق باری'' حضرت امیر خسرو کی تصنیف ہے اور یہ شائبۂ شک بھی خود ''خالق باری'' کے مقطع یعنی آخری شعر کو دیکھ کر بالکل رفع ہو جاتا ہے، جس میں لفظ خسرو موجود ہے، اور جس شاعرانہ شوخی و فصاحت کے ساتھ یہ لفظ مقطع میں واقع ہوا ہے اور اس پر درویشانہ انکسار کا طرہ دیکھ کر نا ممکن ہے کہ کوئی صحیح المذاق شخص اس کو تخلص نہ سمجھے اور صرف لفظ معنی مثل دیگر الفاظ با معانی کے جن سے ''خالق باری'' بھری ہوئی ہے، قرار دے۔ وہ شعر یہ ہے:

مولوی صاحب سرن پناہ   گدا بھکاری خسرو شاہ

اس کی ترکیب بالکل وہی ہے جیسے آج کوئی خسرو نام کا شخص اپنے تئیں کسی تحریر میں خاکسار خسرو لکھ کر ختم کلام کر دے۔''

مولانا کا یہ استدلال زیادہ تر شاعرانہ رنگ میں ہے۔ اہل اللہ میں سادات نے اپنے نام سے پہلے یا بعد میں شاہ کا لفظ استعمال کیا ہے، مثلاً شاہ نعمت اللہ 832ھ، شاہ میانجی 889ھ اور سید رابی حامد شاہ 901ھ وغیرہ لیکن امیر خسرو کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ شاہ کا لفظ اپنے تخلص کے آخر میں لا کر سادات کے نام کے ساتھ خواہ مخواہ التباس پیدا کر دیتے اور نہ امیر کے زمانے میں فقراء کے نام کے ساتھ اس لفظ کا رواج تھا، لیکن اس شعر میں سب سے زیادہ توجہ طلب مصرع اول ہے، جس میں مولوی صاحب کی ترکیب موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ مولوی صاحب، منشی صاحب، پنڈت صاحب کی سی ترکیبیں امیر خسرو کے عہد میں رائج نہیں تھیں۔ ''مولوی صاحب'' در کنار تنہا مولوی کا لفظ بھی امیر کے عہد میں علماء کے نام کے ساتھ نہیں ملتا، ایسے مرکب محض گذشتہ صدی کی مبتدعات سے ہیں، اس لیے ہمیں اس شعر کو جدید اضافہ ماننا پڑے گا اور بات بھی یہی ہے کیونکہ اگرچہ یہ شعر مطبوعہ نسخوں میں اسی طرح ملتا ہے، مگر قلمی نسخوں میں اس کی شکل بالکل مختلف ہے، جو حسب ذیل ہے:

دو جگ رہا خسرو کا نام   خالق باری ہوئی تمام

ایک اور نسخہ میں یوں ہے:

دو جگ وچ رہیا خسرو نام۔   خالق باری ہوئی تمام

ان شعروں میں اگرچہ خسرو کا تخلص موجود ہے، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ خسرو وہی مشہور امیر خسرو ہیں۔ خسرو اور لوگوں کا بھی تخلص ہو سکتا ہے اور میرا خیال ہے کہ ہم نے ''خالق باری'' کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رکھی ہے۔ تاریخ و ادب میں اس کا کہیں ذکر نہیں آتا، نہ امیر خسرو کی تصنیفات کے ساتھ اس کا شمار ہوتا ہے اور نہ کوئی اسے جانتا ہے اور نہ اس کے قدیم نسخے دستیاب ہوتے ہیں۔ جس قدر نسخے ملتے ہیں،

بارہویں اور تیرہویں قرن ہجری کے نوشتے ہیں۔ صرف ایک نسخہ ایسا ہے جو گیارہویں صدی سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ نسخہ برٹش میوزیم کی فہرست کتب فارسیہ میں "رویل 16 ب 3" ہے' جو طامس ہائڈ متوفی 1702ء مطابق 1114ھ کی ملک تھا۔ فہرست نگار کا بیان ہے کہ کسی فرنگی نے سترہویں صدی عیسوی میں نقل کیا ہے' لیکن افسوس ہے کہ اس نسخے میں مصنف کا نام مذکور نہیں ہے۔ انڈیا آفس میں ایک نسخہ نمبر 2448' 11 جلوس محمد شاہی مطابق 24 ربیع الثانی 1134ھ کا کتابت شدہ ہے' لیکن اسی کتب خانے میں ایک اور نسخہ نمبر 2447 ہماری دلچسپی کے کچھ سامان رکھتا ہے۔ اس کی تاریخ کتابت معلوم نہیں' لیکن اس کا نام "مطبوع الصبیان" دیا گیا ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "خالق باری" کا اصل نام "مطبوع الصبیان" ہے۔ اس نسخے کے ساتھ نثر کا ایک دیباچہ بھی ہے۔ فہرست نگار نے اس کا ایک پارہ نقل کر دیا ہے۔ وھو ہذا:

"الحمد للہ...... (بداں) اسعدک اللہ تعالیٰ فی الدارین کہ چند کلمہ عربی و فارسی

ہر ایک با ترجمہ ہندوی برائے تعلیم صبیان بر طریق ریختہ (گفتہ آمد)"

بد قسمتی سے اس نسخے میں بھی مصنف کا نام مرقوم نہیں۔ اس رسالے میں چھپن فصلیں ہیں اور ہر فصل میں چار شعر ہیں۔ اس حساب سے اس کے اشعار کی تعداد دو سو چوبیس ہوتی ہے۔ کتاب کا آغاز حسب معمول خالق باری سرجن ہار النخ سے ہوتا ہے۔ اب یہ فصلیں یا تو متناسب الفاظ و لغات یا بحور کے لحاظ سے قائم کی گئی ہیں' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رائج الوقت "خالق باری" کا شیرازۂ اشعار بہت کچھ درہم برہم کر دیا گیا ہے' حتیٰ کہ اس کا دیباچہ اور نام قطعاً بھلا دیے گئے۔ سب سے دلچسپ دیباچے کا وہ پارہ ہے' جس میں ریختہ کا لفظ موجود ہے۔ ریختہ کے موجد اگرچہ امیر خسرو ہیں' لیکن ان کے ہاں وہ موسیقی کی ایک اصطلاح ہے۔ اس دیباچے میں ریختہ نظم کے معنوں میں آیا ہے اور یہ وہ معنی ہیں جو ولی اور سراج کے ہاں ملتے ہیں۔ ریختہ بمعنی نظم گیارہویں صدی کے آخر میں ملتا ہے' اس سے ظاہر ہے کہ کتاب "مطبوع الصبیان" مع دیباچہ اسی قرن میں کسی وقت تصنیف ہوئی ہو گی۔

عالمگیر کے عہد میں اردو زبان کی طرف خاص توجہ کی جاتی ہے اور بچوں کے لیے یہی زبان ذریعۂ تعلیم بن جاتی ہے اور بارہویں اور تیرہویں صدی میں "خالق باری" کے انداز کی درجنوں کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ مثلاً رازق باری' حامد باری' ایزد باری' واحد باری' صمد باری' مالک باری' اللہ باری اور قادر نامہ' مرزا غالب وغیرہ وغیرہ۔ جب اس قدر کتابیں دو صدی کے اندر اندر لکھی گئی ہیں تو ظاہر ہے کہ "خالق باری" بھی ان کے متصل زمانے میں لکھی گئی ہو گی۔ یہ امر قرین قیاس نہیں کہ "خالق باری" 725ھ سے قبل لکھی ہے۔ اس کے بعد پورے چار سو برس یعنی گیارہویں صدی تک اہل علم خاموش رہیں اور بارہویں اور تیرہویں صدی میں اس کی تقلید میں درجنوں کتابیں لکھی جانی شروع ہوں۔ میرے نزدیک "خالق باری" اس سلسلے کی ایک کڑی ہے اور اس کا زمانہ ہمیں دیگر تصنیفات کے زمانے کے قریب ماننا چاہیے۔

اگر "خالق باری" امیر خسرو کی تصنیف ہوتی تو صورتحال بالکل مختلف ہوتی۔ اس عہد سے لے کر سینکڑوں کتابیں اب تک اس کی تقلید میں لکھی جاتیں۔ شارح اس کی شرحیں لکھتے' اہل لغات اس سے استناد کرتے اور یہ کتاب مختلف فیہ لغات کے لیے ایک سندی ماخذ بن جاتی۔ بہت کم لوگ واقف ہیں' جس محنت اور مشکلات کے ماحول میں آٹھویں' نویں اور دسویں قرن ہجری کے ہندی فرہنگ نگاروں نے اپنی کتب لغات ترتیب دی ہیں' وہ ادنیٰ ادنیٰ شرحوں سے لغات جمع کرتے ہیں' کتابوں کے حواشی سے الفاظ لیتے ہیں' استادوں سے پوچھ رہے ہیں' خطوط و رقعات سے استناد کر رہے ہیں وغیرہ۔ اگر امیر خسرو اتنا بڑا مجموعہ لغات اپنی یادگار چھوڑ جاتے جو کہا جاتا ہے' کئی ہزار اشعار اور کئی جلدوں پر مشتمل تھا تو کیا یہ فرہنگ نگار جو ایک درجن سے زیادہ ہیں' اس سے استفادہ نہیں کرتے۔ یہ خیال کرنا کہ محض اتفاقیہ یہ کتاب ان کے ہاتھ نہیں لگی' بے حقیقت معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کتاب کو داخل نصاب مانا جاتا ہے' اس لیے شروع ہی سے ان کی واقفیت اس سے ضروری تھی۔

مولانا محمد امین صاحب نے اس یقین کے اندر کہ "خالق باری" امیر خسرو کی تصنیف ہے' شاعرانہ انداز میں دل کھول کر اس کی مدح سرائی کی ہے' بلکہ "نصاب الصبیان" سے ایک قسم کا مقابلہ کر کے "خالق باری" کی افضلیت کو تسلیم کر لیا ہے اور غالباً مولانا نے یہ سب کچھ محض عقیدتاً کیا ہے' کیونکہ حقیقتاً اگر ان کو مقابلہ منظور ہوتا تو "نصاب الصبیان" کے بجائے عبدالواسع کے نصاب یا قادر نامہ مرزا غالب سے مقابلہ کرتے' جو ہر حال میں زیادہ موزوں ہوتا۔ امیر کی وقعت ہمارے دل میں بھی اسی قدر ہے جس قدر کہ مولانا کے دل میں ہے' لیکن "خالق باری" کا معاملہ اور بات ہے۔ میں امیر کی طرف اس تالیف کا انتساب امیر کی ہتک سمجھتا ہوں۔ ہمیں اس کے نقائص پر بھی ذرا ایک نگاہ ڈال لینی چاہیے۔

اس کتاب میں ہر قسم کی ترتیب کا التزام مفقود ہے۔ مضمون' الفاظ اور وزن میں کوئی ترتیب ملحوظ نہیں۔ ہندی الفاظ کے صحیح تلفظ کی کوئی پروا نہیں کی گئی۔ عربی' فارسی اور ہندی الفاظ کے مرادفات التزاماً نہیں دیے گئے۔ کبھی فارسی' ہندی دیے۔ کبھی فارسی' عربی پر قناعت کر لی اور کبھی صرف ہندی الفاظ پر۔ پھر بھرتی کے الفاظ اس کثرت سے لائے گئے ہیں کہ الفاظ برائے بیت "خالق باری" کا وقیع پہلو بن گئے ہیں۔ مثلاً

بادہ شراب و راوق و صہبا ے است و مد
گر جرعہ زاں خوری تو کنی کار نیک و بد

کا آخری مصرع تمام و کمال برائے بیت ہے۔ پھر وہی الفاظ بعض اوقات دوبارہ دہرا دیے ہیں۔ ان کی مثالیں دینا باعث طوالت ہے۔ ہمیں غور کرنا چاہیے کہ کتاب نو عمر بچوں کے لیے لکھی گئی ہے' اس کے لیے اس کی بحروں کا شگفتہ اور سبک ہونا ضروری تھا' لیکن اس تصنیف کی اکثر بحریں غیر شگفتہ اور ناہموار ہیں۔ پھر اوزان کی غلطیاں بھی موجود ہیں۔ ایک مصرعہ بڑھ گیا اور ایک گھٹ گیا۔ کوئی اوچھا اور کوئی لمبا ہو گیا۔ مثلاً شعر

جامہ کپڑا ٹاٹ ٹپڑ ڈبہ کوپا
زر بود وسنا سیم چیتل نقرہ روپا

جو بظاہر بحر رمل مسدس سالم میں ہے' لیکن مصرعہ اوّل کی ابتدا میں ایک سبب خفیف زائد از وزن لایا گیا ہے۔ اور شعر

عقرب بتازی بچھو کژدم برج فلک   بشر تو سروش و فرشتہ ملک

میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلا مصرعہ انگڑائی لے رہا ہے۔ اگر اس کے وزن کی تلاش کی جائے تو فارسی والے کہیں گے کہ کوئی ہندی وزن ہوگا اور ہندی والے کہیں گے کہ فارسی وزن ہوگا۔ آنے والے شعر میں

قوت فرصاو است و کھیرا باد رنگ   چھینکا آونگ ہندوی ڈھیل ہے درنگ

آونگ کا گاف اور ڈھیل کی لام زائد از وزن ہیں۔

بعض مقامات پر دیکھا جاتا ہے کہ مصنف مختلف موقعوں پر ایک ہی لفظ کے دو مختلف معنی دے جاتا ہے۔ مثلاً ذیل کے دو شعر

عنقا سیمرغ ہست لگ لگ ہے تیترا   ہم بارکش ریسماں ہے جیوڑا

طاؤس مور باشد و درّاج تیترا   خوب ونکو بھلا و بدو زشت ہے برا

مصنف کے نزدیک تیتر کی فارسی لگ لگ بھی ہے اور درّاج بھی' لیکن خود فارسی میں لگ لگ اور دراج دو مختلف جانور ہیں۔ دراج بے شک تیتر ہے' لیکن لگ لگ کو اہل لغات یوں بیان کرتے ہیں:

''مرغے است مشہور کہ گردن ومنقار و پائے دراز دارد و مار را شکار کند۔''

حکیم سنائی فرماتے ہیں:

آں لگ لگ گوید کہ لک الحمد و لک الشکر

تو طعمۂ من کردۂ آں مار ثریاں را

اب ایسی غلطی امیر خسرو سے نہایت بعید ہے۔ کسی دوسرے موقع پر خرما کے معنی ایک جگہ کھجور بتائے جاتے ہیں اور دوسری جگہ املی' چنانچہ

جان خرما ہندوی املی   داں صمغ گوند کلیم است کنبلی

ہندوی گویند خرما را کھجور   داکھ را فارسی میداں انگور

املی کو اگرچہ خرمائے ہندوی کہا جاتا ہے' لیکن جس طریق سے مصنف نے بیان کیا ہے' بے حد مغالطہ خیز ہے۔ انگور کا تلفظ جس طرح شعر دوم میں کیا گیا ہے' وہ ہمیں پنجاب کی یاد دلاتا ہے۔ انگور کا یہ تلفظ امیر سے بعید ہے' بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ کتاب بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ شعر آئندہ میں مصنف سے ایک اور لغزش مشاہدہ ہوتی ہے:

فارسی سیمرغ و عنقا ہست تدرو و کبک ہنس

ہچو یرقان است کانور ہے زریر و نسل بنس

اس شعر میں تدرو، کبک اور فس تین مختلف پرندوں کو مصنف نے ایک مان لیا ہے۔ کبک کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ اسی کو ہم چکور کہتے ہیں۔

کبک کو ہندی میں کہتے ہیں چکور

مرزا غالب ''قاطع برہان'' میں کہتے ہیں ''تدرو در فارسی طائرے را گویند کہ بشیر ہندی آنست۔'' اور فرہنگ نویس کہتے ہیں کہ ''مرغے ست صحرائی شبیہ بخروس در نہایت خوش روشی و خوش رفتاری'' لیکن ہمارے لیے سب سے اہم یہ امر ہے کہ خود امیر خسرو کبک اور تدرو کو علی الرغم مصنف ''خالق باری'' علیحدہ علیحدہ پرندے تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ ''قران السعدین'':

آں کہ پریدے ز پر خود تدرو مانده چو پر گم شدگان زیر سرو
لالہ چو از کوہ برفت از شکوہ کبک ہبرید دل از بیخ کوہ

(ص 47 طبع میر حسن رضوی)

''قران السعدین'' میں دونوں شعر اسی ترتیب سے بلا فاصلہ ملتے ہیں جس سے اس احتمال میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ امیر کے نزدیک کبک اور تدرو دو مختلف جانور ہیں اس لیے ''خالق باری'' کا مصنف اور امیر خسرو ایک شخص نہیں ہیں، لیکن صاحب ''خالق باری'' نے تدرو اور کبک کو ایک جانور کیوں تسلیم کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود بعض اہل لغات اس غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں مثلاً ''موید الفضلاء'' میں تدرو کی تشریح میں ہم یہ عبارت پڑھتے ہیں:

''تدرو بفتحتین، کبک و آں پرندہ ایست آتش خوار و خوش رفتار کہ بکوہ ہا بود کذا فی الادات۔''

(ادات الفضلاء۔ قاضی بدرالدین محمد دہلوی نے 822ھ میں تالیف کی ہے۔)

اب ظاہر ہے کہ صاحب ''خالق باری'' نے اپنی تالیف کے وقت ''ادات الفضلاء''، ''موید الفضلاء'' 925ھ یا کسی اور ایسی کتاب لغات سے امداد لی ہے جس کے مآخذ میں یہ کتابیں شامل ہیں۔ بیت ذیل بھی قابل توجہ ہے:

نیا خال ہندوی ماموں جان اور عمو کہیے چچا بکھان

''نیا'' کے معتبر معنی دادا یا نانا کے ہیں۔ چنانچہ لغت فرس، فرہنگ جہانگیری، رشیدی، چراغ ہدایت اور آنندراج میں صرف یہی معنی دیے ہیں اور فردوسی علی العموم انہی معنوں میں لاتا ہے۔ مثال:

دروگر زمانست و ما چوں گیا ہمانش نبیرہ ہمانش نیا

مصنف ''خالق باری'' نہایت مشہور اور مستند معنوں کو صرف نظر کر کے غیر معروف بلکہ مشتبہ معنی ''ماموں'' دیتا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکی ہے یعنی ''ادات الفضلاء'' یا ''موید الفضلاء'' وغیرہ لغات سے نقل کر رہا ہے۔ چنانچہ ''موید الفضلاء'' میں اس لغت کے لیے لکھا ہے۔ ''جد و برادر مادر و برادر بزرگ'' لیکن یہ یاد رہے کہ آخری دونوں معنوں کے لیے ہمارے پاس کوئی معتبر سند نہیں ہے اور غالباً ایسے معنی

ہیں جو ہندوستان میں بعض غلط فہمیوں کی بنا پر پیدا ہو گئے ہیں۔

''خالق باری'' جیسی کتاب کی تصنیف کتب لغات کی امداد کے بغیر دشوار ہے' لیکن جو لغات مصنف کے پیش نظر ہیں' ایسی ہیں جو مغلوں کے عہد سے پیشتر ہندوستان میں لکھی گئی ہیں کیونکہ جو لغزشیں ان کتابوں میں موجود ہیں' ان کا عکس ''خالق باری'' میں بھی مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ''خالق باری'' ان کتب لغات کے بعد لکھی گئی ہو۔ ''موید الفضلاء'' 925ھ میں کہا جاتا ہے' تصنیف ہوتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ ''خالق باری'' اس کتاب کی تصنیف کے بہت بعد تالیف ہوئی ہوگی۔

''خالق باری'' کو ''موید'' سے موخر ماننے کے لیے ایک اور بھی دلیل ہے جو یہ ہے کہ ''موید الفضلاء'' میں بعض اوقات فارسی الفاظ کے ہندی مرادفات بھی دیئے گئے ہیں۔ جب ہندی الفاظ کا ''خالق باری'' کے ہندی الفاظ سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو ''موید'' کا تقدم ''خالق باری'' پر صریحاً ظاہر ہو جاتا ہے اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ''موید'' کی زبان ''خالق باری'' سے زیادہ قدیم ہے۔ میں یہاں چند الفاظ کی فہرست مقابلے کی غرض سے ناظرین کے پیش کرتا ہوں:

موید الفضلاء...... حربا= کھرکت...... داس= ہنسوا...... چار مغز= اکروت

خالق باری...... حربا= گرگٹ...... داس= داتی...... جوز خراساں= اخروٹ

موید الفضلاء...... جوز بوا= جاپھل...... بوے= گندہ...... خیار= ککھری

خالق باری...... جوز بویا= جائے پھل...... بوے= باس...... خیار= ککڑی

موید الفضلاء...... انگوزہ= ہینگہ...... دبہ= کوپہ...... خرس= بھال

خالق باری...... انگوزہ= ہینگ...... دبہ= کوپا...... خرس= ریچھ

موید الفضلاء...... خنور= کوٹھی...... دوغ= چھاچھ...... آسمانہ= چھتہ

خالق باری...... کندر= کوٹھا...... دوغ= مہی...... سقف= چھت

موید الفضلاء...... فازہ= جنوائی

خالق باری...... فازہ= جمائی

''خالق باری'' کی زبان کے مقابلے کے لیے میرے نزدیک سب سے مناسب کتاب ''نصاب سہ زبان'' یا ''صمد باری'' عبدالواسع ہانسوی ہے۔ عبدالواسع عہد عالمگیر کے ایک بزرگ مانے جاتے ہیں۔ ان کی کتاب ''دستور العمل معروف بہ رسالہ عبدالواسع'' نہایت مشہور ہے اور اب بھی درس میں داخل ہے۔ ''نصاب سہ زبان'' ایک نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ اس میں التزاماً ہر مصرع میں تین لفظ عربی' فارسی اور ہندی کے بالترتیب یکے بعد دیگرے دیئے گئے ہیں۔ ساتھ ہی متناسب الفاظ کو علیحدہ علیحدہ عنوان کے نیچے بیان کر دیا ہے۔ مثلاً لغات اعضائے انسان' اجناس غلہ' میوہ جات' ترکاریہا وگلہا' ادویات وغیرہ وغیرہ۔ خاتمہ میں مصادر

مشہورہ وغیر مشہورہ دے دیے ہیں۔ اب ''خالق باری'' اور ''نصاب'' کی زبان میں بہت کم فرق دیکھا جاتا ہے۔ اکثر الفاظ دونوں میں عام ہیں' لیکن چونکہ عبدالواسع ہانسی کے متوطن ہیں' جہاں ہریانی زبان کی اشاعت ہے۔ غالباً اس اثر میں عبدالواسع بعض ایسے الفاظ (اگرچہ ہندی میں) دے جاتے ہیں جن سے موجودہ اردو خواں واقف نہیں۔ ذیل میں ''خالق باری'' اور ''نصاب'' کے مابہ الامتیاز الفاظ کی ایک فہرست دی جاتی ہے:

خالق باری...... فازہ = جمائی...... تپ = جوڑی...... راسو = نیول

نصاب سہ زبان...... فازہ = جلبھائی...... تپ = جڑ...... راسو = نیولا

خالق باری...... روباہ = لونکڑی...... شیر = سینہہ...... امید = آس

نصاب سہ زبان...... روباہ = لونبڑی...... شیر = باگھ...... امید = آسا

خالق باری...... نیا = ماموں...... مردمک = پوتلی...... لب = ہونٹھ

نصاب سہ زبان...... نیا = دادا...... مردمک = پتری...... لب = اودھر

خالق باری...... گوش = کان...... انگشت = اونگلی...... رخسار = گال

نصاب سہ زبان...... گوش = سرون...... انگشت = اونگری...... رخسار = کپول

خالق باری...... پائے = پانو...... مادر = ماں...... پیشانی = کپار

نصاب سہ زبان...... پائے = چرن...... مادر = مہتاری...... پیشانی = ماتھا

خالق باری...... چشم = نین...... پہلو = پانسلی

نصاب سہ زبان...... چشم = لوچن...... پہلو = پانسلی

دونوں کتابوں کی زبان پر غور کرنے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ''خالق باری'' ''نصاب'' سے چنداں مقدم نہیں ہے۔

آخر میں ایک اور امر کی طرف بھی توجہ دلائی جاتی ہے کہ موجودہ ''خالق باری'' کا متن جس میں علی گڑھ کا نیز بازاری ایڈیشن شامل ہیں' چنداں قابلِ اعتبار معلوم نہیں ہوتے۔ مولوی محمد امین صاحب چڑیا کوٹی نے اگرچہ نہایت جانفشانی سے اپنا نسخہ مرتب کیا ہے' لیکن بدقسمتی سے انہوں نے زیادہ تر مطبوعہ نسخوں پر اعتبار کیا ہے اور قلمی نسخوں کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس لیے ان کا نسخہ اگرچہ بازاری نسخوں کے مقابلے میں بہتر مانا جا سکتا ہے' تاہم مستند نہیں ہے' کیونکہ بمرور زمانہ مطبوعہ نسخوں میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ اور حک و اصلاح ہو گئی ہے۔ ''خالق باری'' کی قدیم ترتیب اور اشعار کی تنظیم بالکل برباد کر دی گئی ہے اور رفتہ رفتہ بعض اغلاط بلکہ یوں کہیے مصنوعی لغات اس میں شامل ہو گئے ہیں۔ میں یہاں صرف چند مثالوں پر قناعت کرتا ہوں:

علی گڑھ اور بازار کے نسخوں میں ایک مصرع

''تابہ گزگاں است کڑاہی و توا''

آتا ہے' جس میں ''گزکاں'' نے مصنوعی لغت کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ گزکاں اس صورت میں آنندراج' برہان' نفائس رشیدی اور جہانگیری میں نہیں ملتا۔ البتہ قازقاں' قزقاں اور گزغاں' بمعنی ''دیگ بزرگ مسیں'' ملتا ہے۔ یہ ترکی زبان کا لفظ ہے۔ امیر خسرو فرماتے ہیں:

ولے با ایں ہمہ زیں خواں خالی شستہ بر دستم
کہ حلوائے رضا پختہ نگردد اندریں گزغاں

قلمی نسخوں کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے مصرع بالا میں ''گزغاں'' دراصل لکھا تھا۔ اسی طرح مصرع

ہندوی کہانڈا کہاوے ان من (یا آں من) میغ

میں ''اُن من'' یا ''آں من'' ایک حیرت میں ڈالنے والا لغت بن گیا ہے۔ مولوی محمد امین صاحب بھی اس لفظ کی تشریح سے عاجز ہیں اور تجویز کرتے ہیں۔ ''قیاس یہ چاہتا ہے کہ یہ لفظ ''انمز'' ہے۔ اس صورت میں وزن عروضی درست ہو جاتا ہے۔'' لیکن اس کے معنی جو مولوی صاحب ''بادل کا گھر آنا'' بیان کرتے ہیں' چنداں چسپاں نہیں۔ مگر قلمی نسخوں میں یہ مصرع یوں ہے:

ہندوی کھانڈا کھاوے ابر میغ

اب وہ تمام گنجلک رفع ہو جاتی ہے۔ ایک مصرع

''ہم قرنفل لونگ را کیکر بخواں''

میں کیکر کو پنجابی لفظ بتایا گیا ہے۔ چنانچہ تمام نسخوں میں اس کو پنجابی لکھا گیا ہے' لیکن سب سے زیادہ حیرت خیز یہ امر ہے کہ اہل پنجاب اس لفظ سے اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہیں۔ قلمی نسخوں میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصرع مذکور دراصل یوں ہے:

ہم قرنفل لونگ را نیکو بداں

اس سے ظاہر ہے کہ کیکر محض اتفاقیہ ایک مصنوعی لغت بن گیا ہے اور کوئی تعجب نہیں۔ اگر لفظ ''نیکو'' ترقی معکوس کرتا ہوا کیکر بن گیا ہو۔

شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ

ہندوستان کے مشاہیر اولیا سے ہیں۔ ابتدا میں سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ کے مرید ہونے کی نیت سے 725ھ میں دہلی آئے' لیکن اس وقت تک ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ آخر دہلی میں شیخ نجیب الدین فردوسی کے مرید ہو گئے۔ بہار جا کر مدتوں کوہ راج گیر میں ریاضت وعبادت میں مشغول رہے۔ 782ھ میں وفات پائی اور میر اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ تصنیفات کے سلسلے میں آپ کے ملفوظات و مکتوبات موسوم بہ "معدن المعانی کتاب ارشاد السالکین" اور "شرح آداب المریدین" مشہور ہیں۔ "شرف نامہ" احمد منیری ابراہیم بن قوام فاروقی نے آپ ہی کے نام پر سلطان باربک شاہ 864ھ و 879ھ والی بنگالہ کے عہد میں لکھا ہے۔ شیخ شرف الدین بھاشا میں بھی شاعری کرتے تھے اور شرف آپ کا تخلص تھا۔ ذیل میں آپ کا ایک "کج مندرہ" جو انواع امراض کے لیے مفید بتایا جاتا ہے' نقل کرتا ہوں۔ ان کے دو دوہرے اس کج مندرہ میں بھی موجود ہیں۔ علاوہ ازیں کج مندرہ اس عہد کی اردو کا بھی ایک اچھا خاصا نمونہ ہے:

"کج مندرہ از شاہ شرف الدین احمد یحییٰ منیری بر جمیع امراض کہ دریں ذکر می شود مجربیست از علف خشک جھاڑا بکند۔"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللھم صل علیٰ محمد و آل محمد صاحب التاج و المعراج و البراق اسمه جسمه مطهر منور مولی الثقلین صاحب العلم والحلم. دافع البلاء والوباء ابو القاسم محمد بن عبداللہ صاحب العرب والعجم. یاایھا المشتاقون الذین آمنوا بنور جماله صلوا علیه و آله وسلموا تسلیماً کثیراً برحمتک یا ارحم الرحمین. بسم اللہ شافی بسم اللہ المعافی بسم اللہ الکافی بسم خیر الاسماء بسم اللہ الذی لا یضر مع اسمه شی فی الارض ولا فی السماء وهو السمیع العلیم.

اوانکار اوشتا کرتا بیدن ہرتا وہی ایک سرجن ہار دو جک تین تلوک۔ چار بید پانچ پنڈ و چھ مارک سات سمندر آٹھ بس نو گرہ دس راون۔ اگیارہ رودر بارہ راس۔ تیرہ تھول چودہ بھون پندرہ تھ سولہ ک لاچار کہاں چار بان پانچ بھوت آت مان نوے ناتھ چوراسی سیدہا چوسٹھ جوگنی اشٹ کوڑی ناک بی تیس کوڑی دیوتا

چوراسی۔ جن سرجیو جنت اکاس پاتال مرت منڈل رات دن ھر گھری ڈنڈلی ڈنڈ پلا چپلا جوگ مہورت میں تمیں ساکھی دہرت ہوں جو کچھ فلانے کے پنڈ پراں میں موی راہ کا باٹ کا کوٹے کا پوکہر کا اندہیاری کا اجیالی کا چوٹ کا پھیٹ کا کیٔے کا کرائے کا بھیجے کا ہجائے کا لانگھے کا الکھیں کا دیودا نو بھوت پلیت راکس بھوکس ڈائن ڈکن سکھن پچن چوڑیل میل ملان جان جوان ڈیٹھ موتہ تپ تجاری جاڑا جوڑی اکھوری بھگوڑی کہ تھنیلا مروٹ آو ڈنبھی کرکری آدھاسیسی آو بریسی نہرواڈھروا کل سوا کچھ دی پلی اٹھارہ کوڑہ اٹھارہ پرمیو ہوک سوک جلندر کٹن دہبر ریس پچیس کوڑہ کشت آوں لوہو بلغم پی چش مرگی کیبی کہا گلٹی پھرکی باؤ کولا سرخ باؤ سبز باؤ سیاہ باد و ہفتاد و دو باد ہر بائے کہ باشد در وجود فلاں جن آبکار دہس ہے دوہائی سلیمان بن داؤد پیغمبر کی جل بھسمنت ہو بیک بلا جائے تاتر سوالاکھ پیغمبر کا بجر تھاپ نوے ناتہ چوراسی سدبھا کا سراب جی جی کرنت تی تی مرنت دہائی شاہ شرف الدین یحیٰ منیری کی بحق کھیعص و حمعسق و بحق لم یلد و ولم یولد.......... ولم یکن له کفواً احد و نزل من القران ما هو شفاء و رحمت للمومنین ولا یزید الظالمین الا خساراً.

کالا ہنسا نرملا بسے سمندر تیر

پنکہ پسارے بکہ ہرے نرمل کرے سریر درور ہے نہ پیر بحق لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ایں دو ہرا راسہ بار بخواند۔

شرف حرف مائل کہیں درد کچھو نہ بسائے

گرو چھویں دربار کی سو درد دور ہو جائے

(از بیاض مملوکہ مولوی محبوب عالم صاحب۔ ایڈیٹر "پیسہ اخبار")

شاہ کبیر یا کبیر داس

یہ ذات کے جولاہے تھے اور بنارس کے رہنے والے۔ کہتے ہیں کہ ان کی وفات پر مسلمانوں نے انہیں رسوم اسلام کے مطابق دفن کرنا چاہا اور ہندوؤں نے اپنے مذہبی طریق پر جلانا چاہا۔ اس سے کم از کم دونوں قوموں میں ان کی ہردلعزیزی مسلّم ہے۔ صاحب ''دبستان'' نے جو حالات دیے ہیں' وہ زیادہ تر ہندو ذرائع سے ماخوذ ہیں۔ ان میں انہیں رامانند کا چیلہ بتایا گیا ہے۔ ہندی نورتن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکے کا نام کمال اور لڑکی کا نام کمالی تھا۔ کبیر کے کلام میں قدم قدم پر مسلمانی اثر نمایاں ہے۔ اگرچہ اس کا کلام کبیر پنتھیوں اور ہندوؤں کی حراولت میں رہنے سے بہت کچھ مسخ ہوگیا ہے اور اکثر غیر کبیری کلام اس میں شامل کر دیا گیا ہے۔ تاہم مسلمان صوفیوں اور کبیر کے کلام میں بہت کم فرض دیکھا جاتا ہے۔ اکثر امور میں وہ صوفیوں کا ہم آواز ہے۔ عشق الٰہی' ذکر' فنائیت' محویت' حیرانی' ترک و تجرید' موت کی یاد' دنیا کی بے ثباتی' ہمہ اوست جو صوفیہ کے ممتاز مضامین ہیں' کبیر کے ہاں عام ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس کے اکثر اشعار ہمیں مسلمان شعراء کی یاد دلاتے ہیں۔ حافظ شیرازی کہتے ہیں:

ہر کسے پنج روزہ نوبت اوست

کبیر کہتے ہیں:

کبیر نوبت آپنی دن دس لیہو بجائے

فردوسی کا شعر ہے:

چہ بندی تو دل بر سرائے فسوس — کہ ہر ماں ہمی آید آوائے کوس

کبیر کہتے ہیں:

کبیر سریۓ سرائے ہے کیا سوئے سکھ چین — سوانس نگارا کوچ کا باجت ہے دن رین

ابوالفرج کہتا ہے:

ہر کس بقدر خویش گرفتار محنت است — کس را نداده اند برات مسلمی

کبیر کا قول ہے:

راجا دکھیا پرجا دکھیا جوگی کو دکھ دونا ری
کہے کبیر سنو بھائی سادھو کوئی مندر نہیں سونا ری

مولانا روم:

چشم بند و لب بہ بند و گوش بند — گر نہ بینی سر حق بر من بخند

اور کبیر:

دیکھے رہی دیکھ تجھ مَیں تیرا دھنی دم کو روک دیدار پاوے
دم کو روک اور موں کو بند کر چاند سورج گھر ایک آوے

کبیر کا یہ شعر ہمیں عمر خیام کی یاد دلاتا ہے:

ماٹی کہے کمہار کوں تو کیا روندے موہیں
اک دن ایسا ہووے گا میں روندوں گی توہیں

کبیر کی زبان اردو سے بہت ملتی جلتی ہے۔ دس فیصدی سے زیادہ اس کے ہاں فارسی الفاظ ہیں' بلکہ ایسے فارسی محاورے جو اردو کے ذریعے سے عام میں رائج تھے' اس کے ہاں موجود ہیں۔ مثلاً نوبت زدن فارسی محاورہ ہے۔ کبیر نے اس کا ترجمہ نوبت بجانا کر لیا ہے۔ اسی طرح ''تیشہ بر پا زدن و خوردن'' فارسی کا ایک اور محاورہ ہے' کبیر اس کا بھی استعمال کرتا ہے:

دین گنوایو سنگ دنی نہ چالی ساتھ — پانو کلہاری ماریا مورکھ اپنے ہاتھ

فارسی کی ایک ضرب المثل ہے:

کہ زنگی بشستن نگردد سفید

کبیر اپنے انداز میں یوں لکھتا ہے:

کویلا ہوے نہ اُوجرو نو من صابن لائے

ان چند امثال سے جو میں نے یہاں دکھائی ہیں' ظاہر ہوتا ہے کہ کبیر اپنے تخیل' جذبات اور مقولات میں بہت کچھ مسلمانوں کے زیر اثر ہے اور یہ کہ اس کی تربیت مسلمانوں میں ہوئی ہے' لیکن جس طرح حضرت عیسیٰ نے یورپ پہنچ کر یورپین خط و خال پیدا کر لیے ہیں' اس طرح کبیر کے کلام نے ہندوؤں کی صحبت میں رہ کر ہندوائی شکل اختیار کر لی ہے۔ کبیر کے معتقدین نے یہی نہیں کیا ہے بلکہ ایک قدم اور بلند پروازی کی ہے یعنی کبیر کے نام پر ایسے ابیات اور نظمیں شائع کی ہیں جو اسلام پر حملہ ہیں۔ مثلاً یہ شعر کبیر کے نام پر شہرت رکھتا ہے:

کانکر پاتھر جوڑ کے مسجد لیئی بنائے — تا چڑھ ملا بانگ دے بہرا ہوا خدائے

کیا یہ سمجھا جائے کہ کبیر جو مسلمان اور مسلمان زادہ تھا اور مسلمان گھر کا پرورش یافتہ' اذان جیسے غیر معمولی رکنِ اسلامی کی غایتِ اصلی سے ناواقف محض تھا۔ مسلمانوں کا بچہ بچہ تک جانتا ہے کہ اذان کا مقصد اعلانِ

نماز ہے تاکہ نمازی بروقت جمع ہو جائیں۔ نعوذ باللہ یہ مقصد نہیں کہ خدا بہرا ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر ہے:

مسلمانوں کے پیر اولیا مرگی مرگا کھائی
خالا کی ری بیٹی بیاہیں گھر ہی میں کریں سگائی

اس شعر میں پہلا اعتراض مرغا مرغی کے ذبیحہ پر ہے' دوسرا اعتراض خالہ کی بیٹی بیاہنے پر۔ یہ اعتراض محض ہندو نقطۂ نظر سے ہیں اور ہر وہ شخص جس نے مسلمانوں میں پرورش پائی ہے' اس کو لغو سمجھے گا۔ کبیر ایک صاحب ترک و تجرید شخص ہے۔ اس کے مسلک کو ایسے فریقی مسائل سے کوئی لگاؤ نہیں۔ کبیر اپنی اصلی نظموں میں اپنے آپ کو مسلمان جولاہہ کہتا ہے۔ ایک نظم کا پہلا مصرعہ یوں شروع ہوتا ہے:

''مسلمان جولاہہ ایک''

دوسرا مصرعہ مجھ کو یاد نہیں رہا۔

کبیر کا بارہ ماسہ راقم کے پاس موجود ہے جو انہوں نے اپنے مرید سید مراد کی فرمائش پر لکھا ہے۔ اس میں ست تصنیف سن 1130 دیا ہے جو غالباً کوئی اور ست ہے۔ میں اس کا ابتدائی بند یہاں نقل کرتا ہوں:

گئی بیس اب آیو بوڑھاپا — بنان پیو کہو یو تر تاپا
سبھی بیس ہیں کھیل کنوائی — پیسہ کی نیہا نیک نہیں پائی
ساٹھ برکھ میں جات نجانی — گور کی بچن نیک نہیں مانی
چھن چھن دیہہ بھی ات جھیناں — پیہ کو سمرن کچھو نہ کیناں
سب جوبان اکارتھ کھویو — برہی نام کبیرا رویو
چیلا سید مراد سیانا — جن گور بچن ساتھ گور مانا
موسوں کہی موہ یہ آسا — کہدیو مو کوں بارہ ماسہ
مانس مانس میں جی دکھ پاے — تے جگ کوں ان آے سناے

برہی ست ہے بھیو گیارہ سے اور تیس
بارہ ماسہ میں کہوں پنڈت دیو اسیس

صاحب ''مخزن الاصفیا'' (ص 446) کبیر کے متعلق لکھتے ہیں:

''مرید و خلیفہ شیخ تقی است از اولیاء اللہ و مشاہر عہد خود است و جمال ولایت را در طریق ولایت مستور داشتے و در موحدان وقت خود ممتاز بود و او را در زبان ہندی کلام بسیار عالی است کہ بر علو درجات او دال است و اگر در کلام او تفحص و تجسس کردہ آید نوعے از قسم وصال یافتہ می شود و فراق را در ساعت وصلت او اصلا عبور نیست۔ و اول کسے کہ بزبان ہندی حقایق و معارف بیان فرمودہ اوست و انواع اشعار ہندی وارد

لیکن اکثرے از جنس بشن پد وساکھی از وے منقول است واگر بنظر انصاف بہ بینی جواہر دقائق ولآلی حقائق بمیزان سنجیدہ است کہ مثل آں در کلام دیگرے یافتہ نمی شود...... واز قوت باطنی او آنکہ اہل اسلام وہنود ہر دو فریق براو اعتقاد کامل دارند واز خود شمارند۔ چنانچہ در اہل اسلام بہ پیر کبیر و در ہنود بہ بھگت کبیر اشتہار دارد۔"

شیخ عبدالحق اپنے دادا شیخ سعداللہ متوفی 928ھ کی رائے کبیر کے متعلق ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"عمی می فرمودند روزے از ایشاں پرسیدم ایں کبیر مشہور کہ بشن پدہاے وے می خوانند مسلمان بود یا کافر؟ فرمودند موحد بود۔ عرضہ کردم کہ موحد مگر غیر کافر و مسلمان است؟ فرمودند فہم ایں معنی دشوار است خواہید فہمید۔" (اخبار الاخیار، ص 343)

کبیر کے زمانۂ وفات کے متعلق بہت کچھ اختلاف ہے۔ اکثر مصنفین ان کو سلطان سکندر لودھی کے عہد میں مانتے ہیں۔ مثلاً ابوالفضل اور صاحب "دبستان المذاہب"۔ اس طرح ان کی وفات دسویں صدی ہجری کے پہلے ربع میں ہونی چاہیے، لیکن سرکاری آرکیالوجیکل رپورٹ اثریات قدیمہ ومخطوطات صوبہ شمال و مغربی واودھ (ص 224) میں لکھا ہے کہ بجلی خاں نے کبیر کا روضہ موضع مگھر ضلع بستی میں (جہاں کبیر وفات پاتے ہیں) 1450ء میں تیار کرایا (جو سال 854ھ کے مطابق ہے) اور 972ھ میں فدائی خاں نے بعہد اکبر اس روضے کی مرمت کرائی۔ شاہ کبیر کی یادگار میں ایک مسجد شہر جون پور میں بابا بھیک نے 991ھ میں تعمیر کی ہے۔ کبیر کی اوقاف کے لیے دو گاؤں شاہی زمانہ سے معافی میں چلے آتے ہیں۔ ایک گاؤں مسلمانوں کے قبضے میں ہے اور دوسرا ہندوؤں کے قبضے میں۔ کبیر کے مزار کے برابر ہندوؤں نے کبیر کا سمادھ بنا رکھا ہے۔ سمادھ میں ایک سادھو رہتا ہے اور مزار پر مسلمان مجاور ہیں۔

کبیر کی تحریک ان اثرات کی آواز بازگشت ہے جو اسلام کی موجودگی سے ہندوستان میں بروئے کار آئے ہیں۔ کبیر کی آواز توحید کی نشر واشاعت اور بت پرستی کی بیخ کنی میں نہایت مفید ثابت ہوئی ہے اور ہندوستان کے ایسے مذاہب پر جو اس کے بعد وجود میں آئے ہیں اس کا اثر نہایت گہرا ہے۔ مثلاً کبیر پنتھیوں کا وہ پیشوا مانا جاتا ہے۔ دادو پنتھیوں، ستنامیوں اور نانک پنتھیوں پر بھی کبیر کا پرتو نمایاں ہے۔ مسٹر بوس کا بیان ہے کہ کبیر نے ہندوستان کی بارہ تیرہ مذہبی تحریکات پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ بلحاظ شاعری اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ وہ ہندی زبان کا در حقیقت پہلا بڑا شاعر ہے۔ اس کا کلام سادگی، تاثیر، صفائی، جدت، معنی آفرینی، سوز وگداز اور شیرینی ادا کے اوصاف سے آراستہ ہے۔ کبیر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ دقیق سے دقیق خیال کو چند معمولی الفاظ میں ادا کر سکتا ہے، جس کو خواندہ وجاہل اور عامی وعالم سب سمجھ سکتے ہیں اور اسی کمال کی بدولت اس کو دائمی شہرت کا تاج مل گیا ہے۔ تلسی داس اور سورداس اگرچہ کبیر سے بہت بعد گذرے ہیں، لیکن ان کا کلام اس قدر دقیق اور عالمانہ ہے کہ ہم اس کا اکثر حصہ سمجھنے سے قاصر ہیں، لیکن کبیر کے ہاں یہ دقت محسوس نہیں ہوتی۔

اگر چہ اس کا وطن بنارس ہے، لیکن اس نے وہ زبان استعمال کی ہے جو اس زمانے میں عوام الناس کی زبان تھی۔ اسی لیے اس کا کلام اردو کے اس قدر قریب ہے کہ آج بھی اس کا سمجھنا دشوار نہیں۔ کبیر کی تصنیفات سے بعض ریختے بھی مشہور ہیں۔ اسی طرح اس نے فارسی بحروں میں بھی لکھا ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ بعض موقعوں پر اس نے ردیف قافیے کی بھی پابندی کی ہے۔ میں یہاں دو مثالیں درج کرتا ہوں:

خلق سب رین کا سپنا، سمجھ من کوئی نہیں اپنا
کٹھن یہ موہ کی دھارا، بہا سب جات سنسارا
گھڑا جو نیر کا پھوٹا پتا جو ڈار سے ٹوٹا
آ اس نرجات جندگانی ابھوں لگ ابھی مانی
تجو بدلو یہ چترائی رہو نہنگ جگ مائیں
نکس جب پران جاویں گے کوئی نہیں کام آویں گے
آ اس نر جان یہ دیہا لگا لے نام سے نیہا
کٹے جسم جال کی پھانسی کہے کبیر ابی ناسی

(کبیر پچناولی۔ ص184)

دیگر:

سنتا نہیں دھن کی خبر ان حد باجا باجتا
رسمندر مندر گاجتا باہر سنے تو کیا ہوا
گانجا افیم و پوستا بھنگ اور شرابیں پیتا
اک پریم رس چاکھا نہیں املی ہوا تو کیا ہوا
کاسی گیا اور دوارکا تیرو شکل بھرمت پھرے
گانٹھی نہ کھولی کپٹ کی تیرتھ گیا تو کیا ہوا
پوتھی کتابیں بانچتا اوروں کو نت سمجھاوتا
نر کوئی محل کھوجے نہیں بک بک مرا تو کیا ہوا
قاضی کتابیں کھوجتا کرتا نصیحت اور کو
محرم نہیں اس حال سے قاضی ہوا تو کیا ہوا
شطرنج چوپڑ گنجفہ اک نرد ہے بد رنگ کی
بازی نہ لائی پریم کی کھیلا جوا تو کیا ہوا
جوگی دگمبر سے بڑا کپڑا رنگے رنگ لال سے

واقف نہیں اس رنگ سے کپڑا رنگا تو کیا ہوا
مندر جھروکے راوٹی گل چمن میں رہتے سدا
کہتے کبیرا میں سبی گھٹ گھٹ میں صاحب برم رہا

(کبیر بچناولی)

یہ نظمیں اچھی خاصی اردو کہلائے جانے کی مستحق ہیں، لیکن مجھ کو شبہ ہوتا ہے کہ وہ کبیر کی نہ ہوں اور بعد میں کبیر کی طرف منسوب کردی گئی ہوں۔ بات یہ ہے کہ ہندی ادبیات میں ہم ہر قسم کی ابتری اور آشوب سے ملاقی ہوتے ہیں۔ قدما کے حالات اوران کے سنین حیات وممات سے ہندی ادیب اکثر بے خبر ہیں۔ اسی طرح اساتذہ کے اصلی اور غیر اصلی کلام کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ اب اسی کبیر کی طرف اسی پچاسی تالیفات منسوب ہیں۔ خدا جانے ان میں کتنی کبیر کی ہیں اور کتنی الحاقی۔ اسی طرح اپنے ادبی ذوق کی قدامت ثابت کرنے کی دھن میں وہ ہر لغو دستاویز کو پرتھی راج اور اس کے جانشینوں کے عہد کی ماننے کے لیے تیار ہیں۔

میرا خیال ہے کہ کبیر کے بعد بھی کبیر کے نام پر برابر نظمیں لکھی جاتی رہی ہیں، کیونکہ بعض نظموں میں ایسی اشیا اور چیزوں کا ذکر آتا ہے جو کبیر کے عہد میں رائج نہ تھیں۔ مثلاً بندوق، تمباکو اور دوربین۔ بندوق اگرچہ دکن میں پہلے سے رائج تھی، لیکن ہندوستان میں بابر کے عہد تک بھی بہت کم معلوم تھی اور عام استعمال میں ہرگز نہ تھی۔ تمباکو ہندوستان میں اکبر کے عہد میں آتی ہے اور دوربین تو گذشتہ صدی میں یورپین لاتے ہیں۔ میں ان کی مثالیں ذیل میں عرض کرتا ہوں:

تیر تپک سے جو لڑے سو تو سور نہ ہوئے
مایا تج بھگتی کرے سور کھائے سوئے

(کبیر بچناولی۔ص28)

دیگر:

کب تار و بندوق چلایا داس دیو کب بنب بجایا
(کبیر بچناولی۔ص169)

دیگر ع:

بھنگ تمباکو سلفا گانجا سوکھا کھوب اوڑایا رے
(کبیر بچناولی۔ص145)

دیگر ع:

تھرے دوارے دور بین لگاوے اُترے بوجھل پارا
(کبیر بچناولی۔ص103)

شیخ بہاء الدین باجن

(متوفی 912ھ)

مصنف آخر قرن نہم کے بزرگ ہیں اور شیخ رحمت اللہ گجراتی بن مخدوم شیخ عزیز اللہ متوکل کے مرید ہیں۔ صاحب ''خزینۃ الاصفیا'' شیخ عزیز اللہ کے مرید بتاتے ہیں۔ (ص 411) شیخ رحمت اللہ محمود بیکرہ 863ھ و 917ھ والیٔ گجرات کے پیر ہیں۔ شیخ بہاء الدین کے والد کا نام معزالدین ہے اور مزار برہان پور میں ہے۔ ان کے بھائی میاں میناں بھی شیخ رحمت اللہ کے مرید تھے۔ سال وفات بقول تذکرہ ''گلزار ابرار'' 912ھ ہے۔ کچھ مدت سیاحی بھی کی ہے۔ ادھر گجرات سے سندھ خراسان تک گئے ادھر جزیرۂ سیلان تک پہنچے۔

شیخ باجن ہندی و فارسی میں اشعار کہتے تھے اور باجن تخلص کرتے تھے۔ باجن کے معنی ہندی میں ساز کے ہیں۔ انہوں نے فارسی زبان میں ایک تصنیف اپنے پیر کے حالات اور مریدوں کی ہدایت میں لکھی ہے اور اس میں اپنے اشعار کثرت سے لائے ہیں۔ باجن پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو زبان کو ''زبان دہلوی'' کے نام سے یاد کیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو ان ایام میں بھی برج بھاشا سے علیحدہ مانی جاتی تھی۔ ان کے ہاں صرف ایک نمونہ اس اردو کا ملتا ہے۔ میں اس کو اس سے پیشتر انہی صفحات میں نقل کر چکا ہوں۔

نمونہ کلام:

مناجات:
روزے دہر دہر نماز گزاری دینی فرض زکوۃ
بن فضل تیرے چھوٹک ناہیں آگہیں کہیں بات

دوہرہ:
بھونرا لیوے پھول رس رسیا لیوے باس
باجن باجے سنچے آس کر بھونرا کھڑا اداس

دوہرہ:
نہ انہ جنیا نہ وہ جایا نا وہ مائی باپ کھلایا
باجن سب انہ آپ نا پایا پرگٹ ہو پر آپ لگایا

دوہرہ:
باجن وہ کسی سریکھا نہیں اور اس سریکھا نہیں کوئے
جیسا کوئی من منہ چنت دے ویسا بھی نہ ہوئے

دوہرہ: باجن جو کسی کے عیب ڈھانکے
اس تھے ورجن تھر تھر کانپے
نعمت علی اس تھے پائی
میں چیاں (کذا) انکھیاں چاری نکھائی

دوہرہ: باجن بکھیاری بکھان کرے گا
ولی اپنی بھیک کارن کچھ کچھ کہے گا
جو کچھ قسمت میں ہے وہی لہے گا
گدا کوں تب وہی براتا رہے گا

دیگر: محمد سرور پرم کا رحمت اللہ بھریا
باجن چیوڑا وار کر سر آگیں دھریا

عقدہ: ایک آپیں جاگنہ اورن بھی جگاونہ
پھرے پھرے سبدہ سناونہ
النک بیٹھی ہے چوکیاں
جاگو لوکا جاتی رات

دوہرہ: باجن کوئی نجانے وہ کد تھا او کد تھے پرگٹ ہووا
وہی جانے آپ کوں جب تھے پرگٹ ہووا

قطبن

اصلی نام معلوم نہیں۔ تخلص قطبن ہے اور بھاشا کے سر برآوردہ شاعر ہیں۔ ان کے متعلق میری اطلاع کا تنہا ماخذ ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی 1903ء کی رپورٹ ہے جو سیام داس صاحب بی۔ اے آنریری سیکرٹری سبھا مذکور نے تیار کی ہے اور یوپی کی گورنمنٹ نے اپنے خرچ اور حکم سے چھپوائی ہے۔ سبھا کی یہ رپورٹیں جو صرف ہندی مخطوطات سے تعلق رکھتی ہیں' 1900ء سے شروع ہوتی ہیں۔ ابتدا میں سالانہ رپورٹ شائع ہوتی رہی۔ بعد میں سہ سالہ رپورٹ کی شکل میں تبدیل کر دی گئی اور مسٹر سیام داس ہی اڈیٹر رہے۔ یہ رپورٹیں اب تک مسلسل شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان رپورٹوں نے ہندی قلمی ادبیات کی تلاش اودھ' بہار' اضلاع متحدہ' مالوہ' راجپوتانہ اور بندیل کھنڈ وغیرہ میں جاری رکھ کر جہاں جہاں قلمی ذخائر کا سراغ لگا' ان کی فہرست اپنے ذیل میں شامل کر لی ہے۔ ان فہرستوں سے ہندی کے ذخیرے پر ایک نہایت ہی حیرت بخش روشنی پڑتی ہے اور سینکڑوں نادر اور نامعلوم کتابیں دریافت ہوئی ہیں۔ درحقیقت ناگری پرچارنی سبھا نے یہ ایک نہایت مفید کام کیا ہے جو تکمیل کو پہنچایا ہے۔ طباعت کے مصارف گورنمنٹ صوبہ متحدہ نے برداشت کیے ہیں۔ ہم مسٹر سیام داس کو ان کی محنت' ہمت' ذوق اور استقلالِ کامل پر جو انہوں نے ہمارے وطن کے مخطوطات کے تحفظ میں دکھائے ہیں' مبارکباد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اردو کے میدان میں بھی خدا مسلمانوں کو یہی توفیق عطا فرمائے۔

ناگری پرچارنی سبھا کی تازہ دریافت کردہ کتابوں میں قطبن کی تصنیف "مرگاوتی" بھی شامل ہے۔ یہ ایک نظم ہے جو محمد جائسی کی "پدماوت" کی طرح ایک عشقیہ افسانہ ہے۔ قصے کا خاکہ مسٹر سیام داس نے اس طرح بیان کیا ہے:

> "راجہ گنپت دیو چندر گیری کے راجہ کا فرزند' شہزادی مرگاوتی کے عشق میں مبتلا ہو کر صحرا نوردی اختیار کرتا ہے۔ یہ شہزادی کنچن نگر کے راجہ روپا مرار کی دختر بلند اختر ہے۔ راج کنواری اور کمالات کے علاوہ فن پرواز سے بھی واقف ہے۔ شہزادہ بڑی اور مسلسل مصائب کی برداشت کے بعد شہزادی تک رسائی حاصل کرتا ہے اور بیاہ ہو جاتا ہے۔ بیاہ کے کچھ عرصے بعد شہزادی یکایک غائب ہو جاتی ہے اور

شہزادے کو اس کی تلاش میں پھر بیابانوں کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ وہ ایک دریا سے محصور پہاڑی پر پہنچتا ہے اور ایک عورت کو جو کسی راکشش کی قید میں تھی' رہائی دلاتا ہے۔ اس عورت کا نام رکمن تھا۔ رکمن کا والد اس شکر گزاری میں رکمن کا بیاہ شہزادے سے کر دیتا ہے۔ چند روز کے بعد شہزادہ چھپ کر چل دیتا ہے اور متواتر تکالیف اٹھانے کے بعد اسی شہر میں پہنچ جاتا ہے' جہاں مرگاوتی اپنے باپ کی وفات کے بعد اس کی جانشین بن کر راج کر رہی ہے۔ میاں بیوی دوبارہ مل جاتے ہیں اور شہزادہ حکومت میں شریک ہو جاتا ہے۔ دونوں بارہ سال تک نہایت راحت اور آسائش کے ساتھ حکومت کرتے ہیں۔ راجہ گنپت دیو اپنے فرزند کی لمبی جدائی کی تاب نہ لا کر اس کی تلاش میں آدمی روانہ کرتا ہے جو رکمن کے شہر ہوتا ہوا کنچن نگر پہنچ جاتا ہے اور راجہ کا ضروری پیغام شہزادے کو پہنچا دیتا ہے۔ شہزادہ اپنی بیگم مرگاوتی و خدم و حشم سمیت روانہ ہوتا ہے اور راستے میں رکمن کو لیتا ہوا مع الخیر اپنے باپ کی راج دھانی پہنچ جاتا ہے۔ شہر میں اس کی آمد پر بڑی خوشیاں منائی جاتی ہیں اور شہزادہ کئی برس تک اپنی دونوں بیویوں کے ساتھ بڑے لطف کی زندگی بسر کرتا ہے۔

ایک دن شہزادہ شکار کھیلنے گیا اور اپنے ہاتھی سے گر کر فوت ہو گیا۔ اس کی وفادار بیویاں اس کی نعش کے ساتھ جل کر مر جاتی ہیں اور قصہ ختم ہو جاتا ہے۔''

مسٹر سیام داس کی نگاہوں میں اس کتاب کی اہمیت اس لیے بڑھ گئی ہے کہ ہندی ادبیات کا اکثر حصہ سری رام چندر اور سری کرشن کی مناقب آرائی پر وقف ہے۔ خال خال ایسے شاعر گذرے ہیں جنہوں نے ملک محمد جائسی کی طرح عشقیہ افسانوں یا حکایات پر قلم اٹھایا ہے۔ قطبن اس سلسلے کا غالباً پہلا ہندی شاعر ہے جس نے جائسی سے بھی 37 سال قبل افسانہ نگاری کی بنیاد ڈالی ہے۔ مسٹر سیام داس کا بیان ہے کہ ''قطبن کا سرپرست حسین ساہا شیر شاہ سور کا باپ ہے۔'' اور حاشیے میں اضافہ کرتے ہیں کہ ''حسین شاہ بعد میں جون پور کا بادشاہ ہو گیا۔ جب 1478ء میں بہلول لودھی نے جون پور کا الحاق دہلی کے ساتھ کر دیا۔ حسین ساہا بہار میں جا کر 1494ء تک حکومت کرتا رہا۔ اس سال سکندر لودھی نے بہار پر حملہ کیا۔ حسین شاہ کو شکست ہوئی اور بھاگ کر بنگالہ چلا گیا اور کچھ سال بعد وفات کر گیا۔''

یہاں مسٹر موصوف کو تھوڑا سا مغالطہ ہو گیا ہے۔ وہ حسن سور شیر شاہ کے باپ جاگیردار سہسرام اور سلطان حسین شرقی والیٔ جون پور 863ھ/ 1458ء و 905ھ/ 1500ء کو ایک ہی شخص فرض کر رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ قطبن کا سرپرست نہ حسن سور ہے اور نہ حسین شاہ شرقی ہے' اس لیے کہ ''مرگاوتی'' محرم 909ھ/1503ء کے پہلے پہلے مخصف میں تصنیف ہوتی ہے اور حسین شاہ شرقی اس سے چار سال پیشتر یعنی

905ھ/1500ء میں فوت ہو جاتا ہے۔ حسین سور کو قطبن کا مربی ماننا بھی دور از کار ہے اس لیے کہ دونوں کے نام مختلف ہیں یعنی "مرگاوتی" کا مصنف اپنے ممدوح کا نام حسین شاہ بتاتا ہے اور شیر شاہ کے باپ کا نام حسن ہے جو ایک معمولی جاگیردار تھا۔ میرے خیال میں قطب کا سرپرست علاء الدین حسین شاہ والئ بنگالہ ہوگا جس نے 909ھ/1493ء سے لے کر 925ھ/1518ء تک حکومت کی ہے۔ یہ بادشاہ ہندی اور بنگالی ادبیات کا ایک سرگرم سرپرست تھا۔

قطبن اپنے مرشد شیخ بڈھن کے ذکر میں کہتے ہیں:

شیخ بڈھن جگ ساچا پیرو نام لیت سدھ ہووے سریو
قطبن نام لئی پا دھرے سربر دی دوہ جگ نہ مرے
پاچھلے پاپ دھوے سب گئے جھڑیں پرانے اور سب نئے
نیکے بھیا آج اوتارا سب سوں بڑسو پیر ہمارا
جیہ کو باٹ دکھائی ہووے پہنچے ایک نمک میں سوے

دوہرہ: گرو پنتھ دکھاوے دین ہے جو چل جانے کوئے
نمک ایک میں پہنچے جو ست بھاوے سو ہووے

اور حسین شاہ کے لیے کہتے ہیں:

شاہ حسین آہے بڑا راجا چھتر سنگاسن ان کو چھاجا
پنڈت او بدھ ونت سیانا پڑھے پوران ارتھ سب جانا
دھرم دود شل ان کو چھاجا ہم سر چھاہ و جیو جگ راجا
دان دیے او گنت نہ آوے بلی او کرن نہ سر بر پاوے
رائے جہاں لوں گندے رہ ہیں سیوا کریں یا سب چھ ہیں

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ

(متوفی 945ھ)

آپ کے والد کا نام اسمٰعیل ہے اور شیخ محمد بن شیخ عارف بن شیخ احمد عبدالحق چشتی صابری کے مرید ہیں اور صاحب تصنیفات کثیرہ ہیں۔ از آنجملہ انوار العیون، رسالہ قدسیہ، رسالہ نور الہدیٰ، رسالہ قرۃ العین اور رشد نامہ ہیں۔ ان کے مکتوبات مولانا خضر بدھن بن رکن جونپوری نے جمع کیے ہیں۔ 945ھ میں وفات پائی۔ وہ ہندی کے بلند مرتبہ شاعر ہیں۔ الکھ داس تخلص کرتے تھے۔ نمونہ کلام:

سرود در پردہ پوربی:

دہن کارن پی آپ سنوارا بن دہن سکھی کنت کنھارا
نہ کھیلے دہن، نہیں ایوان پاس پھول منہ اچھے حیوان
کیوں نہ کھیلوں تج سنگ پیا مجھ کارن تیتیں اپنا کیا
الکھ داس آکھے سن سوئی سوئی پاک ارتھ پھمن سوئی

سبد: ایک تھیں ہم انت پھیلی آپی آپ بیاہی
کنہ کنہ کینا سنبھوراتا ایام سرا جنوائی

دوہرہ: ایک اکیلا آپ سو جس تھیں یہ سنسار
آتھ نیاتھ تھول سول سبھی ایک انکار

دوہرہ: جدھر دیکھوں ہے سکھی دیکھوں اور نکوئی
دیکھا بوجھ بچار منہ سبھی آپیں سوے

جیسو کنبہ آنیہ منہ تھیو تیسو چند بندیں ترمیو
باہر بھیتر کہا نہ جاے سرب ترنتر ایکی کاے
چیت پاتی ست مالت بھول انس پوجا اچھی ابھول
یوجوا میں رس لادھیو بھیو سرب ترنتر آپیں دیو

سبد:

جل تھل مہیسر اور اکاس — پی سرب ترنتر تورے پاس
توہ چھاڈ پیا کھ کہواں جانوں — جتھ رجانوں تتھ تورا ٹھانوں
باہر بھیتر کہا نہ جائے — سرب ترنتر ایکی کائے
الکھ داس آکھے مور کنت — دنہہ جگ سکھی رات بسنت

سبد:

جان اجاں سبھ کھیلنہ لوئی — بن پی کھیلے نہ کھیلا ہوئی
جان اجان جگ کھیلے رے — ہو ہو ہو ہولی رے
سبہ کھے کنہ سکھی مہہ جان — سرب ترنتر پی پروان
جان اجان جگ کھیلے بھاک — کت بلیا لیوں ہردے لاک
الکھ داس آکھے سن تانہاں — ہم تم کھیلیہ دی کل بانہاں

دوہرہ:

دیکھوں ری من پوچھوں ری دیکھوں اتوں بانی
سبھی رنگ تیر کا مایا رنگ سبایا پانی
رلسی کیوتھ ناچوں سکھی پی جی رنگ چڑھایا
تن من جیو ایک رنگ دیکھا تو میں آپ گنوایا

عقدہ:

الکھ داس آکھے سن لوئے — دوئی دوئی کہو مت بھائی کوئی
جل تھل مہیسر سرب ترنتر — کو رکھ ناتھ اکیلا سوئی

شلوک:

اپاناشت پراناشت ناشت کنجت جکترا
بدھ پاجا منو ناشت تتر دیوی اکل بتا

سبد:

پھلے نہ پھولے آوے نہ جاوے — کلنس کا سبد کانسی ہی سماوے
جل تھیں اپنا بلبلا جل ہیں ماتھ بلائے — تیسا یہ سینسار سبھ موتہہ جائے سمائے

دوہرہ:

آپ گنوائیں پی ملے پی کھوئے سبھ جائے
اکتھ کتھا ہے پرم کی جے کوئی بوجھے مائے

شاہ علی محمد جیوگام دھنی گجراتی

سید احمد کبیر رفاعی کی اولاد ہیں اور سید عبدالرحیم کے پوتے ہیں۔ 14 جمادی الاول 973ھ کو انتقال کیا اور رایکھر میں متصل روضۂ شاہ غربی مدفون ہیں۔ ہندی کے شاعر ہیں۔ ''کتاب چشتیہ'' میں لکھا ہے کہ جب مخدوم بہاء الدین برناوی خاتم التارکین بسبیلِ سیاحت گجرات تشریف لے گئے' شاہ علی جیو کے مہمان رہے۔ اس قیام کے زمانے میں میزبان نے اپنا ہندی کلام جو عجیب و غریب اور پُر لذت بحور میں لکھا تھا' سنایا اور اپنا ایک رسالہ جو نکات و دقائق موحدانہ پر مشتمل تھا' ہدیہ دیا۔

شاہ علی جیو کے کلام کو ان کی زندگی میں ان کے مرید شیخ حبیب اللہ بن عبدالرحمٰن القریشی الاحمدی نے ایک مختصر دیباچے کے ساتھ مدوّن کیا ہے اور اس کا نام ''جواہر اسرار اللہ'' رکھا ہے۔ دیباچہ حسب ذیل ہے:

> ''میگوید بندۂ فقیر و حقیر کہ یکے از کمینہ مریداں و خاکروب حضرت رب العالمین بندگی حضرت قطب الاقطاب العالم والآفاق تاج الافراد سلطان العارفین غوث الاعظم الشریف سلطان سیدی معشوق اللہ الحسینی الرفاعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ المسمیٰ بہ شیخ حبیب اللہ ابن عبدالرحمٰن قریشی الاحمدی کان اللہ لہٗ کہ چند مکاشفات حضرت بندگی سید السادات سیدی و شیخی شیخ العالم الشریف المخاطب حضرت اللہ تعالیٰ بخطاب سلطان العارفین و سلطان العالم الشریف شاہ علی جیو معشوق اللہ مدظلہ ابن شاہ ابراہیم ابن شاہ عمر الحسینی الاحمدی رضی اللہ عنہم ...... در بیان توحید و اسرار بالفاظ گوجروی بطریق نظم فرمودہ بود دریں مختصر آوردہ و جمع کردہ و آں ملفوظات حضرت سلطان العالم شاہ علی محمد معشوق اللہ المنابت جواہر اسرار اللہ را بکتاب جواہر اسرار اللہ نام داشتہ۔''

''جواہر اسرار اللہ'' کی یہ پہلی اشاعت ہے جس کا ایک نسخہ دیوانِ عطار (مملوکہ پروفیسر سراج الدین آذر ایم اے) کے حاشیہ پر مرقوم ہے۔ یہ نسخہ گیارہویں صدی کی ابتدا کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کی دوسری اشاعت شاہ علی جیو کے پوتے سید ابراہیم بن شاہ مصطفیٰ بن شاہ علی جیو نے مرتب کی ہے۔ اس اشاعت کا ایک نسخہ نوشتہ 1127ھ میرے پاس ہے۔ سید ابراہیم اپنے دیباچے میں حبیب اللہ کی اشاعت کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس کا نام ابوالحسن شیخ محمد ابن عبدالرحمٰن القریشی الاحمدی لکھتے ہیں اور ایک فارسی قصیدہ بھی جو شاہ علی جیو

کی مدح میں ہے نقل کرتے ہیں۔

یہاں شاہ علی جیو کے کلام کا نمونہ دیا جاتا ہے:

نکتۂ اول در مکاشفہ:

اپنے بھاؤ حولیایا لورے ۔۔۔ سو کہوں بھیس کچھو بھی جھورے

نکتۂ دوم:

تو کھنڈ ہو رہے اسمنہ آہے ۔۔۔ سب پیو جہت تھیں جتا ہوا ہے
ہونتوں دونوں ناکو اسی کے ۔۔۔ آہیں اے سب بھیس جسی کے

نکتۂ سوم:

سرک اچھر ہور مندر مارے ۔۔۔ ہر ہمن اس منہ ندیاں بارے
مانک موتی سکھ سنگارا ۔۔۔ اے سب بھیس پیا کا سارا

نکتۂ چہارم:

کبھیں سو لیاوے بھیس اکاسا ۔۔۔ ہو کر چند اتارو نہ پاسا
دیہ الا لا تج بکھیرے ۔۔۔ روپ انپڑے اپیں ہیرے

نکتۂ پنجم:

کہیں سوے ہووے اندھیاری راتا ۔۔۔ سانجہ بتی کر لاوے دھاتا
ہو کر دیورا راتیں ساری ۔۔۔ لا کر جوت دکھاوے بھاری

نکتۂ ششم:

مکھ پر بال بکھیر سو ساتھی ۔۔۔ جھب کر ہووے رات سنگھاتی
دل سنبھال سو بکھرے کیا ۔۔۔ دن ہو آوے سورج بھیا

نکتۂ ہفتم:

ان بھرولی کھیلے میرے ۔۔۔ بھیس کیے ہیں میرے تیرے
پرکھ تار ہو آپیں آیا ۔۔۔ دیکھو بھیس او ناری لیایا

نکتۂ ہشتم:

کھیل جبرایہ رویا کھیلے ۔۔۔ ہس تل بھی کھیل نہ ملے
آپیں ناچے آپیں گاوے ۔۔۔ آپیں آپس بھاؤ دیکھاوے

نکتۂ نہم:

کبھیں تج بھرا بھیس لیاوے ۔۔۔ دھرتی ہو کر آپ بچھاوے

کہ پریت ہو بھاری بیسے سر ماں ہو کر نینوں بیسے

نکتۂ دہم:

ایک سمندر وہ سات دکھاوے دھنوس بادل مینہ ہو آوے
وہی سمندر ہو بوند دکھا لے ندیاں نالے ہو کر چالے

نکتۂ یازدہم:

کہیں سو مینہان ہو جھڑ لاوے کہیں پیوتی اولے تھاوے

نکتۂ دوازدہم:

کاج بچ ہنس آپیں کھیلے نار پرکھ ہو وہی سو جھیلے

مکاشفہ: چاؤ ہوا اس میرے ساتھی کی جگ کی بھیس ہو آؤں
کہیں سو راجا کہیں سو پرجا کہیں سو بندا آپ کہاؤں
کہیں سو عاشق ہو کر روں کہیں عارف ہوئے بچھانوں
کہیں موحد کہیں محقق کہیں سو جانوں کہیں نجانوں

نکتہ: بھیس بندوں کے کروں سو بندگی اوبہا ہو ہو نماز گذاروں
ہوں حاجی ہوں کعبا آہوں آپیں آپس اوپر واروں

نکتہ: ہوئے بندے ہور ہوئے لیتاں اویں آپیں آپ کہاسوں
فرض کیاں ایہ باتاں تم پر پیار کروں گا کرسی تاسوں

نکتہ: بھاؤ نماز جب لیاؤن کیرا بھلیں تن یوں آپ سنواروں
وضو غسل کرتا نہوں کیران پاکری بھر سنگاروں

نکتہ: ستر عورت کر کاجھوں آپس بہ سنگاروں ساز ملاسوں
کعبا ہو کر آپ دکھاؤں سجدے کر کر لنکا لاسوں

نکتہ: آج سو تویں بھیس کیے ہیں علم قدیم منہ جیوں تھے لورے
فرض نماز آپس پر کیتی تس منہ تیرہ فرض سو جورے

نکتہ: اسمنہ بھلا ساز جو آہی سوجے شرطاں جانیں پیارا
حدث جنب تھیں پہلوں باری یہ تن پاک کریجی سارا

نکتہ: دوجی شرط فریضا ایہے کپڑے پاک نمازی جھیے
تیجی شرط سو تھاں پاک جریئے دوے قدم کی مقدار سیے

نکتہ: سجدے کی بھی جویئے بھایو کار ہی پاک سو تھانہاں
سو کیوں جو کچھ تھام نہ کیجے سیس نمائے جہاں سوناہاں

نکتہ: چوتھی شرط سو ستر عورت ہی پن تو تسمہ بکٹ اتوانہیں
مردوں کون تن ڈاہپیا لوڑے موندوں تھیں تل کھوئیں تائیں

نکتہ: ہور جے بیبیاں ہوویں اصیلاں نہ تن سارا ڈاہپان جوئی
وے نڈہاہیں مکہ ہور پاوں اور ہتھیلیاں جہاں لگ ہوئی

نکتہ: مردوں کا جے ستر عورت ہے باندریوں کا ہی جانیں تیویں
پن ہاں باندیاں ڈہانپیں اتنا پیٹ ہور پیٹھ ندیکھی جیویں

نکتہ: اصیل عورت کے تن کے ٹکرے چیری کے نہیں عورت مانہاں
چوتھا بھاگ کہلے جے اسمہ بھلے ڈھانپتے جے اس تھانہاں

آگے نماز کی ہدایتیں ہیں۔ میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ شاہ علی جیو نے ایک آدھ مقام پر فارسی بحر میں طبع آزمائی کی ہے۔ بحر ہزج مربع سالمُ مکاشفہ در عقدہ:

بچاری بھولڑی کھا دو — دور دنتھی آپ کوں کادھو

نکتہ اول: پرم رنگ جیو جن ماہاں — سو دیکھیں نانہ سب تھانہاں
تھوں من لوک ہے کانہاں

نکتہ دوم: لوکا کی بھوک کوں لوجھو — گسائیں ساج ان سوجھو
پرم کی بات کچھ بوجھو

نکتہ سوم: جو جیوڑا پیو سوں لاگا — ہے جس نیہ کی آگا
تھوں کا لوجہ سب بھاگا

نکتہ چہارم: جو لوئیں تر بھریں ناکہیں — رونویں رو دکھ سکھ چاکہیں
تھوں اے ناچتے آکہیں

نکتہ پنجم: نبولو بول کچھ کاچو — جو لاگے پیار تم باچو
تمہ بھی اینوں ہیں ناچو

نکتہ ششم: جنھوں من پرم کا بھٹکا — تلیں تل نیہ کھٹکا
سو جانے مرم کا لٹکا

نکتہ ہفتم: انھوں کی سیج شہ بس بس — ہساوے پیوا نہ ہس ہس
مرے تب سوک ہاتھ گھس گھس

نکتۂ ہشتم: الہی آنکہ کہیں لاگے سوتا یہ جیوڑا جاگے
جوان کا بوگہ پن بھاگے

نکتۂ نہم: پر کہ یہی تا وہ پڑ آویں سو سنتیں آپ کھو چاویں
سو بید ہے بان بند ہواویں

نکتۂ دہم: جو بانا پیو سبز اوے پیا سوں پیار بڑھاوے
پراتس کینو کھواوے

نکتۂ یازدہم: جو اپنے کنتہ بسراوے پراتس آکھیا جاوے
بھلا سو پیو دکھلاوے

نکتۂ دوازدہم: دھوں جگ مانہ ہے کاجے ساروں سرتاج بے راجے
سنیں تن کیت سنہ باجے

نکتۂ سیزدہم: جو بولیں لوگ بہتیرے کھلے ہیں کان جن کیرے
سنے سب سادہ پیو میرے

نکتۂ چہاردہم: باجوں سب مانہ وہ بولی تاروں اور بانس پر دوبلی
پوچھیں جن جیو پیو کھولی

نکتۂ پانزدہم: بجتر مانہ کو تانہیں کرے سب سادہ وہ سائیں
نبولوں بول سب کائیں

نکتۂ شانزدہم جو گاویں گیت بہ تانوں سنیں اے پیو کے کانوں
سہی کر بات تم جانوں

نکتۂ ہفدہم: ہمارے لوگ اے سارے دیکھیں جب جیو کے پیارے
تماشیہ جانو ہیں وارے

نکتۂ ہیزدہم: نبی کی نین ات ماتی سلونی اور رنگ راتی
کھلیں وے پیو دکھلاتی

نکتۂ نوزدہم: جھنڈ ہایا آج میں دیجا سور سے پاو لگ بیٹھا
دہریا انہ ہاتھ منجھ پیٹھا

نکتۂ بیستم: جو ایسے پیو کو پاویں اُٹھیں ہور بھیر گل لاویں
پھریں ہور وارنیں جاویں

نکتۂ تخلص: سو لگن لگتا آوے لنک گل بانہ جب پاہوے
علی تب چانپ گل لاوے

شیخ خوب محمد چشتی

گجرات کے رہنے والے ہیں اور شیخ کمال محمد ستیانی کے مرید ہیں۔ 986ھ میں تصوف کی ایک مثنوی ''خوب ترنگ'' نامی تصنیف کی اور 1000ھ میں اس کی شرح بزبان فارسی لکھی۔ شرح کا نام ''امواج خوبی'' ہے۔ ''خوب ترنگ'' کی تاریخ تصنیف شعر ذیل کے دونوں مصرعوں سے الگ الگ برآمد ہوتی ہے بلکہ دوسرے مصرعے سے دوہری تاریخیں نکلتی ہیں:

خوب محمد کیے بچار   چودہ کھاٹ اوس برس ہزار

اور شرح کی تاریخ اس شعر میں بیان کی ہے:

عدد شمار ز تاریخ نعت محمد   ہزار سال تکمل ز فکر خوب محمد

دیباچہ میں کہتے ہیں:

خوب کیسے کا خوب ترنگ   سنتیں کچھو نہ کچھو تنگ
یوں انکار نہ کچھو دیکھ   جایو ناں تج یوں من لیکھ
کے یہ تو کہتا ہے خوب   دیکھو کے کہتا ہے خوب
پڑھے جو چھو کرداو قرآن   تو اس کوں کر جھوٹ نمان
مت بوجھیں ہے چھو کرداو   اس کا کیا پوچھے برباد
جو بے قدر کنیں نہیں پائے   جوہر تو کیا بہتاں نکھائے
یہ تو جان بنانج یہ ہوے   جے مقصود تجھے یوں کوے
یہ تو کہیا فلانے یار   ایسا بوجھ کرے انکار
جتناں طالب کوں بس ہوئے   میں اس مانہ کہیا ہے سوئے
جیوں دل عرب عجم کی بات   سن بولے بولی گجرات
تیوں ترجماں سو ہوں جیوں دل   کہوں بدوں تھیں حل مشکل
میں مرشد تھیں سنیاں بیان   وے مرشد صاحب عرفان
جنہوں منجھے سکھایا دین   جنہ تھیں منجہ دل ہوا یقین

جیلانی بسطامی شاہ — بغدادی جس چتر کلاہ
ہر ماضی پر حجت لیک — ہوں معتقد ہوا ان دیک
وارث محمدی ہر تھانوں — شیخ کمال محمد نانوں
کیا عروج مقام اقدم — اللہم اغفر و ارحم
اون کوں تھا یہ علم کمال — خذ العلم افواہ رجال
اون تھیں میں سنیا دن رات — اوس منہ یاد رہی کچھ بات
وہ جیوں مجنوں آئی ترنگ — جمع کیے لے تس تس دھنگ
خوب ترنگ اس دیا خطاب — مدح رسول اللہ باب
یااللہ اے مدح رسول — او سی دوستی کر قبول
جیوں میری بولی منہ بات — عرب عجم مل ایک سنگھات
تیوں ہی کہوں گا کریں نہ کھوڑ — آیا بول کیا نہیں چھوڑ
لہنہاں شعر کا قصد نہ لیکھ — لہنہاں مراتب کہوں سو دیکھ
ارض سما منہ جے نہ سمائے — وزن شعر منہ وے کیوں آئے
دوڑیا ہوں نظروں کی شان — دیکھ مراتب سوں آسمان
کل مراتب جز منہ لیاؤں — کر نسخا تصنیف دکھاؤں
نعت میں کرتا ہوں سیر — یا اللہ تم بالخیر
غلط نہ پکڑیں اہوں اجاں — ورس کہوں وے تو من آن
جو کچھ خطا اس منہ تو پائے — اسے سہی کر برائے خدائے
پن اتاں کہوں گو بچھائے — مت ان بجھے بول برائے
نسخہ کی تاریخ اس تھانہ — پائے عدد ہر مصرعے مانہ
خوب محمد کنے بچار — چودہ گھاٹ اوس برس ہزار
دوجا چاند جو تھا شعبان — دیس دوشنبہ کیا بیان

شیخ خوب محمد اس زبان کو عربی و فارسی آمیز گجراتی کہتے ہیں، لیکن در حقیقت یہ اردو ہے۔ اگرچہ اس میں گجراتی زبان کا بھی پرتو موجود ہے۔ گجری بھی اسی کا نام ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب رسالہ ''اردو'' حصہ بیست و ہفتم ص 541 میں رقم طراز ہیں:

''جب یہی زبان دکن میں آئی اور اس میں دکنی لفظ اور لہجہ داخل ہوا، تو دکنی کہلائی اور گجرات میں پہنچی تو اس خصوصیت کی وجہ سے گجری اور گجراتی کہی جانے لگی۔

شاہ برہان صاحب جانم متوفی 990ھ نے اپنے کلام میں کئی جگہ اپنی زبان کو گجری کہا ہے۔ مثلاً وہ کتاب "حجت البقاء" میں فرماتے ہیں:

"جے ہوویں گیان بچاری　　نہ دیکھیں بھا کا گجری"

یعنی جو صاحب عرفان ہیں، وہ گجری (گجراتی) زبان کا خیال نہ کریں گے۔"

فارسی و عربی الفاظ ان کے زمانہ سے پیشتر مقامی لہجہ اختیار کر چکے تھے، اس لیے وہ ان کو مروجہ لہجے میں لکھ جاتے ہیں۔ مثلاً اوپر کے اقتباس میں مصرع کو مصرے 'نسخ کو نسکا' درست کو درس رقم کیا ہے۔

احمد دکنی

اردو ادب کی تاریخ میں محمد قلی قطب شاہ 988ھ و 1020ھ کا نام سنہری حرفوں میں لکھا جانا چاہیے۔ وہ خود اردو اور فارسی کا زبردست شاعر تھا۔ اس کے ضخیم کلیات پر جو اٹھارہ سو صفحات پر شامل ہے' 1922ء میں مولوی عبدالحق صاحب نے رسالہ ''اردو'' بابت ماہ جنوری میں ایک پُر مغز اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے۔ علوم کی سرپرستی میں جس قدر حصہ اس بادشاہ نے لیا ہے' ابھی ہم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے کیونکہ اس کے عہد کے ذہنی کارناموں کی تاریخ ابھی تک مدوّن نہیں ہوئی ہے۔ ''اختیاراتِ قطب شاہی'' جو ''اختیاراتِ بدیعی'' (ایک طبی تصنیف) کی تنقید ہے' اسی بادشاہ کے حکم سے اطباء کی ایک جماعت نے تالیف کی ہے جس کا اصل نسخہ راقم کے مجموعہ کتب کے نوادرات میں سے ہے۔

احمد دکنی اسی بادشاہ کے دربار کا شاعر ہے اور اس کے حکم سے اپنی تصنیف ''لیلیٰ مجنوں'' لکھتا ہے۔ احمد کے حالاتِ زندگی سے ہم بے خبر ہیں۔ میرے مہربان اور مخدوم پروفیسر سید عبدالقادر ایم۔ اے' پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کی وساطت سے احمد کی ''لیلیٰ مجنوں'' کے چند اجزاء مجھ تک پہنچے ہیں جن میں کل 49 منتشر اوراق ہیں۔ باقی کتاب کا اکثر حصہ غائب ہے۔ ان میں چودہ تصاویر اکبری دبستان کے طرز میں موجود ہیں لیکن اکثر شکستہ و خستہ۔ یہ مثنوی خط نسخ میں لکھی گئی ہے۔ اس کی تقطیع 9x5½ ہے۔ فی صفحہ گیارہ اشعار جلی قلم میں مرقوم ہیں۔ رسم الخط میں بعض مقامی خصوصیات مشاہدے میں آتی ہیں' جو زیادہ تر ہندی اصوات کے اظہار کے لیے وضع ہوئی ہیں۔ چنانچہ جیم فارسی' رائے ہندی اور دال ہندی اور بائے فارسی کے نیچے بالعموم تین نقطے دیے ہیں۔ تائے ہندی پر چار نقاط اور کاف فارسی کے نیچے (بعض اوقات) تین نقاط دیے گئے ہیں۔

احمد سبب تالیف میں کہتا ہے:

جو منج بخت کوں فتح یاور ہوا — سو منج بخت کا سیوک انبر ہوا
جو شہ آپ تھے آپ منج یاد کر — منجے غم کی بندگی تھے آزاد کر
دیتے امر علی کے یہ باغ لاؤں — جو پالوں اسے شہ امریت ناؤں
جو میں شہ کا امر سر پہ لیتا — ترت باغ لانے شتابی کیتا
بھو تیک پریشانی روزگار — اگرچہ منجے ہے ملامت سو بار

بہو تیک شغلاں ستیں رات دن — نتھی منج فرصت بھلویک بن
ولے آس و ہر شہ کے فرمان پر — لگیا تن سنگارن بہو قصہ دہر
دھریں عشق کی باس اس بن کے پھول — جو اس باس پر جوں بھنور جکلوں بھول
سو کج عشق کوں اب جگت میں جگاؤں — جو گھر گھر تے لیلیٰ و مجنوں اچاؤں
جو لیلیٰ و مجنوں تھے بوبوں پران — سو تازہ کروں اب انو کا پران
جو اس بن چمن پر تھے گزرے پون — پون پاس تھے باس لے سرک بن
جو اس باغ پر شہ کا داغ ہے — سو باغوں میں یہ باغ شہ باغ ہے
وہی باغ کا شہ میں باغباں — بھنور باغ کا کیوں نہوی آسماں
جو اس باغ مہکار تھے جگ بھرے — سو سرمست کر قدسیاں کوں دہرے
سو کج شہ کوں یہ بن مبارک رہو — جو اس بن تھے ہر روز نو روز ہو
شہنشہ کے ارکان دولت جکیوی — مبارک انو پر بھی یہ باغ ہوئی
جکوئی باغ کی باغبانی کرے — سو اس باغ تھے شادمانی کرے
دہی باغ کا باغباں کوں نواز — بہو مرحمت سوں کرے سرفراز
جو احمد کرے آس دہر بن سنگار — سو اب شہ تھے پائے ستیں سنگار

مثنوی کے افتتاحیہ ابیات یہ ہیں:

اس اللہ کے نانوں سوں سب جگت — جو وانی دیا ونت اس کی صفت
سرہانا سب اللہ کوں جسم قرار — جو جگ کا وہی ہور پروردگار
جو دنیا میں کافر مسلمان کوں — منگے من سو بخشے بہو مان سوں

شاعر نے حمد کے بعد تین مناجاتیں لکھی ہیں۔ میں دوسری مناجات سے کچھ اشعار حوالہ قلم کرتا ہوں:

رحیمی سوں رحمت کرے سو رحیم
کریمی کے سب گن دہرے سو کریم
سبہ کچھ کوں بھر دے سو رحمت دہرے
سبہ جگ کوں انپڑے سو نعمت دہرے
بھلے اور برے پر کرم راکھتا
برائی چھپا کر بھرم راکھتا
گنہ گار کے پاپ بھجن کرے
گنہ بخش بخشش سوں پرکن کرے

نہ وہ کچھ کسی دہاتھ حاجت دھرے
جو عالم سب اس کی عبادت کرے
ولے سب جگت کوں ہدایت دکھائے
کرم ساتھ اپنے عبادت سکھائے
عبادت سے آپیں تو ہے بے نیاز
سو ہوئے جن عبادت کرے سرفراز
کرے ایک نیکی تو دے دس ثواب
جو لوڑے زیادتہ پے دے بے حساب

مصرع ''جو عالم سب اس کی عبادت کرے'' میں ''جو'' کاف بیانیہ کا قائم مقام ہے۔ پنجابی اور دکنی میں بالعموم آتا ہے۔ مثلاً عبدالحکیم پنجابی کہتے ہیں:

کہے بے چارہ اب یوں کر کے فریاد | جو یا رب بھائیاں دی دیکھ بیداد

دیگر:

کہا یعقوب جو فرزند میرا | تساں کھادا چھڈو جھگڑے تے جھیڑا

اسی ''لیلیٰ مجنوں'' میں احمد ایک اور مقام پر کہتا ہے:

جو پانی سینتیں جیوتی سب جگت | جو طافاں ہوئے سب جگت جائے گت

اسی طرح یہ شعر:

بولایا لکھن ہار سکیاں کوں | جو لیکھے کتابت بھوگیاں سوں

لیکن کاف بیانیہ اردو میں قدیم سے ہے۔ پرانے مصنف اس کو بشکل ''کے'' لکھتے ہیں۔ مثلاً شاہ علی جیو گام دہنی:

بے حد ثابت ہوئی جو ہے ہے اس منہ جگ بھی جد نجوے
کے وہ الطف سب لطف تھے ہے نجر نہ آوے فہم نہ ہوے

بعد میں فارسی املا اختیار کر لیا گیا۔ چنانچہ یہی احمد گویا ہے:

بہو عجز سوں آس احمد دھرے | کہ سائیں وکھت عجز رحمت کرے

فارسی اُردو سے ہندوستان کی اکثر زبانوں ہندی، گجراتی وغیرہ میں لے لیا گیا ہے۔ کاف بیانیہ کی سرگذشت کا ایک دلچسپ پہلو وہ ہے جب کہ بمبئی کے فاضلوں کے ایک دبستان نے اسے سنسکرت کے ماخذ سے استخراج کرنے کی کوشش کی تھی۔

شیخ عثمان

غازی پور کے رہنے والے ہیں۔ والد کا نام شیخ حسن تھا اور جہانگیر کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔
انہوں نے ''چتراولی'' نام ایک عشقیہ قصہ بزبان ہندی لکھا ہے' جو دوہوں اور چوپائیوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ اور تصنیفات بھی کیں۔ ''چتراولی'' ایک نہایت دلچسپ تصنیف ہے اور اسی پر ان کی شہرت قائم ہے۔ اس تالیف کے زوردار حصے وہ ہیں' جو چتراولی کے محل' اس کے حسن و جمال' بیان ہجر اور بارہ ماسہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ شہزادے کی تلاش میں مصنف نے جہاں مختلف ممالک اسلامیہ کا ذکر کیا ہے' اس میں انگریزوں کی طرف بھی ایک تلمیح ملتی ہے جو ہندوستانی ادب میں بقول مصنف کامتا کومیدی سب سے پہلی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سورت میں اپنی کوٹھی 1612ء میں قائم کرتی ہے اور 1613ء کی یہ تلمیح ہم کو مل جاتی ہے۔
ذیل میں ''چتراولی'' کے اس حصے سے جس کا عنوان ''کنور ڈھونڈہن کھنڈ'' ہے' بعض اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

جن پچھوں دس کنہ پیانا
دیکھے سے سنکھی لوک سیائیں
ہیرے سی ٹھٹھہ نگر سوہاوا
کابل ہیرے موگل کر دیا
دیکھے سی روم سکندر کیرا
دیکھے سی مکہ ووہی استھانا
حاجی سنگ ملی گیو مدینہ
گا بغداد پیر کے تیرا
استنبول' مصر' پونی' ہیرا
دکہن دیس کو جے گیو و ہارا
پھیے ہی گے ہیرں گجراتا
گیو جام جھن کچھی ہوئی

پھلہیں گا سو دیس ملتانا
مہیراون سب سیوہیں سائیں
ہنگ ہرن سیویں گنجاوا
جہاں پوہم بچی ہوئی زریا
سیام رہا ہوئی شکل اندھیرا
ہی اندہ تیں پاہن جانا
کابہا گئے جو صاف نہ سینہ
جیہی بیچے تیہی سنگ ہمیرا (امیر)
گا لداخ لہو کنھوسی پھیرا
چلاتا کی سولنک پھارا
سندر دنی لوگ سوکھ راتا
لوگ سروپ سوکھی سب کوئی

بلندیپ دیکھا انگریزا جہاں جائے نہیں کٹھن کریجا
اونچ نیچ دہن سپت ہیرا مدبراہ بھوجن جن کیرا
جہاں جائی اوہن بندر ساجا لگا سنگ چڑھی گیو جھاجا

شیخ بہاء الدین برناوی خاتم التارکین

آپ مخدوم شیخ فرید الدین برناوی مہاجر مکہ متوفی 987ھ کے پوتے اور جانشین ہیں۔ مسلمانان ہندوستان میں صرف دو شخص فن موسیقی میں یگانۂ روزگار مانے گئے ہیں۔ امیر خسرو اور مخدوم بہاء الدین۔ امیر اس کا دیباچہ ہیں اور مخدوم اس کا تمت ہیں۔ مخدوم کے حالات اب تک گوشۂ گمنامی میں رہے ہیں۔ فقیر اللہ نے "راگ درپن" میں البتہ ان کا مذکور کیا ہے۔ میری اطلاع کا ماخذ "کتاب چشتیہ" ہے جو مخدوم علاء الدین ثانی کی یادگار ہے۔ چنانچہ یہ چند سطور اسی سے ماخوذ ہیں:

"قاضی عارف برناوی نے حرف شناسی اور ہجا خوانی کرائی۔ ملا انور روہتکی سے کتابی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں شیخ اللہ داد پانی پتی آپ کے معلم تھے۔ میراں سید عبدالشکور سے تیمناً شرح عقاید پڑھی۔ اسی زمانے میں ایک عربی قصیدہ لکھ کر استاد کی خدمت میں پیش کیا۔ تحصیلِ علمی کے بعد ریاضت ومجاہدہ میں مشغول ہو گئے۔ نماز سحر کے بعد شکار کے بہانے سے جنگلوں میں نکل جاتے اور تیس تیس کوس جنگلوں میں پھر لیتے۔ ابتدا میں تیر سے شکار کھیلتے رہے۔ بعد میں بندوق اختیار کر لی۔ ان نواح میں آپ ہی پہلے شخص ہیں جس نے بندوق سے شکار کھیلنا اختیار کیا۔ شکار بوکارہ بے حد پسند تھا۔ جدِ امجد کے مکہ معظمہ جانے کے بعد تمام دنیاوی اشیاء مثلاً جاگیر و قریات' انعامات و وظائف' اثاث البیت' اجناس ومتاع' ہتھیار' مویشی' گھوڑے وغیرہ کو ترک کر دیا۔ اسی بنا پر آپ خاتم التارکین کہلائے۔ سیر وسفر کے بے حد شائق تھے۔ دکن' گجرات' کنبھایت' جونپور' پٹنہ' بہار' پنڈوہ' سرہند' لاہور' پٹن' اجودھن' ہانسی وحصار وغیرہ وغیرہ کی سیاحت کی۔ ہند کے ہر بڑے شہر میں ان کے دوست واحباب موجود تھے۔ اکبری وجہانگیری امراء سے رسم و راہ تھی۔ ان دونوں سلاطین سے ملاقات کی ہے۔ موسیقی کے ساتھ ان کا تعلق عشق کی حد تک تھا۔ جکری' خیال اور چٹکلہ' قول و ترانہ سا ورہ دھرپد' بشن پد وغیرہ میں انہوں نے اشعار لکھے ہیں۔ یوں تو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے' لیکن ہندی میں اکثر لکھتے تھے۔ ساز وخیال وساز کہتر س کے موجد ہیں۔

انہوں نے گمنام رہنا پسند کیا' اس لیے کوئی تخلص اختیار نہیں کیا۔ چنانچہ ان کا کلام دوسروں کے نام سے مشہور ہو گیا۔"

یہاں بعض نمونے "کتاب چشتیہ" سے لے کر ہدیہ ناظرین کیے جاتے ہیں۔ برائے بارش:

کاہے اے بدرا ناں برست کاہے تھی ناہن گرجت کاہے ناں جھڑ لاوت
کاہے تھی برکھارت تیوت برمن من چتوت کاہے تھی ناں گھور گھور ستاوت
چتر وسا تیرو و ہے اُما ہو داتا میکھ کہاوت
گربن تیا کوتا جم گٹ تھیں اول بدل لے آوت

دیگر:

ان نینن کا یہی بسیکھ
ہوں تجھ دیکھوں توں منج دیکھ

خیال:

کیسیں کی سروں توہ من چنچل تو کہوں کہو ڈولی
او دتیک یک باد کرت رہے یا ہے کاج بنولی
آ تک للاری لکھی تو تیئی متی لیک کاٹھ کو کھولی
جے استر کینے بدہنا تن کی سدا کلولی

(سادرہ) جہانگیر اور خرم کی جنگ کے وقت کہا:

اے اے بھائی جیتا مصاف ساہن سرتاج
جس ری تو ملا نت نت راج

خیال برائے شفا:

ٹھاکر گرو کبھو چیت نہ دہری — جینن اپرا وہ اپراد ہی کرے
مہاچھیں روگی کی بیدن اپنی مہا تھیں کہن میں ہرے

خواجہ خضر کے لیے:

دائم حیات کائم کرامات ملاکات نعمت پاؤ نہم
ندی تیر ورم بھاری بھیر پھرت مرہت ہو تہیاں تہیاری رم پرم
رحم کیجیے کرپا تھیں دیجے کا کہوں زاوری سم
تم کھواجہ کہدروے مہتر الیاس رہ دوو پاس یا جگت میں اگم

برائے طلب لقائے سلطان الاولیا:

کاری کاج تھاری ہوں تو تھکت بچھو کر بھتیرو
آج بھاگ جاگ پڑے ہمارے پرن درسن پاوت تیرو
انندے انند مہاہو دکھ سیہ موش گنو سوہرو
ترپت بھئی تپت سب ناسی اولیا چرنن لگ ماتھو میرو

بارش بند ہونے کے لیے:

اب من ماں نیوری بدرا نیکی بھانت جر جر آیو
نیکی میں گھٹالی آ تو نیکھیں گرج سنایو
نیکھیں نیکھیں تمیں تو رنس رنس جھر لایو

ان کے دوست داس گھنوں بیراگی نے اپنی وفات کے وقت شیخ کی خدمت میں ذیل کا پد بھجوایا تھا:

اے من نام پائیں ماتمیں تھیں دکھ سکھ بھاے
یہ جو کچھو کو سپنو سو دیکھت جاے رے بہ جاے
بے بچن ست کرن کی ہے تی میں کہی سناے
داس گھنوں جیوں جل ترنگن جل میں جل جو سماے

مولانا محمد افضل جھنجھانوی یا پانی پتی

میرٹھ کے قریب جھنجانہ یا جھنجنہ ایک پرانی بستی ہے۔ عہدِ ماضی میں ایک مردم خیز قصبہ تھا اور بعض مشاہیر وہاں سے پیدا ہوئے ہیں۔ شیخ عبدالرزاق اور شیخ عبدالقادر متوفی 940ھ جو مشہور اہل اللہ ہیں' اسی بستی سے تعلق رکھتے ہیں اور شیخ صوفی دانشمند جنہوں نے علوم ہندیہ تحصیل کر کے ان کے تراجم اکبر کے لیے فارسی زبان میں کیے' اسی قصبے کی گود میں پلے ہیں۔ محمد افضل کا شمار اسی سرزمین کے نونہالوں میں کیا جاتا ہے۔

ہم ان کے حالات سے قطعاً تاریکی میں ہیں۔ بس اسی قدر جانتے ہیں کہ ایک دوازدہ ماہہ یا بکٹ قصہ کے اردو میں مصنف ہیں۔ میر حسن اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں۔

"محمد افضل' افضل تخلص' از قدیم است کدام ہندو بچہ گوپال نام بود کہ برو عاشق شدہ حسب حال خود بارہ ماسہ عرف بکٹ کہانی گفتہ کہ اکثر کھتریاں و گائیناں مشتاق اوی باشند تھنے فارسی و تھنے ہندی دارد۔ لیکن قبولیت داد الٰہی است بردلہا اثر میکند از وست:

پڑی ہے گل میں میرے بیم پھانسی
مرن اپنا ہے اور لوگوں کی ہانسی
مسافر سے جنہوں نے دل لگایا
انہوں نے سب جنم روتے گنوایا"

(تذکرہ حسن۔ ص 41)

ان کے زمانے کی نسبت اشپرینگر نے اپنی فہرست میں محمد قائم چاند پوری کے تذکرہ کے حوالے سے اتنا لکھا ہے کہ:

"افضل' عبداللہ قطب شاہ سے جو 1020ھ میں تخت نشیں ہوتا ہے' پیشتر گذرا ہے۔ اس کی تعلیم معمولی حیثیت کی تھی۔ صوفیانہ شعر کہتا تھا اور ایک بکٹ کہانی لکھی ہے' جس کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔"

قائم نے افضل کا جو زمانہ دیا ہے' اس میں بظاہر ایک غلطی معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ عبداللہ شاہ درحقیقت 1035ھ میں تخت نشین ہوتا ہے نہ کہ 1020ھ میں جو محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کا سال ہے۔ اس کی

یہی صورت ہو سکتی ہے کہ یا تو قائم نے محمد شاہ کے نام کے بجائے عبداللہ قطب شاہ یا 1035ھ کی جگہ 1020ھ لکھ دیا۔ یہ امر بھی تعجب خیز ہے کہ قائم محمد افضل کے زمانے کو جو اس کے اپنے بیان سے ایک ہندوستانی شاعر ہے ایک دکنی بادشاہ کے عہد کے ساتھ مضاف کر رہا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں رائج ہونے سے پیشتر اردو شاعری چونکہ دکن کی سرزمین کے ساتھ وابستہ تھی اس لیے ہمارے تذکرہ نگار اپنے ذہن میں غیر دکنیوں کو بھی دکنی تصور کر لیا کرتے ہیں۔ چنانچہ شیخ سعدی کو جو ہندوستانی ہیں دکنی فرض کر لیا گیا ہے۔

علی قلی خاں والہ داغستانی نے اتفاق سے محمد افضل کا تذکرہ "ریاض الشعراء" میں شامل کر لیا ہے جو ہمارے شاعر کے حالات پر بالکل مختلف روشنی ڈالتا ہے۔ والہ کا بیان ہے کہ محمد افضل پانی پت کے باشندہ ہیں جو فضائل و کمالاتِ ظاہری و باطنی سے آراستہ اور عشق و فقر کی چاشنی سے شیریں کام تھے۔ ہندی اور فارسی میں نہایت اعلیٰ شعر کہتے تھے اور نثر نویسی میں مقبول خواص و عوام تھے۔ معلمی ان کا پیشہ تھا اور طلباء کی ایک کثیر تعداد ان کے حلقۂ درس میں داخل تھی۔ بہتوں نے ان سے فیض اٹھایا۔ بڑی عمر میں آ کر کسی ہندو عورت کے دامِ عشق میں گرفتار ہو گئے اور ایسے وارفتہ ہوئے کہ تمام زہد و عبادت و تقویٰ خیرباد کہہ دی اور مسجد و مدرسہ کے بجائے کوچۂ دلدار کا طواف کرنے لگے۔ اس عشق و وارفتگی کے ایام میں مولانا نے عاشقانہ غزلیں کثرت کے ساتھ لکھی ہیں۔ ایک غزل کا مطلع یہ ہے:

عالم خراب حسن قیامت نشان کیست
در رہ کدام فتنہ گر است و زمان کیست

شدہ شدہ مولانا کے عشق و جنون کی خبر عورت کے رشتہ داروں کو لگ گئی اور غریب عورت مفت میں بدنام ہو گئی۔ بے چاری نے باہر نکلنا ترک کر دیا۔ حتیٰ کہ تہوار کے موقعوں پر بھی گھر سے باہر قدم نہ رکھتی۔ مولانا دیدارِ یار سے مایوس ہو کر کوچۂ یار میں اور بھی جم کر بیٹھ گئے۔ بالآخر عورت کے رشتہ داروں نے تنگ آ کر اسے متھرا اپنے عزیزوں کے پاس بھیج دیا۔ جب حضرت کو معلوم ہوا کہ ان کا مطلوب متھرا بھیج دیا گیا ہے روتے پیٹتے اس طرف کا رخ کیا اور متھرا پہنچ کر تلاشِ یار جاری کر دی۔ تقدیر سے ایک دن یہ عورت اپنی ہمجولیوں کے ساتھ باہر سیر کو گئی تھی۔ سامنے سے قبلہ مولانا تشریف لا رہے تھے۔ آپ دیکھتے ہی آگے بڑھے اور یہ شعر پڑھا:

خوشا رسوائی و حال تباہے   بر راہے و آہے و نگاہے

خدا جانے وہ عورت ان کے شعر کا مطلب سمجھی یا نہیں لیکن اس نے مولانا کو بڑی گرما گرم داد دی۔ طیش میں آ کر کہا "مولوی تجھے شرم نہیں آئی کہ منہ پر سفید داڑھی لگا کر ایک جوان عورت کی محبت کا دم بھرتا ہے۔" مولانا شرمائے تو بہت لیکن عشق کا بھوت ان کے سر سے نہیں اترا۔ پری کو شیشے میں اتارنے کے لیے فریب کا ایک ایسا جال تیار کیا کہ جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا یعنی داڑھی منڈوا دی۔ زنار گلے میں ڈال لی اور برہمن کا بہروپ بھر کر ایک مندر کے پجاری کے شاگرد بن گئے۔ دن رات برہمن کی سیوا کرتے اور علومِ

ہندی کی تحصیل میں مشغول رہتے۔ طبیعت تھی اخاذ' تھوڑے ہی دنوں میں ہندی میں حیرت انگیز ترقی کر لی۔ برہمن نے انہیں مندر میں اپنا نائب مقرر کرلیا۔ کچھ عرصے کے بعد جب برہمن کا انتقال ہوگیا' مرتے وقت انہیں اپنا جانشین مقرر کر گیا۔ مولوی نے چند ہی روز میں عوام کے قلوب پر ایسا اثر ڈالا کہ سب ان کا کلمہ پڑھنے لگے۔ اس مندر میں سال میں ایک مرتبہ میلہ بھرا کرتا تھا جس میں مستورات بھی خاص طور پر شامل ہوا کرتی تھیں۔ جب میلے کا دن آیا اور عورتیں نذر و نیاز لے کر جوق در جوق پوجا کے لیے مندر میں داخل ہونے لگیں۔ مولانا کی مطلوبہ بھی اپنی نذر لے کر آئی اور جب اپنی باری میں مہاراج کے قدم چومنے کے لیے جھکی' آپ نے اس کو روک دیا اور کہا ''ہمیں بھی پہچانتی ہو؟'' عورت نے سر اونچا اٹھایا۔ مہاراج کو نگاہِ غور سے دیکھا اور پہچان گئی' لیکن یہ امر اس کی فہم سے باہر تھا کہ ایک مسلمان مولوی ہندو مندر میں بیٹھ کر پوجا کرا سکتا ہے۔ سہمی اور گھبرائی۔ ان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ بالآخر بولی کہ آپ نے مجھ جیسی ناکارہ عورت کے لیے بے حد مصائب برداشت کیے ہیں۔ گذشت آنچہ گذشت' لیکن آئندہ کے لیے وعدہ کرتی ہوں کہ میں آپ کی تابعدار بن کر رہوں گی۔ آخر وہ عورت مسلمان ہوگئی اور مولانا کی اہلیہ بن گئی۔ مولانا نے 1035ھ میں انتقال کیا۔

میں والہ کے اس بیان کو میر حسن کے بیان پر ترجیح دیتا ہوں' اس لیے کہ اوّل تو والہ میر حسن سے اقدم ہے۔ دوسرے محمد افضل اپنی ''بکٹ کہانی'' کے خاتمے میں یہ شعر لاتے ہیں:

بیاد دلربا خوش حال می باش　　　گہے افضل گہے گوپال می باش

میر حسن کے نزدیک گوپال اس ہندو بچہ کا نام ہے جس پر مولانا عاشق تھے۔ اس توجیہ سے یہ شعر بے معنی بن جاتا ہے۔ میری مراد آخری مصرع سے ہے۔ والہ کے بیانات کی روشنی میں گوپال خود مولانا کا نام قرار پاتا ہے یعنی ان کی زندگی کے اس واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے' جب وہ برہمن بن کر مندر کے پجاری بن جاتے ہیں اور گوپال نام اختیار کر لیتے ہیں۔ اس شعر کے معنی بالکل روشن ہو جاتے ہیں۔ قائم کا بیان ہے کہ افضل عبداللہ قطب شاہ کے دور سے پہلے کے آدمی ہیں۔ والہ کا بیان اس کا بھی موید ہے یعنی عبداللہ قطب شاہ 1035ھ میں تخت نشین ہوتا ہے اور افضل اسی سال انتقال کرتے ہیں۔

ہمارے مورخین کا عقیدہ ہے کہ شمالی ہند میں اردو شاعری ولی کی آمد اور محمد شاہی دور تک وجود میں نہیں آئی تھی' لیکن محمد افضل کے دوازدہ ماہہ کی موجودگی میں ہمیں اس عقیدے میں ترمیم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ محمد افضل پر ہی کیا منحصر ہے' اگر باقاعدہ تلاش کی جائے تو افضل کے ساتھی اور بھی ملیں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ اردو میں تالیف و تصنیف ہند کے ہر صوبے میں کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود تھی۔ یہ اور بحث ہے کہ وہ لوگ دلی کے روزمرہ میں نہیں لکھتے تھے یا جذبات میں فارسی کے متبع نہیں تھے اور ہندی طرز میں لکھتے تھے۔ ان کے اوزان ہندی تھے اور عورت کی طرف سے خطاب ہوتا تھا۔ بہرحال ملک میں اردو میں رسائل لکھے جانے کا رواج تھا۔ غیر تعلیم یافتہ طبقے میں یہ تالیفات مقبول تھیں۔ مذہبی مسائل' قصے' تصوف کے مسائل'

تعویذ گنڈے وظائف بلکہ منتر جنتر تک اس میں موجود تھے' لیکن آج یہ چیزیں ہماری نظروں سے کیوں نہیں گذرتیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہماری وہی ناقابل معافی بے پروائی ہے' جس کے اثر میں ہم نے اسلاف کے علمی ودماغی کارناموں کے ساتھ نہ صرف بے رحمانہ بلکہ مجرمانہ سلوک روا رکھا ہے۔ شیکسپیئر اور ملٹن' گولڈ اسمتھ اور ٹینی سن کی آندھیوں نے ہمیں اندھا کر دیا ہے۔ ہم انگریزی ادیبوں اور شاعروں کے حالات سے واقفیت رکھتے ہیں' لیکن اگر واقف نہیں ہیں تو اپنے وطن کے باکمالوں سے۔ انگریز اور انگریزی پرستی کی لہر ہم میں اس قدر دوڑ گئی ہے کہ ہم اپنے وطن کی ہر شے سے نہ صرف احتراز کرتے ہیں' بلکہ نفرت کرنے لگے ہیں۔

محمد افضل کی ''بکٹ کہانی'' درحقیقت ایک بارہ ماسہ یا دوازدہ ماہہ ہے' جس میں ایک فراق دیدہ عورت اپنے خاوند کی جدائی میں اپنی سکھیوں یعنی سہیلیوں سے خطاب کر کے اپنی بے تابی اور دردِ جدائی کی داستانِ الم سناتی ہے اور جیسا کہ ہمارے ملک میں بارہ ماسوں کا دستور ہے' ہر ہندی ماہ کے عنوان کی ذیل میں اپنا قصہ غم ایک دل گداز پیرایہ میں دہراتی ہے۔ اس کی زبان دکنی سے بہت مختلف اور صاف ہے۔ اس نظم میں فارسی بندشیں اور ترکیبیں جا و بے جا باندھی گئی ہیں۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے' جو دکنی سے غیر حاضر ہے۔ ایک مصرع کی بندش آدھی فارسی میں ہے اور آدھی ہندی میں۔ حتیٰ کہ افعال وضمائر فارسی سے بھی بے تکلف کام لیا گیا ہے۔ بعض امثال یہاں سپردِ قلم کرتا ہوں:

چہ سازم چوں کنم کس کن پکاروں　　　جتن کیا عشق کے غم کا بچاروں

دیگر:　جنوں در ملک جاں جھنڈا گڈایا　　　سمجھ اور بوجھ کا تھانا اوٹھایا

دیگر:　چو شد مت پیا کے سنگ رہتے　　　مرم با یک دیگر کہتے و سنتے

دیگر:　چہ بینم کہ منگل گاوتی ہیں　　　مرے گھر ناریاں سب آوتی ہیں

ذرا ضمائر متصل کا استعمال ملاحظہ ہو:

ع: ''نہیں جز وصل کا سوکھا نہالم''

(دیگر) ''کہوں کیا اب مکانش ماگھ لیتا۔''

دیگر: ملے آ کر چھٹے جانم جلن سوں

بلکہ فارسی کا اثر اس سے بھی زیادہ گہرا ہے۔ یعنی لفظ ''دھوم'' ہندی ہے' اس پر بہ قاعدہ فارسی شین اضافہ کر کے حاصل بالمصدر دھومش بنالیا۔

اٹھا کر کھرمنے دھومش مچائی　　　متاع صبر و تسکین دل لوٹائی

فارسی کا ایسا اثر میر جعفر زٹلی کے ہاں بھی بہت غالب ہے۔ اس قدر فارسیت کے باوجود یہ نظم جذبات کے لحاظ سے بالکل ہندی ہے۔ اس میں ہندووانہ زندگی کا مرقع پیش کیا گیا ہے حتیٰ کہ ہندو تہوار ہولی' دوالی اور دسہرہ مع ان کے لوازمات کے مذکور ہے۔ ہولی کے گیت گائے جاتے ہیں۔ رنگ کی پچکاریاں ہاتھوں

میں ہیں۔ دف اور مردنگ بجائے جاتے ہیں۔ سر منڈل پھڑک رہا ہے۔ گلال اور عبیر اڑایا جا رہا ہے۔ دوہرے اور غزلیں گائی جاتی ہیں۔ کاگا قاصد ہے۔ کوئل کوکتی ہے اور پپیہا پیہ پیہ کی پکار لگاتا ہے۔ جوگن کا بھیس، برہمن کا پوتھی دیکھنا، ٹوٹکے کرنا وغیرہ وغیرہ یہ تمام ہندی جذبات ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ محمد افضل کی یہ نظم ہندوؤں میں جیسا کہ میر حسن کا بیان ہے زیادہ مقبول رہی۔

از دوازدہ ماہہ محمد افضل

سنوں سکھیو بکٹ میری کہانی　　بھئی ہوں عشق کے غم سوں نمانی
نہ مجھ کوں سوکھ دن نہ نیند راتا　　برہوں کی آگ میں سینہ جراتا
تمامی لوک مجھ بوری کہیں ری　　خرد گم کردہ و مجنوں کہیں ری
نہیں اس درد کا دارو کسی کن　　پھٹے حیران سبھی حکماء ذو فن
اری جس شخص کوں یہ دیو لاگا　　سیاناں دیکھ اوس کوں دور بھاگا
اری یہ ناگ جس کوں ڈنگ لاوے　　نپاوے گا درد جیورا کواوے
اری یہ عشق ہے یا کیا بلا ہے　　کہ جس کی آگ میں سبھ جگ جلا ہے
کہ جس کے بیچ یہ آتش پری رے　　وہی دن رین سلکت ہے سریرے
وہی جانے کہ جس کے تن لگی ہے　　برہوں کی آگ تن من میں دگی ہے
بوائیکی نہیں جس شخص کوں پیر　　چہ داند درد دیگر را ارے بیر
بھئی بوری برہوں بیراک ستی　　جلے جیورا مرا نت آگ سیتی
چہ سازم چوں کنم کس کن پوکاروں　　جتن کیا عشق کے غم کا بچاروں
نہیں یک دم مجھے دن رین میں چین　　اندھیری ہو چلی رووت مری نین
جنوں در ملک جاں جھنڈ گڈایا　　سمجھ ار بوجھ کا تھانا اوٹھایا
اوٹھا کر کھر منیں دھوش مچائی　　متاع صبر و تسکین دل لوٹائی
کیا مجھ دستگیر آں شاہ بیداد　　چہ سازم چہ کنم فریاد فریاد
پیالا حسن کی مے کا پلایا　　کیا بے خود مجھے مجھ سوں بھولایا
گدا ہو کر پھروں گھر گھر و بازار　　کبھو ہووے کہ پانوں بیکھ دیدار
بہت مدت کہی کر کے گداہی　　پیا کے وصل کی تب بیکھ پاہی
پیا نے کر پکڑ کر سوں لگاہی　　تمامی آگ تن من کی بوجھائی
چو شد مدت پیا کے سنگ رہتی　　مرم با یک دگر ستی و کہتی
چہ حیلۂ عشق نے برمن اوٹھایا　　فلک دشمن مری بھجبہ (کذا) لگایا

مرا سکھ دیکھ اوس کوں حسرت آہی — نہادہ بر دلم داغ جدائی
بکٹ قصہ نہت مشکل کہانی — دیوانی کی سنو سکھیو کہانی
ملن پاچھی بچھیرناں بھی کٹھن ہی — کہو اب زندگی کا کیا جتن ہی

ساون

چڑا ساون بجا مارو نکارا — سجن بن کون ہے ساتھی ہمارا
گھٹا کاری اومد چھاتی سوں آہی — برہوں کی فوج پر کیتی چڑاہی
پپیہا پیہ پیہ نس دن پوکارا — پوکارت دادرو جھنگر جھنکارا
اری جب کوک کوئل نیں سوناہی — تمام تن بدن میں آگ لاہی
اندھیری رین جگنوں جگ مکاتا — اری جلتی اوپر تیں کیا جلاتا
سونی جب مور کی آواز بن سوں — شکیب از دل شدہ آرام تن سوں
بھئی جل تھل پھیا سربسز عالم — نہیں جز وصل کا سوکھا نہالم
ہندولی جھولتی سبہ نار پیہ سنگ — حسد کی آگ نی جارا مرا انگ
چلا ساون دگر ساجن نہ آہی — اری کن سوکنی تونی چلاہی

بھادوں

سکھی بھادوں تپت بھوتی پریری — تمامی تن بدن میرا جری ری
سیہ بادر چھاروں اور چھائیں — لیا مجھ گھیر پیہ اجھوں نیائیں
پھورن پرنی لگی اور راعد گرجا — تمامی تن بدن جیو جان لرجا
گھٹا کاری کی اندر بیچ چمکی — جری جیہورا اکن سون دیہہ لرجی
اکیلی دیکھ نس کاری ور آوی — تمامی رین دن برہوں ستاوی
پیا پردیس جا ہم کوں بسارا — نجانوں کیا کنہ دیکھا ہمارا
گھٹا غم کی اومد چھاتی سوں آہی — اری دو نین نیں برکھا لگاہی
اری نس دن بتاؤ پوچھ ہاری — خبر پیہ کی نیاہی ہای ہاری
جری پوتھی بھمن سبہ مرگئی ری — پھٹی کب کاک اودو ٹھگ رہی ری
کہو پیہ کی خبر پوچھوں کسے جای — لکھوں پتیاں کسی دیوں ہای ری ہای
خدا را ای صبا بیں حال میرا — پیا کوں کہوہ کری تک ایک پھیرا

دہل رحلت کا بھادوں نے بجایا — اچھوں لگ ساورا پردیس چھایا

اسوج

سنو سکھیو کہ رت اسوج آہی — پیاری کی خبر اب تک نیاہی
کہو کیسی جیویں پیہ باجھ ناری — جنھی روتی کٹی ہی عمر ساری
لکھوں پتیاں ارے اے کاگ لے جا — سلونی سانوری سندر پیا پا
کنا کت جب پیارا پیہہ آوی — تو جبی دیکھی مہر کر کی بولاوی
سلام از طرف ایں غم خوار کیجو — پکن کوں پرس پاتی ناتھ دیجو
اری یہ کاگ باتیں سوکھ نمانی — مرم دل درد مندوں کا نجانی
پیا بن تیج ری ناکن بھئی ری — ہسن کھیلن کی سب سودھ بودھ گئی ری
دسہرا پوجنی گھر گھر سکھی ری — کرم میری نجانوں کیا پری ری
اری سبزک پیا کے باغ جا کر — اسکوں بے وفا سیتی لوکا کر
کہو اِی سنگ دل تب مکھ دیکھایوں — تیری مکھ سیں اگر اک قول پالوں
کہ گھر جا برہنی کو گل لگادو — پکر پیاں پلنگ اوپر چھادو
کہ تیری برہوں سیں دن رین رووے — جنم سب چوبنا تجھ باجھ کھووے
تم اوراں سیں پیاری سوکھ کرت ہیں — ہمن سی برہنی سو دوکھ بھرت ہیں
دیا پردیس جا سوکن تھیں راج — بھولایا کہر نہیں تجھ نین میں لاج
تو جبی اے سنگ دل کیسی پری چیں — جری جت آہ سوں جل تھل دواویں
اری ظالم نداری خوف رب کا — قیامت ہی کہری کر فکر تب کا
درا کر توں ز آہ درد منداں — کہ می سوزد ز آہش سنگ وسنداں
سکھی اس سوچ میں سب عمر جاتی — سکھو سیں غم پیاری کا سناتی
کہ ہووے جا کہے کوہی اس سجن سوں — سنی دل سوں کبھی دیکھی ہمن کون

سکھی آسوج رت چلتی رہی ری
پیا بن برہنی جلتی رہی ری

محبوب عالم عرف شیخ جیون

شمالی ہندوستان میں محمد افضل کی تحریکِ اُردو نظم میں کسی تنہا واقعے کی کڑی نہیں ہے' بلکہ بعد میں اور لوگ بھی اس کی تقلید کرتے ہیں۔ یہ تحریک پہلے پہل ہریانی زبان میں شروع ہوتی ہے' جسے اجاب بانگڑو کہتے ہیں۔ ہریانی زبان' مشرق میں اردو' شمال میں اردو اور پنجابی' مغرب میں پنجابی اور راجستانی اور جنوب میں راجستانی زبانوں سے محصور ہے' جو داوری' فتح آباد' رہتک' ہانسی' حصار' کلانور' مہم' گہانا' نارنول وغیرہ شہروں میں کسی قدر اختلاف کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ اس علاقے کا مغربی حصہ بالکل غیر آباد تھا' لیکن فیروز شاہ نے دریائے جمنا اور ستلج سے نہریں کاٹ کر اور کئی نئے شہر آباد کر کے اس کو بہت سرسبز بنا دیا تھا۔ اس سرزمین میں جھجر کو بھی شامل سمجھنا چاہیے۔ ہریانی زبان اردو کے نہایت قریب ہے' کیونکہ دہلی کے قرب کی وجہ سے ان اطراف میں مسلمانی اثرات ہمیشہ غالب رہے ہیں۔

شیخ جیون گیارہویں صدی میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے حالاتِ زندگی سے ہم ناواقف ہیں۔ اسی قدر معلوم ہے کہ سید میراں بھیکھ چشتی صابری متوفی 1131ھ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ چنانچہ ان کے خلفاء کی فہرست میں شیخ جیون کا نام بھی ملتا ہے۔ اشپرینگر نے شیخ جیون کی مصنفات کے مفصلہ ذیل نام دیے ہیں:

(1) فقہ ہندی (2) محشر نامہ (3) دردنامہ (4) خواب نامہ پیغمبر (5) دہیز نامہ بی بی فاطمہ خاتون۔ ان میں سے نمبر اول ''فقہ ہندی'' شیخ جیون کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ اس کے مالک کوئی عبدی ہیں جو پنجاب سے علاقہ رکھتے ہیں۔

یہاں صرف ''دردنامہ'' کے مختصر سے تبصرے پر قناعت کی جاتی ہے۔ ''دردنامہ'' ایک بڑی کتاب ہے' جس میں پونے تین ہزار کے قریب اشعار ہیں۔ اس کی زبان رائج الوقت اُردو سے بہت مختلف نظر آتی ہے لیکن جس وقت یہ کتاب تصنیف ہوتی ہے' اس وقت اس کی اور دہلی کی زبان میں بہت کم فرق ہوگا۔

سب سے بڑا فرق اس کی ماضی' مستقبل اور مضارع کے صیغوں میں ہے۔ جہاں یہ زبان اردو اور راجستانی زبانوں کی تقلید کرتی ہے۔ مثلاً:

عرض اور بھی ہم جو تجھ سے رکھاں
کہاں نانہ تجھ سے تو کس سے کہاں

اردو میں ایسے موقع پر رکھیں اور کہیں لاتے ہیں اور یہ شکل بھی ہریانی میں موجود ہے۔ اسی طرح ماضی کی مثال:

مصرع: تمہیں میرے پیچھے بہت دکھ پڑاں (یعنی پڑے)

اردو کی لام ہریانی میں رے سے اور ڑے ڈال سے بدل جاتی ہیں:

تلوار=تروار' ڈال=ڈاڑ' پڑھینگے=پڈھانگے' بڑائی=بڈائی' پڑھنا=پڈھنا' چڑھنا=چڈھنا۔

الفاظ میں حرف دوم علت بہت نمایاں ہے:

رکھ=راکھ' بکری=باکری' کل=کالھ' دکھ=دوکھ' اکھٹی=ایکھٹے' لگا=لاگا' اترا=اوترا۔

نون غنہ کثرت سے مستعمل ہے:

نے=نیں' تو=توں' کوچ=کونچ' پچاس=پنچاس' سنی (ماضی)=سنیں' کو=کوں' مانے=مانیں

ہائے مخلوط التلفظ بہت موقعوں پر خارج کردی گئی ہے:

بھی=بی' ابھی=ابی' جبھی=جبی' باہر=بار

''دردنامہ'' کا افتتاحیہ ہے:

جیوں میں پہل نام رحمٰن کا | تیوں گیان میں دھیان سبحان کا
صحی ایک کرتار وہ پاک ہے | کھڑا جس کی قدرت سے افلاک ہے
وہی ہے جو کرتار عالم خدا | زنجن زنکار سب سے جدا
جنے ایک پلک میں کیا یہ جہاں | وہی توڑ دے پھر خودی اور گماں
کیا جن تکبر ذنی پاک سے | پڑا عاقبت خاک پر تاک سے
تکبر سے شیطان رانا گیا | فرشتے سے وہ دیو دانا گیا
تکبر خودی کی تھی نمرود نیں | براہیم نبی سے جو مردود نیں
گیا مغز بیچ ڈانس جب کیا بنی | گگی لاکھ پاپوش سر پر گھنی
بنایا ارم بہشت شداد نیں | لگائے بہت درم بیداد نیں

چلا بہشت کوں وہ بنا کر براں
غضب کے فرشتے نیں کھینچے پراں

فارسی اور عربی الفاظ کے استعمال میں مصنف ان کے اصلی تلفظ کی پرواہ نہیں کرتا' بلکہ مقامی لہجے میں لکھتا ہے۔ مثلاً فاطمہ کو فاطماں اور طاق کو تاک لکھتا ہے اور پاک اس کا قافیہ ٹھہراتا ہے۔ لوک کا قافیہ شوق لاتا ہے۔ عکرمہ کو عکرماں لکھ کر اکڑماں کا قافیہ بنایا ہے۔ ہراول کو ہرول اور گرز کو گرج اور صحیح کو صحی لکھتا ہے۔

محبوب عالم کے کلام میں خاصی چستی اور روانی نظر آتی ہے۔ میں واقعۂ اُحد کے چند اشعار یہاں نقل کرتا ہوں:

ہوئے پھر مقابل قریشوں کے تب — نبی اور اصحاب ایک بار سب
عکاسہ طرف داہنی کو کھڑا — ابو سلمہ بانویں طرف پر پڑا
کیا سعد وقاص عبیدا ہرول — کیا اور مقداد کوں جب چنڈول
ہوئے آپ درمیان کی فوج میں — نبی خاص مقبول رحمان ہیں
کھڑی فوج کفار کی بھی طیار — کرے داہنی خالد آ کر پوکار
ہوا طرف بانوکے جب عکرماں — کھڑا تیر تلوار لے اکڑماں
مقابل ہوا عمر سفیاں شتاب — چلا اور بیٹا ربیعہ خراب
ہوئی صف جو دونوں طرف سے تیار — پوکارے چھوں طرف سے مار مار
ترنگوں کی پھر تنگ کھینچی لگام — بھئی ونگ اس جنگ کی دھوم دہام
دہماں دم گھما گم ہوئی پھیر کر — لیا ایک نیں ایک کوں گھیر کر
کہیں برچھیاں ترچھیاں ہاتھ میں — ہوئے مرد کی مرد جب گھات میں
کری سیل کی ریل اوت کھیل کر — لیا مرد نیں مرد کوں ٹھیل کر
شپاشب چلے تیر پہ تیر زور — کھیا کھپ ہوئے پارہ نجوہ پھوڑ
لگے گرج بھاری گرج شور کر — کمر توڑ ڈاری نپٹ زور کر
چھٹی دہار تروار اوت آب دار — جیسے پار صابن ہوئے لوہ تار
لڑائی ٹھئی اک قیامت اوٹھی — قیامت کی اس بات چھاتی پھٹی
کہیں مست گھومیں صحابی کھڑے — کہیں گھاؤ کھائے قریشی پڑے
مسلمان اصحاب نیں تیر کر — لیا مار کفار کوں چیر کر

گیئے بھاگ کافر چلے کھائے ڈر
اوٹھی (کذا) گیت جب ناریاں گائے کر

رسول اللہؐ کی وفات پر مصنف نے حضرت عائشہؓ و حضرت فاطمہؓ و شیخینؓ کی طرف سے مرثیے لکھے ہیں جو بالکل غزل کی شکل میں ہیں، لیکن وہ انہیں دوہرے کہتا ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کا دوہرا حسب ذیل ہے:

سکھ چین کے گھر سووتی لاگا کلیجے تیر اب
دکھ نین بھر بھر رووتی بھاری پڑی ہے پیڑ اب
رو رو کروں ہوں زاریاں کس کوں سناؤں حال یہ

کیا سی گی اب مرم کی دیکھی گئی ہے چیر اب
جانی بنا کوئل بھئی جر جر بی جوں کویلا
تن ماں گی ہے لو کٹی دل کا گیا دلگیر اب
نسدن پوکاروں ایکلی پیو بن سبھی تن بے کلی
آنسو جھراں ناری بھراں نینو رہا نہ نیر اب
میری ہوئی ہیں نین کٹی بنسی گی ہے چھانچک
تربھون پڑی بیکل کھڑی کیسے دہروں میں دھیر اب
پیو چاہ چاہے جیو یہ پیو بن نہیں کچھ جیونا
جیکوں تجوں پیکوں لہوں سانچی اتھی ہے پیر اب
پک پک پڑی تھک گری ٹوٹا تنک ناہیں رہا
محبوب عالم نیہہ کی پاؤں پڑی زنجیر اب

حضرت عمرؒ کا دوہرہ یہ ہے:

محمدؐ یاد نا چوکوں پڑا دن رین کر لاؤں
کھڑا فریاد ماں کوکوں محمد سا کہاں پاؤں
محمد نیہہ کی پھانسی گئی گرما نہ ہے ہانسی
گئی ہے ٹوٹ کر پھانسی کسے یہ حال دکھلاؤں
لگن لاگی نپٹ گاہڑی محمد پیت نیں یاد ہی
بہی ہے جیو ماں ٹھاڈی محمد نانو نت گاؤں
محمد کہہ محمد کہہ پوکاروں میں سدا اللہ
پھروں گھر گھر یہی کہہ کہہ محمد ناؤں پہنچاؤں
کروں ہا ہا محمد بن سہوں پھاہا پڑا نس دن
گیے سب چین ہر دم میں کسے دکھ بات بتلاؤں
نہ سنگی ہے نکو ساتھی پھٹی اس درد ماں چھاتی
پھٹی تن کی سبھی ناٹی محمد باجھ من پاؤں
عجب محبوب عالم تھا نہایت خوب بالم تھا
مرا نت پرت پالم تھا رہا ہے بیٹھ کس ٹھاؤں

میر جعفر زٹلی

پچھلے تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر کیا ہے اور اردو شعرا نے مانا ہے' لیکن حال کے تذکرہ نویسوں نے ان کے نام پر پردہ ڈال دیا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے یہ کہہ کر ان سے دامن چھڑایا ہے کہ زٹل کا بھروسہ کیا' لیکن اردو کی تاریخ میں ان کے خاردار و داغدار مضامین کے باوصف میر جعفر سے اعراض نہیں کر سکتے' اس لیے کہ ہندوستانی اردو نگاروں میں ان کا نمبر بہت پہلے ہے۔ ان کا اور ولی کا ایک زمانہ ہے' اس لیے دہلی میں ولی کے متبعین سے ان کا زمانہ اقدم ہے۔

میر جعفر اصل میں نارنول کے باشندے ہیں اور سید عباس کے فرزند ہیں جن کا پیشہ دکانداری تھا۔ اورنگزیب کی تخت نشینی اور میر جعفر کی ولادت ایک ہی سال کے واقعے ہیں۔ ان سے پہلے دو بہنیں ہو چکی تھیں اور بعد میں ان کے چھوٹے بھائی صفدر ہوئے۔ میر کی کم عمری میں ان کے والد کے انتقال کا واقعہ پیش آیا۔ چچا نے جن کا نام میر سرور تھا' سرپرستی کی۔ مکتب میں تعلیم پانے کے بعد ملازمت کی تلاش میں نکلے اور شہزادہ کام بخش کی فوج میں سواروں میں ملازم ہو گئے۔ چونکہ اورنگزیب کا اکثر زمانہ دکن میں گذرا' اس لیے یہ بھی کام بخش کے ساتھ وہیں رہے۔ ان کا سالِ وفات کسی نے نہیں لکھا' لیکن ان کے کلیات مطبوعہ لکھنؤ ص 48 کی ایک سرخی سے معلوم ہوتا ہے کہ فرخ سیر نے ان کو قتل کروا دیا تھا۔

میر جعفر فحش گوئی میں عبید زاکانی کے خلف ارشد معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ تو طبیعت کی افتاد اور کچھ ان ایام کی مبتذل اخلاقی حالت نے ان کو اس رنگ میں رنگ دیا۔ ہجویں انہوں نے کم لکھی ہیں اور وہ بھی ضرورتاً لکھی ہیں۔ تاہم ان کی زبان درازی اور بے باکی میں کوئی شک نہیں۔ ان کے قلم سے راجا کے پرجا تک کوئی نہیں بچا۔ وہ نہ شہزادوں سے خائف تھے اور نہ خانوں سے۔ جس نے انہیں چھیڑا' نقصان اٹھایا۔ مشہور تو زٹل ہیں' لیکن کلام کو خداداد قبولیت حاصل تھی' اس لیے دنیا ان سے کنیاتی تھی۔ ان کی زبان سے عورتیں بھی نہیں بچیں۔ عالمگیر اگرچہ نہایت ثقہ اور متین بادشاہ تھا' لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اس کی انتہائی سنجیدگی اور متانت کی تلافی کے لیے ایک ہی وقت میں دو زبردست ہزال اور فحش گو فارسی اور اردو زبانوں میں پیدا کر دیئے' ایک یہی ان سطور کے موضوع اور دوسرا نعمت خان عالی۔

قمر النساء بیگم نے میر صاحب کو تیس روپے انعام دیئے جانے کا حکم دیا۔ بیگم کے دیوان فتح علی خاں

نے پانچ دے کر ٹالنا چاہا۔ میر صاحب اس پر بگڑ گئے۔ دیوان صاحب کی ہجو الگ لکھی اور روپیہ الگ وصول کیا۔ خان جہان خان بہادر کوکلتاش عہد عالمگیر کے مشاہیر امراء سے ہیں۔ میر نے ان کی خدمت میں ایک قرآن مع ایک عدد قصیدہ پیش کیا اور قرآن شریف کے ہدیے اور قصیدے کے صلے کے لیے عرصے تک منتظر رہے لیکن کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہوا۔ آخر میر نے تنگ آ کر خان والاشان کی ہجو لکھی۔ ایک امیر نے ان کو پانچ اشرفیاں انعام دلوائیں۔ اس کے دیوان خدایار بیگ نے اشرفیاں دبالیں۔ میر کو خبر لگی۔ خدایار پر برس پڑے۔ اس ہجو کے آخر میں فرماتے ہیں:

جو کوئی مجھ اوپر شفقت کرے — جگت بیچ اس کی خدا پت رکھے
نہ ایں ہجو از راہ حرص و ہواست — دلازار را ہجو کردن رواست
بیا جعفر اکنوں شکایت مکن — ز موزی و ماضی حکایت مکن

میر کے قلم سے عالمگیر کے فرزندوں میں کوئی نہیں بچا۔ ان شہزادوں کی آپس کی رقابت نے دکن کی مہم کو ایک نہایت پیچیدہ اور کٹھن کام بنا دیا تھا۔ محمد معظم کی تعریف میں کہتے ہیں:

نخستیں کلاں ترکہ برکھنڈ کرد — ہمہ کار و بار پدر بھنڈ کرد
چناں لوٹ شد بستی بھگ نگر — نہ خذ ما صفا ماند نہ ما کدر
چہ ملکے بدست خود آوردہ داد — مگر از پیشکش اساسے نہاد
جہاں ہوے ایسا کلچھن کپوت — لگے خلق کے منہ کو کالک بھبھوت

اور محمد اعظم شاہ کے حق میں کہتے ہیں:

دگر شاہ اعظم ہمہ کنہ در — برسوائی انداخت کار پدر
بخو شدامن و خسپورہ ساختہ — بہ للو چتو کار در باختہ
فرستند ایناں بشب پان پھول — ملا کر کیا کام سب خاک دھول
ازیں اختلاتش کہ گیرد خراج — کہ دھنگ بھنگ گشت اشت للو کا راج

محمد اکبر کے لیے کہتے ہیں:

چہارم پسر ڈومنی کا جنا!

خود شہزادہ کام بخش پر بھی میر نے ہاتھ صاف کیا۔ خیریت اسی میں گذری کہ نوکری سے موقوف کر دیے گئے۔ میر اپنی اس غلطی کو مانتے ہیں اور پشیمان بھی ہیں:

از ہجو آں سلطان خود کردی پریشان جان خود
در ماندۂ بے بال و پر کہہ جعفر اب کیسی بنی
با بادشہ تیں بیر کی سر کی خدا نے خیر کی

تا حال ہم داری حذر کہہ جعفر اب کیسی بنی
وہ ذوق ہر دم کا کہاں وہ عطر بیگم کا کہاں
در خاک شد آں کروفر کہہ جعفر اب کیسی بنی

عالمگیر نے ''امجد خاں'' کا خطاب ایک امیر کو دیا۔ میر نے اس واقعے کی تاریخ ''چغل سگ'' نکالی جس سے 1113ھ برآمد ہوتے ہیں' لیکن تعجب ہے کہ میر اورنگزیب کا ہمیشہ نہایت ادب سے ذکر کرتے ہیں۔ اس کی زندگی میں نیز وفات کے بعد بھی اس کا احترام کرتے رہے۔ اگرچہ ایک آدھ جگہ اس کو للو کہہ گئے ہیں' تاہم کوئی ہجو مقصود نہیں ہے۔ اس کی وفات پر جو ہندوستان کا نقشہ بگڑا ہے اور رعایا پر ایک عالمگیر بے اطمینانی اور بے چینی چھائی ہے' اس کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں:

کہاں اب پایئے ایسا شہنشاہ — مکمل اکمل و کامل دل آگاہ
رکت کے آنسوؤں جگ رووتا ہے — نہ میٹھی نیند کوئی سووتا ہے
صدائے توپ و بندوق است ہر سو — بسر اسباب و بندوق است ہر سو
دوا دو ہر طرف بھاگڑ پڑی ہے — بچہ در گود سر کھٹیا دھری ہے
کٹا کٹ و لٹالٹ ہست ہر سو — چھٹا جھٹ و پھٹا پھٹ ہست ہر سو
بہر سو مار مار و دھاڑ دھاڑ است — او چل چال و بتر خنجر کٹار است
از آں اعظم و زیں سوے معظم — جھڑا جھڑ و دھڑا دھڑ ہر دو پایم
بہ بینم تا خدا از کیست راضی — بخواند خطبہ بر نام کہ قاضی

محمد معظم کے دور میں میر نے ایک رسالہ ''اخبار دربار معلیٰ'' کے نام سے لکھا ہے جس میں اول دربار کے فرضی وقائع بیان کیے جاتے ہیں اور پھر ان کے متعلق شاہی احکام صادر ہوتے ہیں۔ میر نے یہ شاہی احکام اکثر اوقات ضرب الامثال کی زبان میں ادا کر دیے ہیں۔ اس طرح ہمیں کسی قدر اس عہد کی ضرب الامثال سے واقف ہو جانے کا موقع مل جاتا ہے۔ میں بعض یہاں نقل کرتا ہوں۔ اکثر وہی ہیں جو آج بھی رائج ہیں:

''(1) چوم چھاڑا بھاری پتھرا۔ (2) تجھے پرائی کیا پڑی تو اپنی آپ نبیڑ۔ (3) ہارا حاکم ضامن چاہے۔ (4) اندھے کی جورو کا خدا رکھوارا۔ (5) دم جو پکڑی بھیڑ کی وارا ہوا نہ پارا۔ (6) باندر کے ہاتھ ناریل۔ (7) باسی رہے نہ کتا کھائے۔ (8) ٹھالا بنیا پنیری تولے۔ (9) ماں پر پوت پتا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ (10) بہرے آگیں گاونا اور گونگے اگے گل' اندھے آگیں ناچناں یہ تینوں ال بلل۔ (11) دبی بلی چوہے پاس کان کتروائے۔ (12) گدھوں کھایا کھیت پاپ نہ پن۔ (13) داتا کی ناو پہاڑ چڑھے۔ (14) مارے منہ طباخ سے اگے دھرا کھائے۔

(15) ترت دان مہا پن۔ (16) اوکھلی میں سر دینا دھمکوں سے کیا ڈرنا۔
(17) کھاویں بیویں محمود کے اور آویں مسعود کے۔ (18) پاسا پڑے سو داؤ راجا
کرے سو نیاؤ۔ (19) آٹا نمو اور پوچا سنگا۔ (20) جیسا لووے تیسا اوبے (کذا)
(21) خارشتی کتا مخمل کی گدی اور اس پر باناتی جھول۔ (22) چار دن کا چاندنا اور پھر
اندھیری رات۔"

اس رسالے کے متعلق ایک حیرت خیز واقعہ یہ ہے کہ اس میں عالمگیر ثانی متوفی 1173ھ اور شاہ عالم ثانی متوفی 1221ھ کے زمانوں کے بعض واقعات درج ہیں۔ مثلاً احمد شاہ درانی' سورج مل جاٹ اور مرہٹوں کا دہلی میں استیلا وغیرہ۔ اب یہ ناممکن ہے کہ میر عالمگیر کے جلوس کے سال 1069ھ میں پیدا ہو کر بارہویں صدی کے اختتام تک زندہ ہیں' حالانکہ ان کی عمر ساٹھ سے کچھ اوپر بتائی جاتی ہے' جس حساب سے انہیں فرخ سیر 1131ھ کے زمانے میں انتقال کرنا چاہیے۔ اس صورت میں یہی خیال کیا جا سکتا ہے کہ کسی فرزند معنوی نے میر کی وفات کے بعد بھی "اخبار دربار معلّی" جاری رکھا۔

جب میر ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے' ان کا ملازم ان کا تمام اندوختہ لے کر بھاگ گیا۔ میر نے اپنے دل کا غبار نثر میں اس طرح نکالا۔

"در عین وقت بیکاری وچنیں ناداری عنی از لی منفی و ہینہ و چہ بمینہ چگونہ نفرے بے پدرے ماچہ خرے فرصت وقت را یافتہ متاع کثیر و قلیل گرفتہ بگوشہ خزید قولہ تعالیٰ یفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید مثلہ موئے پر سو درے۔ مثلہ جیسے کوڑھ میں کھاج۔ مثلہ بلکہ بے خرچی میں آٹا گیلا۔ بیا جعفر بجوش و مخروش نشیندہ کہ گفتہ اند۔"

جب فرخ سیر تخت نشین ہوا' اس کے سکہ پر یہ شعر کندہ کیا گیا:

سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر پادشاہ بحر و بر فرخ سیر

میر کی طبیعت بھی جولانی پر آئی۔ آپ نے اپنے انداز میں اس سکہ کو یوں سجایا:

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر پادشاہ پشہ کش فرخ سیر

میر تقی میر نے لکھا ہے کہ میر جعفر ایک روز مرزا بیدل کے ہاں گئے اور فتوح کی امید میں یہ شعر پڑھا:

چہ عرفی چہ فیضی بہ پیش تو پھس

مرزا بہت برہم ہوئے اور کچھ دلوا کر ٹال دیا۔

میر حسن بیان کرتے ہیں کہ میر جعفر ایک دن مرزا بیدل کے گھر گئے۔ بیدل اس وقت فکر شعر میں مشغول تھے' کچھ توجہ نہ کی۔ میر زیادہ انتظار نہ کر سکے' پوچھا قبلہ وہ مصرع کیا ہے جس کے دوسرے مصرع کی تلاش ہے۔ بیدل نے کہا وہ مصرع یہ ہے:

لالہ در باغ داغ چوں دارد

میر نے سنتے ہی بے تامل کہا:

چو بکے سبز زیر...... دارد

بیدل بہت خفا ہوئے اور کچھ دے کر پیچھا چھڑایا۔

میر جعفر کے کلیات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانے میں اردو اور فارسی میں گنگا جمنی پیوند دیے جانے کا دستور تھا اور زبان کی وہ شاہراہ جو بہ تقلید دکن عہد محمد شاہ میں قائم ہوئی ہے' اس وقت تک تیار نہیں ہوئی تھی۔ ان کا کلیات اگر چہ مختصر ہے' تاہم اس میں سینکڑوں عجیب وغریب الفاظ پائے جاتے ہیں' جو آج متروک ہیں۔ ثقہ وسنجیدہ مضامین پر انہوں نے بہت کم ہاتھ ڈالا ہے۔ لفاظی میں نظیر اکبرآبادی سے کم نہیں ہیں۔ ان کی طباعی اور ذہانت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ زبانِ اردو کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے کلیات میں موجود ہے۔

میر اپنے تمسخر کی لہر میں اکثر اوقات ہندی الفاظ کو عربی بندش دے دیتے ہیں۔ مثلاً۔

''چوں گھڑ گھڑاہٹ الرعد فی الغمام وکڑکڑاہٹ البرق فی المسبر ابر سراست و ہنگام گھٹا گھور صبح و شام شور دارد و مور بر دوام و آوان لرزۃ العمارات وگڑبڑۃ الکھنڈرات وٹوٹ الچھپر والبو چھاڑ فی المنظر او ست دل وسعت منزل علی الخ بیچ را لکھیچ کھاج کو چہائے بیچی آگیس اکراہ می ورزد۔''

یا فارسی کے مطابق ہندی الفاظ کی تصریف کردیتے ہیں۔ جیسے:

''(1) نہ ہلد نہ ٹلد نہ جنبد زجا (2) مثل تو نباشد جہاں اے شہ خوباں لٹکندہ و مٹکندہ و بر فتار جو ہے سو۔''

یہ طرز اور زبانوں میں بھی موجود ہے۔ طرزی نے اسے فارسی میں استعمال کیا ہے اور سولہویں صدی کے انگریزی شعراء کے کلام میں ایسے نمونے کثرت سے ملتے ہیں جن میں انگریزی اسماء وافعال کو لاطینی زبان کی تصریف کے مطابق برتا گیا ہے۔

یہاں کسی قدر کلام کا نمونہ حوالہ' قلم کیا جاتا ہے:

نہ سو سکھ سیج راحت میں سدا رہ زود طاعت میں
اجل بھی ہے گی ساعت میں کہ آخر خاک ہو جانا
جنہوں کے لاکھ تھے گھوڑے سدا زربفت کے جوڑے
انہوں کو موت نے توڑے کہ آخر خاک ہو جانا
جنہوں گھر جھولتے ہاتھی ہزاراں رین دن ساتھی
تمہوں کو خاک اب کھاتی کہ آخر خاک ہو جانا
کمر جب موڑ کر چلتے عطر سب دیہہ پہ ملتے

دیکھو اب خاک میں رلتے کہ آخر خاک ہو جانا
جنوں کے لال تھے ہیرے سدا مکھ پان کے بیڑے
تمھوں کو کھا گئے کیڑے کہ آخر خاک ہو جانا
سدا جو پہنتے ململ محل میں باجتے مندل
گئے وہ خاک میں رل مل کہ آخر خاک ہو جانا
لنگی باندھتے پاگاں محل میں رنگ اور راگاں
وہاں ہیں بیٹھتے کاگاں کہ آخر خاک ہو جانا
لذت کا کھاوتے کھانا پہرتے ریشمی بانا
انہوں کو موت نے بھانا کہ آخر خاک ہو جانا
ہزاروں شہر کے راجا جنو مکھ چاند سے لاجا
نقارا موت کا باجا کہ آخر خاک ہو جانا

دربیان نوکری:

بشنو بیان نوکری جب گانٹھ ہووے کھوکھری
جب بھول جاوے چوکڑی یہ نوکری کا خبط ہے
ہر روز اُٹھ مجرا کریں درکار یک صد گر پڑیں
بے شرم آپس میں لڑیں یہ نوکری کا خبط ہے
ہر صبح ڈھوویں نوکری کوئی نہ پوچھے بات ری
سب قوم ڈھوویں لاکڑی یہ نوکری کا خبط ہے
چوکی لکھیں اور حاضری کھاون نپاوین باجری
تس پر چلاوے ناظری یہ نوکری کا خبط ہے
راکھے سپاہی کھات کو چوکی دلاویں رات کو
کوئی نہ پوچھے ذات کو یہ نوکری کا خبط ہے
صاحب عجب بیداد ہے محنت ہمہ برباد ہے
اے دوستاں فریاد ہے یہ نوکری کا خبط ہے
ہم نام کو اسوار ہیں روزگار سے بیزار ہیں
یارو ہمیشہ خوار ہیں یہ نوکری کا خبط ہے
یک تیر بے پیکاں مگر وردے نہ سوفار و نہ پر

فوطہ نمانمدہ در کمر یہ نوکری کا خبط ہے
دربار دیکھا خان کا بیڑا نپایا پان کا
زر کا تو پھر امکان کیا یہ نوکری کا خبط ہے

انقلابِ زمانہ:

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے
ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھاون میں وفاداری
محبت اُٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے
نہ بولے راستی کوئی عمر سب جھوٹھ میں کھوئی
اُتاری شرم کی لوئی عجب یہ دور آیا ہے
خوشامد سب کریں زر کی چہ بیگانہ چہ زن گھر کی
ملاوے بات سب ہر کی عجب یہ دور آیا ہے
نفر کی جب طلب ہووے نفر باہر کھڑا رووے
میاں گھر میں پڑا سووے عجب یہ دور آیا ہے

یہ واضح رہے کہ اشعار بالا میں ردیف پر قناعت کی گئی ہے اور قافیے کا استعمال نہیں ہوا۔ محبوب عالم کے دوہروں کی بھی یہی خصوصیت ہے۔ نظموں کا یہ دستور پنجاب میں بہت عام تھا۔

سید اٹل نارنولی

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ میر جعفر زٹلی کے بھائی ہیں۔ اگر چہ سگے بھائی نہیں ہیں تو روحانی ضرور ہیں۔ ان کا ایک رقعہ ''کلیاتِ جعفر زٹلی'' میں محفوظ ہے۔ اس رقعہ کے ملاحظہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اور میر جعفر کا مذاق ایک ہی رنگ کا ہے اور زٹل اور اٹل میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ وھو ہذا:

''رقعہ سید اٹل از نارنول نوشتہ بمیر جعفر ورد کن فرستادہ بود۔''

''پناہ بڑائی وچوڑائی میر جعفر زٹلی بڑے بھائی ہر روز از یاد حق سکھی باشد از سید اٹل بعد او یک جہار بسیار اور منوہار بے شمار او جھل وخفی نماند کہ پیر پریت ہم وطن و اومنگ ملاقات واشتیاق آں از حد پرگھٹ نپٹ بیروں واز جہت اندیشہ بنہایت افزوں لیک بموجب آں کہ کل امر مرہون باوقاتہا حوالہ نمودہ دوا نجھری نگارد کہ بعضے بدبختاں کافر کٹھ دلی بوجہ مزید غشہ در جوی خودی چوں غوک از ندی ٹرٹری کردند واکھاڑ پچھاڑ کردہ در نارنول ٹھیکا ٹھاہ بودم وبعضے ٹرٹوں وچہ چوں از برائے ایں نپٹ مہربان از دہان..... نشان چوں...... پڑ پڑ برزبان می آوردند۔ نظم:

زٹل تیری جعفر جہانگیر شد   زٹل گفتن اندر توئی میر شد

امید کہ خود دریں بٹیہ ہادی بودی از خط وکتابت بھول جانا روا نباشد۔ بیت:

نام حق شب و روز پکارا کر   خط و کتابت کو بھی بچارا کر''

اس رقعہ کا جواب میر جعفر نظم میں دیتے ہیں جو یوں شروع ہوتا ہے:

سنو اے سخندان برادر عزیز   اٹل نارنولی توئی با تمیز

اسی جواب میں زٹل ذیل کا شعر بھی لکھتے ہیں:

منم کمتریں بندہ شاگرد تو   شب و روز در یاد و در ورد تو

جس سے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں زٹل اور اٹل ایک ہی بہروپ نہ ہو۔

غزل ذیل سید اٹل کا نمونہ کلام ہے جو ایک بیاض نوشتہ عہد محمد شاہی سے نقل کی جاتی ہے:

رخسار پُر بہار تجن رونقِ چمن   یا گل گلاب کا کہوں یا لالہ یاسمن

یا حقۂ جواہر یا درج در کہوں — یا غنچہ گلاب کہوں یا کہوں دہن
گیسوئے تابدار ہیں ناگ ہے بھونگ — یا زلف مشک رنگ ہے یا نافۂ ختن
با قد خوش خرام چلے جب لٹک لٹک — شمشاد اور صنوبر خم کھاویں در چمن

چوں ماہتاب روی او کرتا ہے جھمک جھمک
یا آفتاب گشتہ در خشندہ در گگن

بیداد گر ستم گر ظالم عجب عجب — گہ مہربان وگاہ غضبناک وخندہ زن
بر توسن کرشمہ سوار است نازنیں — سید اکمل ز بادۂ دیدار او مگن

(از بیاض پرتاب سنگھ ساکن موضع آدرطہ پرگنہ راہوں دوآبہ بست جالندھر بست ونہم شہر جمادی الاول 9ھ جلوس والا ے محمد شاہ بادشاہ غازی)۔

فارسی لغات سے اردو کی قدامت کی شہادت

اکبر اعظم کے عہد میں فارسی خوانی کا رواج از سرِ نو تجدید پاتا ہے۔ اس عصر میں علوم و فنون نے وہ ترقی کی جو گذشتہ ایام میں نامعلوم تھی۔ فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد 790ھ سے لے کر اکبر کے جلوس 963ھ تک کا زمانہ ہندوستان میں فارسی کے لیے عہدِ تاریک کا حکم رکھتا ہے۔ اس زمانے میں بہت کم تصنیفات ہوئیں اور نہ کوئی چوٹی کا مصنف یا شاعر پیدا ہوا۔ یوں تو فارسی کا ستارہ اس زمانے سے پیشتر بھی گہنانے لگ گیا تھا۔ خلجیوں میں علاء الدین محمد شاہ 715ھ کا زمانہ انقلاب خیز ہے۔ اس کا عہد زمانۂ ماسبق کے اثرات کی بنا پر اگرچہ علم و فضل کے علمبرداروں سے خالی نظر نہیں آتا اور علماء و فضلا' ادیب و شعرا کا جمگھٹا پایہ تخت میں موجود ہے' لیکن بادشاہ بذاتِ خود جاہلِ مطلق تھا اور پرستارانِ علم سے اس کو کوئی الفت نہ تھی حتیٰ کہ اس نے اپنی اولاد تک کو جاہل رکھا اور محل میں ان کی پرورش ہوتی رہی۔ اس کے قواعد و ضوابط جاسوسی کی سختی نے رعیت کے دلوں میں پڑھے لکھوں سے نفرت پیدا کر دی تھی۔ لوگ نویسندوں کو بیٹی دینا تک ناپسند کرتے تھے۔ شاعروں' مؤرخوں' ادیبوں اور عالموں کی اس کے دربار میں آمد و رفت رہی' لیکن بادشاہ کو اس جماعت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ یہ لوگ اس کے نزدیک دربار کی رونق اور نمائش و نمود کے سوا کسی مصرف کے نہ تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخر عہد علائی سے تعلیم یافتہ طبقے کی تعداد گھٹنے لگی اور عوام الناس میں تعلیم کا ذوق و شوق کم ہو گیا۔ علوم کی بے رواجی کے ساتھ ساتھ فارسی پر بھی زوال آ گیا۔ تغلقوں نے کسی حد تک اس تنزل کی روک تھام کی' لیکن فیروز شاہ کی وفات پر کامل اندھیر چھا گیا۔ فیروز شاہ کے جانشینوں' خضر خانیوں' لودھیوں اور سوروں کا زمانہ فارسی کے لیے نہایت بدفال تھا' بالخصوص پٹھانوں کا جو فارسی کے دشمن مطلق تھے۔

شیر شاہی عہد کے پٹھانوں کے ذکر میں اخوند درویزہ اپنے مرشد سید علی ترمذی کے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں:

بحکم آن کہ جہل و بختی بر افغاناں غالب است تا ہر کہ برزبان فارسی نطق و تکلم کند او را دشمن می گیرند۔

ان ایام میں دیسی زبانوں کی طرف عام توجہ ہو گئی تھی۔ مذہب و تصوف اور شاعری کا سب سے زیادہ چرچا تھا۔ برج' اودھی اور قنوجی کے بعض مشہور شاعر اسی زمانے میں پیدا ہوئے۔ دنیا مذہب و تصوف کے

پیچھے دیوانی ہو رہی تھی اور ہر قسم کے شیاد بشرطیکہ ان میں لسانی وطباعی موجود ہو ایک نیا فرقہ اور نیا مذہب بنانے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ مداری اور جلالی فرقے' مہدویوں کی تحریک' کبیر چشتی' دادو چشتی' ستنامی اور نانک پنتھی اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ قصہ مختصر نئے مذہب بنے' نئے فرقے اُٹھے اور تصوف پھلا پھولا' لیکن فارسی ہندوستان میں ٹھٹھر گئی۔

علمی لحاظ سے ان ایام میں کوئی کام ہوا ہے تو یہ ہے کہ طبیبوں نے طب یونانی کو ہندوستانی فضا کے مطابق ڈھالا۔ عربی و فارسی ادویہ کے اسماء کو ہندی اسماء کے ساتھ مطابقت دی۔ در حقیقت یہ ایک نہایت مفید کام تھا جو اس عصر کے اطباء نے کیا۔ اس کے ماسوا جیسا کہ دور تنزل میں دیکھا جاتا ہے' شرح نگار پیدا ہوئے اور اسی ضرورت نے فرہنگ نگاروں کی جماعت پیدا کی۔ یہاں چند الفاظ انہی لغات نگاروں کی بابت کہنا چاہتا ہوں۔

ہندی فرہنگ نگاروں میں سب سے مقدم مولانا فخر الدین مبارک غزنوی قواس کمانگر ہیں جو علاء الدین خلجی 695ھ و 715ھ کے مشہور و معروف شاعر ہیں۔ ضیاء الدین برنی اور فرشتہ دونوں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ ہندوستان میں ان کا ''فرہنگ نامہ'' فارسی لغات کا سنگ بنیاد ہے۔ ہماری نظر میں ان کی اہمیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ فارسی الفاظ کی تشریح کرتے وقت بعض موقعوں پر مصنف نے ہندی الفاظ بالخصوص دواؤں اور دیگر اشیاء کے نام بھی دے دیے ہیں۔ میں یہاں بعض الفاظ نقل کرتا ہوں:

اظفار الطیب کے لیے کہتے ہیں:

''ہندش و کہ و مکہ گویند۔'' دوسرے معنی لکھتے وقت کہا ہے: ''بپارسی ناخن پریاں۔ ہندش نکھ نامند۔''

ابر نیساں کے واسطے کہتے ہیں:

''اہل ہند آں را باراں سواتی نامند و آں ابتدائے زمستان و انتہائے برشکال است۔''

پرستو: مرغیکہ ہندش بھکراج گویند۔''

تاک: ہندش چھیکا نامند۔''

چنوک: قبرہ یعنی مانورک و بہندوی منترہ گویند۔''

کت: تخت ہندواں باشد میان بافتہ۔''

قافلہ: سایہ پرور کہ ہندش نیری گویند۔''

ہفوش: ''چیزیست خوردنی کہ برنج تو کردہ می کوبند و در جامہ بستہ بالائے آب گرم در آوندے مہر کردہ و مقدارے دراں سوراخ کردہ میدارند۔ از بخار آں پختہ میشود۔ ہندش بھاکر نامند۔''

(منقول از موید الفضلاء)

میں انہی نمونوں پر اکتفا کرتا ہوں جن میں سے نصف آج ہم نہیں سمجھتے۔ مولانا کی تحریک اس قدر مبارک ہوئی کہ ان کی تقلید میں اور لوگوں نے فرہنگیں لکھنی شروع کیں۔ چنانچہ مولانا رفیع المعروف بہ حاجب

خیرات نے 773ھ میں ''دستور الافاضل'' اور ملا رشید برادر جامع ''شرف نامہ منیری'' نے ''زفان گویا'' قاضی بدر الدین محمد دہلوی نے 822ھ میں ''ادات الفضلاء'' 873ھ میں محمد بن داؤد شادی آبادی شارح خاقانی و انوری نے ''مفتاح الفضلاء'' مولانا ابراہیم بن قوام فاروقی نے رکن الدین باربک شاہ 864ھ و 879ھ کے زمانے میں ''شرف نامہ منیری'' مولانا محمود بن شیخ ضیاء نے 916ھ میں سکندر لودھی کے نام پر ''تحفۃ السعادت'' وغیرہ تصنیف و تالیف کیں۔ ان کے علاوہ طب میں ''حقائق الاشیاء'' ''قنیۃ الطالبین'' از قاضی شاہ ''موائد الفوائد'' ''لسان الشعراء'' ''فوائد الفضلاء'' بھی اہم تالیفات ہیں جن کے زمانوں اور مصنفین سے ہم ناواقف ہیں۔ ہماری دلچسپی کا سامان جو ان فرہنگوں میں ہے' یہ ہے کہ ان میں سے اکثر مصنفین نے فارسی الفاظ کی شرح کے وقت ہندی مرادفات بھی دے دیے ہیں اور یہ التزام قریب قریب تمام مصنفین نے کیا ہے' جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان ایام میں ہندی کی طرف ایک عام رجحان ہو گیا تھا۔ وہ ہر غیر معمولی لفظ کا ہندی مرادف دے دیتے ہیں۔ اگر موجود نہیں ہے تو واضح کر لیتے ہیں۔ یہ عمل طبی تالیفات میں زیادہ تر مشاہدے میں آتا ہے۔ میں اس کو کسی قدر واضح کرنا چاہتا ہوں۔ زبان کی ارتقائی تعمیر میں ایک اصول یہ بھی ہے کہ وہ دوسری زبان کے الفاظ کو یا تو بعینہٖ لے لیتی ہے یا ان کا ترجمہ کر لیتی ہے۔ اس کی مثال میں لفظ ''آذان الفار'' ہم لیتے ہیں۔ آذان الفار ایک بوٹی ہے جس کے پتے زمین پر پھیلے ہوتے ہیں۔ شاخیں باریک ہوتی ہیں اور پتوں کی شکل چوہے کے کانوں کے مشابہ ہوتی ہے۔ اس مشابہت کو دیکھ کر حکماء نے اس کا نام آذان الفار رکھ دیا۔ فارسی والوں نے اس کا ترجمہ مرزنگوش کر لیا۔ فارسی میں مرزن چوہے کے معنوں میں آتا ہے۔ حکماء کو ہندی میں اس لفظ کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے وہی اصول اختیار کر کے اس کا ترجمہ ''موساکنی'' کر لیا۔ اب موساکنی اب سے پانسو سال پیشتر ہندی میں مستعمل ہو رہا ہے۔ متاخرین یا تو یہ ترجمہ بھول گئے یا کسی اور مصلحت کے زیر اثر موساکنی کو چوہہ کنی کہنے لگے۔ اسی طرح اظفار الطیب ہے جسے فارسی میں ناخن پریاں اور ہندی میں جھیہ کہر اور نکھ کہتے ہیں۔ یہاں ناخن کی رعایت تینوں زبانوں میں موجود ہے۔ اسی قیاس پر بصاق القمر کا ہندی ترجمہ ''چندر کانت'' کیا گیا۔ بصاق لعاب و کف دہن کو کہتے ہیں۔ کانت کے معنی مجھے معلوم نہیں' لیکن قیاس چاہتا ہے کہ بصاق کا ہم معنی ہوگا۔ اسی قیاس پر ''متروگربہ'' اور ''حادہ گربہ'' کا ترجمہ ''بلائی لوٹن'' اور ''بلی لوٹن'' کیا گیا ہے۔ زبد البحر فارسی میں کف دریا' ہندی میں سمندر پھین اور پنجابی میں سمندر جھگ اسی اصول پر مبنی ہے۔ اس قسم کی بیسیوں اور مثالیں بتائی جا سکتی ہیں۔

یہ امر یاد رہے کہ یہ فرہنگ نگار جس چیز کو ہندی کہتے ہیں وہ نہ برجی ہے نہ پنجابی' نہ راجستانی اور نہ بنگالی و گجراتی۔ ہندی سے ان کی مراد یہی اردو ہے جو اس عہد کے مسلمانوں میں بالعموم رائج تھی۔ اس نے ان بعید زمانوں میں بھی اسی قدر ترقی اور وسعت اختیار کر لی تھی کہ پنجاب' بنگالہ' گجرات اور ہندوستان میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس کی دلیل ہمارے پاس یہ ہے کہ مذکورہ بالا فرہنگ نویس باوجودیکہ مختلف مقامات ہند

سے تعلق رکھتے ہیں' کوئی مالوہ کا ہے کوئی بنگالہ کا اور کوئی پنجاب کا' جہاں مختلف زبانیں بولی جارہی ہیں اور ان لوگوں کا اپنے اپنے وطن کی زبانوں سے واقف ہونا بھی لازمی ہے' لیکن اپنے لغات میں وہ وطنی زبانوں کے الفاظ نہیں دیتے بلکہ اسی عام زبان کے جو تمام ملک کے مسلمانوں میں مشترک ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ الفاظ ان تمام لغات میں عام ہیں۔ یہ خیال نہ کیا جائے کہ چونکہ فرہنگ نویس ایک دوسرے سے نقل کرنے کے عادی ہوتے ہیں' اسی لیے یہ الفاظ ان لغات میں عام ہوگئے ہیں۔ اس خیال کی تردید نہایت آسانی سے کی جاسکتی ہے۔

ان ہندی الفاظ کے ذخیرے میں بعض ایسے بھی نظر آتے ہیں جو اگرچہ اصلاً فارسی ہیں' لیکن فارسی والوں نے ان کو متروک قرار دے دیا ہے مگر چونکہ اردو میں برابر استعمال ہوتے رہے ہیں' اس لیے فارسی خوانوں نے ان کا شمار ہندی الفاظ میں کرلیا ہے یا بعض وجوہ سے ہندی میں انہوں نے دوسرے معنی پیدا کر لیے ہیں۔ بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جو فارسی خوانوں نے ہندوستان میں ایجاد کیے' لیکن فصحا نے ان کو تسلیم نہیں کیا اور فارسی سے خارج کردیے' مگر چونکہ عام رواج میں تھے' اسی لیے انہیں ہندی تسلیم کرلیا گیا۔ یہاں چند مثالیں دی جاتی ہیں:

انگشتانہ لازمی طور پر فارسی لفظ ہے جو انگشتوانہ سے بنا ہوگا۔ وہ لوہے کی ایک ٹوپی ہے جس کو درزی سوئی کے زخم سے محفوظ رہنے کی خاطر سیتے وقت انگلی میں پہن لیا کرتے ہیں۔ ایرانیوں نے اس کے لیے اور لفظ وضع کرلیے۔ مثلاً ''انگشت دان'' اور ''آہن آشیان'' وغیرہ۔ آخری لفظ کی تشریح میں صاحب ''موید الفضلاء'' کہتے ہیں:

''در ہندی انگشتانہ گویند۔''

ظاہر ہے کہ اس ہندی سے مصنف کی مراد بھاشا اودھی زبانیں وغیرہ نہیں ہیں' بلکہ اردو جس کا قدیم نام ہندوی ہے۔ گویا اردو بولنے والوں میں یہ لفظ اس کثرت کے ساتھ استعمال ہو رہا تھا کہ فارسی خوانوں نے اس کو ہندی تسلیم کرلیا۔

لفظ ''کماس'' کی شرح میں مصنف مذکور کہتے ہیں:

''کوزہ گرد دہن بر کماس کشت از چوب وسفال وجز آں کہ زیر بغل آویزند۔
اکثر درویشاں وشباناں دارند۔''

وہ اس تشریح پر قناعت نہیں کرتے بلکہ آخر میں اضافہ کرتے ہیں کہ:

''اہل ہند آں را جگول گویند۔''

ہم جانتے ہیں کہ جگول فارسی لفظ ہے۔ وہ فارسی میں جب بھی مستعمل تھا اور اب بھی' لیکن چونکہ جگول ان کے زمانے میں اردو بولنے والے کثرت سے استعمال کرتے تھے' اس لیے انہوں نے اس کو اردو کا لفظ مان لیا۔

یہی مصنف ''بارگیر'' کے معنی بیان کرتے وقت کہتے ہیں:

''در قنیۃ الطالبین بمعنی هودج است کہ آں را عماری نیز گویند و ہندا نباری۔''

عماری عربی لفظ ہے۔ جاہلوں نے بگاڑ کر اس کا انباڑی بنالیا۔ اردو میں آج بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

ایک اور لفظ ''قلاب'' کی شرح میں تحریر کرتے ہیں:

''کنیزک۔ ہندش بردہ گویند۔''

مصنف موصوف بددل کے معنی ہدی میں ''کاہل'' بتاتے ہیں' حالانکہ کاہل عربی میں سستی کے معنی دیتا ہے' لیکن اردو میں وہ بزدل اور نامرد کے مفہوم میں آنے لگا۔ اس کی تائید دکنی ادبیات سے ہوتی ہے' جس میں کاہل فی الواقع بزدل کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ محمد امین دکنی:

تو ہم اک باگ کو ماریں یہ دس مل ہموں کو کیا تمیں بوجھے ہو کاہل

صاحب ''موید الفضلاء'' خیزران کے ذکر میں لکھتے ہیں:

''چوبے است' ہندش بیت گویند۔''

بیت در حقیقت فارسی بید کی بگڑی شکل ہے جس طرح سے پلید سے پلیت اور مدد سے مدت بنے ہیں۔ علیٰ ہذا لفظ روپاک ہے جسے اردو میں رومال کہتے ہیں۔ اس لفظ کی ترکیب فارسی ہے مگر ایرانی اسے تسلیم نہیں کرتے۔ یہی حالت لنگی کی ہے۔

اب جس زبان میں انگشتوانہ کو انگشتانہ' کماس کو کجکول' عماری کو انباڑی' روپاک کو رومال' کنیز کو بردہ' خیزراں کو بیت' پلید کو پلیت' مدد کو مدت اور لنگ کو لنگی کہا جاتا ہے' اردو کے سوا وہ کوئی اور زبان نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ہمیں یقین کر لینا چاہیے کہ اردو ان ایام میں موجود تھی اور ہندوستان کے ہر صوبے میں جہاں جہاں مسلمانی اثرات تھے' بولی اور سمجھی جاتی تھی اور تغلقوں کے دور سے پیشتر ہی مکمل ہو کر ایک حالت پر قائم ہو گئی تھی۔ سیدوں اور پٹھانوں کے دور میں جب دیسی زبانوں میں شاعری کا چرچا ہوا' اردو میں بھی گجرات و دکن میں شاعری شروع ہو گئی۔ ان ایام میں جو اس زبان کی رفتار دیکھی جاتی ہے' اس سے گمان ہوتا ہے کہ اگر مغلوں کا حملہ ہندوستان میں خلل انداز نہ ہوتا تو اردو بہت جلد سرکاری اور درباری زبان بن جاتی اور اس میں تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ جیسا کہ دکن و گجرات میں دیکھا جاتا ہے' شروع ہو جاتا' لیکن مغلوں کی آمد نے اس زبان کی بڑھتی امیدوں کو دو ڈھائی صدی کے لیے ملتوی کر دیا۔ ایرانی عنصر جو امرا اور عمال کی صورت میں پھیل گیا' اس نے ایک مرتبہ اور فارسی کے ٹمٹماتے چراغ کی بتی اکسا دی اور تیل ڈال دیا اور ملک میں ایک مرتبہ اور فارسی کا دور دورہ ہو گیا۔

میں یہاں مذکورۂ بالا لغات سے ان ہندی الفاظ کے نمونے سپردِ قلم کرتا ہوں' لیکن یہ یاد رہے کہ میں نے ان کتابوں کو ''شرف نامہ احمد منیری'' کے سوا بچشمِ خود نہیں دیکھا ہے کیونکہ یہ تمام کتابیں قلمی اور نایاب

ہیں اور اسلاف کے ذہنی و عملی کارناموں سے ہماری بے خبری ایک ایسا پُر درد افسانہ ہے جس کے دوہرانے کی مجھ کو یہاں فرصت نہیں۔ ملک میں ایک بھی کام کا کتب خانہ نہیں۔ ہمارے محترم معاصر جب کہ لاکھوں روپیہ انگریزی کتب خانوں کے بنانے میں صرف کر دیتے ہیں' مشرقی کتابوں اور مشرقی کتب خانوں پر ایک پیسہ خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جن بزرگوں کے ہاں بدبختی سے یہ کتابیں مقید ہو گئی ہیں' وہ زروزاری کی پرواہ نہیں کرتے اور ان کے دکھانے تک کے روادار نہیں۔ نہ خود ان سے فائدہ اٹھانے کے اہل ہیں اور نہ دوسروں کو ان سے افادے کا موقع دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں کی یادگار ہیں' لیکن جس مجرمانہ غفلت سے بزرگوں کی یہ یادگاریں رکھی جاتی ہیں' ناگفتہ بہ ہے۔ دیمک اور چوہے ان کو چاٹتے ہیں اور جب وہ چیزیں دنیا کے کسی مصرف کی نہیں رہتیں' کنوؤں میں پھینک دی جاتی ہیں' دریاؤں میں بہادی جاتی ہیں یا نذر آتش کی جاتی ہیں اور یہ آخری حشر ہوتا ہے ان بزرگوں کی یادگاروں کا۔ خدا رحم کرے ہماری اس جہالت پر جس کے طفیل ہزاروں نسخے سالانہ برباد ہو رہے ہیں۔

اگرچہ اصل لغات میری نظر سے نہیں گزرے ہیں' لیکن کتاب ''موید الفضلاء'' 925ھ جس کو نول کشور نے چھاپ دیا ہے' میرے زیر نظر ہے۔ اسی کی سند پر میں نے ''فرہنگ نامہ' قواس'' کے بعض الفاظ گذشتہ سطور میں نقل کیے ہیں اور اسی کی سند پر ''ادات الفضلاء'' ''زفان گویا'' اور ''قنیۃ الطالبین'' سے استفادہ کیا ہے۔ ''شرف نامہ احمد منیری'' اور ''ریاض الادویہ'' سے براہ راست استفادہ کیا ہے' لیکن مجھ کو شبہ ہے کہ ''موید الفضلاء'' میں کسی غیر مصنف نے ہندی الفاظ کی قدیم شکلوں کو بدل کر موجودہ یا اس کی قریب کی شکلوں میں لکھ دیا ہے۔ مثلاً گھر گھت کا گرگٹ یا لکھری کا لکڑی بنا دیا ہے۔

''ادات الفضلاء'' از قاضی بدرالدین دہلوی تالیف 822ھ:

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
اسکوب	چھت	آفتاب پرست	گھرگت	اونج	لہسوڑہ
آزخ	ماسہ	اید	بھال	آونگ	ملگنی
ادات	مور	تابول	تنبول	تخم کتان	السی
تلی	بھاندی	ورائے	گھنٹی		

''زفان گویا'' از مصنفات ملا رشید پدر ابراہیم برادر جد'' جامع شرف نامہ احمد منیری'':

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
آہن ربا	کانک	ازنب	برچھین	اظفار الطیب	جتھیہ کھر
اسرب	سیسا	آبرود	باچھڑ	آس	مورلر
استرش	پچال	تختۂ استرش	تل	بادبر	پھرکی

بوق	پھیر	بادرد	ہری	پیازک	لوند
پرنگ	پیتل	پالاوان	ہانکہ	پنجپایہ	کیکرہ
جوزبا	جاہپل	جوپلیں	اونتی	چقندر	دیدس
چارمغز	اکروت	چکاچک	چکر	حرزون	سنکہ
خیارچنبر	باندرپوری	خرچوک	بھتیل وکچری	درخت سفتہ	بھنور

''قنیۃ الطالبین'' قاضی شاہ ابن باب

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
آسیب	دبکھ	اسفاناخ	پالک	الہد	بندی
اشخار	ساجی وکھار	انبیر	سنداسی	ابہل	ہوبیر۔ کنکول مرچ
ام غیلاں	جوانسہ	ایہقان	ترمزا	آذرگوں	سورج مکھی
اویش	سانتھ	بھدب	پیٹھا۔ کھنڈ	بنج	بنج وباتورہ
بوتیمار	بگ وبگلا	بیدانجیر	ارند	بادبرنگ	بادبھرنگ
باطن (کذا)	کھنہ	بلطان	چولائی	پلپل	پلپل ومرچ
پوپل	سپاری	پایدام	پاسی	پرازدہ	پیڑا
تغارہ	کھترہ	تختہ گوئی	لٹو بھونیرا (بھوزیا)	شجب کافور	کاکڑا سینگی
جمرج	جاکلہ	جیود	تاڑ	جامہ غوک	کائی
جعدہ	بھنگرہ	جبہ	جوگ درپ	جبیہ	کٹاری
چشپیرہ	چچنہ	خلہ چوب	گروال	خراد	کوپل
خر	گدھا	خزیر	بھوبل	خرف	نکھ۔ نکھوتری
خربق	سرسوں	خارمغیلاں	کگر	دلبل	بابلہ
دوامہ	لٹو	دبہ	کوپا		

''شرف نامۂ احمد منیری'' 864ھ و 879ھ از ابراہیم قوام فاروقی

یہ کتاب ''قنیۃ الطالبین'' مذکورہ صدر سے اقدم ہے۔ اس کے مؤلف مولانا ابراہیم فاروقی بنگالہ کے رہنے والے ہیں۔ اس فرہنگ کی تالیف میں انہوں نے زفان گویا' ادات الفضلاء' فوائد الفضلاء' اصطلاحات شعر' لسان الشعراء' لغت فرس اسدی' موائد الفواد' صحاح' تاج الاسامی' تبیان' عجائب البر والبحر' عجائب البلدان' تاریخ طبری' تحفۃ العراقین' رسالۃ النصیر' برک نامہ' روضۃ الانوار' نفحۃ الریحان' فاتحۃ القلوب'

دیوان الادب، جمال حسینی وغیرہ سے امداد لی ہے۔ اس کے علاوہ زندہ لوگوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مثلاً امیر زین الدین ہروی المخاطب بہ فتح خان جو اس عہد میں ملک الشعرائے بنگالہ تھے اور محمد شیرازی اور شیخ واحدی وغیرہ۔

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
آسا	جھبوائی	آہن ربا	جوبک	الوا	کھوکتوا
آسیب	دبکہ	آفتاب پرست	گھراگیت	آہن جفت	بھالہ
اردی بہشت	چیت	اولنج	لبھورہ	آزخ	مسا
اسپناخ	پالک	انگزوانگوزہ	ہینگ	اشترخوار	جواسہ
اکار (باغبان)	کوری	آہک	چونہ	استرنگ	لکھمناں
آونگ	ملکنی	ارزن	چینہ	آغشتہ	موتھہ
بنانج	سوکن	بادبر۔ بادفرہ	لثوہ	بلادر	بھلاوہ
بندش	گالہ	بنوماش	منگ	بناغ	ککری
بروک (چیستان)	بہیلی	بساک	سہرہ (سہرا)	بورک	کھنکھندی
بجرک	کرہ (گرہ)	بشنگ	نہالی	بان	بکنہ
بکران	کھرچینی (کھرچن)	باختہ	کھجوا (کچھوا)	تیک	گھن
پنج پایک	کیکرہ	پنگان	تھال	پاتلہ	کراہی
پلہ	ہلاس	پیچہ (لبلاب و عشقہ)	اکاس بیل	تختہ بند	پتی
ترترک	ممولا	تورک	لولی	تسمہ	پاتی
تشی	ساہی	جامہ خوک	سوال	جوال	لون (گون؟)
جالی	پیلو	چغندر	گانگلو	چارمغز	اکھروت
جلانک	کیرورہ	چویلین	اوتنی	چوبیہ	بلائی
جغانہ	سرمندلی	چوبہ	بیلن	خاکستر	راکھ
خشکامار	جلندھر	خربوزہ	گادر	خزدوک	کیرورہ
خیک	پکھال	خرول	رائی	خفتان	آنگھ (انگا)
خرزہرہ	کنتر	خرفہ	لونک	خرہ	کھل
دروک	گرہی (گرہ)	دولنگ	وساہل	درخت سنبہ	کھتورہ

دغدغہ	کدکدی (گدگدی)	دیوچہ	جوک	درائے	گھانتی
روناس	مجیٹھ	راسو	نیول	رشاشہ	بھوہوی
روے	بھنکار	زرت	جوار	زرنباد	کچور
زغیر	السی	زاک	بھکڑی (پھکڑی)	زغنک	ہچکی
زلہ	جھیکر	زوالہ	پیرہ	سریج	کچیالہ
سخ	کچیالہ	سراغوچ	کونجی	سرند	سوال
سوسمار	گوہ	سلیک	گھن	سنبل	جھر
سندان	نہالی	سارہ	رسوت	سفتہ	ہندی
سکرہ	کلوزن	سقلی	کراہی	شب تاب	جگنی
شلبلیت	میتھی	شکنج	بدھ	شود	شولی
شب بار	جواسہ	شخار	ساجی	شخک	ہچکی
شیردان	کھیری	شمہ	بلائی	طلق	ابھر
غلیج	کروی (گدگدی)	غسک	اودس	غنک	لاتھ
قلہ	پیوی	قولنج	باسور	قزاستر (قلاوز)	چوکی
قرصک	برسولہ	کیلا	کھیلا	کت	کھت (کھاٹ)
کشک انجیر	گولہ	کنار	بیر	کشنیز	دھنیہ
کاغ	جکال	کاکل	کانس	کان	کھان
کلتبین	سنداسی	کاژیرہ	کور	کامہ (بسد)	سوالی
کلاوہ	اتی	غلولہ (حلوئی)	لدروپندی	کلونہ	کونجی
کلوندہ	ککری	کمان گرہ	غلول (غلیل)	کورہ	بھتی
کوفتہ	پلہری	کاسنی	کسنی	کولانج (حلوئی)	لاپڑ
گندر	گاجر	گز	جھاؤ	گوشخارک	کنلالی
گردوں	گدی	گیرہ	جکری	لہفت	گدی
لوس	جھلہ	مشکیں/وفادار (پھول)	جولی (جوئی)	موز	کیلہ

مقناطیس	جومک	مندل	مندلہ	مولو	سنگی
مانچہ	سولی	وشم	بھاپہ	یاقوت سرخ	پدم

"موید الفضلاء" 925ھ

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
آفتاب پرست	کنول	آہن جفت	پھال	گوشت ترنج وبہیہ	بجوریکا گود
آسرنج	سندور	ابجوج	اگر	انگزوانگوزہ	ہینگ
اذان الفار	موساکنی	آبخور	گھاٹ	آیار	سیسہ
اسقر	ساہی	آہار	ماندی۔ کلپ و کھرپ	استرار	مسور
اسپرمور	مورموین	اسپرکاہ	کاندل	اوبر	چھند
ارز	چاتول	ابن عروس	نیول	اصل السوس	ملٹھی
اخینوس	سالک	الماس	ہیرا	اشراش	سریش
الحموط	ستاول	الوا	کنوار	آزاددرخت	بکائن
اسرنج	سندور	اولنج	لیسورہ	ازخ	ماسہ
آزاد	نم (نیم)	اجمود	کھورا جوائن	اسطوخودوس	دہاتورہ
اشترخوار	جانواسہ	آسترنگ	لکھمنان	آونگ	ملکنی۔ الگنی
اسفیل	کندا	اسارون	بندکر	اشلان	مورسوکھا
اشہنہ	چلوہ	اجمودہ	جوائن	آسمانہ	چھتہ
املہ	آتولہ	اہیانہ	تالو	انچہ	دھوکہ
ایلداشہ	ایلاچ۔ الاچی	اسرغ	ہیرادوکھی رنگپات	افرع	گنجہ
انباغ	سوکن	آک	آک۔ مدار	اکلیل الملک	اسپرک۔ کھموی
امک	سکادسیسہ	اراک	پیلو	انارمشک	ناکیسر
انجزک	مروا	انجگک	کھیلا	اربیان	جھینگہ (مچھلی)
اشتان	چوکہ	انمبو	چھوہارا	انگورسیاہ	کالی داکھ
اشنوشیہ	چھینک	الوسیہ	جام	انستہ	موتھ
آہنجہ	ہاتھ	انجرہ	انگن کے بیج	بارنب	سویا

بابونج	ایرم سار۔ سونبھل	بازیچ	پنگبہ	بخار	بھاپ
بازیار	کسان	بلادر	بھلانواں	بزیار	جاوتری
بندش	گالہ	بنوماش	مونگ	بساک	سہرہ
بلوک	چھچہ	بیانک	گوند	بشنگ	نہائی
بادرنگ	رام تلسی	بدول	کاہل	برہھن	لونیا کا ساگ
بکھان	کلتھی	بیخ سوس	ملٹھی۔ چٹھی	بروزن	بازرہ
باقلہ	باکلہ	بلیلہ	بہیڑہ	بوسہ	دونا مروا
بوی	گندہ	بھارنگی	سوند ہاکھر	پتنگ	گھن
پاتلہ	کراہی	پاخرہ	اونبہ	پیشہ خانہ	کھٹ چھپر۔ مسہری
تنگار	سہاگہ	تیر	کری	ترترک	ممولا
ترہ تیزک	بالم۔ چندسور	توزک	لوبیہ	تقویم	پترہ
تسمہ	پاتی	تاکی	دھنیہ	ثقاء	رائی
جدحد	جھینگر	جنبیہ	جمدھر	چوخا	کلتھا
		چقندر	کنگلو		

''ریاض الادویہ'' 946ھ از حکیم یوسفی

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
اثل	اوتھ	شغال	سیال	راسو	نول
سرب	سکہ	اترج	بجورہ	سرگیں گاؤ	گوبر
اوخر	کندپھل	نسیج الکبوت	مکڑی کا جالہ	برنج	چاول
خرگوش	کرمہ	آزاد درخت	درخت نیم	اسفاناخ	پالک
آس	موریوں	آملک	چھلرہ	اظفار الطیب	نکھ
اشنان	لانی	املج	آنولہ	انبہ	انب
بذر کرفش	اجمود	بذر الفرفخ	لونیہ کا بیج	بذر الجزر	گاجر کا بیج
بذر البنج	خراسانی۔ اجوائن	بذر الفجل	مولی کا بیج	بذر الکتان	السی کا بیج
بذر القثد	کھیرہ کا بیج	تخم خیار	ککڑی کا بیج	بذر الریحان	تلسی کا بیج

بذرالشبت	سوئی کے بیج	بسد	مونگا	بستان افروز	کلغا
بسباسہ	جیوتری	ہندوانہ	کلندہ	بلبلیج	بھیرہ
بلادر	بھلاوہ	بندق	ریتھ	بیض	آنڈہ
تربد	نسوت	تمر ہندی	آملی	توتیائے ہندی	ہریا تھوتھہ
پستان	چوچک	ثوم	لسن	جادرس	گنگنی
جدوار	پربسی	ملخ	تدی	جذر	گاجر
جزمارج	مائیں	جوزبوا	جفل	جوزالماثل	دھتورا
جوزالقی	مین پھل	حب النیل	عشق پیچاں کا بیج۔ سمندر سوک	حب القطن	بنولہ
حب السلوک	جمال گوٹہ	خارخسک	گوکھرو	خضض	بکرہ
حلبہ	میتھی	انگوزہ	ہینگ	نخود	چنہ
حمام (کبوتر)	پریوہ	حمار	گدھا	حنظل	تماں
حنا	مہدی	گندم	گیہوں	خبازی	سونچل کا بیج
خمر	روتی	خروع	آرنڈ	خراطین	کیچوہ
خفاش	چمگوودری	خیار	کھیرہ	خیارزہ	کھکھری
دارچینی	تج	ماکیاں	کوکری	دخان	دھوآں
خون	لوہو	روغن کنجد	مینہ تیل	نگس	ماکھی
طلا	سونہ	بادیان	سونف	راتینج	رال
مسکہ	مکھن	زرنیخ	ہرتال	زرنب	سینتی
زعفران	کیسر	زنجبیل	سونٹھ	سیماب	پارہ
سازج	پترج	ساج	سال	سپستان	لسورہ
کوکنار	بیر	سرطان	کیکرہ	سعد	موتھ
سلخ الحیہ	کانچلی	سنگ پشت	کچھوہ	ماہی	مچھری
سنبل الطیب	چھر	گربہ	بلائی	موی	بال
شونیز	کلونجی	صدف	سیپ	صمغ	گوند
صندل ابیض	اوجلہ چندن	صندل احمر	رکت چندن	پنٹول	سیہ
غوک	میدکی	طاؤس	مور	طباشیر	پنسلوچن

سپرز	تلی	سم بز	بھیڑ بکری کے کھر	عدس	مسور
کنجشک	چڑیا	عظم	ہاڈ	عفص (ماذو)	ماجوپھل
عقرب	بچھو۔ اٹھوہ	عنب الثعلب	مکو	عود	اگر
غزال	ہرن	فاختہ	تتکی	موش	چوہیہ (چوہا)
ترب	مولی	فضہ	روپا	تخم کرفس	اجمود
فلفل اسود	مرچ	فوفل	سپاری	فوہ	مجیٹھ
فیل	ہاتھی	قاقلہ	الاچی	قرنفل	لونگ
قسط	کٹھ	نیشکر	گنا	قصب	بانس
قطن	روئیں	زاک زرد	کاہی	قلط	کلتھ۔ موتھ
اشخار	ساجی	خارپشت	جنگلی چوہا	کبریت	گندھک
جگر	کلیجہ	کرفس	اجمود۔ کلاوہ	کراث	گند
کرکی	کونج	کرک	گینڈہ	کرش	اوجری
کشنیز	دھنیا	کلیہ (گردہ)	بوکر	کہربا	کپور
شیر	دودھ	گوشت	ہیرہ	قوج	مینڈھا
مروارید	موتی	الماس	ہیرہ	آب	پانی
مرزنجوش	مروہ	زہرہ	پت	مقل ازرق	کوکل
نمک	لون	موز	کیلہ	جوز ہندی	ناریلیل۔ جیبری
نخالہ	بھوس۔ بورہ	نمل	چینٹی۔ چیونٹہ	نیلوفر	کول پھول
		ورد	پھول		

پنجاب میں اردو

''پنجاب میں اردو'' اردو زبان کی تاریخ میں ایک نیا باب ہے جس کا اب تک کسی نے مطالعہ نہیں کیا ہے۔ خود اہل پنجاب بھی عموماً اس سے بے خبر ہیں اور اسی ناواقفیت کی بنا پر فی زمانہ پنجاب میں یہ عقیدہ لوگوں کے دلوں میں قبولیت حاصل کر رہا ہے کہ ''پنجاب پر اردو کا کوئی حق نہیں ہے۔ سکھ گردی کے بعد جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور آیا' کمپنی کے انگریزی اور ہندوستانی عہدیداروں نے اس اجنبی زبان کو مدارس و دفاتر میں داخل کر کے رواج دے دیا۔'' یہ رائے ان نوجوانوں کی ہے جن میں اور اوصاف کے علاوہ وطن پرستی کے جذبات بیدار ہیں۔ یہ خیال کسی حد تک غلط ہے۔ اوراق آئندہ کے مطالعے سے کافی واضح ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو جس طرح ہندوستان کے اور صوبوں میں' اسی طرح پنجاب میں برابر بولی اور سمجھی جاتی رہی ہے۔ پنجاب سلطنت اسلامی کا ایک جزو تھا اور سلطنت کا صوبہ ہونے کی حیثیت سے اردو کو یہاں اسی قدر دخل حاصل تھا جیسا کہ سلطنت کے اور صوبوں میں۔ قدیم زمانے سے یہ زبان اسی صوبے میں کم وبیش رائج رہی ہے۔ اردو کے لیے اہل پنجاب کی طبعی مناسبت اور قدیم اردو پر پنجاب کا اثر دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اردو پنجاب کے کسی خطے یا ضلع کی زبان تھی؟ اس سوال کا کوئی قطعی جواب ہمارے پاس موجود نہیں' لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ پنجابی اور اردو میں ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں قریب ترین مماثلت موجود ہے۔ ان کی صرف ونحو اہم قواعد و مسائل میں باہم مطابق ہے اور ساٹھ فیصدی سے زیادہ الفاظ ان میں مشترک ہیں۔ مزید برآں جن امور میں یہ زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں' ان میں ہمیں اضافت کو بھی محسوب کرنا چاہیے۔ مثلاً اردو کی اضافت ''کا'' ''کے'' ''کی'' کے بجائے پنجابی میں ''دا'' ''دے'' اور ''دی'' آتا ہے' اگرچہ تصرف میں دونوں زبانیں متفق ہیں۔ گویا کاف اردو کے ساتھ اور دال پنجابی کے ساتھ مخصوص ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی اضافت ایک زمانے میں پنجاب میں رائج تھی۔ اس کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم دستاویز موجود نہیں' لیکن جب ہم پنجاب کے دیہات و قصبات پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بیسیوں موضعوں اور قصبوں کے نام کے ساتھ وہ جزو کلمہ بن رہی ہے۔ مثلاً ڈسکا' فاضلکا' امروکا' لتھرکا' مٹھنکا' ویکا' جاکے' جنڈوکے' خانکے' کالے کے' کاموکے' بجن کے' ابھوکے' ماچھی کے' منجوکے' مریدکے' سادھوکے' دہرکے' چیچہ کی ملیاں' بدوکی' اورکی' چنوکی' تارکی' خان کی' جھام کی' کیموکی' رحیم کی

چوپڑی وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے نام پنجاب میں کثرت کے ساتھ ملتے ہیں۔ یہ امر ظاہر ہے کہ جس تیزی سے زبان بدلتی ہے' اس تیزی کے ساتھ ملک کے جغرافیائی نام نہیں بدلا کرتے' اسی لیے ان مقامات کے ساتھ اردو کی اضافت کا موجود ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اضافات پنجاب میں قدیم الایام سے ہیں اور ایک وقت استعمال میں آ رہی تھیں' لیکن جب موجودہ پنجابی کی لہر آ کر ملک پر چھا گئی' پرانی زبان کا شیرازہ بکھر گیا۔ یہ بھی یاد رہے کہ یہ اضافات نہ صرف جغرافیائی اسما میں ملتی ہیں بلکہ اور الفاظ میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً پیکا' باپ کا گھر' اس کا مرادف میکا جس کی ترکیب بھی وہی ہے' اردو میں مستعمل ہے۔ نانکا' ننھیال' دادا کا ددھیال۔ ان میں تصریف بھی ہوتی ہے یعنی پیکے' نانکے' دادکے۔

ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم اردو زبان زیادہ تر پنجابی اثرات میں ہے' یعنی آج جن باتوں کی تشریح سے اردو عاجز ہے' پنجابی زبان آسانی کے ساتھ ان کی تشریح کر سکتی ہے۔ اس قسم کی متعدد مثالیں گذشتہ اوراق میں دی جا چکی ہیں۔ یہاں ایک اور مثال دیتا ہوں۔

رسالہ ''معراج العاشقین'' مولانا عبدالحق صاحب بی۔ اے۔ آنریری سیکرٹری انجمن ترقی اردو نے تاج اردوئے قدیم میں شائع کیا ہے۔ یہ رسالہ حضرت صدر الدین سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نواز متوفی 825ھ کی طرف منسوب ہے اور اردو کا غالباً قدیم ترین نمونہ ہے۔ اس رسالے میں ایک فقرہ آتا ہے:

> ''دوسرا تن ممکن الوجود۔ اس کا نگہبان اسرافیل۔ نفس لوامہ' حواس خمسہ ممکن کی آنک سوں غیر نہ دیکھنا سو۔ غفلت کے کان سوں غیر نہ سننا سو۔ وسواس کے نک سوں بدبوئی نہ لینا سو۔ تجلی کی زبان سوں غیر نہ بولنا سو۔ مغروری کی شہرت کوں غیر جا نہ دوڑانا سو۔ غفلت ہور غضب ان پانچہ خواص کا' مراقبہ کرنا پیر کے ممکن کا مشاہدہ قائم کرنا۔ ذکر قلبی کو شریعت کے کانسے میں پلایا۔''

اس فقرے میں مصادر کے آخر میں سو کا استعمال نہایت عجیب ہے اور اردو زبان اس کی تشریح سے قاصر ہے۔ اب اسی ''سو'' کا استعمال پنجابی میں آج بھی موجود ہے' جو ضمیر غائب کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ مثلاً ''جاناسو'' اسے جانا (ہے) ''کیتوسو''۔ اس نے کیا (ہے) یہی مفہوم مذکورۂ بالا فقرے میں ہے۔ ان امور سے ظاہر ہے کہ پنجابی اور اردو کے تعلقات ایک دوسرے کے ساتھ بہت گہرے ہیں۔

شمالی ہندوستان میں جس میں دہلی بھی شامل ہے' اردو کی قلمی یادگاریں گیارہویں صدی ہجری سے قدیم نہیں ملتیں اور تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ پنجاب میں بھی اسی صدی سے تالیفات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پنجاب میں مولانا عبدی کی تصنیف رسالہ ''فقہ ہندی'' سب سے قدیم ہے جو 1074ھ میں بعہد اورنگزیب عالمگیر لکھا جاتا ہے۔ عبدی کی تحریک' ہمارا خیال ہے' برابر جاری رہی ہے لیکن محمد شاہی دور تک کسی اور تالیف کا سراغ نہیں چلتا۔ ان ایام میں قصبۂ بٹالہ میں شیخ محمد فاضل الدین کے ہاتھوں اس تحریک کو بہت

تقویت ملتی ہے۔ ان کے فرزند غلام قادر مثنوی ''رمز العشق'' کے مصنف ہیں۔ صوفی حلقوں میں یہ مثنوی بہت مقبول رہی ہے۔ نہ صرف اس کی شرح لکھی گئی ہے' بلکہ اس کی تقلید میں فقیر اللہ مثنوی ''دُرِّ مکنون'' 1004ھ میں لکھتے ہیں اور میاں نور محمد المعروف بہ میاں بھیل ولد میاں تھو مثنوی ''فتح الرمز'' 1250ھ میں تصنیف کرتے ہیں۔

ریختہ کی طرز کی نظموں میں سب سے قدیم ریختہ فرید الدین گنج شکر متوفی 664ھ کی طرف منسوب ہے۔ علاوہ بریں بعض اردو فقرے بھی ملتے ہیں۔ ان کے بعد شیخ عثمان اور شیخ جنید اور منشی ولی رام کے ریختوں کی باری آتی ہے جو گیارہویں صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔ بارہویں صدی ہجری کی متفرق نظموں میں زیادہ تر صوفیانہ نظمیں داخل ہیں' جن میں سے اکثر حضرت غوث الاعظمؒ کی شان میں ہیں۔ ایسی نظمیں چونکہ کثیر تعداد رکھتے ہیں' بارہویں صدی ہجری کی متفرق نظموں میں زیادہ تر صوفیانہ نظمیں داخل ہیں' جن میں سے اکثر حضرت غوث الاعظمؒ کی شان میں ہیں۔ ایسی نظمیں چونکہ کثیر تعداد میں ملتی ہیں' اس لیے میں نے صرف چند انتخاب کر لی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان زیادہ تر خانقاہ نشینوں کی گود میں پلی ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان بزرگوں کا تعلق زیادہ تر عوام سے تھا۔ دیسی اور پردیسی ان سے فیض کے طالب تھے۔ لوگ دور دور سے اپنی مرادیں لے کر ان کے پاس جاتے تھے' اس لیے ملکی زبان کا جاننا' اس میں بات چیت کرنا ان کے لیے ضروری تھا' دوسرے صوفی پیشہ لوگ اکثر سیاح اور جہاں گرد ہوا کرتے ہیں اور اردو ان ایام میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں بولی جاتی تھی' اس لیے سیاحوں' صوفیوں اور سپاہیوں کے لیے اس زبان کا جاننا از بس ضروری تھا۔

دیکھا جاتا ہے کہ یہ نظمیں اکثر اوقات الم خیز اور فریاد مندانہ ہیں اور مصرع:

سنو پکار دکھی کی ایا شہ جیلاں

کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ ان زمانوں کے سیاسی انقلابات میں مضمر ہے جو پنجاب میں رونما ہو رہے تھے۔ ان کے اوزان بسا اوقات ہندی ہیں یا ایسے ہیں جو قدیم سے ہندی خوانوں نے فارسی سے لے لیے ہیں۔ قافیہ ان میں چنداں ضروری نہیں ہے اور مربع و مخمس کی شکل میں ہیں۔

تغزل' دہلی مرکز کے قیام کے بعد پنجاب میں دیر سے پہنچتا ہے' جس کے اثر میں فارسی بحور و جذبات پنجاب کی نظموں میں روشناس ہوتے ہیں۔ اگرچہ ایہام گوئی جس پر دہلی کی ابتدائی شاعری کا دارو مدار تھا' یہاں کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔ پنجاب نے اپنے ادبی تعلقات دہلی و دکن سے سیاسی مصائب کے باوجود برابر قائم رکھے ہیں۔ سید بلاقی' ولی اورنگ آبادی' سراج دکنی' شاہ آبرو' فغاں' اشرف وغیرہ سے یہاں کے باشندے نہ صرف واقف ہیں' بلکہ اسی شوق و ذوق کے ساتھ پڑھتے ہیں' جس طرح نظامی' سعدی اور حافظ کو پڑھتے ہیں۔ اس عہد کی بیاضیں ان شعراء کے کلام سے پُر ہیں۔ سید بلاقی کا مولود نبیؐ بے حد مقبول تھا۔ اس

کے کئی نسخے میری نظر سے گذرے ہیں۔ محمد افضل کا بارہ ماسہ کمال شوق سے پڑھا جاتا تھا اور ولی کا کلام بڑے اشتیاق کے ساتھ لوگ پڑھتے تھے۔

1188ھ میں رنجیت سنگھ کا دادا چڑت سنگھ بسنتی ندی کی جنگ میں اپنی بندوق کے پھٹنے سے مارا جاتا ہے اور ہمیں سخت تعجب ہوتا ہے کہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ نامدار خاں دت اس کا مرثیہ اردو زبان میں لکھتا ہے۔ سکھوں کی تاریخ میں اردو صرف اسی موقع پر نمودار نہیں ہوتی بلکہ اس تاریخ سے دس سال بعد جب جے سنگھ (کینہ مثل) کا اکلوتا فرزند گوربخش سنگھ عین میدان جنگ میں گولی کے زخم سے ہلاک ہوتا ہے (اس کی بیوی سدا کور نے اپنی بیٹی بعد میں رنجیت سنگھ کو بیاہ دی) ہم دیکھتے ہیں کہ محمد غوث بٹالوی گوربخش سنگھ کا مرثیہ اردو میں لکھتا ہے۔

پنجابی شاعروں اور ناظموں کے متعلق جو اطلاع آئندہ اوراق میں درج ہے' زیادہ تر عام شائقین کی بیاضوں سے حاصل کی گئی ہے۔ اس لیے یہ اطلاع مختصر' ناکافی اور غیر متعین ہے۔ ان کے زمانوں کے متعلق بھی ضرورتاً قیاس و احتمال سے کام لیا گیا ہے۔ ان کے تقدم و تاخر کی بابت بھی نکتہ چینی کی گنجائش ہے اور یہ خامیاں اس لیے ہیں کہ اس خاص مضمون پر اطلاع حاصل کرنے کا بظاہر کوئی ذریعہ معلوم نہیں ہوتا۔ پنجاب میں بدقسمتی سے اس وقت کوئی جامع کتب خانہ موجود نہیں ہے اور نہ اب تک اہل پنجاب کو مشرقی کتب خانہ بنانے کا احساس ہوا ہے۔

آخر میں چند کلمات ان بزرگوں کی زبان دانی کے متعلق بھی کہنے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے کلام کو جانچتے وقت ہمیں اپنے زمانے کے معیار تنقید سے کام نہیں لینا چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ یہ لوگ پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں' جہاں اردو مادری زبان نہیں ہے اور ایسے ڈیڑھ' دو سو سال پہلے خود اردو کا معیار مختلف تھا۔ میں مانتا ہوں کہ ان کے خیالات بلند نہیں ہیں' اور نہ زبان با محاورہ ہے اور اکثر حالات میں پنجابی لہجہ غالب ہے' تاہم ان کے مطالعے سے ہمارا مقصد شاعری سیکھنا نہیں ہے بلکہ صوبہ پنجاب میں اردو کی نشوونما اور اس کی ترقی کا مطالعہ کرنا ہے۔ خود اردو کے قدیم اساتذہ میں آج جو ہم دلچسپی لیتے ہیں' وہ محض علمی اور تاریخی نقطہ نظر سے ہے۔ ان بزرگوں کے واسطے بھی ہمارا نقطہ نظر یہی ہونا چاہیے۔ اس تمہید کے بعد پنجاب میں اردو کا تبصرہ شروع کیا جاتا ہے۔

شیخ فریدالدین گنج شکرؒ

(متوفی 664ھ)

ساتویں صدی ہجری میں شیخ فریدالدین مسعودؒ ایک عجیب و غریب ہستی ہیں۔ ملتان کے قصبہ کھوتوال میں پیدا ہوئے اور ملتان میں تعلیم پاتے رہے۔ ممالک اسلامیہ میں سیاحت بھی کرتے ہیں۔ مشہور صوفیوں سے ملاقات کرتے ہیں اور دہلی جا کر قطب الدین بختیار کاکی اوشیؒ کے مرید ہو کر پاک پٹن میں سکونت اختیار کر لیتے ہیں اور 664ھ میں اسی مقام پر وفات پاتے ہیں۔ شیخ فارسی اور پنجابی کے شاعر ہیں اور کچھ حصہ ان کے کلام کا اب تک محفوظ ہے' لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اردو بھی بولتے تھے۔ اس قسم کے ان کے کئی فقرے ان کے سوانح نگاروں نے اتفاقیہ اپنی تصنیفات میں نقل کیے ہیں۔ چنانچہ:

مولانا برہان الدین صوفی ابھی خورد سال ہی تھے کہ ان کے والد شیخ جمال الدین ہانسوی مرید شیخ فریدالدین کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی بیوی ''مادر موسناں'' شوہر کی وصیت کے مطابق اپنے فرزند خواجہ برہان الدین صوفی کو لے کر حضرت گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ شیخ نے خواجہ برہان الدین کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کی خورد سالی کا لحاظ نہ کر کے اپنی بیعت میں لے لیا۔ اس پر مادر موسناں معترض ہوئیں اور ہندی زبان میں بولیں:

''خوجا برہان الدین بالا ہے۔''

یعنی کم عمر ہیں۔ شیخ فریدالدین نے ہندوی زبان میں جواب دیتے ہوئے کہا:

''مادر موسناں! پونو کا چاند بالا ہوتا ہے۔''

یہ واقعہ میں نے سید محمد بن سید مبارک کرمانی متوفی 770ھ کی تصنیف ''سیر الاولیا'' سے نقل کیا ہے' جس میں مذکورہ بالا ہندی فقرات بلفظہ درج ہیں۔

ایک روز شیخ فریدالدین اپنے پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو وضو کرا رہے تھے۔ اتنے میں حضرت کی نگاہ ان کے چہرے پر پڑی۔ دیکھا کہ آنکھ پر پٹی بندھی ہے۔ آپ نے دریافت کیا۔ بابا آنکھ پر پٹی کیوں باندھ رکھی ہے۔ بابا فرید نے ہندی زبان میں جواب دیا۔

''آنکھ آئی ہے۔''

شیخ نے جواب دیا

''اگر آئی ہے ایں راچہ ابستہ آید۔'' (جواہر فریدی۔ ص 208)

جن ایام میں بابا فرید گنج شکرؒ سرسہ میں حضرت خواجہ عبدالشکور کے مزار پر آتے جاتے تھے' ایک دن سرسہ کے لوگ جنہیں یہ معلوم کرنے کا اشتیاق تھا کہ باوا مزار پر جا کر کیا کیا کرتے ہیں' ان کے راستے میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جب آپ کو معلوم ہوا' ناراض ہوئے اور ہندی زبان میں فرمایا:

''سرسہ سرسہ کبھی سرسہ کبھی نرسہ۔'' (جواہر فریدی۔ ص 275)

ان فقرات سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان ساتویں صدی ہی میں اپنے امتیازی خط و خال نمایاں کر چکی ہے یعنی اس میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو اس کو ایک طرف برج کی اور دوسری طرف پنجابی سے ممیز کرتی ہیں۔ ''ہوتا ہے'' نہ پنجابی ہے نہ برجی۔ اس سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ اہل پنجاب ان ایام میں اردو بول اور سمجھ سکتے تھے۔

ذیل کی نظم میں بھی حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی طرف منسوب ہے' جس کے لیے میں جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی اور سید عبدالحکیم صاحب ناظم کتب خانہ الاصلاح دسنہ ضلع پٹنہ کا منت پذیر ہوں۔ یہ نظم سید اشرف صاحب نے دسنہ لائبریری کے بعض بوسیدہ اوراق قدیم سے حاصل کی ہے جن پر حضرت بابا کے اقوال فارسی بھی درج تھے اور ناظم صاحب نے ایک نقل نہایت مہربانی کر کے میرے پاس بھیج دی ہے۔ وہو ہذا۔

وقت سحر وقت مناجات ہے — خیز دراں وقت کہ برکات ہے

نفس مبادا کہ بگوید ترا — خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے

بادم خود ہمدم ہشیار باش — صحبت اغیار بودی (کذا) بری بات ہے

باتن تنہا چہ روی زیں زمیں — نیک عمل کن کہ وہی سات ہے

پند شکر گنج بدل جاں شنو — ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

پنجاب میں نظم سب سے پیشتر لکھی گئی ہے اور نثر نسبتاً کم ملتی ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ اس سلسلے میں بہت کچھ ذخیرہ تھا' لیکن موجودہ نسلوں کی عدم اعتنا سے اکثر حصہ جو قلمی تھا' برباد ہو گیا ہے اور جو کچھ باقی ہے وہ بھی عنقریب برباد ہو جانے والا ہے۔ مشرقیات سے اہل پنجاب کی عام بے پروائی نے ہماری تلاش کے کام کو اور بھی مشکل بنا دیا ہے۔ پنجاب میں اگرچہ مسلمانوں کی اکثریت پر ناز اں ہے' لیکن یہاں ایسا کوئی کتب خانہ موجود نہیں ہے' جو مسلمانی مخطوطات اور ان کے ذہنی و دماغی کارناموں کا صحیح معنوں میں جامع ہو۔ ذیل میں جو مواد پیش کیا جاتا ہے' وہ اندکے از بسیار کا مصداق ہے۔

شیخ عثمان

پنجاب میں اردو شاعری دکن کے بعد اور دہلی کے معاصر شروع ہو جاتی ہے۔ ابتدائی نمونے بہت کم ملتے ہیں اور جس قدر ملتے ہیں ان میں تخلص موجود نہیں۔ قدیم نمونے زیادہ تر ریختہ کی شکل میں ہیں اور ان میں فارسی بہت غالب ہے اور مقامی اثر بھی حاضر ہے۔ ان نظموں کی بعض خصوصیات بھی ہیں۔ مثلاً اکثر مسمط طرز کی ہیں۔ قافیے کی پابندی سے آزاد ہیں اور ردیف پر قناعت کی گئی ہے' جیسا کہ میر جعفر زٹلی اور شیخ جیون کے کلام میں مشاہدہ ہو چکا ہے۔ یہ نظمیں ہندی اوزان میں بھی لکھی گئی ہیں اور فارسی اوزان میں بھی۔ الفاظ بعض اوقات پنجابی لہجے میں تلفظ کیے گئے ہیں۔

ابتدائی نمونوں میں جو کم از کم گیارہویں صدی ہجری کی ابتدا سے تعلق رکھتے ہیں' تمام غزل فارسی ہے۔ صرف ردیف اردو ہے۔ مثلاً ذیل کا ریختہ:

عاشق دیوانہ ام آؤ پیارے حبیب — از ہمہ بیگانہ ام آؤ پیارے حبیب
اے نظرت آفتاب بر من مسکیں بتاب — جان و جگر شد کباب آؤ پیارے حبیب
اے دل و دین جان من درد تو درمان من — ذکر تو سامان من آؤ پیارے حبیب
زاں لب شیریں شکر بارد در و گہر — ساز مرا بہرہ ور آؤ پیارے حبیب
چند کشی کشتہ را عاشق آشفتہ را — بے دلم و بے نوا آؤ پیارے حبیب
دم بدم انتظار یک نظرم وا گمار — عاشقم و خستہ وار آؤ پیارے حبیب
اے تو کس بیکساں مونس بے چارگاں — غم خوار آوارگاں آؤ پیارے حبیب
حکم ترا بندہ ام نزد تو شرمندہ ام — زار و سر افگندہ ام آؤ پیارے حبیب
وقت شبابم گذشت کار نیامد زدست — پشت زغمہا شکست آؤ پیارے حبیب
در بدر و کو بکوہ نعرہ زناں سو بسو — دیدن تست آرزو آؤ پیارے حبیب
روز و شبم انتظار دم بدم بے قرار — دیدہ جو ابر بہار آؤ پیارے حبیب

بر دل عثماں غریب رحمت خود کن قریب
زانکہ تو ہستی مجیب آؤ پیارے حبیب[1]

اس غزل میں ہم دیکھتے ہیں کہ اردو نے صرف انگلی پکڑی ہے۔ آئندہ چل کو وہ پہونچا بھی پکڑ لے گی۔ یہ ریختہ حضرت مجدد الف ثانی سرہندی علیہ الرحمۃ متوفی 1035ھ کے پیر بھائی حضرت عثمان جالندھری کی یادگار ہے۔ ''خزینۃ الاصفیا'' میں شیخ عثمان کا ضمناً ذکر آ جاتا ہے' لیکن ان کا سن وفات نہیں ملا۔ اسی طرز کا ایک اور ریختہ ہے' جس کے مصنف کے حالات سے ہم واقف نہیں ہیں:

منم مشتاق دیدارت اری تک دور کن گھونگھٹ
بجان و دل خریدارت اری تک دور کن گھونگھٹ
نہ نیتی نیند مجھ آوے نہ تجھ بن بات مجھ بھاوے
ترفداں رات دن جاوے اری تک دور کن گھونگھٹ
اگر تو یوسف ثانی و گر تو ماہ تابانی
اگر تو شاہ خوبانی اری تک دور کن گھونگھٹ
عجب رفتار تو داری عجب گفتار تو داری
چہ حسنت نادرے داری اری تک دور کن گھونگھٹ

حاشیہ:

1- بوساطت مولانا عبداللہ صاحب بالقابہ۔

شیخ جنید

اسی قرن کے ایک اور بزرگ ہیں۔ ان کا اسم گرامی جنید ہے اور جماعت صوفیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے حالات زندگی نامعلوم ہیں۔ آئندہ نظم ان کی ہے:

دلا غافل چہ می خسپی کہ اپنی سج تھیں ڈریئے
چو روز مرگ درپیش است اتنی نیند کیوں کریئے
چو دزد اندر کمیں باشند کرے جو نیند بنجارا
نباشد سود یک جیتل گواوے مول بھی سارا
بدین دنیائے دہ روزی بڈائی کائی کیوں کریئے
اگر صد سال عمرت شد نہایت ایک دن مریئے
چہ مغروری دریں دنیا سدا اس جگ نہیں رہنا
ہمیں راہے کہ درپیش است سبھی اس پنتھ سے چلنا
کجا رفتند آں شاہاں کہ جن کی بارتھی ہستی
گرفتند جائے در صحرا گئے سب چھوڑ کر بستی
کجا رفتند آں مرداں کہ بانکاں پوتیاں دہر دے
ہمہ در خاک خسپیدند جہاں تھیں سبھی تھیں ڈردے
کجا رفتند آں یاراں جہاں تھیں جیونی تیرا
چناں رفتند زیں عالم کلھونا کیا بھر تیرا (کذا)
کجا رفتند آں حوراں جہاں کے نین تھے بانکے
چناں بگذاشتند خانہ نہ پھر گھر بار دھر جھانکے
کجا آں ماہر و خوباں جو مور کنداوتے پاتے
نہ نام و نے نشان ماندہ سبھی گل گل بہنے ماتے
کجا سوداگراں منعم جہان کے بار تھے تاندھے

کلالاں خاک شاں بردند کھڑے مکھ پارتس بھاندھے
دراں وقتیکہ تو میری نہ دنیا کام تجھ آوے
کسے کو داد بخشیدہ وہی کچھ ساتھ بھی جاوے
نہ اینجا خویش کس باشد نکری یار کو یاری
نہ کس مونس بود دیگر نہ بھائی باپ مہتاری
ترا در گور بسپارند پھر کر لوگ گھر آوے
ہیتند با خدا کارت نہ کوئی آوے چھرکاوے
دراں درگاہ بے رشوت نجاتوں کیوں رہے پردا
جنیدا مرد آں باشد کہ اس سیار تھیں ڈردا

ہندوستان کی طرح پنجاب میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اردو مشائخ کی خانقاہوں میں سب سے پہلے پرورش پاتی ہے اور گھٹنوں چلنا سیکھتی ہے۔

منشی ولی رام

شاہجہاں کے دور میں منشی ولی رام صاحب عربی و فارسی و ہندی میں شعر کہتے تھے اور ولی تخلص کرتے تھے۔ داراشکوہ کے مشیر خاص تھے۔ ان کی مثنوی ملقب بہ "دشش وزن" مطبع نادر العلوم میں چھپ چکی ہے۔ غزل ان کا نمونہ کلام ہے:

چہ دل داری دریں دنیا کہ دنیا سے چلانا ہے
چہ دل بندی دریں عالم کہ سر پر چھوڑ جانا ہے
چو ہنگام اجل آید بکارت کچھ نہ لکھ آید
بچھائی کاہ کی تیری وہی تیرا بچھانا ہے
قبا و چیرۂ رنگین ہمہ از تن تو بکشایند
وہیں گے کفن کی چادر جو تیرا خاص بانا ہے
ہزاراں کھانا گرداری پراز حلوا پلا رنگیں
دویں دو مشت ارداوا جو تیرا خاص کھانا ہے
بہ مادر پدر فرزنداں برادر ہا کہ می نازی
وہی تجھ کو جلائیں گے جتاں پر بیت ٹھانا ہے
تو مہماں آمدی ایں جا شدی خود خانہ خاوند
تو اپنے آپ کو بھولا کسی کو نا پچھانا ہے
شراب سرخ می نوشی اجل کر دی فراموشی
مرن کو دور مت سمجھو عجب یہ تک بہانا ہے
طلب دیدار می دارم کہ روز اول شفاعجا
بسا رومت ولی راما کہ آخر رام رانا ہے

(خزینۃ العلوم از درگا پرشاد نادر۔ مفید عام 1879ء)

مولانا عبدی

1074ھ میں ''فقہ ہندی'' نامی ایک رسالہ بعہد عالمگیر پنجاب میں لکھا جاتا ہے۔ اشپرینگر نے فہرست کتب خانہ اودھ میں اس کو ''محشر نامہ'' کے نام سے موسوم کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کتاب کا نام ''محشر نامہ'' نہیں ہونا چاہیے بلکہ ''فقہ ہندی''۔ اس کا یہ خیال بالکل درست ہے' لیکن اس رسالے کے ناظم کا نام محمد جیون عرف محبوب عالم متوطن جھجر بیان کرتا ہے اور خاتمے سے دو شعر نقل کرتا ہے:

فقہ ہندی کو موماں انو زبان پر یاد
مسئلہ آوے دین کا مول نہ ہووے فساد
سن ہزار چرتھے پچ رمضان (کذا)
اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

اور شعر افتتاحی حسب ذیل نقل کرتا ہے:

اللہ مولا پاک ہے جو جگ سرجن ہار
جن دہا یار صدق سوں سوے اترے پار

میرے زیر نظر ''فقہ ہندی'' (مملوکہ پروفیسر سراج الدین آذر ایم۔اے) ہے جو 1233ھ کی نوشتہ ہے۔ اس میں خاتمے کا پہلا شعر اشپرینگر کے منقولہ بالا شعر کے مطابق ہے اور شعر دوم یوں ہے:

سن ہزار چوہتر پچ ماہ رمضان تمام
اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا نظام

مگر شعر افتتاحی یوں ہے:

حمد ثنا سب رب کوں خالق کل جہان
لائق حمد ثنا کیے اور نہ کوئی جان

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اشپرینگر کے سامنے دو مختلف رسالے ایک ہی جلد میں ساتھ بندھے ہوئے تھے' جن میں ''فقہ ہندی'' کا نمبر دوم تھا۔ اشپرینگر نے دونوں رسالوں کو ایک سمجھا۔ اس لیے ابتدائی شعر پہلے رسالے کا دیا اور خاتمہ ''فقہ ہندی'' سے نقل کر دیا' اسی لیے اس نے مصنف کے نام میں بھی غلطی کھائی تھی۔

''فقہ ہندی'' کا مصنف عبدی ہے نہ کہ محمد جیون۔ عبدی کا نام اس شعر میں آتا ہے:

کیتے مسئلہ دین کے عبدی کہے امین
فقہ ہندی زبان پر بوجھو کرو یقین

اس کے علاوہ رسالے کی زبان اس قدر پنجابی آمیز ہے کہ اس کو ہریانی زبان میں کسی طرح داخل نہیں کیا جا سکتا' بلکہ اس کا صحیح نام پنجابی اردو ہے۔ ذیل کے اشعار میں ناظرین خود اندازہ لگا سکتے ہیں:

حمد ثنا سب رب کوں خالق کل جہان
لائق حمد ثنا کیے کے اور نہ کوئی جان
علم شریعت نال کے بھیجا پاک رسول
جو کچھ بھیجا رب نیں سب ہم کیا قبول
یا رب اپنے فضل سوں بے حد بھیج درود
نبی محمد مصطفیٰ تجھ سوں ہو خوشنود
بھیجوں اوس آل پر اور اصحاب تمام
تس بھیجوں احباب پر بہت درود سلام
کیتے مسئلہ دین کے عبدی کہے امین
فقہ ہندی زبان پر بوجھو کرو یقین
مطلب مسئلہ بوجھنا فرض عین کے جان
عربی ترکی فارسی ہندی یا افغان
علم شریعت بوجھنا فرق عین کے جان
بالغ عورت مرد کوں جو ہووے مسلمان
چار علم سب فرض ہے بوجھو کرو قیاس
علم توحید نماز ہے روزہ حیض نفاس
تس کے پیچھے مومنا تہتر فرقہ جان
بہتر فرقہ دوزخی سو تعبیہ شیطان
رافضی خارجی جبریہ مرجیہ بھی جان
جبریہ قدریہ ہری کے سو بارہ فرقہ مان
فرقہ بہشتی مصطفیٰ اور اصحاب تمام
یہ فرقہ اسلام کا سنت جماعت [نام]

تس پرچار امام ہے چار رکن اسلام
ابوحنیفہ شافعی مالک احمد نام
سنی ہو دس چیز سوں یہ مسئلہ کر یاد
تفضیل دے دو شیخ کوں دوستی دو داماد
دو امام پیچھے نماز کر دو قبلہ کو جان
دو جنازہ پر نماز کر مسح دو موزہ آن
دونوں عید نماز کر اطاعت دو سلطان
راضی ہو تقدیر پر دو گواہی جان
گناہ کبیرہ بوجھنا لازم کر کے جان
اشتراک باللہ اور مارنا ناحق مسلمان
سحر کرنا اور بھاگنا بیچ غلبہ کفار
عاق کرنا ماں باپ کا جو ہیں مسلم پندار
کھانا مال یتیم کا بیاج کھانا جان
نو ہیں کبیرہ متفق اور زنا خمر پچھان

دو ہاتھ نکالے ہاتھ سوں جب آکھے تدبیر
سرشہ جیھائی رفع کرائے صاحب تقدیر
چار انگلی کے فرق سوں جدی دہرے دو پانو
جوتوں کھڑا نماز میں دیکھ سجدہ کی ٹھانو
دیکھ رکوع میں پانو کو سجدہ ناک تمام
قعدہ بیچ کنار کو کاندھا وقت سلام
حی علی الفلاح تہاڈا ہووے امام
قد قامت الصلوۃ شروع کرے امام
طرف قبلہ کر انگلیاں سجدہ کر بچ ہاتھ
موئنڈ برابر پیٹھ کے راکھ رکوع کے ساتھ
گھٹنہ دہڑ بھی ہاتھ سر جدہ کوں لیاؤ
سر اٹھاؤ بھی ہاتھ کوں پیچھے گھٹنہ اٹھاؤ☆

اس تصنیف کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بعض فارسی افعال کا استعمال کیا جاتا ہے جیسے:

لب بنی کے بال لے سارے ناخن چیں
ختنہ چھوٹی ازار کر سنت جان یقیں

دیگر:

استنجا سنت خاک سوں ڈھیلہ پتھر ساتھ
چوبؑ روئی اور برف سوں چونہ نمد رواست

دیگر:

عیدگاہ کی راہ میں پکار کہے تکبیر
پچھوں دوگانہ عید کے قربانی واجب گیر

عبدی پنجابی میں بھی ایک شاعر گذرا ہے جو"رسالہ مہتدی" کا مصنف ہے۔ اب "رسالہ مہتدی" اور "فقہ ہندی" کی زبان میں قرابت قریبہ موجود ہے جس سے میرا خیال ہے کہ دونوں رسالوں کا مصنف ایک ہی شخص ہے۔ مثلاً "فقہ ہندی":

مسئلہ آویں دین کے مول نہ ہوئے فساد

دیگر:

کہیے مسئلے دین کے عبدی کہے آمین

رسالہ مہتدی:

آکھاں وقت سوال دے مول نہ ہووے فساد

دیگر:

واجبات نماز دے عبدی کہے آمین

دونوں رسالوں کا وزن بھی ایک ہے اور جملوں کی ترکیب اور بندش بالکل پنجابی طرز میں ہے۔

☆ان اشعار کا موازنہ "پنجاب کے قدیم اردو شعراء" مولفہ خورشید احمد خاں یوسفی (اسلام آباد1992ء) میں درج کردہ کلام سے کیا گیا ہے۔ دونوں کے متن میں اختلافات نسخ پائے جاتے ہیں۔ رک. ص16-12 — م-ا-ج)

ناصر علی سرہندی

''آب حیات'' میں مذکور ہے کہ استاد ولی نے ناصر علی کو لکھا تھا:

اچھل کر جا پڑے جوں مصرع برق
اگر مصرع لکھوں ناصر علی کوں

ناصر علی نے جواب میں لکھا:

باعجاز سخن گر اڑ چلے وہ — ولی ہرگز نہ پہنچے گا علی کوں

پنجاب میں علی کی غزلیں ایک وقت میں بہت مقبول تھیں اور اب بھی پرانی بیاضوں میں مل جاتی ہیں۔ یہاں علی کے اردو کلام کا نمونہ ایسی بیاضوں سے دیا جاتا ہے' جو محمد شاہ کے عہد میں یا اس سے چند سال بعد نقل کی گئی ہیں:

نین کے ساگر تمن کے بھیتر اچھوں لباب سوں مل پڑے گا
ہووے گی نرگس خجل چمن موں گلوں کی انکھیاں میں گل پڑے گا
دو نین کارے تمیں کی جانی حیران کرتے لوگن کے تائیں
خراب ہوگا تمام عالم جب ان نینن موں کجل پڑے گا
تمن کے ابرو کمان دستے پلک ہے عاجز چو تیر ناوک
نظر غضب کی نہ دیکھ ساجن کوئی بچارا اوتھل پڑے گا
علی ملاحت تیرے بجن کی اگر زلیخا سنے گی کبھوں
مصر میں سودا دگر ہووے گا ورم نہ یوسف کا مل پڑے گا

(از بیاض پرتاب سنگھ۔ نوشتہ 9 سن جلوس محمد شاہی)

بجن کے حسن کا قرآں پڑھیا ہے میں نظر کر کر
نہیں پائی غلط اوس میں دیکھا زیر و زبر کر کر
ترے غم کا مجھے سرجن ہویا ہے کافیہ کافی
شرح ملاں درس میں سوں ستی ہے بس بدر کر کر

معانی اور بیاں بھیتر بدیع اس کو سمجھتا ہوں
پڑھی ہے حسن تیرے کی مطول جس فکر کر کر
کلام العشق ہمنا کوں سنا حکمت سوں منطق موں
وگرنہ اس مطول کوں رکھا تھا مختصر کر کر
اصول اور ہندسہ کب لگ پھروں تکمیل اے یاراں
ہدایہ عشق کا غالب ہویا مجھ پر اثر کر کر
بگرد روی ساجن کے ہویا پیدا خط مشکیں
لیا ملک سلیمانی مگر موراں مکر کر کر
جرس تجھ کارواں کا سن علی آں شوخ بے پروا
کیا ہے بار ہستی کا و لے عزم سفر کر کر

(از بیاض نوشتہ محمد شاہ مرقومہ 1161ھ)

دیگر:

چندر سے مکھ پر یہ خال مشکیں نپٹ بشوخی لٹک رہا ہے
عجب ہے یاراں کہ ایک زنگی بملک رومی اٹک رہا ہے
بت فرنگی بقتل ہمنا رکھے جو پر چیں جبیں دمادم
ہوا ہے جیونا جگت میں مشکل کہ تیغ ابرو سرک رہا ہے
علی تفقر! مقام جس کوں ہوا ہے حاصل ز وصل جاناں
چو چشم نرگس ہوا ہے حیراں بوصل دلدار چھک رہا ہے

(از بیاض پرتاب سنگھ نوشتہ 9 سن جلوس محمد شاہی)

علی کا کلام فارسی ترکیبوں کی بنا پر محمد شاہی عہد کے شعراء کے کلام سے ممیز ہے۔ بگرد روی ساجن' آں شوخ بے پروا' بت فرنگی بقتل ہمنا' چو چشم نرگس' چو تیر ناوک ایسی بندشیں ہیں جو قدیم شعرائے دہلی کے ہاں کمیاب ہیں۔ برخلاف اس کے پنجاب کے شاعر ایسی ترکیبیں لانے کے عادی ہیں۔

شیخ ابوالفرح محمد فاضل الدین بٹالوی

(متوفی 1151ھ)

بٹالہ سرزمین پنجاب میں ایک مردم خیز شہر ہے۔ مرزا نورالعین واقف فارسی کے مشہور شاعر کا مولد و منشا یہی شہر ہے۔ بارہویں صدی ہجری میں اس شہر میں مشائخ کا ایک مشہور خاندان ظہور میں آیا جس کے جداعلیٰ شیخ ابوالحسن علی بغدادی معروف بہ بدیع الدین شہید حسینی جیلانی ہیں۔ آپ بسبیل سیاحت عراق سے ہندوستان وارد ہوئے اور یہیں رہ پڑے۔ عوام الناس میں عربی لباس کی بنا پر آغا کے نام سے مشہور ہو گئے۔ آپ کا مزار موضع سہاری من مضافات پنجاب ہے۔ آپ کے احفاد میں شیخ ابوالفرح محمد فاضل الدین بٹالوی نے خاص شہرت حاصل کی۔ آپ شیخ محمد افضل لاہوری کلانوری کے مرید ہیں۔ بیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر تلاش معاش کی غرض سے شاہی لشکر کی شمولیت کی امید میں وطن سے نکلے۔ جب بٹالہ پہنچے' کچھ ایسے موانعات پیش آئے کہ شراکت لشکر کے ارادے کو ترک کر کے یہیں رہ پڑے اور تصوف میں ذوق لینے لگے۔ آپ نے چالیس کتابیں اور رسالے یادگار چھوڑے ہیں[1]۔ ایک روایت[2] ہے کہ تصانیف کی تعداد ایک سو سے زائد ہے۔ ان میں سے "قصیدہ خمریہ حضرت غوث الثقلین" پر آپ کی عربی اور فارسی شروح اور "ترجمہ مواعظ الرحمٰن" کے نام ہم تک پہنچے ہیں۔ 7 ذی الحجہ 1151ھ میں بہتر برس کی عمر میں انتقال فرماتے ہیں۔ "غم عام" تاریخ وفات ہے۔ آپ کے والد کا نام سید محمد عنایت اللہ ہے جو عہد شاہجہاں و عالمگیر میں سیالکوٹ' کشمیر' کابل وغیرہ مقامات میں متفرق اوقات پر قاضی القضاۃ رہے ہیں اور خان بہادر کے خطاب سے سرفراز تھے۔ آپ نے عربی اور فارسی علوم کی تحصیل مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی کے نواسے ابوالحسن فتح محمد اور میاں محمد غوث لاہوری سے کی ہے[3]۔

حضرت محمد فاضل بھی اردو میں شعر کہتے تھے۔ ان کا اور سید ولی اورنگ آبادی کا زمانہ تقریباً ایک ہے۔ یہاں میں آپ کی ایک مناجات جو عربی اور اردو میں ہے درج کرتا ہوں:

ناہیں مرا چھٹ تم کوئی انظر بحالی یا نبیؐ
ہے رین دن غفلت بڑی نظر بحالی یا نبیؐ
اس فضل سوں راکھو مجھے من عزل درجات الصفا

فریاد کرتا ہوں ہر گھڑی انظر بحالی یا نبیؐ
میں ہوں خرابی میں پڑا کالطفل سوء الخلق حیف
اس غم ستی چھاتی سڑی انظر بحالی یا نبیؐ
اس شرم سوں مجھ مکھ نہیں حتیٰ اری ضوء الصفا
ہے مرگ بھی سر پر کھڑی انظر بحالی یا نبیؐ
برقع شریعت سوں رکھو حتیٰ کون بنور کم
اس عشق سوں کر پھل جڑی انظر بحالی یا نبیؐ
رو رو لکھوں رو رو بھروں قصاً بقصاً عاصیا
افواج عصیاں[4] سوں جھڑی انظر بحالی یا نبیؐ
راکھو تمہیں راکھو تمہیں لی لیس غیرک یا ملاذ
ناہیں مرا چھٹ تم ستی انظر بحالی یا نبیؐ
بھولا ہوں میں بخشو تمہیں لا تاخذونی بالوزر
جب محی دین بخشش کری انظر بحالی یا نبیؐ
فاضل پکارے رین دن اشفع شفیع المذنبیں
فریاد کرتا ہر گھڑی انظر بحالی یا نبیؐ

(از بیاض مملوکہ پروفیسر آذر)

حواشی:

1- تذکرۃ الابرار۔ غلام محی الدین بن عبدالکریم قادری پشاوری۔

2- بدر محی الدین صاحب کا خط (بحوالہ شرائف غوثیہ) از درگاہ فاضلیہ بٹالہ

3- بدر محی الدین صاحب کا خط (بحوالہ شرائف غوثیہ) از درگاہ فاضلیہ بٹالہ۔

4- فارسی کا پرتو ہے جیسے فوج ہے از کلنگاں۔

شیخ محمد نور

شیخ محمد فاضل کے پیر بھائی شیخ نور محمد ہیں جو شیخ محمد افضل کے مرید ہیں۔ ان کی اردو مناجات یہاں نقل کرتا ہوں:

بہر خدا توں اے صبا بغداد جا فریاد کر
دربار میراں شاہ کے کہہ خستی مجھ سر بسر
ڈوبا میں غم کے چاہ موں کر فضل مجھ بہر خدا
تم بن مرا کویو نہیں میں دست عاصی کا پکڑ
روتا میں اپنے حال سوں غفلت سیں حیراں ہویا
زحمت سو مجھے مضطر کیا دیوو شفا خود کرم کر
تیرے مرید جو خاص ہیں ان کے سگاں کا ہوں میں سگ
بہر خدا اور مصطفیٰ کر لطف کی مجھ پر نظر
حق نے تو ہے سرور کیا ولیاں میں تم سرتاج ہو
ہویا نہ کوئی تا ہووے تیرے جیہا تا دن حشر
صد حیف مجھ عاصی تائیں تم سا ہووے میرا سائیں
دل کی سیاہی تا اوٹھے عالم کے تم ہو راہبر
بختوں کے جس (کذا) مارے ہوئے وہ بار تم کے آ کرے
مجھ اس لیے تجھ نام کی ہے درد دل میں میاں بہتر
تم سار کا جس پیر ہو اوس کوں نہیں پروا کچھ
پاوے دو جگ میں عافیت تیری نظر سوں سنگ و زر
چاہو اگر مردے تائیں زندہ کرو اک پل منے
تم کی صفت مہ کہا کروں تم سا نہیں کویو دگر
خوارے کہ میں گرداب موں فکراں سے مجنوں ہویا

مرنے میں کچھ باقی نہیں جیتا میں تم کی آس پر
قوت کہی مجھ صبر کی ہے بے قراری روز شب
تم سیں طلب آرام کی بد وہم مجھ کے دور کر
تم کی محبت دل مرا لیا ہے اپنے دام سوں
حق سوں رجا واسق مجھے پاؤں میں دنیا دیں میں فر
دیوے خدا توفیق گر تم کا اسم ہر دم پھروں
تجھ اسم اعظم اسم ہے مشہور ہے عالم بہتر
بوجھا ہے کر تحقیق میں عالی تری درجات ہے
صدقہ علی حسنین کا آ فرق مجھ کے قدم تہر
دامن لگے کی لاج تجھ سن عاجزی مجھ کی شاہا
محفوظ کر دل جاں سوں دو جگ گوا میرے خطر
دارو مبارک لب ستی مجھ کا کہو خود فیض سوں
دل کی قساوت سب گوا روشن کرو سینہ جگر
عصیاں سوں میں غرقاب ہوں نیکی نہیں مجھ سوں ہوئی
تجھ بار ہی میں آگرا ہوں ناتواں بے بال و پر
کر کر تصدق نالو کے باطن مرے کی خبر لے
رکھ شاد دنیا دین موں مجھ نفس شیطان کا نہ ڈر
حق کی حضوری بخش مجھ مجلس محمد مصطفیٰ
وہ قرب انبیاء کرم کر دو جگ ہواں میں شاد تر
بن دیکھنے تجھ اے شاہا زندگی میری برباد ہے
چہرا مبارک مجھ دکھا تجھ سوں فدا دل جان سر
غم کی تباہی سے چھوڑا کر دفع مجھ سیں ہر بلا
توں پادشاہ دو سرا مشکل میری آسان کر
افضل سائیں نائب ترے میرے پھڑے نے دست جی
برکت اونہوں کے نام کی مجھ سوں گوا ہر شور شر
میں نور عاجز رات دن ہے ورد تیری مدح کا
واصل خدا کا کر مجھ بے رنج بے محنت ضرر

یہ خانقاہی اردو کے نمونے آج ہمارے کانوں کو بہت عجیب معلوم ہوں گے، لیکن ہمیں تاریخی دلچسپی کی رو سے ان پر نگاہ ڈالنی چاہیے۔ یہ تبرکات ایسے عہد کی یادگار ہیں؛ جب کہ ابھی دہلی میں بھی سناٹا تھا اور میر و سودا کی غزل خوانی شروع ہونے میں ایک عرصہ درکار تھا۔ ہمیں اس نظم کی بعض خصوصیات کو یاد رکھنا چاہیے۔

کر فضل مجھ: مجھ پر فضل کر۔ میرا کو یو نہیں: میرا کوئی نہیں۔ ولیاں میں: ولیوں میں۔ تیرے جیہا: تیرے جیسا۔ تجھ نام کی: تیرے نام کی۔ مجھ کے اوپر: میرے اوپر۔ تم سار کا: تم سریکا۔ تم کی صفت مہ کیا کروں: تمہاری صفت میں کیا کروں۔ تم کا اسم ہر دم پھڑوں: تمہارا اسم ہر دم پڑھوں۔ بن دیکھنے تجھ: تیرے دیکھے بغیر۔ مجھ دیکھا: مجھ کو دکھا۔ بعض الفاظ کا جو غلط تلفظ دیا ہے۔ مثلاً کرم، قدم وغیرہ پرانی اردو میں اسی طرح بولے جاتے ہیں۔

موسیٰ

اسی عہد کا ایک ترجیع بند دیا جاتا ہے۔ جس کے مالک موسیٰ ہیں۔ ان کے حالات معلوم نہ ہو سکے:

ہم چرنوں لاگے آن تیرے   جو پاویں درسن دان تیرے
دو جگ پر احسان تیرے   سبہ بندہ ہیں سلطان تیرے
سب وحش طیور انسان ترے   لاگے ہیں دھیان او گیان ترے
دھارے ہیں عرش نشان ترے   میں صدقہ ار قربان ترے
کر دل کوں بدر منیر میرے   یا غوث الاعظم پیر میرے
دو جگ میں شکر شیر ہو تم   یا داتا حضرت پیر ہو تم
سبہ ولیاں بیچ امیر ہو تم   ہر اول اور اخیر ہو تم
قادر بر ہر تقدیر ہو تم   ہر شے موں بلا نظیر ہو تم
کر دل کوں بدر منیر میرے   یا غوث الاعظم پیر میرے
تم محی الدین جیلانی ہو   تم سانچے قطب ربانی ہو
تم سچے محبوب سبحانی ہو   تم برحق غوث صمدانی ہو
تم حوض کوثر کے بانی ہو   ہر مشکل کی آسانی ہو
کر دل کوں بدر میرے   یا غوث الاعظم پیر میرے
میں عاجز تجھ دربار کھڑا   کہتا تیرے دوار کھڑا
تجھ نام کا لے آدھار کھڑا   کرتا ہوں یہ نستار کھڑا
رنجیدہ دل لاچار کھڑا   کاندھے پر غم اسوار کھڑا
مجھ ساتھ کا کھیوا پار کھڑا: یا پیر میں پاپی وار کھڑا
کر دل کوں بدر منیر میرے   یا غوث الاعظم پیر میرے
تم صحی پیراں سر پیراں جی   تم سانچے حضرت میراں جی
تم کھولو بند اسیراں جی   مجھ دکھ کی کاٹ زنجیراں جی

تم انکھیں دیت بصیراں جی   تم خوشی دیت دل گیراں جی
تم دھیرج دیت ادھیراں جی   کیا ہند دکن ایراں جی
کر دل کوں بدر منیر میرے   یا غوث الاعظم پیر میرے

نہیں غرضی مال منال کا ہوں   آشفتہ تیرے جمال کا ہوں
نروی تجھ جاہ و جلال کا ہوں   شیدا تجھ قیل ار قال کا ہوں
میں بھوکا تیرے وصال کا ہوں   دیوانہ اسی خیال کا ہوں
میں منگتا اسی سوال کا ہوں   میں عرضی اس احوال کا ہوں
کر دل کوں بدر منیر میرے   یا غوث الاعظم پیر میرے

تو ہادی راہ ہدایت کا   تو معنے فیض کی آیت کا
حامی ہیں روز عنایت کا   کافی ہیں کرم کفایت کا
ہیں داعی فضل رعایت کا   والی ہیں عین عنایت کا
ہے سایہ ترے رعایت کا   یہ شوق مجھے بعنایت کا
کر دل کوں بدر منیر میرے   یا غوث الاعظم پیر میرے

تجھ بھ کی کنتھا سیتا ہوں   کٹ سیس کپڑے بیتا ہوں
تجھ یاد کی پھکیا کیتا ہوں   اور خون جگر کا پیتا ہوں
تجھ نام لیے سیں جیتا ہوں   میں نیک عمل سیں ریتا ہوں
تجھ در کی ماٹی لیتا ہوں   مکھ پر یہ خاک رہتا ہوں
کر دل کوں بدر منیر میرے   یا غوث الاعظم پیر میرے

تم غم مجھ دل سیں دور کرو   یہ بات میری منظور کرو
مجھ دشمن چکنا چور کرو   آتش میں دل منور کرو
سینہ کو یہ پُرنور کرو   آ عشق اپنے سوں معمور کرو
مے اپنی سوں مخمور کرو   یہ پار ہمارا پور کرو
کر دل کوں بدر منیر میرے   یا غوث الاعظم پیر میرے

ہم بے کس دیکھن اور ترا   مشہور جگت موں شور تیرا
پنچھی موں باندھا چور ترا   وہ چور تیرا میں ڈھور ترا
القاب ہے بندہ چور ترا   رکھتا ہوں ڈھیر اور زور ترا
ایمان ہے شکر معمور ترا   ....

کر دل کوں بدر منیر میرے یا غوث الاعظم پیر میرے
سر پوٹ اوگن کی بھاری ہے مجھ لاگی آس تمہاری ہے
تجھ نام پر پوٹ اتاری ہے دیکھ ایسی شکل ہماری ہے
موئی تجھ درس پیکہاری ہے توں دستگیری نستاری ہے
مجھ سوخت رین اندھاری ہے یا پیر میرے ایہ یاری ہے

کر دل کوں بدر منیر میرے
یا غوث الاعظم پیر میرے

(از بیاض پروفیسر آذر)

یہ نظم اگرچہ ہم مصنف کے عقائد سے متفق نہیں' سادگی جذبات و ادائے بیان کے لحاظ سے بلند پایہ رکھتی ہے۔ پنجاب میں حضرت شیخ عبدالقادر کے نام پر ایسی ہزاروں مناجاتی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ بارھویں صدی میں پنجاب کی سیاسی ابتری نے اور بھی ان کو فروغ دیا ہے۔ عالمگیر کی وفات کے بعد وہ دور شروع ہو جاتا ہے جس کو ہم پنجاب کی تاریخ کے سیاہ ورق کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس عہد میں اس سرزمین پر آفتوں پر آفتیں ٹوٹیں۔ بلاؤں پر بلائیں نازل ہوئیں۔ سکھوں کی تاخت و تاراج' نادر کی آمد اور احمد شاہ درانی کے حملے ایسے واقعات ہیں جنہوں نے یہاں کے باشندوں کے قلوب کو یاس اور ناامیدی کے جذبات سے معمور کر دیا۔ قاعدہ ہے کہ مصیبت میں خدا یاد آتا ہے' لیکن خانقاہی اثرات میں پنجاب نے صرف حضرت غوث الاعظمؒ کو یاد رکھا اور انہی کا کلمہ اکثر پڑھا۔

حضرت غلام قادر شاہ

(متوفی 1176ھ)

شیخ محمد فاضل کے فرزند اور جانشین حضرت غلام قادر شاہ ہیں جو علم و عمل، زہد و تقویٰ، ریاضت و مجاہدات اور حال و قال میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ آپ کا لقب اہل اللہ ہے۔ تصوف میں متعدد تصنیفات آپ کے قلم سے نکلی ہیں، جن میں سے ''صفا المرآت'' کا ہم تک نام پہنچا ہے۔ شب یکشنبہ 5 ربیع الثانی 1176ھ میں رحلت کی۔ ''فوت مخدوم'' آپ کی تاریخ وفات ہے اور غلام تخلص ہے۔

ان کی اردو مثنوی ''رمز العشق'' ان کے والد بزرگوار کی زندگی ہی میں تصنیف ہو چکی تھی، کیونکہ اس میں انہوں نے اپنے والد کو خطاب کر کے بعض شعر لکھے ہیں۔ یہ مثنوی میر اثر کی مثنوی ''خواب و خیال'' سے جو 1159ھ کی تصنیف ہے، اقدم ہے۔ اس مثنوی کے دو نسخے میرے پاس ہیں۔

(1) محمد جان کے قلم کا نوشتہ ہے جو مصنف کے مرید اور سالے ہیں اور مصنف کی زندگی ہی میں اس کی کتابت کرتے ہیں۔

(2) 1204ھ کا نوشتہ ہے۔ عنوان پر سنہری اور رنگین گلکاری ایرانی تقلید میں ہو رہی ہے۔ خاتمے میں یہ عبارت درج ہے۔ ''نسخہ متبرکہ رمز العشق تصنیف حضرت غلام قادر شاہ قدس سرہ ساکن بٹالہ تمام گردید 1204ھ۔'' دونوں نسخے خط نسخ میں ہیں۔ بارہویں صدی اور اس سے پیشتر قرون کی اردو تالیفات بالعموم خط نسخ میں ملتی ہیں اور مسلمانوں نے گویا اس خط کو ہندی زبانوں کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ آج بھی پنجابی، سندھی اور پشتو زبانیں خط نسخ ہی میں لکھی جاتی ہیں۔ اگرچہ اردو نے فارسی کی تقلید میں نستعلیق بعد میں اختیار کر لیا۔

اس مثنوی کا وزن عروضی خالص ہندی ہے۔ پنجابی لہجے کی تمام خصوصیات اس میں موجود ہیں۔ اس مثنوی کی شرح شیخ کے پوتے شیخ ابو احمد محمد شاہ المتوفی 1224ھ نے لکھی ہے۔ اس کے متعلق صاحب ''تذکرۃ الابرار'' لکھتے ہیں:

> ''در رمز العشق تصنیف جد بزرگوار خود بعنایت شرح مرغوب و پسندیدہ نوشتہ دور کشف حقائق تصوف و بیان اسرار اصطلاحات حضرات صوفیہ...... تعمق فراواں و تحقیق

بسیار نمودہ۔"

"رمز العشق" میں عربی الفاظ کا استعمال کثرت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ ایک وجہ تو اس کی یہ ہے کہ تصوف کی تمام اصطلاحات عربی ہیں۔ دوسرے حضرت غلام قادر شاہ صاحب خود عربی کے فاضل ہیں اور اس زبان سے زیادہ مزاولت رکھتے ہیں۔ ذیل میں مثنوی کا نمونہ عرض ہے:

افتتاحیہ:

وہی وہی نہ دوجا کوئی — پرگھٹ ہویا محمد ہوئی
احمد محمد ایک پچھانوں — ایک ہی دکھو ایک ہی جانوں
حمد کہو اور بہت درود — فھو الحامد و المحمود
اول آخر باطن ظاہر — ناہیں اس سے کویو باہر
انا من نورٗ سنو بیان — والکل نوری دہرو دھیان
سچ لیو ار بوجھو بات — ایک ہی ذات ہے ایک ہی ذات
سبہ بڈیائی اسے مسلم — صلی اللہ علیہ وسلم
صلی اللہ علیہ و آلہ — ومن اشتاق بنور جمالہ
سیما شیخی عبدالقادر — نعم الموٰلی نعم الناصر
فاضل شاہ کا لے کر نام — سنو حقیقت کہے غلام
ایک حقیقت سب موں ساری — آپ سنے ار آپ سناوے
وہی سمیعٗ بصیر علیم — ناہیں اس کا کوئی سہیم
کان ولم یک معہ شیئا — و ھوالان کمان کان کہیا
غیر کہاں ہے دیکھ پیارے — آپ ہی آپ ہے ہر ہر جا رے

سات مراتب بوجھ پیارے — ہر ہر کے ہیں حکم نیارے
ست گر سوں توں کر تحقیق — ناں ہو ملحد ناں زندیق
فرق ار جمع موں فرق پچھان — پھر دونوں کو ایک ہی جان
بوجھ یو تنزیہ کوں خوب — ناں ہو ملحد ناں محجوب
بھی تشبیہ کوں جانوں نیک — پھر دونوں کوں مانوں ایک
ظاہر موں ہے وحدت کثرت — باطن موں ہے کثرت وحدت
قدم وجوب کے سبہ اسماء — جانوں فاعل فی الاشیاء

ازلی ابدی ہیں درکار نا نہ معطل ناں بیکار
اس مشہد موں ہے مسجود فھو القاصد و المقصود
یوں ہے سب اسماء کہانی حادث جانوں اور نقصانی
اس مظہر میں راکع ساجد فھو الطالب وہو العابد
بندے کا ہے طاعت کام واعبد ربک سنوں کلام
کرو عبادت دن ار رات شرک ار شک سوں ہووے نجات
کرو عبادت شرع آئین حاصل ہووے نور یقین
جس کوں ناہیں شرع گواہ جانوں اس کوں تم گمراہ
حق نے کہیا نور مبین شرع کوں بیچ کتاب متین
جس کوں حاصل ناں یہ نور طبع ہوا کا ہے مغرور
ناں ہوں اس کوں قرب وصال شرع بنا ہے قرب محال

ازخاتمہ:

دین دنی کا پشت پناہ والی میرا فاضل شاہ
قطب حقیقت شمس یقین نائب سید محی الدین
عارف کامل دل آگاہ نور محمد سر الٰہہ
اول آخر ظاہر باطن ہاتھ ہمارے اس کا دامن
ناہیں اس بن کویو میرا اس کا ہوں میں اس چیرا
نانہ کسی سوں مجھ کوں کام وہی ہے مولا وہی غلام
اپنے شہ کا لے کر نام کہیا رمز العشق تمام
رمز العشق کوں جس نے جانا بیشک حق کوں دیکھ پچھانا
حمد کہوں ار بہت سلام اول آخر نیک کلام
یا رب صل علیہ و آلہ واجعلنی فی حبہ و آلہ
اللھم بنور جمالہ شرفنی بالحال و قالہ

آئندہ نعتیہ غزل حضرت غلام قادر شاہ کی تصنیف ہے۔ میں اس کے صرف چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں:

سبھ دیکھو نور محمد کا سبھ دیکھو نور محمد کا
سبھ بیچ ظہور محمد کا سب دیکھو نور محمد کا

وہ نقطہ علم ازل کا ہے وہ اول ہر اول کا ہے
وہ مجمل ہر مجمل کا ہے سبہ دیکھو نور محمد کا
وہ منشا سبہ اسما کا ہے وہ مصدر سبہ اشیا کا ہے
وہ سر ظہور خفا کا ہے سبہ دیکھو نور محمد کا
کہیں ظاہر ہو مشہور ہویا کہیں باطن ہو مستور ہویا
کہیں ناظر ہو منظور ہویا سبہ دیکھو نور محمد کا
کہیں کلمہ حق کا نور اللہ کہیں بیچ پنگوڑے عبداللہ
سبحان اللہ سبحان اللہ سبہ دیکھو نور محمد کا
کہیں شمع کہیں پروانہ ہے کہیں دانا کہیں دیوانہ ہے
کہیں یار کہیں بیگانہ ہے سب دیکھو نور محمد کا
وہ آپ ہی آپ عیاں ہویا کہیں کثرت کا ساماں ہویا
ہر شان ہو وہ ہر شان ہویا سبہ دیکھو نور محمد کا
کہیں غوث تمام کہایا ہے کہیں مولانا دہرایا ہے
کہیں عبد غلام کہایا ہے سبہ دیکھو نور محمد کا

شیخ نصیرالحق

شیخ فاضل الدین کے مرید شیخ نصیرالحق ہیں۔ یہ فارسی، ہندی، پنجابی اور اردو کے شاعر ہیں۔ اردو میں انہوں نے خصوصاً بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ نصیر اور نصیرا تخلص کرتے ہیں۔ مناجاتیں، توتا، برہنی اور کھرول اکثر لکھتے ہیں۔ ان کا کلام بہت ہے۔ میں صرف بعض مثالیں دیتا ہوں:

اری نصیرا وقت ہے یہ وقت پھر نا پایئے
سر کاٹ لے کر ہاتھ پر آگے پیا کے جایئے
صورت نہ سیرت مجھ منے کس راہ پیا کوں پایئے
فاضل سائیں ہے بو الفرح ان کے تصدق جایئے
آتش پڑی بیڑے مرے اس عشق دھند و کار کی
بھتہ تن جلا کولا کیا صورت بھی انگار کی
بجلی پڑی مجھ غیب سیں اس ابر آتش بار کی
فاضل سائیں کوں جا کہو یہ خبر اس بیمار کی
جھانکی دکھا او پیو کی کر کرم اس آزار پر
قربان کر سب جان و تن اس غوث قطب ابدال پر
جو نام سن سن کانپتے تھے یہ دہا مجھ آئیاں
ہے رے جیا اب کیا کروں فوجاں ز برکیاں دہائیاں
تلوار جمدہر سار کی لے تیر ترکش آئیاں
تجھ بن مرا اب کو نہیں اے شاہ فاضل سائیاں
جوگن بھئی میں اے پیا ہو ہو تیری پکارتی
فاضل سائیں بچیا دیہو نیں اب تو بازی ہار دی

دیگر مناجات تصنیف حضرت نصیرالحق:

یا غوث سید محی الدین لیتے خبر اس زار کی

کر کر تصدق پائیوں کا جھانکی دیکھو دیدار کی
بیڑے پڑے برہوں اگن جلنا پڑا مجھ رین دن
مجھ کو بتا دو وہ سجن دیوے خبر دلدار کی
راکس برہوں جب آئیا اس ماس سب تن کھائیا
اب ہاڑ کھاون تھائیا جو کھب ہے اس خونخوار کی
دیکھے بنا پیارے سجن کیونکر کٹھوں میں رین دن
لیاؤ مجھے دیوؤ کفن ہووے مکھ جنجال کی
دیو دکھائی اے پیا تم بن سکوں کیونکر جیا
برہوں مجھے بیکل کیا طاقت نہیں اس بہار کی
نس دن مجھے ہے روونا رو رو مجھے جی کھوونا
یہ سوکھ لہو سیں تھوونا نشتر لگی ہے سار کی
کب لگ میں اس دوکھ سوں جروں اب مار خنجر میں مروں
سر کاٹ کر آگے دھروں کر بیٹھ اس دلدار کی
وہ پیو پیرو راہ ہے سب جگ کا شہنشاہ ہے
وہ محی الدین دلخواہ ہے ہو خاک اس دربار کی
فاضل سائیں کرنا کرم چرنوں لگی کی کر شرم
لیاؤ مجھے دیوؤ جرم جہاں کی ویلا دو یار کی
کہہ اے نصیرا کیا کروں برہوں کی چکھ مئیں جو مروں
جرتے نہ ہرگز دم بھروں یہ تھورنا گفتار کی

شاہ مراد

شاہ مراد غالباً اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں ان کے حالات سے واقف نہیں۔ نمونہ کلام ذیل میں عرض ہے:

اب کیا کرے کوئی رے جیا جب آنکھوں سے پیا دور ہویا
تن لکڑی ہو جل راکھ بھیا یہ سینہ گرم تنور ہویا
وہ نور جن کوں جس نے دیا یہ چاند چودس کا حق نے دیا
یہ سورج ہے وہ آپ پیا پر نور ہویا مشہور ہویا
وہ قد پیا کا قامت ہے یا شعلہ نور کرامت ہے
یہ قد نہیں ہے قیامت ہے وہ دھوم پڑی ہے شور ہویا
تیرے مکھڑے پر اک خال پیا جس دیکھا گھر پامال کیا
یہ نقطہ ہے بسم اللہ کا جو مصحف پر مسطور ہویا
وہ خال لبوں پر زور پڑا جیوں پھل پر عاشق بھور پڑا
یا زر پر آکر چور پڑا یا قند شکر پر مور ہویا
بن پانی چاہ معمور نہیں بن جانی دل مسرور نہیں
بن درد عمل منظور نہیں جو عاشق ہے مغفور ہویا
اس خاکی تن کوں چار کروں سر صدقہ تیرے وار کروں
تجھ باجھ نہ دوجا یار کروں یہ نازک تن منظور ہویا
جس سر انا الحق جان لیا تس خون جگر کا چھان پیا
سر کہہ کر جیو قربان کیا وہ چڑھ سولی منصور ہویا
وہ مجنوں آپی لیلیٰ ہے وہ یوسف آپ زلیخاں ہے
وہ وامق آپے عذرا ہے مشتاق ہو خود مغرور ہویا
دن رت پیا بن سوتی ہوں دو نین ہنجو بھر روتی ہوں

مکھ لعل شراب سوں تھوتی ہوں نت رونا مجھ دستور ہویا
تیری درسن کی مدماتی ہوں تری کاج سوں نت بر لاتی ہوں
ترے گن کی مالا گاتی ہوں رگ تاراں تن تنبور ہویا
دن رات جو تیری چاہ مجھے یہ آگ برہ کی ناہ بوجھے
نت جلتی ہیری مانہہ مجھے جل سرمہ تن کوہ طور ہویا
یہ شعر عجب استاد سوں ہے یہ دلبر حسن آباد سوں ہے
یہ ریختہ شاہ مراد سوں ہے مقبول ہویا منظور ہویا

یہاں ایک ضروری امر کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اوپر میں نے جس قدر پنجابی اردو نظموں کے نمونے دیئے ہیں، وہ اس تحریک سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے جو بارہویں صدی کے ربع دوم میں دہلی میں ولی اورنگ آبادی کے دیوان یا خود ولی کی آمد سے تعلق رکھتی ہے۔ میر حسن کا بیان ہے کہ ولی عہد عالمگیر میں دہلی آئے، لیکن آزاد 3 سن جلوس محمد شاہی اس کی آمد کا سال بتاتے ہیں۔ میں آزاد کے بیان کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ ولی کا محمد شاہ کے عہد میں دہلی میں موجود ہونا خود ولی کے ایک شعر سے جو مولانا آزاد نے ''آب حیات'' میں نقل کیا ہے، ثابت ہے:

دل ولی کا لے لیا دلّی نے چھین   جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

گویا بقول آزاد ولی 1135ھ میں دہلی وارد ہوئے اور اس عہد سے دہلی میں اردو غزل گوئی عام رواج پا گئی، ورنہ اس سے پیشتر شعراء کے لیے یا فارسی یا بھاشا کا میدان کھلا تھا جس میں وہ اپنی طبیعت کی صنعت گری کی بہار دکھاتے تھے۔ اردو میں غزل گوئی کی بنیاد اگرچہ ولی کے عہد سے بہت قدیم ہے، لیکن ہندوستان میں اولیت کا تاج ولی کے سر پر ہی رکھا گیا ہے۔ چنانچہ ہمارے قدیم تذکرہ نگاروں نے اسی کو اردو شاعری کا آدم مانا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں ولی کے طفیل اس قسم کی شاعری جو قدرتاً مسلمانوں کی طبیعت اور رجحان کے زیادہ مناسب تھی، رواج میں آئی اور یہی وجہ ہے کہ یہ تحریک بڑی سرعت کے ساتھ اس عہد کے تعلیم یافتہ طبقے کے قلوب میں گھر کر گئی کیونکہ اس شاعری کا دارومدار زیادہ تر فارسی جذبات پر تھا اور فارسی خواں گھر گھر میں موجود تھے۔ درحقیقت اردو شاعری فارسی کا پرتو ہے۔ فارسی کے تمام قواعد وضوابط عروض واقسام شعر کو اس میں مستقل کر لیا گیا ہے۔ وہی بحریں ہیں، وہی ردیف وقافیہ کی پابندی، وہی خیالات وجذبات، صنائع بدائع، تشبیہات استعارات وتلمیحات وغیرہ وغیرہ، لیکن پنجاب کی نظموں کے گذشتہ نمونے کئی امور میں مختلف ہیں۔ اول تو ان کی بحریں زیادہ تر مقامی ہیں۔ دوسرے ان میں اگرچہ ردیف کی پابندی کی جاتی ہے لیکن قافیے کا لانا لزوم مالایلزم مان لیا گیا ہے۔ پھر وہ جذبات میں فارسی سے مختلف ہیں۔ ہندی میں عاشق اکثر عورت ہوتی ہے۔ ان نظموں میں بھی یہی خصوصیت موجود ہے۔ وہ فارسی صنائع وبدائع وتشبیہات سے

بالکل عاری ہیں اور اس شاعری کا مدار ایہام پر نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم ولی اور اس کے پیروؤں میں دیکھتے ہیں۔ ہم کو تعجب آنا چاہیے کہ اردو کے لیے دو مختلف مرکزوں میں دونوں تحریکیں ایک ہی وقت میں مصروف کار ہیں، لیکن ایک کو دوسری کی خبر نہیں ہے۔

اس صدی کے تیسرے ربع میں دہلی کی تحریک پنجاب میں پہنچ گئی ہے اور مختلف نظموں میں ہم اس کا اثر دیکھتے ہیں۔ سب سے پیشتر جذبات میں اور زبان میں تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ پرانے الفاظ اکثر متروک کر دیے جاتے ہیں اور تکلف رفتہ رفتہ مذاق میں غالب آنے لگا ہے۔ قدیم سادگی برطرف ہو جاتی ہے اور طبائع میں میلان زیادہ تر تصنع کی طرف پیدا ہو گیا ہے۔ بحریں فارسی اختیار کر لی جاتی ہیں اور ردیف قافیے کا التزام ضروری مان لیا جاتا ہے۔

(برائے تفصیل رک: شاہ مراد خانپوری، م۔ 1114ھ۔ ''گلزار شاہ مراد'' مرتبہ قاضی سراج الدین خانپوری، راولپنڈی۔ 1908ء۔ ''کلام شاہ مراد'' چکوال: اردو مجلس 1966ء و اسلام آباد: لوک ورثہ 1980ء: پنجاب کے قدیم اردو شعراء۔ متذکرہ صدر، ص 17۔ 19...... م۔ا۔ چ)

محمد جان

محمد جان حضرت غلام قادر کے مرید اور سالے ہیں۔ تصوف میں صاحب تصنیف اور فارسی و اردو میں شعر کہتے ہیں۔ یہی محمد جان مثنوی ''رمز العشق'' کے کاتب ہیں جس کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔ میں اپنے عزیز شاگرد سید ذکاء اللہ تھرڈ ایئر اسلامیہ کالج کا ممنون ہوں کہ انہوں نے چند اوراق محمد جان کی نظموں کے میرے لیے بہم پہنچائے۔ نمونہ کلام:

بلبل کی طرح دل کے جھلانے کوں کیا کہیے
زنجیر میں زلفوں کی پھس جانے کوں کیا کہیے
رو رو کے عبث دل کے جل جانے کوں کیا کہیے
بسمل ہو تڑپتا ہے' مر جانے کوں کیا کہیے
کیا کام کیا دل نے' دیوانے کوں کیا کہیے
سر اپنے کو ہر صبح پتھر سوں پٹکتا ہوں
کر یاد پری رو کی رو رو کے سسکتا ہوں
دو نین دو دریا کر دن رین پھڑکتا ہوں

کیا کام کیا دل نے' دیوانے کوں کیا کہیے
کچھ کرتے ہو اے یارو مجھ زار کی اب کاری
پلکوں کی خدنگوں سیں دل پر ہے ستم گاری
دلبر کے جفا سیتی ہر وقت گھر باری
ہر صبح کا وہ رونا' ہر شام کی یہ زاری
کیا کام کیا دل نے' دیوانے کوں کیا کہیے
کر یاد تیری صورت جی وارنے کرتا ہوں
سر کاٹ کے گردن سوں تجھ پاؤں پہ دھرتا ہوں

تجھ تیغ تلے آکر دم ایک نہ بھرتا ہوں
ہنستا ہوں خوشی سیتی پھر شوق سیں مرتا ہوں
کیا کام کیا دل نے، دیوانے کوں کیا کہیے
تجھ تیغ تلے کہہ تو ،سر اپنے کوں دھر دیجے
خونابہ آنکھوں کا ہر شام و سحر پیجے
قسمت موں لکھا جو ہے دنیا موں سو بھر لیجے
مرنا ہے لکھا سر پر کیا اور پہ دھر دیجے
کیا کام کیا دل نے، دیوانے کوں کیا کہیے
آ ذبح نہ کر ہم کوں ڈر اپنے خدا سیتی
کیا قتل غریبوں کوں کرتا ہے حیا سیتی
تن پرزے ہی پرزے ہے تجھ جور و جفا سیتی
رو رو کے پرکھتا موں ہجراں کی بلا سیتی
کیا کام کیا دل نے، دیوانے کوں کیا کہیے
کیا پوچھتے ہو مجھ سیں غم یار کا کھاتا ہوں
کر لخت جگر اپنا آنکھوں سے بہاتا ہوں
محبوب کے ہجراں میں دن رین لنگھاتا ہوں
گزرے ہے جو کچھ مجھ پر دلبر کوں سناتا ہوں
کیا کام کیا دل نے، دیوانے کوں کیا کہیے
ہنستے ہو ارے یارو کچھ چشم مروت ہے
مرتا ہوں میں غم سیتی کچھ تجھ میں فتوت ہے
خوں آنکھوں سیں جاری ہے کچھ مجھ میں نہ قوت ہے
کچھ میری کرو کاری کیا ایسی اخوت ہے
کیا کام کیا دل نے، دیوانے کوں کیا کہیے
سنتا ہے محمد جاں کیا گریہ و زاری ہے
خاموش صفت ہو ناں کیا بات پیاری ہے
وہ فضل کرے اپنا یہ بات نیاری ہے
مغرور عبادت پر احسان شماری ہے

کیا کام کیا دل نے، دیوانے کوں کیا کہیے

یہاں ایک نامعلوم شاعر کی غزل کے چند اشعار دیے جاتے ہیں جن کے لیے گویا انشا اللہ خاں نے مصرع "بحرِ رجز میں ڈال کے بحرِ رمل چلے" لکھا ہے۔ اس میں پہلا شعر بحرِ رجز میں، دوسرا رمل ورجز میں تیسرا رمل اور چوتھا رمل ورجز میں ہے۔ چنانچہ:

اس شمع رو کوں دیکھ کے دل جل کے دیوانہ ہوا
تیری گرہ کا کیا گیا میں سب سیں بیگانہ ہوا
ہے تجھے میوہ کی خواہش چل توڑیں گے باغ میں
تیری تو خاطر باغ میں انگور بیدانہ ہوا
بے وفائی مت کرو اے لیلیٰ صاحب جمال
مثل مجنوں کے معا سرمست دیوانہ ہوا
اے صنم تم مت نہ پوچھو بات میرے حال کی
تیرے کناں کو دیکھ کر میں آپ دردانہ ہوا

اس نقص کے باوجود زبان میں بے حد اصلاح ہو گئی ہے۔

میاں احمد

غزل ذیل ایسی بیاض سے منقول ہے جو 1161ھ میں لکھی گئی ہے:

چوں شب گذشت صبح چڑہی تب سمجھ پڑی
جاگن نہ ہوا ایک گھڑی تب سمجھ پڑی
جب مرگ کا پیالہ پیا آنکھ کھل گئی
جب کھاٹ پر چو دیہ دھری تب سمجھ پڑی
تو شک نہالیوں سے مجھ فکر نا ہوا
جب ایت زیر سیس دھری تب سمجھ پڑی
جس وقت یار چھوڑ چلے ہم رہے نکو
منکر نکیر پوچھ دھری تب سمجھ پڑی
حساب کا جو وقت ہوا آنکھ کھل گئی
چیٹھی عمل کی آپ پڑہی تب سمجھ پڑی
عمرا تمام گذر گئی عمل نا ہوا
جب عمر کی دوپہر ڈہلی تب سمجھ پڑی
احمد کوں (کذا) طرف کوئی نہیں جز خدا رسول
جب فضل پر امید دھری تب سمجھ پڑی

محمد

محمد بارہویں صدی کے منصف دوم سے علاقہ رکھتے ہیں۔ مربع آئندہ انہی کا کلام ہے:

قربان خدا کے ہوں جس راہ دکھالا ہے
اور ہوش دیا مجھ کوں جس سیتی یہ بھالا ہے
محبوب مرا سندر سبہ جگ کا اوجالا ہے
اور عروش فرش کے بیچ سب چیز سیں بالا ہے
دل اپنا میں خوں کر کر آنکھوں سیں بہاتا ہوں
اور خون جگر تائیں ہر آن میں کھاتا ہوں
فریاد و فغاں سیتی اک دھوم مچاتا ہوں
پھر یار نہ پہنچا (پہچھ تا) ہے یہ کون سا چالا ہے
آہوں سیں مری بدری افلاک اوپر چھائی
سینے سیں نکس آتش ہو برق عجب دہائی
نینوں سے برس بوندیں ہر نہر اچل آئی
اس عشق کی شورش کا کچھ راہ نرالا ہے
دن رات ترپھتا ہوں اس یار کی صورت کوں
آرام گیا مجھ سوں پہنچا ہوں مہورت کوں
تاجاں سیں قدم کر کر جا یار کی مورت کوں
سر کاٹ دھروں آگے یہ طور سکھالا ہے
بن یار کے اب جینا دشوار نظر آوے
یا جان نکس جاوے یا اس کی خبر آوے
محبوب نہیں آتا کس طور صبر آوے
لاچار اگن لا کر جیو جان کوں جالا ہے

اے شاہ مرے والی مرتا ہوں بناں تیرے
مجھ سار کے تجھ در پر کتنے ہی پڑی چیرے
الفت میں تیری برہیں رہتی ہیں مجھے گھیرے
پھر ہاتھ سیں گل لالے گر در پہ بہالا ہے
تم غوث جہاں کے ہو سکھ بخش تمہارا ہے
دکھیا ہوں پڑا مرتا تجھ آگے پکارا ہے
دیدار دو اپنا تم ہجراں نیں مارا ہے
کوکر ہوں تیرے در کا تیرا ہی سہالا ہے
تجھ طرف برا دیکھوں شاید کہ کرم ہووے
اس جلنے سیں چھٹ جاؤں جاں میری تے سکھ پاوے
دل ماتی سیں نکس آوے اور مکھ کوں تج دھووے
دنیا کے تعلق سوں یہ دیس نکالا ہے
بس کر توں محمد اب اس قصہ عجائب سوں
کس کس نے کیا اورک اس بات غرائب سوں
پیر اپنے سیں تو جاکر کر دور نوائب کوں
جن پیر کی صورت سوں سب جگ کا اجالا ہے

(از بیاض پروفیسر آذر)

بدھ سنگھ

بدھ سنگھ کا زمانہ بارہویں قرن ہجری کے نصف ثانی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی غزل ایسی بیاض سے نقل کی جاتی ہے جو 1181ھ سے قبل کی نوشتہ ہے۔ وھو ہذا:

دھودا بہت جن کو میں پایا نہیں ہنوز
عیا رقیب ساتھ جو آیا نہیں ہنوز
از یک نگاہ ترچھی ہوا خاک سار دل
دامن کے اوس کے ہاتھ لگایا نہیں ہنوز
شمشیر چشم کھینچ ڈراتے ہو کیا جن
سرمہ کے سنگ سوں آپ دوایا نہیں ہنوز
اس زلف پیچ دار کیا پیچ پیچ دل
مار سیہ کوں ہاتھ لگایا نہیں ہنوز
بدھ سنگھ نہ ہو تو بیدل ز اغماض دلفریب
گر ہے جواب صاف خط آیا نہیں ہنوز

بارہویں صدی کے ایک پنجابی سکھ سے اس سے بہتر نمونہ شاعری کی توقع کرنا غالباً ہماری زیادتی ہوگی۔

خفیہ بیگم

ایک دلچسپ پہلو اس عہد کا یہ ہے کہ عورتیں بھی اردو میں شاعری کرنے لگی ہیں۔ان میں خفیہ بیگم تخلص والدہ میر صابر ہیں۔ذیل کی شاعری انہیں کی یادگار ہے:

اتنا سخن ہے دل موں سمائی ہو جاوے گی
جہاں موں سوں بات نکسی[1] پرائی ہو جاوے گی
اب پھول سیں جدا نہ کرو عندلیب کوں
فصل خزاں میں آپ جدائی ہو جاوے گی
اس آرسی سے دور کرو زنگ کینہ کا
تب تو دلوں میں آ کے صفائی ہو جاوے گی
یا تو فغاں کرے گی مری کوچہ اوسے اثر
یا آہ میری تیر ہوائی ہو جاوے گی
میرے بلانے سے ترا کوچہ گھٹ نہ جاوے گا
پر عاشقوں میں میری بڑائی ہو جاوے گی
میرا خیال لوگوں نے پکڑا ہے آ کے کیوں
ناحق کسی سوں میری لڑائی ہو جاوے گی
اس دعویٰ میں تو خفیہ خدا کوں رکھوں ہوں میں
اوس کی طرف تو ساری خدائی ہو جاوے گی

حاشیہ:

1- ایک دن سودا کے ہاں میر سوز تشریف لائے۔ان دنوں شیخ علی حزیں کی ایک غزل کا چرچا تھا جس کا یہ مطلع ہے:

ی مرقیم بجاناں سر راہے گاہے
وہم از لطف نہاں داشت نگاہے گاہے

میر سوز مرحوم نے اپنا مطلع پڑھا:

نہیں نکلے ہے مرے دل کی اپاہے گاہے
اے فلک بہر خدا رخصت آہے گاہے

مرزا سن کر بولے میر صاحب بچپن میں ہمارے ہاں پشور کی ڈومنیاں آیا کرتی تھیں یا تو جب یہ لفظ سنا تھا یا آج سنا ہے۔ میر سوز بچارے ہنس کر چپ ہو رہے (آب حیات)۔

میر صابر

میر صابر نے اس کا جواب دیا:

کب جانتے تھے تو جھ سیں جدائی ہو جاوے گی
غم کی منادی دوکھ کی دوہائی ہو جاوے گی

ہوئے دے مجھ کوں اپنا تصدق اب ایک بار
کوچہ اس تمھیں پیارے تیری بھلائی ہو جاوے گی

گر سینہ صاف ہو کھلے بنداں گلے لگو
اتنے میں دل کی کام روائی ہو جاوے گی

ابرو کی چین دور کر آخر سنو گے تم
یہ ترشی ایک روز مٹھائی ہو جاوے گی

دیکھوں نگاہ قہر سوں آوے اگر رقیب
اوس بے حیا کوں چشم نمائی ہو جاوے گی

صابر نیہ بات جس نے کہی آفریں اوسے
جہاں منہ سے بات نکسی پرائی ہو جاوے گی

مخمس ذیل بھی اسی عہد کا معلوم ہوتا ہے:

بات پر خوف ٹھگ لگا ہے گا — راہ میں چور کا دبا ہے گا
رین اندھیار سوں دنا ہے گا — یہ تجھے سوونا خطا ہے گا
جاگیو جاگنا بھلا ہے گا

جاگدے پر نہیں پڑے کوئی چور — جاگدے پر نہیں کرے کوئی زور
جاگنے کا نفع جو ہے گا زور — جاگنا خوب ہے خصوصاً بھور
جاگیو جاگنا بھلا ہے گا

اے بتاؤ تو جھے نہیں سونا — سوونا پونجی ہاتھ سوں کھونا

پونچی پھر نار ہاتھ میں ہونا — بے خبر اس سرا موں نہیں سونا
جاگیو جاگنا بھلا ہے گا

اے مسافر تو جھے ہے جانا دور — ماندہ ہو کر تھکا ہیں چکنا چور
اس سرا بیچ تو نہ ہو مغرور — نیند کے ہاتھ مارے گئے ہیں سور
جاگیو جاگنا بھلا ہے گا

کون اس ٹھانو میں رہا ٹھیرا — ڈاکہ ہے ہاتھ موں دریں صحرا
باہر و پر نہ بھول وہ لہیرا — ماہرو ہوت اپنا گھیرا
جاگیو جاگنا بھلا ہے گا

تیں جو کوچھ کرنا ہے کر لے آج — پھر نہ لہراوے گا یہ تیرا راج
اولٹ ماریں گے تیرے سر سوں تاج — اس وقت کیا رہے گا تیرا لاج
جاگیو جاگنا بھلا ہے گا

کوچھ سمجھ بوجھ اے میرے ناداں — اپنی غفلت سوں توں تہو شاداں
رات کوں سنتا ہیں تو اپنے کاں — دمبدم بولتے ہیں یہ گشتی باں
جاگیو جاگنا بھلا ہے گا

ساتھ تیرے رہیں فرشتے دو — نیک بد کرتا ہیں سو لکھیں او
قبر میں پوچھیں گے فرشتے دو — اس وقت کیا جواب دے گا او
جاگیو جاگنا بھلا ہے گا

رحمٰن

اگر مجھ باغ میں دیکھے تو بلبل در چمن لرزے
میرے غم کی اگن سن کر سو دوزخ کی اگن لرزے
جنیؤ پہن کر گل میں کروں پھر بت پرتی میں
مرا ثابت کفر دیکھ کر یکایک برہمن لرزے
اگر مجنوں کی تربت پر گذر جاؤں دیوانہ ہو
جو میرے حال کوں دیکھے تو مجنوں در کفن لرزے
اگر رحمان کہیں جگ میں سخن خوبی نزاکت سوں
عجب کیا ہے غزل سن کر مگر سارا دکن لرزے

(از بیاض پروفیسر آذر)

نعمت اللہ

جس دل میں ہے غم یار کا عشرت کے تئیں کہہ کیا کرے
جو تشنہ لب دیدار کا شربت کے تئیں کہہ کیا کرے
جو عشق کی آتش میں جل طالب ہویا دیدار کا
دوزخ سیں وہ ڈرتا نہیں جنت کے تئیں کہہ کیا کرے
جو عشق کے بازار میں بدنام اور رسوا ہویا
طالب نہیں وہ نام کا عزت کے تئیں کہہ کیا کرے
اسباب دنیا ترک کر جو بے سر و سامان ہویا
حاجت اوسے کیا مال کی دولت کے تئیں کہہ کیا کرے
لقمان افلاطون جیسے دنیا سیتی جاتے رہے
دارو نہیں کوچہ موت کا حکمت کے تئیں کہہ کیا کرے
جب عشق خوباں از ازل ہے نعمت اللہ کے نصیب
تقدیر پھیرے کس طرح قسمت کے تئیں کہہ کیا کرے

(از بیاض پروفیسر آذر)

بارہویں قرن کا ربع آخر پنجاب میں بے شمار شعراء دیکھتا ہے' جو کثرت کے ساتھ اردو شاعری کرتے ہیں۔ زبان صاف ہو جاتی ہے۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ ان کے کلام میں اور ہندوستانیوں کے کلام میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس عہد کے شعراء میں ان لوگوں کا شمار ہونا چاہیے۔ نامدار خاں دت' محمد غوث بٹالوی' دلشاد پر سروری (پسروری)' خوش دل' فدوی' شاہ مراد' رام کشن' وارث شاہ وغیرہ لیکن سب سے پیشتر بعض ایسی نظموں کا ذکر کیا جاتا ہے جو سکھوں کی تاریخ سے گہرا تعلق رکھتی ہیں اور ان کی تاریخ تصنیف ہم کو معلوم ہے۔

نامدار خاں دت[1]

رنجیت سنگھ کا دادا چڑت سنگھ سکر چکیا مثل کا بانی ہے' جو امیر سنگھ کی بیٹی سے شادی کر کے بہت طاقتور ہو گیا۔ ابتدا میں اس نے ایمن آباد کے مغل فوجدار کو قتل کر کے شہر کو لوٹ لیا۔ 1757ء میں اس نے گوجرانوالہ میں ایک قلعہ تعمیر کیا جس پر حاکم لاہور نے اس کی بڑھتی طاقت کو پست کرنے کے لیے اس پر چڑھائی کی' لیکن چڑت سنگھ اور اس کے اتحادی جان توڑ کر لڑے اور حاکم کو شکست دی۔ اس فتح نے چڑت سنگھ کے حوصلوں کو اور بھی بلند کر دیا۔ 1167ھ/ 1762ء میں احمد شاہ کے ہندوستان آنے پر چڑت سنگھ نے اپنے اہل و عیال کو جموں بھیج دیا اور آپ افغانی فوجوں کے دائیں بائیں لگا رہا۔ احمد شاہ کی واپسی کے بعد چڑت سنگھ نے وزیر آباد لوٹ لیا اور وہاں کے مغل فوجدار کو نکال کر خود شہر پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد احمد آباد پر قبضہ کر لیا۔ روہتاس اس نے نور الدین خان بامیزئی سے چھین کر دھنی' چکوال' جلالپور' پنڈ دادن خاں پر قبضہ کر لیا۔ صاحب خاں عامل پنڈ دادن خاں نے بھاری رقم دے کر اپنی جان بچائی۔ 1188ھ/ 1774ء کے قریب جموں کا راجا رنجیت دیو اپنے فرزند اور ولی عہد برج راج سے سخت ناراض تھا اور چاہتا تھا کہ برج راج دیو کے بجائے اپنے دوسرے فرزند دلیل سنگھ کو ولی عہد بنا دے۔ برج راج دیو نے چڑت سنگھ کو اپنی امداد کے لیے بلایا۔ چڑت سنگھ' حقیقت سنگھ اور جے سنگھ (کنہیہ مثل) کے ساتھ مل کر 1188ھ/ 1774ء میں ایک بڑی فوج کے ساتھ جموں کی طرف روانہ ہوا۔ رنجیت دیو نے مقابلہ کے لیے چمبہ' کانگڑہ' نور پور' بسیر سے اور بھنگی مثل سے امداد منگوائی۔ بسنتی ندی کے قریب مقابلہ ہوا اور ایک غیر فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں اتفاق سے چڑت سنگھ اس کے کسی ہمراہی کی بندوق پھٹنے سے ہلاک[2] ہو جاتا ہے۔ اس وقت نامدار خاں دت چڑت سنگھ کا مرثیہ لکھتا ہے:

افسوس ہے جہاں کے ثبات اور قرار پر
اس باغ بے وفا کی خزاں اور بہار پر
اس پیر زال عروس نما کے نگار پر
دو دن کی زندگانی ناپائدار پر
دل بستگی نہ کر دم بے اعتبار پر
احوال چڑت سنگھ کا لکھتا ہوں فی المثل

پہونچا جب اس کا حکم قضا سیں دم اجل
آیا ولایت اپنی میں لے کر ہجوم دل
فرصت نہ دی قضا نیں چلا چل ایک پل
آیا اجل کا شیر ہرن کے شکار پر
آیا ہجوم فوج سیتی کرکے اضطراب
جیوں صبحدم جلال سوں چڑتا ہے آفتاب
تنہا ہو اپنی فوج سوں کر جنگ پر شتاب
ہنگامہ ہجوم مخالف نہ کر حساب
یک بارگی دلیر چلا کار زار پر
دل موں غرور اپنی شجاعت کا دھر چلا
گویا کہ رخصت اپنے رفیقوں کوں کر چلا
تقدیر کے حساب سیتی گرچہ مر چلا
لیکن خیال مرگ سیتی بے خبر چلا
پوچھا نہ کچھ جو کھیل ہے دم کے شمار پر
جیدھر سون توپ رہکلہ چلتی تھی بے شمار
آیا اوسی طرف سیں صدا کرتا مار مار
تھی ہاتھ میں تفنگ ولایت کی برق وار
کر جاگی کوں چاک پیالہ پڑی شرار
کندھے سوں تیکی جلد گئی سو کو مار کر
اوڑ کر گئی تفنگ کی چھپر دماغ میں
جیوں تند باد پون کا چھکا چراغ میں
تھا منتظر نہنگ اجل کا سراغ میں
عالم کے دل موں داغ لگا اور داغ میں
افسوس ایسے مرد کا مرنا دیار پر
تیری قضا سیں چپر بندوق تیز تھا
یک لخت دور کاسہ سر ریز ریز تھا
ہر سو صدائے کوچ دی خیز خیز تھا

دھوون نہ تھا جہان گوں مگر رستخیز تھا
عالم کے دل موں داغ لگا یادگار پر
دنیا میں چند روزہ جو ہے زندگی مراد
اوس مرد کوں بخوبی و نیکی کریں گے یاد
دنیا میں نیک نام تھا عقبی میں روے شاد
لکھتا ہوں مجمل اس کی تاسف کا یاد داد
تقریر بات فرض تھی یہ نامدار پر

(از بیاض پروفیسر آذر)

یہ نظم اس کی معاصر نظموں سے جو دہلی اور لکھنؤ میں ان ایام میں لکھی جا رہی تھیں' زبان کے لحاظ سے کم نہیں ہیں۔ بیان حقیقت اور جذبات کی ادائیگی میں انتہا درجے کی سادگی سے کام لیا گیا ہے اور مبالغہ نام کو بھی نہیں۔ واقعات ایسے پیرایے میں ادا ہوئے ہیں جو بالکل قدرتی اور فطرتی ہیں ذرا مصرع:

جوں صبحدم جلال سوں چڑتا ہے آفتاب

پر غور کرو۔ بعض الفاظ ایسے ہیں جن سے مصنف کے پنجابی ہونے کا سراغ چلتا ہے۔ مثلاً جھنکا بجائے جھونکا۔ چپڑ بمعنی ریزہ و کرچ۔

تاریخ کے برخلاف نامدار خاں کا بیان ہے کہ یہ خود چڑت سنگھ کی بندوق تھی جو پھٹی اور خود چڑت سنگھ کے ہاتھوں میں پھٹی یعنی کوئی چنگاری جاگی سے اڑ کر بندوق کی پیالی میں (نپل کے استعمال سے پہلے اس کے بجائے بندوق کی نال میں ایک سوراخ ہوا کرتا تھا جس سے بارود کا تعلق باہر سے کوٹھی کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ یہ سوراخ جو باہر کی طرف سے پیالی کی شکل کا ہوتا تھا' پیالی کہلاتا تھا) جاگی یعنی بتی کے ذریعے سے پیالی کی بارود آگ لیتی تھی اور کوٹھی کے بارود کو مشتعل کر دیتی تھی جس سے بندوق چلتی تھی۔ اتفاقیہ گر گئی۔ چڑت سنگھ نے بندوق پھینک دی اور اس کی بعض کرچیں اچھل کر اس کے سر میں لگیں جس سے اس کا سر پاش پاش ہو گیا۔ ہمیں اس بات کو چڑت سنگھ کی وفات کے سلسلے میں زیادہ صحیح تسلیم کرنا چاہیے۔

حواشی:

1- دت موہیال برہموں کی ایک شاخ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بھاردواج رشی کا لڑکا دان سے متنفر تھا اور اپنی محنت اور زور بازو سے کما کر کھانا چاہتا تھا۔ جب افلاس سے مجبور ہوا تو اس نے سپہ گری سیکھی اور اس فن میں ماہر ہو گیا۔ اس کا نام درون اچارج تھا۔ یہی بعد میں کوروؤں اور پانڈوؤں کا اتالیق مقرر ہوا اور مہابھارت کی جنگ میں سپہ سالار رہا۔ درون اچارج کی اولاد نے سپہ گری کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ چنانچہ دت بھی اسی کی اولاد میں محسوب ہے۔ یہ لوگ بہادری اور سخاوت میں مشہور ہیں اور خیرات لینے کے بجائے خیرات

دیتے ہیں۔ چنانچہ:

دت داتے دان کے پورے ہاتھ کے کبی تیغ کے سورے

کئی دت حسینی کہلاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ کی مدد پر دشمنوں سے لڑتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ملک عرب میں بھی ان کا راج تھا۔ راہب جو عرب کے تخت پر بیٹھا دت تھا۔ بعض ایسے واقعات کی بنا پر کہا جاتا ہے: دت سلطان آدھے ہندو آدھے مسلمان (گلشن سو بیالی از گوری شنکر) یہ اطلاع مسٹر کنہیا لال ایم۔ اے نے ہم پہنچائی ہے۔

2- تاریخ پنجاب (انگریزی) از سید محمد لطیف

محمد غوث بٹالوی

سکھوں کی کنہیہ مثل کا بانی جے سنگھ ہے۔ یہ موضع کاہنہ کا جو لاہور سے پندرہ میل جنوب میں ہے' باشندہ تھا۔ 77-1176ھ/ 1763ء میں احمد شاہ ابدالی کی پنجاب سے واپسی کے بعد جے سنگھ نے قصور پر حملہ کیا اور ایک ماہ کے محاصرے کے بعد اس پر قابض ہو گیا۔ جے سنگھ سرہند کی اس جنگ میں بھی شامل تھا جس میں زین خاں مارا جاتا ہے۔ اس کے بعد جے سنگھ ایزد بخش رئیس گھروٹہ کو ایک سخت جنگ کے بعد اپنا مطیع کر لیتا ہے۔ نور پور' دتار پور اور سیپہ کے رؤسا اس کے باجگذار بن جاتے ہیں۔ بکریہ کو بہت جلد تسخیر کر لیتا ہے۔ بعد میں سنسار چند والی کٹوچ کی امداد کے لیے' جو کانگڑہ کا دعویدار تھا' روانہ ہوتا ہے اور فتح کر کے خود قابض ہو جاتا ہے۔ قصور پر سخت جنگ کے بعد دوبارہ قابض ہو جاتا ہے مگر نظام الدین خاں پھر اس پر قبضہ کر لیتا ہے۔ بٹالہ اور کلانور پر رام گڑھیا مثل والوں کا قبضہ تھا۔ جے سنگھ نے جسا سنگھ رام گڑھیا کو ستلج پار نکال کر ان مقامات پر بھی قبضہ کر لیا' لیکن جے سنگھ نے مسلمانان بٹالہ کو سخت اذیتیں پہنچائیں۔ شرفا کو لوٹ لیا اور ان کے مکانات جلا دیئے۔ حضرت شیخ غلام غوث بٹالوی (متوفی 1198ھ) کو جو حضرت شیخ غلام قادر کے فرزند اور جانشین تھے' قید کر دیا اور ان کا اثاث البیت تک لوٹ لیا۔ اسی سلسلے میں ان کا بے نظیر کتب خانہ لوٹ لیا گیا۔ مصنف "تذکرۃ الابرار" اس کے متعلق کہتا ہے:

> "تا آنکہ قدم در میدان وقاحت گذاشتہ دست تعدی بر اماکن و مساکن آنحضرت دراز کردہ متاع واشیا و مواد و اسباب لزومی و جمیع اثاث البیت بغارت بردند خصوصاً جواہر نایاب کتب کہ از نوادر روزگار و عجائب عالم بمرور دہور و چندیں مساعی جمیلہ و انواع ترددات جمع آمدہ شب و روز در مدرسہ شریفہ مستعمل طلاب بود بدمست آں چناں جہال افتاد کہ کتاب را از کباب و اسباب را از اسباب فرق نمی کردند۔"

1198ھ/ 1783ء میں سنسار چند والی کٹوچ' جسا سنگھ رام گڑھیا اور مہا سنگھ پسر چڑت سنگھ نے باتفاق ہمدگر جے سنگھ پر چڑھائی کی اور موضع اچل کے پاس بٹالے سے آٹھ میل کے فاصلے پر فریقین میں جنگ ہوئی۔ جے سنگھ کی فوجیں اس کے فرزند گوربخش سنگھ کے زیر کمان تھیں۔ گوربخش بڑی بہادری سے لڑا'

لیکن موت کا کیا علاج۔ قضا کار ایک تیر اس کے سینے پر آ کر لگا جس نے عین میدان جنگ میں اس کا کام تمام کر دیا۔ سپہ سالار کی موت نے جنگ کا فیصلہ کر لیا اور جے سنگھ کو شکست مل گئی۔ بوڑھا جے سنگھ اپنے نوجوان اکلوتے بیٹے کی وفات دیکھ کر بالکل بددل ہو گیا۔ اس نے تیر و ترکش پھینک دیئے' گھوڑے سے اترا اور زار و قطار روتا ہوا دشمن کی گولیوں کی زد میں جا کھڑا ہوا۔ غنیم اس بوڑھے جنگ آزما کی نوحہ وشیون سے بے حد متاثر ہوا اور کسی نے اس پر حملہ نہیں کیا۔

گوربخش سنگھ کی وفات کے موقع پر بٹالے کا ایک شاعر محمد غوث جو بٹالے کی کچہری میں گوربخش سنگھ کی فوجداری میں ملازم تھا اس کا مرثیہ لکھتا ہے۔ مرثیہ دراز ہے۔ اس لیے یہاں صرف چند اشعار پر قناعت کی جاتی ہے:

بہار اندر آیا تھا باغ جہاں — قضا سوں پڑی جھول باد خزاں
گرا آہ پاؤں سے سرو رواں — پڑا ہر طرف میں یہ شور و فغاں
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
کدھر موتیاں والا ہے نوجواں

ہویا ہے یہ ماتم سوں غم بے شمار — جگت اس مصیبت سوں ہے بے قرار
سر اپنے پہ غم سوں اوٹھا خاک ڈار — تاسف سوں کہتے ہیں سب شہر دار
کدھر ہے وہ گور بخش سنگھ پہلواں
کدھر موتیاں والا ہے نوجواں

بوری ساعت اندر کیا اس نے جنگ — ہویا کافیہ زندگانی کا تنگ
چھوٹی غیب سیں گولیے از تفنگ — لگی پہلو پر آ چو تیری خدنگ
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
کدھر موتیاں والا ہے نوجواں

کیا اس قدر رن موں جا کار زار — کہ دشمن ہویا بھاگنے کوں تیار
بحکم قضا کار پروردگار — یہ حکمت ہویا پڑ گئی یہ پکار
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
کدھر موتیاں والا ہے نوجواں

ہویا گل ہے جے سنگھ جی کا چراغ — خزاں اندر آیا جوانی کا باغ
مٹایا گورو نے خوشی کا سراغ — جگر موں لگا غم کا ہریک کوں داغ
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
کدھر موتیاں والا ہے نوجواں

پڑا شور ماتم کا ہر سو بسو زمانہ موں ہوتی ہے یہ گفتگو
نہ جیتا رکھا سنگھ کوں ست گرو نہ پوری ہوئی دل کی کوچھ آرزو
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
کدھر موتیاں والا ہے نوجواں

ہویا درد سوں چاند سورج سیاہ سیاہ پوش بیٹھے ہیں فوج و سپاہ
رضا ہے خداوند کی واہ واہ پڑے لوگ روتے ہیں سب دردخواہ
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
کدھر موتیاں والا ہے نوجواں

لکھا تھا نوشتہ موں یہہ ابتدا کہاں رہ سکے ہے رضائے خدا
سہہ افسوس اندر ہے شاہ و گدا ستم یہ ہویا ہے نہایت بڑا
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
کدھر موتیاں والا ہے نوجواں

رہا یونہی سب ملک کا بندوبست اجل نے وہی ہار آئی شکست
لکھا تھا خدا نے یہ روز الست کرافسوس بے سنگھ ملتا ہے دست
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
کدھر موتیاں والا ہے نوجواں

دلاور جواں مرد وہ شتر تن چھکا کوں اٹھا جا بنایا وطن
جوانی کے جوبن کا تھا وہ رتن نچھوڑا اجل نے کیے سو جتن
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
کدھر موتیاں والا ہے نوجواں

خزینے دفینے پڑے ہی رہے دوشالا اور لاچے دھرے ہی رہے
طویلہ موں گھوڑے کھڑے ہی رہے شتر بار زر کے گڑے ہی رہے
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
کدھر موتیاں والا ہے نوجواں

یہ کیسا ہویا ہے ستم سخت آہ بٹالہ کے سرسوں گیا پادشاہ
اسی درد سوں رات دن ہے سیاہ نزنکار ست گور کیے اپنی چاہ

کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
کدھر موتیاں والا ہے نوجواں

(از بیاض پروفیسر آذر)

اس نظم کو بھی گوربخش سنگھ کے واقعہ وفات کے متعلق موجودہ تاریخ سے اختلاف ہے یعنی بقول محمد غوث وہ گولی سے مارا جاتا ہے' جو اس کے پہلو میں لگتی ہے۔ تاریخ کا بیان ہے کہ اس کے سینے میں تیر لگا تھا۔ میں محمد غوث کے بیان کو ترجیح دوں گا' کیونکہ یہ مرثیہ گوربخش سنگھ کی وفات کے عین بعد لکھا گیا ہے۔

غزل آئندہ بھی محمد غوث کی ملک ہے:

گر میرے یار کوں خدا لیاوے — ناتواں شکر حق بجا لیاوے
دل تڑفتا ہے میرا اس کے سوا — قاصد اس کوں شتاب جا لیاوے
اپنے آنے سوں گر کرے کچھ عذر — دستخط اس کا پھر لکھا لیاوے
گر وہ آزردہ ہوئے مجھ سیتی — کر کے منت اوسے منا لیاوے
ایسا ہووے جو کوئی مجکوں بھی — پاس دلبر کے جا ملا لیاوے
یا سجن میرے کوں بہر عنواں — جس طرح جانے وہ رجھا لیاوے

ہو رہاں میں غلام غوث اس کا
جو کوئی یار کوں بلا لیاوے

دل محمد دلشاد پسروری

اردو کے علاوہ فارسی کے زبردست شاعر ہیں۔ پورا مصنف دوم قرن دوازدہم ان کا زمانہ ہے۔ نام دل محمد ہے۔ چنانچہ دیوان:

دل محمد بدہر نامم کنی گر از لطف شاد کامم
بنام دل شاد سر بر آرم دل محمد خوش از تو بادا

دیگر:

شاد آں کہ دل محمد اسمش دل شاد ازاں تخلص ماست

پرسرور (پرسرام پور) جس کو آج کل پسرور کہا جاتا ہے' وطن ہے اور دیوان اس عقیدے کی کافی تائید کرتا ہے چنانچہ:

خوش آں وطن بحلاوت ملاحت آباداں ست
جہان غیب و شہادت نظیر ہر دو جہاں ست
اگر تو ذائقہ آب پرسرور چشی
ملاحتش بدروں حلاوتش پنہاں ست
ولایتے نمکیں اندروں بروں شیریں
عجب مدار کہ شہر عجائب البلداں ست
یکے در دست عجب تال آب شش پہلو
بشش جہات بہ پنجاب گو کہ ثانی آں ست
دلیل شادی دلشاد نام ایں شہر است
کہ پرسرور طرب بخش عالم دل و جاں ست

تعلیم کے لحاظ سے جن کمالات کے وہ مدعی ہیں' اس شعر میں درج ہیں:

از علم و شعر و تاریخ فقہ و سلوک و اخلاق
دارد تمام لیکن دلشاد زر ندارد

یعنی فقہ، تصوف، اخلاق، تاریخ اور شعر میں ماہر ہے۔

دلشاد ایک ایسے دور انقلاب میں گذرے ہیں جو پنجاب کی تاریخ کا تاریک ترین ورق ہے۔ مغلیہ سلطنت اپنے تنزل کے آخری مراحل طے کر رہی ہے۔ نادر کے بعد احمد شاہ ابدالی نے اپنے مشہور حملے شروع کر دیے ہیں اور سکھ جماعت غارت و رہزنی میں مصروف ہے۔ قتل و خونریزی کا بازار چار سُو گرم ہے۔ پنجاب کے اس دورِ ظلمت کے ساتھ ساتھ دلشاد کی شاعری کا زمانہ بھی متوازی گامزن ہے۔ دوسرے الفاظ میں بارھویں صدی کے نصف دوم کے تمام واقعات ان کی آنکھوں کے سامنے ہوئے ہیں اور ان واقعات عصری کی جھلک ان کے کلام میں موجود ہے۔ کبھی وہ افغانوں کے ہاتھ سے نالاں ہیں اور کبھی سکھوں کے مظالم پر لعنت بھیج رہے ہیں۔ مصیبت اور بدحالی میں قاعدہ ہے کہ انسان کو بہت یاد آتا ہے۔ مذہب سے قریبی لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اولیاء اور مشائخ سے لو لگائی جاتی ہے۔ یہی کیفیت دلشاد کے قلب کی ہے۔ کبھی رسول عربیؐ کی خدمت میں اپنی فریاد لے جاتے ہیں، حضرت علیؓ سے استغاثہ کرتے ہیں، کبھی مہدی آخر الزماں کو بلاتے ہیں۔ کبھی حضرت عیسیٰؑ کو پکارتے ہیں اور کبھی غوث الاعظمؒ سے ملتجی ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں:

غم ہجوم آورد مارا یا رسول اللہ اغث
در چنیں وقتے خدا را یا رسول اللہ اغث

دیگر: غلوی کردہ سگاں شیر حق کجا رفتی
بہ پنجہ از سر پر شورشاں دمار برآر

دیگر: ز ہندیان سحر ملک ما بشام رسید
تو از نیام بہ پنجاب ذوالفقار برآر

دیگر: امام مہدی آخر زماں بیا وقت ست
ندانم از تو شود کے ظہور یا قسمت

دیگر: بفرست مہدی خویش تا کفر را نشاند
از حد گذشت اکنوں میعاد یا محمدؐ

دیگر: دیں را چو محی دینت احیا کند بہ پنجاب
ہاں عیسیٰؑ زماں را ارشاد یا محمدؐ

دیگر: غم شدہ دو چار من دگر یا غوث اعظم الغیاث
خوں می رود زیں چشم تر یا غوث اعظم الغیاث

اس صدی میں غوث الاعظمؒ کی ایک غیر معمولی مقبولیت کا راز پنجاب کے ان سیاسی اثرات کے پرتو میں مفہوم ہو سکتا ہے، جن کے تاریک بادل اس ملک کی فضا کو گھیرے ہوئے تھے۔ اس سے پیشتر متعدد نظمیں ایسی نقل ہو

بچی ہیں جو بالخصوص غوث الاعظمؒ کی شان میں ہیں۔ جب ہم دلشاد کی آواز فریاد اس طرح بلند ہوتی دیکھتے ہیں تو قیاس کر سکتے ہیں کہ پنجاب پر ان ایام میں کیا قیامت گزرتی ہوگی۔ مذہباً اگرچہ سنت جماعت ہیں' لیکن حب علیؓ سے بھی غافل نہیں ہیں۔ محرم میں وہ ماتم حسینؓ زندہ کرتے ہیں۔ ان کی کئی نظمیں شاہد ہیں۔ پنجتن پاکؓ سے بھی عقیدت ہے:

ذکر مدح پنجتن داریم ورد پنج وقت
در مخمس گوئی اے دلشاد ناچاریم ما

دیگر: ہمچو دلشاد از ولائے پنج تن
والئے اقلیم پنجابیم ما

پنجاب اور پنجتنؓ کی رعایت میں کئی اشعار لکھے ہیں' لیکن یہ شعر نہایت عجیب ہے:

پنجابیؔ کہ نیست درو حب پنج تن پنجابیست غیر پدر نیست درو یار

اپنے وطن سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ ذیل کے ابیات ملاحظہ ہوں۔ ان سے کس قدر محبت ٹپک رہی ہے۔ امام برخوردار کے بے حد معتقد ہیں:

شہر ما پرسرور می گویند کان علم و شعور می گویند
اہل اخبار ہند تارنخش اول از لاہور می گویند
شکر فیاضے دو تالابش مردم و مرغ و مور می گویند
حسن ہر خانہ اش ہمی بینند شہر حور و قصور می گویند
تیغ مردانش دیدہ بد خواہاں مژۂ آب شور می گویند
از مزار امام برخوردار طرفہ بزم حضور می گویند
خاک دروازہ اش ہمی بینند سرمۂ کوہ طور می گویند
زیں ولایت کجا روم دلشاد شہر دہلی ست دور می گویند

تاریخی لحاظ سے دیکھتے ہوئے ان کے ہاں سب سے پہلی تلمیح دہلی کے قتل عام کی طرف ہے جو 1151ھ/1738ء میں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں:

قتل عام ست در جہاں آباد آخر ایں غمزۂ تو نادر نیست

دوسری تلمیح نواب یحیٰی خاں اور قتل رائے جسپت رائے دیوان لاہور کے متعلق ہے:

در جہاں گر ہمسر اسکندر و خاقاں شود
از شجاعت تابع نواب یحیٰی خاں شود
گر مخالف ہمچو عکس آئینہ نواب را
می شود شخصے بمقابل صورت بیجاں شود

انتقام قاتلان رائے جسپت رائے را
آید از تیغ تو در پنجاب گر عریاں شود

زکریا خاں کی وفات پر کچھ عرصے کے بعد یحییٰ خاں ان کا خلف اکبر صوبہ دار لاہور بنا دیا گیا۔ سکھوں کی ایک جماعت ایمن آباد کے مویشی پکڑ کر لے گئی۔ ان کی سزا دہی کے لیے رائے جسپت رائے دیوان لاہور بھیجے گئے۔ سکھوں نے شاہی فوج کا مقابلہ کیا اور دیوان جسپت رائے معرکے میں مارے گئے۔ صوبہ دار یحییٰ خاں کو اس پر طیش آیا اور اس نے اپنے وزیر لکھپت رائے کو ایک بڑی فوج کے ساتھ ان کی سرکوبی کے لیے تعین کیا۔ وزیر نے سکھوں کو بڑی تعداد میں قتل کیا اور ایک ہزار کے قریب قیدی گرفتار کر کے لایا جو 1159ھ/ 1746ء میں لاہور میں قتل کیے گئے۔

1162ھ/ 1747ء میں میر منو صوبہ دار لاہور چار محال پسرور، گجرات، سیالکوٹ اور اورنگ آباد بروئے معاہدہ احمد شاہ ابدالی کے حوالے کر دیتا ہے اور شاہ ان محال کا صوبہ دار بلند خاں سدوزئی کو مقرر کرتا ہے۔ دلشاد اس بلند خاں کے خیر مقدم میں لکھتے ہیں:

خبر ز عالم بالاست قمریاں بچمن بلند خاں چو سہی سرو صوبہ دار رسید
ز یمن مقدم نواب منعم الدولہ بہار را دگر آب بروے کار رسید
ہزار شکر خدا کآب رفتہ پنجاب دگر ز یمن قدومش بجوئبار رسید
نظام چار محال تو حق کند دلشاد سحر بگوش بشارت ز چار یار رسید

اس عہد کے قبل یا بعد رنجیت دیو والی جموں جو 1196ھ/ 1838ب میں ستاون سال راج کر کے فوت ہوتا ہے۔ پسرور پر قبضہ کر لیتا ہے۔ اس سلسلے میں دلشاد کی آمد و رفت جموں میں بھی ہو جاتی ہے۔ جموں میں ان ایام میں مسلمانوں پر سخت مظالم توڑے جاتے ہیں حتیٰ کہ ان کو اذان دینے تک کی اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ:

بسکہ منعت دریں شہر اذان جمعہ
نکند گوش کسے نالۂ بے کاراں را
گریہ را نیست اثر در دل راجہ جموں
سبزہ بر سنگ نہ روید چہ گنہ باراں را
موذیاں کردہ ہجوم اے شہ دولہ فریاد
تیغ گجرات سزیست دل آزاراں را

دیگر:

مردمانش ز بس کہ سنگ دل اند
جموں امروز سخت کہسار است

جموں سے پسرور صرف چالیس میل انگریزی کے قریب ہے۔ رنجیت دیو احمد شاہ ابدالی کا محکوم اور درانیوں کی فتح کشمیر کے وقت (1175ھ) ان کا بڑا معاون رہا ہے۔ رنجیت دیو نے دیوان نرائن داس کو ظفروال و دیگر علاقے کا ناظم بنا کر بھیجا ہے۔ راجہ کے حکم سے نیا بند و بست اور پیمائش ہو رہی تھی۔ دلشاد کی معافی میں کچھ زمین ہے۔ ان سے چہارم طلب کیا جاتا ہے۔ یہ عذر کرتے ہیں۔ اسی طرح رام داس نامی کسی شخص کی دھرم شالہ ضبط کر لی گئی ہے۔ اس سلسلے میں دلشاد نرائن داس کی خدمت میں ایک غزل بھیجتے ہیں:

اے مبارک فال دیوان نرائن داس ما
جز بہ لطف تو دریں دوراں کہ دارد پاس ما
ایں ظفر وال از قدوم فیضت امن آباد گشت
قلعہ دارالاماں شد منکہ منہاس ما
می نماید رخ چھور از حسن اقبالت چو حور
یا رب آباداں محل عیش و استیناس ما
چوں روا کر دے کہ مساخاں تا میموں قدم
بر زمیں باشد ندا از بیری مساس ما
ضابطانت درپے ضبط فقیراں تاختند
ضبط کردہ دھرم سال و تکیہ رام داس ما
در تقاضائے چہارم ہائے ایں قصاب کار
وضع مع خواہند پائے چارمیں از راس ما
آخر ایں بے رگی شاں تا کجا خواہد رسید
کلک این ہا رشتہ و یا تیشہ و یا داس ما
بخشش آیمہ را در منزلت تے گفتہ اند
تے گرفتہا شود کار سنگ کناس ما
عاقبت دولت سرائے راجہ رنجیت دیو
خانہ آباداں نمی گردد پر از افلاس ما
چوں تو دانا کے پذیرد گفتہ ایں ناکساں
اے رضا جوئے دل خواص و عوام الناس ما

معین الملک عرف میر منو 67-1166ھ/52-1751ء میں احمد شاہ ابدالی سے شکست کھاتا ہے اور اس کے دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ احمد شاہ نہایت تپاک سے اس سے ملتا ہے اور اس کی بہادری کی تعریف

کرتا ہے اور رستم ہند کا اس کو خطاب دیتا ہے۔ دلشاد اس موقع پر غزل ذیل کہتے ہیں:

معین دین و پناہ دوراں امام ملت مدار گیہاں
چراغ شرع و فروغ ایماں نشاط امروز و عیش فردا
ازاں رود فتح در رکابش کہ رستم ہند شد خطابش
جبیں نہادن بخاک پائش مراد دنیا نجات عقبیٰ
فلک یکے کمتریں غلامش کہ پشت خم کردہ در سلامش
معین الدیں خاں خجستہ نامش زعقل پیروز بخت برنا
منم کہ در پرسرور باشم ز در گہت چند روز باشم
ز حاضران حضور باشم اگر زلطف تو باشد ایما

معین الملک کی وفات کے بعد آدینہ بیگ خاں پنجاب میں طاقتور ہو جاتا ہے۔ وہ خواجہ مرزا خاں کو حاکم لاہور بنا دیتا ہے۔ پرسرور میں جب مرزا خاں آتا ہے شاعر یہ غزل پیش کرتا ہے:

ز بزم عیش تو نواب خواجہ مرزا خاں
بکام کینہ در ایام غیر زہر خند مباد
بجام مے غم آدینہ را مبدل کن
بسینہ تو غم زاہداں بلند مباد

معلوم ہوتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی کی آمد کو ابتدا میں پنجاب نے بنظر استحسان دیکھا ہے اسی لیے شاعر مختلف مقامات پر نعرہ ہائے مسرت بلند کرتا ہے اور اس کے جانے پر تاسف:

باد نو روزی سحر در گلشن بستاں رسید
مژدۂ آمد کہ اقبال شہ دوراں رسید
ابر نیساں می رسد یا موسم باد بہار
یا بہ پنجاب اردوئے شاہ در دراں رسید

دیگر:
ہائے پیراں و فقیراں شہ در دراں
گر ز پنجاب رود آمدہ رفتن مدہید

دیگر
خیال سرو قدش گرز دل در خواب بر گردد
فغانم از گلو افغان وش از سیلاب بر گردد
حواسم رفت چوں ضیق النفس شد در گلو آہم
شہ افغاں نمی دانستم از پنجاب بر گردد

دیگر:

خبر آمد کہ شہ پیشاور آمد　　سر آمد سرور آمد افسر آمد
گہے بشکست سر گہہ سینہ کفر　　شہ آمد صورت کر و فر آمد

لیکن دلشاد کا یہ اظہار مسرت زیادہ دیرپا نہیں ہے۔ تجربہ اور افغانیوں کے سلوک نے انہیں سبق دیا کہ قصاب اور شبان میں بڑا فرق ہے۔ چنانچہ آخر میں دلشاد کا نقطہ نظر بدل جاتا ہے اور وہ افغانوں کے ہاتھ سے بھی دست بافغاں ہیں۔ ان کی غزلوں میں متعدد مقامات پر یہ جذبات موجود ہیں:

بخواب خوش چہ رود کس جملک ہندوستان
بگوں ز آمد افغاں رسد فغانے چند
ز لالہ ہیچ نمانده است غیر داغ سیاه
بباغ ہند ز اغماض باغبانے چند

دیگر:　مدتے شد کہ اشک و افغاں نیست
شاہ در دراں نمی آید

دیگر:　افغاں کہ بہند آید و گیرد سر خود را
دلشاد ز آمد و شد او جاے فغان ست

لیکن دلشاد سب سے زیادہ سکھوں کے خلاف فریاد خواں ہیں۔ یہ قوم رہزنی اور لوٹ مار سے بنی۔ مدتوں قزاقی اور قطاع الطریقی ان کا پیشہ رہا۔ زوال مغل اور احمد شاہ کے حملوں نے ان کو خروج کا موقع دے دیا۔ آخر سکھوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ دلشاد:

فغاں ز آمد و رفت قشوں ابدالی　　بلا ہنوز سگ بے شعور یا قست

سکھوں کے قبضہ لاہور کی تاریخ "جہانے خراب شدہ" 1181ھ ہے اور شعر بالا میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

ایک اور غزل میں سکھوں کے لیے کہتا ہے:

الٰہی قطع ہستی کن سگاں گرگ تازاں را
ز لا مقراض می گرداں سر ایں مو درازاں را
حواسم آب شد از آتش دود سیہ کاراں
بکن بیروں ز پنجاب ایں شرار فتنہ ساماں را
جہاں در چنگل مردار خواران سیہ آمد
خداوندا بر ایں زاغاں رہا کن شاہبازاں را

دیگر:

سفید صحنک چینی شیشہ پنجاب زمو دراز سیاہاں فتاد مو او را

پنجاب کی آنکھیں اس وقت بھی دہلی کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ عالمگیر ثانی کے بعد جب شاہ عالم ثانی جو بنگالہ میں 1173ھ/ 1759ء میں تخت نشین ہوتا ہے' دہلی پہنچتا ہے۔ دلشاد پنجاب میں اس واقعے کو یوں شہرت دیتے ہیں:

دلشاد ز پردل خبر تاز شنیدم شاہنشہ والا گہر آمد خبر اینست

زین خاں سرہند کی جنگ میں 1762ء میں سکھوں کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے۔ جب پسرور میں آیا تو دلشاد کہتا ہے:

پژمردگاں نشاط ز سر بر گرفتہ اند
ہنگام نو بہار بوقت خزاں رسید
یعنی بہ پرسرور ز فرخندگی بخت
با زیب و زین و زینت و شاں زیں خاں رسید

احمد شاہ ابدالی 1175ھ میں رنجیت دیو کی امداد سے کشمیر فتح کرتا ہے۔ نورالدین خاں فاتح کشمیر اس کا پہلا صوبہ دار بنایا جاتا ہے' پھر بلند خاں' پھر نورالدین خاں 1179ھ میں خرم خاں ولی مقرر ہوتا ہے اور اواخر 1180ھ میں نورالدین خاں تیسری بار صوبہ دار بنتا ہے۔ 1183ھ میں خرم خاں دوبارہ صوبہ دار بنایا جاتا ہے۔ خرم خاں کی آمد پر دلشاد بعض دوستوں کی فرمائش پر ذیل کی غزل خان کے خیر مقدم میں لکھتا ہے:

مژدہ آمد کہ اقبال شہ دوراں رسید
ابر نو روزی سحر در گلشن بستاں رسید
ابر نیساں می رسد یا موسم باد بہار
یا بہ پنجاب اردوئے شاہ در دراں رسید
چوں گل از باد صبا کشمیریاں خرم شوند
با نشان سبز و رنگیں فوج خرم خاں رسید

دلشاد کی شاعری کی بعض ممتاز خصوصیتیں ہیں۔ وہ شعر گوئی اس لیے نہیں کرتا کہ اس کو ایک دیوان یادگار چھوڑنا ہے۔ جیسا کہ اردو شعراء نے کیا ہے بلکہ ضرورت' اقتضائے ماحول' دوستوں کی فرمائش وغیرہ ایسے محرکات ہیں جن کے اثر میں وہ شعر کہتا ہے' اس لیے اس کا دیوان اس عہد کے واقعات کا آئینہ بن گیا ہے۔ مجھ کو اس انداز کا شاعر سوائے اکبر الہ آبادی کے اور کوئی معلوم نہیں۔

دلشاد کے کلام پر سادگی غالب ہے۔ ساتھ ہی صنعت تجنیس و مراعات النظیر کی رعایت دیکھی جاتی

ہے۔ وہ اکثر اپنی تشبیہ اور استعارے ملکی واقعات و دیگر امور سے لیتا ہے۔ اس صنف میں وہ سب سے منفرد ہے اور اس میں بھی شریک نہیں کہ اس صنف خاص نے اس کے کلام کو ایک زیور دے دیا ہے۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو:

گفتار تو بگرفت جہاں از لب میگوں　　　با فوج فرنگی شہ والا گہر آمد

دیگر:

خیال سرو قدش گر ز دل در خواب بر گردد
فغانم از گلو افغان وش از نیلاب بر گردد

دیگر: در زمیں پیوستہ تخم اشک می کاریم ما
گر توئی نواب ما آخر زمیندار یم ما
اشک چشم خود بدست خود ہمیں سازیم پاک
صوبہ پنجاب زیر آستیں داریم ما

دیگر: عالم از شیریں کلامیہا مسخر کردہ ایم
در درانیم از قندھار می آئیم ما

دیگر: مدتے شد کہ اشک و افغاں نیست
شاہ درّوراں نمی آید

دیگر: قتل عام ست در جہاں آباد
آخر ایں غمزہ تو نادر نیست

دیگر: رسید فوج بفوج اشک چشم ما ہمہ جا
جہاں گرفت قشون درّورانی ما

ان میں ہجوگوئی اور ظرافت کے اوصاف بھی موجود ہیں' لیکن ہجو بہت کم لکھی ہے۔ کسی لالہ جی کو لکھا ہے:

اے بندہ میان دو عدم زندگی تست　　　ہشدار کہ گویند آزاں نام تو لالا

ان اشعار کو پڑھو:

ہر خاں کہ بہ پنجاب دریں دور زمان است
خانست بگفتن ندرد گروہ نان است
ز اولاد علی گوید واللہ اعلم
ہر کھوکر ہند کہ در ذات اعوان است
از درد فروشاں کہ بہر پیشہ مہارند
شیخے کہ بود گگے زئی پیر مغان است

بر پشتہ ہر شہر دو صد غول بیاباں
از نوشہیاں پشت زمیں پر زشہان است
در مذہب عدلی ہمہ نانک مشرب
ہر خانہ از مزدکیاں صاحب خان است
سید کہ بہند آل نبی داند خود را
سب از پے اصحاب جد خود بزبان است
ہر لا ولدے را کہ ازو نام و نشاں نیست
رجپوت ازاں گم شدہ در ہند نشان است

دلشاد کا قلم ان ہجویات کے باوجود لطیف سے لطیف اور نازک سے نازک جذبات کے ادا کرنے کے قابل ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار:

پادشہ پرسید یک شب ہندوان خویش را
زن پس شوہر چرا سوزد روان خویش را
در حضور شمع چوں پروانہا کردند عرض
آن عشق ایں است و سازد عشق آن خویش را
گر ز ما چوں شمع ایں پروانگی منظور نیست
خسرو از سوز دل افروزد روان خویش را
خسروا در عشق بازی کم ز ہندو زن مباش
کز برائے مردہ سوزد زندہ جان خویش را

بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ دلشاد تیرہویں صدی کے آغاز کے بعد بھی زندہ تھے لیکن ہم ان کی تاریخ وفات سے بے خبر ہیں۔ اردو میں انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور اسی کو اپنی یاد کا ذریعہ مانتے ہیں۔ چنانچہ:

گذاشتیم بہر گوش شعر ہندی خویش بیادگاری ما ماندہ درکانی ما

لیکن آج یہ ذخیرہ مفقود ہے۔ ممکن ہے تلاش سے دستیاب ہو سکے۔ میں یہاں ان کے اردو کلام کا نمونہ درج کرتا ہوں:

دلبر ہے نوجواں نجانوں کرے گا کیا
بانکی ہے اوس کی آن نجانوں کرے گا کیا
حافظ خدا ہے جوہریوں کی دوکان کا
یہ موتی اوس کی کان نجانوں کرے گا کیا

اوس لعل لب سے آگے کئی دل ہوئے تھے خوں
اب کھا کے آیا پان نجانوں کرے گا کیا
شیشہ شراب کا نہ لگے ہاتھ مست کے
یہ دل میرا نادان نجانوں کرے گا کیا
غمزہ سوں تیر ترکش مژگاں کو ساز کر
ابرو کی لے کمان بانوں کرے گا کیا
خنجر نگاہ چشم سیہ سوں کٹار مار
یہ ذات کا پٹھان نجانوں کرے گا کیا
دلشاد کی بھی لیتے خبر اپنے واسطے
اپہ شورش و فغان نجانوں کرے گا کیا

سید ولی اورنگ آبادی کی غزل کا مطلع ہے:

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا　　شاید کہ میرا حال اسے یاد نہ آیا

دلشاد لکھتا ہے:

گذرے ہیں کئی دن وہ پریزاد نہ آیا
شاید کہ میرا وعدہ اوسے یاد نہ آیا
نے خط نہ کتابت نہ خبر کوچھ نہ سندیا
پیغام ہمارا گیا برباد نہ آیا
اس دام میں افسوس پھڑکتے ہیں کئی جاں
جب ہم کوں پھنسا کر گیا صیاد نہ آیا
اک زخم کا محتاج تڑفتا رہا بسمل
پھر مار کے شمشیر وہ جلاد نہ آیا
اس خنظری میں ہے شیریں نقش بدیوار
جب تیشہ گیا مار کے فرہاد نہ آیا
کہتے ہیں سبھی جموں کے آپس میں پریرو
کیا وجہ میاں ساتھ جو کہ دلشاد نہ آیا

وارث شاہ

حضرت وارث شاہ[1] پنجابی کے بہترین شاعر مانے جاتے ہیں۔ میں مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر "پیسہ اخبار" کی ایک بیاض سے ان کی ذیل کی غزل حوالہ قرطاس کرتا ہوں:

جس دن کے ساجن بچھڑے ہیں تس دن کا دل بیمار ہویا
اب کٹھن بنا کیا فکر کروں گھر بار سبھی بیزار ہویا
دن رات تمام آرام نہیں اب شام پڑی وہ شام نہیں
وہ ساقی صاحب جام نہیں اب پینا ے دشوار ہویا
بن جانی جان خراب بھی ہا آتش شوق کباب بھی
جوں ماہی بحر آب بھی نت رووں ساتھ پیار ہویا
مجھے پی اپنے کو لیاؤ رے یا مجھ سوں پی پہونچاؤ رے
یہ اگن فراق بجھاؤ رے سب تن مل جل انگار ہویا
جب پی پاؤں تب بھاگن ہوں...... براگن ہوں
اس پی اپنے کی لاگن ہوں یہ لاگ مجھے لاچار ہویا
اب پی کے درشن جاؤں گی تب ہار سنگھار بناؤں گی
...... نام سداؤں گی یہ پی کے ساتھ قرار ہویا
نت راگ پیا کے گاتی ہوں یہ دیہ رباب بناتی ہوں
بھرے شاہ کے جاتی ہوں میرا تن من...... تار ہویا
تب مجنوں کامل ہویا تھا جب لیلیٰ کہہ کر رویا تھا
وہ یک دم سکھ نسویا تھا اب لگ نیک شمار ہویا
سو میں اب مجنوں وار بھی پردیس۔ بدیس خوار بھی
اوس پی اپنے کی یار بھی اب میرا بھی اعتبار ہویا
جب وارث شاہ کہلایا نے تب روح سوں روح ملایا نے

تب سیج سہاگ سولایا نے جیو جان مخزن اسرار ہویا

(از بیاض مملوکہ مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر "پیسہ اخبار")

حاشیہ:

1- کاتب نے نام کے ساتھ علیہ الرحمۃ اضافہ کر دیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس کی مراد مصنف "ہیر رانجھا" سے ہے۔

خوشدل

نام محمد ابراہیم ہے اور لاہور کے مشہور اہل علم خاندان چشتی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد قاضی ضیاء الحق مع اپنے عم بزرگوار مولانا نظام الدین و برادر خورد بہاء الحق ایران سے ہندوستان آئے اور لاہور میں متصل گڑھی شاہو سکونت اختیار کی اور نواب خان بہادر نے اپنے فرزند یحیٰی خاں کا اتالیق مقرر کر دیا۔ مولانا ابراہیم علم و فضل میں یگانہ زمانہ تھے' لیکن لاہور میں سکھوں کے دخل کے وقت تمام جائداد سے بے دخل کر دیے گئے اور گھر لوٹ لیا گیا۔ ناچار ایک مسجد میں جو مطبع کوہ نور کے بالمقابل تھی' امامت کرنے لگے اور معلمی اختیار کر لی۔ گوجر سنگھ نے دو آنہ یومیہ دروازہ لاہوری و دہلی پر ان کا تقرر کر دیا۔ مولوی نور احمد چشتی مصنف ''تحقیقات چشتی'' و ''یادگار چشتی'' و ''تحفہ چشتی'' و ''عجائبات چشتی'' مولوی محمد ابراہیم کے پڑپوتے ہیں۔ چشتی خاندان تقریباً دو صدی سے اپنے علم و فضل کے لیے مشہور چلا آ رہا ہے۔ رنجیت سنگھ کے عہد کا سب سے ضخیم روزنامچہ جو بیس بائیس جلدوں میں ہے' اسی خاندان کا کارنامہ ہے۔ اس خاندان میں دستور تھا کہ تخلص اکثر اوقات ہم قافیہ اختیار کیے ہیں جو دل پر ختم ہوتے ہیں۔ مثلاً پر دل' خوشدل' بیدل' یکدل۔ مولانا خوشدل 1202ھ میں انتقال کرتے ہیں اور ''رضی اللہ عنہ'' مادہ تاریخ[1] ہے۔ اگرچہ ''تحقیقات چشتی'' میں 1195ھ اور ''حیات رشید'' میں 1216ھ یا 1220ھ دیا ہے۔

مولانا خوشدل کا نمونہ کلام ذیل میں پیش کیا جاتا ہے جس میں دنیا کو بڑھیا اور جسم انسانی کو چرخہ تصور کیا گیا ہے۔ چرخے کی یہ نظم پنجاب میں بہت مقبول رہی ہے۔ وھو ہذا:

عشق کے غم سوں ہو محزوں — آہ دنیا سبھ مکر و فنوں
جو توں چاہے قادر کوں — اس عالم سوں ہو بیروں

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں

اے رنگیں دیوانہ ہو — عالم سوں بے گانہ ہو
دل پر پروانہ ہو (کذا) — وہ ہے گا بے شبہ و نموں

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں
نابود سبی آہ ہستی ہے بنیاد فرازش پستی ہے
کیا دولت خواب کی مستی ہے مت کر اتنا شور و جنوں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں
تن چرکھا بودھیا سنسار میل کیا اس کا کرتار
بھور نیا دے اَیسی پار پیرے وہ ار کاتے توں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں
آہ جیو میرا پیپا دیوانہ دنیا ساتھ بھوت بھتانا
بھول گیا اوسے اونا جانا اب کیا اس کا فکر کروں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں
کدھر گئے گور ار بہرام کدھر گئے صیاد ار دام
کدھر گئے جمشید ار جام کدھر گئے گنج ار قاروں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں
بلبل گلزار خدا کا ہو قمری شمشاد فنا کا ہو
اب تارک حرص و ہوا کا ہو اہ خوب نصیحت ہے تجھکوں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں
چھتا نا کر نا پچھتاوا ....
جیوں گذرے تیوں گذارے جا مت کر اتنا فکر فزوں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں
کدھر گئے مہتر یعقوب کدھر گئے یوسف محبوب
کدھر گئے طالب مطلوب کدھر گئے لیلیٰ مجنوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں

او بے خبر ارض و سما کا ہے جاں مرغ اسیر فنا کا ہے
ٹوک انبرت نام خدا کا ہے آخر عدم ہے دنیا دوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں

کہاں سکندر ہے سلطاں دارا کہاں رفیع الشاں
سبہ جگ کوں فانی گھر جاں چھوڑ تکبر مکر و فنوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں

خودی تکبر سبہ کو چھ چھوڑ مت کر اتنا غوغا شور
جیسا چوراہے کا رور باقی ہور ہو تا کر ہوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں

جو غفلت کے مدہ ماتے ہیں عصیاں سوں باز نہ آتے ہیں
پھر روز جزا پچھتاتے ہیں یہ محکم رکھ دل میں مضموں

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں

ایہہ دنیا ہے سفر سرائے غافل ہو مت آنکھ لگائے
پونجی کھوئی چلے پچھتائے پھر نہیں آوے ہاتھ کہوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں

جو زاہد زہد نما ہوں گے دل چتر اہل ریا ہوں گے
شرمندہ روز جزا ہوں گے رو مت ریا ہوں ہو بیروں

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں

کدھوں بیٹھے بیچ عماری　　کدھوں پھرتے نال سواری
فکر معیشت گھر کی خواری　　تس پہ دیکھوں غرارفوں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں
خوشدل قسمت پہ قانع ہو　　ہنکار سوں دل کوں مانع ہو
بیندۂ قدرت صانع ہو　　کس سوں کیا مطلب تجکوں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں

(از بیاض پروفیسر آذر)

حاشیہ:

1- میں اس اطلاع کے لیے مسز مسعود علی چشتی کا (خوشدل کی اولاد میں ہیں) ممنون ہوں۔

فدوی لاہوری

مرزا سودا اُن کے حریف غالب اُن کو بقال بچہ کہتے ہیں۔ فارسی و ریختہ میں کامل تھے۔ ایران میں ایک عرصے تک رہے ہیں۔ تجارت ذریعہ معاش تھا۔ احمد نگر فرخ آباد میں ایک عطار کی دکان پر مکان کرایہ پر لے رکھا تھا۔ عطار کی دکان پر اکثر آ بیٹھتے تھے اور وہیں شعر کے چرچے رہتے تھے۔ فدوی نے سودا کے بعض اشعار پر اعتراض کیے تھے۔ مثلاً ایک مقام پر سودا نے شیخ و برہمن دونوں کے لیے دین کا لفظ استعمال کیا تھا۔ فدوی نے اعتراض کیا کہ دین شیخ کے لیے اور دھرم برہمن کے لیے مخصوص ہے۔ سودا نے جواب میں آیہ کریمہ لکم دینکم ولی دین نقل کی۔ اسی طرح سودا کا ایک شعر کسی اور بحر میں حسب ذیل تھا:

تم نے جہاں وا کیے بند قبا اپنے جان
جا کے صبا نے بباغ کھول دیے گل کے کان

فدوی نے اصلاح دے کر اس طرح لکھا:

کھول دیئے ناز سے تم نے دو چشم اپنے جان
کھولے صبا نے یہ سن غنچہ نرگس کے کان

اسی طرح شاگردوں کے بارے میں جنگ ہوئی جن میں شیدا قابل ذکر ہیں۔ نوبت ہجوؤں تک پہنچی۔ مرزا نے جس طرح میر ضاحک، فاخر مکیں، میاں فوقی، شیخ صبغت اللہ، ندرت کشمیری، مراد علی وغیرہم کی ہجویں لکھی تھیں، فدوی کی بھی ہجویں لکھیں۔ چنانچہ پانچ اب تک مرزا کے کلیات میں موجود ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہجو گوئی کا سلسلہ ایک عرصہ تک قائم رہا ہے۔ ان میں سے ایک ہجو مرزا نے پنجابی زبان میں لکھی ہے جس کا مطلع ہے:

پئی جو سودا کے کن یہ گل کہ فدوی جس کول جاوندا ہے
بھلے برے نوں وے یارا کہہ، کہہ ہجو تیندی سناوندا ہے

یہ معرکہ 1186ھ میں پیش آیا۔

میر حسن فدوی کے متعلق لکھتے ہیں:

"فدوی مردے بود بر خود غلط برائے مباحثہ و مجادلہ بہ فرخ آباد پیش میرزا رفیع

سلمہ اللہ آمدہ ہنگامہ برپا نمود بعد از ذلت بسیار بہ وطن خود برگشت یوسف زلیخا بزبان ریختہ گفتہ بود وہمہ عالم می نمودہ ہر کسے کہ از و لطف بر می داشت از و محظوظ می شد۔ حالا معلوم نیست کہ زندہ است یا مرد۔ از وست۔"

مژہ کی نوک سینے میں نگاہ یار لے ڈوبی
کہ جیسے بھال تودے میں سری یک بار لے ڈوبی
نہ پوچھو رنگ مہندی کا کف قاتل پہ اے یارو
کسی کے خوں میں اس کے ہاتھ کو تلوار لے ڈوبی

میں محسوس کرتا ہوں کہ میر حسن کا فیصلہ فدوی کے حق میں چنداں منصفانہ نہیں ہے' لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ خود فدوی کے ہم وطن اس کے حالات وکمالات سے قطعاً بے خبر ہیں اور نہ اس کی تصنیف یوسف زلیخا کا سراغ چلتا ہے' تاہم اس کی بلند پایگی میں شک نہ کرنا چاہیے۔ ذیل میں اس کے کلام کا نمونہ درج ہوتا ہے' جو بعد تلاش حاصل ہوا ہے۔

آنسو نہیں ہیں دیدۂ تر میں بھرے ہوئے
موتی ہیں آبدار صدف میں دھرے ہوئے
ابرو ترے کی تیغ سے سورج ڈرے ہوئے
پھرتا ہے اپنے منہ پہ سپر کوں دھرے ہوئے
خالی کر ان کو دل کے نشانیں پہ ایک بار
ترکش تری مژہ کے ہیں چاروں سرے ہوئے
کہنے لگا کہ میری گلی کی طرف نہ آئے
جا اے دوانے یاں سے ادھر کوں پرے ہوئے
یہ سن کے میں نے عرض کی خدمت میں اس طرح
لیکن دو دست بستہ ادب سیں ڈرے ہوئے
جرأت کہاں کہ آ سکوں قرآن کی قسم
لاتا ہے دل میرا مجھے آگے دھرے ہوئے
فدوی ہمارے دیدۂ گریاں کے فیض سے
اشجار کوہ و دشت کے یکسر ہرے ہوئے

[رک: پنجاب کے قدیم اردو شعراء۔ متذکرہ بالا' ص 98۔105......م۔ا۔ج]

حضرت مراد شاہ

والد کا نام پیر کرم شاہ عرف مسیحا شاہ ہے۔ پانچ سال لکھنؤ و دیگر مقامات میں گذارنے کے بعد 1196ھ میں اپنے پدر بزرگوار کی معیت میں واپس اپنے وطن لاہور آ رہے تھے کہ شاہجہاں آباد کے قریب قزاقوں سے مقابلہ ہوا اور پیر کرم شاہ مارے گئے۔ اس افتاد سے دو سال اور وطن آنا نصیب نہیں ہوا۔

حضرت مراد شاہ کئی تصنیفات کے مالک ہیں۔ دیوان کے علاوہ متعدد چھوٹی چھوٹی مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔ 1214ھ میں اپنے شاگرد حکیم علیم اللہ کی فرمائش پر قصہ چہار درویش نظم کرنا شروع کیا اور کچھ حصہ نظم کر چکے تھے کہ پیام اجل آ پہنچا اور عین عالم شباب میں انتیس سال کی عمر میں دنیا سے 1215ھ میں کوچ کیا۔ مزار موضع مردانہ تحصیل شاہدرہ میں ہے۔

ان کی طبیعت غزل سے بہتر مثنوی پر جمتی ہے۔ اس میدان میں وہ کسی سے کم نہیں اور اہل ہندوستان کے دوش بدوش ہیں۔ متواتر سات سال ہندوستان میں رہنے کی بنا پر زبان بالکل صاف ہو گئی ہے۔ سلاست اور روانی کے علاوہ کلام میں پختگی موجود ہے۔ 1196ھ میں ایک منظوم خط عزیزان وطن کو لکھتے ہیں جو ''نامہ مراد'' کے نام سے موسوم ہے اور ہمارے مخدوم جناب غلام دستگیر نامی کی سعی سے چھپ چکا ہے۔ اس خط میں اردو کی مقبولیت کے ذکر میں فرماتے ہیں۔

وہ اردو کیا ہے یہ ہندی زباں ہے — کہ جس کا قائل اب سارا جہاں ہے
کلام اب تجھ سے میں ہندی زباں میں — کروں شہرت ہو تا سارے جہاں میں
کہ اب وسعت میں اس کی سب سخنداں — سمند طبع کو کرتے ہیں جولاں
لطافت یہ نکالی ہے اسی میں — کہ فرماتے نہیں کچھ فارسی میں
اسی کا شہرہ اب ہو جائے سب تک — یہاں سے تا بایراں بل عرب تک
خصوصاً شعر اب شاعر یہاں کے — نہیں کہتے بجز ہندی زباں کے
غرض ہندی کا یہ چرچا یہاں ہے — کہ شعر فرس مطعون زماں ہے
یہ شہرت ہے اب اس مضمون پُر کی — نہ کوئی فارسی پوچھے نہ ترکی
نہیں ہندی سخن میں نقص ممکن — لطافت ہے بہت سی اس میں لیکن

نہ شاعر ہند کے یوں فی الحقیقت　　گئے لے فرس کے مضمون پہ سبقت
جھنجھوڑا فارسی کی استخواں پر　　کیا پر مغز تب ہندی زباں کو
فصاحت فارسی سے جب نکالی
لطافت شعر میں ہندی کے ڈالی

لفظ اردو کا استعمال ان کے ہاں تحسین کی طرح قدیم ہے۔ گویا تحسین نثر میں اور یہ نظم میں سب سے پہلے لاتے ہیں۔ میں ایک اور مثال ان کی مثنوی ''چار درویش'' سے دیتا ہوں:

یہ قصہ جو ہے چار درویش کا　　اگر نظم ہو تو بہت ہے بجا
و لیکن ہو اردو زباں میں بیاں　　کہ بھاتی ہے ہر ایک کو یہ زباں

نامی صاحب ان کی ''مثنوی مراد العاشقین'' اور فارسی ترجیع بند ''نامریداں'' چھاپ چکے ہیں۔ ذیل میں ان کا ''مگس نامہ'' بطور نمونہ کلام ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے:

شہر لاہور قبہ اسلام　　روشن آفاق میں ہے جس کا نام
خوبی اس کی تھی شہرۂ آفاق　　حسن کا اس کے تھا جہاں مشتاق
اصفہاں ہے جو ایک نصف جہاں　　خوبیوں میں نہ تھا کچھ اس سے کلاں
دور و نزدیک تھا یہی مشہور　　اپنے نزدیک تھا بہت سا دور
تھا عمارت سے یہ قوی بنیاد　　ربع مسکوں میں افتخار بلاد
تھا بہشت بریں بروے زمیں　　عجب انسان تھے اس مکاں کے مکیں
ایک سے ایک تھے دو صد چنداں　　سب ملائک صفت و لے انساں
اولیاء و مشائخ و سادات　　علماء اک سے اک ستودہ صفات
شہر تھا یہ کہ کان علم و ادب　　کان کیا بلکہ جان علم و ادب
کیا بہار اس کی میں کروں تحریر　　شہر تھا یا مرقع تصویر
گل عذاروں پہ حسن کی تھی بہار　　گل تھے ہر ایک کے گلے کا ہار
کھینچتے تھے دکھا کے رخ دل کو　　خانہ خانہ میں تھے کماں ابرو
عقل قبضہ میں کس کے رہتی تھی　　جاں ہو قربان دل سے کہتی تھی
تیر زد ہر کہ ترکش آساں نیست　　گوشہ کرد آں کہ مرد میداں نیست
خوبرو تھے حیا سے سب موصوف　　اور عاشق وفا میں تھے معروف
راہرو تھے سبھی طریقت پر　　تھام قدم قطر الحقیقت پر
اور جس کو کہیں مجازی تھا　　شیوہ اس کا بھی پاک بازی تھا

جو کہ عالم تمام دیکھ آتا
سو نہ دیکھ اس کو پھر کہیں جاتا

رشک آبادی جہاں تھا یہ
الغرض خوب ہی مکاں تھا یہ

سو زمانے نے ایسی زشتی کی
خوبی اس قطعہ بہشتی کی

لے کے دوزخ میں ڈال دی یک بار
وقنا ربنا عذاب النار

کوئی اس میں پڑا جو بوم قدم
ہے اب اس کا وجود رشک عدم

ہے مکاں کو شرف کمینوں سے
نہ کہ دوں ہمتوں کمینوں سے

نہ وہ رونق، نہ وہ صفائی ہے
مکھیوں کی غرض دہائی ہے

زر تو شاہ زماں سدھارے لے
مکھیوں کو گئے اجارہ دے

اسی صورت سے آگے احمد شاہ
تھا گیا چھوڑ چیونٹیوں کی سپاہ

گوز میں لی تھی سب انہوں نے گھیر
مثل درانیوں کے ہو کے دلیر

راہ خالی نہ تھا جو کوئی چلے
لیک رہتی تھی جوتیوں کے تلے

اب ہیں پر مکھیوں سے سب لاچار
ہیں یہ گردن پہ آہ سب کی سوار

نہیں آرام ان سے رات اور دن
کھا گئیں کان سب کے کر بھن بھن

دن کو کیا کہیے بات کھانے کی
اٹھ گئی رسم ہی پکانے کی

آتش جوع نے کیا جگر کو کباب
جس کے دل کوں کیا سو ہو بیتاب

خشک روٹی کہیں پکاتا ہے
کس مصیبت سے وہ بھی کھاتا ہے

اور قلیہ پلاؤ کھائے کون
ہو سکے کس سے اور پکائے کون

پک گئی شب کہیں جو تھوڑی دال
اس کے کھانے کا کیا لکھوں احوال

ماش کا دیکھ بیج ہیں چھلکا
کھا کے وسواس وہ جو تھا دل کا

منہ سے لقمہ وہیں اگل ڈالا
دیکھیو دال میں ہے کچھ کالا

یا یہ کہتے تھے کیا ہوا ہے ہے
لائیو طشت مجھ کو آتی ہے قے

اس میں پہنچی حکیم جی کو خبر
کوئی یاقوتی آئے وہ لے کر

لے اُدھر وہ زبان پہ رکھی
پڑ گئی ناک میں اِدھر مکھی

ناچتی ہیں کہیں جو کنچنیاں
دیکھیے جا کے تک وہاں کا سماں

ہے دھیان ان کو بھی یہ تانوں میں
مکھیاں پڑ نہ جائیں کانوں میں

اور پاؤں کی گت سے ہے منظور
مکھیاں ہوں کسی طرح سے دور

ناچنے کا غرض بہانا ہے
مدعا مکھیاں اڑانا ہے

مکھیوں سے نہیں کسی کو نجات
کچھ نہ پوچھو نمازیوں کی بات

جب کوے بیچ ڈول ڈالے ہیں
مکھیوں کا ہی بھر نکالے ہیں

کرنے جس وقت بیٹھتے ہیں وضو
پانی لے منہ میں کرتے ہیں تھوتھو

آہ بھرنا بھی ہو گیا ہے محال
اور لکھنے کا کیا لکھوں احوال

لے کے کاغذ پہ کلک جب رکھی
لکھتے لکھتے ہی یک قلم مکھی

سطر کی سطر ساری چاٹ گئی
اڑ کے پھر آنکھ پر بھی کاٹ گئی

جتنے گھوڑے تھے بوریا سرخنگ
مگسی ہو گیا ہے سب کا رنگ

شہر میں دیکھ میں یہ ہنگامہ
گاؤں میں آ لکھا مگس نامہ

متصل شہر کے اناری نام
ہے مریدوں کا اپنے جس میں مقام

لیک خالی ہیں ان سے شہر نہ گاؤں
کہ برابر ہے ان کو دھوپ اور چھاؤں

دن کو گرتی ہیں یوں کہ صید کو باز
رات کو یہ اڑیں ہما پرواز

سب پرندے خطر سے بھول گئے
اور درندوں کے پاؤں پھول گئے

کوئی حالت نہیں ہے انساں کی
اور نہ صورت کوئی ہے حیواں کی

آہ قطع نظر ز ہر حیواں
نتواں دید صورت انساں

بس کر آگے نہ کہہ کچھ ان کی بات
کہ مراد اب یہ ہے دعا دن رات

مکھیوں سے نجات پاویں سب
رغبت دل سے کھاویں پیویں سب

شہر پہ پھر وہی سماں ہووے
شکل بسنے کی پھر وہاں ہووے

نہ رہے کوئی فتنہ اور فساد
بے خلل شہر میں رہیں آباد

اختر نجس کا عمل جاوے
سعد اختر کا دور پھر آوے

شہر میں ہو سراسر آبادی
پھر وہی رونق اور وہی شادی

اور رہے اس کو تا قیام جہاں
فتنہ آخر الزماں سے اماں

تا بر آوے سبھوں کے دل کی مراد
قید سے رنج و غم کے ہوں آزاد

پیر سکندر شاہ امداد

(متوفی 1214ھ)

حضرت مراد شاہ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ بیس سال کی عمر میں وفات پاتے ہیں۔ مزار خانقاہ حضرت عبدالجلیلؒ واقع لاہور میں ہے۔ نمونہ کلام:

بادہ و جام ساقی و گل و مل ‏ ہے نہیں ہائے اک وہ غیرت گل
شب میں احوال اس کا کہہ نہ سکا ‏ شیشہ ہر چند کہہ رہا قل قل
زلف مشکیں کو دیکھ کر اس کی ‏ کٹ گیا آج طرۂ سنبل
جس گل اندام کے لیے میں نے ‏ کھائے اپنے بدن پہ لاکھوں گل
سو اشارہ میں اس کے خوں میرا ‏ لے گیا اس کے زنگنے کا کل
دیکھ کر اس پری کو ہوش و حواس ‏ آہ پرواز کر گئے بالکل

فیض شاہ مراد سے امداد
ہم نے باندھے ہیں ریختوں کے پل

رام کشن

میں رام کشن کے ایک ترجیع بند سے جو لمبا ہے، صرف چند اشعار پر قناعت کرتا ہوں:

توں بے وفا ہے مجہ تیرے اقرار کی قسم
بے اعتبار ہیں ترے اعتبار کی قسم
ناگن کی بھانت ڈس کے میرا دل الٹ گئی
مرتا ہوں مجھ کوں زلف سیہ مار کی قسم
خفت میں ہوگئی ہیں تری چال دیکھ کر
سب کبک کوہسار کی رفتار کی قسم
نازک بدن ہے تیرا کروں صفت کیا بیاں
شرمندہ گل ہوئے گل گلزار کی قسم
زیباں بزیب و خوبی ادینہ نگر کے بیچ
کھاتی ہے سخن تیرے شکر بار کی قسم
ہم سے نہ اپنے رخ کوں چھپا شوخ نازنیں
تجھ کوں ہے رام کشن طلب گار کی قسم

(از بیاض پروفیسر آذر)

فقیراللہ

فقیراللہ خانوادہ نوشاہیہ سے بیعت ہیں اور شاہ امانت کے مرید ہیں۔ حاجی نوشہ متوفی 1103ھ اس سلسلے کے بانی ہیں۔ شاہ امانت کا حاجی نوشہ سے یہ واسطہ ہے کہ شاہ امانت حضرت عبدالغفور کے مرید ہیں جو محمد حافظ سے بیعت رکھتے ہیں اور محمد حافظ محمد ہادی سے ارادت رکھتے ہیں جو بانی سلسلہ حاجی نوشہ کے مرید ہیں۔

فقیراللہ مثنوی "دُرِ مکنون" کے مصنف ہیں جو "رمز العشق" کی طرز میں تصوف پر لکھی گئی ہے۔ اس میں ایک ہزار سے زائد ابیات ہیں اور بحر بھی تقریباً وہی ہے۔ سرخیوں کے طور پر اس میں دوہرے لائے گئے ہیں۔ اس کی تاریخ تصنیف 1104ھ "چراغ" کے اعداد سے برآمد ہوتی ہے۔ افتتاحیہ:

اند سنا تیرے گن گاواں — ہر دم تیرا نام دھیاواں
اند بھی ست گور میں پایا — اچھا جاپ جس مجھے بتایا
کنت کنزاً نے کیا پیارا — سوہنگ آہنگ آئے پکارا
اچھا جاپ جپاوے کو سوئے — جس کا ہردا نرمل ہوئے
سوہنگ ہوا نا کو جان — سری شغل کا بھید پچھان
ہو اللہ ہے اچھا جاپ — جپ سیں کٹیں کوتاں پاپ
باہر سو بھیتر اور آہنگ — اچھا جاپ ہے سوہنگ آہنگ
ہو انا جب جس نے کہا — سو جن ہو اللہ ہو رہا
ہو انا جب سالک کہے — دوَیت دوار آہنگ ہو رہے
آپی ہر جی آپی توں — انا انا ہو بولیں توں
ہر ہر رنگی ہے بے چوں — جس بے چونی میں سب بے چوں
جو جاپ سیں پاوے سکھ — بن ہو اور سبھی ہے دکھ
ہو جاپ ہی چوتھے پد کا — ساہدو پاوے بھید اس جد کا
شاہ امانت بھید بتایا — تو ہیں ان حد ناد بجایا
معنی اسم صفت کے جانوں — بوجھ بھید اور سر پچھانوں

اسم مسمیٰ جانو میت — سمجھ بوجھ کر دھریو چیت
ہر یک اسم کی شان پچھان — لازم حفظ مراتب جان
جس نے حق کوں سن سمجھ پچھانا — حفظ مراتب لازم جانا
میں کیا کہتا ہوں دیوانا — سن کر طلب کر خو سیانا
اوس کے سات مراتب جان — ہر واحد کے حکم پچھان
فرق ار جمع مو جان یہ نیک — بہتر دونوں کوں جانو ایک
گور ایسے بوجھ منزہ ذات — نا ہو کافر نا کم ذات(کذا)
ست گور سیں یہ بھید پچھان — پھر دونوں کو ایک ہی جان
ایک ہی ایک ہے ایک ہی ایک — سمجھ لو اور بوجھو نیک
آپے عابد ہے معبود — آپے ساجد ہے مسجود
وحدت عین کثرت ہے یارو — ظاہر میں تم سمجھ بچارو
اور باطن میں تمیز جان — کثرت کوں وحدت پچھان
کل اسماء کی واجب جان — فاعل بیچ اشیا کے مان
سبہ اسماء کیا فانی — جانو حادث اور نقصانی

خاتمہ:

سر مکنوں کا جس نے جانا — اپنے آپ کوں آپ پچھانا
فقیر اللہ کیا کہی بات — سر مکنوں ہے شاہ کی ذات
شاہ ہمارا شاہ ہمارا — کل عالم کا سرجن ہارا
سر مکنوں کے سن کوں جان — یعنی عدد ''چراغ'' پچھان
سر مکنون کو کیا تمام — شاہ جیلانی کا لے کر نام
ہے وہ سید عبدالقادر — ظاہر باطن اول آخر

عبد القادر پیر ہمارا محی الدین نام رکھایو رے
ظاہر باطن قادر ہو کر زکو بھر چھایو رے

رحمت شاہ

رحمت شاہ مثنوی ''شیریں فرہاد'' کا مالک ہے۔ جس میں ہر نو دس اشعار کے بعد بند کے طور پر دوہرے آ جاتے ہیں۔ اس مثنوی کی زبان بھاشا اور پنجابی آمیز ہے اور لطف یہ ہے کہ کبھی پنجابی غالب ہے اور کبھی برج۔ رحمت شاہ نے اپنے متعلق کچھ نہیں لکھا حتیٰ کہ ہم کتاب کے نام و تاریخ نیز مصنف کے زمانہ سے بے خبر ہیں۔ پوری وہ اپنا وطن بتایا ہے' جہاں جگ دیو کا استھان ہے۔ یہاں اس کے والدین آ کر آباد ہو جاتے ہیں۔ اس کے والد نے سات مرتبہ حج کیا ہے:

ابتدا:

اول نام صاحب کا لیجے ۔۔۔ پاچھے تے سب کارج کیجے
جیو جنت جو اوس او پائے ۔۔۔ ہر ہر کرت سنگ لائے
اوہو داتا سبھن کا سائیں ۔۔۔ پالے سبھن کو ہر جائیں
اوس مہمان کیا کہوں بکھانو ۔۔۔ اوی جوت کی کلا نجانو
لاکھ جیو جو جل میں رہیں ۔۔۔ تاتا رزق ہمیشہ لہیں
پنچھی اور پرندے ہاتھی ۔۔۔ کیے جون کی شکل نجاتی
خبر لہینہ اوہ کرتارا ۔۔۔ اوی دوار پر کریں پوکارا
دھری کوں نہیں پاس بہاوے ۔۔۔ پاپی کوں نہیں مار ہٹاوے
ہر ہر میں ہر ہے ہر جاتا ۔۔۔ کون کرے ہر تن یہ ناتا
پاتھر سوں جو رزق پونچاوے ۔۔۔ ہور جیو کئی نظر نہ آوے

رحمت شاہ اپنے وطن کے متعلق یہ بیان دیتا ہے:

اک نگر ات بسے سوہاوا ۔۔۔ نگر بیچ تاں لوک ملاوا
دوار دوار پر کھڑے تورنگا ۔۔۔ دیہہ ڈھولک باجے مردنگا
ہر اوہیں کو پر اوپکارے ۔۔۔ کرتے پرش گئے اوتارے
نس دن تے مادہ ماتے ہیں ۔۔۔ شترو سوں سر سنگ کہیں

پوری نام جگدیو استھاناں — نگر لوک اک چتر سو جاناں
ہم بستے ہیں اوس نگر میں — دیا دھرم کا روپ شکل میں
مات پتا ہمرو جب آئیو — ایس نگر استھان بنائیو
پیچھم اودے شہر جگ کینا — انہاں آہ سکھ سپت لینا
ست بار حاجی او بھئے — پھر کہر جا مدینے رہے

انت کال اس نگر میں آئے کیا اسرام
سبہ کارج پورے ہوئے نال رب دے نام

خاتمہ:

دیو جنگل اکٹھے ہوئے — جلسہ دیکھو فرہاد جو موئے
کیا ہویا فرہادی تائیں — کتنے جو مار دیا اس تائیں
کرہ سادی اوس کیا کچھ کیتا — عاشق مار لیا چپ کیتا
لائق ہے بدلہ جو کرو — کتنے کوں سولی پہ دھرو
رل دیواں ایہ بات بنائی — کتنے دے گل پاؤ پھاہی
مار مار کر بوہت بے حالا — اوہ کتنے مندے احوالا
اورک کیتا سب کو پاوے — بدلہ اوہ صاحب دکھلاوے
دیکھے سر پہ صاحب سائیں — بدلہ اوہ چھو دیندا ناہیں

اوہ بدکار جو مار کر کیتے بوہت بے حال
رحمت شاہ دے چغل دا رہ ی مول نہ ڈال

عبدالرحمٰن خلدی

خلدی کا زمانہ تیرھویں صدی کا پہلا مصنف تصور کرنا چاہیے۔ اگرچہ کلام میں قدامت کی جھلک ہے۔

گھونگھٹ دور کر مکھ دکھا رے بجن — دل عاشقاں نہ ستا رے بجن
دیا جن نے جوین کرم سے تجھے — خدا کا کرم نہ چھپا رے بجن
جدائی تیری سے جلا جان و دل — جلے کا جیا نہ جلا رے بجن
کرم کر نزنکار کے واسطے — ترے عشق میں مر چکا رے بجن
مرے خون کا کیا کرو گے جواب — جو پوچھے گا تم کو خدا رے بجن
جدائی تری سے تو میں مر رہا — مرے حال پر کر دیا رے بجن
وفا ابتدا میں بھلا چھوڑنا — تجھے کس کہا سو بتا رے بجن
سنبھالو محبت کا قول و قرار — کرو یاد اپنا خدا رے بجن

کوئی دن تو مل بیٹھو خلدی کے ساتھ
نہیں جگ موں میں رہنا سدا رے بجن

(از بیاض مولوی محبوب عالم ایڈیٹر "پیسہ اخبار")

غلام قادر جلال پوریہ

جلال تخلص

اس کا زمانہ معلوم نہیں، لیکن تیرہویں صدی کے نصف اول میں اس کو جگہ دی جاتی ہے۔ کلام میں فارسی ترکیبیں زیادہ غالب ہیں۔ غزل ذیل سراج دکنی کی مشہور غزل کے جواب میں لکھی ہے:

ترے رخ کی تاب جمال سے نہ قمر کی وہ قمری رہی
نہ سمن کی سیم بری رہی نہ چمن کی جلوہ گری رہی

کرے خوش خرامی کی طرز میں ترے سرو قد کی برابری
یہ ہوس ہمیشہ ہوا میں بھی بخیال کبک دری رہی

بجناب حضرت عشق جب لیا درس نسخہ صلح کل
نہ کسی سے جنگ وجدل رہا نہ کسی سے کینہ وری رہی

بخیال ساقی جسم تو شدہ خواب مخمل و عبقری
گئی بادلہ کی جھلک بدل نہ ذرا بھی تاب زری رہی

ہوئے موج خیز فنا میں ہم بکمال شوق جب آشنا
اسی سیل جوش بلا میں بھی کبھی امن و فراغ دھری رہی

دل و دیں کیا ہے فدا میں سب ترے عشق بیچ پھنسا ہوں جب
نہ رہا ہے کچھ زحق ادب جو رہی سو جاں سپری رہی

بحلاوت لب لعل تو کرے سبزہ دعوئی ہمسری
بمراد دل تو سدا گرہ بمذاق نے شکری رہی

دیکھو معجزہ نہیں کیا ہے یہ ترے حسن و شان کے روبرو
نہ کمال شان ملک رہا نہ مجال حسن پری رہی

کیا منزلوں سے جدا رہا رہ دور کعبہ عاشقی
یہ مراد خاطر عاشقاں اسی راہ میں سفری رہی

نگہ عنایت یار کی کروں کس زبان سے صفت بیاں
کہ کرم سے حال غلام پر وہی عین خوش نظری رہی

(از بیاض مولوی محبوب عالم ایڈیٹر "پیسہ اخبار")

نثر

پوتھی سلوتری کی

نثر نظم سے نسبتاً کم لکھی گئی ہے اور اس کے نمونے کمیاب ہیں۔ میں یہاں ایک رسالے کا ذکر کرتا ہوں جو غالباً بارہویں صدی کے اواخر میں لکھا گیا ہے۔ یہ "فرس نامہ" ہے جو دس فصلوں اور تیرہ اوراق پر شامل ہے۔ اس کا آخری ورق مفقود ہے۔ کاتب کوئی غیر مسلم ہے، جس نے بسم اللہ کے بجائے "ست گور پرشاد" لکھا ہے۔ اس رسالے میں فارسی و عربی کا استعمال کم دیکھا جاتا ہے۔ مصنف حروف ظرف و اضافت کی صورت میں کبھی پنجابی اور کبھی اردو حروف لے آتا ہے۔ اسماء و افعال بھی بعض اوقات پنجابی ہیں اور اگرچہ رسالہ اردو میں لکھا گیا ہے لیکن ٹھیٹ پنجابی لہجے میں ہے۔ نمونہ:

"پوتھی سلوتری کی۔ پچھان ناں گھوڑیاں کا عیب سواب، عمر کا ذات کا روک کا'
سو دس بھانت کا ہے:
بھانت پہلی پیدا ہونے والے کھورے کے۔ دوسرے کھورے کے سواد نے کی۔ بھانت تیسری پچھاں ناں سوکن اوکن کا۔ بھانت چوتھی پچھاں ناں نحس کا۔ بھانت پنجم پچھاں ناں برساں کا۔ بھانت ششم مل (مول) لینیں کھورے کا۔ بھانت ستی پچھاں ناں ذات کھورے کی کا۔ بھانت آٹھی پچھاں ناں کھصیت (خاصیت) کا۔ بھانت نویں پچھان ناں روک کا۔ بھانت دسی کرنا علاج کا۔

بھانت پہلی پیدا ہونے کھورے کے۔ اک برہمن اما نام اس کا اسپت تھا۔ اکن ہوتری تھا۔ اکن ہوتر میں دھوانکس کے جو آنکھیں میں پریا تھا۔ تس تے آنسو جو چلتے تھے۔ داہنی جو اکھ تے آنسو چلتے تھے، تس تے کھورا ہوت بھیا۔ بادیں آنکھ نے جو آنسو چلتے تھے، تس تے کھوری ہوت بھئی۔ پوتر جو اس برہمن کا تھا۔ اس کا نام سالوتر تھا۔ تن پوترا اپنے نو کھیا۔ اک پوتھی کھوریاں کی کرو، جس تے کوں اوکن ارروک ار علاج جانیا جاوئے۔ تس نیں او پوتھی کری، آپ نما ہیں نام رکھیا۔"

یہ عبارت بے ربط اور اکھڑی اکھڑی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف زبان پر عبور نہیں رکھتا۔

ہزار مسائل

رسالہ ''ہزار مسائل'' فارسی کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے اور حفظ الرحمٰن صاحب (حفظ العلوم) کی ملک ہے۔ اس کے مؤلف اور زمانہ تالیف سے ہم بالکل بے خبر ہیں' لیکن اس کی املا اور افعال واضافت کی جمع مؤنث کو دیکھ کر جو قدیم طرز میں ہے' ہمیں تیرہویں صدی ہجری کی ابتدائی ربع میں اس کا تعین کرنا ہوگا۔ کیاں بجائے کی' ہونگیاں بجائے ہوں گی' چھپتیاں بجائے چھپتیں' ہوتیاں بجائے ہوتیں وغیرہ' قدیم شکلیں ہیں جو میرامن کے بہت جلد بعد متروک ہو چکی ہیں۔ نسخہ ہذا 1288ھ مطابق 1930 بکرمی مطابق 1874ء کا نوشتہ ہے۔ نمونہ:

''جب کے نامہ مبارک نزدیک عبداللہ ابن سلام پہنچا' شرطیں تعظیم کیاں بجا نیا کر نامہ معظم کوں پڑھا اور اپنی قوم کو اکٹھی کر کے مضمون نامہ مبارک سنایا کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو آخری زمانہ کے پیغمبر تھے ایک نامہ پاس (کذا) بھیجا اور دعوت اپنے دین کی کی ہے۔ لازم ہے کہ ہم سب لوگ ایمان لیاویں اور ان کی شریعت اور دین کی پیروی کریں۔ کوئی متفق ہو کر جواب سناؤ۔ ان سب نے کہا کہ اے عبداللہ ابن سلام تم سب لوک علماء ہمارے سے داناتر ہیں اور نبیوں کی حقیقت اور ماہیت پر بڑے واقف ہیں۔ تماری مرضی کے خلاف ہم نہیں کر سکتے۔ جو تم فرماویں سب راضی ہیں لیکن یہ خیال ہم کوں آتا ہے کہ کیونکر اپنے دین کو چھوڑیں اور ان کے دین کی پیروی کریں۔ تب عبداللہ ابن سلام نے کہا کہ اے لوگو تم سب جانتے ہو کہ تم کو بھی معلوم ہوگا کہ موسیٰ پیغمبر علیہ السلام نے خبر دیئی ہے اور دوسرے پیغمبروں نے بھی خبر دیئی ہے' اپنی اپنی قوم میں کہتے آئے ہیں کہ ایک نبی آخر زمانہ میں نام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوگا اور جب اس کا زمانہ آوے گا ہم سب کا دین چھپ جاویگا اور اسی کا دین مشرف ہوگا اور مشرق تا مغرب تک پھیل جاوے گا اور ہم سب کی کتاب اور شریعت منسوخ ہو جاویگی۔ اور دوسرا یہ کہ جو چیزیں ہمارے دین میں حلال ہیں اس کے دین میں حرام ہونگیاں اور جو چیزیں

ہمارے دین میں حرام ہیں اس کے دین میں حلال ہونگیاں۔ توریت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام اور دوسرے صحیفوں اور نبیوں نے ارشاد فرمایا ہے کہ ان کتابوں کی پیروی کرنے والیوں کوں چاہے کہ اس پیغمبر کی شریعت میں داخل ہو کر ایمان لیاویں اور اپنے دل کوں شمع دین اس کی سیں روشن کریں۔"

پنجابی انبالوی

اردو زبان پنجاب میں

میں نے جولائی کے ''علی گڑھ منتھلی'' میں اس عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس دفعہ پھر مجھ کو اس عنوان پر کچھ لکھنا پڑا۔ اگست کے ''اردوئے معلٰی'' میں ایک مضمون اسی عنوان کی ذیل میں ''تنقید ہمدرد'' کے قلم سے شائع ہوا ہے۔ سرورق پر مضمون اور مضمون نگار کا نام پڑھ کر توقع پیدا ہوئی کہ کوئی ناصح مشفق ہوں گے مگر مضمون کو جو پڑھ کر دیکھا تو ایک جنگجو کو ناصح کا بھیس بھرے ہوئے پایا۔ ہمدردی کی ٹٹی کی آڑ میں بے دردی کو شکار کھیلتے دیکھا۔ چار و ناچار چند سطریں لکھنی پڑیں' ورنہ میں پہلے مضمون میں لکھ چکا ہوں کہ علم ادب کے بارے میں بے سود نزاع اور بے جا اختلاف میں پسند نہیں کرتا اور خصوصاً امتیاز وطن کو مٹانے کا قائل ہوں۔ ''اردوئے معلٰی'' نے اپنے مضمون نگار کے مضمون کو شائع کرنا اپنی مصلحت کے خلاف نہیں سمجھا ہے۔ خیر ''اردوئے معلٰی'' کو اختیار ہے جو مصلحت چاہے اختیار کرے۔ مناظرہ کرے، مجادلہ کرے، مکابرہ کرے مگر میری جانب سے اس مضمون پر یہ آخری تحریر ہے۔ آئے دن کی چھیڑ چھاڑ کا بندہ قائل نہیں۔

''تنقید ہمدرد'' صاحب کون ہیں؟ کوئی ہوں مگر ذیل کی چند باتیں ان پر ضرور صادق آتی ہیں۔
اول' وہ ہمہ داں ہیں کیونکہ اگرچہ مضامین میں متکلم کا اپنی نسبت مَیں یا ہم لکھنا ہمیشہ ایک ٹیڑھا سوال ہے مگر ان کا اپنے تئیں جا بجا ئیں لکھنا ایک عجیب طمطراق کے ساتھ ہے' جس سے ہمہ دانی ٹپکتی ہے۔ دوم' وہ لکھنوی یا مضافات لکھنؤ کی خاک پاک سے نسبت رکھتے ہیں، کیونکہ وہ جا بجا لکھنؤ کو ہی اردو زبان دانی کے کمال کا مرکز قرار دیتے ہیں اور یہ بھول گئے ہیں کہ ایک اور مشہور شہر بھی ہندوستان میں ہے جہاں کی لکھنؤ نے خوشہ چینی کی ہے اور جہاں اب بھی گذشتہ خاک نشینوں کی کچھ یادگاریں موجود ہیں اور اسی لیے اگر کسی شخص سے اس شہر کی زبان کی تقلید کا جرم سرزد ہو جائے تو وہ قابل معافی ہو سکتا ہے۔ سوم' وہ جناب مخدومی ایڈیٹر صاحب ''اردوئے معلٰی'' کے گلشن خیالات کے گل چیں معلوم ہوتے ہیں کیونکہ بعض اعتراض وہ ہیں جو جناب ایڈیٹر صاحب ممدوح کی زبان سے سننے کی عزت راقم کو حاصل ہو چکی ہے۔ چہارم' ہمدرد نہیں ہیں کیونکہ جا بجا بیدردی کے فقرے موجود ہیں۔ ناظر کو طنزاً ''ملک الشعرائے پنجاب'' کہنا' ناظر کی غزل کو ''لکھنؤ کے ایک جاہل شاعر کی سخن سنجی سے بھی کم'' قرار دینا' چند بے جا اعتراضوں کے ساتھ ہی بہت سے بے جا اعتراض کر بیٹھنا (جیسا کہ آگے چل

کر ثابت ہو گا) یہ سب کچھ صریح دلیل بیدردی ہے نہ کہ ثبوت ہمدردی۔ پنجم' ناظر سے خاص الخاص طور پر خفا ہیں کیونکہ سخت الفاظ زیادہ تر ناظر صاحب کے لیے ہی استعمال کیے ہیں۔

میرا یہ مضمون کسی قدر غیر مسلسل ہو گا کیونکہ میں صرف چند باتوں کا جواب اس غرض سے لکھوں گا کہ "تنقید ہمدرد" صاحب دیکھیں کہ ان کے لیے بھی غلطی کرنا ممکن ہے۔ وہ بھی معصوم عن الخطا نہیں ہیں یا کم از کم ان کے ساتھ معقول اختلاف کرنا ناممکن نہیں ہے۔ اختصار کی غرض سے "تنقید ہمدرد" صاحب کا ذکر ہمدرد کے لفظ سے کیا جائے گا۔

حاجی محمد خاں صاحب نے "پیسہ اخبار ایجنسی" کہیں نہیں لکھا۔ ان کے لفظ یہ ہیں: "پیسہ اخبار اور وکیل ایجنسی"۔ ان الفاظ کے جو خاص معنے ہمدرد صاحب پر نازل ہوئے ہیں' ان معنوں پر غور کرنا ہے۔ وکیل ایجنسی یا تو انگریزی ترکیب بجنسہٖ اردو میں رکھ دی گئی ہے یا فارسی کے قاعدے سے اضافت مقلوب ہے۔ تیسری صورت ممکن نظر نہیں آتی۔ اگر فارسی ترکیب ہے تو "پیسہ اخبار اور وکیل ایجنسی" کے معنے "پیسہ اخبار ایجنسی اور وکیل ایجنسی" نہیں ہو سکتے ورنہ "جہاں اور عالم پناہ" کے معنے "جہاں پناہ اور عالم پناہ" یہ معنے "پناہ جہاں اور پناہ عالم" ہو سکیں گے اور یہ ناممکن ہے۔ پس اضافت مقلوب فرض کر کے ہمدرد صاحب کی تاویل غلط ٹھہرتی ہے۔ اب فرض کیجیے کہ انگریزی ترکیب بجنسہٖ اردو میں رکھ دی گئی ہے۔ اس صورت میں ہمدرد صاحب کے معنے اس وقت درست ٹھہریں جب "پیسہ اخبار اور وکیل ایجنسیز" بصیغہ جمع کہا جائے یا بصیغہ واحد۔ بصورت موجودہ کہیں تو یہ فرض کیا جائے کہ پیسہ اخبار اور وکیل کی ایجنسی ایک ہی ہے (جو از روئے واقعات غلط ہے)۔ پس ہمدرد صاحب کو جو تاویل سوجھی ہے وہ غلط ہے، بالکل غلط ہے ورنہ وہ بتائیں کہ کس قاعدے سے اور کون سی زبان میں ان کے گھڑے ہوئے معنے ٹھیک ہیں۔

میری جو شامت آئی تو میں نے یہ لکھ دیا کہ شرر کی سی نثر آپ صوبجات متحدہ کے کسی مصنف کی کتاب میں ہی دکھا دیجیے۔ پنجاب سے تو بعد میں ہی اس کی نثر کا جواب طلب کیجیے گا۔ اس کے جواب میں ہمدرد صاحب نہایت معقولیت سے ارشاد فرماتے ہیں کہ شرر کی سی نثر بلکہ اس سے بہتر لکھنے والے لکھنؤ اور مضافات لکھنؤ میں بیسیوں یا سینکڑوں بھرے پڑے ہیں' مگر وہ "گرفتار اد بار و غفلت ہیں' اس لیے کسی کو ان کے کمال کا ثبوت نہیں ملتا۔" مجھ کو اس بیان کے درست تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے مگر اس سے امر زیر بحث پر اثر نہیں پڑتا۔ انگریزی شاعر گرے اپنی لاثانی نظم "مرثیہ گور غریباں" میں بعض "گنگ و گمنام" ملٹنوں کا ذکر کرتا ہے۔ ہمدرد صاحب کے مضافات لکھنؤ کے صاحب کمال بھی گرے کے ملٹنوں سے بڑھ کر نہیں ہیں' جب تک کچھ کر کے نہ دکھائیں۔ اس حساب سے تو پنجاب میں ہزار ہا فردوسی اور انیس' ناسخ اور آتش گذر چکے ہیں اور اس وقت بھی موجود ہیں' گو انہوں نے ہل کے سوا کبھی کسی قلم کو نہیں پکڑا اور صفحہ سر سبز کشت زار کے سوا کوئی کتاب نہیں پڑھی مگر کیا ان کے وجود سے پنجاب لکھنؤ کے انیس اور طوس کے فردوسی کے کمال کا معارضہ کر سکتا ہے؟ پھر اس

بات کے معنے کیا ہیں کہ اور بھی شرر جیسے لوگ موجود ہیں مگر وہ کچھ کرتے نہیں؟ ان کے وجود سے فائدہ؟

اب میں ہمدرد صاحب کے اعتراض یکے بعد دیگرے دیکھنا چاہتا ہوں۔

ناظر کی غزل پر بہت جھنجلائے ہیں۔ لکھنؤ کے جاہل شاعر کی غزل سے بدتر قرار دیا ہے اور ایڈیٹر ''مخزن'' کی رائے پر خردہ گیری کی ہے۔ ایڈیٹر ''مخزن'' کی یہ رائے ایک نہایت عام فقرہ ہے اور جہاں تک میرا تجربہ ہے ایڈیٹر لوگ محض مضمون نگاروں کی حوصلہ افزائی کے لیے ایسے فقرے لکھ دیا کرتے ہیں۔ اگر خود انھی سے کسی فرصت کے وقت پوچھا جائے تو شاید وہ بھی کوئی مختلف ہی رائے دیں مگر ایڈیٹری کرتے وقت لکھ ڈالتے ہیں۔ اور تو اور مولانا حسرت موہانی نے امانت کی ''اندر سبھا'' کو شیکسپیئر کے ابتدائی ناٹکوں سے بوجوہ احسن بہتر لکھ دیا! حالانکہ جو لوگ شیکسپیئر کو سمجھتے ہیں اور امانت کے ''اندر سبھا'' سے واقف ہیں' وہ اس بیان کو پڑھ کر ضرور مسکرائیں گے مگر چونکہ مولانا کو ایک انوکھی تاویل ''اندر سبھا'' کی سوجھی تھی' اس کی جدت کے نشے میں سبھی کچھ لکھ گئے اور میں ان کو معذور سمجھتا ہوں۔

میں بھی ناظر کی اس غزل کو کچھ بہت اعلیٰ نہیں سمجھتا۔ غالباً ناظر نے یہ غزل محض دل بہلاوے کے طور پر لکھ دی ہے مگر جو غلطیاں ہمدرد نے نکالی ہیں' وہ اس میں موجود نہیں ہیں۔ ذیل میں تفصیل عرض ہے۔

کم ہے پائے ناتواں زنجیر کیا۔ ''فرمایا ناتوانی کو اپنی زنجیر کہہ سکتے تھے۔ خود پائے ناتواں کو اپنی زنجیر کہنا سلامتی ذوق سے کوسوں دور ہے۔'' یہ ارشاد ہمہ دانی کا ایک معمولی نتیجہ ہے۔ شعراء کا عمل ناظر کے طرز کلام کا موید ہے۔ یہ ارشاد ہمہ دانی کا ایک معمولی نتیجہ ہے۔ ''بسا اوقات ایک شے کو خود اسی شے کے حق میں کسی وجہ سے ایک دوسری شے کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے۔'' وہ وجہ کبھی اس شے کی کوئی صفت ہوتی ہے، کبھی اس شے کی کوئی تاثیر اور کبھی کبھی محض قائل کا ایک خیال یا عقیدہ۔ مثالیں بغور ملاحظہ ہوں:

کس دشمن من نیست منم دشمن خویش

میں اپنا دشمن ہوں، خود ہی حاسد خود ہی محسود۔ وجہ اپنی بدکرداری۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

سورج ہے خود ہی مثبت خود ہی ثبوت۔ وجہ سورج کا روشن ترین اشیاء ہونا۔ اسی طرح پائے ناتواں خود ہی قید خود ہی مقید۔ وجہ پاؤں کی پرلے سرے کی ناتوانی۔

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردہ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز (غالب)

ہمدرد کے قاعدے سے یہ بھی غلط ہے کیونکہ ٹوٹنے والی شے ایک شے ہے اور صدائے شکست بالکل الگ شے ہے' مگر غالب کہتا ہے کہ میں ہی ٹوٹا ہوں اور میں ہی اس ٹوٹنے کی آواز ہوں۔ اب پیمائش کر کے بتلائیے کہ یہ سلامتی مذاق سے کتنے میل کے فاصلے پر واقع ہے؟ اور لیجیے۔

نقشے ز خود براہ گذر بستہ ایم ما
بر دوست راہ ذوق نظر بستہ ایم ما
(غالب)

خلاصہ یہ کہ میں اپنی راہ میں خود حائل ہوں' اسی لیے دوست کو نہیں دیکھ سکتا۔ چاہیے تھا کہ یہ پردہ کوئی اور ہوتا اور متکلم پس پردہ ہوتا۔ یہاں خود ہی حجاب خود ہی محجوب۔ اس کو بھی جریب ڈال کر دیکھیے یہ کہ منزل سلامتی مذاق سے دور ہے؟ اور لیجیے ؎

ما جملہ وقف خویش و دل ما زما پُر است
گوئی ہجوم حسرت کار خودیم ما

ہماری حسرت کار اور شے ہے اور ہم اور شے۔ ہم خود اپنی حسرت کار کا ہجوم کیونکر ہو سکتے ہیں؟ خدا جانے یہ سلامتی مذاق سے کس طرف اور کتنے فاصلہ پر واقع ہے؟ پس اگر میں اپنا دشمن آپ ہو سکتا ہوں۔ اگر آفتاب اپنی دلیل آپ ہو سکتا ہے۔ اگر میں اپنی شکست کی آواز خود ہو سکتا ہوں۔ اگر میں اپنے رستے میں آپ حائل ہو سکتا ہوں۔ اگر میں اپنی حسرت کار کا ہجوم خود ہو سکتا ہوں تو پائے ناتواں بھی اپنی زنجیر آپ ہو سکتا ہے۔ یہ سلامتی مذاق سے نہ کوسوں دور ہے نہ میلوں نہ منزلوں۔ البتہ ہمدانی سے بُعد المشرقین پر واقع ہے۔

غالب کے اشعار مندرجہ بالا کو شاید غیر متعلق کہا جائے اور یہ تاویل کی جائے کہ وہ سوائے اخیر مثال کے مسئلہ وحدت الوجود پر مبنی ہیں اور اخیر مثال کے صرف یہ معنے ہیں کہ میں ہمہ تن حسرت ہوں مگر اس سے میرے استدلال میں فرق نہیں آتا۔ میں نے جن الفاظ میں اصول زیر بحث کو بیان کیا ہے' وہ بالکل جامع و مانع ہیں۔ مسئلہ وحدت الوجود وجہ ہوگا۔ (بمراد اصول مذکور) ہمہ تن حسرت ہونا بھی طبعی طور سے ناممکن ہے۔ یہاں بھی ایک وجہ سے ہی متکلم "ہجوم حسرت کار خود" ہے اور وہ وجہ متکلم کی ایک صفت (بہ درجہ غایت حسرت زدہ ہونا) ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہمدرد کا اعتراض ناظر کے لفظوں پر ہے۔ معنی پر اعتراض نہیں ہے کیونکہ معنی تو یہ ہیں کہ پاؤں کی ناتوانی پاؤں کے لیے زنجیر کی سی تاثیر رکھتی ہے۔ اس سے کون منکر ہے۔ خود ہمدرد صاحب بھی منکر نہیں ہیں۔ مگر اعتراض لفظوں پر ہے جو کہتے ہیں کہ پائے ناتواں (خود اپنے حق میں) زنجیر سے کیا کم ہے؟ پس وحدت الوجود کا حوالہ دینا تو معنے پر بحث کرنا ہے۔ حالانکہ لفظی اعتراض کا جواب لفظی تحقیق سے ہی ممکن ہے۔ اسی لیے میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو لفظی ساخت ناظر کے شعر کی ہے' وہ شعراء میں ایک خاص اصول کے موافق مروج اور مسلم ہے۔

سر میں سودا کی ہے پھر تبخیر کیا

فرمایا ہے کہ "سودے کی تبخیر" ہونا چاہیے اور "سودا کی تبخیر" کو خاص پنجاب کا محاورہ قرار دیا ہے۔ واقعی خاص پنجاب کا محاورہ ہے۔ اس لیے ذوق نے لکھا ہے ؎

ہو گیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق
لالہ بے داغ سیہ پانے لگا نشوونما

کسی قاعدے کا حوالہ دینا ان لوگوں کے لیے ہرگز ضروری نہیں ہے۔ جن کا قول بے دلیل خود قانون اور قاعدے کا حکم رکھتا ہو اور یہی رتبہ ہمدرد صاحب کے اقوال کا ہے۔ اگر ہمدرد صاحب کی مراد کو میں غلط سمجھا ہوں تو میں خوشی سے اصلاح کو قبول کروں گا مگر میری سمجھ میں ہمدرد صاحب کا قاعدہ اس طرح آتا ہے کہ جن اسمائے نکرہ مذکر کے آخر میں الف ہو حروف مغیرہ یا تابع مغیرہ کے آنے سے ان کے آخر کا الف یائے مجہول سے بدل جاتا ہے۔ جیسا گھوڑے کا قدم گدھے کی دم وغیرہ اسی طرح سودے کی تجیر۔ میں کہتا ہوں کہ عربی الاصل یا فارسی الاصل الفاظ جو پرلے سرے کی عمومیت حاصل نہ کر چکے ہوں اور جو ہر نہج سے ہندی الفاظ کا رتبہ حاصل نہ کر چکے ہوں وہ اس قاعدے سے ضرور مستثنیٰ رکھتے ہوں گے چنانچہ استادوں نے مستثنیٰ رکھے ہیں:

گریباں پھاڑ کر جا بیٹھے صحرا کے دامن میں (مومن؟)

آپ یہاں صحرائے دامن میں کیوں نہیں کہتے؟

دریا میں مچھلیاں جو کمزور ناتواں ہیں (حالی)

دریے میں کہیے گا کیا؟ حاجت شمع ہے شائد کہ ہما کے گھر میں (برق) ہے کے گھر میں لکھیے گا؟ اگر نہیں تو آپ کا قاعدہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر آپ کہیں کہ اس خاص لفظ کو محاورے میں اس طرح بولا جاتا ہے تو اس کے دو جواب ہیں۔ اول' کوئی عالمگیر محاورہ ایسا نہیں ہے' کم از کم اہل دہلی کا تو یہ محاورہ نہیں ہے۔ لکھنؤ کی گلیوں کا محاورہ شاید ہو۔ دوم' اگر کوئی محاورہ ہو بھی تو میں اسے عامیانہ سمجھتا ہوں اور ذی علم لوگوں کی توجہ کے قابل نہیں سمجھتا۔ سودا ایک علمی اصطلاح ہے۔ اس کا وہی استعمال مستند ہوگا جو اہل علم کے ذوق سلیم کے موافق ہوگا۔ غلط العوام پر عمل نہیں ہوگا۔ ایک ہی شہر میں فصحا اور عوام کی زبان میں نمایاں فرق دیکھے جاتے ہیں۔ دہلی میں بہت سے لوگ پتھر کی جگہ پھتر بولتے ہیں اور اکٹھا کو اکھٹا' مگر فصحائے دہلی سے کبھی یہ لفظ سننے میں نہیں آیا۔

چوتھے اور پانچویں شعر میں ردیف بیکار نہیں ہے۔ بول چال میں اسی طرح بولتے ہیں۔ وہ آئے تھے کیا؟ تم گئے تھے کیا؟ یہ کیا اکثر فقرے کے آخر میں آتا ہے اور محاورے کے رو سے بالکل ٹھیک ہے۔ یہ استفہام مطلق کے لیے ہے۔ استفسار محض صرف پوچھنا ہمدرد صاحب کے نزدیک ناظر کی ان دو ردیفوں نے آتش مرحوم کی روح کو صدمہ پہنچایا ہے مگر خود آتش اپنی روح کو چار صدمے پہنچا چکا ہے۔ ذیل کے چار شعروں میں جو آتش کی لاجواب غزل میں موجود ہیں' ردیف کے اگر یہ معنے نہیں تو ہمدرد صاحب ہی بتلائیں کہ اور کیا ہیں؟

کیا کیا الجھتا ہے تیری زلفوں کے تار سے
بخیہ طلب ہے سینۂ صد چاک شانہ کیا؟

زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا؟

ہوتا ہے زرد سن کے جو نامرد مدعی | رستم کی داستاں ہے ہمارا فسانہ کیا؟
بیتاب ہے کمال ہمارا دل حزیں | مہماں سرائے جسم کا ہوگا روانہ کیا؟

ان چار شعروں کے استفہامی فقرے سادہ شکل میں یہ ہیں۔ شانے کا سینہ بخیہ طلب ہے کیا؟ قارون نے خزانہ لٹا دیا کیا؟ ہمارا افسانہ رستم کی داستان ہے کیا؟ مہمان روانہ ہوگا کیا؟ آزاد نے "آب حیات" میں یہ غزل نقل کر کے حاشیئے میں مقطع کی ردیف کی "جگہ" یعنی محل وقوع پر اعتراض کیا ہے:

آتش غزل یہ تو نے لکھی عاشقانہ کیا!

اعتراض کا مطلب یہ ہے کہ کیا کا موقع عاشقانہ سے ماقبل ہے۔ مابعد آنے سے لطف بندش نہ رہا۔ اس سے ضمناً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ باقی اشعار میں ردیف کا محل وقوع از روئے قواعد نحو و از روئے محاورہ درست ہے۔ پس آتش کے ان چار اشعار منقولہ بالا میں بھی درست ہے۔ ان وجوہات سے اور اس معنے میں ناظر کے فقرے بھی اس طرح ہو سکتے ہیں۔ یہی تو قیر تھی کیا؟ وعظ میں تاثیر نہیں کیا؟ جو استفہام مطلق آتش کے مذکورہ بالا شعروں میں ہے، وہی ناظر کے ان شعروں میں ہے۔ نوعیت استفہام کا کوئی فرق موجود نہیں ہے۔ پھر آتش کے ہاں ردیف با کار اور ناظر کے ہاں بیکار کیوں ہے؟

ناظر کے مصرعوں کے اول میں یا موجود ہے۔ شائد اس پر انگلی رکھ کر کہا جائے کہ اس کی وجہ سے کیا بیکار ہے۔ یہ بھی غلط ہے۔ یا کے آنے سے فقرے کی نوعیت بدل گئی ہے؟ استفہامیہ سے غیر استفہامیہ ہوگیا ہے؟ نہیں۔ پھر کیوں کیا پر اعتراض ہے۔ کیا جملات استفہامیہ میں آتا ہے۔ یہ بھی جملہ استفہامیہ ہے۔ یہاں بھی آیا۔ پھر بیکار کیوں ہے؟

اب اقبال کی باری آئی۔ ان کے اغلاط کی فہرست لکھنے سے پہلے ہمدرد صاحب نے عین مناسب سمجھا کہ فال نیک کے طور پر کم از کم ایک غلطی زبان کی خود بھی کر دیں۔ چنانچہ لکھا ہے "ہر بند میں ایسی غلطیاں زبان ومحاورے کی الخ۔"

یہ زبان ومحاورے کی قابل غور ہے۔ زبان اور محاورے کی ہونا چاہیے ورنہ زبان ومحاورہ تو فارسی کی ترکیب عطفی ہے۔ واو کو یائے مجہول سے نہیں بدل سکتے، جب تک کہ خود ترکیب کو ہندی شکل نہ دے لیں۔ شاید رند کی آہ وزاریاں سند میں پیش کی جائیں:

آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں

مگر مجھے اس پر بھی اعتراض ہے۔

کہہ دیا خواب کو۔ اعتراض درست ہے۔

نظم چھپوائی ہے میں نے۔ اعتراض درست ہے۔

صفا۔ درست ہے اور اعتراض غلط۔ ذوق کا شعر ہے

دل ہے آئینہ صفا چاہیے رکھنا اس کا
زنگ سے بھرتا ہے کیوں اس میں تو کینہ بھر کے

مگر پوچھتے ہیں کہ ''شورلب کیونکر بن گیا؟'' صرف اس لیے کہ لب کا کام بولنا ہے اور شور بھی بولتا ہے۔ خواہ چیخ کر ہی بولتا ہے۔ آپ یہ بھی پوچھ سکتے ہیں کہ رخسار آفتاب کیونکر بن گیا اور زلف شب کیونکر بن گئی؟ یہ اعتراض ٹھیک نہیں۔ اگر کوئی وجہ شبہ موجود ہے تو شاعر تشبیہ دے سکتا ہے۔

بناؤں اور دیکھوں کا قافیہ واقعی غلط ہے مگر یہ اس کوشش کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے جو نئے شعرا کبھی کبھی قید قوانی کی سختی سے آزاد ہونے کی کرتے ہیں۔ فرض کیجئے آپ اسے ناموزوں قرار دیں اور غلطی شمار کریں تو یہ ایک دانستہ غلطی ہوگی جسے بے خبری یا لغزش نہیں کہہ سکتے۔

پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں۔ آپ پوچھتے ہیں یہ ہوا آنا کیا محاورہ ہے؟

کیا ضروری ہے کہ محاورہ ہی ہو۔ اخوت کی ہوا اضافت تشبیہی ہے۔ اخوت ایک ایسی ہوا ہے جو ان پھولوں تک آتی تو ان کے رنگ و بو پر اپنا اثر ڈالتی۔ چونکہ وہ ان پھولوں تک آ کر پھٹکی ہی نہیں اس لیے ان کے رنگ و بو پر اس کا اثر نہیں پڑا۔ یہ سیدھے سے معنے ہیں۔ اگر آپ کہیں کہ ہوا آنا ایک برا پہلو بھی رکھتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ ہزاروں لفظ آپ ہر روز بولتے اور لکھتے ہیں۔ ان کے بھی برے پہلو موجود ہیں۔ پھر اس کی تخصیص کیا ہے۔ کیا آپ ''یونس اندر دہان ماہی شد'' کو ''گلستان سعدی'' سے اس لیے نکال ڈالیں گے کہ بھانڈوں کے ہاں اس کا بہت برا استعمال ہوتا ہے؟ اور یہ کہہ نہیں سکتے کہ ہوا کے لیے آنا کبھی نہیں بولتے۔ ضرور بولتے ہیں۔

سوا فتاد بالکل جائز اور درست ہے۔ سو جان سے عاشق ہونا (نہ کہ سو جانوں سے) کئی طرح سے سمجھانا (نہ کہ کئی طرحوں سے سمجھانا) وغیرہ۔ غرض ہر روز بولنے میں اسی طرح آتا ہے۔ آتش کا شعر ہے ۔

کاکل یار نے زنجیر کی صورت پکڑی
قید ہونے کے لیے سینکڑوں آزاد آیا

آزاد واحد ہے۔ آیا فعل واحد لایا گیا ہے۔

چلمن کی جھلک کو غلط قرار دینا دائرہ بیان کو تنگ کرنا ہے۔ یہ اضافت ظرفی ہے۔ دریا کا پانی وہ پانی ہے جو دریا میں بہتا ہے۔ باغ کا پھول وہ پھول ہے جو باغ میں کھلتا ہے، چلمن کی جھلک وہ جھلک ہے جو چلمن میں سے نظر آتی ہے۔ داغ کا شعر ہے ۔

جلوہ بے پردہ تو ہوتا ہے فقط ہوش ربا
وہ قیامت ہے جو چلمن کی جھلک ہوتی ہے

مالا پرولی ہے۔ فرمایا ہے کہ ''مالے کے ساتھ پرولی! کیا خوب''۔ حضرت یا تو مجھے وہ قانون دکھا

دیکھیے، جس کی رو سے ہر سخن سنج کا فرض ہے کہ وہ طوعاً و کرہاً لکھنؤ کے قاعدہ تذکیر و تانیث کا پابند رہے اور پابند نہ رہے تو واجب التعذیر ٹھہرے۔ ورنہ میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ اہل دہلی مالا کو مونث بولتے ہیں۔ جناب جلال لکھنوی کا رسالہ ''تذکیر و تانیث'' ہی ملاحظہ فرمالیا ہوتا۔ وہ بھی لکھتے ہیں کہ فصحائے دہلی ہمیشہ مالا کو مونث بولتے ہیں۔ پھر آپ کا کیا اجارہ ہے؟

سیدھا کرے کوئی' واقعی سیدھا کرنا کوئی بہت خوشگوار فعل تو نہیں ہے' جس کی آرزو شد و مد کے ساتھ کی جائے مگر اقبال کبھی کبھی شوخی کی ترنگ میں سب کچھ روا رکھتے ہیں۔

بہر حال میں اس شعر کو اقبال کے ہلکے شوخ کلام کا حصہ سمجھتا ہوں اور اس معنے میں اس پر کوئی معقول اعتراض نہیں دیکھتا۔ جہاں یار کے دروازے پر دربان کو ٹھوکنے کو یار لوگ تیار ہو جاتے ہیں۔ وہاں اگر خود بھی معشوق یا عشق سے دو چار دھول دھپے کھائے تو کیا تعجب ہو گیا۔ ظفر کہتے ہیں ؎

منع دربان کو کر دے کہ نہ روکے ہم کو
ورنہ اک روز تیرے سر کی قسم ٹھوکیں گے

غالب فرماتے ہیں ؎

دھول دھپا اس سراپاناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

علاوہ ازیں غالباً اقبال کی مراد سیدھا کرنے سے یہ محاورے کے معنے نہیں ہیں بلکہ محض لفظی معنے یعنی خم اور کجی کو دور کرنا مراد ہیں۔ پس اس میں اگر اتفاق سے ایک پہلو ذم کا نکلے تو یہ وہ عیب کلام ہے' جس سے اچھے اچھے استاد بھی بچے ہوئے نہیں ہیں اور یہ استادوں کا قصور نہیں ہوتا بلکہ سامعین اور ناظرین کی ناشائستہ عادات فہم اور نامہذب اصطلاحات اس پہلوئے ذم کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ ''یونس اندر دہان ماہی شد'' کی مثال گذر چکی۔ جناب جلال کا شعر ملاحظہ ہو ؎

اب آنکھوں میں کب پھر کے آتی ہیں نظریں
کہیں دیکھ پایا ہے روزن کسی کا

روزن کا لفظ ملاحظہ طلب ہے۔

میں نے اپنی سمجھ کے موافق ہمدرد صاحب کے اعتراضوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور جو مطلب ان کے اعتراضوں کا سمجھ میں آیا' اس کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ اگر کسی اعتراض کا مطلب سمجھنے میں مجھ سے غلطی ہو گئی ہو تو مجھے ممنون اصلاح فرمایا جاوے۔

یہ میں اپنے پہلے مضمون میں صاف صاف مان چکا ہوں کہ پنجاب کے لکھنے والوں سے بعض اوقات تذکیر و تانیث کی غلطیاں اور محاورے کی لغزشیں ظہور میں آئی ہیں۔ میرا مقصد یہ نہ تھا کہ ان لغزشوں کی

حمایت کروں، ورنہ میں ان کو اغلاط ہی کیوں کہتا۔ میرا مطلب پہلے مضمون میں حاجی محمد خاں صاحب کے خلط مبحث کو صاف طور سے ظاہر کر دینا تھا۔ ہمدرد صاحب کو زیادہ اشتعال غالباً میر ممتاز علی صاحب کے مضمون سے ہوا گو مجھ کو اس مضمون میں کوئی بڑی وجہ اشتعال نظر نہیں آتی۔ بہر حال اگر میری اوپر کی تحریر درست ہے تو اس سے یہ ضرور ثابت ہوگا کہ ہمدرد صاحب بھی بعض اوقات غلط لکھتے ہیں اور غلط سمجھتے ہیں بلکہ امید ہے کہ سمجھ کی غلطی دانستہ یا نادانستہ کرنا محاورے کی غلطی کرنے سے اہل بصیرت کے نزدیک مذموم تر ہوگا۔

(اس مضمون کو باوجود اس کے کہ اس میں کسی شخص یا جماعت کی نسبت کوئی دلآزار بات نہیں کہی گئی اور دلآزار باتوں کے جواب میں محققانہ انداز سے لکھا گیا ہے، ہم کسی قدر مجبوری کی حالت میں چھاپتے ہیں۔ ہمارے دوست مضمون نگار کے خاص حقوق اوراق ''مخزن'' پر ہیں اور ان کی تحریر کے اندراج سے گریز کرنا ہمارے لیے مشکل ہے ورنہ اس قسم کی بحث سے کہ کہاں کی اردو اچھی اور کہاں کی اس سے کم درجہ کی ہے، ہمیں اس حد تک اصولی اختلاف ہے کہ یہ ناگوار بحث کسی اور اخبار یا رسالہ میں ہوئی ہو اور ہمارے ہاں صرف مناسب جواب بھی چھپے تو اسے بھی پسند نہیں کرتے۔ ہمارے خیال میں اردو علم ادب کے لیے ابھی سرگرم مزدوروں کی ضرورت ہے۔ جو پیشانی عرق میں تر کر کے اینٹیں، گارا اور چونا سب قسم کی چیزیں اس عالیشان عمارت کے لیے جو آخرش بنے گی، جمع کرتے جائیں۔ معمار جو موزوں اور نفیس ترتیب سے اس سامان کو چنیں، ابھی رفتہ رفتہ پیدا ہوں گے۔ یہ ان کا کام ہوگا کہ کس اینٹ کو عمارت میں لگائیں اور کسے پھینک دیں۔ کسے سامنے سجائیں اور کسے اندر بھرتی میں۔ اس وقت پہلے مزدوروں کا آپس میں لڑنا کہ کس کی ٹوکری میں ایک اینٹ کچی ہے اور کس کی پکی، بہت بے جا ہے اور تعمیر کی بنیاد میں ہی خرابی کا باعث ہے۔ کچھ دنوں سب اپنی اپنی جگہ ہمت سے، استقلال سے، نیک نیتی سے کام کیے جاؤ، پھر دیکھو کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ''مخزن'' ان مزدوروں میں سے جو کاخ اردو کی تعمیر کے کام میں مصروف ہیں، ایک ہے۔ اس نے چند دن ہوئے خوشی ظاہر کی تھی کہ مزدوروں کی جماعت کو ایک کمک علی گڑھ سے پہنچی ہے جہاں سے ''اردوئے معلّٰی'' جاری ہوا ہے۔ یہ رسالہ ایک قابل ناظم و ناشر کے ہاتھ میں ہے، جس سے ناظرین ''مخزن'' بھی ناآشنا نہیں۔ ہم اس اپنے لائق دوست کو بھی یہ دوستانہ مشورہ دیتے ہیں کہ دلی اور لکھنؤ اور پنجاب اور ہندوستان کی زبان دانی کے جھگڑوں کی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھانے کے بجائے وہ خاص علمی اور ادبی مضامین ہی سے سروکار رکھیں۔ یہ نہ صرف رسالہ کے لیے فروغ کا باعث ہوگا بلکہ اہل قلم کے درمیان رشتہ اتحاد مضبوط کرے گا اور یہ لوگ ایک دوسرے کے معاون ہو سکیں گے۔ ایڈیٹر ''مخزن'')

(در: مخزن (لاہور) ستمبر 1903ء، ص 17-29)

محمد اقبال

اردو زبان پنجاب میں

(عنوان مندرجہ بالا سے گو یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ اس مضمون میں پنجاب اور ہندوستان کی اردو کے متعلق ایسی بحث ہو جسے ہم ناگوار کہہ چکے ہیں اور جس سے ہم گریز کرنا پسند کرتے ہیں مگر حقیقت یہ نہیں۔ اس میں بعض محاورات زبان کے متعلق اساتذہ کے کلام سے استناد کر کے جتایا گیا ہے کہ ان کا کس کس طرح استعمال جائز ہے اور ان کے استعمال پر جو اعتراضات ہوئے تھے ان اعتراضات سے بریت کی کوشش کی گئی ہے۔ جس تحقیق سے شیخ محمد اقبال صاحب نے اس مضمون میں کام لیا ہے وہ قابل داد ہے اور اسے بحث کا خاتم سمجھنا چاہیے۔ ''مدیر مخزن'')

آج کل بعض اخباروں اور رسالوں میں اہل پنجاب کی اردو پر بڑی لے دے ہو رہی ہے اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس بحث کے فریق زیادہ تر ہمارے نئے تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ اُدھر ایک صاحب ''تنقید ہمدرد'' جو اخلاقی جرأت کی کمی یا کسی نامعلوم مصلحت کے خیال سے اپنے نام کو اس نام کی نقاب میں پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں، ناظر و اقبال کے اشعار پر اعتراض کرتے ہوئے پنجابیوں کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ اِدھر ہمارے معزز محترم دوست میر ممتاز علی ایڈیٹر تالیف و اشاعت اور انبالوی صاحب اپنے محققانہ مضامین سے اپنی وسعت خیال کا ثبوت دیتے ہیں۔ ہمارے دوست ''تنقید ہمدرد'' اس بات پر مُصر ہیں کہ پنجاب میں غلط اردو کے مروج ہونے سے یہی بہتر ہے کہ اس صوبے میں اس زبان کا رواج ہی نہ ہو' لیکن یہ نہیں بتاتے کہ غلط اور صحیح کی معیار کیا ہے، جو زبان بہمہ وجوہ کامل ہو اور ہر قسم کے ادائے مطالب پر قادر ہو' اس کے محاورات و الفاظ کی نسبت تو اس قسم کی معیار خود بخود قائم ہو جاتی ہے، لیکن جو زبان ابھی زبان بن رہی ہو اور جس کے محاورات اور الفاظ جدید ضروریات کو پورا ادا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً اختراع کیے جا رہے ہوں' اس کے محاورات وغیرہ کی صحت و عدم صحت کی معیار قائم کرنا میری رائے میں محالات سے ہے۔ ابھی کل کی بات ہے' اردو زبان جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں تک محدود تھی مگر چونکہ بعض خصوصیات کی وجہ سے اس میں بڑھنے کا مادہ تھا' اس واسطے اس بولی نے ہندوستان کے دیگر حصوں کو بھی تسخیر کرنا شروع کیا اور کیا تعجب ہے کہ کبھی تمام ملک ہندوستان اس کے زیر نگیں

ہو جائے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ جہاں جہاں اس کا رواج ہو وہاں کے لوگوں کا طریق معاشرت ان کے تمدنی حالات اوران کا طرز بیان اس پر اثر کیے بغیر رہے۔ علم السنہ کا یہ ایک مسلم اصول ہے، جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے اور یہ بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں نہیں ہے کہ اس اصول کے عمل کو روک سکے۔ تعجب ہے کہ میز' کمرہ' کچہری' نیلام وغیرہ اور فارسی اور انگریزی کے محاورات کے لفظی ترجمے کو بلا تکلف استعمال کرو، لیکن اگر کوئی شخص اپنی اردو تحریر میں کسی پنجابی محاورے کا لفظی ترجمہ یا کوئی پُر معنے پنجابی لفظ استعمال کر دے تو اس کو کفر وشرک کا مرتب سمجھو! اور باتوں میں اختلاف ہو تو ہو مگر یہ مذہب منصور ہے کہ اردو کی چھوٹی بہن یعنی پنجابی کا کوئی لفظ اردو میں گھسنے نہ پائے! یہ قید ایک ایسی قید ہے جو علم زبان کے اصولوں کے صریح مخالف ہے اور جس کا قائم و محفوظ رکھنا کسی فرد بشر کے امکان میں نہیں ہے۔ اگر یہ کہو کہ پنجابی کوئی علمی زبان نہیں ہے جس سے اردو الفاظ و محاورات اخذ کرے تو آپ کا عذر بے جا ہوگا۔ اردو ابھی کہاں کی علمی زبان بن چکی ہے جس سے انگریزی نے کئی ایک الفاظ بدمعاش بازار لوٹ چالان وغیرہ کے لیے ہیں اور ابھی روز بروز لے رہی ہے۔

یہ ایک دلچسپ اور نتیجہ خیز بحث ہے جس پر ایک مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے مگر اس مضمون کا مقصد صرف ان اعتراضات کا جواب دینا ہے جو ''تنقید ہمدرد'' صاحب نے میرے اور ناظر کے اشعار پر کیے ہیں۔ میں نے یہ جواب اس وجہ سے نہیں لکھا کہ صاحب تنقید نے میرے یا میرے دوست حضرت ناظر کے کلام کو اپنی نکتہ چینی کا آماجگاہ بنایا ہے بلکہ میری غرض صرف یہی ہے کہ ایک منصف مزاج پنجابی کی حیثیت سے ان غلطیوں کا ازالہ کروں، جو عدم تحقیق کی وجہ سے اہل پنجاب کی اردو کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ اگرچہ ''تنقید ہمدرد'' صاحب نے بالخصوص حضرت ناظر کی نسبت اور بعض بعض جگہ میری نسبت دل آزار الفاظ استعمال کیے ہیں مگر میں باوجود حق اور قدرت کے اس بات سے احتراز کروں گا کیونکہ فن تنقید کا پہلا اصول یہی ہے کہ اس کا ہر لفظ نفسانیت کے جوش سے مبرا ہو۔ تنقید کی بنا دوستی' محبت اور نیک نیتی پر ہونی چاہیے۔ نہ یہ کہ مضمون تو اپنے خیال میں از راہ دوستی لکھیں اور طرز بیان ایسا اختیار کریں کہ دوستی اور دشمنی میں تمیز نہ ہو سکے۔ میر رضی دانش کیا خوب فرماتے ہیں:۔

ے مخور چندانکہ نشناسد زگل گل چیں ترا
پاسبان حسن پاک خویشتن بودن خوش است

حضرت ناظر کے کلام پر جو اعتراض ''تنقید ہمدرد'' صاحب نے کیے ہیں' ان کا جواب انبالوی صاحب نے شافی طور پر دے دیا ہے اور حق یہ ہے کہ جواب دینے کا حق ادا کیا ہے۔ البتہ لفظ ''سودا'' کے غیر متغیر ہونے کی نسبت جو انہوں نے ارقام فرمایا ہے' وہ شافی نہیں ہے۔ اصول نحو کی رو سے عربی الفاظ جن کے آخر میں الف ہو' غیر متغیر ہیں مثلاً صحرا مینا وغیرہ' مگر ''سودا'' میں اختلاف ہے۔ فصحائے دہلی میں مومن مرحوم

اور فصحائے لکھنؤ میں سے آتش مرحوم کے کلام میں یہ لفظ متغیر اور ناسخ مغفور کے کلام میں غیر متغیر ہے۔ اگر حضرت ناظر نے اس لفظ کو غیر متغیر لکھ دیا تو کیا برا کیا اور میری رائے میں سودا بمعنی جنون کو غیر متغیر ہی لکھنا چاہیے تاکہ سودا بمعنی معاملہ بیوپار سے اس کی تمیز ہو سکے۔ میرے اشعار پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں اُن میں سے الفاظ ''چلمن کی جھلک'' پر بھی ایک اعتراض ہے۔ ''تنقید ہمدرد'' صاحب میرے مقصود فی الذہن کو سمجھتے بھی ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہ الفاظ سے یہ مطلب نہیں نکلتا۔ بھلا اگر الفاظ میرے مقصود کے اظہار سے قاصر ہیں تو آپ نے میرا مطلب کیونکر سمجھ لیا؟ بہرحال انبالوی صاحب نے مرزا داغ دام فیضہ کا ایک شعر سند میں دے دیا ہے، جس میں بعینہ یہی الفاظ انہیں معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں جو میرے ذہن میں تھے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ انبالوی صاحب نے ''مالا'' کی تانیث بھی ''مفید الشعراء'' مصنفہ حضرت جلال لکھنوی کے حوالے سے ثابت کر دی ہے۔ اب بھی اگر مزید ثبوت کی ضرورت ہو تو مولوی سید احمد صاحب سلمہ، کی ''فرہنگ آصفیہ'' ملاحظہ فرما لیجئے۔ باقی اعتراض کا جواب بالترتیب عرض کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ''تنقید ہمدرد'' صاحب انصاف کر کے اپنی غلطی کو تسلیم کریں گے۔

اعتراض اول:

آرزو یاس کو یہ کہتی ہے
اک مٹے شہر کا نشاں ہوں میں

''تنقید ہمدرد'' صاحب فرماتے ہیں کہ آرزو یاس سے یہ کہتی ہے'' ہونا چاہیے۔ کاش ان کو اساتذہ اردو کے کلام پر عبور ہوتا یا کم از کم اس قسم کا نازک اعتراض کرنے سے پہلے اپنا اطمینان کر لیتے۔ اکابر شعرائے قدیم وحال کا کلام اس دعویٰ کا موید ہے کہ ''کہنا'' کا صلہ ''سے'' بھی آتا ہے اور ''کو'' بھی۔ البتہ ایک باریک فرق ان کے استعمال میں ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں ''کہنے'' کا مقولہ ایک کلمہ مفرد یا مرکب ناقص (ترکیب اضافی یا توصیفی وغیرہ) ہو اور اس میں مفعول اول کی کوئی صفت پائی جائے تو ہمیشہ ''کو'' آئے گا۔ مثلاً زید نے عمر کو جاہل کہا یا ''بجز جام جہاں میں کہئے پیمانے کو کیا کہئے'' مگر جہاں مقولہ مرکب ناقص یا کلمہ مفرد بھی ہو لیکن وہ مفعول اول کی صفت پر دال نہ ہو اور نیز جہاں مقولہ ایک جملہ یعنی مرکب تام ہو تو ''کہنا'' کا صلہ ''سے'' اور ''کو'' دونوں آتے ہیں۔ مندرجہ بالا شعر میں ''کہنا'' کا مقولہ مرکب تام یعنی ''ایک مٹے شہر کا نشاں ہوں'' ہے۔ آپ کا ادعا ہے کہ یہاں ''کو'' کی جگہ ''سے'' ہونا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ ''سے'' اور ''کو'' دونوں ہو سکتے ہیں اور اساتذہ کا کلام میرا موید ہے۔ فخر المتقدمین والمتاخرین حضرت امیر علیہ الغفران ایک مشہور غزل میں فرماتے ہیں:-

صورت غنچہ کہاں تاب تکلم مجھ کو
منہ کے سو ٹکڑے ہوں آئے جو تبسم مجھ کو

مر کے راحت نوی پر ہے یہ کھٹکا باقی
آ کے عیسیٰ سرہالیں نہ کہیں قم مجھ کو

دوسرے شعر میں ''کہنا'' کا مقولہ ایک مرکب تام یعنی قم ہے اور حضرت مرحوم اس کا صلہ ''کو'' استعمال کرتے ہیں۔ مومن مرحوم فرماتے ہیں:-

یہ قدرت ضعف میں بھی ہو فغاں کو
کہ دے پٹکے زمین پر آسماں کو
دیا اس بد گماں کو طعنہ غیر
غضب ہے کیا کہوں اپنی زباں کو

شیخ غلام ہمدانی مصحفی جن کے انداز کے جناب حسرت وارفتہ ہیں فرماتے ہیں:-

کہیو آئے باد صبا بچھڑے ہوئے یاروں کو
راہ ملتی نہیں ہے دشت کے آواروں کو

اور لیجئے مرزا رفیع سودا دولت مند بخیل کے ہجو میں فرماتے ہیں:-

غرض اٹھ کر چلا وہ جب واں سے
کہہ گیا کان میں یہ مہماں سے
چاہو جو کچھ کہ اب تناول کو
کہہ دو بلوا کے تم بکاول کو

مرزا نے پہلے شعر میں کہنا کا صلہ ''سے'' استعمال کیا ہے اور دوسرے میں ''کو''۔ فرمایئے آپ کے دلیرانہ دعوے کی تردید ہوئی یا نہیں؟

اعتراض دوم:

حال اپنا اگر تجھے نہ کہیں
اور رکھیں اسے کہاں کے لیے

مذکورہ بالا بحث میں مَیں نے ثابت کر دیا ہے کہ ''کہنا'' کا صلہ ''سے'' بھی آتا ہے اور ''کو'' بھی۔ مگر اس شعر پر جو اعتراض کیا گیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ ''کہنا'' ''تجھے'' کے ساتھ بغیر صلے کے کبھی مستعمل نہیں ہوتا لہٰذا مجھ کو یہ ثابت کرنا ہے کہ جہاں ''کہنا'' کا مقولہ کلمہ مفرد یا مرکب ناقص ہو خواہ اس سے مفعول ثانی کی صفت مترشح ہوتی ہو خواہ نہ ہوتی ہو اور نیز جہاں ''کہنا'' کا مقولہ مرکب تام ہو ''کہنا'' تجھے کے ساتھ بغیر صلے کے بھی مستعمل ہوتا ہے بلکہ ''مجھے'' اور ''تمہیں'' بھی اس قاعدے سے آزاد نہیں ہیں۔ (استاد)

کیا مدح ہے یہ جو تجھے ہم شاہ کہیں ہیں
سچے ہیں وہی لوگ جو اللہ کہیں ہیں
(میر تقی علیہ الرحمۃ)

ایک مولا کہے ہیں ایک خدا کہتے ہیں
یا علی جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں
(میر تقی علیہ الرحمۃ)

نالے کیا نہ کر سنا! نوحے پہ میرے عندلیب!
بات میں بات عیب ہے میں نے تجھے کہا نہیں؟
(میر تقی علیہ الرحمۃ)

ہم نشیں تجھ سے میں وہ خاک کہوں خلوت میں
آج جو اس نے کہا ہے سر بازار مجھے
(مرزا داغ دام فیضہ)

ع وہ تیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر
(مومن مرحوم)

ناصح یہ مجھے راست کہے تھا کہ بجز داغ
کیا لیوے گا دل دے کے تو ان لالہ رخاں کو
(مرزا رفیع سودا مرحوم)

ع کیا کہئے تمہیں حضرت دل بے ادبی ہے
(ظفر مرحوم)

حضرت امیر مرحوم روحی فداہ کا بھی ایک شعر یاد آ گیا:-

قاصد! یہ زباں اس کی بیاں اس کا نہیں ہے
دھوکا ہے! تجھے اس نے کہا اور ہی کچھ ہے

مگر اس شعر کی وہ توضیحیں ہوسکتی ہیں۔ ایک اعتبار سے یہ میرے دعویٰ کا موید ہوسکتا ہے، دوسرے اعتبار سے نہیں ہوسکتا۔ ''تنقید ہمدرد'' صاحب انصاف کریں۔ بے قصور اقبال اردو کو الٹی چھری سے ذبح کرنے کا مجرم نہیں ہے۔ ہاں! اس نے اساتذہ اردو کی پیروی کی ہے اگر یہ تقلید جرم ہے تو انا اول المجرمین!

اعتراض سوم:

جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں

''ہوا آنا'' محاورہ اردو نہ ہوگا۔ میرا مقصود بھی تو محاورہ نہیں ہے۔ خان آرزو مرحوم نے بھی اسی قسم کا ایک اعتراض شیخ علی حزیں علیہ الرحمتہ کے ایک شعر پر کیا تھا۔ مگر مولانا صہبائی مرحوم اس اعتراض کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ''ایراد الفاظ گاہے بطریق محاورہ و روزمرہ بود کہ مردم را باہم دراوائے مدعا بے تکلف اتفاق افتد و گاہے برائے تناسب و رعایت محسنات بدیعی الخ'' میرے شعر میں پھولوں کو جو مناسبت ہوا اور باغ سے ہے وہ ظاہر ہے اور اسی مناسبت کی وجہ سے یہ لفظ استعمال کیا گیا۔ ہاں! اگر آپ کے اعتراض کا مفہوم یہ ہو کہ ''آنا'' ہوا کے ساتھ اردو میں مسموع نہیں ہے تو ظفر دہلوی کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے:۔

خدا جانے سحر کس کی گلی سے یہ ہوا آئی
حباب آسا جو میرا ہو گیا ہے پیرہن ٹھنڈا

اعتراض چہارم:

آشیاں ایسے گلستان میں بناؤں کس طرح
اپنے ہم جنسوں کی بربادی کو دیکھوں کس طرح

''تنقید ہمدرد'' صاحب فرماتے ہیں کہ ''بناؤں'' اور ''دیکھوں'' کا قافیہ غلط ہے۔ نکتہ چینی کرنے میں تو آپ نے کوئی تامل نہ کیا مگر یہ نہ بتایا کہ غلطی کیا ہے۔ ذرا یہ بھی تو معلوم ہوتا کہ آپ کو اصول فن قافیہ سے کہاں تک واقفیت ہے۔ خیر! مجھے اس بحث سے کام نہیں۔ میں آپ کی خدمت میں مختصر طور پر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس قافیہ میں ایطائے خفی ہے۔ جس کو شائگان کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ قواعد قافیہ کے رو سے یہ قافیہ غلط ہے مگر جیسا کہ میں ابھی ثابت کروں گا۔ متقدمین اور متاخرین میں سے کسی استاد نے فن قافیہ کے اصولوں کی پابندی نہیں کی اور شائگان اساتذہ فارس و ہند کے کلام میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ مثلاً عبدالوہاب نشاط شیرازی جو اساتذہ حال میں سے ہیں ایک قصیدے میں فرماتے ہیں:۔

یا کہ گوئی از بلائے زاہداں جاں بردہ ام
نیم جانے بر در پیر مغاں آوردہ ام
بندگاں را قابل خدمت نبودم خویش را
باہزار امید در سلک سگاں آوردہ ام

ان اشعار میں ''مغان'' اور ''سگان'' کا قافیہ ہے۔ ہر دو الفاظ میں ''ان'' جمع کی علامت ہے لہٰذا یہ

دونوں حروف وصل وخروج میں اصل قافیہ مغ اور سگ کا ہے۔ اگر جمع کی علامت ساتھ نہ ہوتی تو اکفا ہو جاتا جو عیوب قافیہ میں سے ہے۔

علیٰ ہذا القیاس مومن مرحوم کے اس شعر میں:

پھر دل میں مرے لگی ہے آتش
نالے سے برس رہی ہے آتش

اور شیخ ناسخ مغفور کے اس شعر میں:

جب وادی وحشت میں گذر میرا ہوا ہے
ہر ایک بگولا پئے تعظیم اٹھتا ہے

بھی قافیہ شائگان ہے۔ حضرت امیر مینائی مرحوم کا مطلع ہے ''سنگدل تجھ کو مرے ساتھ یہ کاوش کب تک + میری سوزش کے لیے غیر سے سازش کب تک۔'' ''ش'' یہاں وصل ہے۔ اصل قافیہ کاو اور ساز کا ہے۔ جو اختلاف روی کی وجہ سے غلط ہے مگر وصل نے اس عیب کو پوشیدہ کر لیا ہے۔ چونکہ حضرت مرحوم نے ردیف کی رعایت رکھی ہے جو ضروری تھی' اس واسطے بادی النظر میں قافیہ غلط نہیں معلوم ہوتا۔ ساز کا صحیح قافیہ نواز تھا' جیسے میر انیس علیہ الرحمتہ کے اس شعر میں ہے

راہ میں کچھ جو سلوک اور نوازش کی ہے
تو نے فرزند ید اللہ سے سازش کی ہے

سید فضل الحسن حسرت موہانی ایڈیٹر ''اردوئے معلّٰے'' ایک غزل میں فرماتے ہیں:۔

دن کو ہم ان سے بگڑتے ہیں وہ شب کو ہم سے
رسم پابندی اوقات چلی جاتی ہے
ہم سے ظاہر میں وہ ہر چند خفا ہیں لیکن
کوشش پرسش حالات چلی جاتی ہے

ان اشعار میں ''اوقات'' اور ''حالات'' کا قافیہ بھی شائگان ہے۔ ''ات'' دونوں جگہ علامت جمع ہے لہٰذا یہ دونوں حروف زوائد ہیں' اصل قافیہ اوق اور حال کا ہے جس میں اختلاف روی ہے۔ یوں کہو کہ مصنف نے روی کا لحاظ ہی نہیں کیا۔ ''بناؤں'' اور ''دیکھوں'' کا قافیہ بھی اسی قبیل سے ہے۔ یہاں ''وں'' بوجہ علامت صیغہ واحد متکلم ہونے کے زوائد ہیں اصل قافیہ بنا اور دیکھ کا ہے جس میں اختلاف روی ہے یا یوں کہو کہ روی کا لحاظ ہی نہیں رکھا گیا۔

اب ''تنقید ہمدرد'' صاحب خود ہی انصاف کریں کہ جب اساتذہ فارس ہندو دیگر شعرا شائگان کو بلا تکلف استعمال کرتے ہیں تو میں اس کے استعمال سے عرضہ تیر ملامت کیوں ہوا؟ بلکہ میرا تو یہ دعویٰ ہے کہ

اساتذہ قدیم وحال نے فن قافیہ کے تمام بڑے بڑے اصولوں کی پروا نہیں کی۔ مثال کے طور پر چند اشعار عرض کرتا ہوں:۔

(1) مولانا شمس الدین فقیر صاحب "حدائق البلاغت" فرماتے ہیں کہ حروف تاسیس و دخیل کے سوا اور کل حروف قافیہ قبل روی ہوں یا بعد روی سب کی رعایت و تکرار واجب ہے اور اختلاف ناجائز مگر فردوسی اس اصول کی پروا نہیں کرتے اور فرماتے ہیں:۔

چہ گفت آں خداوند تنزیل وحی
خداوند امر و خداوند نہی

اس شعر میں حائے حطی اور ہائے ہوز دونوں قید ہیں۔ ان کی رعایت مندرجہ بالا اصول کے رو سے ضروری تھی۔ البتہ بعض عروضیوں نے لکھا ہے کہ جہاں حروف قید قریب المخرج ہوں وہاں اس اصول کی پابندی کی ضرورت نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس شیخ سعدی کے اس شعر میں "چناں نادر افتادہ در روضہ + کہ در لاجوردی طبق بیضہ و (روف)" کی رعایت ضروری تھی مگر بلبل شیراز نے اپنی نغمہ سرائی کے جوش میں کچھ پروا نہیں کی۔

(2) مولانا عطاء اللہ شاگرد مولانا جامی علیہ الرحمتہ اور صاحب "حدائق العجم" (شمس قیس خوارزمی) فرماتے ہیں کہ اختلاف توجیہ ہرگز جائز نہیں البتہ روی متحرک ہو تو جائز ہے مگر فصحا کا دستور العمل بسا اوقات اس اصول کا مخالف ہوتا ہے۔ مثلاً:۔

تواں صوف سخن را ساخت معلم
کہ چشم خامہ اش نبود بریشم
(فوقی یزدی)

درخشاں کرد چوں تیغ از پلالک
بماہی گاؤ گفتا کیف حالک
(نظامی علیہ الرحمتہ)

بے در فروغیکہ چوں برومد
زیسمائے مے خوارہ نیرومد
(مرزا غالب علیہ الرحمتہ)

خوشا احوال یاران گذشتہ
کہ جن کی زیست تھی رشک فرشتہ
(مرزا رفیع سودا)

ان چہار اشعار میں، قبل روی کی حرکات میں اختلاف ہے حالانکہ روی ساکن ہے۔

(3) عروضی متفق ہیں کہ حرف مکتوبی کا قافیہ اس غیر مکتوبی کے ساتھ جو تلفظ میں ہو درست نہیں ہے مگر اساتذہ حال اس اصول کے پابند نہیں ہیں۔ چنانچہ حضرت امیر اللہ تسلیم دام فیضہ فرماتے ہیں:۔

قید اپنا وہ آپ پر فن تھا
حلقہ زلف طوق گردن تھا
عذر مانع نہ تھا کوئی تسلیم
ترک شعر و سخن یہ قصداً تھا

اور برق مرحوم فرماتے ہیں:۔

یار من من کے بگڑ جاتا ہے
کام بن بن کے بگڑ جاتا ہے
یہ ترا ڈر ہے کہ بوسوں کا کھیل
ادبا بن کے بگڑ جاتا ہے

غرضیکہ اس قسم کی صدہا مثالیں اساتذہ کے کلام میں ملتی ہیں۔ جن کو متقدمین اور متاخرین کی دواوین وقصائد پر عبور ہے وہ ان باتوں کو بخوبی جانتے ہیں۔ بعض شعرا نے صلاح اور راہ غیاث اور اداس کا قافیہ باندھا ہے اور خواجہ حافظ شیرازی علیہ الرحمتہ نے تو روی کو ایک مصرع میں متحرک اور ایک میں ساکن بھی لکھ دیا ہے۔ قافیہ تو ایک طرف بعض اساتذہ لکھنؤ نے ردیف میں بھی بڑی آزادی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ شیخ ناسخ مغفور فرماتے ہیں:۔

کر دیے خط نے ترے عارض پُرنور سیاہ
ہو گیا مشک کی مانند یہ کافور سیاہ
پاس جو بیٹھ کے پڑھتے تھے غزل وہ گئے دن
اب تو ناسخ کبھی کر آتے ہیں ہم دور سے آہ

حقیقت یہ ہے کہ زبان کے اصول اساتذہ کے کلام سے مستخرج ہوتے ہیں، جو کچھ اکابر شعرا کے کلام میں آ گیا ہے وہی سب کا دستور العمل ہونا چاہیے۔ شیخ مصحفی علیہ الرحمتہ کیا خوب فرماتے ہیں:

حاصل ہے زمانے میں جنہیں نظم طبیعی
نظم ان کی کے اشعار بہ از آب رواں ہیں
پرواہ انہیں کب ہے ردیف اور روی کی
کب قافیہ کی قید میں آتش نفساں ہیں
مجھ کو تو ردیف آتی ہے نہ قافیہ چنداں

اک شعر سے گرویدہ مرے پیر و جواں ہیں

اعتراض پنجم:

ہاتھ اے مفلسی صفا ہے تیرا
ہائے کیا تیر بے خطا ہی ترا

آپ کو صفا بمعنی صاف کے جواز میں تامل ہے مگر آپ کو یہ معلوم نہیں کہ اہل زبان کے تصرفات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بسا اوقات مصدر کو بمعنی اسم فاعل استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح اساتذہ پارس نے مصدر زوال کو بمعنی زائل کنندہ استعمال کیا ہے۔ حکیم افضل الدین خاقانی خلیفہ بغداد کی تعریف میں فرماتے ہیں:۔

ع ابر انعامش زوال قحط قحطان آمدہ

علیٰ ہذا القیاس۔ کبھی حال کو اسم فاعل کے معنوں میں (مستانہ بمعنی مست) بولتے ہیں مثلاً ''اُدھر دیوانہ جاتا ہے اِدھر مستانہ آتا ہے۔'' (داغ) اگر صفا بمعنی صاف کے استعمال میں کلام ہو تو حضرت داغ دام فیضہ کا یہ مطلع ملاحظہ فرمایئے:۔

آئینہ منہ پہ بھلا اور برا کہتا ہے
سچ ہے یہ صاف جو ہوتا ہے صفا کہتا ہے

دہلی مرحوم کی زبان پر اعتبار نہ ہو تو میر انیس علیہ الرحمۃ کا یہ مصرع ملاحظہ ہو:۔

ع بت توڑ کے کعبے کو صفا کر دیا کس نے؟

البتہ ظفر کا یہ شعر قابل اعتبار نہیں ہے کیونکہ یہاں صفا بمعنی صاف بترکیب فارسی بندھا ہے اور فارسی میں صفا بمعنی صاف مستعمل نہیں ہے:۔

وہ آئینہ ہے کہ جس کو ہے حاجت سیماب
اک اضطراب ہے کافی دل صفا کے لیے

اعتراض ششم:

شور آواز چاک پیراہن
لب اظہار مدعا ہے ترا

اس شعر میں ایک نازک بات تھی مگر افسوس آپ نے تدبر نہ کیا اور یہ اعتراض کر ہی دیا کہ شور لب کیونکر بن گیا۔ مینا خانہ خیال کے تماشائی ہو کر ایسی جنبش مژگاں سے رنگ تماشا کو ''توڑنا'' مناسب نہ تھا۔ اقبال ہیچمدان عرض کرتا ہے کہ لب اظہار میں اضافت بیانی ہے۔ آپ کا اعتراض صحیح ہوتا اگر لب اظہار سے حقیقی لب مراد لی

جاتی۔ہاں! اضافت بیانی کی سند چاہو تو حاضر ہے:۔

شیخ علی حزیں علیہ الرحمۃ:

صف مژگان تو گر عکس بدریا فگند
خار قلاب بود در بدن ماہیٔ ما

مرزا غالب علیہ الرحمۃ:

کمال گرمیٔ سعی تلاش دید نہ پوچھ
بسان خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ

پس جب "ماہیٔ ما" اور "میرے آئینہ" سے "میں" مراد ہو سکتی ہے تو لب اظہار سے اظہار کیوں مراد نہ ہو اور اظہار اور شور میں جو مناسبت ہے وہ ظاہر ہے، لیکن مجھے امید نہیں کہ آپ اس توضیح کو قبول کریں۔ ایک اور تشریح پیش کرتا ہوں شائد سمع قبول سے شرف اندوز ہو۔ شور کو لب کے ساتھ اظہار میں مشارکت ہے۔ پس یہ استعارہ بے تکلف ہے۔ اور استعارہ بے تکلف تمام فصحا کے نزدیک جائز ہے۔ علم معانی کا کوئی چھوٹا سا رسالہ لے کر پڑھئے۔ اس میں بھی اس قسم کے استعارے کو جائز لکھا دیکھئے گا۔ قطع نظر اس بات کے آپ خوب جانتے ہیں کہ استعارے کا میدان وسیع ہے۔ شاعر اہل زبان کے محاورات کا پابند ہوتا ہے اور یہ پابندی ضروری ہے، لیکن اہل زبان کے تخیلات کی پابندی ضروری نہیں۔ یہ ضرور نہیں کہ اگر حقدمین نے گلشن طور لکھا ہے تو ہم بھی گلشن طور ہی لکھا کریں۔ جس شخص نے ملا ظہوری پر یہ اعتراض کر دیا تھا کہ "آتش بیگانہ" مسموع نہیں ہے' میری رائے میں وہ غلطی پر تھا کیونکہ ظہوری کا تخیل ایرانیوں کے تخیل کا مقلد نہیں ہو سکتا۔ اسی خیال سے مرزا بیدل علیہ الرحمۃ نے فارسیوں کی پروانہ کر کے "خرام کاشتن" ہر گاہ دو قدم خرام سے کاشت) لکھ دیا اور نافہموں نے ان کی آزادی تخیل کو سہام اعتراض کا نشانہ بنایا۔ حقدمین میں سے ناصر علی سرہندی علیہ الرحمۃ اور مرزا جلال اسیر بھی ان قیود سے آزاد ہیں۔ خواجہ آتش مرحوم "گرگ بغل" تحریر فرماتے ہیں اور حضرت امیر مرحوم کے اشعار سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

ع "میں بار خاطر قفس و آشیاں نہیں

غالباً گرگ بغل اور خاطر قفس کا استعارہ آپ کسی ایرانی یا اردو شاعر کے کلام میں نہ پائیں گے۔ پس میری رائے میں استعارے پر اعتراض کرنے کا حق کسی محقق کو حاصل نہیں۔ الا اس صورت میں جبکہ استعارہ اصلیت سے معرا ہو۔ باوجود اس تشریح کے مجھے پھر بھی خیال ہے کہ آپ مذکورہ بالا رائے کو تسلیم کرنے میں ضرور تامل کریں گے۔ اس واسطے میں اپنے استعارے کی تائید میں شیخ علی حزیں علیہ الرحمۃ کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔ جس طرح میں نے لب سے مراد آواز لب یا گفتار لی ہے' اسی طرح شیخ علیہ الرحمۃ اپنے شعر میں ناقوس سے مراد آواز ناقوس لیتے ہیں:۔

سر کافرشدن واریم کو بت خانہ عشقے
کہ ناقوش بجائے نغمہ یاحی شود مارا

اس سند پر بھی آپ اپنے اعتراض کی غلطی کو تسلیم نہ کریں تو آپ کی مرضی۔ میری رائے میں تو اس قسم کے استعارے کی تائید میں اس شعر سے بڑھ کر اور کوئی سند نہیں ہو سکتی۔ ماشاءاللہ آپ ایک تعلیم یافتہ اور محقق آدمی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سررشتہ انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔

اعتراض ہفتم:

اس جہاں میں اک معیشت اور سو افتاد ہے الخ

آپ کے رائے میں یہاں ''سو افتاد'' کی جگہ ''سو افتادیں'' ہونا چاہیے مگر آپ اعتراض کرنے سے پہلے یہ تو سوچئے کہ الفاظ دس، سو، ہزار، لاکھ، سینکڑوں اردو زبان میں واحد تصور کیے گئے ہیں۔ اس واسطے ان کا معدود واحد ہو سکتا ہے اور فصحا نے واحد استعمال کیا ہے۔ آپ لکھنوی ہیں یا لکھنؤ کی زبان کے مقلد ہیں' اس واسطے میں سند میں اساتذہ لکھنؤ کے اشعار پیش کرتا ہوں:۔

خواجہ حیدر علی آتش مرحوم:

مشق ناوک افگنی کرتا تھا جب وہ ماہرو
سینکڑوں ہی تودۂ خاکستر پروانہ تھا

شیخ ناسخ مغفور:

تھی نہ امید رہائی کی دل ناسخ کو
لاکھ زنجیر ترے گیسوئے خمدار کی تھی

حضرت تسلیم دام فیضہ:

خال و مژگاں کے عشق سے دل میں
سینکڑوں داغ لاکھوں روزن تھا

حضرت جلال مدظلہ:

نظر آتی نہیں مجھ کو وہ دس منزل میں رہتے ہیں
مری آنکھوں کی پتلی میں نگہ میں تل میں رہتے ہیں

اعتراض ہشتم:

ع مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

معلوم نہیں آپ کا اعتراض اس مصرع کی زبان پر ہے یا مفہوم پر۔ ''سیدھا کرنا'' کے معنی یہاں وہی مراد لیے گئے ہیں جو میر ممنون دہلوی کے اس شعر میں ہیں:۔

تیرے قامت نے کیا خوب ہی سیدھا اس کو
سرو گلشن کو بہت دعویٰ رعنائی تھا

اگر آپ یہ کہیں کہ اس محاورے کا اطلاق اپنی ذات پر نہیں ہو سکتا تو صحیح نہیں کیونکہ ظفر مرحوم کا مطلع ہے:

عشق میں کیا ہم ہی اے تقدیر سیدھے ہو گئے
کتنے اس قالب میں ٹیڑھے تیر سیدھے ہو گئے

اصل میں سیدھا کرنا فارسی محاورہ راست کردن کا ترجمہ ہے اور یہ محاورہ صوفیائے کرام کے اشعار میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

یہی وہ راستی ہے جو عشق کی حرارت سے پیدا ہوتی ہے اور جس کا اثر سکندر کے آئینے کو جمشید کا جام جہاں نما بنا سکتا ہے۔ حرمان نصیب اقبال کو اسی راستی کی آرزو ہے۔ مگر افسوس آپ نے اس تمنائے محمود کو مذموم تصور فرمایا!! کاش آپ اس رمز سے آگاہ ہوتے! ہاں میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس مصرع میں پہلوئے ذم ضرور ہے اور پہلوئے ذم کس استاد کے کلام میں نہیں؟ حضرت جلال لکھنوی فرماتے ہیں:

ع سلامت رہو کیا لگائی ہے ٹھوکر

اور میر تقی میر الرحمۃ فرماتے ہیں:

ع ہے راہ تنگ ایسے جیسے سوئی کا ناکا

اور طول لکھنوی کا مصرع تو سب کو معلوم ہے۔ دیگر اساتذہ کے کلام میں بھی کئی مثالیں پہلوے ذم کی موجود ہیں۔ مگر میں انہیں نظر انداز کرتا ہوں۔ اب آپ خود انصاف کریں کہ بڑے بڑے فصحا اس سے نہیں بچ سکے تو اقبال کی کیا حقیقت ہے! اصل بات یہ ہے کہ کسی شعر یا عبارت کا ایسا مفہوم سمجھنا پڑھنے والے کی اپنی طبیعت پر منحصر اور اس کے اندرونی خیالات کے میلان کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ مرزا بیدل علیہ الرحمۃ والغفران فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں:

میوہ و نقل و ترنج ہر یکے بار است و بس
لیک مے باید بہر موقع جدا فہمد کسے
نادرو ہر جا مقام ساز گر یست صرف
طبع گر روشن بود ظلمت چرا فہمد کسے

میں نے اپنے فہم قاصر کے مطابق آپ کے تمام اعتراضات کا جواب دے دیا ہے۔ البتہ ''میں نے'' پر جو اعتراض آپ نے کیا ہے وہ صحیح ہے' چونکہ یہ محاورہ مخصوصات پنجاب میں سے ہے' اس واسطے میں

اس کی تائید میں کوئی شعر فصحائے دہلی و لکھنؤ کے کلام میں سے پیش نہیں کر سکتا، لیکن اتنا عرض کیے دیتا ہوں کہ جس نظم کے شعر پر آپ نے یہ اعتراض کیا ہے' اس میں بعض اور بھی پنجابی الفاظ و محاورات استعمال کیے گئے تھے۔ معلوم نہیں آپ کی حرف گیری اسی محاورے تک کیوں محدود رہی۔ بہر حال میں اس لغزش کو تسلیم کرتا ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پنجاب میں یہ محاورہ زبان زد عام ہے اور شب و روز سنتے سنتے بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بے احتیاطی میں زبان یا قلم سے نکل جاتا ہے' مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ پنجاب میں پڑھے لکھے آدمی اردو کے مستند محاورے سے جس میں "میں نے" کی بجائے "مجھ کو" استعمال ہوتا ہے نا آشنا ہیں۔ میرے اشعار بہت سے موجود ہیں، جن میں اس محاورہ کا صحیح استعمال ہے۔

میں آپ کا مشکور ہوں کہ آپ کے مضمون سے میری طبیعت تحقیق کی طرف مائل ہوئی اور کیا تعجب ہے کہ میرا جواب آپ کی طبیعت پر بھی یہی اثر کرے۔ آپ مطمئن رہیں مجھے اساتذہ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہے۔ اگر اہل پنجاب مجھ کو یا حضرت ناظر کو بہمہ وجوہ کامل خیال کرتے ہیں تو ان کی غلطی ہے۔ زبان کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی دشوار گذار وادی ہے کہ بالخصوص ان لوگوں کو جو اہل زبان نہیں ہیں' یہاں قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہے۔ قسم بخدائے لایزال میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ بسا اوقات میرے قلب کی کیفیت اس قسم کی ہوتی ہے کہ میں باوجود اپنی بے علمی اور کم مائیگی کے شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ ورنہ مجھے نہ زباندانی کا دعویٰ ہے نہ شاعری کا۔ راقم مشہدی میرے دل کی بات کہتے ہیں:-

نیم من در شمار بلبلاں اما بایں شادم
کہ من ہم در گلستان قفس مشت پرے دارم

(در: مخزن (لاہور) اکتوبر 1903ء، ص 25-40)

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی

پنجاب میں اردو

(ذیل کا مضمون انجمن ارباب علم کے ایک جلسے میں جو خان بہادر شیخ عبدالقادر
بی اے بیرسٹرایٹ لا صدر دائمی انجمن کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا، پڑھا گیا تھا اور اس سے
پیشتر کہیں شائع نہیں ہوا.........ایڈیٹر)

اگر چہ یہ کہنا درست ہے کہ زبان اظہار خیال کا آلہ ہے، لیکن زبان کی یہ تعریف جامع و مانع نہیں کہی جا سکتی۔ مزاولت سے زبان ذہن کی ترتیب وفکرت کی تدوین کا آلہ بھی ثابت ہوتی ہے۔ اگر آپ کو ایسی زبان سکھائی جائے، جو حشو وتنافر، خلط مبحث وغرابت، ایہام واجتماع نقیضین، طول فضول اور اشکال پسندی، مبالغۂ ضعف تالیف سے پاک ہو اور آپ ایسی زبان بولنے اور لکھنے کے عادی ہو جائیں اور آپ کو ایسی زبان میں غور وفکر کرنے کی مہارت ہو جائے تو یقیناً آپ کی فکر مستقیم ہوگی اور آپ کو صحیح نتائج اخذ کرنے میں مدد ملے گی۔
آپ جانتے ہیں کہ فکر کی قوت کا وہ درجہ ہے کہ جس تک ترقی کرنے سے التزاماً انسان کا ذہن اتنا صحیح الفکرت اور قوی الحرکت، وسیع المشاہدات اور سریع المناظرات ہو جاتا ہے کہ پھر اسے فوراً ضابطوں کے سمجھنے اور نفس نظام کے پہچاننے یعنی اصول قائم کرنے میں دقت پیش نہیں آتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص فکرت پر تو قدرت رکھتا ہے مگر زبان پر نہیں۔ کیا ایسے موقعے اکثر پیش نہیں آتے کہ ایک شخص آپ سے باتیں کرتے کرتے ایک سوال کے جواب میں بہت کچھ کہہ کر بھی اپنے کہے پر اعتماد نہیں رکھ سکتا اور بالآخر اسے اپنے کلام کی خود شرح کرنی پڑتی ہے۔ کہتا ہے "میرا مطلب یہ ہے....." اگر اس کی ساری تقریر یہ ساتھ ساتھ لکھی جارہی ہو تو واضح ہوگا کہ "میرا مطلب" کے بعد جو کچھ قایل نے کہا، بس وہی جواب میں کافی تھا۔ اس سے پہلے کا قول بالکل فضول اور لایعنی تھا۔ میں کہتا ہوں کہ زبان فکرت اور قوائے ذہنی پر بہت کچھ حاوی ہے اور دماغی ترتیب پر اس کا رسوخ اور اثر اس سے کہیں زیادہ ہے جو آپ سرسری طور پر خیال کر سکتے ہیں۔
ایک شخص زبان پر اتنی کم قدرت رکھتا ہے کہ فرض کیجئے لفظ "مردود" کے معنی جان کر بھی اس کے استعمال میں غلطی کرتا ہے۔ اس کا صرف موقع اور محل کے خلاف کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اس تخطیہ کا خوگر ہو جاتا ہے اور یہ فقرہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے: "جب ابا مردود شاہی میں چکلہ دار تھے۔"

حضرات سامعین! آپ نے اس قسم کے الفاظ اور فقرے اکثر اشخاص کی زبان سے سنے ہوں گے اور تبسم کیا ہوگا یا اظہار نفرت۔ بات یہ ہے کہ زبان فکرت پر حاوی ہو کر قوت ارادی کو گویا سلب کر دیتی ہے۔ جس طرح ہکلے کے آلات نطق کا مادی نقص قوت ارادی پر غالب آ جاتا ہے اور وہ بخلاف ارادہ حروف اور الفاظ کی تکرار کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک لفظ کا بے محل استعمال بوجہ مزاولت ایک ذہنی نقص بن کر قوت ارادی کا مزاحم ہو جاتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ارکان تمدن اور تہذیب و معاشرت بھی زبان کے اثر سے آزاد نہیں یا منطقی صحت کے ساتھ یہ کہیے کہ ایک جماعت کے خواص جمعی اور ایک فرد کے شعار کا موازنہ اس کی زبان کی وضع قطع سے کیا جا سکتا ہے بلکہ علم لسان کے مبصر زبان ہی کو اس کا مزاج دریافت کرنے کے لیے بمنزلہ نبض کے قرار دیتے ہیں۔ انہیں وجوہ سے اور انہیں امور کو مدنظر رکھ کر ادیبوں نے ضابطے باندھے اور قواعد مرتب کیے، جن کی تفصیل علم معانی، علم بیان اور علم بدیع میں پائی جاتی ہے اور انہیں میں سے چند کا ذکر یہاں بالاجمال کیا جائے گا۔ پیشتر اس کے کہ میں چند نکات پیش کروں۔ اس کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ حاشا وکلا میرا یہ زعم نہیں کہ جن نقائص و سقائم کا ذکر ذیل میں آئے گا۔ ان سے میرا کلام نظم و نثر بالکل پاک ہے۔ میں تو کیا جس کسی کو یہ زعم ہو باطل ہے۔ بلکہ آپ یہ سمجھ لیں کہ ان نقائص و سقائم سے بچنے کی فکر ہمیشہ عارض حال رہتی ہے، لیکن فن اور زبان کے نکات کا اظہار ہر سمجھدار آدمی کا فرض ہے۔ آج کل ہر کہیں جمہوریت کا سکہ رواں ہے۔ ہماری زبان بھی اس کے معرض عمل میں ہے، لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ جس طرح افراد آزادی اور آوارگی کے معنوں میں حد امتیاز قائم کرنے سے عاری ہیں اسی طرح جمہوریت کے معنی بھی غلط فہمی کا شکار بن رہے ہیں۔ یاد رہے کہ میں اس اصطلاح کو محض ادبی نفس معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔ شخصیت اور جمہوریت میں فرق صرف اتنا ہے کہ اول صورت میں قواعد کی توضیع و تعمیل صرف ایک شخص کو ودیعت ہوتی ہے اور دوسری صورت میں اس ذمہ داری کے لیے چند اشخاص نامزد ہوا کرتے ہیں۔ قواعد یا قوانین اور ان کی تعمیل و پابندی ہر صورت میں لابدی ٹھہرتی ہے۔ چونکہ انسان بالطبع متمدن ہے۔ اس کی زبان بھی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ضابطہ اور تنظیم کے تحت میں ہے، لیکن افسوسناک استعجاب ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ ایسے اصحاب کی کمی نہیں جو اردو کو جمہوریت کی شان سے بیگانہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس خواہش اور کوشش کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک معمولی رسالہ یا کتاب کے مضامین سمجھنے کے لیے قاموس اور امرکوش کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا تو انشا ایسی الجھی ہوئی اور اسلوب اتنا پیچیدہ رکھا جاتا ہے کہ شرح اور تفسیر کے بغیر سمجھ میں نہ آ سکے۔ میری نظر میں یہ آثار اچھے نہیں۔

ادبی، تاریخی اور شاعرانہ تحریروں میں غیر مانوس لغات کا استعمال، اللہ بخشے منشی نول کشور کی بدولت عربی، فارسی اور ہندی کی ایسی بہت سی کتابیں کوڑیوں کے مول مل جاتی ہیں، جو پہلے اشرفیوں میں مشکل سے

ہاتھ لگتی تھیں۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ علم کے ان خزانوں کے جواہر اردو کے زیور میں اس طرح جڑے جاتے کہ اس کی زیب وزینت دوبالا ہو جاتی۔ انگریزی بھی اردو جیسی غیر حرفی اور بیچ میل زبان ہے۔ اس میں لاطینی، یونانی اور فرانسیسی وغیرہ زبانوں کے بے شمار لفظ اور ترکیبیں داخل ہیں مگر وہ سموئے ہوئے ہیں۔ نہ تو بے جوڑ اور انمل ہیں اور نہ اس شکل سے کہ سسرو اور سقراط، ڈرراو اور دوماسے ماہر ہوئے بغیر سمجھ ہی میں نہ آ سکیں۔ بے ضرورت فارسی، عربی یا سنسکرت کے لغات کو اردو زبان برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر آپ ہر لغت کو اصطلاحی حیثیت دیں اور اس کی اصطلاحی اور ادبی شان میں امتیاز نہ کریں تو یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔ زبان کی توسیع اور ترقی اس طرح ہوگی کہ آپ اسے ان مانوس زبانوں کے اور نیز انگریزی کے ان ادبی خزانوں سے مالا مال کریں جو اردو کے ظرف میں سما سکتے ہیں۔ اردو اس ضعیف کی مانند ہے جسے قوت دینے والی اور تازگی بخش غذا کی ضرورت ہے مگر وہ ثقیل اور بطی الہضم نہ ہونی چاہیے۔ اب اگر اسے ایسے مقویات اور مفرحات اعتدال سے زیادہ دیے جائیں تو خوف ہے کہ آلات انہضام ماؤف ہو کر دل کے لیے خون کی کافی مقدار مہیا نہ کر سکیں جس سے دماغ کے مختل ہونے کا خدشہ ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ زبان کام کا آلہ قرار دی گئی ہے، جس کے توسل سے معلومات کی توسیع، خیال کی توسیع اور اخلاق وتمدن کی اصلاح مدنظر رکھی جاتی ہے۔ وہ محض تفریح اور دل لگی کی چیز نہیں۔ جب ایک شے اپنے حقیقی مصرف سے گر جاتی ہے تو اس میں طرح طرح کے نقائص آ جاتے ہیں۔ آپ ایک گھڑی سے جو اظہار وقت کا آلہ ہے، زیور کا کام لینے لگیں تو وہ اپنے حقیقی مصرف میں قاصر ہو جائے گی۔ آپ چاہیں گے وہ چھوٹی ہو، پتلی ہو، ہلکی ہو، اس کا خول سونے کا ہو وغیرہ وغیرہ، لیکن صحیح وقت دینے والی گھڑی بھاری ہوگی۔ اس لیے جسامت میں بڑی۔ اسی طرح زبان کا مصرف اگر محض دل بہلانا اور غزل وافسانہ گوئی قرار دیا جائے تو پھر اس سے کوئی مفید اور اہم کام لینا مشکل ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اچھی اور کام کی بات جو کبھی کہی جاتی ہے، لوگوں کے دلوں میں نہیں بیٹھتی۔

غیر مانوس الاستعمال لغات کلام کو فصاحت سے دور کھینچ لے جاتے ہیں اور جب ایک کلام فصاحت سے دور ہو جائے تو تاثیر سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ کلام فصیح کی تعریف علم معانی میں یہ آئی ہے کہ کلام فصیح وہ کلام ہے جو غرابت، تنافر حروف، مخالفت قیاس لغوی اور عیب ترکیب سے پاک ہو۔ ایسا کلام اگر امر حق اور پاکیزہ خیالات پر محتوی ہو، تو سامع پر ضرور اثر کرے گا، لیکن اگر وہ کلام فصیح نہیں تو اس کا اثر سامعین یا ناظرین کے دلوں پر جیسا کہ مقصود ہے، ہرگز نہ ہوگا۔

غرابت کی تعریف میں اوپر بتا آیا ہوں، یعنی کلمہ غیر مانوس الاستعمال کلام میں لانا مثلاً ریل کی جگہ سکۃ الحدید، شذرات، ملاحظات، استبداد، احتجاج، حریت، ببلیوگرافی، ڈیفینیشن، ڈیپارٹمنٹ، آوشیہ، آدرش، وکلوں، آندولن وغیرہ وغیرہ۔ مصنفین اور اہل قلم کے کلام سے صفحہ اور سطر کی قید کے ساتھ نظیریں پیش کی جا سکتی

ہیں، لیکن مذاقِ سلیم مانع ہے کہ مبادا ایراد و تعریض کے الزام کا مورد ہو جاؤں۔

غرابت کے بعد ہی مخالفت قیاس لغوی کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تعریف ہے فارسی یا اردو کے ضابطہ کے خلاف کوئی لفظ کلام میں وارد کرنا۔ جیسے

سودا میں اس چمن میں ہوں جوں غنچہ دل گرفت

اس مصرعہ میں دل گرفت ضابطہ فارسی کے خلاف استعمال کیا گیا ہے۔ دل گرفتہ کہنا چاہیے۔

موسیٰ کو تیرے حکم سے دریا نے راہ دی
فرعوں کو تو نے غرق کیا رود نیل کا

یہاں ''رود نیل کا'' خلاف ضابطہ اردو استعمال کیا گیا ہے۔ اردو کے ضابطہ کے مطابق ''رود نیل میں'' ہونا چاہیے۔

یہ دو نقائص کلام کے اور سب نقائص سے کہیں زیادہ عام ہیں اور اردو کی اکثر تحریروں میں پائے جاتے ہیں۔ مقامی اور ذاتی تخصیص کا اس میں دخل نہیں۔ لوگوں کا مذاق کچھ ایسا بگڑ گیا ہے کہ بے ضرورت اور بے محل کلام میں غیر مانوس لغات عربی، فارسی اور سنسکرت کے ٹھونسے جاتے ہیں۔ اگر پنڈتائی اور مولویت کا زعم ذہن شریف پر ایسا ہی مسلط ہو گیا ہے تو عربی، فارسی اور سنسکرت میں خامہ فرسائی کیوں نہیں فرمائی جاتی؟ بیچاری اردو کے گلے پر شمشیر اصفہانی اور فولاد ہندی کیوں لادی جاتی ہے۔ اس ضمن میں ایک اور بات ذکر کے قابل ہے، جو نہایت عجیب ہے یعنی مشاق اہل قلم اور مصنف خاص کر ایسے موقع پر جس کی اہمیت اعلیٰ درجے کی ہو اپنے قلم پر بھروسہ نہیں کر سکتے یا تو ایک عندیہ کو جو اصطلاحی حیثیت رکھتا ہو، ایک ہی تحریر میں ایک سے زیادہ الفاظ میں تعبیر کریں گے۔ جیسے 1918ء کی آل انڈیا مسلم لیگ کے استقبالی خطبہ ایلائیز کے لیے دو جگہ دو مختلف لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یعنی حلفی اور اتحادی یا یہ ہوتا ہے کہ باوجودیکہ ایک تحریر ایک عالم فاضل سے لے کر گنوار کسان تک کے لیے مقصود ہو، لیکن ایسے الفاظ اور ترکیبیں استعمال کی جاتی ہیں کہ ان کی تشریح کی ضرورت پڑتی ہے اور ایک لفظ کے لیے کئی کئی الفاظ خطوط وحدانی بطور تکوتح لکھنے کی ضرورت عائد ہوتی ہے۔ اس کی نظیر میں پنجاب کی پچھلی انڈین نیشنل کانگرس کے استقبالی خطبہ سے چند الفاظ اور فقرے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں ''محبت کی مے میں سرشار ہو کر'' مے اور سرشار کو بدل کر اگر یوں کہتے ''محبت کے نشہ میں چور ہو کر'' تو پڑھے اور بن پڑھے سب سمجھ جاتے۔ دھیر یہ لکھ کر خطوط وحدانی میں (استقلال لکھا گیا ہے) اسی طرح ''نربھتا'' کی تشریح ''(''بے خوفی'')'' سے کی گئی ہے۔

یہاں ایک اور نظیر بھی پیش کی جا سکتی ہے، جو مخالفت قیاس لغوی کی ذیل میں آتی ہے۔ 1919ء کے اپریل اور مئی کے مہینوں میں لاہور میں مارشل لاء یعنی فوجی حکومت کا دور رہا۔ مارشل لاء کے افسر نے متعدد احکام رعایائے شہر کی آگاہی اور تعمیل کے لیے نافذ کیے۔ یہ احکام انگریزی اور اردو وغیرہ کئی زبانوں میں شائع

ہوتے تھے۔ انگریزی میں تو ان احکام کا ہمیشہ ایک ہی عنوان ہوتا تھا (مارشل لاء آرڈر نمبر..........) لیکن اردو میں کوئی التزام ان تین لفظوں سے مرکب عنوان کا نہ بن پڑا۔ چنانچہ کم سے کم تین مختلف ترجمے ایسے احکام کے ایک ہی عنوان کے کیے گئے' حالانکہ اس کی حیثیت ٹیٹھ اصلاحی تھی۔ ملاحظہ ہو:۔

(1) ''اعلان فوجی قانون نمبر 22''

(2) ''اعلان ۔فوجی قانون نمبر 20''

(3) ''فوجی قانون حکم نمبر 19''

حالانکہ یہ ترجمے پلٹن کے سپاہیوں یا نیم تعلیم یافتہ انگریز افسروں نے نہیں کیے تھے بلکہ ایک سرکاری دفتر کے ان اہل قلم اصحاب نے جن کا کام ہی تالیف اور ترجمہ تھا۔ اب دیکھئے ان تینوں عنوانوں کے اگر بروئے قواعد زبان اردو کچھ معنی بھی ہو سکتے ہیں' تو وہ مختلف فیہما ہیں۔

''اعلان فوجی قانون نمبر 22'' سے یہ پایا جاتا ہے کہ جس طرح ہائیکورٹ کے فیصلے یا فنانشل کمشنر کے سرکلر مختلف نمبروں میں نکلا کرتے ہیں۔ اسی طرح اہالیان فوج سے متعلق جو قوانین افسر مجاز وقتاً فوقتاً جاری کرتا رہا' یہ اس کے ایک نمبر کا اظہار ہے۔

دوسرے عنوان میں اعلان کے بعد جو ایک لمبا موٹا خط گھسیٹا گیا ہے' اس کی ہستی کو اردو کے فن انشاء کے ضابطہ میں تسلیم کر بھی لیا جائے تاہم اس کلام کے کچھ معنی قرار نہیں دیے جا سکتے۔

تیسرا عنوان فوجی قانون حکم۔ یہ قطعاً مہمل ہے' اس لیے کہ یہ تینوں الفاظ الگ الگ اگرچہ اپنے معنی رکھتے ہیں اور انہیں کلمہ کی حیثیت حاصل ہے' لیکن قواعد اردو کے بموجب ترکیب بالا سناد سے معرا ہیں۔ لہٰذا یہ مجموعہ الفاظ مہمل قرار پاتا ہے۔

مخالفت قیاس لغوی کی تحت میں چونکہ ترجمہ کا ذکر آ گیا ہے تو یہاں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کثرت استعمال نے یورپ کی زبانوں کے بہت سے کلموں کو کلام میں ایسا مروج کر دیا ہے اور کان ان سے اس قدر آشنا ہو گئے ہیں کہ اب ان کی جگہ سنسکرت یا عربی، فارسی کے لغات لانا یا گھڑ کر رکھنا سامعہ کو گوارا نہیں ہوتا اور ایک قسم کا مخالفت قیاس لغوی کا نقص وارد کرتا ہے۔ آزاد مرحوم نے ایک لمبی فہرست ایسے الفاظ کی مرتب کی تھی، لیکن اب وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ ابھی تھوڑی مدت گذری کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کی ترتیب و تنظیم کی ذیل میں اصلاحات علوم طبیعات کے متعلق حیدرآباد میں بڑی بحث ہوئی۔ ایک فریق کے وکیل مولانا علی حیدر طباطبائی حیدر یار جنگ تھے۔ آپ باوجودیکہ عربی اور فارسی کے جید عالم ہیں، لیکن آپ کا قول یہ تھا کہ اگر ایک لغت انگریزی کا ایک شے کے لیے معین ہے تو اس کو اردو میں استعمال کرنا بہتر ہے بمقابلہ اس کے کہ عربی کا ایک سطر کا فقرہ گھڑا جائے۔

سب جانتے ہیں کہ جب کسی جماعت میں بیداری کے آثار ہویدا ہوتے ہیں تو ہر چیز نیا اور قوی

رنگ اختیار کرتی جاتی ہے۔ مصوری، موسیقی، شاعری، ڈراما، تعمیر وغیرہ بھی آئین حکومت کی اصلاح اور اخلاق جمہور کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ قومی رنگ پکڑتے جاتے ہیں۔ سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ اور باتوں میں بھی آزادی آتی جاتی ہے، لیکن یہ آزادی سیاسی ہو یا کسی اور نوع کی اخذ و ترک' کسب اور جلب منفعت، ضابطہ اور معقولیت پر موقوف ہونی چاہیے۔ تاریخ عالم پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں وہی قوم پروان چڑھی، جس کا دستور العمل اس شعر کی طرح تھا

تمتع ز ہر گوشہ یافتم
ز ہر خرمنے خوشہ یافتم

دنیا کی اعلیٰ درجے کی مقتدر اور متمدن اقوام میں سے دو کے ساتھ ہم کو خصوصیت ہے۔ جاپان اور انگلستان۔ جاپان کے ساتھ اس بنا پر کہ وہ ہمارا ایشیائی بھائی ہے اور انگلستان سے اس لیے کہ وہ ہمارا حاکم ہے۔ جاپان کی ترقی کل کی بات ہے اور انگلستان کی بیداری صرف سولہویں صدی عیسوی کے وسط سے عرصہ شہود میں آئی جسے کم وبیش تین سو برس ہوئے ہیں۔ ان دونوں قوموں کی اور ترقیات کے دفاتر کو جانے دو اور صرف ایک ایک لغت کی کتاب اٹھا لو تو واضح ہوگا کہ غیر زبانوں کے کتنے خیالات' الفاظ اور ترکیبیں انہوں نے اپنے ہاں لے لیے اور ان کو اپنے ذہن اور زبان کے سانچے میں ڈھال لیا۔ اگر اہل ہند بیدار ہونے لگے ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ زبان سے نادار ہو جائیں۔ ہندی والوں نے بڑی دانائی کی کہ پنڈتوں کی ایک نہ مانی اور یورپی زبانوں کے بہت سے اصلاحی لغت یا ترکیبات جن کی آواز کانوں کو ناگوار نہ تھی اور جن کا بدل غیر مانوس سنسکرت کا لغت یا فقرہ تھا' جوں کے توں یا خفیف پھیر بدل کے ساتھ اپنی علمی فرہنگ میں داخل کر لیے۔ (تفصیل کے لیے دیکھو ہندی سائنٹیفک گلاسری۔ مرتبہ ناگری پرچارنی سبھا۔ بنارس) اس اصول پر مولانا طباطبائی عثمانیہ یونیورسٹی کو چلانا چاہتے تھے۔ زبان کے باب میں ہندی والوں کی اہلیت قابل داد ہے اور تقلید کی مستحق۔ تلک مرحوم کی گیتا رہس کا ہندی ترجمہ رائے پور واقع صوبجات متوسط کے مسٹر مادھو رائے سپرے نے کیا اور ایسی زبان میں کیا کہ ہندی خوان جو سنسکرت نہیں جانتا' اسے بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اس کے ایک باب میں یہ فارسی اور عربی الفاظ کوئی پچاس صفحوں کے حجم میں میری نظر سے گذرے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

روزگار (بمعنی شغل جو وجہ معاش ہو) طرح، طور، موقع، معلوم، ایک بار، پرواہ، دلیلیں پیش کرنا، بعد، علاقہ، سواء، ایک دم، ارادہ، جاری، بالکل، زور شور، حال، حال ہی میں، تیار، درمیان، مینار، عمارت، زمین، حساب، دربار، ضرور، حیثیت، صرف، نمونہ، صدی، دلیلیں، دیر، یعنی، اصل میں، حصہ، سلسلہ، صاف صاف۔ وغیرہ۔

اگر میں ان الفاظ کے سنسکرت مترادف سنانے بیٹھوں تو آپ میں سے اکثر اصحاب ابھی جمائیاں لینے لگیں۔ نہیں تو کھانسی ضرور چھوٹ پڑے! اسے کہتے ہیں ادبی رواداری اور تاج تبلیغ۔ ہمارے ہاں انشا

پردازی کی معراج یہ سمجھتے ہیں کہ لکھنے والے کو بڑا عالم اور لکھا پڑھا سمجھا جائے۔ یہ سوچ کسی کی جوتی کہ جو کچھ لکھا ہے اس کے سمجھنے والے کتنے ہوں گے۔ اخبار کو جریدہ، روزانہ کو روزنامہ، رسالہ کو مجلّہ علی ہذا لکھ کر اپنے زعم میں اپنے آپ کو ظہوری اور بدر چاچ کی ٹکر کا سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اڈیٹر تو مدیر کے ساتھ مدریا گڑ گڑاتے چمپت ہوا۔ اب رئیس التحریر کا من مانتا خطاب اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک رئیس التحریر ملاحظات کی ذیل میں فرماتے ہیں:۔

''گذشتہ دسمبر سے ..... برابر چھ جزو پر نکل رہا ہے، لیکن میری یہ جرأت صرف اس توقع پر تھی کہ موجودہ خریداران میں سے ہر صاحب کم از کم ایک خریدار ضرور پیدا کر دیں گے، لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک میری یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ تاہم میں مایوس نہیں ہوں اور فروری کا رسالہ پھر چھ جزو پر شائع کر رہا ہوں۔ یعنی میں اپنی توقعات کو پھر بآندازہ ایک ماہ وسیع کرنا چاہتا ہوں۔ قدم بڑھا کر پھر اس کو لوٹانا میری فطرت کے خلاف ہے، لیکن اگر آپ نے اعانت نہ فرمائی، تو مجبور ہو کر مجھے یہ بھی کرنا پڑے گا اور رسالہ پھر 80 صفحات کا کر دیا جائے گا.....

''میں طبّی مشورہ کی بنا پر فروری اور مارچ سے باہر بسر کرنے پر مجبور ہوں۔ ہر چند ڈاک برابر مجھے ملتی رہے گی۔ تاہم ممکن ہے کہ تمام خطوط کا جواب بروقت نہ دے سکوں۔ اس لیے قبل سے یہ معذرت پیش کیے دیتا ہوں۔''

اس نثر کے ابتدائی حصہ میں تین جگہ ''لیکن'' آیا ہے۔ دو مقام پر یہ کلمہ محض حشو ہے۔ ''یعنی'' اور اس کے بعد جو کچھ درج ہے وہ بھی بے ضرورت ہے۔ دونوں ''تاہم'' اور ''ہر چند'' بھی غیر ضروری ہیں۔ یہ سارا مطلب فصیح اور سلیس اردو میں اس طرح لکھا جا سکتا ہے:۔

''پچھلے دسمبر سے ..... برابر چھ جز پر نکل رہا ہے۔ میری یہ جرأت صرف اس توقع پر تھی کہ ..... کے موجودہ قدر دان ایک ایک خریدار تو ضرور پیدا کر دیں گے۔ افسوس ہے کہ ابھی تک یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ مگر میں مایوس نہیں اور فروری کا رسالہ پھر چھ جز پر نکال رہا ہوں۔ قدم بڑھا کر لوٹانا اپنا شعار نہیں۔ اس پر بھی آپ نے اعانت نہ فرمائی تو پھر میں مجبور ہو جاؤں گا کہ رسالہ کو 80 صفحات پر لے آؤں.........

میں طبّی مشورہ سے فروری اور مارچ میں ..... سے باہر رہوں گا۔ ڈاک تو مجھے ملتی رہے گی، لیکن شاید خطوں کے جواب فوراً نہ دے سکوں۔ اس لیے پہلے سے یہ معذرت پیش کرتا ہوں۔''

اسی رسالہ میں ایک صاحب لکھتے ہیں۔ ''اوائل ہفدہم صدی میں'' اگر سترہویں صدی کے اوائل میں لکھ دیتے، تو کیا اردو کی تیرہویں ہو جانے کی بدشگونی تھی بقول کیے وزیرے چنیں شہر یارے چناں۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ شوکت الفاظ بلند آہنگی اور رزور کلام کا مفہوم غلط قرار دیا گیا ہے۔ شاید یہ سمجھا جاتا ہے کہ بلاغت اور کلام بلیغ اسی کا نام ہے۔ بلاغت یا کلام بلیغ کی تعریف ادیبوں نے یہ کی ہے کہ ایسا

کلام جس میں فصاحت اور مقتضائے حال کی موافقت پائی جائے، کلام بلیغ ہے۔ کلام کے اسی وصف کو بلاغت کہتے ہیں۔

نثر لکھیں یا نظم انشا کو غریب اور خلاف قیاس لغات اور ترکیبوں سے گرانبار کر کے بلند آہنگی کا خون کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو تشبیہ اور استعاروں کی وہ بھرمار کر دی جاتی ہے کہ الٰہی توبہ۔ سب مانتے ہیں کہ مرزا غالب نے ان دو صنعتوں کی مدد سے باریک نکتے شاعری کے اپنے کلام میں داخل کیے، لیکن ان کے ہاں بھی ان کی بہتات سے تغزل کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور یہی نہیں کہ کلام نغز گفتاری سے دور ہو گیا' بلکہ مغلق ہو گیا۔ چنانچہ اپنے ارشد تلامذہ اور اہل مذاق احباب کے استفسار پر کبھی کبھی خود ان کو اپنے اشعار کی شرح کرنی پڑی۔ مرزا کا تتبع آج کل اردو نظم کے طبقہ جدید میں ساری و حاوی ہے۔ تتبع کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ مرزا کو بھی یہ رنگ اعتدال سے خارج محسوس ہوا اور آخر کو چھوڑ دینا پڑا۔ انہوں نے اواخر عمر میں اپنے ممدوح میر تقی کی طرف مراجعت کی اور وہ اسی رنگ کے اشعار ہیں جنہوں نے خلقت کو ان کا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ پہلے فرمایا کرتے تھے:

سر شک سر بصحرا دادہ نور العین دامن ہے
دل بے دست و پا افتادہ برخوردار بستر ہے
قطرہ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خط جام مے سراسر رشتہ گوہر ہوا
آمد سیلاب طوفان صدائے آب ہے
نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ ہے
اہل بینش نے بہ حیرت کہ شوخی ناز
جوہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا

پھر فرمانے لگے:

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا وفا کیا ہے
دیکھ کر ان کو جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

آزاد مرحوم نے تشبیہ و استعارہ کے استعمال کے باب میں جو تاکید کی ہے' نہایت اہم اور لازمی ہے۔ آپ ''آب حیات'' میں فرماتے ہیں:۔

''ہمارے متاخرین کو آفرین لینے کی آرزو ہوئی تو بڑا کمال یہ ہے کہ کبھی صنعت در صنعت کبھی استعارہ در استعارہ سے تنگ و تاریک کیا جس سے ہوا تو یہ ہوا کہ بہت غور کے بعد فقط ایک وہمی نزاکت اور فرضی لطافت پیدا ہو گئی کہ جسے محالات کا مجموعہ کہنا چاہیے۔''

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

''اس فخر کے ساتھ یہ افسوس پھر بھی دل سے نہیں بھولتا کہ انہوں نے ایک قدرتی پھول کو جو اپنی خوشبو سے مہکتا اور رنگ سے کھلتا تھا' مفت ہاتھ سے پھینک دیا۔ وہ کیا ہے؟ کلام کا اثر اور اظہار اصلیت۔ ہمارے نازک خیال اور باریک بیں لوگ استعاروں اور تشبیہوں کی رنگینی اور مناسبت کے ذوق شوق میں خیال سے خیال پیدا کرنے لگے۔''

جاننا چاہیے کہ انسان کا نفس عقلی کی نسبت حسی کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے اور لطف سخن کی بنیاد محاکات پر ہے۔ اس لیے تشبیہ کو علم بیان میں جگہ دی گئی، لیکن لکھنے والوں کو احتیاط چاہیے کہ تشبیہیں اور استعارے کلام میں اسی قدر آئیں جس قدر کھانے میں نمک مسالہ، نہ کہ نمک مسالہ میں کھانا۔ تشبیہ کی بنیاد اگرچہ غوامض پسندی' معنی آفرینی اور جدت طرازی اور تحسین کلام بتائی جاتی ہے، لیکن اس کی علت غائی قصور اظہار حقیقت ہے۔ ذیل کی تاریخی مثال سے اس کی وضاحت ہو گی۔

لکھا ہے کہ حسان ابن ثابت کے چھوٹے بچے کو ایک دفعہ بھڑ نے کاٹ کھایا۔ چہرہ پر ورم ہو گیا۔ حسان کو خبر ہوئی۔ لڑکے سے پوچھا کس جانور نے کاٹا' لڑکا جواب نہ دے سکا' کیونکہ یہ حقیقت اس پر ظاہر نہ تھی کہ جس جانور نے اسے کاٹا' اس کو زنبور کہتے ہیں۔ پھر حسان نے پوچھا کہ وہ کس قطع کا جانور تھا۔ بچہ بے تکلف کہنے لگا۔ ''کانہ ملتفا حبرہ'' یعنی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دھاریدار چادروں میں لپٹا ہوا ہے۔ بھڑوں کے پروں پر رنگین خط ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو دھاریداری چادر سے تشبیہ دی۔ حسان سمجھ گیا کہ بھڑ نے کاٹا تھا۔

پچھلے چالیس برسوں میں بے شمار ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوئے۔ اس سے جہاں یہ ہوا کہ انگریزی مصنفوں کے خیالات سے اردو مالا مال ہوئی۔ یہ بھی ہوا کہ اس کی انشا کی پرواز بگڑ گئی۔ بیان کا اسلوب پیچیدہ اور مغلق ہو گیا۔ اس کا الزام نہ صرف انگریزی داں اردو نویسوں پر ہے بلکہ ان پر بھی جو انگریزی جانتے ہی نہیں۔

عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جو خیال دو تین چھوٹے چھوٹے جملوں میں سلاست سے ادا ہو سکتا تھا' گھیر گھوٹ کر ایک لمبے اور پیچیدہ جملے میں الجھایا جاتا ہے۔ مثلاً ایسے جملے تازہ تصانیف اور رسالوں میں اکثر پائے جاتے ہیں:۔

''انسان جبکہ مسلم طور پر اشرف المخلوقات مانا گیا ہے تو چاہیے تھا کہ وہ اپنے حسیات وجذبات پر پورے طور پر قادر ہوتا جیسا کہ ایک مکمل انجن اپنے مختلف پرزوں کے افعال وحرکات پر قادر ہوتا ہے جبکہ ان میں سے ہر ایک کا فعل جداگانہ ہے، جن کی رفتار کو حد اعتدال کے اندر رکھنا اس کا فرض ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے بھی اپنے پایہ سے گر جاتا ہے۔ جو آخرکار اسے گراتے گراتے بہائم میں ملا دیتا ہے' جن سے تمیز کرنے کو قدرت نے اسے عقل سلیم عطا فرمائی تھی جو نور سبحانی اور دلیل راہ حقیقت بتاتی ہے۔ جیسا کہ علماء حکماء نے کہا ہے جن کے علم وفضل کے اکناف عالم میں جھنڈے گڑے ہوئے ہیں اور جنھیں استاد خلائق مانا جاتا ہے۔ خواہ ان کے تمام خیالات سے ہمیں اتفاق ہو یا نہ ہو۔''

اب دیکھئے یہ عبارت غرابت اور مخالفت قیاس لغوی کی تعریف سے باہر ہے، لیکن کلمے اگرچہ بالا سنادتر کیب رکھتے ہیں۔ ان کی نشست اور اسلوب ذہن سے ناآشنا واقع ہوئے ہیں۔ یعنی یہ عبارت باوجود اردو زبان کی ہونے کے اردو کی سی نہیں بچتی۔ متکلم کا مافی الضمیر چند چھوٹے چھوٹے جملوں میں آسانی اور خوش اسلوبی سے ادا ہو سکتا تھا۔ میاں بشیر احمد صاحب اور مولانا تاجور صاحب نے اردو پر بڑا احسان کیا کہ اپنے رسالہ ''ہمایوں'' میں اردو کے متعلق انعامی مضامین کا اعلان کیا، جو مضامین اس اعلان کے جواب میں لکھے گئے وہ ''ہمایوں'' میں چھپ چکے ہیں۔ ان میں سے صرف دو مضامین کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔ مولانا وحید الدین سلیم، پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:۔

''ہندی اور فارسی دونوں آریائی خاندان کی زبانیں ہیں۔ اردو زبان کے تیار کرنے میں ان دونوں زبانوں نے کام کیا ہے۔ عربی ایک دوسرے خاندان السنہ سے تعلق رکھتی ہے' جس کو سامی خاندان کہتے ہیں۔ اگر ہم اردو کے ان الفاظ کو شمار کریں، جو ہندی اور فارسی سے لیے گئے ہیں تو بمقابلہ عربی زبان کے الفاظ کے ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری زبان میں آریائی الفاظ اور سامی الفاظ کے درمیان میں چھ اور ایک کی نسبت ہے۔ اردو زبان کی قدرتی ساخت آریائی ہے کیونکہ اس کی گرامر وہی ہے جو آریائی زبانوں کی مشترک گرامر ہے۔ عربی کے الفاظ بے شبہ اس میں شامل کیے گئے ہیں مگر ان سے اس زبان کی قدرتی بناوٹ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کیونکہ اردو گرامر کو عربی گرامر سے کوئی واسطہ نہیں۔''

''جو اردو زبان کا موجودہ ادب عربی ایرانی ادب کی نقل ہے یعنی اس ادب کی نقل کی گئی ہے جو عرب اور ایران کے متحد اثر سے تیار ہوا ہے۔ اس میں ہندوستانیت کی جھلک نام کو نہیں۔''

اسی موضوع پر حضرت ناظر دہلوی اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں:

''زبان کو سہل بنانا دراصل اس کو ترقی دینا ہے، جو لوگ مغلق ترکیبیں اور ادق الفاظ استعمال کرتے ہیں وہ دیدہ و دانستہ اردو کے دشمن ہیں۔''

میں اب اور اقتباس نہیں کروں گا تاکہ طوالت سے بچوں۔ اس قبیل کے مضامین کو مارچ 1923ء کے ''ہمایوں'' میں تمام وکمال پڑھنا اور ان پر غور و فکر کرنا اردو کے ہر خیر خواہ کا فرض ہے۔

پروفیسر سلیم نے اپنے مضمون میں جس کا ابھی ذکر آیا ہے، ایک نئی آنے والی قوم کی بشارت دی ہے۔ فرماتے ہیں ''اس آنے والی قوم کا نام ہندلمان ہوگا۔'' ایسی قوم کا یہاں کبھی ظہور ہوگا یا نہیں اسے تو خالق دو جہاں کی قدرت صانعہ پر چھوڑیے، بالفعل اس پر غور کیجئے کہ اردو میں ہندلمانیت جو بزرگ پیدا کر گئے ہیں اسے تو نہ مرنے دیں۔ اردو کے سچے خیر خواہوں کو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ملک کے دیسی لواحقات، تلازمے، محاکات، روایتیں اور کہاوتیں جن سے متقدمین اردو زبان کو سجایا کرتے تھے اور جن کا تتبع متاخرین نے بھی کیا۔ اب ہم نے زبان سے ان کے خارج کر دینے کی قسم کھائی ہے۔

سنئے سلف کیا فرما گئے ہیں۔

گردش سے روسیہ کی کیا کیا بلائیں آئیں

میر:۔

جانے ہی کے ہیں لچھن سارے اس آسماں کے

ریگستاں میں جا کے رہے یا سنگستاں میں ہم جوگی

رات ہوئی جس جاگہ ہم کو ہم نے وہاں بسرام کیا

دل کی تہ کی کہی نہیں جاتی نازک ہے اسرار بہت

انچھر تو ہیں عشق کے دو ہی لیکن ہے بستار بہت

سودا:۔

شعلہ پیرا اگر ہو تیری تیغ

کاہ سے کوہ تک ہو سب بھسمت

جرأت:۔

شاید آ جائے کبھی ہاتھ عروس گیتی

اسی امید پہ ہم بیٹھے ہیں آسن مارے

دل بھی اب مجھ سے دور بھاگے ہے

اس سے مل کر اسے بھی بھاگ لگے

مصحفی:۔

چہرہ اتر گیا ہے نقشے بگڑ گئے ہیں
پھر ان دنوں تو میرے لچھن سے جھڑ گئے ہیں

رنگین:۔

ہے یہ گھر لنکا یہاں ہے کوئی باون گز سے کم؟
ایک سے ایک آہ بندی کی ٹکیلی تھہر ہے

نصیر:۔

تیرے ہی نام کی سمرن ہے مجھ کو اور تسبیح
تو ہی ہے ورد ہر اک صبح و شام عاشق کا

معروف:۔

غیر ہفتہ کے دن آیا جو سفر سے معروف
میں نے جانا کہ بس اب مجھ پہ سنیچر آیا

ناسخ:۔

دیکھا جسے ہو گیا وہ عاشق
تیری آنکھوں میں موہنی ہے
گر رخ کا بوسہ دیتے نہیں لب کا دیجئے
وہ ہی مثل ہے پھول نہیں پنکھڑی سہی

ذوق:۔

ارادہ عرش اعظم کا ہے آہ صبحگاہی ہی کو
در فریاد رس پر چل کے اب دھونی رمانی ہے

آتش:۔

چاہے قسم جو یار تو کیا کیا اٹھایئے
قرآن سر سے آنکھ سے گنگا اٹھایئے

اسیر:۔

ہم تو پیاسے رہے ہے غیر کو دی پیر مغاں
الٹی اس شہر میں بہتی ہوئی گنگا دیکھی

رنگیںؔ:-

نہ دلایا داد تسلسل اشک سرنی یار کی کلائی کی

وزیرؔ:-

اس بت کافر کا زاہد نے بھی نام ایسا جپا
دانہ تسبیح ہر اک رام دانہ ہو گیا

بحرؔ:-

ہے کچھ نہ کچھ تو بجوگ ناحق نہیں یہ بروگ
کیسا لگا جی کو روگ اے بحرؔ کیا حال ہے
طرہ حسن اس صنم کے سر پہ زیباں ہو گیا
زلف کالی بن گئی، جوڑا کنھیا ہو گیا
ہُوا دھوپ میں بھی نہ کم حسن یار
کنھیا بنا وہ جو سنولا گیا
کب شعر ہم نے یار کے آگے پڑھے نہیں
کس دن ہمارے پھول مہیسر چڑھے نہیں

....

آپ نے دیکھا کہ متقدین ومتاخرین اردو کیا کیا محاورے، تلمیحات اور محاکات جو ٹھیٹھ ہندوستانی کیا معنی ہندوانی ہیں اپنے کلام میں لاتے تھے اور پھر کس صحت کے ساتھ اور برمحل۔ مرزا رفیع سودا کے ہاں کئی مرثیے ہندی آمیز اردو میں ہیں اور دوہے چوپائی میں ہیں اور پھر یہ سب بزرگ جن کے کلام سے ابھی استفادہ کیا گیا' مسلمان تھے بلکہ ان کی شان میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ ''ہندلمان'' تھے اور ان کا وطن ملک سخن تھا۔

میرے محترم دوست حضرت صدر جلسہ ''مخزن'' مرحوم کے سرورق پر لکھا کرتے تھے۔ ''نو کروڑ ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں اور اسی قدر ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں۔'' آج کل کی میعادی اور مستقل تصنیفیں دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ شاید ہمارے فاضل دوست کے زمانہ میں اور اردو رائج ہوگی کیونکہ جو زبان ہمارے آج کل کے اہل قلم لکھ رہے ہیں' وہ عام فہم کیا معنی خاص فہم بھی نہیں۔ خاص الخاص فہم یا شاذ فہم ہے۔ اسے تو نو کروڑ کیا' نو ہزار آدمی بھی مشکل سے سمجھ سکتے ہوں گے۔ حال میں آپ کے ہاں ایک سوشل تقریب ہو چکی ہے۔ میرا مطلب لالہ لاجپت رائے کی دعوت چائے سے ہے' جو ترکی وفد کے اعزاز میں دی گئی۔ آپ نے ذہن نشین کئے، وہ الفاظ جو لال چاند دل کے کھیا حضرت لیاقت بے کی زبان مبارک سے نکلے؟ انہوں نے فرمایا میں اردو سمجھ تو لیتا ہوں، لیکن آسانی اور صفائی سے بول نہیں سکتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ چاہتے تو اردو میں ہی اپنا مطلب

ادا کر سکتے تھے، لیکن وہ ہماری میعادی لٹریچر کی زبان دیکھ کر سہم گئے کیونکہ وہ ایسی زبان بولنے پر قادر نہ تھے۔

القصہ پروفیسر سلیم اور ناظر دہلوی سے میرا پورا اتفاق ہے کہ اگر اردو کو ہندوستان کی زبان بنانا منظور ہے تو اسے ''عربیرانی'' (یعنی عربی، ایرانی) کے بجائے ''ہندالمانی'' زبان بنایئے۔ جہاں تک ہو سکے اس کے معلومات اور علمیت کے خزانے میں ترقی کیجیے، لیکن برائے خدا اس کی ''اردوئیت'' کو حلال نہ کیجیے۔ 1877ء میں جب ''اودھ پنچ'' نکلنا شروع ہوا تو اکبر مرحوم نے منشی سجاد حسین صاحب مغفور کو لکھا تھا:۔

مرضی تھی خدائے دو جہاں کی
محدود ہوں شوخیاں زباں کی
دل میں جو آئے بک نہ جاؤ
ہشیار چلو بہک نہ جاؤ

میں دیکھتا ہوں آپ کو انتظار ہے کہ میں اپنے آج کے موضوع کے آخری حصہ پر کیا کہوں گا۔ آج کا موضوع رکھا گیا تھا ''اردو پنجاب میں۔'' لیکچر کے اعلان میں پنجاب کا نام دیکھ کر ضرور کان کھڑے ہوئے ہوں گے۔ لیجیے سنیے اردو کہاں پیدا ہوئی اور اس نے کہاں نشو و نما پایا۔ یہ ایسے سوال ہیں جن کا جواب شافی نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی نے تفنن طبع کے طور پر کبھی کچھ لکھ دیا تو اسے الہام اور سرتی سمجھ کر پلے نہیں باندھ رکھنا چاہیے۔ آزاد مرحوم نے اس تنقیح پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

''اسے فقط شاہجہان آباد کا اقبال کہنا چاہیے کہ یہ زبان خاص و عام میں اس کے اردو (اردو بازار) کی طرف منسوب مشہور ہو گئی۔ ورنہ جو نظم و نثر کی مثالیں بیان ہوئیں ان سے خیال کو وسعت دے کر کہہ سکتے ہو کہ جس وقت سے مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آیا ہوگا اسی وقت ان کی زبان نے یہاں کی زبان پر اثر شروع کر دیا ہوگا۔''

اگلے زمانے کے بزرگ بھی کتنے راست گو اور انصاف پسند تھے۔ آزاد مرحوم اگرچہ دہلی کے تھے، لیکن انہوں نے اردو کا سب سے اول باضابطہ شاعر ولی دکنی کو تسلیم کیا امیر خسرو دہلوی کو نہیں۔ حالانکہ قرائن موجود تھے کہ وہ امیر خسرو کے سر پر سہرا باندھتے مگر نہیں جو سچ جانا وہ لکھا۔ وہی بات کہی جو دھرم لگتی تھی۔ انہیں کے اس قول کی بنا پر جس سے کسی کو مجال انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ کہنا قرین انصاف ہے کہ واقعات حاصلہ کو ذہن نشین رکھ کر نہایت حزم و احتیاط سے استدلال کے بعد تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ پنجاب اردو کے قدیمی منسوبات میں سے ہے۔ مبادیات کی بحث میں زیادہ دور تک جانا بے سود ہوگا۔ واقعات بداہت سے شہادت دے رہے ہیں مگر میرا روئے سخن عہد حاضرہ کی جانب ہے۔

پنجاب کو اردو سے تعلق ہے۔ یہ امر تسلیم کرنا پڑے گا۔ اگرچہ پنجاب نے اپنی پنجابی سے کبھی سرد مہری کا برتاؤ نہیں کیا۔ اس کا باعث خواہ پنجاب کا اورینٹل کالج قرار دیا جائے، خواہ دہلی کا قرب اور خواجہ

تاشی یا یہ واقعہ کہ اردو کی نئی یا نیچرل شاعری کی بنیاد اہل دہلی کے ہاتھوں پنجاب میں ہے۔ اسی شہر لاہور میں رکھی گئی۔ یا یہ بات کہ جس طرح شاہ عالم ثانی کے عہد میں روہیلوں اور مرہٹوں کے ہاتھ سے دہلی کی تباہی ہو کر اس کے ہر علم و فن کے باکمال لکھنؤ میں جا بسے تھے' اسی طرح ہنگامہ 1857ء کے بعد پنجاب میں چلے آئے اور جس طرح اس وقت پورب کو اردو سکھائی تھی' اب پچھم پر توجہ ارزانی فرمائی۔ غرض کہ علت غائی کچھ ہی کیوں نہ ہو یہ بدیہی واقعہ ہے کہ پنجاب ان خطوں میں سے ہے جنہیں اردو سے خصوصیت ہے۔ اردو کی ترقی اور توسیع میں پنجاب کا جو مہتمم بالشان حصہ ہے' اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ تصانیف و تالیفات اور تراجم وغیرہ کی تعداد جو یہاں سے ہر سال اشاعت پاتی ہے' حکومت اور یونیورسٹی' جس حوصلہ افزائی اور کشادہ دلی سے اردو کی سرپرستی کرتی ہے' اس دعوے کی حجت ناطق ہیں۔ اردو ادب اور تہذیب انشا کے باب میں پنجاب کے شعرا اور اہل قلم کا بڑا حصہ ہے۔ بایں ہمہ میں حیرت اور افسوس سے دیکھتا ہوں کہ اہل زبان کا ایک طبقہ پنجاب کے ساتھ نہ صرف سرد مہری کا بلکہ معاندانہ سلوک کرتا رہا ہے۔ بیشک پنجاب کو ان حضرات سے ایسی توقع نہ تھی، لیکن اس پر بھی پنجاب نے تحمل اور تمکین سے کام لیا اور یہ اوصاف اس کے شعار میں داخل ہیں۔ اب جو یہ تذکرہ آ گیا ہے تو کہنا پڑتا ہے' ادبی نہیں مقامی وجوہ تھے۔ بڑے قوی اور محرک وجوہ تھے جنہوں نے لکھنؤ کے ایک حصہ کے ہاتھوں پنجاب کے ساتھ یہ غیر متوقع سلوک کرایا۔ اول یہ کہ اردو کے مرکزوں کے اعتبار سے پنجاب دہلی کا پیرو ہے (دیکھو مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی کا مضمون''' دہلی اور لکھنؤ کی اردو''۔ مندرجہ رسالہ ''دلگداز'' مطبوعہ مئی 1918ء)۔

معترض یہ سمجھے کہ پنجاب پر حملہ کرنے سے وہ دہلی کی طاقت کو صدمہ پہنچائیں گے۔ دوسرا موجب اس قابل تحقیر و اکراہ تعریض کا یہ ہوا ہو گا کہ ان کو خوف ہوا کہیں ایسا نہ ہو کہ پنجاب بھی ان کی طرح دہلی سے آزاد ہو کر خود مختار ہو جائے اور کل کو ان کا مدمقابل بن جائے۔ آپ نے اہل فرنگ کی امریکہ کے رواج غلامی کی تاریخ میں پڑھا ہو گا کہ جو دیسی غلامی سے آزاد شدہ تھے' وہی غلاموں پر زیادہ تشدد کرتے تھے اور ان کی آزادی کے دشمن تھے۔ اردو ادب کے باب میں اہل زبان فرقہ کی وہ پالیسی ہونی چاہیے جس کا رنگ امریکہ کی خود مختاری کے بعد سے اپنی نو آبادیوں کے متعلق انگلستان کے تمدن اور تدبر سیاسی کے کوائف میں نمایاں ہے۔ اس کا تازہ ترین ثبوت مجلس بین الاقوام یعنی لیگ آف نیشنز کے ووٹوں کا ضابطہ ہے۔ اس میں انگلستان نے کشادہ دلی یا خود غرضی نہیں بلکہ نہایت عاقبت اندیشی اور سیاسی دانشمندی سے آسٹریلیا اور کینیڈا وغیرہ حتیٰ کہ ہندوستان کو بھی برابر کا ایک ایک ووٹ کا حق دلوایا۔ دہلی میں اس دور اندیشی کی وجاہت تھی۔ اس نے پنجاب کی ترقیات اردو پر ہمدردی اور مسرت کا اظہار کیا۔ لکھنؤ اس سے عاری تھا۔ خواہ مخواہ مخالفت پر تل گیا۔

اس میں کوئی شکوے کی سزاوار بات نہیں۔ کوئی مقام یا خطہ کیوں نہ ہو جہاں کی مادری زبان اردو نہیں' ایسی ہر جگہ میں آپ کو مقامی خصوصیات ملیں گی جو آپس میں باعتبار نوعیت باختلاف ہمد گر متنازع فیہ

ہوں گے۔ کیوں نہ اسی قبیل سے پنجاب کے خصوصیات اردو کو بھی تصور کیا جائے۔ واقعات حاضرہ بیّن طور پر شہادت دے رہے ہیں کہ دنیا کی زبانیں اب اہل زبان کی چودھرایت کے تدغن سے نکل کر معقولیت کا پیرایہ پکڑتی جاتی ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہر کس و ناکس بیساختہ یہ کہہ اٹھے کہ نہیں اس کے معنی یہ ہیں اور ہم چونکہ اہل زبان ہیں لہٰذا ہمارا قول صحیح اور آپ کا غلط۔ میں اس کی تصریح کی غرض سے امپیریل لیجس لیٹو کونسل اور پنجاب کی کونسل کی روداد سے ایک ایک نظیر پیش کروں گا جن کا تعلق اسی مبحث سے ہے۔ دہلی کی کونسل میں ایک لفظ پر جو عالمانہ مباحث آنریبل سر جارج لونڈز اور آنریبل پنڈت منموہن مالوی کے درمیان ایک مسودہ قانون کی بحث کے دوران میں ہوا نہایت دلچسپ ہے۔ سر جارج نے لندن کی ایک قانونی رپورٹ سے یہ جملہ نقل کیا تھا:۔

"An application was made on the part of Fitzgerald in the court of Exchequer to set aside the verdict obtained against him by Mr Wright, which was dismissed with full cost."

اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

''ایک مرافعہ فٹز جیرلڈ کی جانب سے عدالت اکسچکر میں دائر کیا گیا۔ بدیں غرض کہ وہ حکم تعزیزی جو مسٹر رائیٹ نے اس کے خلاف حاصل کیا تھا مسترد کیا جائے۔ جو مع خرچہ کے خارج کیا گیا۔''

بحث لفظ "which....." یا "جو" کی ضمیر سے تھی کہ وہ کس کی طرف راجع ہے۔ آیا مرافعہ کی طرف یا حکم تعزیزی کی طرف۔ سر جارج پنڈت صاحب کو قائل نہ کر سکے اور میری یادداشت صحیح ہے تو یہ قرار پایا کہ اصل رپورٹ میں قرینہ اور ربط عبارت دیکھا جائے مگر وہ اس وقت اجلاس میں موجود نہ تھی۔ اس قسم کا دوسرا معاملہ تمبر 1913ء کے جلسہ پنجاب کونسل میں پیش آیا جبکہ آنریبل مسٹر شادی لال صاحب نے جو آج کل پنجاب کے چیف جسٹس ہیں' آنریبل سر مائیکل فنٹن کے آبکاری کے مسودہ قانون پر انشا اور اسلوب کے اغلاط کی بنا پر ایک نہیں دو نہیں سولہ اعتراض وارد کیے جو تسلیم کرنے پڑے۔ حالانکہ فنٹن صاحب اپنے وقت کے پنجاب کے سویلین جرگہ میں منشئے بے بدل تھے اور لونڈز صاحب لنڈن کے ہائیکورٹ کے نامی بیرسٹر اور گورنمنٹ ہند کے وزیر صیغہ قانونی تھے۔ اگر الہ آباد کا ایک ہندوستانی گریجوایٹ جو کبھی ہندوستان کے باہر نہیں گیا' لونڈز صاحب کی عبارت پر اور لاہور کے کالج کا ایک گریجوایٹ فنٹن صاحب کی انشا پردازی پر ایسے معقول اعتراض کر سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ پنجاب کے ایک ادیب اور شاعر کو یہ حق نہ ہو کہ وہ اہل زبان کے کلام پر اظہار رائے کر سکے۔

اب جو بات یہاں تک پہنچ گئی ہے تو میں اپنے پنجابی بھائیوں سے یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ وہ باوصف ہرامر کے اردو کے باب میں اس غلطی سے بچیں' جس کا شکار ہمارے لکھنوی بھائی ہوئے۔ یہ معاملہ ذرا تفصیل طلب ہے مگر میں اس سے متعلق اپنا ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالوں گا بلکہ چند اہل الرائے کے قول

نقل کروں گا۔ خواجہ حالی مرحوم اپنے ''مقدمہ شعروشاعری'' میں فرماتے ہیں:۔

''ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب دلّی بگڑ چکی اور لکھنؤ سے زمانہ موافق ہوا اور دلی کے اکثر شریف خاندان اور ایک آدھ کے سوا تمام نامور شعرا لکھنؤ ہی میں جا رہے اور دولت وثروت کے ساتھ علوم قدیمہ نے بھی ایک خاص حد تک ترقی کی' تو اس وقت نیچرل طور پر اہل لکھنؤ کو ضرور یہ خیال پیدا ہوگا کہ جس طرح دولت اور منطق و فلسفہ وغیرہ میں ہم کو فوقیت حاصل ہے' اسی طرح زبان میں فوقیت ثابت کرنے کے لیے ضرور تھا کہ اپنی اور دلی کی زبان میں کوئی امر مابہ الامتیاز پیدا کرتے...... خود بخود طبیعتیں اس بات کی مقتضی ہوئیں کہ بول چال میں ہندی الفاظ رفتہ رفتہ ترک اور ان کی جگہ عربی الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے...... اور یہی رنگ رفتہ رفتہ نظم ونثر پر بھی غالب آ گیا۔''

مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو جو نامی رسالہ ''اردو'' کے اڈیٹر اور حیدرآباد کے سررشتہ تعلیمات کے نامور افسر ہیں' ''انتخاب کلام میر'' کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:۔

''اب ایک سوال یہ باقی ہے کہ میر کی شاعری کا اثر ان کے (لکھنوی) ہمعصروں اور مابعد کے شاعروں پر کیا پڑا؟ اگرچہ میر صاحب کی خود ان کے زمانہ میں بے انتہا قدر ہوئی اور اب تک لوگ ان کی استادی کا لوہا مانتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ ان کے آخر زمانہ نیز مابعد کی شاعری پر میر کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ لکھنؤ کی شاعری کا رنگ بالکل جدا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل لکھنؤ جس کلام کی اس قدر دل سے داد دیتے تھے' اس سے وہ مطلق متاثر نہ ہوئے۔''

مولوی صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں:۔ ''لکھنؤ کی ممتاز خصوصیت تصنع اور تکلف تھی۔''

حضرت شوق نیموی اپنے بیش بہا رسالہ ''اصلاح'' میں جو 1887ء میں لکھنؤ کے قومی پریس سے شائع ہوا تھا' لکھتے ہیں:۔

''مانا کہ ع ہر گلے را رنگ وبوئے دیگر است اور بلند پروازی وجدت ایک عمدہ چیز ہے مگر مزے کے ساتھ ہو۔ غزل میں عشقیہ مضامین درد انگیز معانی، پاکیزہ خیالات، سلجھی ہوئی ترکیبیں، نکھری ہوئی بندشیں، دلکش الفاظ، چلبلے جملے۔ مربوط مصرعے، پھڑکتے ہوئے شعر ہونا چاہئیں۔ سابق زمانے سے اکثر دلّی والوں نے بیشتر ان امور کا خیال رکھا ہے۔ اس وجہ سے اس کو دلّی کا رنگ کہتے ہیں۔ میر و درد کا کلیات، تسیم دہلوی کا دیوان، داغ کا کلام دیکھو کہ کس قدر مقناطیسی اثر رکھتا ہے۔ لکھنؤ کے اگلے شعراء میں

سے صبا کی شیریں بیانی اور سحر کی سحر بیانی دتی والوں سے ملتی جلتی ہے اور اب تو اکثر لکھنؤ والوں نے اپنی طرز چھوڑ کر وہی رنگ اختیار کیا ہے۔"

گورنمنٹ ہند امپیریل گیزیٹر آف انڈیا' جلد دوم' میں ہندوستانی زبانوں اور دیسی بولیوں کے اعلیٰ ترین ماہر ڈاکٹر گریرسن کی زبان سے فرماتی ہے:۔

"متاخرین اردو شعراء میں سے جو دتی کے مقلد تھے' ولی محمد نظیر قابل ذکر ہے۔ اگرچہ وہ آگرے میں پیدا ہوا تھا..... اس کی تصانیف اس فارسیت سے پاک ہیں جس نے شعرائے لکھنؤ کی شاعری کا چہرہ بگاڑا۔"

"اہل زبان" جو ایک مرکب اضافی ہے' خواہ آپ اسے بامعنی قرار دیں یا مہمل لیکن کیا آپ یہ سن کر خاموش ہو جائیں گے کہ مدراس کے ایک پنجابی خواں شیخ نے یا فرید پور کے تین کوڑی بابو نے ایسی "ہیر" لکھی کہ فضل شاہ اور وارث شاہ کے ہم پلہ ہے۔ آپ یہ خود اندازہ فرمالیں کہ آپ کے دل کو اس وقت کیا احساس ہوگا۔ میں یہاں اہل زبان کا جھگڑا اٹھانے نہیں آیا ہوں۔ جو اصحاب مجھے جانتے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں مقامی تعصبات سے بالاتر ہوں، لیکن آپ ہی فرمایئے کہ اس کا کیا علاج کہ جب میں ٹھیٹ کی پنجابی بولتا ہوں تو حالانکہ وہ لفظ صحیح معنی میں اور محل مناسب پر بولا گیا ہے مگر اس کے سنتے ہی آپ ہنس پڑتے ہیں کیونکہ تیس سال آپ کا ہمسایہ ہونے کے باوجود بھی میں اس لفظ کا صحیح تلفظ ادا نہیں کر سکتا۔ وجہ کیا کہ میں جس گھر اور شہر میں پیدا ہوا وہاں پنجابی نہیں بولی جاتی ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ایک فن یا زبان کی پشتینی مزاولت اور ایک زبان کے مادری ہونے کا امتیاز سائنس جدید کی رو سے بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ کیا میں یہ کہنے کی مبادرت کروں کہ پنجابی میں بھی فصاحت کا معیار معین ہے، میں اصلی وڈی ہیر کی طرف اشارہ کروں گا۔ میاں محمد الدین دھڑیا ولی اس کتاب کے دیباچہ میں وارث شاہ اور فضل شاہ کی ہیر کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"لیکن جو شاعر اپنی عمر میں ایک ہی کتاب کو بار بار سوچ کر بناتا رہا ہو اور اس کی زبان کو مانجھ مانجھ کر صاف کرتا رہا ہو' قاعدہ کی بات ہے کہ وہ اس کی تصنیف جہانگیر منظوری اور عام مقبولیت حاصل کر کے رہتی ہے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"جس شاعر نے اپنی زبان میں محاورات و مصطلحات عوام کو خوب دل کھول کر بیان کیا ہو....."

اسی طرح اگر ہمارے ملک کی آبادی کے ایک حصہ نے پشت در پشت اپنا یہ مشغلہ رکھا ہو کہ زبان کو مانجھیں اور محاورات و مصطلحات کے صحیح استعمال کے طریقے قرار دیں تو وہ سچ مچ ہم سب کے لیے مایہ ناز ہونے چاہئیں۔ جس طرح سید وارث شاہ مرحوم پنجابی زبان کے باب میں ہیں۔ ایک زبان کا روزمرہ اور محاورہ ایسی چیزیں ہیں کہ اس شخص سے سیکھنی ہی پڑیں گی جس کی وہ مادری زبان ہے۔ صاحب "قاموس" کی نظیر آپ

کے سامنے موجود ہے۔ ہاں فن اور قاعدہ کے باب میں کسی کو کسی پر شرف حاصل نہیں۔ دہلی سمجھے گی کہ اس کی زندگی اکارت نہیں گئی۔ جب پنجاب کے گھروں میں پہلا لفظ جو بچہ کو سکھایا جائے گا' وہ اردو ہو۔

جن کو اہل زبان کہا جاتا ہے اور جو واقعی ہیں بھی، انہوں نے پنجاب سے سرد مہری کا سلوک کبھی نہیں کیا۔ داغ مرحوم ایک غزل میں فرماتے ہیں:۔

اہل کلکتہ سے لائق فائق

اہل لاہور ہوئے جاتے ہیں

(صفحہ 25' ضمیمہ یادگار داغ)

مولوی سید مقبول احمد صاحب الہ آبادی "ہمایوں" کے اسی نمبر میں جس کا آگے ذکر آ چکا ہے' لکھتے ہیں:۔

"شبلی اکاڈمی۔ مولانا شرر کا ذاتی مطبع وطن اور پیسہ اخبار کی ایجنسیاں انجمن ترقی اردو اور خواجہ حسن نظامی صاحب کا دفتر بالفعل اردو لٹریچر کی اشاعت کا مرکز ہیں۔"

آپ نے دیکھا کہ اردو کی اشاعت کے باب میں پنجاب کو دہلی اور لکھنؤ کے پہلو بہ پہلو رکھا گیا ہے۔

دسمبر 1908ء کے "مخزن" میں میرے فاضل دوست صدر جلسہ نے ایک تجویز اردو اکاڈمی قائم کرنے کی شائع فرمائی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس کا نام وضع کرنے میں بندہ بھی شریک تھا۔ یہ نام اردو سبھا قرار پایا۔ ساری اردو دنیا اردو کی ٹکسال اور اردو کے مرکز یا مرکزوں نے نہایت گرمجوشی اور خلوص دل سے اس تجویز کا استقبال کیا۔ متعدد اقتباس طول کلام کا موجب ہوں گے۔ میں اس جگہ لکھنؤ کے رسالہ "معیار" سے چند سطریں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ اردو کے متعلق ایک پنجابی تجویز کو کس طرح پذیرا کیا جاتا ہے:۔

"ہمارے مکرم دوست ایڈیٹر 'مخزن' کی مبارک تحریک و تجویز پر لکھنؤ یا دہلی کے علاوہ اور اہل کرم بھی کر ہمت مضبوط باندھ لیں تو بہت جلد یہ خارزار گلستان نظر آئے گا کسی جگہ اور کسی مقام پر کوئی متنفس ایسا نہیں جو فاضل بیرسٹر شیخ عبدالقادر صاحب کی اس بیش بہا تجویز کا تہ دل سے لبیک کہہ کر موید نہ ہو۔ ہم سب ہندوستان کے باشندے ہیں۔ ہماری زبان اردو ہے۔ واقعی لیڈر قوم مسٹر عبدالقادر صاحب کی یہ تجویز کہ اردو سبھا قائم ہو اور اس کے ذریعے سے زبان اردو کا پژمردہ باغ ہرا بھرا نظر آئے' آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔"

آپ نے دیکھا کہ کہیں مغائرت یا رشک کی نام کو بھی بو آتی ہے؟ اور پھر اس بات کو اٹھارہ بیس برس ہونے آئے' زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے اور اگر آج اردو سبھا ایک جیسی جاگتی ہستی نظر نہیں آتی تو اس کی جگہ آپ کی انجمن ارباب علم موجود ہے۔ آپ اس کے اراکین میں نواب حیدر یار جنگ، حضرت ناصر نذیر فراق دہلوی، مولانا شوق قدوائی لکھنوی اور حضرت شید دہلوی کے نام نامی پائیں گے۔ اگر ان حضرات کے

دل میں آپ کی طرف سے ...... کچھ بھی مغائرت یا استحقار کی بو ہوتی تو وہ کب آپ کے ساتھ مل کر اردو کی خدمت کرنے پر رضامند ہوتے۔

آج ایک اور بات جو آپ سے کہنی ہے یہ ہے کہ تنقید سے گھبرانا نہ چاہیے۔ میں اپنے دوستوں سے یہی کہا کرتا ہوں کہ جب تمہارے کلام کی تنقید کی جائے تو سب سے پہلے یہ دیکھا کرو کہ اس سے کیا کیا اور کہاں تک فائدہ اٹھا سکتے ہو۔

نواب حیدر یار جنگ طباطبائی اپریل اور مئی 1920ء کے مشترکہ "زمانہ" میں ادب الکاتب کے عنوان سے ایک نہایت دلچسپ مضمون لکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"میرے ایک دوست اہل زبان انگریزی و فارسی پڑھے ہوئے ہیں۔ میرے شاگرد بھی ہیں۔"

ان حضرت کی تحریر کی غلطیاں اور اصلاح پہلو بہ پہلو شائع کی گئی ہیں جن سے واقعی سبق لینا چاہیے۔ میں پھر عرض کروں گا کہ تنقید سے گھبرانا نہ چاہیے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھو کہ تمہارا نقاد کہاں تک تمہارے شکریہ کا مستحق ہے۔ یعنی اس کے اعتراض کہاں تک درست ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھاؤ اور باقی کو بھول جاؤ۔ نقادوں کو ہر کہیں برچھا سمجھا گیا ہے۔ انگریزی کے شاعر جیمس رسل لول نے ایک نہایت دلچسپ نظم میں نقادوں کی تنقید یا تضحیک کی ہے۔

اس کے آخری حصہ کے چند اشعار کا ترجمہ لطف سے خالی نہ ہوگا۔ تصرف اتنا ہی کیا گیا ہے کہ "جانسن کے تذکرہ شعرا" کی جگہ اپنے اردو کے شعرا کے تذکرہ "آب حیات" کا نام ڈال دیا ہے اور میر انیس کی ایک مشہور رباعی کے مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اسی سے اس انگریزی کے ترجمہ میں ہندوستانی ماحول پیدا ہو گیا۔ ملاحظہ ہو:

حصہ استعداد کا فطرت نے ہر اک کو دیا
جو ملا جس گوں کا اس سے کام ویسا ہی لیا
شاعری تصنیف کی ہے قابلیت جس سے دور
وہ بھی تنقیدی مضامین لکھ کے چھاپے گا ضرور
کچھ اِدھر سے کچھ اُدھر سے لے کر تنقیدیں کرے
زعم باطل بغض ذاتی اپنے شائع کر دے
اس طرح ہر طفل مکتب آج بن بیٹھا ادیب
ہیں رسالے اس کی شہرت کے لیے گویا نقیب
پڑھ کے جستہ جستہ اور بے سمجھے وہ "آب حیات"

دیکھنے لگتا ہے اپنے پیش پا کل کائنات
بے تکلف جس طرح سیٹی بجاتا ہے کوئی
یوں وہ کر دیتا ہے تنقید اک بڑی تصنیف کی
دھیان کب قول امیسی پر ذرا دیتا ہے وہ
پھول اور کلیاں ہٹا کر کانٹے چن لیتا ہے وہ
ایک ہے وقعت میں تعریض اس کی اور توصیف بھی
بلکہ ذم سے بڑھ کے ہے مدح و ثنا اس کی بری
ڈھائی چاول لیکن اپنے وہ بگھارے گا ضرور
اس پہ وہ لکھے گا تنقید اور لکھے گا ضرور
اس طرح بٹ کر بناتا ہے وہ اک محکم رسن
جس کے پھندے میں لٹک جاتا ہے خود وہ پرفتن
دیکھ کر کہہ اٹھتے ہیں سب برملا
بھائی یہ کر جگ ہے کرنی کا یہ دیکھو پھل ملا

خاتمہ پر ایک گذارش کروں گا اور وہ یہ ہے کہ قوم کی زبان بنانا یعنی اسے ہر پہلو سے ترقی دینا ایک انسان یا ایک جرگہ کا کام نہیں۔ اس کے لیے جمہور متعلقہ کے مساعی درکار ہیں۔ کام جو کرنا ہے وہ بے اصول توسیع کا نہیں بلکہ اس میں زبان کی تہذیب و تدوین بھی شامل ہے۔ اس کی علمی استطاعت میں ترقی کے ساتھ اس کی لطافت اور ترنم کا بھی لحاظ رکھنا ہے۔ الفاظ کے ذخیرہ اور محاسن ادبی کی بھی توقیر لازم ہے اور یہ بھی مدنظر رکھنا ہے کہ جو خوبیاں پہلے سے اردو میں موجود ہیں وہ کہیں زائل نہ ہو جائیں۔ اس کام میں پنجاب، دہلی اور لکھنؤ کے ساتھ مل کر ممتاز اور نمایاں حصہ لے سکتا ہے۔ اس میں انگریزی دان، عربی دان اور سنسکرت دان اہل زبان اور غیر اہل زبان سخن سنج اور ناظم و ناثر، علمی اشغال میں مصروف کار اور صاحب تخیل، صرفی اور فلسفی، سخن فہم اور نقاد و مبصر سب کے شریک کار ہونے کی ضرورت ہے۔

صاحب علم و فن و فہم و ادب ہیں درکار
باغ اردوئے معلیٰ میں تب آئے گی بہار

(در: ہزار داستان (لاہور) جلد 8 نمبر 1۔ جنوری 1926ء ص 3-24)

حافظ محمود شیرانی

پنجابی لٹریچر

(پروفیسر حافظ محمود شیرانی ہندوستان کی وہ مایہ ناز ہستی ہیں جن کو فارسی ادب سے متعلقہ تحقیقات مستشرقین عالم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ اب آپ نے اردو ادب کی طرف توجہ فرمائی ہے جیسا کہ ہم "مخزن" بابت ماہ جون 1927ء میں یہ اطلاع دے چکے ہیں۔ موصوف نے "پنجاب میں اردو" کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے اور اس میں اردو زبان کے مواخذ پر ایک زبردست تحقیقاتی نظر ڈالی ہے۔ یہ کتاب اردو کے ادبی حلقوں میں ہنگامہ خیز ثابت ہوگی کیونکہ اس میں آپ نے ناقابل تردید دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو زبان اصل میں پنجاب کی پیداوار ہے۔ گویا اس کا ماضی و مستقبل پنجاب ہی سے وابستہ ہے۔ یہ کتاب ابھی مطبع میں ہے۔ مگر پروفیسر صاحب نے ہمیں اس کا ایک باب 'پنجابی لٹریچر' "مخزن" سالگرہ نمبر کے لیے عطا فرمایا ہے............ایڈیٹر)

پنجاب اگرچہ میان داب کا ہمسایہ ملک ہے' لیکن رسم و رواج اور اوضاع و اطوار میں اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہندو اقتدار کے دور میں میان دابیوں اور پنجابیوں میں چشمک رہی ہے اور میان داب جو اپنے سنسکرت کے تمدن پر نازاں تھا' پنجاب کو ایک وحشی ملک تصور کرتا رہا ہے۔ مہابھارت اور پتنجلی کے بعض اشاروں سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے لوگ کسی باقاعدہ نظام کے ماتحت نہ تھے نہ ان کا کوئی بادشاہ تھا۔ وہ ہمیشہ جنگ و فساد میں مبتلا تھے۔ ان کے ہاں برہمن نہیں تھے۔ تمام پنجاب چھوٹے چھوٹے رئیسوں میں منقسم تھا جو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔ باشندے ویدوں کا احترام نہیں کرتے تھے اور نہ دیوتاؤں پر قربانیاں چڑھاتے تھے۔ وہ بالکل وحشی اور غیر مہذب تھے۔ شراب پیتے تھے اور ہر قسم کا گوشت کھانے کے عادی تھے۔ ان کی عورتیں قد و قامت کی بڑی [رنگ کی پیلی] اور اخلاقاً گندی ہوتی تھیں۔ کئی کئی شوہر رکھتی تھیں۔ ایک شخص کا وارث اس کا فرزند نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی بہن کا لڑکا۔ یہ بیانات دشمنوں کے قلم سے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ ان میں صداقت کا عنصر بہت کم ہو۔

بہر کیف اسلام کی آمد پر پنجاب کی حالت میں ایک انقلاب رونما ہوا اور اہل پنجاب حلقہ بگوش اسلام ہو کر دینی و دنیاوی ترقی کرتے ہیں۔

☆............☆☆............☆

ابھی مسلمانوں کو دہلی میں آباد ہوئے ایک صدی بھی نہیں گزرنے پائی ہے کہ ہم دہلی کے دربار میں پنجاب کے بعض مشاہیر امرا و فضلا دیکھتے ہیں۔ اگرچہ اس عہد کی تاریخ کے فقدان نے ہمارے لیے یہ امر ناممکن کر دیا ہے کہ کوئی مکمل بیان اس عہد کے مشاہیر پنجاب پر دیا جائے' لیکن یہاں میں بعض ایسے اسماء درج کرتا ہوں جو خاک پنجاب سے ہیں اور اتفاقیہ اس زمانے کی تاریخ میں ان کے نام مل جاتے ہیں۔

مشاہیرِ پنجاب

ساتویں صدی میں اگرچہ پنجاب دارالسلطنت ہند نہیں رہا تھا' تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب کے شہروں میں مقتدر ہستیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ مثلاً ملک عین الدین علی شاہ کوہ جودی۔ یہ بلبن اور کیقباد کے عہد میں امیر تھے۔ ملک تاج الدین کہرامی [اور ملک نصیر الدین کہرامی) اسی زمانے کے امراء میں داخل ہیں۔ سامانہ سے سید عزیز اور سید معین الدین ممتاز اور زہد و اتقا و علو نسب میں شہرۂ آفاق تھے۔ قاضی رکن الدین بھی سامانہ کے باشندے ہیں اور جید علمائے وقت میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا رکن الدین سنامی اور مولانا ضیاء الدین سنامی خلجیوں کے عہد کے علماء سے ہیں۔ مؤخر الذکر محکمۂ احتساب کے افسر تھے اور صوفیہ کے خلاف تھے۔ انہوں نے اپنی تصنیف یادگار چھوڑی ہے۔ مولانا علاء الدین لاہور کے باشندے اور اپنے زمانے کے ممتاز علماء میں محسوب تھے۔ قصور سے مولانا سراج الدین پیدا ہوتے ہیں جو فضل و کمال سے متصف تھے۔ ملتان میں شیخ بہاء الدین زکریا اور اُچہ [اجودھن] میں شیخ فرید الدین مشہور تر از آفتاب ہستیاں ہیں۔ ان کا خاندان علم و فضل تصوف و عرفان کے لیے صدیوں مشہور رہا ہے۔ اگرچہ مغلوں کے حملوں نے پنجاب کو عرصہ تک دم نہیں لینے دیا اور اس کی ترقی کی رفتار کو روک دیا' لیکن اسی نقصان سے پنجاب کو یہ فائدہ پہنچا کہ اس نے تین خاندان ہندوستان کو ایسے دیئے جنہوں نے تخت دہلی پر بیٹھ کر پورے دو سو برس تک حکومت کی۔ اس معاملہ میں ہندوستان کا کوئی صوبہ پنجاب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

پنجابی اور لہندا

ملک پنجاب کی زبان آج کل پنجابی کے نام سے منسوب [موسوم] ہے۔ امیر خسرو اس کو لاہوری کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ابوالفضل ملتانی کہتا ہے۔ مغربی مورخین نے شمالاً و جنوباً ایک خط کھینچ کر مشرقی مغربی پنجابی میں اسے تقسیم کر دیا ہے۔ مشرقی حصہ کی زبان کا نام پنجابی رکھتا ہے اور مغربی حصہ کی زبان کا نام لہندا۔ پنجابی کو وہ مغربی ہندی میں شامل کرتے ہیں اور لہندا کو بیرونی دائرے میں داخل کر کے سندھی اور کشمیری کا رشتہ دار مانتے ہیں۔ اہل پنجاب یہ فرق تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا بیان ہے کہ پنجابی اور لہندا ایک ہی چیز ہے۔ مغربی اور مشرقی زبان میں جو فرق ہے' وہ اصولی نہیں ہے بلکہ تدریجی اور ضلع ضلع کی مقامی خصوصیات کی بنا پر

پیدا ہوتا چلا گیا ہے اور یہ تقسیم ہر حال میں ناجائز ہے۔

پنجاب اگرچہ پانچ دریاؤں کا ملک ہے' لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ صوبے کی زبان انہی دریاؤں کے مابین محصور ہے بلکہ وہ ان دریاؤں سے چھلک کر دونوں طرف پھیل گئی ہے۔ اِدھر دریائے گھگر تک آ گئی ہے۔ اُدھر دریائے سندھ پار کر گئی ہے۔ ایک اہم مغربی عقیدہ یہ ہے کہ پنجابی زبان کی ہمسایہ ہندوستانی زبان جو مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے' ایک زمانے میں تمام مشرقی پنجاب پر پھیل گئی ہے اور اس صوبے کی اصلی زبان لہندا کو ہٹاتی ہوئی یا اس پر چھاتی ہوئی دریائے چناب تک پہنچ گئی ہے' بلکہ بعض اوقات اس کا اثر تھل تک محسوس ہوتا ہے۔ ہند میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سیاسی واقعات کا بہاؤ شمال سے زیادہ جنوب کی طرف رہا ہے۔ سیاسی واقعات نیز مغلوں کے دباؤ کے زیر اثر آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں بڑے بڑے گروہ پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی اور اس کے نواح میں آباد ہوتے رہے ہیں۔ بارہویں صدی میں سکھ پنجاب سے نکل کر اردو' بانگڑو اور بیکانیری علاقوں میں گھس جاتے ہیں۔ ان واقعات کے سامنے ہندوستانی زبان کے شمال کی طرف بڑھنے اور لہندا کو پیچھے دھکیلنے کا کوئی مناسب موقع نظر نہیں آتا۔

پنجابی کے مصنفین

پنجابی میں شعر و ادب ایک معتدبہ مقدار میں موجود ہے۔ جس کا اکثر حصہ مسلمان دماغوں کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ خواجہ مسعود سعد سلمان کے بعد پنجابی کے پہلے شاعر شیخ فریدالدین مسعودؒ متوفی 664 ہجری ہیں۔ سکھوں کا بیان ہے کہ وہ فریدالدین ابراہیم ہیں جو گرونانک کے معاصر ہیں۔ ان کے کلام کا کسی قدر حصہ اتفاق سے سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب میں محفوظ ہے۔ دوسرے شاعر گرونانک صاحب ہیں جن کا جپ جی سکھوں میں بہت مقبول ہے۔ شاہ حسین متوفی 1008 ہجری نے ایک کافی اپنی یادگاری چھوڑی ہے۔ پنجاب کے علماء نے بے شمار کتابیں اور رسالے اس نظر سے تصنیف کیے ہیں کہ مسلمان جماعت کا غیر تعلیم یافتہ طبقہ احکام دین' روزے' نماز اور مسائل شرعیہ سے ضروری واقفیت حاصل کر سکے۔ ایسی کتابیں اکثر اوقات مختصر نظم کی شکل میں ہوتی تھیں تاکہ لوگ آسانی سے یاد رکھ [کر] سکیں۔ جاہل طبقہ کے لیے یہ طریقہ تعلیم مسلمانوں نے ہندوستان کی باقی زبانوں میں بھی اختیار کیا ہے۔ پنجابی میں ایسی تالیف [تالیفات] کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ اگرچہ تحقیق معلوم نہیں کہ یہ سلسلہ کس زمانے سے شروع ہوتا ہے لیکن اس کے قدیم ہونے میں کوئی شک نہیں' کیونکہ اکبری عہد کی ایسی تالیفات اب بھی موجود ہیں۔ ان میں مولانا عبدی ابن محمد ساکن باتو کا "رسالہ مہندی" سب سے مقدم ہے جو 997ھ کی تصنیف ہے۔

نو سے ورہے ستانویں جاں گذرے وچ شمار
پچھے ہجرت مصطفیٰ تدن تہیا طیار

مولوی عبداللہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جو جہانگیر کے عہد سے شروع کر کے شاہجہاں کے آخر ایام تک برابر چالیس سال تک تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں۔ شرعیات ان کا میدان ہے اور اسی میں تمام عمر گذار دی۔ ان کی پہلی تصنیف ''تحفہ'' 1025ھ اور آخری کتاب ''خیر العاشقین'' 1065ھ میں ختم ہوئی۔ ''خلاصہ'' 1034ھ میں ''انواع العلوم'' 1044ھ میں۔ ''خیر العاشقین کلاں'' 1054ھ میں اور ''سراجی'' 1058ھ میں نظم ہوئیں۔ مولانا عبداللہ کے حالاتِ زندگی سے ہم ناواقف ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ انہوں نے علومِ دین اور فقہ کی زبردست خدمت کی ہے۔ مولوی عبداللہ کے مقلدین میں علاماں ناجی (غلاماں ناجی' کذا) اور درویش محمد ہیں۔ فقہی رسائل دونوں نے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ عادل بن درویش محمد نے ''مسائل فقہ'' لکھے۔ مولانا عبدالکریم نے 1086ھ میں ''نجات المومنین'' تصنیف کی۔ 1054ھ میں فقیر شاعر نے ''نور نامہ'' کو نظم کیا۔

عالمگیر کے عہد سے بچوں کی تعلیم کے لیے متعدد کتب نصاب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے' جن میں ذریعہ تعلیم پنجابی زبان ہے۔ کہرل رائے نامی نے 1105ھ میں ''ایزد باری'' اور امید نے 1106ھ میں ''اللہ باری'' تالیف کیں۔ ''فارسی نامہ'' عبدالرحمٰن بن محمد قاسم قصوری کی یادگار ہے۔ ''رازق باری'' اور ''واحد باری'' کا ذکر وارث شاہ علیہ الرحمۃ اپنی مثنوی ''ہیر و رانجھا'' میں کرتے ہیں۔ ''نصاب ضروری'' کے مالک خدا بخش ہیں۔ 1220ھ میں گنیش داس ''صنعت باری'' پر قلم اٹھاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب نے بچوں اور غیر تعلیم یافتہ گروہ کی تعلیم کا انتظام اور مقامات سے بہتر کیا تھا۔

نیم مذہبی تصنیفات میں احوال الآخرت' معراج نامے' نور نامے' وفات نامے' جنگ نامے وغیرہ قسم کی کتابوں کا بہت وسیع سلسلہ موجود ہے۔ طب میں بھی بعض کتابیں تصنیف اور بعض ترجمہ ہوئی ہیں۔ مثلاً دارالشفا' ترجمہ قانونچہ و مجرباتِ اکبری وغیرہ۔

قصص و افسانے کے سلسلے میں ہیر و رانجھا کا قصہ بے حد مشہور ہے۔ مقبل نے محمد شاہی عہد میں اور وارث شاہ علیہ الرحمہ نے 1180ھ میں اس افسانے کو نظم کر کے ایک غیر فانی شہرت حاصل کر لی ہے۔ ان کے مقلدین میں فضل شاہ نے زیادہ نام پیدا کیا۔ سوہنی مہینوال کے قصہ پر سید فضل شاہ' مشتاق رضا اور غمناک نے طبع آزمائی کی ہے۔ سسی و پنوں کو ہاشم' سید فضل شاہ' مولوی غلام رسول' احمد یار اور بوٹا نے علیحدہ علیحدہ نظم کیا ہے۔ فضل شاہ نے لیلیٰ مجنوں کی نظم لکھ کر اپنا نام کیا ہے۔ یوسف زلیخا کا قصہ پنجاب میں بہت مقبول رہا ہے۔ متعدد شعراء نے اس کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ مثلاً پیر اندتہ' محمد سعید اور مولوی غلام رسول لیکن سب سے قدیم عبدالحکیم کی یوسف زلیخا ہے۔ جو 1218ھ میں حلیہ نظم پہنتی ہے اور راقم السطور نے آئندہ اوراق میں اس سے بہت امداد لی ہے۔ عبدالحکیم اوچہ تحصیل احمد پور کے باشندے ہیں' جو بہاولپور کے علاقے میں واقع ہے۔ عبدالحکیم نے یہ مثنوی اپنے علاقے کی زبان میں جو ملتانی کے نام سے مشہور ہے لکھی ہے' اور نواب بہاول خاں

کے نام معنون کی ہے۔

صوفی شعراء میں حضرت بلھے شاہ متوفی 1171ھ اور علی حیدر متوفی 1191ھ شہرت خاص رکھتے ہیں۔ بلھے شاہ کی کافیاں صوفی حلقوں میں بے حد مقبول ہیں۔ پنجابی میں ''قصص الانبیاء'' اور ''شاہنامہ'' جیسی کتابیں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں۔ جنگ نامے پنجابی ادبیات کی ایک اور صنف ہیں، جن میں شہید کربلا اور ان کے متوسلین کی جنگوں کا ذکر ہے۔ ان میں مقبل کا جنگ نامہ سب سے قدیم ہے جو 29 جلوس محمد شاہی مطابق 1160-1159ھ میں لباس نظم پہنتا ہے۔ اس کے علاوہ بارہ ماسے اور سی حرفیاں پنجابی ادب کی خصوصی شاخ ہیں، جواب بالکل متروک ہیں۔ سی حرفی گجراتی اردو میں بھی ملتی ہے اور شاہ علی جیوگام دھنی کے ''جواہر اسرار [اللہ]'' میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظمیں بھی بارہ ماسوں کی طرح قدیم ہیں۔

(در: مخزن، سالگرہ نمبر، مارچ 1928ء، ص 10-14 'یہ باب'' پنجاب میں اردو'' میں بعنوان ''پنجاب'' موجود ہے، لیکن ان متون میں جو لفظی اختلافات پائے جاتے ہیں، ان کو خطوط وحدانی میں درج کر دیا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیرانی صاحب اس کتاب کی طباعت کے آخری مراحل تک مسودے میں ترمیم و تنسیخ کرتے رہے.....م۔ا۔ج)

حافظ محمود شیرانی

پنجاب میں اردو کی بعض قدیم تصنیفات

پنجاب کے ساتھ اردو کے تعلقات کی کہانی ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد سے شروع ہوتی ہے، جب کمپنی سیاسی اغراض کی بنا پر اپنے مقبوضات میں اردو کی ترویج واشاعت کی موید تھی بلکہ اس عہد سے بہت قدیم ہے۔ حضرت امیر خسرو اور ان سے متقدم محمد عوفی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کے مشہور شاعر خواجہ مسعود سعد سلمان (متوفی 515ھ) عربی وفارسی کے علاوہ ہندی زبان میں بھی صاحب دیوان تھے۔ ایک روایت سے، جس کے معتبر ہونے میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں، واضح ہوتا ہے کہ شیخ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ متوفی 664ھ، ہندی زبان میں جو اردو کا قدیم نام ہے، دوہرے لکھتے تھے۔ شیخ باجن متوفی 912ھ نے اپنی تالیف ''خزینہ رحمت'' میں آپ کا ایک دوہرہ نقل کیا ہے، جو یہ ہے:

سائیں سیوت گھل گئی ماس نربیا دیہ
تب لگ سائیں سیوساں جب لگ ہوسوں کھیہ

انہیں گنج شکرؒ کے اعقاب میں ایک اور بزرگ ہیں جو آپ کے ساتھ ہمنامی کے شرف کی بنا پر فرید ثانی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے دوہروں کا ایک مجموعہ سکھوں کے گرنتھ میں محفوظ ہے۔ فرید ثانی کے گرونانک کے ساتھ دوہروں میں سوال وجواب بھی ہوئے ہیں۔

پنجاب میں ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جو بطرز ریختہ لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے شیخ عثمان، شیخ جنید اور منشی ولی رام کے ریختے میری نظر سے گذرے ہیں۔ شیخ عثمان اور شیخ جنید عہد جہانگیری میں گذرے ہیں اور منشی ولی رام شاہجہاں کے عہد کے ایک صوفی منش بزرگ ہیں جو 1077ھ میں وفات پاتے ہیں۔ ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے دیوان ومثنویات فارسی کے علاوہ ایک دیوان ریختہ بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے۔

پنجابی کے بعد اردو بھی اس صوبے میں نصابی اور تعلیمی زبان رہی ہے۔ چنانچہ اردو کا مشہور نصاب ''خالق باری'' بھی باقاعدہ درس میں داخل تھا۔ وارث شاہ علیہ الرحمتہ اپنی تالیف ''ہیر رانجھا'' میں جو 1180ھ کی تصنیف ہے، اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح ''حمد باری'' بھی دیر تک یہاں کے مکتبوں میں رائج رہی ہے، جو اردو کا ایک اور نصاب ہے۔ جبکہ اردو نصابوں کی تقلید میں اس صوبے میں بھی اردو نصاب تیار کیے گئے

ہیں۔ان نصابوں میں سب سے مقدم ''فرح الصبیان'' ہے جسے لاہور کے شیخ اسحٰق لاہوری نے بعہد شاہجہاں 1057ھ کے قریب تالیف کیا ہے۔اس نصاب کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اردو نصابوں میں بلحاظ قدامت ''خالق باری'' کے بعد اس کا نمبر آتا ہے، لیکن ''فرح الصبیان'' سے زیادہ اہم اور دلچسپ وہ نصاب ہے جو 1207ھ میں لکھا جاتا ہے۔اس کا نام ''اللہ باری'' یا ''ذوق الصبیان'' ہے اور مولوی احسن اللہ لاہوری اس کے مصنف ہیں، لیکن اس کا ذکر آئندہ۔

جب اس صوبے میں اردو نصاب تیار کیے جا رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ اردو کی یہاں کافی ضرورت محسوس کی جاتی ہوگی۔ چنانچہ اس کے آثار قدیم تصنیفات کی شکل میں بھی ملتے ہیں۔ میری تلاش اور تفتیش سے، اور ظاہر ہے کہ ایک پردیسی کی تلاش چنداں بارآور نہیں ہو سکتی، ایک درجن کے قریب ایسی اردو تالیفات کا سراغ ملا ہے جن کے مصنف پنجابی ہیں۔ اگر خود اہل پنجاب اس تلاش کو جاری رکھیں تو مجھے یقین ہے کہ ایسی اور بیسیوں کتابوں کا پتہ لگایا جا سکتا ہے، جو پنجاب کی پیداوار مانی جا سکتی ہیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے قبل لکھی گئی ہیں۔ میں ذیل میں ان کا ذکر کرتا ہوں۔

1- مثنوی گلزار فقر از غلام محی الدین بن شیخ محمد یوسف

میرپور فی زمانہ گذشتہ صدی کے سیاسی خلفشار و انتشار کے باعث داخل کشمیر ہے، لیکن مغلیہ عہد میں داخل پنجاب اور سرکار گجرات میں شامل تھا۔ مثنوی ہذا 1131ھ میں لکھی جاتی ہے۔اس مثنوی کا موضوع جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے 'فقر و تصوف ہے۔ ہم مصنف کے حالات زندگی سے بالکل ناواقف ہیں۔ان کے بیان سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ صوفی اور صوفی زادہ ہیں۔ مثنوی ان اشعار سے شروع ہوتی ہے:

سنوں سادھو اک من کی بات   جس سیں پائی ذات صفات
کہے فقیر غلام محی الدین   دیندار کوں چاہیے دین
دیندار کوں دین پیارا   واری دین پہ عالم سارا
دیندار کا اوچا پایا   چوداں طبق میں اوس کی چھایا
توں کیا جانے دین کیا ہو   نس دن خواب غفلت میں سو
جس دن تس سب کچھ پایا   دھوتی انبر او سب مایا
جو کچھ ہے سو دین ہے دین   کیا دنیا جھوتی چرکین
دنیا لے کر دین نہ دیہ   موتین دے کر کھیہ نہ لے
دیکھ عالم کیا بہتا جاتا   توں دنیا سیں راتا ماتا
کہاں پیغمبر کہاں وہ پیر   کہاں وہ خان اور کہاں امیر

یہ عالم تم سوں بیگانا جس میں آخر تم کوں جانا
عقبیٰ میں ہے کام تمہارا جہاں ابد لکھ رہے پیارا
دنیا چھود عقبیٰ میں لاگ نیند چھوڑ کر نس دن جاگ

کتاب میں اخلاق وتصوف کے بعض مسائل بڑے اختصار کے ساتھ چھیڑے گئے ہیں۔ مثلاً صفائے قلب، علم وعمل، طہارت ونجاست، اطاعت پیر، نور محمدی، غوث اعظمؒ، فرائض صوفی اور توحید وغیرہ وغیرہ۔ زبان نہایت سادہ اور صاف ہے۔ مثنوی پر تبصرہ کا یہ موقع نہیں ہے اس لیے میں اس سے دست کش ہو کر خاتمہ کے اشعار نقل کرتا ہوں جو مصنف کے وطن وولدیت اور تاریخ تصنیف پر روشنی ڈالتے ہیں:

غلام محی الدین ایک فقیر جس کا حضرت اپ ہے پیر
قطب عالم تھا میرا باپ جس نیں دیا اپنا آپ
حق کی راہ میں سب کچھ دیا سب کچ دے کر حق کوں لیا
شیخ اجل اور عارف کامل قطب دین مکمل اکمل
شیخ محمد یوسف نام ہر کامل میں بیچ تمام
خاندان بدا ہے ککھر اصل نجیب اور نیکو گوہر
سب سلطان دیوان اور خان متشرع ہویں با ایمان
ان کے شہر میں رہن ہمارا تولد مسکن ازو کہارا
میرپور شہر ہے بیچ پنجاب حق راکھے دائم ان کی [آب]
یہ نسخہ جب بھیا تمام گلزار فقر کا کیا نام
تخمیناً یہ نیک کلام چار پہر میں بہی تمام
ایک تمیں برس ایک باراں سو ہجرت میں ہوے تھے نو
پیغمبر اور آل کرام لاکھ درود اورلاکھ سلام

''گلزارِ فقر'' اسی سال لکھی جاتی ہے جس سال دہلی میں بہ تتبع ولی دکنی ریختہ گوئی کی بنیاد پڑتی ہے۔ شاہ حاتم کے دیوان میں سب سے قدیم غزل کی جو تاریخ ہے وہ اسی سنہ سے تعلق رکھتی ہے۔

2- مثنوی رمز العشق از شاہ غلام قادر ابن شیخ محمد فاضل شاہ بٹالوی

میں اس مثنوی کے متعلق ''پنجاب میں اردو'' میں کسی قدر تذکرہ کر چکا ہوں۔ اس بیان کا یہاں دوہرانا نامناسب ہے۔ ہاں اس قدر عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''رمز العشق'' چونکہ حضرت فاضل شاہ بٹالوی کی زندگی میں لکھی جاتی ہے اس لیے ہمیں اسے 1151ھ سے قبل کی تصنیف ماننا ہوگا، جو ان کی وفات کا

سال ہے۔ پنجاب میں اس مثنوی کو نہایت اہمیت حاصل ہے اور مثنوی ''گلشن راز'' کی طرح، جس کے ساتھ بلحاظ مطالب و مضامین اس مثنوی کو اشتراک بھی ہے، بہت کچھ وقعت دی جاتی ہے۔ اس کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کی سات آٹھ مختلف شرحیں عربی، فارسی اور اردو میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے میں بعض کے ناموں کے ذکر پر قناعت کرتا ہوں:

(الف) شرح از شیخ ابو احمد محمد شاہ متوفی 1224ھ۔ یہ مصنف مثنوی کے پوتے ہیں اور اپنی شرح فارسی زبان میں لکھتے ہیں۔

(ب) بزبان عربی از مصنف صدر۔

(ج) اسرار العشق بزبان فارسی از سید حسن شاہ بٹالوی۔ اس کے علاوہ اس مصنف نے دو اور شرحیں لکھی ہیں جن کی تفصیل مجھے معلوم نہیں ہوئی۔

(د) شرح اردو از حافظ انور علی رہتکی جو (الف) کا ترجمہ ہے۔

(ہ) شرح اردو از خلیفہ محمد بخش۔

(و) اسرار العشق مسمی بہ کنز العشق بزبان اردو از شمس الدین فاضلی بٹالوی۔ طبع امرتسر 1341ھ۔

یہ شرح سید حسن شاہ کی تینوں شرحوں پر مبنی ہے۔

بٹالہ اب داخل ضلع گورداس پور ہے، لیکن قدیم زمانہ میں وہ خود ضلع تھا اور پنجاب کے مردم خیز شہروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ سجان رائے مصنف ''خلاصۃ التواریخ'' اور شاعر مشہور مرزا انور العین واقف اسی شہر کے متوطن ہیں۔ شاہ غلام قادر کا نام اردو کے حامیوں کی فہرست میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ ان کی وجہ سے بارہویں صدی ہجری کے وسط میں شہر بٹالہ میں اردو کا دبستان قائم ہوتا ہے، جس میں متعدد اصحاب یعنی شیخ نصیر الحق، شاہ مراد اور محمد جان وغیرہ حصہ لیتے ہیں اور اردو میں نظمیں لکھتے ہیں بلکہ مصنف مثنوی کے والد حضرت محمد فاضل الدین جو بانی سلسلہ فاضلیہ ہیں' خود اس تحریک کے حامیوں میں سے ہیں۔

(3) اردو کی تحریک جو درگاہ فاضلیہ سے اٹھی اور پروان چڑھی' نتائج کے لحاظ سے خاصی کامیاب معلوم ہوتی ہے۔ ''رمز العشق'' کے بعد ہم ایک اور مثنوی سے دوچار ہوتے ہیں، جو عاجز بٹالوی کی یادگار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب نے اس عہد میں دلی و دکن سے اپنے ادبی تعلقات قائم کر لیے ہیں۔ اس عہد کے موضوعات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے لوگ سید بلاقی، ولی اورنگ آبادی، سراج دکنی، شاہ آبرو، فغان و اشرف وغیرہ کے دواوین و تالیفات کا بڑے ذوق و شوق کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں، جس طرح نظامی، سعدی، خسرو اور حافظ شیراز کا مطالعہ جاری ہے۔ اسی طرح ''فقہ ہندی'' جو 1074ھ کی تالیف ہے اور سید بلاقی کا مولود نبی۔ تصنیف 1067ھ اور محمد افضل کے بارہ ماسے کو یہاں کمال ذوق کے ساتھ پڑھا جا رہا ہے۔ ان تالیفات کے متعدد نسخے نوشتہ پنجاب میری نظر سے گذر چکے ہیں۔

عاجز بٹالوی سیف الملوک اور بدیع الجمال کے قصہ کو نظم کا جامہ پہنا دیتا ہے۔ میں عاجز کے زمانہ سے ناواقف ہوں مگر بارہویں صدی ہجری کے اواخر یا نصف کم میں اس کو جگہ دی جا سکتی ہے۔ اس مثنوی کی زبان صاف نہیں ہے اور ہمیں اس کو عاجز کا ثمر خام کہنا چاہیے۔ اس میں پنجابی اثر کافی نمایاں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عاجز پنجاب سے باہر نہیں نکلا اور نہ اردو پر اسے پوری قدرت حاصل ہے۔ تاہم ہمیں اس کی کوشش کو بنظر تحسین دیکھنا چاہیے۔ مثنوی کی ابتدا ہے:

کروں یاد میں حق کوں شام و پگاہ
محمد نبی ہے ہمارا گواہ

اس کی زبان اور وزن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے عہد کی یادگار ہے جب پنجاب میں دبستان دہلی پورا پورا اثر انداز ہو چکا ہے۔ پہلی دونوں مثنویاں ہندی وزن میں تھیں۔ ان کی زبان پر بھی قدامت غالب ہے۔ عاجز کی مثنوی کا فارسی وزن ہے اور زبان غرابت سے خالی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سامنے ہندوستان کی تالیفات موجود ہیں۔

سبب تالیف میں عاجز کا بیان ہے کہ میرے دوست مجھ سے مستدعی ہوئے کہ قصہ سیف الملوک کو ہندوی زبان میں لکھ دو۔ اگرچہ یہ قصہ فارسی زبان میں موجود ہے مگر فارسی ہر شخص نہیں جانتا۔ تم اگر ہندوی زبان میں کرو تو ہر شخص سمجھ سکے گا۔ بٹالہ میں اب تو تم ہی شعر و شاعری میں مشہور ہو اور ہمارے لیے تو خاقانی و انوری ہو۔ نہ تمہارے سوائے کوئی اور شخص نظر آتا جو اس کام کو سرانجام دے سکے' اس لیے ہم تم سے التجا کرتے ہیں۔ الغرض میں نے اپنے دوستوں کا التماس قبول کیا اور قصہ کی نظم میں مصروف ہو گیا۔ میں اس بیان کے صرف ضروری اشعار درج کرتا ہوں:

حقیقت سنو میری منظور کر
سناتا ہوں میں سبکوں مذکور کر

عجائب ہے یہ عشق کی واردات
نہ ہو گی سنی آگے اس طور بات

مرے دوستدار اور مشفق رفیق
مجوز ہوئے مجھ سیں اوہر طریق

ہماری لگے کہنے کچھ عرض ہے
قبول اوسکا کرنا تمہیں فرض ہے

کہ یہہ قصہ عشق سیف الملوک
نیا ہندوی میں لکھو کر سلوک

اگر فارسی میں یہ مذکور ہے
ہر اک کی سمجھ سے ولے دور ہے

اگر ہندوی میں کرو تم اوسے
جو مجمن موں ہر اک کی آوے بسے

تمہارے بغیر اب نکو اور ہے
بٹالہ میں تیرا تو اب دور ہے

کہ مانند خاقانی و انوری
تو مشہور ہے در سخن پروری

توقع ہے ہمکوں تری ذات پر
جو قصہ کہینگا تو اس بات پر

غرض کہنا یاروں کا بھاری لگا — جگر موں سخن ہو کٹاری لگا
لیا مان کہنا رفیقوں کا میں — نہ مکھہ مورا آن سبھ شفیقوں کا میں
اسی وقت لیکن قلم کوں بدست — کیا عشق نامہ کا میں بندبست
گر اس میں کوئی سہو ہو یا خطا — اوسے تھا کیو تم بذیل عطا
مرے عیب پر ہو جیو عیب پوش — برا بولنے میں رہو تم خموش

میرے پاس جو نسخہ ہے وہ 1260ھ میں لاہور میں لکھا گیا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ کمپنی کی آمد سے پہلے پنجاب میں یہ قصہ مقبول رہا ہے۔ مصنف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اردو زبان، جسے وہ ہندوی کے نام سے یاد کرتا ہے، پنجاب میں عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔

اگر ہندوی میں کرو تم اوسے
جو بجن موں ہر اک کے آوے بسے

(4) اس موقع پر مجھے ایک کتاب ''گنج شہیداں'' کا ذکر کرنا چاہیے جو غلام محمد غوث بٹالوی کی تصنیف ہے۔ ایک غوث بٹالوی کا ذکر ''پنجاب میں اردو'' میں آتا ہے جو بٹالہ میں جے سنگھ کے فرزند گوربخش سنگھ کی فوجداری میں ملازم تھا اور جس نے سنہ 1198ھ (م 1783ء) میں گوربخش سنگھ کا مرثیہ بزبان اردو لکھا ہے۔ (صفحہ 273-277، پنجاب میں اردو)

''گنج شہیداں'' کا یہ نسخہ پروفیسر فیض الحسن ایم اے بٹالوی، پروفیسر فارسی، فیروز پور کالج کی مہربانی سے مجھ تک پہنچا ہے، جس کے لیے میں پروفیسر ممدوح کا تہ دل سے احسان مند ہوں۔ بقول مصنف اس نسخہ میں تیرہ ہزار اور آٹھ سو ابیات ہیں۔ کتاب ماہ ربیع الاول میں شروع ہوئی اور دوسری ذی قعد کو سات مہینے اور گیارہ دن میں ختم ہوئی۔ بدقسمتی سے مصنف نے سال تصنیف نہیں دیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

یہ قصہ پُرغم و پُرسوز و پُرساز — کیا تھا ربیع الاول میں یہ آغاز (کذا)
کی میں نے جگر خواری شب و روز — پس از رنج و مشقت محنت و سوز
بتاریخ دوم در ماہ ذیقعد — کیا آخر ختم یہ قصہ سعد
مہینے سات میں اور روز یاراں — کہا جانو اس قصہ کوں یاراں
ہزاراں سیزدہ اور ہشت صد ہے — یہ سب نسخہ کی بیتوں کا عدد ہے
کیا حق نے میرا مقصود حاصل — ہویا با محنت اس نعمت سے واصل
خرد اپنی سے برقول سعیداں — رکھا نام اس کا میں گنج شہیداں
نہ تھی طاقت اگر مجکوں سخن کی — ہوئی لاکن مدد یہ پنج تن کی

اگرچہ مصنف کے پُرگو ہونے میں کوئی شک نہیں مگر اس نے اپنے حالات کے متعلق اس تالیف

میں سکوت سے کام لیا ہے۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام غلام غوث ہے اور نام کی رعایت سے تخلص غوث ہے۔ وہ اپنے آپ کو حسینی اور حیدر پرست کہتا ہے:

حسینی مذہب ہم حیدر پرستم　　غلام قنبرم ہر جا کہ ہستم
غلام غوث کوں ان کی غلامی　　ہوئی حاصل بزرگی سے مدامی

یہ تالیف یقیناً فارسی ماخذ پر مبنی ہے۔ چنانچہ مصنف خود کہتا ہے:

کتاب فارسی سے دیکھ مذکور
کیا ہندی میں اس قصہ کوں مشہور

ایک حیران کن امر یہ ہے کہ اس کتاب پر ایک مہر ہے جس پر ''سری صاحب سہائے 1118'' اور ''51'' مرقوم ہے۔ یہ 51 جلوس عالمگیری ہے جو 1118ھ کے مطابق ہے مگر میں اس مہر سے یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ یہ نسخہ عہد عالمگیری کی تالیف ہے۔ میرا خیال ہے کہ مہر بعد میں کسی نے کتاب پر چسپاں کر دی ہے۔

(5) اب میں بٹالہ کے مصنّفین سے فارغ ہو کر اردو کے ایک اور حامی احسن اللہ لاہوری احسن تخلص کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ یہ ہدایت اللہ ابن عنایت اللہ مہر کن کے فرزند ہیں۔ آبائی پیشے مہر کنی کے ساتھ انہوں نے کتابت اور معلمی کو بھی ملا لیا ہے۔ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ 1196ھ میں وہ ایک ضخیم لغت ''مفتاح الاقواہ'' جو سترہ اٹھارہ ہزار ابیات پر مشتمل ہے، ختم کرتے ہیں۔ 1207ھ میں وہ ایک اردو نصاب تیار کرتے ہیں جس کا نام ''اللہ باری'' یا ''ذوق الصبیان'' ہے۔ اس نصاب کی زبان گذشتہ تصنیفات کے مقابلہ میں نہایت شگفتہ اور رواں ہے۔ ملا صاحب اردو کے متعلق فرماتے ہیں کہ بچے اس آسان زبان کو شوق کے ساتھ خوشی خوشی پڑھتے ہیں:

یہ آساں اور ہندی بولی　　لڑکوں کو ایک کھیل ہے کھلی
خوشی خوشی پڑھتے رہتے ہیں اوسکو　　چشم و سر اوپر دھرتے ہیں اوسکو
ذوق الصبیاں نام رکھا ہے　　سال اوس ''در باغ'' کہا ہے

اس نصاب سے ایک اقتباس ذیل میں عرض ہے:

بجن دوست ہے یار خلیل　　تھوڑا اندک کم و قلیل
بہتا بیش بس و بسیار　　فزوں زیادہ وافر دار
فیل اور پیل اور مکنا ہاتھی　　ہمدم ہمرہ بیلی ساتھی
سنگ و سنگت قافلہ کارواں　　سوداگر تاجر بازرگاں
پتھر سنگ رتن ہے جوہر　　مروارید موتی در و گوہر

مربع چورس گرد ہے گول ۔ نرخ بہا اور قیمت مول
اجر و اجرت مزد و مزدوری ۔ روغن گھیو ملیدہ چوری

ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ جب پنجاب میں اہل پنجاب اردو کے نصاب از خود تیار کر رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ یہاں کے لوگوں کو اردو کے ساتھ بہت کچھ ارتباط ہوگا۔

(6) 1213ھ میں مُلّا احسن اللہ، عقائد و فرائض اسلام پر ایک تالیف بزبان اردو لکھتے ہیں۔ ''بخشائش'' اس تالیف کا سال تاریخ ہے اور ''بخشائش نامہ'' نام ہے:

جو ہے ذکر بخشش میں یہ قیل و قال ۔ تو ''بخشائش'' اس کا ہے تاریخ سال
ہے بخشش نامہ رکھا اوس کا نام ۔ کہ ہم عاصیوں کو ہے بخشش سے کام

''بخشائش نامہ'' کی زبان نہایت صاف اور سلیس ہے۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ مُلّا صاحب جو کبھی پنجاب سے باہر نہیں گئے اور اردو زبان انہوں نے پنجاب میں بیٹھ کر سیکھی ہے، اپنے شگفتہ اسلوب بیان سے ان کی کتاب آج بھی ہمارے لیے دلچسپی کے سامان رکھتی ہے۔ مُلّا صاحب فرماتے ہیں کہ اگرچہ ہندی زبان میں مجھ کو شعور نہیں ہے اور نہ میں کبھی ہندوستان گیا ہوں۔ ایک دوست کی فرمائش سے میں نے یہ کتاب لکھ دی ہے۔ فقر و تصوف پر اور زبانوں میں کافی تالیفات دستیاب ہوتی ہیں لیکن اردو زبان اس سے خالی ہے۔ اس خیال سے میں نے اس زبان کے باغ میں پودا لگا دیا:

نہ تھا گرچہ ہندی میں مجھ کو شعور ۔ کہ لاہوری بدھو ہوں سدھ بدھ سے دور
نہ ہندوستان میں پہونچا کبھو ۔ نہ اس بوستان کی لیتی مینے بو
پہ ایک دوست کا مان حکم و رضا ۔ جو دیکھا سنا بارے جیوں تیوں کہا

ہندوستان کے شعرا کی طرف ایما کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جو پہونچا ہے اوس باغ سے کوئی پھول ۔ تو گئیں بلبلیں اپنی بولی کو بھول
کہاں بلبلوں کی ہزاراں صدا ۔ کہاں قمریوں کی صدا خوش ادا
کہاں عندلیباں شیریں سخن ۔ کہاں بذلہ گویان نمکیں دہن
کہاں شاعران وہ صاحب شعور ۔ ہر ایک بیت ان کی چو قند و نبات
بھلا اب کہاں یہ بیچارہ حقیر ۔ سوا خبر حاضر نجانے فقیر
ہے ہر چند پر گو یہ لاہوری غول ۔ مغل دیکھے پر فارسی جائے بھول
نہ کچھ شعر کا ہے شعور و شعار ۔ سو اشعار اپنے سے ہے بلکہ عار
اگرچہ وہاں پھول ہیں رنگ رنگ ۔ گل فقر سے پر ہیں وہ باغ تنگ
جو دیکھا یہ گل ہے جہاں اور کہاں ۔ بجرب و عجم کیا یہاں کیا وہاں

بترکی و کشمیری و فارسی | نہ عاری ہے اس رو سے کوئی آدمی
بہر خاک یہ پھول و پھل ہے لگا | یہاں تک جو پنجاب میں بھی اوگا
یوہیں دل میں آیا کہ یہ کیا ہے بات | نہ اس گل کا ہو وہاں کوئی پھول پات
جو یہ بات آئی مرے دل میں بس | تو ان باغوں کی کر کے ریس اور ہوس
بنایا میں یہ باغ لاہور میں | اوی طرز میں اور اوی طور میں
لگایا ولے اس میں در ہر محل | گل فقہ اورفقر کا پھول پھل

(7) حضرت مراد شاہ کئی تصنیفات کے مالک ہیں۔ دیوان کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں ان کی یادگار ہیں۔ ہندوستان میں کئی سال رہنے کی بنا پر ان کی زبان بالکل صاف ہوگئی ہے۔ 1196ھ میں ایک منظوم خط یاران وطن کو لکھتے ہیں جو "نامہ مراد" کے نام سے موسوم ہے اور نامی صاحب کی کوشش سے چھپ بھی گیا ہے۔ اس خط میں اردو کی مقبولیت کے سلسلہ میں مراد شاہ فرماتے ہیں:

وہ اردو کیا ہے یہ ہندی زباں ہے | کہ جس کا قائل اب سارا جہاں ہے
کلام اب تجھ سے میں ہندی زباں میں | کروں شہرت ہوتا سارے جہاں میں
کہ اب وسعت میں اس کی سب سخنداں | سمند طبع کو کرتے ہیں جولاں
لطافت یہ نکالی ہے اسی میں | کہ فرماتے نہیں کچھ فارسی میں
اسی کا شہرہ اب ہو جائے سب تک | یہاں سے تا بایراں بل عرب تک
خصوصاً شعر اب شاعر یہاں کے | نہیں کہتے بجز ہندی زباں کے
غرض ہندی کا یہ چرچا یہاں ہے | کہ شعر فرس مطعون زماں ہے
یہ شہرت ہے اب اس مضمون ترکی | نہ کوئی فارسی پوچھے نہ ترکی

1214ھ میں شاہ مراد اپنے شاگرد حکیم علیم اللہ کی فرمائش پر قصہ چہار درویش کی نظم پر مصروف تھے بلکہ ایک حصہ نظم بھی کر چکے تھے کہ پیام اجل آ پہنچا اور عین عالم شباب میں 1215ھ میں اس جہان فانی سے رحلت کی۔

(8) 1204ھ میں مثنوی "سرِ مکنون" غالباً بہ تقلید "رمز العشق" لکھی جاتی ہے۔ اس میں ایک ہزار سے زائد ابیات ہیں اور سرخیوں کی جگہ دوہرے لائے گئے ہیں۔ فقیر اللہ اس کے مصنف ہیں۔ خاتمہ سے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

فقیر اللہ کیا کہی بات | سرمکنون ہے شاہ کی ذات
شاہ ہمارا شاہ ہمارا | کل عالم کا سرجن ہارا
سرمکنون کے سن کوں جان | یعنی عدد "چراغ" پہچان

سرِ مکنون کوں کیا تمام | شاہ جیلانی کا لے کر نام
علی ولی کا ہے وہ پوت | جس کی منزل ہے لاہوت
ہے وہ سید عبدالقادر | ظاہر باطن اول آخر

(9) مثنوی گلریز از حافظ مرتضٰی ولد محمد خاں شہاب الدین زئی خویشگی قصوری

مصنف نے اس مثنوی میں، جو 1206ھ میں ختم ہوئی ہے، ضیا نخشبی کے فارسی افسانہ ''گلریز'' کا خلاصہ اردو نظم میں کیا ہے۔

ابتدا: خدایا خدائی ہے لائق تجھے
خاتمہ: یہ ہے مرتضٰی دل سوں تیرا غلام
لطف را کھ اپنا تو نس دن مدام

یہ مثنوی میری نظر سے نہیں گذری ہے۔

(10) مثنوی چمن سیر عرف قصہ مرغ زریں از احمد سرہندی

میرے پاس جو نسخہ ہے، ابتدا سے ناقص ہے۔ خاتمہ میں ناظم قصہ کتاب کا نام اور تاریخ تصنیف بدین الفاظ بیان کرتا ہے:

ہوئی تیار جب اتمام باخیر | رکھا میں نام اس کا اب چمن سیر
ششم تاریخ تھی کیا نیک دن ہاں | مبارک تھا مہینہ ماہ رمضاں
کوئی پوچھے کہ سن ہجری پیغمبر | جو باراں سو سے تھے وہ تیس اوپر
ہوا شاعر مجھے جو دلپسندی | مصنف اوسکا ہے احمد سرہندی
پڑھے کوئی سنے لایو نہ تم دیر | دعا کچھ مرے حق میں بے تاخیر

''چمن سیر'' کی زبان جدید ہے اور اجنبی و نامانوس الفاظ سے پاک ہے، لیکن اس میں کافی خامیاں نظر آتی ہیں۔ ناظم کو اردو پر قدرت نہیں ہے۔ نمونہ کے واسطے میں چند شعر یہاں درج کرتا ہوں، جو شہزادہ حسین کی کنویں سے رہائی کے بیان میں آتے ہیں:

مجھے دے ساقیا یک جام پر لب | نکلتا کوئیں سے اب ماہ نخشب
روایت لاتے ہیں پیران کامل | خبر دیتے ہیں شہزادہ کے قائل
کہ جب سے بھائیوں نے کوئے میں ڈالا | کیا دہپر (کذا) ستم جگ سے نرالا
ہوئے چالیس دن کوئے کے اندر | نہ تھا محرم کوئی جز ذات اکبر

جو کچھ تدبیر ہوتی ہے بشر کی | جو کچھ تھا آذقہ و پر گزر کی
ہوا جب آذقہ مصروف آخر | رہا وہ سات دن بھوکا سراسر
جو دن ساتوں میں کچھ کھانا نہ پایا | وہ آخر کو تو جان کندن میں آیا
نہ رہی تھی وس میں کچھ جینے کی باقی | ولے تھی یک رمق وہیں حیاتی
جو پہنچی آن اس کی نیک ساعت | ہوئی رب کی خلاصی پر ارادت
جیسے پھرتے تھے سب دیواں یکایک | وہ آگے آ گیا کواں اچانک

(11) ''واردات'' تحسین کی ایک نظم ہے جس میں ایک سو چھتیس اشعار ہیں۔ یہ نظم چار چار ہم قافیہ مصرعوں کے بندوں میں منقسم ہے اور بخط مصنف نوشتہ ذی قعدہ 1236ھ میرے پاس ہے۔ نظم میں شاعر نے اپنے ایک سفر کا ذکر کیا ہے جو اس نے میر پور میں اپنے ایک دیوان زادہ شاگرد سے ملنے کے لیے، جس سے اس کو ملازمت ملنے کی امید تھی، اختیار کیا ہے۔ وہ اپنے وطن سے پیادہ پا چل کر تکلیفیں جھیلتا ہوا تیسرے دن چاشت کے وقت میر پور پہنچتا ہے اور سیدھا اپنے شاگرد کے ہاں، جو ایک با اختیار رئیس ہے، جاتا ہے۔ لالہ صرف زبانی خاطر مدارت اور آؤ بھگت سے کام لیتے ہیں۔ چاشت سے عصر کا وقت آ جاتا ہے، اس نے جھوٹ موٹ کو بھی کھانے کے لیے نہیں پوچھا۔ رات بغیر کھانے سے بسر ہوتی ہے۔ دوسرے دن وہ اپنے ایک ملاقاتی عبدالودود نامی سے ملتا ہے جو شاعر کو اپنے گھر لے جا کر کھانا کھلاتا ہے۔ میر پور میں اس وقت میر بھاون نامی ایک مشہور اولیاء اللہ ہیں۔ تحسین زیارت کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ وہ آنے کی تقریب پوچھتے ہیں، یہ بتاتے ہیں، شیخ مسکرا کر حافظ کا شعر پڑھتے ہیں کہ:

گفتہ بودی کہ شوم مست و دو بوسہ بدھم

مقصد یہ تھا کہ دیوان زادہ کی طرف سے کسی قسم کی توقع رکھنا بڑی غلطی ہے۔ ایک دن شاعر پھر دیوان زادہ کے ہاں جا نکلتا ہے۔ لالہ زبانی سلام واحترام تو بہت بجالاتا ہے، لیکن آب وطعام کا آج بھی ذکر نہیں آتا۔ آخر لالہ کہتے ہیں کہ مجھے کسی غرض سے آپ کے وطن ہی طرف جانا ہے۔ اگر آپ چلنے کو آمادہ ہیں تو آپ کی سواری کے لیے گھوڑا تیار ہے۔ تحسین تفصیل کے ساتھ اس گھوڑے کی مذمت کرتا ہے اور بادل نخواستہ اس پر سوار ہوتا ہے۔ شام تک لنگرائی پہنچتا ہے اور دق آ کر گھوڑے کو چھوڑ دیتا ہے۔ دوسرے دن سفر میں گزار کر تیسرے دن ہمارا شاعر بخیریت اپنے وطن پہنچ جاتا ہے۔ یہ واقعات ہیں جن کو تحسین واردات میں بیان کرتا ہے۔ اس نظم کی ابتدا ہے:

ایک صاحبزادہ دیوان کے تھے استاد ہم

نمونہ کی غرض سے میں چند اشعار اس نظم کے یہاں درج کرتا ہوں:

میر بھاون شاہ کا مدت سے تھا شوق جمال
تھے وہ اپنے عہد کے کامل ولی اہل کمال
ایک مسجد میں ہویا بالاتفاق اونکا وصال
مہرباں ہو کر کیا اپنے کرم سے قیل و قال
پھر کہا آمد کا اپنی اب کرو موجب عیاں
عرض کی میںنے کہ ہے کب بر دل روشن نہاں
ڈالے ہے گردش جہاں پر سفلہ پرور آسماں
ہنس کے یوں کہنے لگا خامش! ہوا مطلب عیاں
حاکم اس جاگا کے پاس آئے ہو جو قسمت سو لو
شعر حافظ کا پڑھا یہ کہہ کے شاہ نیک خو
تم کہا تھا دونگا دو بوسہ و لیکن مست ہو
وعدہ آخر ہو چکا ہم نے اک دیکھا نہ دو
دل میں بیشک اوسکے سننے سے ہوا مجھ کو یقیں
شاخ آہو پر برات عاشقاں واصل نہیں
یہ سفر قسمت میں تھا اور دیکھنی تھی یہ زمیں
اب قضائے آسمانی سے نہ کیجے دل غمیں
بیٹھ کر دو ساعتیں خدمت میں باحکم ادب
دست بوس شاہ کر تب میں ہویا رخصت طلب
قصہ کوتہ مخلص اپنے آگے در ہنگام شب
کر دیا ظاہر یکایک روز کا احوال سب

(12) رحمت شیریں و فرہاد کے قصہ کا ناظم ہے، جو ہندی بحر میں لکھا گیا ہے۔ نو دس شعروں کے بعد بند کے طور پر تمیز کے لیے ایک دوہرا لایا گیا ہے۔ اس کی زبان پنجابی، اردو اور برج ملی جلی ہے، رحمت، پوری اپنا وطن بتاتا ہے جہاں جگدیو کا استھان ہے۔

(13) مثنوی فتح الرمز جو غالباً پنجاب کے مشہور صوفی حضرت شیخ نور محمد کی، جو شاہ سلیمان تونسوی کے پیر ہیں، تالیف ہے اور سنہ 1250ھ میں ختم ہوتی ہے۔ اس کی زبان اردو اور پنجابی آمیز ہے۔

(14) رنجیت سنگھ اور کمپنی کے دور کا ایک سیالکوٹی شاعر ہے، جس کا تخلص ''عشق بیچ'' یا ''بیچ'' ہے۔ اس کا دیوان میرے پاس موجود ہے، جس میں غزلیات کے علاوہ ایک واسوخت، چند مناقب، مخمس اور

رباعیاں ہیں۔ اس کے زمانے کا پتہ ان بعض تاریخوں سے چلتا ہے، جو آخر دیوان میں درج ہیں۔ مثلاً راجہ رحم اللہ رجوی والا کی تاریخ وفات سنہ 1263ھ اور تاریخ تولد فرزند مہر و طوائف 1263ھ۔ ایک دو موقعوں پر شاعر نے اپنے استاد فرید کا نام بھی لیا ہے۔ ''عشق پیچہ'' کے ہاں اگرچہ کوئی جدت اور بلند خیالی نظر نہیں آتی اور زبان کے عیب بھی پائے جاتے ہیں تاہم وہ اس دبستان کا جو دہلی اور لکھنؤ کے نام سے مشہور ہے، ایک کامیاب مقلد ہے اور غالباً پنجاب میں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے، جس سے ہم واقف ہیں۔ میں بخوف طوالت نمونہ کلام دینے سے احتراز کر کے صرف دو شعروں پر قناعت کرتا ہوں:

پلٹن میں سے تیر افگنوں کی
مژگاں بھی تو ایک کمپنی ہے
خط سمجھو نہ گورے منہ پہ اس کے
کالے لوگوں کی چھاؤنی ہے

یہ فہرست سنہ 1131ھ سے لے کر 1265ھ تک کے پنجابی مصنفین و تصنیفات پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں صرف انہی لوگوں کو شامل کیا ہے، جو صاحب تصنیف کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ اس فہرست میں ان لوگوں کو نہیں لیا گیا ہے جنہوں نے تفریحاً اردو میں گاہے گاہے سخن سرائی کی ہے اور جن کا کلام اس عہد کی بیاضوں میں ملتا ہے۔ اگر ایسے لوگوں کو شامل کر لیا جاتا تو فہرست نہایت دراز ہو جاتی۔ ان اردو گویوں میں ہم پنجاب کے بعض محترم اشخاص کا نام بھی دیکھتے ہیں مثلاً غنیمت کنجاہی، دلشاد پسروری، حضرت وارث شاہ مصنف ''ہیر رانجھا''، شیخ موسیٰ جن کا کلام نہایت پُر تاثیر ہے۔ فقیر نور الدین و عزیز الدین جو رنجیت سنگھ کے عہد میں مدار المہام تھے۔ ایسی بیاضیں کثرت سے ملتی ہیں جن میں ان اردو سرایوں کا کلام ملتا ہے۔ اگر تمام کا جائزہ لیا جائے تو ایک علیحدہ کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔

اس مضمون کے متعلق ہمارے پاس صرف دو ذریعہ معلومات ہیں۔ پہلا ''پنجاب میں اردو'' جس میں ایک پورا باب اسی اطلاع کا حامل ہے۔ دوسرا ایک سیر حاصل مضمون جو قاضی فضل حق ایم اے، پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور نے فروری 1933ء کے ''اورینٹل کالج میگزین'' میں سپرد قلم کیا ہے، لیکن یہ مضمون ابھی تک بہت تشنہ ہے اور اس سلسلے میں تحقیقات کی کافی گنجائش ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی سنہ 1846ء میں جو 1262ھ کے مطابق ہے، پنجاب پر قابض ہو جاتی ہے۔ اس عہد میں اردو کو پنجاب میں سرکاری حیثیت مل جاتی ہے، لیکن یہاں ایک اور امر، جو نہایت ضروری گزارش طلب ہے، یہ ہے کہ موجودہ صوبائی تقسیم کی رو سے، جس پر کمپنی کے زمانہ سے عملدر آمد ہے، ہمیں پنجاب میں درحقیقت اردو کے دو دبستان ماننے پڑیں گے۔ ان میں ایک دبستان کا ذکر آ چکا ہے، دوسرا دبستان ہریانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ فی زمانہ ہریانہ کا اطلاق ایک محدود خطہ زمین پر ہوتا ہے، لیکن میں نے اپنی سہولت کی غرض سے

ان مقامات کو بھی ہریانہ میں شامل کر لیا ہے، جو قدیم زمانہ میں تقریباً سرکار دہلی میں داخل تھے۔

ہریانہ میں گیارہویں صدی ہجری سے دیسی زبان میں ہم ایک نئی تحریک دیکھتے ہیں جس کے آثار عالمگیر کے عہد سے ہمیں ملتے ہیں۔ میں اس تحریک کے متعلق کوئی تفصیلی اطلاع تو نہیں دینا چاہتا اس لیے کہ یہ کام دراصل جائزہ اردو کی دہلی شاخ سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اس خیال سے کہ چونکہ سرکاری و دیگر لسانی رپورٹیں ہریانی میں عام طور پر کسی قسم کے لٹریچر کے وجود سے لاعلمی ظاہر کرتی ہیں، میں سطور ذیل کا اضافہ مناسب خیال کرتا ہوں۔

ہریانی زبان کو جٹو، بانگڑو وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس زبان کی سب سے قدیم تالیف، جس سے ہم دوچار ہوتے ہیں، شیخ عبداللہ انصاری پانی پتی کی "فقہ ہندی" ہے، جو سنہ 1074ھ میں بہ عہد عالمگیر لکھی جاتی ہے:

فقہ ہندی کو موموناں آؤ زباں پر یاد
مسلہ آوے دین کا مول نہ ہووے فساد
سن ہزار چوہتر بیچ رمضان تمام
اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا نظام

یہ کتاب ہندوستان و پنجاب و گجرات میں کافی مقبول رہی ہے اور بمبئی میں "رسالہ عبدو" کے نام سے چھپ بھی چکی ہے۔ میر عبدالواسع ہانسوی اسی عہد میں اپنا نصاب سہ زبان، جو "حمد باری" و "جان پہچان" کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے، تالیف کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہریانی زبان کی ایک لغت، جو اردو کی قدیم لغت مانی جا سکتی ہے، تصنیف کرتے ہیں۔ اس لغت کا نام "غرائب اللغات" ہے۔ خان آرزو اپنی اصلاحات کے ساتھ اسی لغت کی ایک جدید اشاعت تیار کرتے ہیں۔

اسی زمانہ میں ہم محمد افضل کی "بکٹ کہانی" یا "بارہ ماسہ" سے دوچار ہوتے ہیں۔ افضل کو مختلف لوگوں نے مختلف نسبتوں سے یاد کیا ہے۔ کوئی اس کو جھنجھانوی، کوئی پانی پتی اور کوئی نارنولوی بیان کرتا ہے۔ افضل کا بارہ ماسہ پنجاب و ہندوستان میں نہایت مقبول و معروف ہوا۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں اس کی قبولیت کا ذکر کرتے ہیں۔

اس کے بعد ہمیں جعفر زٹلی کا نام لینا چاہیے، جس کا کلیات اپنی گنگا جمنی اردو اور فارسی کے لیے مشہور ہے۔ اکرم رہتکی اپنا تیرہ ماسہ سنہ 1143ھ میں ختم کرتا ہے۔ محبوب عالم ساکن جھجھر متعدد تصنیفات کے مالک ہیں۔ ان میں سے "محشر نامہ" اور "مسائل ہندی" ہندی وزن میں ہیں۔ "نور نامہ" اور "درد نامہ" فارسی وزن میں ہیں۔ ان کے علاوہ ایک دیوان دوہرہ جات ہندی بھی ان کی یادگار ہے۔

شیخ عبدالحکیم (1187ھ) "دہیز نامہ بی بی فاطمہ" اور "خواب نامہ پیغمبر" کے مصنف ہیں۔ بسل

تھانیسری کئی منظوم مذہبی رسالے لکھتے ہیں۔ ان کے بعد ہریانہ دیستان میں سب سے زیادہ مشہور مصنف شیخ محمد رمضان بھی ہیں، جن کی "آخرگت" اور "بلبل باغ محمد" نظم میں اور "عقائد عظیم" نثر میں ہیں۔ ان کے علاوہ کئی اور چھوٹے چھوٹے رسالے ان کے قلم سے نکلے ہیں۔ مثلاً "نصیحت نامہ" اور "رنگیلی" وغیرہ۔

شاہ غلام جیلانی ریختی متوفی 1235ھ "چوپائیوں" کے مالک ہیں۔ فنی اعتبار سے یہ چوپائیاں ایک نہایت بلند پایہ شاعری کی حامل ہیں۔

نواب فیض محمد والی جھجھر سنہ 1814ء و 1835ء کی سرکار میں ایک شاعر شیخ غلام نبی نارنولوی تھے جن کی تصنیفات سے ایک "راگ مالا" مشہور ہے۔ کسی زمانہ میں ایک اور بزرگ غلام حسین چشتی بھی بیان کیے جاتے ہیں۔ ایک راگ مالا ان کی طرف سے بھی منسوب ہے۔

اس مضمون پر مفصل اطلاع کے لیے "اورینٹل کالج میگزین" کے نمبر 27 اور 28 ملاحظہ کیجیے جو نومبر سنہ 1931ء و فروری سنہ 1932ء کو شائع ہوئے ہیں۔

(در: اورینٹل کالج میگزین شیرانی نمبر جلد 56: 3، 4 (شمارہ مسلسل 222 - 223) ص 1-10)

حافظ محمود شیرانی

محمد شاہ کے عہد میں پنجابی جفت فروشوں کے فساد پر بے نوا سنامی کا مخمس

سنام[1] فی زمانہ ریاست پٹیالہ میں ایک معمولی قصبہ اور ریلوے سٹیشن ہے، لیکن مسلمانی روایات میں اپنے علماء و فضلاء و شعرا کی بنا پر کسی قدر شہرت کا ملک ہے۔ سنام کا ذکر غالباً پہلی مرتبہ عثمان مختاری غزنوی کے ایک قصیدے میں آتا ہے۔ جب مسعود ثالث (492ھ و 508ھ) اس کے قریب کوئی نیا قلعہ فتح کرتا ہے۔ حوالہ شعر ذیل میں آتا ہے:

خبر رسید کہ اندر نواحیٔ سنام
سر حصارے کو داشت با ستارہ قران

عمید سنامی یہاں کا مشہور شاعر ہے۔ ''عرفات العاشقین'' ''منتخب التواریخ'' اور ''گل رعنا'' میں اس کا نمونہ کلام محفوظ ہے۔ وہ ان شعرا میں سے ہے جو امیر خسرو سے پیشتر اس ملک میں گزرے ہیں۔ اس کا سال ولادت 601ھ ہے۔ ضیا سنامی تین مشہور ضیاؤں میں سے ایک ہیں جو آٹھویں صدی ہجری میں گزرے ہیں۔ ''نصاب الاحتساب'' ان کی مشہور تالیف ہے۔ عنایت اللہ سنامی ''احکام الموتی برای مردم سکنہ سنام'' تالیف کرتے ہیں۔ یہی قصبہ بے نوا کا وطن ہے۔ محمد شاہ کے ابتدائی دور میں بے نوا سنام سے دہلی آتا ہے۔ اپنی خوش طبعی اور شاعری کی بنا پر یہاں کے لوگوں میں اچھا اثر پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ نووارد ہے مگر قبول عام حاصل کر لیتا ہے۔ بے نوا کا ذکر ''نکات الشعرا'' ''مخزن نکات'' ''طبقات الشعرا'' از قدرت اللہ شوق ''تذکرہ میر حسن'' ''چمنستان شعرا'' اور ''تذکرہ گلزار ابراہیم'' میں ملتا ہے۔ ان میں سے میر قائم اور شوق کے بیانات ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔

میر صاحب کہتے ہیں کہ مجھے اس کا حال تحقیق معلوم نہیں۔ محمد شاہ کے عہد میں سنکرن[2] جوہری نے کسی جوتے فروش کو قتل کر دیا تھا، اس پر بلوہ ہو گیا۔ جوتے فروشوں نے جامع مسجد میں جا کر خطبہ روک دیا۔ ظفر خان روشن الدولہ[3] نے کہ طرہ باز کر کے مشہور ہے، جوہری مذکور کو پناہ دی۔ آخر بڑا فساد ہوا اور امرائے عظیم

میں جنگ ہوئی۔ طرفین سے بہت آدمی مارے گئے۔ ظفر خاں تاب نہ لاکر بھاگ نکلا۔ اس واقعے سے امیر موصوف کو اس قدر خفت ہوئی کہ مدت العمر گھر سے باہر کبھی قدم نہ رکھا۔ اس قصے کو شاعر مذکور نے ایک مخمس میں نظم کر دیا ہے جو اب تک لوگوں کی زبان پر ہے۔

قائم کہتے ہیں' بے نوا کسی گمنام شاعر ساکن قصبہ سنام کا تخلص ہے، جو شوخ چشم اور ظریف تھا، کبھی کبھی لطیفے کے طور پر بدیہہ شعر کہتا تھا۔ محمد شاہ کی سلطنت کے ابتدائی ایام میں دہلی آیا اور ہر شخص سے، جو قابل ملاقات تھا، ملا۔ ایک روز مجلس مشاعرہ میں وارد ہوا، میاں مبارک آبرو نے اس کی طرف توجہ نہ کی، کچھ دیر کے بعد جب ملاقات ہوئی، بولا "میاں آبرو! آپ اپنے مخلصوں سے اس قدر تغافل کرتے ہیں گویا کبھی تین آنکھ نہ ہوئے تھے"۔ چونکہ آبرو کے ایک آنکھ نہ تھی' یہ لطیفہ بہت باموقع ثابت ہوا اور حاضرین جلسہ خوب ہنسے۔ الغرض اپنے عہد کا تحفہ انسان تھا۔

قدرت اللہ شوق نے میر صاحب کے بیان کی نقل کے علاوہ اس میں کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔ کہتا ہے مجھے اس کا حال تحقیق معلوم نہیں، محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں جن کا لقب اب فردوس آرام گاہ ہے، سبھ کرن جوہری نے کسی چرمینہ فروش کو ہولی کے دن قتل کر ڈالا، اس پر عام بلوہ ہوگیا۔ جفت فروشوں نے جمع ہو کر جامع مسجد میں خطبہ نہ ہونے دیا۔ نواب ظفر خاں روشن الدولہ نے، طرہ باز خاں جن کا لقب تھا،، جوہری مذکور کو پناہ دی۔ نواب وزیر الممالک قمر الدین خاں بہادر جفت فروشوں کے طرف دار تھے، بالآخر بڑے امرا میں زبردست فساد ہوا، طرفین کے بہت لوگ مارے گئے اور تمام مسجد خون سے بھر گئی۔ ظفر خاں کثرت پاپوش زنی کی تاب نہ لاکر بھاگ گیا۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:

آں چہ بر فرق ظفر خان ازخدا افتادہ است
من چہ گویم معنی آن پیش پا افتادہ است

شاعر مذکور نے اس قصے کو ایک مخمس میں نظم کیا ہے، جو اب تک لوگوں کی زبان پر ہے۔

میر صاحب کی طرح پہلا اور آخری مخمس شوق نے بھی نقل کر دیا ہے، لیکن میر صاحب کے ہاں پہلے مخمس کا دوسرا مصرع یوں ہے:

مریخ پر جو تیز کی خنجر کی اپنے دھار

شوق نے "مریخ پر" کی جگہ "مریخ پھر" تحریر کیا ہے اور یہی صحیح ہے۔ یہ غلطی طباعت کی معلوم ہوتی ہے۔

بے نوا کے نمونہ کلام میں "تذکرہ گلزار ابراہیم" میں دو شعر ملتے ہیں:

تم ہو بوس و کنار کی صورت
میں ہوں امیدوار کی صورت
بے نوا ہوں زکوۃ حسن کی دے

او میاں مالدار کی صورت

(صفحہ 65)

صاحب تذکرہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ شعر ایک بیاض میں خان آرزو کے نام پر بھی دیے ہیں، میں اضافہ کرتا ہوں کہ آخری شعر قائم اور میر حسن نے بے نواہی کی طرف منسوب کیا ہے۔

جوتی فروشوں کا فساد محمد شاہ کے عہد کا ایک مشہور واقعہ ہے۔ اکثر کتب تاریخ میں اس کا مذکور آتا ہے، لیکن میں اپنی نارسائی4 کی بنا پر اصل تاریخوں کے بیانات قلم بند کرنے سے معذور ہوں۔ اس کی تلافی میں ولیم ارون کی تالیف "لیٹر مغلز" کی ایک عبارت کا ترجمہ دیتا ہوں، جس میں واقعہ مذکور کسی قدر تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ مگر یاد رہے کہ ارون ہندوستان کی آئی سی ایس جماعت سے تعلق رکھتا ہے جس کا نقطہ نظر عموماً نوکر شاہی اور سرکاری ہوا کرتا ہے۔ یہ جماعت ہر چیز کو حکومت کی عینک سے دیکھتی ہے۔ ارون پرانے تاریخی واقعات کے سلسلے میں بھی جو اس کے عہد سے دو سو سال قبل گزرے ہیں، اپنی روش خاص بدل نہ سکا۔ چنانچہ مسلمانوں کے ذکر میں، جیسا کہ انگریزوں کا عام دستور ہے، چوٹیں کرنے اور چٹکیاں لینے کا موقع نہیں چھوڑتا، طعن اور استہزا سے بھی کام لیتا ہے۔ اس جذبے کو میں نے اپنے ترجمے میں بڑی حد تک دبا دیا ہے۔

ارون ایک معتبر اور محتاط مصنف ہونے کے باوجود بعض بازاری مصنفین کی دھوکے بازی کا آسان شکار بن گیا ہے، چنانچہ جعفر زٹلی کے حالات جو اس نے ہندوستانی سپیکولیٹر کے رسالہ زر کامل عیار سے دیے ہیں، بالکل بے سروپا اور غیر تاریخی ہیں۔ سطور آئندہ میں ارون کا بیان دیا جاتا ہے۔

از لیٹر مغلز تالیف ولیم ارون، جلد دوم، باب دہم، صفحہ 257، فصل 84۔ دہلی کے جفت فروشوں کا بلوہ۔

محمد شاہ بادشاہ (1131ھ و 1161ھ) کے گیارہویں سال جلوس میں جوتے فروشوں کے بلوے کو اس عہد کی تمام تاریخوں میں ایک قابل لحاظ جگہ دی گئی ہے۔ مسلمانوں کے ادنیٰ طبقے کے عام دستور کے مطابق ماہ شعبان کا نصف اول طرح طرح کے تیوہار اور خوشیاں منانے میں بسر کیا جاتا ہے۔ ان میں قابل ذکر شبرات5 ہے جس میں چراغاں کرتے ہیں اور آتش بازی گلی کوچوں میں چھوڑی جاتی ہے۔ اس مہینے کی آٹھویں تاریخ کی شام کو ایک صراف سبھکرن نامی جس کا شاہی محلات سے تعلق تھا، حافظ خدمت گار6 خاں خواجہ سرا، داروغہ جواہرات خزانہ، کے مکان سے اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ یہ شخص ایک عرصے سے نواب روشن الدولہ پانی پتی کے خاص آدمیوں میں تھا اور اس کی امداد سے اس کو کوئی منصب بھی مل گیا تھا۔ نیز خانساماں شاہی کے ماتحت اس کو کوئی بڑا عہدہ بھی ملا ہوا تھا۔ اس کا گھر جوہری بازار کے عقب میں واقع تھا، جہاں پہنچنے کے لیے سبھکرن کو جفت فروشوں کی دکانوں سے جو چوک سعد اللہ خاں میں تھیں، گزرنا تھا۔ یہ جفت فروش سب کے سب پنجابی تھے اور ان کی دکانیں بڑی تعداد میں تھیں جو سڑک کے دونوں طرف کھڑی تھیں۔ یہ سب سب متعصب قسم کے مسلمان تھے اور اپنی عبادات کے سختی سے پابند تھے۔ ان کے بوڑھے بڑے باوقار اور سن

رسیدہ معلوم ہوتے تھے۔ ان کی ڈاڑھیاں لمبی اور لباس ستھرا تھا۔ ان میں سے اکثر حافظ قرآن تھے اور محراب سناتے تھے۔ جب منشی سبھکرن کی پالکی وہاں پہنچی، اس وقت ہندو اور مسلمان آتش بازی چھوڑنے میں مشغول تھے۔ جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے، اتفاق سے ایک ہوائی جوہری کی پالکی میں جا گری جس سے اس کے درباری لباس میں سوراخ پڑ گیا۔ جوہری کے ملازمین نے جوار دلی میں تھے، دکان داروں کو سخت سست کہا۔ اس پر دونوں جماعتوں میں مار پیٹ تک نوبت پہنچ گئی۔ جوہری کے نوکر مسلح تھے اور موچیوں کے پاس ان کی رانپیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ چونکہ زیادہ تعداد میں تھے، انہوں نے ایک سپاہی کی ڈھال اور تلوار چھین لی۔ سبھکرن طیش کی حالت میں اپنے گھر پہنچا اور اس آدمی کو جس کی ڈھال اور تلوار چھین لی گئی تھی، دشمنوں سے بدلہ لینے کی غرض سے فوراً واپس بھیجا۔ رات کے وقت دوستوں کی ایک جماعت کے ساتھ یہ شخص جوتے فروشوں کے محلے میں پہنچا۔ ایک نوعمر لڑکا ان کے ہاتھ آ گیا جس کو مارتے مارتے انہوں نے ادھ موا کر ڈالا۔ لڑکے کی چیخیں سن کر ایک بوڑھا آدمی حاجی حافظ اپنی چارپائی سے اٹھ کر ننگے پاؤں دوڑا آیا اور لڑکے کو بچانے میں تلوار کا زخم کھا کر مارا گیا۔ حملہ آور حاجی کو اسی جگہ چھوڑ کر جہاں وہ گرا تھا، اپنے گھر چل دیے۔ صبح کے وقت تمام موچی اور ان کے پیچھے تمام شہری لاش کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے قسم کھائی کہ جب تک قاتل اور قاتل کے آقا کو ان کی بداعمالی کی سزا نہیں ملے گی، وہ میت دفن نہیں کریں گے۔ تمام ادنیٰ طبقے کے مسلمان ان کے شریک ہو گئے۔ اب انہوں نے لاش کو گاڑی پر ڈالا اور دین دین کے نعرے لگاتے سبھکرن کے دروازے پر پہنچ گئے۔ راتوں رات سبھکرن نے شیر افگن خاں[7] پانی پتی خانساماں شاہی کے ہاں جو اس کا افسر تھا، پناہ لی۔ یہ جوہری جیسا کہ اس سے قبل اشارہ ہو چکا ہے، روشن الدولہ ظفر خاں کا متوسل تھا جس کے ساتھ شیر افگن خاں کی رشتے داری بھی تھی۔ ہم وطنی اور رشتے داری کی بنا پر دونوں سردار ایک دوسرے کے دلی دوست تھے۔ شیر افگن خاں ایک اور طاقتور سردار لطف اللہ خاں صادق کا چھوٹا بھائی بھی تھا۔ ان دو وجوہ سے کہ (1) پناہ گزین اس کا ماتحت تھا اور (2) دوست خاص کا متوسل تھا، شیر افگن خان نے گناہگار کو بلوائیوں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا، بلکہ شد و مد کے ساتھ اس امر کی تردید کی کہ مجرم اس کے گھر میں موجود تھا۔ مردے کو سبھکرن کے گھر پر چھوڑ کر یہ انبوہ بہ غرض داد خواہی شاہی محل کی طرف روانہ ہوا۔

محمد شاہ بادشاہ اپنی والدہ قدسیہ بیگم کی معیت میں باغ جعفر خاں کی سیر سے واپس آ رہا تھا، جیسے ہی قریب پہنچا، بلوائیوں کے ہجوم نے فریاد کی اور انصاف انصاف کے نعرے لگائے۔ بادشاہ نے نزدیک بلا کر ان کی رام کہانی سنی اور قمر الدین خاں وزیر کو حکم دیا کہ سزاول بھیج کر مجرم کو جہاں کہیں موجود ہو، گرفتار کرا لے۔ شیر افگن خاں نے جس کے ہاں مجرم پناہ گزین تھا، تعمیل حکم سے صاف انکار کر دیا۔ جمعرات کا دن اس حالت میں ختم ہوا۔

جمعے کے دن 11 شعبان 1141ھ (11 مارچ 1729ء) کو جوتی فروشوں نے شہر میں جلوس نکالا اور مسلمانوں کو دین کی حفاظت کے واسطے عام دعوت دی۔ جامع مسجد دہلی محل اجتماع قرار پائی۔ جمعے کی نماز کے وقت تک مسجد کا وسیع صحن آدمیوں سے کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ فریادیوں نے مسجد کی محراب و منبر پر اس طرح قبضہ کرلیا کہ نہ امامت کی جاسکتی تھی اور نہ خطبہ ادا ہوسکتا تھا۔ ان میں پیش پیش عرب، حبشی اور قسطنطنیہ کے ترک تھے جو رومی خان سے متعلق تھے، نیز سید عرب علی خان بغدادی کے تابعین میں سے تھے جو شاہی توپ خانے میں حیدرقلی خاں سابق میر آتش کے عہد سے ملازم تھے۔ یہ لوگ غیر مسلح ہونے کے باوجود سرغنہ بن گئے اور حلقہ باندھ کر منبر کے قریب آگئے۔ نمازی رکوع و سجود نہ کر سکے، امام جماعت نہ کرا سکا، قاضی کی جس کو کافر کا طرفدار بتایا گیا، گھونسوں اور مکوں سے تواضع کی گئی۔ نہ تلوار چلی نہ خونریزی ہوئی مگر قاضی اور اس کے فرزند پر اس قدر گھونسے اور لاتیں پڑیں کہ دونوں قریب المرگ ہوگئے۔ خطیب کو منبر سے اتار کر زمین پر گرادیا اور اتنا پیٹا کہ بے ہوش ہوگیا۔ فساد کی اطلاع قلعہ معلی میں پہنچی، شاہی حکم سے وزیر اور روشن الدولہ[8] اپنی اپنی فوج کے ساتھ ہنگامہ فرو کرنے کے لیے بھیجے گئے۔ سب سے پہلے وزیر پہنچا جو اپنی جماعت کے ساتھ مسجد کے شمالی دروازے سے داخل ہوا۔ اس نے مسلمانوں کے ساتھ ہر قسم کے وعدے کیے اور اپنی چرب زبانی سے فی الوقت قاضی اور اس کے عملے کو مار پیٹ سے بچا لیا، لیکن اس جلیل القدر امیر کی ملاقات نے بلوائیوں کو اپنی انتقامی جدوجہد میں اور بھی مضبوط کر دیا۔ بدقسمتی سے عین اس موقع پر نواب روشن الدولہ اپنی فوج کے ساتھ مسجد کے شرقی دروازے سے نمودار ہوا جس سے بادشاہ سلامت داخل ہوا کرتے تھے۔ اس کی فوج زیادہ تر جاہل افغانوں پر مشتمل تھی جنہیں اپنی بہادری پر بے حد ناز تھا۔ یہ لوگ خورجہ، سکندرہ اور دہلی کے دیگر پرگنات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے افسر شاہجہاں پور، مئو، شمس آباد، فرخ آباد (ہندوستان کا افغانستان) اور تھانیسر (واقع سرکار سرہند) کے رہنے والے تھے۔ جنوبی سمت سے شیر افگن خاں نمودار ہوا جس نے مقتول کے ورثا کو خون بہا لینے پر راضی کرنے کی کوشش کی تھی اب یہ سن کر کہ وزیر اور روشن الدولہ پہنچ چکے ہیں، اپنی مسلح جماعت کے ساتھ جو ہندوستانیوں پر شامل تھی، آموجود ہوا۔ مسجد میں ہجوم کی زیادتی روکنے کے خیال سے روشن الدولہ نے اپنے افغانوں کو تمام دروازے بند کر دینے کا حکم دیا۔ روشن الدولہ اور شیر افگن خاں کو دیکھ کر مجمع کے غیض و غضب کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔ دین دین کے ساتھ انہوں نے "کافروں کو مارو" کا نعرہ بلند کیا، نعل دار جوتیاں سنبھالیں اور اینٹ پتھر جو اپنے ساتھ لائے تھے، دونوں برابر پھینکنے شروع کیے۔ اس حملے کی پہلی شدت شیر افگن خاں کو سہنی پڑی۔ اس کی بے حد بے عزتی ہوئی۔ اس پر جوتے پھینکے گئے اور اس کی پگڑی پر پتھر پڑے۔ روشن الدولہ کی طلائی مندیل پر بھی وار ہوئے۔ بلوائی ان پٹھانوں پر جو اپنے اپنے آقا کے پیچھے صف بستہ کھڑے تھے، ٹوٹ پڑے۔ اس وقت تک وزیر محض تماشائی بنا رہا۔

بالآخر ان امرا کی خطرناک حالت اور اپنے افسروں کے زخمی اور خون میں لتھڑے چہرے دیکھ کر

افغانوں میں تاب نہ رہی، انہوں نے ڈھالیں کندھوں پر لیں اور تلواروں سے فسادیوں پر حملہ بول دیا۔ دکانداروں کا بے حد نقصان جانی ہوتا' لیکن توپ خانے کے ملازمین نے جوان کے طرف دار تھے، اپنی توڑے دار بندوقوں اور فرنگی طپنچوں کے ساتھ ان کے حملے کا جواب دیا۔ مغل پورے کے مغلوں کی ایک جماعت بھی ان کی شریک ہوگئی۔ ایک حبشی نے منبر کے پاس سے دونوں امیروں پر اپنا طپنچہ داغ دیا۔ اس پر افغان جو غصے سے دیوانے ہو رہے تھے، نہایت جوش و خروش میں لپکے، متخاصم جماعتیں ایک دوسرے سے بھڑ گئیں، افغانوں کی تعداد توپ خانے والوں سے بہت زیادہ تھی اور جوتی فروش بالکل نہتے تھے۔ اس وقت تک وزیر کے ہمراہیوں نے جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے ہم وطنوں پر بری آ بنی ہے' انہوں نے وزیر کے حکم کی مطلق پروانہ کی اور اپنے ہتھیار سنبھال کر فوراً لڑائی کی آگ میں کود پڑے۔ باقی مغلیہ فوج مسجد کے باہر اپنے گھوڑوں پر وزیر کو واپس پہنچانے کے انتظار میں صف بستہ کھڑی تھی۔ اس رونما ہونے والے واقعے سے مشتعل ہو کر مسجد کی سیڑھیوں پر گھوڑے سے اتر کر آگے بڑھی اور ان پٹھانوں کو جو دروازوں پر نگہبانی کر رہے تھے، منتشر کر کے مسجد کے دروازے کھول دیئے اور نعرے مارتے بڑی تیزی کے ساتھ مسجد میں گھس گئے۔ پیچھے سے وزیر کا ہاتھی اور اس کے اونٹ جن پر ضرب زن اور بان لدے تھے' آ پہنچے۔ بہت جانیں ضائع ہوئیں۔ پٹھانوں نے جہاں تک ممکن تھا اپنی جگہ نہ چھوڑی مگر کہاں تک مقابلہ کرتے۔ شیر افگن خاں کے سیدھے ہاتھ کی کلائی پر زخم آیا، تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی، اس کے کئی آدمی مارے گئے، کئی زخمی ہوئے۔ بقیۃ السیف نے بھاگ کر جان بچانی چاہی۔ پٹھان اس وقت تک روشن الدولہ کے گرد سپر بنے کھڑے تھے، شیر افگن خاں کی پسپائی پر انہوں نے روشن الدولہ کو بھی لوٹنے پر مجبور کیا۔ اس کا بھاری جسم اور فربہی پھرتی کے ساتھ مراجعت میں مزاحم ثابت ہوئے، لہٰذا اس کے آدمیوں نے اسے اپنے کندھے پر اٹھا لیا اور لڑتے بھڑتے خستہ اور چکنا چُور دروازے کو جا لیا۔ مسجد سے نکل کر انہوں نے شیر افگن خاں کے بھائی دل دلیر خاں کی حویلی میں جو مسجد سے چند قدم کے فاصلے پر تھی، بھاگ کر پناہ لی۔ جب مسجد کے پٹھانوں کو معلوم ہوا کہ دونوں سردار حفاظت کے مقام پر پہنچ گئے ہیں، انہوں نے بھی مسجد سے مراجعت کی اور اسی پناہ گاہ میں چلے آئے۔ فسادیوں نے قمر الدین خاں وزیر کے احکام کی پروانہ کر کے ان کا تعاقب کیا اور لڑائی جاری رکھی، دل دلیر خاں کی حویلی کا محاصرہ کر لیا اور مجرموں پر اپنا انتقام توڑنے اور حویلی کو جلا دینے کی ٹھان لی۔ آخر سمجھا بجھا کر ان کو اس ارادے سے باز رکھا گیا۔ امرا کی ایک تعداد جو روشن الدولہ کے تابعین میں تھی اور جنہیں لڑائی میں کوئی دلچسپی نہ تھی، مسجد کے زاویوں، محرابوں اور گمٹیوں میں چھپ گئی۔ یہ لوگ گولیوں کی بوچھاڑ سے مجبور ہو کر بازار کی طرف کے کانچوں میں رینگ گئے اور جس طرح بھی ممکن ہوا گلی میں لٹک لٹک کر اتر گئے۔ اس طرح سے بھاگنے میں ایک امیر اعظم خاں پر بری بیتی۔ جس جگہ وہ چڑھا ہوا تھا' اس کے نیچے مٹی کے برتن بیچنے والے کی دکان تھی جس پر چھپر پڑا تھا۔ چھپر مضبوط تھا، پھر بھی لٹکنے میں اس کی ٹانگیں چھپر کے اندر اتر گئیں اور بلندی اور

اڑ واڑ میں پھنس کر رہ گئیں۔ دکاندار نے غصے میں آ کر اور ایک بانس لے کر خاں صاحب کی ٹانگوں کی خوب ہی مرمت کی، حتیٰ کہ وہ سوج گئیں اور جگہ جگہ سے زخمی ہو گئیں۔ خان صاحب ایک عرصے تک پاؤں پر کھڑے ہونے سے معذور رہے۔

دن بھر کی کارروائی کے نتیجے کے طور پر وزیر[9] بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے مقبول عوام اور محافظ اسلام بن گیا۔ ادھر بادشاہ خوش تھے کہ یہ مہم ان کا وبال دوش بنے بغیر آپ سے آپ فیصل ہو گئی۔ اسی وقت سر کی پگڑی اتار کر شاہی انعام کے طور پر وزیر کے پاس لے جانے کے لیے ایک خواجہ سرا کے حوالے کی اور حکم دیا کہ وزیر فوراً حاضر خدمت ہو۔ وزیر نے اپنے آدمیوں کو فسادیوں سے مسجد خالی کرانے اور دروازوں پر مضبوط پہرہ رکھنے کا حکم دیا اور قدم رسول میں جا کر نماز پڑھی، شکرانے کے نفل ادا کیے، مجاوروں کو انعام دیا اور خواجہ سرا کے ساتھ دیوان خاص میں حاضر ہوا اور تمام کیفیت گوش گزار کی۔ شمس الدولہ بخشی اول تمام دن محل سرا پر حاضر رہا۔ دونوں وزیروں کو انعام مرحمت ہوا اور پھر رخصت ہو گئے۔ بادشاہ محل میں تشریف لے گئے۔ مقبول جفت فروش جوہری کے مکان میں جسے لوگوں نے گرا کر میدان بنا دیا تھا، دفن کیا گیا۔ بعد میں وہاں ایک مسجد بنا دی گئی۔ یہ واقعہ ایک عرصے تک فارسی اور ہندی نظموں کا موضوع بنا رہا۔

بے نوا کا مخمس دہلی میں اردو شاعری کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی تصنیف کی تاریخ ہم کو معلوم ہے کیونکہ جس واقعے یعنی جوتی فروشوں کے بلوے کی روداد اس کا موضوع ہے، وہ گیارہویں سال جلوس محمد شاہی میں رونما ہوتا ہے۔ اردو شاعری کے دبستان دہلی میں تاریخی واقعات کے شعر کے ذریعے سے بیان کی غالباً یہ پہلی مثال ہے اور اسی لیے اس مخمس کو کسی قدر اہمیت حاصل ہے۔ تذکرہ نگار میر صاحب کے زمانے سے اس کا حوالہ دیتے آئے ہیں، لیکن کسی نے اس کو تمام و کمال نقل نہیں کیا۔ البتہ میر صاحب اور ان کی تقلید میں شوق نے اس کے پہلے اور آخری بند نقل کرنے پر قناعت کی ہے۔ مخمس فی ذاتہ اچھی شاعری کا نمونہ نہیں، تاہم بعد کے شعرا کے واسطے وہ ایک مثال بن گیا ہے۔ ناجی نے پانی پت میں نادر کی آمد، دہلی کے لشکر کے انتشار، امرا کی منافقت اور سپاہیوں کی آرام طلبی کے متعلق جو اپنا مخمس لکھا ہے، بے نوا کی تقلید معلوم ہوتا ہے۔ میر و سودا نے متعدد شہر آشوب لکھے ہیں، ان میں نہایت مشہور سودا کا وہ مخمس ہے جس کی ابتدا ہے:

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں تو ڈانواں ڈول

بے نوا کا مخمس ان ایام میں بہت مشہور ہوگا اور ہندوستان کے طول و عرض میں اس کی کافی اشاعت ہوئی ہوگی۔ جس بیاض سے میں اس کو نقل کر رہا ہوں اس کا نمبر میرے مجموعہ کتب میں جو اب پنجاب یونیورسٹی کی ملک ہے، 2164 ہے اور مخمس یہ ہے:

مخمس در مذمت طرہ باز خاں

یہ کیا ستم ہے اے فلک ہرزہ نابکار
مریخ پھر کے تیز کیا ہے خنجر کی دھار
جوتی فروش مرد مسلمان دین دار
سبکرن جوہری نے لیا ہے ستم سے مار
سنگ جفا سے چور کیا لعل آبدار

موچی و لچے اکٹھے اللہ کوں کر کے یاد
قاضی و کوتوال سوں کرتے پھریں فریاد
کہتے ہیں بادشاہ سیں دلاؤ ہماری داد
اکٹھے ہو جور[10] باندھ کفر پہ کریں جہاد
تاحشر دین دین محمد ہو برقرار

لچے و موچی اکٹھے مسجد میں جا کے پیٹھ
حبشی عربی اکٹھے ہو منبر کوں گھیر بیٹھ
تروار تیر ترکش بندوق سب سمیٹھ
قاضی کا کاڑا[11] حلوہ مفتی کا کچلا پیٹھ
مانع ہوئے نمازکوں اڑ بیٹھے کئی ہزار

نواب طرہ باز نے سن کر یہ ماجرا
مسجد کوں ہو سوار شتابی سیں آ چھڑا (چڑھا)
بولا پڑھو نماز کرو طاعت خدا
قاضی نبی کا نائب حرمت رکھو روا
دنگل میں خاص و عام سیں جب یہ کہا پکار

جوتی فروش بیچ پڑی آ کے کھلبلی
کیتوں کے کنے ڈھیلے ہوئے اور عقل ٹلی
بے حد شمار مرحلہ سے جوتیاں چلی (کذا)
کیا نئی کیا پرانی گنوارو[12] (و) گھیتلی[13]
لاہوری[14] سیف خانی[15] چہران منده[16] بھتہ دار[17]

تب زر لباس بولا ابس کوٹ چھاتی ہے
یارو برے سمیں کا نہ کوئی سنگاتی ہے
عزت گئی تو جوتی سیں اب جان جاتی ہے
اب بات کچھ نہ بنتی ہے اور بن نہ آتی ہے
اب مجھ کو سیڑھیوں میں شتابی لیجو اوتار

دستور بادشاہ نے پیل و پیادہ ساتھ
نواب طرہ باز کے اوپر چلائے ہاتھ
دوسر پڑی لڑائی (و) چھوٹے فتح کے ہاتھ
بندوق لاگی باجنے ہوئی دن کو چاند رات
مسجد میں آ پکارے فرشتے کہ مار مار

بجز گئے ابس کے بیچ مغل اور پٹھان سب
پاجی نفر سپاہی (و) نواب و خان سب
لے کر سلاح ہاتھ میں دھائے ندھان[18] سب
تلوار تیر ترکش جمدھر کوں باندھ سب
گرجا گگن لڑائی کا بری لہو کی دھار

للکار کھیت بیچ پڑے جو نجیب تھے
کیتے ہوئے شہید جو حق کے حبیب تھے
زخمی ہوئے پٹھان جو جنگ کے عجیب تھے
گھٹ گئے لبے شان لڑے جو غریب تھے (کذا)
یہ فتح داد حق سیں جسے دیوے کردگار

کیتے غریب غربا تماشے میں پھنس گئے
کیتے نمک حرام لڑائی میں کھس[19] گئے
کیتے ہی کود پھاند وہاں کاند[20] کھس گئے
مردوں پہ بوجھ ڈال کے نامرد جس گئے
افسوس کیتے ضائع ہوئے مرد اہل کار

کیتوں کو جیو سیں مار قضا نے گرا دیا
تاریخ بے نوا نیں رقم پر چڑھا دیا

بلوائے عام ملک ظفر خاں اٹھا دیا
لکھتا ہے مار جوتیاں طرہ اوڑا دیا
تا حشر ہر زباں پہ رہے گا یہ یادگر

حواشی:

1- قدیم لفظ یہ تشدید دوم اور موجودہ بہ تخفیف تشدید ہے۔

2- سکرن کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، صحیح نام سکرن بلکہ سمکرن ہے جیسا کہ اصل مخمس اور شوق وارون کے ہاں درج ہے۔

3- نواب روشن الدولہ ظفر خاں محمد شاہی عہد کے امرائیں سے ہیں۔ نواب قمر الدین خاں کے بعد کچھ عرصہ وزیر بھی رہے، بالآخر خیانت کے الزام میں معزول کر دیے گئے۔ دہلی کی دو مشہور مسجدیں ان کی بنوائی ہوئی ہیں۔ ایک تو سنہری مسجد جو کوتوالی چبوترے کے پاس ہے اور دوسری روشن الدولہ کی مسجد جو فیض بازار میں ہے۔ 1145ھ (مطابق 1732ء) میں انتقال کیا۔ (ایڈیٹر)

4- یہ مضمون قبلہ حافظ صاحب نے ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے وطن ٹونک کے قیام کے دوران میں لکھا تھا کیونکہ لاہور چھوڑتے وقت اپنے کتب خانے کا غالب حصہ یونیورسٹی لائبریری کے حوالے کر آئے تھے اس لیے یہاں "نارسائی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ (مرتب)

5- شبرات منانے میں تمام مسلمان شریک ہیں، ادنیٰ و اعلیٰ کی تفریق غلط ہے۔

6- آبرو نے اسی خواجہ سرا کے حق میں لکھا ہے:

یارو خدمت گر خاں خوجوں کے بیچ
ہے تو متقی و لیکن منقطع

7- شیر افگن خاں عزت الدولہ نواب بندہ علی خاں با سطی تخلص محمد افضل ثابت الہ آبادی کے مرید اور ممدوح ہیں۔ ثابت کا دیوان نواب موصوف نے ترتیب دیا ہے۔ اس کا ایک نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ جس پر چند سطریں بندہ علی خاں نے اپنے قلم سے لکھی ہیں۔ ان کے حالات شفیق اورنگ آبادی نے اپنے فارسی تذکرہ "گل رعنا" میں مفصل دیے ہیں۔ میرے کتب خانے میں نواب ممدوح کی یادگار دو بیاضیں ہیں جن پر کچھ عبارت خود نواب کی نوشتہ ہے۔ ان میں بڑی بیاض نہایت اہم ہے۔ اس کے مختلف ابواب و فصول میں مشائخ، علماء، وزراء، سلاطین، امراء اور اساتذہ قدیم و جدید کا کلام کثرت کے ساتھ نقل ہوا ہے۔

8- ارون کا یہ قول کہ روشن الدولہ شاہی حکم سے گیا تھا، بے نوا کے بیان کی روشنی میں غلط معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ روشن الدولہ اور شیر افگن خاں از خود آئے تھے۔

9- وزیر کے حق میں ارون کی یہ رائے خود اس کے ذکر کردہ واقعات کی روشنی میں غیر منصفانہ ٹھہرتی ہے۔

10- یعنی زور (مرتب)

11- کاڈا یعنی نکالا۔ یہ راجستھانی انداز ہے، پنجابی صورت "کڈیا" ہے (مرتب)۔

12، 13، 14، 15، 16- جوتیوں کی مختلف قسمیں ہیں (مرتب)۔

17- ساتھی (مرتب)۔

18- بمعنی آخر۔ دکنی کا مخصوص لفظ ہے (مرتب)۔

19- کھسنا، کھسنا۔ بھاگ جانا؟ (مرتب)۔

20- کاندھ: دیوار۔ پنجابی میں "کند" (مرتب)۔

(در: مقالات شیرانی، مطبوعہ لاہور، جلد دوم)

قاضی فضل حق

پنجاب میں اردو

میرے دوست حافظ محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" لکھ کر تحقیق و تجسس کے لیے ایک جدید زینہ کی طرف رہنمائی کی ہے اور باوجودیکہ وہ خود پنجابی نہیں ہیں' تاہم انہوں نے خطہ پنجاب کی علمی اور ادبی مساعی کو منظرِ عام پر لانے میں وہ کام کیا ہے کہ فرزندانِ پنجاب کے ادب نواز حلقے ان کے احسان کے بوجھ سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

پروفیسر صاحب کو شکایت ہے اور بالکل صحیح شکایت ہے کہ پنجاب میں کوئی ایسا وقیع کتب خانہ نہیں جو اس موضوع پر تدبر اور غور کرنے والوں کے لیے باعث امداد ہو سکے اور یہ کہ اہل پنجاب نے اپنے وطن کے مساعی ادبیہ کو نہ صرف فراموش کر دیا ہے بلکہ بہت حد تک ضائع کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر صاحب کی موشگاف طبیعت اور بالغ نظری بھی اس کتاب کو ایک خاکے کی حیثیت سے زیادہ پیش نہیں کر سکی اور اگر اہل وطن توجہ کریں تو ممکن ہے کہ یہ خاکہ مکمل ہو کر ایک نہایت خوشنما تصویر بن کر نگار خانہ ادب کی زینت کا باعث ہو سکے۔

دو سال ہوئے اس خیال کو مدنظر رکھ کر میں نے گرمی کی رخصتوں میں بعض جگہوں سے قلمی نسخے حاصل کرنے کی کوشش کی اور مقام مسرت ہے کہ اس وقت میرے پاس پنجاب کے اردو' فارسی اور پنجابی شعراء کے کلام کا معتدبہ ذخیرہ جمع ہو گیا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ ذخیرہ بطور مشتے از خروارے ہے اور مزید تلاش سے اس سے بہت زیادہ مواد ملنا ممکن ہے۔

اس وقت میں اردو شعراء کی ایک فہرست اور ان کے کلام کے نمونے اور حتی الامکان ان کے حالات مختصراً پیش کروں گا اور کبھی کبھی پروفیسر صاحب کی فروگذاشتوں (جن کے لیے اکثر صورتوں میں وہ ذمہ دار نہیں) کی طرف بھی اشارہ کرتا جاؤں گا۔

"اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے"

"پنجاب میں اردو" میں شیخ فریدالدین شکر گنج" کی ایک پانچ شعر کی "ملمع" نظم دی ہے اور اس میں چوتھا شعر اس طرح درج ہے۔

باتن تنہا چہ روی زیں زمیں
نیک عمل کن کہ وہی سات ہے

ایک قلمی بیاض میں اس نظم کے چھ شعر دستیاب ہوئے ہیں جس میں چوتھا اس طرح ہے ۔

باتن تنہا چہ روی زیر خاک
بہر خداوند چہ سوغات ہے

اور پانچویں شعر یوں ہے ۔

ایں سفر دور و دراز است لیک
نیک عمل کن کہ وہی سات ہے

مگر میرے خیال میں یہاں بھی غلطی ہے۔ ان دو شعروں کو اس طرح پڑھنا چاہیے۔

باتن تنہا چہ روی زیر خاک
نیک عمل کن کہ وہی سات ہے
ایں سفر دور و دراز است لیک
بہر خداوند چہ سوغات ہے

پروفیسر صاحب کے ہاں آخری شعر اس طرح ہے ۔

پند شکر گنج بدل جاں شنو
ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

مگر میرے بیاض میں اس کی صورت یہ ہے ۔

پند شکر گنج ز دل جاں شنو
ضائع مکن عمر چلی جات ہے

اس طرح پروفیسر صاحب نے فریدالدین شکر گنج" کے ایک ہم قرن اور ہم مشرب بزرگ شیخ جنید کے نام سے ایک ملمع منسوب کیا ہے[2]، جو ایک بیاض[3] (مرقومہ 1128ھ) میں شیخ فریدالدین کے نام پر بادنیٰ تغیرات درج ہے۔ اور وہاں مقطع اس طرح سے ہے ۔

فرید امرد آں باشد کہ اس سنسار سیں ناتھی
نہ بندد دل دریں دنیا کہ اس کرتار سوں کاتی (کذا)

پروفیسر صاحب کے ہاں یہ شعر مفقود ہے۔

کجا رفتند آں یاراں کہ جن سوں چین تھا تیرا
چناں رفتند زیں خانہ لکا ہو کیا ہے پھیرا

رحمٰن

رحمٰن کا ایک ریختہ پروفیسر صاحب نے صفحہ 267 پر درج کیا ہے۔ اس میں اس ایک شعر کا اضافہ ہوسکتا ہے۔

پڑا ہوں درد مندی میں برہ بن کے بیاباں میں
اگر تیغ و عادر کف یقیں لاؤں دہن لرزے (بیاض یعقوب)

شاہ مراد

منشی طالب علی پابند قریشی ایڈیٹر ''رہنمائے تعلیم'' لاہور کے اجداد میں سے ہیں۔ قریشی صاحب نے ان کی مصنفات میں سے ایک بارہ ماسہ جو پنجابی اور ہندی میں ہے' شائع کیا ہے اور اس میں شاہ مراد کے حالات بالتفصیل دیئے ہیں۔ قریشی صاحب کی طفیل سے وہ رسالہ میرے پاس پہنچ گیا تھا مگر افسوس کہ اس وقت دستیاب نہیں ہوسکا۔

شاہ مراد پنجابی زبان کے مستند شعراء میں سے ہیں۔ میاں محمد صاحب ''سیف الملوک'' میں ان کی شاعری کے قائل اور مداح ہیں۔

میرے پاس ان کے پنجابی کلام میں سے دو تین متصوفانہ غزلیات موجود ہیں۔ ان شاء اللہ کسی دوسرے موقع پر ان کے متعلق مزید اطلاع بہم پہنچا سکوں گا۔

نعمت اللہ پارسا

''پنجاب میں اردو'' ص 267 پر پروفیسر صاحب نے ان کی صرف ایک غزل دی ہے اور ان کے حالات وغیرہ کے متعلق وہ بالکل خاموش ہیں۔ ایک بیاض[4] میں علاوہ اس غزل کے جو پروفیسر صاحب نے نقل کی ہے' ان کی ایک ''مناجات پیر دستگیر'' بطور ''سلام'' ملی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلسلہ قادریہ بٹالویہ میں احمد شاہ بن محمد شاہ متوفی 1224ھ کے مرید تھے ''مناجات'' بتمامہ یہاں درج کرتا ہوں''۔

اے صبا بغداد موں توں جا ادب سے کہ سلام
شاہ اقطاب علاکوں جا ادب سے کہ سلام
اسم ان کا اسم اعظم اسرار کا امر حق
سرّ ذات کبریا کوں جا ادب سے کہ سلام
اختر برج شہادت خسرو دونو جہاں
ماہ جاناں پیشوا کوں جا ادب سے کہ سلام
مطلع آں نور اخفا مہبط سرّ الہ
سرو بستاں اصفیا کوں جا ادب سے کہ سلام
گلبن باغ محمد ناز صدر مرتضیٰ
شمع بزم اولیا کوں جا ادب سے کہ سلام

شاہ ولایت محی دین ماہ ہدایت رہنما	منبع فیض خدا کوں جا ادب سے کہ سلام
قطب عالم غوث اعظم شان ان کی حق کہا	پیر عالم گیر ماکوں جا ادب سے کہ سلام
لاتخف اونیں کہا ہے مریداں مہر سوں	مالک روز جزا کوں جا ادب سے کہ سلام
مست عاشق لاابالی وارث دلق نبی	عالم علم خفا کوں جا ادب سے کہ سلام
تکیہ مارادر دو گیتی جز جناب غوث نیست	آں حبیب اللہ علاکوں جا ادب سے کہ سلام
دستگیر بے کساں و قاضی حاجات کل	پردۂ عیب و خطا کوں جا ادب سے کہ سلام
نام پاکش شاہ احمد پیر ما آل رسول	پیر عالی اتقیا کوں جا ادب سے کہ سلام
دستگیرم شاہ احمد پیر ماشاہ جہاں	واصل اللہ ذوالعطا کوں جا ادب سے کہ سلام
خاک پائے محی دیں ہے نعمت اللہ پارسا	آں شہ مشکل کشا کوں جا ادب سے کہ سلام

پنجابی کے مصنفین کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر صاحب لکھتے ہیں[5]۔

"خواجہ مسعود سعد سلمان کے بعد پنجابی کے پہلے شاعر شیخ فریدالدین مسعودؒ متوفی 664ھ ہیں اور سکھوں کا بیان ہے کہ وہ فریدالدین ابراہیم ہیں جو گورونانک کے معاصر ہیں۔"

سکھوں کا یہ بیان دراصل ایک تاریخی اشکال کے حل کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ گرنتھ صاحب میں جو کلام "فرید" کے نام پر درج ہے اس کے اکثر و بیشتر حصے کے مصنف خواجہ فرید الدین مسعود شکر گنج ہی ہیں۔ اس بات کے لیے ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ آیا خواجہ فریدالدینؒ کو شعر و سخن اور خصوصاً ہندی یا پنجابی شاعری سے کچھ لگاؤ تھا یا نہیں۔ سیر کی اکثر کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ گاہے گاہے وہ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ "جواہر فریدی" میں جو ان کے حالات و کرامات کا مفصل مجموعہ ہے لکھا ہے کہ ایک دفعہ ابتداء ریاضات میں انہوں نے اپنی والدہ کے سامنے اثناء کلام میں یہ شعر "ہندوی زبان" میں فرمایا ہے۔

فرید ادھر سولی سر پنجرے تلیاں توکت کاگ
رب اجیون باہوڑے سودھن اساڈے بھاگ

یہ شعر زبان، وزن، طرز ادا وغیرہ میں "فرید" کی "بانی" مندرجہ گرنتھ صاحب سے مماثلت تامہ رکھتا ہے اس لیے یہ تسلیم کر لینا مشکل نہیں کہ فرید اکثر اپنے نصائح کو کلام منظوم میں ادا کرتے ہوں گے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ فرید ثانی (ابراہیم) کس طرح اس روایت میں شامل ہوئے۔ مجھے پروفیسر ضیاء محمد ایم اے، ایم او ایل کے توسط سے "کلام فرید" کی ایک اردو شرح (مطابق آیات و احادیث) مصنفہ مشتاق (جو بقول خودش "علم فارسی عربی شاستری گورمکھی میں واقفیت رکھتا ہے") بنام "شلوک فرید" بصورت نسخہ قلمی دستیاب ہوئی ہے۔ اس کے دیباچے میں ان شلوکوں کی تدوین اور گرنتھ صاحب میں شمولیت کا حال لکھا ہے جسے مخلصاً درج ذیل کیا جاتا ہے۔

''جواہر فریدی میں لکھا ہے (لیکن تلاش کرنے پر مجھے نہیں مل سکا) کہ گورو نانک صاحب واسطے ملاقات جناب شیخ بہرام (ابراہیم) قدس سرہٗ جو اس زمانے میں سجادہ نشین جناب بابا صاحب کے تھے، پاک پٹن تشریف لے گئے اور شیخ ابراہیم سے عرض کیا کہ ہم نے ایک کتاب تعلیم ارشاد توحید ذات پاک ہندی میں تیار کی ہے جس میں اکثر موحدان ہندی کلام بھی درج ہے...... آپ براہ مہربانی جناب بابا صاحب کے ارواح مقدسہ سے اجازت لے دیں کہ آنجناب کے کلام مبارک بھی اس کتاب میں درج کی جاوے۔ چنانچہ بہرام صاحب قدس سرہ نے بمنشاء گورو نانک صاحب ارواح مقدس جناب بابا فرید صاحب سے اجازت لے دی۔ اس واسطے گورو نانک صاحب نے تمام شلوک ارشاد کردہ بابا فرید میں درج فرمائے۔ گورو نانک صاحب اور شیخ بہرام صاحب (جو کہ فرید ثانی رحمتہ اللہ کے نام سے مشہور ہیں، جناب بابا صاحب کی گیارہویں پشت میں بعدہ ہوتے ہیں) ہر دو صاحبان موصوف ہم عصر ہیں اور جناب بابا فرید صاحب اول ساڑھے تین سو سال ان ہر دو صاحبان سے پیشتر ہوئے ہیں۔''

وہ اصحاب جو مکالمہ ارواح وکشف کے قائل نہیں، یہ سمجھ لیں کہ بابا گورو نانک صاحب نے شیخ ابراہیم سے بابا فریدؒ کا کلام لے کر اسے اپنی کتاب (گرنتھ صاحب) میں درج کرنے کی اجازت حاصل کی۔

مولانا غنیمت کنجاہی (متوفی 1111ھ یا 1112ھ) صرف فارسی کے شاعر اور ناثر مشہور ہیں۔ ان کی مثنوی ''نیرنگ عشق''، ''دیوان غنیمت'' اور ''انشاء غنیمت'' مشہور ہے، مگر یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مولانا پنجابی اور اردو میں بھی ''شوق فرمایا کرتے تھے۔'' افسوس ہے کہ ان کا اردو و پنجابی کلام زمانہ کی دستبرد سے ضائع ہو چکا ہے۔ صرف ایک فارسی رباعی محفوظ ہے جس میں مولانا نے دو اردو جملے بھی استعمال کیے ہیں۔ وہ رباعی ایک قلمی[7] بیاض سے نقل کر رہا ہوں۔

چوں گئے داد دل بہ گلبدناں (کذا) رنگ او ہچو رنگ نافرماں
گفتمش ''تیرا یار لالہ ہے'' گفت با داغ دل کہ ''بابو۔ ناں''
(بابونہ ایک پھول کا نام ہے)

فدوی لاہوری

اس شاعر کے متعلق پروفیسر صاحب لکھتے ہیں ''فارسی وریختہ میں کامل تھے۔ ایران میں ایک عرصہ تک رہے۔ تجارت ذریعہ معاش تھا۔ احمد نگر فرخ آباد میں ایک عطار کی دکان پر مکان کرایہ پر لے رکھا تھا۔ عطار کی دکان پر آ بیٹھے تھے اور وہیں شعر کے چرچے رہتے تھے''۔ (الخ)

اس کے بعد میر حسن کے تذکرے سے اقتباس دے کر فرماتے ہیں ''لیکن اس کا کیا کیا جاوے کہ خود فدوی کے ہم وطن اس کے حالات وکمالات سے بے خبر ہیں''۔ پروفیسر صاحب کو اس کی صرف ایک غزل

مل سکی ہے جو انہیں بعد تلاش حاصل ہوئی ہے۔

فدوی کی زندگی کے حالات قریباً ہر تذکرے میں مختصراً مل سکتے ہیں مگر مولوی کریم الدین نے اپنی کتاب ''طبقات الشعراء'' میں جو دراصل گارسیں دتاسی کی فرانسیسی کتاب ''تاریخ ادبیات ہند'' کا اردو ترجمہ ہے ذرا تفصیل سے کام لیا ہے۔ مثلاً ''وہاں کیا ہے؟''

''یہ فدوی محمد حسین لاہوری شاگرد صابر علی شاہ المتخلص صابر کا تھا۔ واقع میں یہ ایک بنئے کا لڑکا تھا۔ ایک شخص مرزائی نے حالت غلامی میں اس کو تعلیم دلوائی۔ بعد ازاں وہ فدوی اپنے ملک کو چھوڑ کر فرخ آباد میں آیا' جہاں سودا سے اس کا مباحثہ ہوا۔ سودا نے ایک مخمس اس فدوی لاہوری کی ہجو میں لکھا ہے جو کلیات سودا میں مندرج ہے۔ اس فدوی کے بہت لوگ بہ سبب اس کے غرور اور نخوت کرنے کے دشمن ہو گئے تھے۔ وہ واقع میں شورہ پشت آدمی تھا۔ جب وہ لاہور سے آیا' اس وقت اس نے زبان ریختہ میں ایک قصہ بنام یوسف و زلیخا تصنیف کیا' مگر میر فتح علی نے اس کی خوردہ گیری کری اور ہجو میں ایک مثنوی بنام بوم و بقال تصنیف کی ہے' جس کا اول یہ ہے۔

صورت لوح و قلم جس کے لیے خلق کی — یارو خدا ایک ہے دوسرا برحق نبی
آج زباں ہے کھلی کل کے تئیں بند ہے — راست ہی تک بولیو ان کی ہے سوگند ہے

جو کہ انتخاب دیوان سودا میں درمیان کلکتہ کے سودا کی طرف اس کو منسوب کر کے اس کے دیوان میں غلطی سے چھپوا دی ہے کیونکہ سودا کی کہی ہوئی وہ مثنوی نہیں ہے۔ باوجود اس کے کہ اس مثنوی میں وہ آپ اقرار سودا کے استاد ہونے کا کرتا ہے' لیکن چھاپہ والوں نے اس میں کچھ تمیز نہیں کی ہے۔

فدوی نے یوسف زلیخا بحکم نواب ضابطہ خاں کے لکھی تھی' جس کے پاس چندروز رہا تھا۔ نواب محمد یار خاں کے ملازموں میں بھی فدوی منسلک تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ اس جائے محمد قائم اور مصحفی اور شعراء اس زمانے کے اس سے ملتے رہتے تھے۔ اس نواب کے گھر میں مشاعرہ ہوا کرتا تھا' چونکہ نواب بدخصلت تھا' اس واسطے چندروز کے بعد وہ مجلس موقوف ہوئی۔ پچاس برس کی عمر میں فدوی فوت ہوا۔ شاہ مبارک آبرو کا شاگرد تھا۔ درویشانہ روش رکھتا تھا۔ یہ ایک شعر اس کا ہے۔

یار ہم سے جو سدا چیں بہ جبیں رہتا ہے
نہیں معلوم بلا کونسی پیش آنی ہے

یہی شعر آگے چل کر محمد محسن فدوی نام سے بھی منسوب کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے دونوں کے حالات کو گڈمڈ کر دیا ہے۔''

محمد محسن کے حالات یوں دیئے ہیں:

''محمد حسن ولد میر غلام مصطفیٰ خاں سید حسینی ہے۔ مولد اس کا لاہور' سولہ برس کی عمر میں وہ دہلی کو آیا۔

شاہ مبارک آبرو کا شاگرد ہوا۔ علم ہیئت میں بھی مشہور تھا۔ اشعار اس کے قدما کے طور پر ہیں۔ اس کے آباؤ اجداد درویش تھے۔ اس نے بھی یہی پیشہ اختیار کیا تھا۔ ایک دیوان فدوی کا فورٹ ولیم کے کتب خانے میں موجود ہے۔ معلوم نہیں اس کا ہے یا کسی اور کا۔ 1747ء میں موجود تھا۔ اس کے یہ شعر ہیں (یہاں وہ شعر بھی دیا ہے جو دوسری جگہ دوسرے فدوی سے منسوب کیا ہے)

(تذکرہ گارسیں دتاسی۔ مترجمہ مولوی کریم الدین)

گذشتہ سال مجھے ایک اردو تذکرے کے کچھ اوراق قلمی دستیاب ہوئے تھے جس کا نام معلوم نہیں ہو سکا، مگر اس کے حاشیے پر ایک جگہ کسی دوسرے شخص کے قلم سے یہ الفاظ ملتے ہیں: ''اس کتاب (کذا) کا نام دیوان عشق ہے۔''

بہر حال اس تذکرے کے چند اوراق جو مجھ تک پہنچے ہیں ان میں مصنف نے جو کچھ اپنے متعلق لکھا ہے وہ یہ ہے:

''مسرور تخلص شرف الدین احمد نام لکھنے والا اس بیاض کا۔ ہر چند اشعار کم عیار اس بے مقدار کے اس موافق نہیں کہ بیچ ذیل افکار سخناں عالی طبع کے لکھے جاویں، لیکن ہوس دامنگیر قلم کی ہوئی۔ برعایت ردیف میم کے چند شعر اس جگہ مرقوم ہوتے ہیں۔ یہ عاصی لیاقت شعر گوئی کی کچھ نہیں رکھتا۔ محض برکت صحبت صاحب طبعان اہل سخن کے کبھی کبھی سراسر پوچ اور واہیات موزوں کرتا ہے۔ اہل ہنر یہی سمجھیں کہ جہاں گل ہیں وہاں خار بھی درکار ہے۔''

دوسری جگہ کہتا ہے ''یہ عاصی ایک برس تک سہارنپور میں حضور بندگان عالی مسٹر رابرٹ کنگہاٹ صاحب بہادر اسسٹنٹ کلکٹر کے منشی کے عہدہ پر نوکر رہا۔''

اس کا والد غلام محی الدین عشق [10] مصنف ''تذکرۂ طبقات سخن'' (تصنیف عشق) ہے جس کے تفصیلی حالات اشپرینگر کی فہرست کے صفحہ 187 پر درج ہیں۔

مسرور [11] کی عمر بارہ سال کی تھی کہ اس نے باپ کے ضخیم دیوان کی تدوین میں بہت مدد دی۔

اس کے دادا نعمت اللہ نعمی بھی فارسی کے شاعر تھے۔ ان کے متعلق لکھتا ہے:

''دیوان فارسی اس جناب مرحوم کا بہ ضخامت تمام ہے۔ ریختہ پر رغبت کم تھی۔ سوا فکر شعر اور خوش نویسی خط نستعلیق اور شکستہ منشورات جناب مغفور کے کچھ ایسے ہیں کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ 1215ھ میں دار فانی سے رحلت فرمائی۔ تاریخ وفات یہ ہے:

جستم از اہل عزا تاریخش
یک بروں جست و بگفتا اے واہ (کذا)
رفت از عالم ابدان نعمی

جعل الجنتہ ماوا مثواہ"

مسرور نہ صرف فدوی کا معاصر تھا بلکہ اس کے والد اور فدوی میں "رابطہ دوستی کا بدرجہ تمام تھا" اس لیے اس کا بیان معتبر شمار کیا جانا چاہیے۔ وہ لکھتا ہے:

"فدوی' مرزا فدائی بیگ نام لاہوری شاگرد شاہ صابر علی صابر تخلص کا' سپاہی وضع' خانہ جنگ تھا اور بیچ سرکار ضابطہ خاں کے علاقہ روزگار کا رکھتا تھا' چنانچہ بموجب فرمائش نواب موصوف کے قصہ یوسف زلیخا کا اس نے زبان ہندی میں بخوبی نظم کیا مگر ناتمام رہ گیا۔ میاں مصحفی نے کہ اپنے تذکرہ میں بقال پسر اور غلام مغل لکھا ہے محض غلط ہے۔ مرزا سودا مرحوم جو اپنی عادت سے لاچار تھے' اس کی ہجو کہی اور ہجو میں مذکور بقال اور بوم کا لکھا۔ میاں مصحفی نے بھی یہی دلیل پکڑ کے اس کو بقال پسر قرار دیا۔ جناب حضرت قبلہ گاہی سے اس کو رابطہ دوستی کا بدرجہ تمام تھا بلکہ جس وقت سکرتال میں ضابطہ خاں نے مرہٹہ سے شکست پائی۔ یہ شخص کئی مہینے تک میرٹھ میں آ کر غریب خانے پر ٹھہرا رہا۔ زبانی جناب ممدوح کے دریافت ہوا کہ قوم اس کی مغل برلچ تھی اور حسب نسب میں اس کے کچھ خلل اور فرق نہ تھا۔ از بسکہ مزاج اس کا امرد پرستی پر راغب تھا۔ بریلی میں ایک افغان پسر پر فریفتہ ہو کر رقیب کے ہاتھ تیغ بے دریغ سے شہید ہوا۔ کلام اس کا۔

پرواز میں ہے زلف گرہ گیر ہوا پر ۔۔۔ اُڑتی ہے سدا کافر بے پیر ہوا پر
قامت کو ترے دیکھ مصور نے بافسوس ۔۔۔ کھینچی قلم آہ سے تصویر ہوا پر
آتش نفسی تیشہ کا گھر کرتی ہے برپا ۔۔۔ مانند حباب اس کی ہے تعمیر ہوا پر
پرواز میں ہے یار تری زلف کی شوخی ۔۔۔ ہو نکہت گل سے نہ گلو گیر ہوا پر
وہ نقش مجھے یاد ہے حب کا کہ نختیں ۔۔۔ کرتا ہوں پری کو بھی میں تسخیر ہوا پر
کیسی تو گھٹا اُمڈی ہے اس وقت میں واللہ ۔۔۔ ٹک کچھ نظر او بت کشمیر ہوا پر
آ پیویں شراب ایسے میں ہم تم کہ نہیں ہے ۔۔۔ اس ابر سیہ بخت کو تاخیر ہوا پر
فدوی کو ملی کان جواہر ہے مہوس ۔۔۔ چل پھینک ادھر نسخہ اکسیر ہوا پر

....

سب اہل زمیں پھرتے ہیں غمناک زمیں پر ۔۔۔ اوقات کوئی کاٹے گا کیا خاک زمیں پر
ہم زیر فلک یار سے نالاں ہیں شب و روز ۔۔۔ اک آفت جاں ہے وہ ستم ناک زمیں پر

....

بعد مرنے کے بھٹکتا ہوں تہ خاک ہنوز ۔۔۔ ساتھ پھرتی ہے میرے گردش افلاک ہنوز
کس کے پہلو کے ہلانے سے زمیں ہے جنباں ۔۔۔ کون بسمل سا تڑپتا ہے تہ خاک ہنوز

....

تمہاری چشم کے آگے ہرن چکارا ہو — نہ ٹھیری دید میں ابرو کا جب اشارا ہو
نہ لاوے تاب ترے چہرۂ درخشاں پر — اگرچہ یوسف مصری بھی آشکارا ہوا
نظر پڑے ہمیں خورشید زر کے حلقے میں — تمہارے کان کے موتی پہ جب نظارا ہو
نہووے پاس کوئی میکشی میں اے فدوی — نشے کے وقت وہ دلبر ہو اور کنارا ہو

....

مانی تو کہاں لکھ سکے جا اس کے قدم لے — تصویر لکھی چشم کی نرگس نے قلم لے
گرمی سے عرق ہو گیا چلتے ہو اے اشک — [12]

....

اس کے علاوہ مختلف بیاضوں سے فدوی کی اور تین غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔ یہاں درج کرتا ہوں:

کوچے میں گرچہ یار کے جائے اماں بھی ہے — لیکن سنبھل کے جانا وہاں خوف جاں بھی ہے
دنیا کے کارگاہوں میں ہے عیش و غم رفیق — تنگی بھی ہے فراخی بھی ہے امتحاں بھی ہے
خوبی میں اپنے یار کی کیا کیا کروں بیاں — بانکا بھی ہے رنگیلا بھی ہے نوجواں بھی ہے
میں ترک صحبت اس گل رعنا کی کیوں کروں — مشفق بھی ہے رفیق بھی ہے مہرباں بھی ہے

فدوی تئیں بلا کے دلاؤ زکوٰۃ حسن
مفلس بھی ہے غریب بھی ہے ناتواں بھی ہے [13]

غزل

جب شوخ اپنے گھر سے مست شراب نکالے — تب دل جلوں کے دل سے بوئے کباب نکلے
یا آملے وہ خوباں یا دل انہوں سے چھوٹے — یا جان عاشقوں کے تن سے شتاب نکلے
مکھڑے سے جب اٹھاؤ تم شال ارغوانی — ڈوبا ہوا شفق سے پھر آفتاب نکلے
یارو میں معتقد ہوں حقے کی خاصیت کا — ہرگز نہ بن بلائے اس سے جواب نکلے
بے طرح لگ رہا ہے یہ دل بغل میں دشمن — پہلو سے یا الٰہی خانہ خراب نکلے

یہ خاکسار فدوی جس وقت جاں کنی موں
مرتے ہوئے زباں سیں یا بو تراب نکلے [14]

....

اس دل سے راز عشق کا پایا نہ جائے گا — پردے موں آفتاب چھپایا نہ جائے گا
یاں تک میں روسیاہ ہوں کہ مولا کو روز حشر — شرمندگی سے منہ کو دکھایا نہ جائے گا

شبنم عبث تو کرتی ہے رو رو کے شست وشو — لالہ کے دل کا داغ مٹایا نہ جائے گا
ہر چند کہ بھروں گا گریباں کے اپنے چاک — دامن کو تیرے ہاتھ لگایا نہ جائے گا
فدوی خدانخواستہ روکے اگر وہ شوخ
ہے بے دماغ تجھ سے ستایا نہ جائے گا

اب میں ان پنجابی ''اردونویسوں'' کا تعارف کرانا چاہتا ہوں جن کے حالات اور کلام تک بوجہ قلت مواد پروفیسر صاحب کی دسترس نہیں ہوسکی۔

بارہویں صدی ہجری میں پنجاب میں اردو کی اشاعت کے سلسلے میں ایک نئی تحریک شروع ہوتی ہے جسے پروفیسر صاحب کی اصطلاح میں ''بٹالہ کی تحریک'' کہا جاسکتا ہے۔ اس تحریک کے روح رواں شیخ ابوالفرح محمد فاضل الدین بٹالوی ہیں جو اپنے عہد کے مقتدر شیوخ میں سے تھے اور جو بہت حد تک پنجاب میں سلسلہ قادریہ کی ترویج واشاعت کے ذمہ دار ہیں۔ شیخ فاضل الدین ''شیخ محمد افضل لاہوری کے مرید تھے'' اور پروفیسر صاحب نے ان کا ذکر محض اس روحانی نسبت کی وجہ سے ہی کیا ہے' مگر معلوم ہوتا ہے کہ شیخ محمد افضل کی شخصیت نے ادبیات پنجاب پر بھی خاص اثر ڈالا ہے۔ وہ خود شاعر تھے اور شیخ فاضل الدین اور ان کے متبعین جو اس ''تحریک بٹالہ'' کے روح رواں ہیں' شاعری میں محض اپنے مرشد بزرگوار کی سنت کی پیروی کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس ''تحریک'' کے بانی مبانی دراصل شیخ محمد افضل ہیں نہ کہ ان کے مرید شیخ فاضل الدین۔

عزیزی چودھری محمد یعقوب سلمہ کی وساطت سے مجھے ایک ضخیم بیاض دستیاب ہوئی ہے جس میں سلسلہ قادریہ ''بٹالویہ'' کے اکثر مشائخ اور ان کے متوسلین کا فارسی' اردو اور پنجابی کلام بالالتزام دیا گیا ہے اور ہمارے موضوع کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہے۔

چنانچہ شیخ محمد افضل کی یہ نظم وہیں سے ماخوذ ہے۔

اے شاہ شاہاں پیر من لینی خبر نامرد کی — کرنا توجہ از کرم پاؤں خلاصی درد کی
دن رین تجھ بن زار ہوں بیکس پریشاں خوار ہوں — قربان تیرے نام پر سُنّی حقیقت فرد کی
پنچھی اکیلا میں پھنسا تھرتھر تڑپتا ہے جیا — اس ہاتھ بیری کٹھن کے دیکھی جو تیزی گرد کی
پھانسی پھنسا ہوں سخت تر اس وقت پر کرنا کرم — مشکل کشا ہو جلد تر پھانسی کٹو اس درد کی
وچ قعر دریا درد کے بیکل ہو یا ہوں رین دن — یا غوث اعظم محی دیں زاری سنوں اس مرد کی
چوپٹ پڑا ہوں گرد میں جگ سے پھنا ہوں ایکلا — تجھ بن نہ کوئی پاس ہے تک سار لے اس فرد کی
حریف وہ بدمست ہے چاہتا ہے بازی چھین لے — چورنگ پڑا ہوں غم ستی کرنی مدد رنگ زرد کی
بجتی گئی اوڑک ہوئی اب میں پڑا ہوں پاؤں پر — کر کر تصدق پاؤں کا بازی ہرو نامرد کی

تجھ بن نہ کوئی ہے میرا اے شاہ شاہاں دستگیر — کر کر نظر اک مہر کی فریاد سن دم سرد کی
محجوب ہو گوشہ پڑا تن پر نہ پروا پاک ہے — پردہ ایماں بخشو مجھے حرمت نہیں بے پرد کی
تم شہ غریب نواز ہو بر سروراں سرتاج ہو — بنتی سنوں اے بادشاہ افضل مسافر مرد کی

....

اب میں اس بیاض میں سے اور دیگر ذرائع سے ان بزرگوں کا مزید کلام دیتا ہوں' جن کا ذکر پروفیسر صاحب کی کتاب میں آچکا ہے کہ ایک تو کلام محفوظ ہو جاوے' دوسرے ادبیات پنجاب کے آیندہ تنقید کرنے والوں کے لیے مواد جمع ہو سکے۔ اس کے بعد میں ان بزرگوں کا ذکر کروں گا جن کے حالات اور کلام تک پروفیسر صاحب کی رسائی نہیں ہو سکی۔

شیخ[15] ابوالفرح محمد افضل الدین بٹالوی (متوفی 1151ھ)

کرم کر کر ہمن حق نے عجائب لکھ دکھایا ہے — کہ برکت مصطفیٰ کی سوں عجب روشن سوایا ہے
ہونے نائب عجائب (اور) جلا یا دیں (و) ایماں کوں — پیارا نام محی ولاین ہمن حق نے بتایا ہے
"سقانی[16] الحب" سیں دیکھو ہوا ہے جان (و) دل روشن — تمامی بزم مستی کوں پیالے لے لے پلایا ہے
"مرید لاتخف" کہ کے دولیا ہے مریدوں کوں — "ہویا محفوظ دنیا دیں تمہارا" جس کہایا ہے
"طبولی" کی طبل باجے علم اسرار سوں چھاجے — طریقت شرع سوں کا جی سبھی ملک نوایا ہے
"عزوم قاتل" کہ کر کفر ملا ہے غیرت سوں — علی کی انجمن کا نور اس مکھ پر سوایا ہے

تمہارا نام لے کر جیو خلایق فیض پاوے ہے
کہے فاضل کرم حق سوں عجائب پیر پایا ہے

پروفیسر صاحب نے جو عربی آمیز اردو مناجات "پنجاب میں اردو" کے صفحہ 243 پر درج کی ہے' اس میں اس شعر کا اضافہ ہو سکتا ہے جو بیاض محولہ سے نقل کرتا ہوں۔

آ بیٹھے دیکھنے عشق کوں صرنا غموماً فی الغموم
کیسی بنی کیسی پڑی انظر بحالی یا نبی

یہ مناجات مخمس بھی شاہ افضل الدین صاحب کی یادگار ہے:

جاصبا بغداد سوں میری طرف سے عرض کر — مردہ ام زارم خدارا برمن عاجز نگر
گرچہ ہوں یا پیر خدمت سوں مقصر سربسر — پر تمہارا نام رکھتا ہوں میں اپنے سر اُپر
یا محی الدین تم بن کون لے میری خبر
قبلہ کونین ہو (اور) کعبہ دارین تم — مرتضیٰ کے لاڈلے زہرا کے نورالعین تم

سرد باغ انما کے گلبن حسنین تم — یہ تعجب کام میرا چھوڑو ہو مابین تم

یا محی الدین تم بن کون لے میری خبر

تم نبی کے لاڈلے ہو مرتضٰی کے تم ہو لال — حضرت حسنین کے ہو تم چمن کے نونہال

جاں بلب ہو کر میں کہتا ورنہ میری کیا مجال — تم سا میرا پیر ہو پھر کیوں مصیبت ہو محال

یا محی الدین تم بن کون لے میری خبر

دین و دنیا کے ہو والی دو جہاں کے بادشاہ — واقف سرّ حقیقت کاشف سرّ الہٰ

ٹک تو میرے حال پر کر فی سبیل اللہ نگاہ — اے میرے غمخوار (و) مونس اے مرے پشت و پناہ

یا محی الدین تم بن کون لے میری خبر

بادشاہا (کذا) غم نے لیا عیش کا گھر بار لوٹ — دکھ کا دعویٰ ہو گیا دل پر مسلم اور ثبوت

کھا کے اپنے آپکو بیٹھا ہوں مانند عنکبوت (کذا) — یا بدن سے جان نکلے یا ہووے دل کو سکوت

یا محی الدین تم بن کون لے میری خبر

غم کی قینچی کترتی ہے صفحۂ دل کے ورق — عیش کا خورشید ڈوبا دے کے عسرت کے شفق

درد کا استاد دیتا دل ہمارے کوں سبق — اس لیے پیتا ہوں بھر بھر خون اپنے کے طبق

یا محی الدین تم بن کون لے میری خبر

شیشۂ دل میرے کوں غم نے کیا ہے بس شکست — چُور ہویا درد سیں اب جگر میرا لخت لخت

ہو رہا ہے تن میرا باریک مجنوں کی صفت — اے میرے والی عجب مشکل بنی ہے مجھ کوں سخت

یا محی الدین تم بن کون لے میری خبر

ہوں اگرچہ مو بمو اندر گناہوں میں غریق — تم سحاب لطف سوں ہے لیک امید عمیق

اب نہیں دکھ سوں میرا تجھ بن کوئی ہرگز رفیق — تجھ کو اپنا مدعا کہتا ہوں اے میرے شفیق

یا محی الدین تم بن کون لے میری خبر

تم دوا ہر مرض کے دارو ہو تم ہر درد کے — ہم تیرے بیمار ہیں محتاج ماء الورد کے

پہنچ سکتا کو نہیں رتبہ تماری گرد کے — شکر حق دامن لگے ہیں ہم تو ایسے مرد کے

یا محی الدین تم بن کون لے میری خبر

آ گیا افلاس نے ایسا ہے مجھ کوں تنگدست — ہے زباں عاری کروں ظاہر جو اپنی سرگذشت

لشکر امراض نے دیکھی صحت کوں شکست (کذا) — تاں رہا آپس میں اعضا و مبریو کا بندوبست

یا محی الدین تم بن کون لے میری خبر

ہوں نپٹ عاجز میرے اوپر کرم ہے کن کرم — تجھ بنا کس کا ہے یا محبوب سبحانی علم

تجھ بنا کس کا ہے کاندھے اولیا اوپر قدم　　اے شہ عالی نسب اے مظہر نور قدم

یا محی الدین تم بن کون لے میری خبر

کب تلک ایسا رہوں حرص و ہوا میں اسیر　　پاؤں میں شیطان نیں غفلت کی ڈالی زنجیر

یہ تعجب ہے کہ میرا تم سا کامل ہووے پیر　　پھر کرے یہ نفس سرکش اس قدر مجھ کوں زہیر

یا محی الدین تم بن کون لے میری خبر

گرچہ گستاخی ہے تجھ میں مجھ کوں کرنی قیل وقال　　مرچکا یا پیر مجھ کوں ٹک دکھا اپنا جمال

آرزو رکھتا ہوں میں پھر پھر مرا ہے یہ سوال　　کب تلک جلتا رہوں آخر کبھی ہووے وصال

یا محی الدین تم بن کون لے میری خبر

قطب عالم غوث اعظم رہبر دنیا و دیں　　دستگیر بیکسان و جرم بخش مذنبین

اے شہ کون ومکاں وائے شہ شاہان زمیں (کذا)　　تم جناب پاک ہو کہتا ہوں میں کر کے یقیں

یا محی الدین تم بن کون لے میری خبر

اے نفس بس کر نکر توں اب دلیری اس قدر　　ہو چکی فریاد آگے ہرزہ گوئی سربسر

اب کریں گے حال پر تیرے وہی اک دن نظر　　چھوڑ کر سب بات کوں یہ مصرع اپنا ورد کر

یا محی الدین تم بن کون لے میری خبر

نفس اور شیطان مجھ کوں رات دن کرتا خراب　　حرص کی آتش میں جل جل کر ہوا ہوں میں کباب

میں تمہارا ہوں خبر میری تمہیں لیہو شتاب　　راہ عصیاں کا بھلا کر راہ دکھلا ہو صواب

یا محی الدین تم بن کون لے میری خبر

ورد فاضل میں بنایا مدح کہ کر دل پذیر　　دور کر ہو غم میرے کوں تم ہو میرے دستگیر

تم کرو گے مخلصی میرے بروز دارو گیر　　ہے مجھے تجھ ذات عالی پر امید بس کبیر

یا محی الدین تم بن کون لے میری خبر

ولہ

ہوا جب محی دیں کا توں مبارک ہو مبارک ہو　　ہوا فارغ توں دوزخ سوں مبارک ہو مبارک ہو

مبارک نام سے جب عشق دل (اور) جان کا لاگا　　ہوا مقبول دو جگ کا مبارک ہو مبارک ہو

کرم اسرار پاوے گا عنایت محی دیں کے سوں　　تیرے جب پیر وہ شہ ہیں مبارک ہو مبارک ہو

محمد کی نیابت جب تمہیں بخشی ہے اللہ نے　　فرشتے انس و جن کہتے مبارک ہو مبارک ہو

ہوئے شادی ہے ہر گھر موں تمہارا نام جب سنیاں　　بدھائی نور سوں مائی مبارک ہو مبارک ہو

چڑھا جب چاند احمد کا نیابت محی دیں کی سوں | ارے لوگو کہو دل سوں مبارک ہو مبارک ہو
کفر ٹوٹا امن جاگا ہویا ہر سو مسلم دین | ہوئے ہیں شاہ محی الدیں مبارک ہو مبارک ہو
تمامی دین دنیا میں ہویا ہے نام وہ روشن | مسلم دین دنیا موں مبارک ہو مبارک ہو
کرم حق اور محمد کا ہویا ہے محی الدین پر جب | کرو تم یاد محی الدیں مبارک ہو مبارک ہو
نہیں ہے جاں میری پر سوا اس محی دین کوؤ | تمامی جگ کہو مجہ کوں مبارک ہو مبارک ہو
ہو یا فاضل تمہارے نام سے محفوظ دائم جیو | ندا اس ہر طرف سوں ہے مبارک ہو مبارک ہو

ولہ

دیکھو لوگو سبھی جگ پر محمد ہے محمد ہے | سرو سر تاج وہ سرور محمد ہے محمد ہے
انبر دریا وسبھ دھرتی کرم سیں خود نوازی ہیں | اٹھا پلکاں دیکھو بھیتر محمد ہے محمد ہے
تمامی اولیاء مومن پکاریں دین و دنیا موں | ہمارے بخت کا اختر محمد ہے محمد ہے
نوازش خلق نے پائی ہویا جب چاند وہ روشن | ارے لوگو دکھو پر گٹ محمد ہے محمد ہے
دکھو خورشید سب تارے سبھی وہ انبیاء مرسل | کہے دلسوں صفا انور محمد ہے محمد ہے
عرش اور فرش پر دیکھو جو محبوب رب کا ہے | تمامی دین دنیا موں محمد ہے محمد ہے
تمامی ورق ہستی ہی پڑھے ہیں جان دل سوں میں | خدا کے سرّ کا دفتر محمد ہے محمد ہے
اٹھا پلکاں دیکھو دل موں نہیں جز مصطفیٰ کوئی | ابو بکر و عمر عثماں محمد ہے محمد ہے
ملائک جن سبھی کہتے مبارک نام ہے پایا | علی اور فاطمہ زہرا محمد ہے محمد ہے
شریعت فیض سوں کاجی طریقت معرفت چھاجی | حقیقت حق سبھی گھر گھر محمد ہے محمد ہے
تمام دین صاحب سوں ہویا جب چاند روشن جگ | کرم اپنا دھنے دھنپت محمد ہے محمد ہے
ہویا ہے جان و تن میرا ستارا نور روشن کا | گئی ظلمات جاں سوں سب محمد ہے محمد ہے
لگی ہے عشق کی برچھی کہوں میں خلق سوں ظاہر | ارے لوگو دکھو ہر جا محمد ہے محمد ہے
احد احمد تمہیں دیکھو کرم سیں جب نوازا ہے | خدا کے فیض کا مظہر محمد ہے محمد ہے
حسین الحسن زین العابدین دیکھو مبارک نام | منور نور سب بہتر محمد ہے محمد ہے

نواز و فضل کر اپنا طفیل شاہ محی الدین
کہے فاضل لکھو دل پر محمد ہے محمد ہے

ولہ

کہو اے قاصد جائے کر سینہ میرا ہے جل پڑا — بوجھا تھا میں نے سہل یہ عشق آتش گل پڑا
اس عشق سوں جل بل گیا یہ صبر اور سبھ عقل جب — جا کر کہو پیوسوں لوکو غم جان و تن جل تھل پڑا
یہ بھوکھ اور سونا گیا سبھ سوکھ گیا لکھ دکھ لگا — آ کر دکھا یو مکھ پیا میں جان سوں تل مل پڑا
اڑری پریوا نکر نامہ پڑھا محبوب کوں — یہ درد و غم سبھ دیکھ لے اس زار کی گل گل سنا
مرتا ہوں غم سیں اے پیا دارو مرا لب سیں کہو — جب خاک سیں ملکر پروں (کذا) تب بھی کہوں جل بل گیا
جب خاک ہو یہ تن مرا اڑے گا قطرہ قطرہ ہو — لگ کر تمہارے پاؤں سے آ کہوں پیا بل بل گیا
عشرت گئی فرقت بھئی اس جاں کو کیسی بنی — پیو کو ملاؤ کب دھنی یہ جیوڑا دل مل پڑا
مجھ کوں نہیں ہے جیوناں تم سیں سوا دیکھا پیا — اس نام اپنے سے شہا وہ آ مجھے پل پل دکھا
تم ہی دین ہو پاک خوتم نیں جلایا دین کوں — فاضل تمہارے نام سیں دائم کہے بل بل گیا

حضرت[17] غلام قادر شاہ (متوفی 1176ھ)

ان کا پنجابی کلام بکثرت دستیاب ہوا ہے۔ پروفیسر صاحب نے حضرت غلام قادر شاہ کی جو نعتیہ غزل دی ہے۔[18] وہ دراصل انتخاب ہے اور اس میں سے مفصلہ ذیل شعر مفقود ہیں۔

کہیں اسم صفت موں ساتر ہے کہیں اسم صفت میں ظاہر ہے
کہیں بھیتر ہے کہیں باہر ہے سبھ دیکھو نور محمد کا
وہ غیب سوں آ اعیان ہویا پھر علموں جا نہان ہویا
پھر عین موں آ اکوان ہویا سبھ دیکھو نور محمد کا
کہیں روح مثال کہایا ہے کہیں جسم موں جا سمایا ہے
کہیں حسن و جمال دکھایا ہے سبھ دیکھو نور محمد کا
کہیں آدم ہو مشہود ہویا منظور ہو مسجود ہویا
کہیں ہو کر نوح نمود ہویا سبھ دیکھو نور محمد کا
کہیں ابراہیم خلیل ہویا سبھ جگ کا آپ دلیل ہویا
کہیں صادق اسماعیل ہویا سبھ دیکھو نور محمد کا
کہیں یوسف ہو محبوب ہویا کہیں عاشق ہو یعقوب ہویا
کہیں صابر ہو ایوب ہویا سبھ دیکھو نور محمد کا

کہیں موسیٰ ہو کلیم ہویا سن راز قدیم علیم ہویا
کہیں موسیٰ ہو کلیم ہویا سبھ دیکھو نور محمد کا
کہیں ارنی کہ مخمور ہویا کہیں نور ہویا کہیں طور ہویا
پھر جل کر چکناچور ہویا سبھ دیکھو نور محمد کا
کہیں آپ حبیب رسول ہویا کہیں اسد اللہ مقبول ہویا
کہیں حسن حسین بتول ہویا سبھ دیکھو نور محمد کا
کہیں اوّل ہے کہیں آخر ہے کہیں باطن ہے کہیں ظاہر ہے
کہیں سید عبدالقادر ہے سبھ دیکھو نور محمد کا
کہیں سالک کہیں مجذوب کہیں کہیں عارف کہیں محبوب کہیں
کہیں طالب کہیں مطلوب کہیں سبھ دیکھو نور محمد کا
کہیں زاہد مومن کہتے ہیں کہیں شیخ برہمن کہتے ہیں
کہیں قیا دشمن کہتے ہیں سبھ دیکھو نور محمد کا
کہیں درد کہیں درماں ہویا کہیں وصل کہیں ہجراں ہویا
کہیں جنت کہیں میزان ہویا سبھ دیکھو نور محمد کا
جن راز حقیقت بوجھا ہے سبھ جان پہچان کے سوجھا ہے
وہ آپ ہی آپ نہ دوجا ہے سبھ دیکھو نور محمدؐ کا

اس کے علاوہ منقبت جناب غوث الاعظمؒ میں پانچ چھ نظمیں ملتی ہیں۔ میں صرف ذیل کی غزلوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

پیا جن مکھ ترا دیکھا اسے پھر کیا دکھانا ہے
چکھا جن رس تیرے لب کا اسے پھر کیا چکھانا ہے
ہوا ہے دل مرا کولا برہ کی آگ کے بھیتر
ایسی جوتی انگاری کوں کہو اب کیا جرانا ہے
نہ عاقل ہوں نہ دیوانہ نہ محرم ہوں نہ بیگانہ
ایسے بیہوش بے خود کوں کہو پر کیا بتانا ہے
جدائی سے جرے عالمؑ جروں میں روبرو ہر دم
ایسے مجنوں دیوانہ کوں کہو پھر کیا ستانا ہے
گرا کر شیشہ دل کوں لگے جور و جفا کرنے

خدا سے تک ڈرو ظالم گرے کوں کیا گرانا ہے
چھڑکتا ہوں قفس بھیتر میں رووں جگ مجھے ہستا
کبھو دیکھو تبسم کر ہسے کوں کیا ہسانا ہے
پیار کا درس جن پایا ہو یا ناداں نہ جانے کچھ
لیا جن سبق وحدت کا اسے کیا پھر پڑھانا ہے
فنا کے بحر قلزم موں پڑا یہ دل گیا گزرا
نہ جاگے روز محشر کے اسے پھر کیا جگانا ہے
پیا جن جام وحدت کا نہ راکھے خوف سولی کا
انا الحق جب ہویا الحق اوسے پھر کیا ڈرانا ہے
سنوں ہرجا سخن تیرا دیکھوں سبھ موں رخن تیرا
ترا ہوں میں سجن تیرا مجھے پھر کیا لبھانا ہے
غلام شاہ فاضل کا کہے دل سوں سنو یارو
دکھا میں شاہ محی الدیں مجھے پھر کیا دکھانا ہے

ولہ

کیا مجہ عشق نے زخمیں کلیجے تیر مارا ہے
مجے لیجا کرو دارو جہاں وہ پیو پیارا ہے
کیا مجہ درد بے درماں لگا مجہ عشق کا برما
نہ باہر سکھ نہ مجہ گھراں ایسی دکھ سوں سوار ہے
لگائی برہ نے کاری پھروں میں درد کی ماری
حقیقت جا کہو ساری تاں نے مجہ کو مارا ہے
لکھوں جو پیو کوں پاتی جروں جیوں دیو کی باتی
نہ میرے درد کا ساتھی تمہارے سوں پکارا ہے
رکت کی انسواں رووں برہ کے بیچ ہی بوواں
پیا بن رین کیوں سوواں جہاں پر جیو وارا ہے
شہاں کے وار نے جاؤں پیا کا درس جب پاؤں
شب و روز پیو کوں گاؤں جو ہر دم جپ ہمارا ہے
چلی ہے چشم پرنم سوں گئے مرجھائے ہم غم سوں
نہ پوچھی بات تم ہم سوں جو کوؤ بھی ہمارا ہے

(اس غزل میں تخلص موجود نہیں مگر عنوان پر ''حضرت غلام قادر شاہ'' لکھا ہے)

اس سلسلے میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شیخ فاضل شاہ کے دوسرے بیٹے شیخ غلام غوث علی بھی شاعر تھے۔ ان کا اردو اور پنجابی کلام نہیں مل سکا۔ فارسی کی چھ سات غزلیں اسی تخلص (یعنی غلام) سے بیاض میں موجود ہیں۔

شیخ[20] نصیرالحق نصیرا

ان کا کلام زیادہ تر ہندی اور پنجابی میں ملتا ہے۔ اردو میں صرف ایک مثنوی کا انتخاب دیتا ہوں۔

دھن دھن بھاگ اس نار کے جو شوہ من بھاوے — سورے لاگل پئو کوں سکھ رین بہاوے
جے سو روپ کرروپ ہے اور اوگنہاری — جب من بھاوے پئو کے ہے سندر ناری
دیکھ ہمارے بھاگ کوں رو میری مائی — کبو نہ ہس کے گل کبی نہ لے گل لائی
ناگن روپ نہ مال ہے اور آو کمینی — کس بدھ پادواں لال کوں میں کرتا ہینی
ہم سی نار کچیل کوں کیا آدر ہووے — ایسا سندر سوہنا کب لاگل سووے
پئو گن دتا بہت ہے ہم اوگنہاری — چرن پیارے لال کے کوئی موہ لے ڈاری
ایک نہ گن موہ ہوئیا سبھ اوگن کینے — کیا مگہ لے کر جاملوں اوس شہ رنگ بینے
ایک بچھوڑا پئو کا اور گن ناں کوئی — دیکھ میں اپنے حال کوں بھر آنسو روئی
روتے روتے اے سکھی موہ سدھ بدھ چھوٹی — نین ہمارے یوں چلے جیوں گاگر پھوٹی
تڑپھت پڑپھت میں مروں اے پئو گھر آؤ — میں بلہاری اے پیا آدرس دکھاؤ
بہی پورانی میں سکھی میرا لال رنگیلا — کس بدھ مجھ کوں آ ملے کچہ کریو حیلا
رات اندھاری پئو بنا ہو ناگن آئی — پل پل موہ کو آڈسے سن میری مائی
کہاں بسیو تم لال جیو میں بل بل جاؤں — آگ لگے اس جیو نے جو درس نپاؤں
موہ اکیلی چھوڑ کر تم کہاں سدھائے — آون آون کہ گئے پھر آپ نہ آئے
دیکھ میں سونجی سیج کو نین بھر بھر روئی — سولاں پرکا سوناں ہائے کیسی ہوئی
رین گئی سبھ دوکھ موں اب بھوروں آئی — جلتی جلتی اے سکھی موہ رین بہائی
جو کچھ ہم پر آبنی کس رو بتاؤں — پتیم جانے جان ہے اور کسے سناؤں

اے نصیرا پیدا کی تم آسادھارو
بل بل واری پیر کے تم رو پکارو

اب میں ان شعراء کا ذکر کروں گا جنہوں نے اپنے مرشدوں کے تتبع میں اردو میں طبع آزمائیاں کیں۔

امامی

میاں امام بخش نام، قادری نسبت اور ابوالفرح سید فاضل شاہ بٹالوی کا مرید تھا۔ یہ مخمس بطور مناجات دستیاب ہوا ہے[21]۔ کلام میں فارسی ترکیبیں عام ہیں۔

اے صبا بغداد موں میری طرف سوں کر گذر — در جناب پیر پیراں باادب سوں عرض کر
کاے شہ ہر دو جہاں بر بندۂ خود یک نظر — ہے بڑا دربار موں تیرے خراب و بے ہنر
یا محی دیں بہر خدا اس زار کی لینا خبر

حق سے آتا ہے تجھے ہر روز لبیک و سلام — مصطفیٰ بھی مرحبا کہتے ہیں تجکوں صبح و شام
کام بخشی سوں تیرے عالم ہوا ہے شاد کام — تجہ نگاہ فیض ہی کا منتظر ہے یہ غلام
یا محی دیں بہر خدا اس زار کی لینا خبر

دستگیر عالم کے ہو تم قبلہ حاجات تم — نور چشم اہل بیت و سیدالسادات تم
حل ہر مشکل کے ہو تم دافع آفات تم — مجہ عاجز ادہین کا ہرگز نچھوڑیو ہاتھ تم
یا محی دیں بہر خدا اس زار کی لینا خبر

پیر جیو تم بن نہیں کوئی ہماری تکیہ گاہ — حرص و ہوا و نفس میں ہو یا ہوں بس خوار و تباہ
غرق ہوں دریاے عصیاں موں سراسر پر گناہ — لطف اپنے سوں کرم تک بر غلام بارگاہ
یا محی دیں بہر خدا اس زار کی لینا خبر

جب عنایت حق کی ہوئی ہم نے پایا تم سا پیر — بھاگ جاگے فضل حق سوں واہ طالع بینظیر
شکر حق ہے تجھ سے اپنے پیر پایا دلپذیر — اب تو کچھ چنتا نہیں خاوند ہے میرا دستگیر
یا محی دیں بہر خدا اس زار کی لینا خبر

واہ واہ دونو جگت محبوب ایزد پاک کے — فرزند خاص الخاص ہو تم صاحب لولاک کے
سب اولیا روے زمیں قربان تمہاری خاک کے — اپنے کرم سے سوں راس کر سبھ کام اس غمناک کے
یا محی دیں بہر خدا اس زار کی لینا خبر

سبھ لاج ہے میری تجھے پانو لگے کا ہے شرم — پردہ میرے کوں ڈھانپا دونو جہاں اے محترم
عسرت سیں پہنچی جاں بلب یا پیر جی کرنا کرم — مرتا ہوں از رنج و الم ڈوبا ہوں در دریاے غم
یا محی دیں بہر خدا اس زار کی لینا خبر

ناظمی

سجادہ نشیناں بٹالہ کے مریدین میں سے تھا۔ شاہ نصیر الحق نصیرا کا ہمعصر معلوم ہوتا ہے۔ ایک غزل دستیاب ہوئی ہے، درج ذیل ہے۔

نہیں سمجھا یونہی اب لگ کچھو پیارے مرہم تیرا — جلا مجھ راکھ کر ڈالا عجب دیکھا دھرم تیرا
تنک سی بات پر پیتم ہمن سے روٹھ کر بیٹھے — بہت باتاں رکھا تائیں آپس دل میں بھرا تیرا

پگوں میں پیار کی بیڑی ہتھوں میں ہتھکڑی ہٹ کی   تجن اب چھوٹنا مشکل گلے پھانسی کرم تیرا

دعاگو ناظمی تیرا یہ ہے مانگے سدا نسدن
کہ یہ بازار خوبی کا رہے یارب گرم تیرا

حیات

شاہ ابوالفرح فاضل شاہ بٹالوی کا مرید اور معاصر تھا۔ ایک یہ نظم اس سے منسوب ہے۔ اردو پر ہندی رنگ غالب ہے۔

پیا[22] بن نینوں نیند نہ آوے   پیا پیا کرتی رین وہاوے اللہ اللہ
اس دوکھ پیا کے کچھو نہ سوجھے   آگ برہ کی کیونکر بوجھے اللہ اللہ
یہ دوکھ پیا کا کوؤ نہ جانے   جس تن لاگے سوئی جانے اللہ اللہ
سکھی سہیلی پوچھیں آئے   کیا تری من بیدن بھائی اللہ اللہ
آگ برہن نے بھر اک لگائی   آیہ میرے من بیدن بھائی اللہ اللہ
جس کو آگ برہ کی لاگے   ہووے پتنگا کیونکر بھاگے اللہ اللہ
جس کو صورت برہ کی ہووے   جیو اپنے سے ہتھ دھووے اللہ اللہ
کہت حیات سہیلا سوئی   درس پیا کے پاوے وہی اللہ اللہ

(بیاض محمد یعقوب)

علیم

یہ بھی شیوخ بٹالہ کے مریدین میں سے ہے 1202ھ میں زندہ تھا۔ اس غزل کا مصنف ہے۔

عشق میں کیوں جا پھنسا دل ہائے دل افسوس دل   آگ سوز اس میں جلا دل ہائے دل افسوس دل
کہ دیا تھا سخت ہے زنجیر زلفوں میں نہ پھنس   کیوں دیوانہ ہو گیا دل ہائے دل افسوس دل
طرۂ پیچاں کا کھا کر زخم کیوں جیتا رہے   سانپ کالے نے ڈسا دل ہائے دل افسوس دل
کیوں لگا شیریں لبوں کا جان کہنے کو عبث   زہر پیالہ کیوں پیا دل ہائے دل افسوس دل

عشق کے دریا کا یہ دل کب شناور تھا علیم
غرق ہو کر گم ہوا دل ہائے دل افسوس دل

(بیاض محمد یعقوب؟)

مشتاق

یہ بھی اسی عہد کا شاعر ہے۔ اس کی تصنیف سے پنجابی آمیز اردو میں یہ نظم دستیاب ہوئی ہے ۔

جس پریم رس چاکھا نہیں — امرت پیا تو کیا ہویا
جس عشق میں سر نہ دیا — جگ جگ جیا تو کیا ہویا
دیکھی گلستاں بوستاں — مطلب نہ پایا شیخ کا
دل کا کفر ٹوٹے نہیں — حاجی ہویا تو کیا ہویا
دنیا رہی باقی چلی — کیا حال مجھ بیمار کا
میں موتیا اس غم تیرے — ڈگیا ہویا تو کیا ہویا
قاضی کتاباں کھول کر — مسلے بتاوے اور کوں
اپنی عمل کرتا نہیں — قاضی ہویا تو کیا ہویا
تعویذ اور طومار سوں — ساری عمر ضائع کری
سیکھے کتاباں یاد کر — حافظ ہویا تو کیا ہویا
معشوق تیرے بھیت موں — ثابت کیا میں دین کوں
عالم جو داتا ہو نہ کر — داتا ہویا تو کیا ہویا
درویش صوفی بے خبر — بھولا پھرے اپنے اوپر
جبہ مصلے گوڈے — پہنے پھرے تو کیا ہویا
جب لگ پیالہ پریم کا — تم بیٹھ کر چکھتے نہیں
دارو جو بوزہ بھنگ بھی — پیتے پھرے تو کیا ہویا
جب عشق کے دریا موں — تم بیٹھ کر نہاتے نہیں
گنگا بنارس دوار کا — نہاتے پھرے تو کیا ہویا
لیلی پکاری اے پیا — پی پی کریندیاں جی دیا
معشوق حاصل نہ تھیا — رو رو دیا تو کیا ہویا
سیلی مکا گوڈری — برگت کیا مشتاق موں
گور کا سبد بوجھے نہیں — چیلا بھیا تو کیا ہویا

(بیاض محمد یعقوب)

جلالا

جلال الدین نام معلوم ہوتا ہے۔ ایک بیاض میں جہاں سلسلہ قادریہ بٹالویہ کے بزرگوں کا کلام بالالتزام درج ہے، نعتیہ غزل اس کے نام سے ملتی ہے۔

همن جیسے گنہ گاروں کو ہے تقوئی محمد کا ۔ سوا اس سے نہیں کوئی جو کہ کلمہ محمد کا
زمین و آسماں چودہاں طبق اور عرش کرسی سب ۔ خدا صاحب کیا سب کچھ سبھی صدقہ محمد کا
زلیخا نوجواں ہوئی لگا یعقوب کو دسنے ۔ بہ پیراں عاشقاں بنیاں توجہ سے محمد کا
یوسف کوں نظر ڈاری جب اس محبوب اللہ کے ۔ ہویا تب جتلا عالم تجلّی اس محمد کا
طفیل اس کے ہی ہو یا محی دیں محبوب ربانی ۔ ہویا روشن جہاں کے باغ میں گل اس محمد کا
لیا جس مشک اس گل کا حرام آتش ہوئی ان کوں ۔ امریدوں کو نہیں پرواہ بڑا درجہ محمد کا
اگر بندہ مسلمانی پچھاں آمنت باللہ کوں ۔ صفت ایماں بھی پڑھ لو جو ہے تقوئی محمد کا
اول مانو خدا صاحب ملائک بھی سبھی اس کے ۔ کتاباں بھی سبھی مانو جو قرآں ہے محمد کا
بصدق دل اگر مانو ہو یا خاصہ مسلماں توں ۔ پیغمبر بھی سبھی مانو بڑا درجہ محمد کا
جنہوں کی نیک نیت تھی تنہوں کو سب جمعیت تھی ۔ ہماری یہ نصیحت ہے کہ کہ کلمہ محمد کا

کہے عاجز جلالا ہو نبی کا بول بالا ہو
کرم از حق تعالیٰ ہو پڑھو کلمہ محمدؐ کا

شیخ محمد حاجی

شیخ فاضل الدین بٹالوی کے مریدین میں سے تھا۔ اس ہندی آمیز اردو متصوفانہ غزل کا مالک ہے[23]۔

کنت کنزاً مخفیاً تھا تب کنے یہ بھید نہ پایورے
فاحبت ان اعرف چاہا تب آدم بھیکھ بنایورے
کہا آپ کوں انا من نور اللہ اور خلق سبھی کوں من نوری
تم سیانے سبھی بچار کرو پھر دوسرا کون سمایورے
وفی انفسکم کہا آدم کوں سبھ جان بجھے ان جان ہوئے
ہر طرف بتاؤں وجہ اللہ تم سوں نہ پچھولو کایورے
نحن اقرب جب خبر دیا تب سوچ بڑی سبہ کے من موں

احد سے احمد آپ بنوں پھر کہہ کر عبد چھپاؤرے
حاجی ہیو میرا بھنہ بھیکھی ہے کہیں بھید بتاؤ بھیکھی کا
کہیں فاضل ہو کر درس بھرے کہیں سمرن وچہ چھپایورے

(بیاض یعقوب)

امام بخش قادری

امام بخش قادری نے اسی بحر اور اسی رنگ میں یہ غزل اسی عہد میں لکھی ؎

کان اللہ ولم یک تھا تب غیر نسول سماؤرے
وھوالآن کما ہو کان پھر دوجا کون سداؤرے
کل شئی پے آپ محیط اور آپ ہویا ہر شے لاغیر
تم بدیا سین تک وہاں کرو پھر کسکوں غیر بتاؤرے
من رأنی قدر ای الحق سمجھ لیو احمد لامیم
رب سیں آپ ہی عرب بنیوں پھر ظاہر عبد کہاؤرے
وھوالظاہر وھوالباطن سبھ اشیاء کا عین ہویا
کچھ نہ چھوڑا غیریت سوں کیا وحدت صرف بتاؤرے
عرف النفس کے رمز سوں سبھ کو واقف ہو انجان ہویا
کیسے فن اور جوڑتوڑ سے ہم میں ہمیں بھلاؤرے
من یضللہ لاہادی لہ پس رہزن بیچ موں کون ہویا
ابلیس کوں محض پنواری سوں بازار میں آن بہاؤرے
اللہ نور السموات توں سمجھ تووالارض کے ساتھ
عین ظہور میں مخفی ہو کر عقدہ عجب بناؤرے
ایک ندائے صاف سنائی کن فیکون کے نغمے سوں
زیر اور بم ہزار طور سیں نادر ساز بجاؤرے
برقع پہن انسان کا نکلا وحدت سوں کثرت کے بیچ
اور سیں اور ہی شکل دکھا کر غوغا شور مچاؤرے
بیرنگ آیا جب رنگی سوں تب دھوم پر تھی شور ہویا
کہیں حج گذارے بیت اللہ کہیں تیرتھ گنگ بہاؤرے

بے چون آکو جب چون ستی تب شیخ برہمن ضد ہوے
کہیں خواجہ ہو کر فخر کیا کہیں بندہ نام دھراؤرے
تنزیہ اور جمع موں اللہ کہیں اپنی ذات کا نام کیا
تشبیہ کا بیچ امام بخش کہیں ظاہر اسم کہاؤرے

پروانہ

اس کے نام اور حالات سے کوئی اطلاع بہم نہیں پہنچ سکی۔ یہ ملمع اس کی یادگار ہے۔

شب و روز مجھے پیا بن چین نہ آوے (کذا)   کہیں کوئی ایسا مجھے پیو ملاوے
احوال دل خویش بگو پیش کہ گویم   یہ دوکھ ہمارا پیا کوں کون سناوے
ہیہات کہ یہ عمر ہمہ ضائع ہی کھوی   وہ دم غنیمت کہ پیاسنگ بہاوے
یہ راہ محبت کچھو آساں نہیں اے دل   جب دار چڑھے تب جا منصور کہاوے
پروانہ چوں سوزم چوں شمع ہمہ شب
در ہجر تو حیرانم نت برہ جلاوے

علی

غالباً "بٹالہ سکول" کا شاعر ہے۔ یہ مناجات اس کی تصنیف[24] ہے۔ (بیاض محمد یعقوب)

ترا نام ستار غفار ہے   میرا نام عاصی گنہ گار ہے
پھرا دل ہمارا برے کام سوں   بحق محمد نبی نام سوں
ترا نام قاضی الحاجات ہے (کذا)   کنجی سب دلوں کی ترے ہات ہے
ترازو عمل جب ہمن تولیو   اوہاں کے میرے عیب مت پھولیو
نہ رسوا کرو گے خلق موں مجھے   کہ پیدا کیے کی شرم ہے تجھے
ہمارے گناہوں سے لرزے زمیں   رحم کر رحیما تو الراحمین
جسی پر ترا لطف احسان ہے   سبھی مشکلاں اس کی آسان ہے
میری مشکل آساں کریں توں قدیر   ہمن عاجزوں کا تو ہیں دستگیر
تری دستگیری دائم برقرار   علی رحمتوں کا تو ہر دم ادہار

کامی

اسی عہد اور اسی گروہ کا شاعر ہے۔ اس کے متعلق اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ سوائے اس کے کہ یہ غزل اس کی تصنیف ہے۔

جو جھلک ترے رخن موں سو نہیں شمس قمر موں
جو مزا ترے لبوں موں سو نہیں شہد شکر موں
جیسی بو ترے بدن موں سو نہیں چوئے چدن موں
نہیں ہے مشک ختن موں سو نہیں باس اگر موں
نہ جانوں کس نے سوارا تیرا یہ روپ نیارا
تیرا سا روپ نہ دیکھا کوؤ سندر کے اودہر موں
نہ جانے تیرے نین کوں یہ کاجل کن دیا ہے
پڑا جب عکس نین کا ہویا تب داغ جگر موں
تیرے دونین کالے بھرے دودھ کے پیالے
بھیا مست وہ دیوانہ جو چڑھا ترے نظر موں
نہ کہوں شمس قمر تجھ نہ کہوں پھول سمن تجھ
تیرے سی جوت پیارے نہیں ہے لعل و گہر موں
نہیں ہے جائے سخن کی مری اس تنگ دہن موں
نہ چلے فکر ہمن کا پتلی ترے کمر موں
کروں تعریف جو تیرے محظوظ ہو گیا ہے
کہے جو کامی نمانا نہیں ہے تجھ سا بشر موں

ذیل کی نظموں کے مصنفوں کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا۔

سمجھ بوجھ بہ خیز پیارے عاشق ہو کر سونا کیا ہے
ہس کر لاگ گلے دلبر کے وصل ہویا پھر رونا کیا ہے
روکھے سوکھے غم کے ٹکڑے خون جگر سے نوش کر لے
یہ تو کھانا دوکھ کر جانے چکنا اور سلونا کیا ہے
ساری عمر غفلت میں کھوئی حیف کرو یا فند کہیں (کذا)
یہ تو خمار مستی ظالم بیج کلم کا دھونا کیا ہے (کذا)

یہ دنیا دن چار بنی ہے ہس کر کل سے بول کرے
گل سے ہو کر گل مل پیارے کانٹوں کا پھر بونا کیا ہے
جو توں چاہیں پگ پیو پرن کے عشق منڈ میں جا کہنا
پایا ہے تو کر لے شادی پاے کا پھر کھونا کیا ہے

....

صبح گذشت شام پڑی تو سمجھ پڑی ۔ باقی نہ رہی ایک گھڑی تو سمجھ پڑی
گھڑیال باز نعرہ زند ہر گھڑی گھڑی ۔ جب عمر کی کٹوری بھری تو سمجھ پڑی
نوشک نہالیوں میں مجھے فکر یہ ہویا ۔ جب مائی منے دیہی رلی تو سمجھ پڑی
صندل کے لگانے میں دوکھت ہمن کا سر ۔ جب اینٹ اپنی سیس دھری تو سمجھ پڑی
عمر تمام بیت گئی کچھ عمل نہ ہویا ۔ جب آن بات ہمن سوں پڑی تو سمجھ پڑی

پروفیسر صاحب نے "پنجاب میں اردو" کے صفحہ 262 پر اسی زمین اور بحر میں ایک غزل "میاں احمد" کے نام پر درج کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں غزلیں ایک عہد میں لکھی گئی تھیں۔ ایک دوسرے کا جواب ہے اور بعض مصرعے بادنیٰ تغیر دونوں غزلوں میں مشترک ہیں۔

تضمین

(بر مصرعہائے حافظؒ)

پیا درسن پیاسی میں جلیں انکھیاں تپیں دلہا ۔ الایا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا
پیا پر جتلا ہونا بلا کے گھر موں پڑنا ہے ۔ کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکل ہا
دو زلفوں میں جو دل پھاندا اچھے یونہیں نین دیکھے ۔ زتاب جعد مشکینش چہ خوں افتاد در دلہا
نجانوں کفر ایماں کو کہے معشوق سو کرنا ۔ کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا
پیا کے پاس جانا ہے رہوں کیوں کر سرا بھیتر ۔ جرس فریاد میدارد کہ بربندید محملہا
پڑا ہوں خونی دریا میں پیا بن زار مرتا ہوں ۔ کجا دانند حال ماسبکباراں ساحلہا
پیا کے بزم کی بتیاں چھپیں کیونکر دلوں اندر ۔ نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

سجن کے دیکھنے کا رن چھوڑوں دنیا کہے حافظ
متیٰ ماتلق من تہوی دع الدنیا و اہملہا

ملمع ریختہ

اندریں رہ کے تواند ہر خسیسے بوالہوس — تج پیا کی سو چڑھے جو سیں کاٹ اگے دھرے
عاشقاں راقا ذکرونی در قرآں آمد خطاب — پیا پیا کر جیو دیجے جوں سپہاسر دھرے
عشق بازی جاں گدازی نیست جز جاں باختن — جس ہو چھتا پیا کی سو اور چھتا کیوں کرے
عاشقاں را اے جواں خون جگر باشد شراب — یہ پیالا پریم کا لوہو کی بونداں سے بھرے

(بیاض فضل حسین)

ملمع لاادری

چہ نوشی جام مے ہر دم چو زہر موت ہے پیتا
ترا ساقی حکیم حق یہ پیمانہ پلاتا ہے
بہ ہر سو کجروی برا مارے پیچ و تاب اتنا
تو در سوراخ ہچوں مار سد ہا ہو سماتا ہے
زطعن خلق می رنجی رہے تو بے ادب جب لگ
ملامت گر کی خود را کسی سو کیا کہاتا ہے
مکن شوخی گرت گویم کہ سداہا بن کے چل پیارے
زبان سرزنش صاحب عجائب تازیانہ ہے
جرس جھنجانے دم میں چلا کر کوچ سوداگر
ترا در گوش می آید کہ شور شادیانا ہے
بہ تحسین ہنر یاراں لگے ہیں عیب ہر دل کوں
نمی بیند کمال کس یہ کیا ناقص زمانہ ہے

(بیاض غلام غوث)

"بٹالہ سکول" کے علاوہ مختلف بیاضوں اور سفینوں سے مجھے پنجاب کے مفصلۂ ذیل اردو شعراء کا پتہ چلا ہے۔

جان محمد

میرے جد ششم ہیں۔ پنجابی میں ان کی شاعری مسلمہ تھی۔ حافظ 25 برخوردار ثانی اور میاں محمد 26 جنہوں نے اپنی کتابوں میں بعض شعرائے قدیم کا ضمناً ذکر کیا ہے ان کے پنجابی دوہروں کی تعریف میں رطب

اللسان ہیں۔ حاجی والہ ضلع گجرات وطن تھا۔ خاندانی روایات کے مطابق یہ سب سے پہلے بزرگ تھے، جو اس جگہ آ کر آباد ہوئے۔ پنجابی میں سی حرفی "شہادت نامہ" اور چند دوہرے ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے محفوظ ہیں۔ 1198ھ میں زندہ تھے کہ "شہادت نامہ" کی تاریخ تصنیف ہے۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چار بیٹے تھے۔ ان کا انتقال 1200ھ میں ہوا ہے۔ اردو میں بھی لکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک مناجات ملی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں عروض کی پابندیوں سے آزاد تھے۔ یہ مناجات نماز کے بعد پڑھی جاتی ہے۔ ممکن ہے نثر مقفّیٰ ہی ہو۔ بہر حال اس وقت کے ایک دور افتادہ پنجابی گاؤں میں اردو زبان کے نمونہ کی حیثیت سے اس میں سے انتخاب دیتا ہوں۔

رحیما کریما بہر رسول مرے عیب گنہ کا نہیں انت مول
لقا شفاعت کا کرم مجھ پہ کریو نزول دل زباں پر کلمہ نبی کا ہر دم وصول
نکریو غالب مجھ پر شیطان نفس عدول فضل کرم لطف اپنا رکھیو معمول

....

ترا نام ستار غفار ہے میرا نام عاصی گنہگار ہے
میرے سر پر عیب گنہ کا انبار ہے توہیں کاٹیو عیب میرے تیری عالی دربار ہے
توہیں کریو رحم اپنا مجھے درکار ہے قدرت تمہاری تجھے معلم کیا اسرار ہے

....

میرے عیب گناہ سے یہئی خطا گنہ گار کے گنہ دور کر مہر فضل کی پاہ
بھیجیو کرم اپناں مجھ پہ کریو عطاء میرے خطا کے پردے اٹھا کر دل سینہ کریو صفا
....
مجھے شوق تیرا میں بولوں ثناء

....

پل صراط کی منزل مجھے سخت گھات ہے ترے یہ ہزار سال کا راہ وہ عجب بات ہے
....
اس منزل کا خوف مجھے دن رات ہے
کنجی سبھ دلوں کی ترے ہات ہے مجھے کلمہ نبی کا زباں سات ہے

....

پردہ ہمارا نہ کھولیو برے کام سوں خدایا بحق نبی نام سوں
نبی جیو خدا ستی بخشاؤ اس بدنام کوں دامن اپنے کی لاج رکھیو اس کام سوں
خجل خواری نہ کریو مجھے برے کام سوں توہیں بھیجیو رحم اپنا مجھے اکرام سوں

....

ترازو مرے عیب گنہ کا فضل ستی تولیو — توہیں ڈھاکیو عیب میرے مت کھولیو
دین محمد کا شرف مرے سر پر جھولیو — لطف کرم سے ایمان سنگ جولیو
سر پر وکیل ہے کامل مت ہولیو — کلمہ نبی کا لب جان پل پل سو بولیو

....

نہ کریو خجل رسوا خلق میں مجھے — خجل خواری سے ہم کیا بتاویں تجھے
یاالٰہی پیدا کیے کا شرم تجھے — امہاری عیب خطا پر فضل کرناں تجھے
جان کندن سختی کا آسان کر مجھے — روز حشر کا توشہ ہم سے نہ ہو کچھے
اس روز کا غم النبا بل بل بچے — گرمی حشر عرصات کی سر پر سچے

....

جب امر ہو گا فضل ستی کرم — اس روز نکلا ہو گا محمد کا علم
اس علم کا ساتھ ہو گا بلند عظم — سبھی مومن تلے اس کے ہوویں گے جن وآدم
جب صراط پر رکھیں گے اپنا قدم — کلمہ نبی کا بولیں گے سبھی دم بدم
پیارا ہے خدا کا وہ نور اکرم — کلمہ نہ چھوڑیو نہ کریو بھرم
امت اپنی کی لاج کا ہے اسی کوں شرم — جان محمد وہی ہوگا جو لکھیا لوح و قلم
محمد عربی کا نام اس وقت بولیں گے ہم — تب آتش دوزخ کی بھاگیگی ہزاروں قدم
سنکر نام اس کا شور دوزخ کا ہوگا کم — ضامن ہمارا وہی ہے جو مرسل نور ختم
حاجی والہ جائے سکونت قدیم وایں دم — بندہ خدا و امت رسول ام؟

....

دانا کنجاہی

خوشی محمد نور (جو سلسلہ قادریہ نوشاہیہ کے ایک مشہور بزرگ ہیں اور جن کا ذکر "فرحت الناظرین" میں "محمد خویش کنجاہی" کے عنوان کے تحت میں دیا ہے) کا بیٹا تھا۔ باپ کی طرح فارسی اور پنجابی کا شاعر تھا۔ اس کا ایک اور بھائی بھی شاعر تھا اور عاقل تخلص کرتا تھا۔ نور کا ایک پنجابی شعر مشہور ہے جس میں اس نے اپنے دونوں بیٹوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ؎

سار دی میں سوی بنائی پانا سیتا سینوں نوں
خوشی کہے سن عاقل دا لکھ لعنت سارے جیون [27] نوں

دانا کی تصنیف سے ایک مطبع [28] ہاتھ لگا ہے جو درج کرتا ہوں ؎

چہ بندی دل بریں ہستی کہ دم میں جان جاتا ہے
نخواہی ماند در عالم جگت پر کیا ریجھاتا ہے
..... ساختی منزل تو کر کچھ کوچ کا ساماں
ازیں دار فنا آخر تیرا اک دن چلاتا ہے
چو بینی نعش مردم را فلانی ہاں سمجھ من میں
کساں تابوت تو دیدہ کہیں گے یہ فلانا ہے
اگر فرش توشد مخمل نہیں کچھ اعتبار اس کا
(تو) در خاک لحد خوابی کہ اصلی یہ پچھانا ہے
بہ سر بر تاج بہرامی کہاویں خاں خاناں توں
کفن در برگور آئی کہ خاناں کا یہ خانا ہے
سریرت شد سرکیواں نجانو پائدار اسکوں
بہ پائے دیگراں روزے لحد میں تم نے جانا ہے
نگیرد پاش در ایں راہ سمجھ کر بھارکوں بھارا
بجز تو بار عصیانت کہو کس نے اٹھانا ہے
مشو دیوانہ اے دانا تجھے گر ہوش ہے باقی
نمی باقی اگر دانا تو دنیا کا دیوانہ ہے
ہزاراں گنج گرواری نہ دیویں گے درم تجھ کوں
بماند یک بہ یک از تو ترا کرک خزانہ ہے
چہ کر دی ریش خند آخر تو پھر بھی ہس ہس کر
بہ حال خویش گریاں شو جگت کوں کیا ہسانا ہے
گداہ در گہ حق شو نہ کیجیے شان شاہی کا
گلیم فقر در برکش یہی تیرا شہانہ ہے

محمد علی سید میرک

یہ بزرگ گجرات کے رہنے والے تھے اور گنیش داس وڈھیرہ ساکن گجرات اپنی کتاب "صاحب نامہ" میں ان کے متعلق لکھتا ہے: "محمد علی سید میرک تخلص در علم اشعار فارسی اندک گو خوب" مجھے ان کے فارسی کلام کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہوسکا مگر ایک قلمی بیاض میں ان کی ایک اردو غزل بھی ملی ہے جس سے معلوم ہوتا

ہے کہ سید صاحب اردو میں بھی طبع آزمائی فرمایا کرتے تھے۔ وہاں ان کا نام میر محمد علی شاہ دیا ہے۔ وہ غزل یہ ہے ۔

صحبت[29] عشرت ہے مے پی لو بہاراں پھر کہاں
ساغر مے گل بکف اے بادہ نوشاں پھر کہاں
اب چمن کے تخت پر بیٹھا ہے گل اے عندلیب
کر لے مجرہ ورنہ یہ تخت سلیماں پھر کہاں
ہیں دکھتے داغ میرے دل کے انجم کی طرح
کر گزر اس انجمن پر یہ چراغاں پھر کہاں
کچھ کرو جو ہو سکتا ہے میرک کا علاج
جب گیا ہاتھوں سیں یہ بیمار درماں پھر کہاں

(منقول از بیاض مملوکہ پروفیسر ضیا محمد)

اسی بیاض میں اسی غزل کی ہم طرح ایک غزل یقین[30] کے تخلص سے ملتی ہے۔ غالباً یہ شاعر معاصر میرک تھا اور ممکن ہے کہ یہ دونوں غزلیں بطور معارضہ لکھی ہوں۔ یقین کی غزل درج ذیل ہے[31] ۔

عمر آخر ہے جنوں کر تو بہاراں پھر کہاں
ہاتھ مت پکڑو میرا یاراں گریباں فر کہاں
یار جب پھرے جواہر کر چک اے دل جاں نثار
جل چک اے پروانہ رنگیں چراغاں پھر کہاں
اس طرح صیاد کب آزاد چھوڑے گا تمھیں
بلبلو دھومیں مچا لو یہ گلستاں پھر کہاں
ہے بہشتوں میں یقیں سب کچھ ولیکن درد نہیں
بھر کے دل رو لیجیے یہ چشم گریاں پھر کہاں

(منقول از بیاض مملوکہ پروفیسر ضیا محمد)

اسی سلسلے میں ہم یقین کی ایک غزل دیتے ہیں ۔

دن جنوں کے آن پہنچے ہوشیاراں الوداع
فصل گل نزدیک آیا اے گریباں الوداع
میکدہ سے قصد مکہ کا کیا اب کیا کریں
توبہ ہم سے ہو گئی اے مے پرستاں الوداع

جس گھڑی صیاد ظالم لے چلا بلبل کو باندھ
ہاتھ مل مل یوں لگے کہنے گلستاں الوداع
ناتوانی سے مجھے جور و جفا کی تاب نہیں
اب یقین بوڑھا ہوا اے نوجواناں الوداع

اشرف نوشاہی

ان کی پنجابی کافیاں فرقہ نوشاہیہ کی مجالس وجد و حال میں بہت مقبول ہیں۔ فارسی اردو اور پنجابی کے پُرگو شاعر تھے۔ ان کی ایک کتاب ''کنز الرحمۃ'' نام فارسی میں طبع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنے مرشد حضرت حاجی محمد نوشہ (متوفی 1064ھ) ان کی اولاد اور ان کے خلفاء کے حالات و کرامات فارسی زبان میں منظوم کیے ہیں۔ یہ کتاب 1220ھ ہجری میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب سے مصنف کے جس قدر حالات مل سکے ہیں، یہ ہیں:

ان کا اصلی نام عزیز الدین تھا مگر بچپن سے ہی لوگ انہیں اشرف کے نام سے پکارتے تھے۔ اخیر میں یہی نام مشہور ہو گیا۔ ان کا اصلی وطن پانڈو کے میں تھا اور ان کے آباؤ اجداد کا مسکن بھی وہی گاؤں تھا مگر اشرف بعد میں موضع منچر ضلع گوجرانوالہ میں چلے گئے۔ اس وقت وہاں کا سردار غلام محمد چٹھہ تھا جسے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے باپ مہان سنگھ نے شکست دے کر چٹھوں کی طاقت کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔ اس واقعہ کی تفصیل کے لیے ''چٹھیاں دی وار'' مرتبہ راقم الحروف ملاحظہ ہو۔ ان کی فارسی اور اردو و پنجابی نظموں کا نمونہ ایک بیاض 32 قلمی میں ملا ہے، جس میں سے صرف اردو حصے کا انتخاب درج کرتا ہوں:

مخمس

اے سجن تیرا حسن جو ہے واہ واہ   کچھ ہماری طرف بھی کچھ نگاہ
ہجر تیرے نے کیا مجھ کو تباہ   آجکل کرتا ہوں غم سے سربراہ
تم رہو جیتے ہماری ہے صلاح

طرف میری بھی کبھی آیا کرو   چاند سا مکھ اپنا دکھلایا کرو
بات میٹھی ساتھ پرچایا کرو   خاک مجھ پر پاؤں رکھ جایا کرو
تم رہو جیتے ہماری ہے صلاح

دم بدم ہجراں ستاتا ہے مجھے   درد اندیشہ دکھاتا ہے مجھے
جیوناں تجھ بن نہ بھاتا ہے مجھے   مرن اپنا یاد آتا ہے مجھے

تم رہو جیتے ہماری ہے صلاح

ہر طرف فتنہ اٹھاتا ہے رقیب کب تلک روتا رہوں گا میں غریب
اجل سر پر آ کھڑی ہے عنقریب پھر ملن ہووے نہ ہووے یا نصیب

تم رہو جیتے ہماری ہے صلاح

ہر زماں اشرفؔ کھڑا ہے در اوپر والہ و دیوانہ پھرتا گھر بہ گھر
لطف اپنے سے کرو اس پر نظر ورنہ داماں تجھ پکڑوں گا ور حشر

تم رہو جیتے ہماری ہے صلاح

اشرف

غزل(1)

مجھ خرمن جاں بیچ ایسی آگ پڑی ہے خاشاک جو تھی غیر کی یکمشت لڑی ہے
دو تین ترے ساحر فرعون کے استاد یا جادوے بنگالہ و یا پریم چڑی ہے
خورشید اوپر آ کے شفق ہو گئی ظاہر یا خوب تیرے ماتھے اوپر لال دھڑی ہے
اولاک تیری پر حیا مشاق ہویا(؟) بجلی کوں مگر کاٹ کے استاد گھڑی ہے

اشرفؔ میں کیا لکھوں گا اس حسن کی تعریف
عین است اگر اسکوں کہا حور پری ہے

غزل(2)

جب نہ تھا عشق کیا گذرتی تھی غم کی رخ پر نگہ نہ پڑتی تھی
ہاتھ اپنے میں تھی یہ دل کی عناں نہ کسی پر اولارا کرتی تھی
طبع آزاد مجھ کسو کے ساتھ کب سخن کا دھیان کرتی تھی
کوچھ اندیشہ نہ تھا نہ کچھ وسواس آنکھ آنسوؤں سوں کچھ نہ بھرتی تھی
جان دشمن کی دیکر میری طرف آب غیرت موں ڈوب مرتی تھی
مرغ دل تھا ہمیشہ درِ پرواز دام زلفوں کی کچھ نہ اڑتی تھی

اشرفؔ یہ بات کچھ نہ تھی معلوم
جب تلک اپنے پہ نہ ورتی تھی

غزل (3)

(ذیل کی نظم میں "دوازدہ معصوم" کی فہرست دی ہے)

دلا تجھ کو ایماں خدا دیوے گا بہشتوں میں جا مصطفیٰ دیوے گا
نہ کر غیر پر حال اپنا عیاں مطالب ترے مرتضیٰ دیوے گا
حسین و حسن فاطمہ کے دو نین تیرے درد کا وہ دوا دیوے گا
کرے گا کرم شاہ زین العباد وہ ہر درد و غم کو گوا دیوے گا
بروز حشر باقر باصفا زا ہوال دوزخ چھڈا دیوے گا
ہویا شاہ جعفر امام قدم تجھے جام وحدت پوا دیوے گا
زہے پیشوا شاہ موسے رضا دلوں کیاں مراداں پچا دیوے گا
کرو ورد نام تقی و نقی خدا سو کشایش کرا دیوے گا
رکھوں دلوں گر عسکری کا دھیان ہمہ بیخ غم کی اٹھا دیوے گا
ہویا مہدئے پاک آخر زماں فرش دین کا تجھ وچھا دیوے گا

سنا اشرفؔ این منقبت خلق کوں
خدا دوجہاں تم جزا دیوے گا

غلامی

بارھویں صدی کے شعراء میں سے ہے۔ اس کی تصنیف کردہ دو غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔

اے باد صبح حال میرے یار کوں جاکوہ ہر حال سے میرے بندگی دلدار کوں جاکوہ (کہہ)
مانند دیوانے کے ہوا ہوں دیکھ میرا کام حالت میرے اوس پلک دار کوں جاکوہ
آرام نہیں جان کوں اے جان تیرے بن دیدار دکھا سندر دیدار کوں جاکوہ
گر ایس طرح دل سیں بھلاؤ گے ہمیں کوں جاوے گی میری جاں ستم گار کوں جاکوہ
ہر غیر کے سنگ سیتی محبت نہ کرو تم اے باد صباح اوس مرے اغیار کوں جاکوہ
شیشہ مرے دل کا میں تیرے ہاتھ دیا ہے مت چور کرو حسن کے سرشار کوں جاکوہ

ہویا ہے تیرے جسم سے بیمار غلامیؔ
لے اوس کی خبر اوس میرے یار کوں جاکوہ

(بیاض خود)

ولہ

جان و دل کنوں بیقراری ہر صباح | ہے کوں الفت ہے تو مہاری ہر صباح
چلتی ہے غم کی کٹاری ہر صباح | غمزہ آوے یاد جب اس چشم کا
چشم کوں ہے انتظاری ہر صباح | مہر کر میری طرف سے کر گذر
کام ہم کا گریہ زاری ہر صباح | دمبدم غم تو ستاتا ہے موجے
غیر سے کرتا ہے زاری ہر صباح | بیوفائی اس صنم کی کیا کہوں
کیف کی جیونکر خماری ہر صباح | دلکوں بیماری صنم کے عشق کی
نین تو رہتے ہیں جاری ہر صباح | باغ عشق کا ہر گھڑی سرسبز ہے
ہے مری فریاد زاری ہر صباح | اے صنم دیدار دکھلاتا نہیں
جان جاتی ہے ہماری ہر صباح | ہجر کا دکھ درد میں کس کوں کہوں

کب کرے دلبر غلامیؔ پہ فضل
شوخ کرتا ہے عیاری ہر صباح

(بیاض غلام غوث)

جانی

نام و مقام وغیرہ کے متعلق کچھ پتہ نہیں۔ ایک بیاض سے جس میں ایک معاصرانہ مادہ تاریخ 1128ھ کا دیا ہوا ہے' یہ مناجات ان کی دستیاب ہوئی ہے:

خدایا ستر کن عیبم کہ ساتر نام ہے تیرا | نبی توں خلق دا والی تجھی کوں شرم ہے میرا
مجے غفلت دبایا ہے ضلالت رہ بھلایا ہے | گناہاں پایا گھیرا الٰہی آسرا تیرا

نبی جی آسرا تیرا

شب و روزم بہ حیرانی زدسو سہائے شیطانی | درون سینہ اندھیرا الٰہی آسرا تیرا

نبی جی آسرا تیرا

ولم کا ذر کی منزل کیا صورت ہوئی وردل | کیا حرص وہوا ڈیرا الٰہی آسرا تیرا

نبی جی آسرا تیرا

نجات جملہ عاصی وہ جہنم سے خلاصی وہ | نہیں کوتہ بنا میرا الٰہی آسرا تیرا

نبی جی آسرا تیرا

دنی بازی الیا واری کے جیتی کے باری مگر نادت ہے پھیرا الہی آسرا تیرا
خداوندا توئی دانی نرفتہ از درت جائی بھلایا بجرم بتیرا الہی آسرا تیرا
نبی جی آسرا تیرا

(بیاض مولوی غلام مصطفیٰ وکیل)

ہاشم

اس کے متعلق سوائے اس بات کے کچھ معلوم نہیں کہ اس غزل کا مصنف ہے۔

اے دلبر شیریں زباں انصاف کردا کیوں نہیں
تجھ چھوڑ گھر جانا کہاں انصاف کردا کیوں نہیں
ساکن ترے دربار کا طالب تیرے دیدار کا
برچھا لگا ہے سار کا انصاف کردا کیوں نہیں
اے بے وفا انصاف کن از من گناہ معاف کن
انصاف کن انصاف کن انصاف کردا کیوں نہیں
غم نے میرے دل کو کیا لے کر اٹھایا تھکوں دیا
غم نے میرے پرزے کیا انصاف کردا کیوں نہیں
ہاشم بچارا مر رہا دربار تیرے پہ چھڑا
ہائے ہائے نہ کوئی کر رہا انصاف کردا نہیں

(بیاض غلام غوث)

خلدی

عبدالرحمن نام ہیرانوالہ ضلع گوجرانوالہ کے رہنے والے پنجابی اردو فارسی میں مشق سخن کرتے تھے۔
پنجابی میں ان کی ایک سی حرفی مطبوع و مقبول ہے۔ ان کی اولاد اب بھی موضع ہیرانوالہ میں موجود ہے۔

پیارا ہمارا گیا ساہورے اسیں اس بنا ہو رہے باورے
کوئی ایسا ہووے کہے جا اسے جو مدت ہوئی گھر کبھو آوڑے
جدائی سے رو رو وہائی ندی یہ کرتے ہمارے نین باوڑے
نہ شب ہے آرام اور نہ دن کو قرار اٹھے پہر پھرتے رہے باوڑے
یہ خلدی کوں تجھ بن اندھیرا ہویا

دنی چند مکھڑا تو دکھلا دُرے

(بیاض غلام غوث)

....

آج ہے یار نے جدا ہونا پھر شتابی نہیں ملا ہونا
جان میری بدن سوں زود نکل خوش نہیں غم میں مبتلا ہونا
اے سجن مجھ سیں تم جدا مت ہو اگر اک دن تو ہے جدا ہونا
گر محبت موں سال گذرے ہیں اب نہیں خوب بے وفا ہونا
تم نے جے کر جدائی کرنی تھی اولی نہ تھا آشنا ہونا
وصل تیرے موں بادشاہی ہے اب پڑا دربدر گدا ہونا
خلدیا صبر کر نہ ہو غمناک
جب نہیں طالب رضا ہونا

(بیاض غلام غوث)

احمد یار ''مرالے والا''

پنجابی زبان کا بہت پُرگو شاعر ہے۔ خود کہتا ہے کہ اس نے چالیس سے زیادہ ضخیم قصے اور کتابیں لکھیں اور سی حرفیوں' بارہ ماسوں اور مختصر نظموں کا کوئی شمار ہی نہیں ہے۔ مفصلہ ذیل پنجابی کتب اس کی تصنیف سے معلوم ہو سکی ہیں۔

سیف الملوک' قصہ کامروپ' ملکی کیماں' مصری بائی' چندر بدن ماہیار' مرزا صاحباں' سوہنی مہینوال' روڈا جلالی' شیریں فرہاد' معراج نامہ' ترجمہ معارج النبوۃ رکن چہارم' شرح قصیدہ بردہ' شرح دعاء سریانی' شرح قصیدہ روحی' شرح قصیدہ غوثیہ' شرح امالی' جنگ نامہ علیؓ' وفات نامہ اصحاب ثلثہؓ' جنگ نامہ امام حسنؓ' جنگ نامہ امام حسینؓ' قصہ تمیم انصاری' ترجمہ مشکوٰۃ المصابیح' خواب نامہ' بازنامہ' اسپ نامہ' نل دمن' قصہ حاتم طائی' تیتر نامہ' یوسف زلیخا' ہیر رانجھا' قصہ راج بی بی' قصہ سسی پنوں' لیلیٰ مجنوں' رنجیت سنگھ نامہ (فارسی)۔

ان کتابوں میں سے مصنف کے جو حالات معلوم ہو سکے ہیں' وہ یہ ہیں:

اس کے بزرگوں کا وطن سوہدرہ متصل وزیر آباد تھا۔ اس کے دادا جلالپور جٹاں ضلع گجرات میں مقیم

ہوئے۔ طبابت پیشہ تھا اور احمد یار کا ذریعہ معاش بھی امامت اور طبابت تھا۔ یہ جوانی میں قلعہ اسلام گڑھ میں (جو رحمت خاں وڑائچ جلالپوری نے اپنے باپ اسلام خاں کے نام پر بنایا تھا) بود و باش رکھتا تھا۔ وہاں ایک جاٹ سے محبت ہوگئی۔ کچھ عرصہ تو رازِ عشق چھپا رہا۔ آخر ظاہر ہوا۔ لڑکی کے خویشوں کی غیرت جوش میں آئی اور میاں صاحب کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔ موضع گھنیاں تحصیل پھالیہ میں کچھ عرصہ قیام رہا۔ آخر "موضع مرالہ" میں جو اسی تحصیل کا گاؤں ہے جا مقیم ہوا۔ اخیر عمر تک وہیں قیام رہا اور شعر گوئی میں عمر بسر کی۔ وہ خود کہتا ہے کہ میں چالیس برس سے زیادہ اس شغل میں مشغول رہا۔ راجہ گلاب سنگھ کی فرمائش پر گرنتھ صاحب کے کچھ حصوں کا فارسی میں ترجمہ منظوم کیا۔ اور اسی راجہ کے حکم سے "رنجیت سنگھ نامہ" "شاہ نامہ" کے وزن پر فارسی میں لکھا جو اس وقت مولوی محمد لطیف صاحب ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول پھالیہ کے پاس موجود ہے۔ اردو میں صرف دو شعر[33] دستیاب ہو سکے ہیں۔ درج کرتا ہوں:

جہاں سیتی پڑا غلغل تری افواج جو بن سیں
عجب شمشیر ابرو سے شہیداں کوں بہار آئی
کہو بلبل قفس سوں سوں نکل کر سیر گلشن کا
جہاں سوں موسم شادی ہو یا رنگیں بہار آئی

میر نتھو شاہ لاہوری حکیم

معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب ذات کے سید تھے اور طبابت کیا کرتے تھے۔ اردو میں شعر بھی کہتے تھے۔ ان کی ایک غزل ایک بیاض[34] سے نقل کرتا ہوں:

نہ پوچھ خونیں دلوں سے قصہ خوش ہو رہ بلا نہ ہرگز
برنگ غنچہ لہو بھرے ہیں ہمارے لب کوں کھلا نہ ہرگز
بھری ہیں خون جگر سے آنکھاں نہ چھیڑ تجکو قسم ہے تجھ کو
کہ ہیں لبالب یہ دو نو شیشے چھلک پڑیں گے ڈھلا نہ ہرگز
سوا ہمارے ایس ایک دل کے وہ کون غنچہ کہ جس کے اوپر
صبا لگاوے بہت سے زورے پھر ایک دم بھی کھلا نہ ہرگز
سرشک عشاق کے تو ظالم کرے ہے پامال ڈر خدا سے
جنہوں کو آنکھوں میں ہم نے پالا انہوں نے زمیں میں رُلا نہ ہرگز
رقیب سرکش بخواب سے ہو گیا ہے تو کیا ہوا ہے
نہ چھیڑ اس کو وہ مردہ دل ہے موا بھلا ہے جلا نہ ہرگز

''تاریخ لاہور'' مصنفہ کنہیالال میں لکھا ہے: ''یہ شخص بھی صاحب تصانیف حکیم تھا۔ کتاب تبصرۃ الاطباء و مرأۃ الشفاء اس کی عمدہ تصانیف میں سے موجود ہے۔ اس کے خاندان میں سے حکیم عنایت شاہ جس کی عزت و توقیر لاہور میں بہت تھی' اس کا مقبرہ بھی اس کی نشست گاہ کے مقام پر شہر کے اندر پختہ بنا ہوا ہے۔ وہ لاولد رہا مگر اس کے ہمشیرہ زادے محمد شاہ' بہادر شاہ و بزرگ شاہ لائق و فائق حکماء میں سے ہوئے ہیں۔ تینوں کے مطب شہر میں جاری تھے۔ اب محمد شاہ فوت ہو چکا ہے۔ اس کا لائق فرزند عالم طبابت کرتا ہے۔''

حکیم صاحب کی یہ اردو غزل ایک بیاض[35] میں ملی ہے۔

ایک قدیم بیاض میں سے مفصلہ ذیل شعراء کے نام اور ان کا کلام دستیاب ہوا ہے۔ اس بیاض میں تین چار جگہ تحریر مطالب متفرقہ کی تاریخیں 1182ھ و 1205ھ و 1207ھ' 1208ھ درج ہیں۔

ریختہ رام سنگھ

سجن اپنے کی منت کر مگر گھر موں بلاؤں میں
کروں جھاڑو دو پلکوں سیں سبھی گھر موں بھراؤں میں

وفا اخلاص کے فراش جب راکھوں مقرر کر — محبت کا فرستارا مگر گھر موں بچھاؤں میں
قلیچہ شوق کا کاڑھوں سجن کے بیٹھنے کا رن — لیوں مخمل تحمل کر بنا تکیہ لگاؤں میں
بناؤں کیف داروں کے پیالہ سوز دل سیتی — کروں سینہ کباب اپنا رکھا سیخاں ملاؤں میں
سناؤں کوک کا تارا جو ہوے مست لذت سوں — دو نینوں کے چراغاں کر پیا آگے جلاؤں میں

جو راضی ہو کہے کہ رام سنگھ حالت تیری کیا ہے
برہوں نے یہ کیا مجھ پر لیا یک کہ سناؤں میں

عالم گجراتی

(ملمع)

ہرگز ندیدم درجہاں ...... سخن تج سار کا — پیارے کرم کن یک زماں محتاج ہوں دیدار کا
ازبس فراق تو سجن پھرنا پڑا ہے دربدر — بے وصل تو دارو نہیں پیارے مرے آزار کا
گجرات کے بازار موں جب تم لٹک کر چلتے ہو — عالم کہے یہ سرو ہے یا کبک ہے کہسار کا

مقبل (ریختہ)

ترے دو نین خونی نے مجھے بے جرم مارا ہے — قیامت کوں مرا چنگل پیا دامن تمہارا ہے

زہے طالع زہے دولت زہے میری شہادت شد کہ میرے قتل پر معشوق نے امشب سوارا ہے
خدا ...... تجھ کوں ترا کیسا کٹھن ہردا نہ ہو مغرور صورت پر کہ یہ دو دن شرارا ہے
نہ ہو مغرور طاعت پر نصیحت مان کر کہنا خدا کے بخشنے کا راہ اے زاہد نیارا ہے
چرا معشوق میرے پر نہ ہووے مہرباں یارو کہ مدت سے ولایت عشق میرا کام اُجاڑا ہے
ہویا ہوں جتلا میں بات بیجا مان کر سن کر تو کہتا تھا رقیبوں کو مجھے مقبل پیارا ہے

طالب

شیلا نہیں تم بے خبر چونی جڑے رخسار پر عاشق کبھی قرباں کیے معشوق کے دیدار پر
معشوق میرا سوہنا تن من جو میرا موہنا باتاں کرے شیریں زباں صدقے کیا گفتار پر
.... حقا الٰہی کیا کیا آنسوں لگے جھرلاء کر
میرا جو من تیں نے لیا تیں نے مجھے غم کو دیا غم نے مجھے ایسا کیا جیسا پتنگا شمع پر

طالب طلب تیری کروں تیرے جو چندا میں تروں
دیگر طلب کس کی کروں یک شب ملوتم آئے کر

شیخ احمد

ملو خوش ہو مجھے ساجن ہوئی اج دیپ مالا ہے چراغاں ہر طرف روشن ہوئی اج دیپ مالا ہے
تماشے دیکھنے کارن جو عالم سر بسر نکلا مجھے تجھ درس کی شادی ہوئی اج دیپ مالا ہے
کہ یاران جہاں سارا ہی ہے بازار موں ساجن کریں وہ عیش اور عشرت ہوئی اج دیپ مالا ہے
میں ہوں مشتاق درسن کا کھلا ہوں در تیرے اوپر درس کی بھیکھ دہ دلبر ہوئی اج دیپ مالا ہے

تیرے اس ہجر سوں ساجن تر سہدا شیخ احمد ہے
اوٹھا گھونگھٹ دکھا درسن ہوئی اج دیپ مالا ہے

حواشی:

1- پنجاب میں اردو، صفحہ 231- 2- پنجاب میں اردو، صفحہ 234-
3- بیاض مملوکہ مولوی غلام مصطفیٰ صاحب وکیل لاہور۔ اسی دیوان میں امیر خسرو کا اردو (ہندی) دوہرہ دستیاب ہوا ہے۔ ے

چند جیوں آسمان لے جاں شہ جیوں اسوار
دیکہ خسرو خاک میں جانہ یک کے بار

4- بیاض محمد یعقوب　　5- پنجاب میں اردو' صفحہ 53۔

6- جواہر فریدی (ترجمہ اردو' 192)　　7- بیاض مملوکہ پروفیسر ضیا محمد۔

8- پنجاب میں اردو' صفحہ 95-294　　9- تذکرۂ نجات

10- گلشن بے خار بحوالہ اشپرنگر' صفحہ 255

11- اشپرنگر' صفحہ 187۔　　12- اس کے آگے کا ورق گم ہے۔

13- بیاض مملوکہ قاضی فضل حسین۔　　14- بیاض مملوکہ خود م۔

15- پنجاب میں اردو' صفحہ 242

16- قصیدہ غوثیہ کے مطلع ۔ سقانی الحب کاسات الوصال فقلت لخمرتی نحوی تعال کی طرف اشارہ ہے۔

17- پنجاب میں اردو' صفحہ 250　　18- پنجاب میں اردو' صفحہ 253

19- اس غزل میں تخلص موجود نہیں مگر عنوان پر "حضرت غلام قادر شاہ" لکھا ہے۔

20- پنجاب میں اردو۔　　21- بیاض محمد یعقوب۔

22- بیاض محمد یعقوب۔　　23- بیاض یعقوب۔

24- بیاض یعقوب۔　　25- قصہ یوسف زلیخا۔

26- سیف الملوک و بدیع الجمال۔

27- جیوں تیسرے بیٹے کا نام تھا جو حکومت کی ملازمت میں تھا اور باپ اس سے ناراض تھا۔ (زبانی روایت)

28- بیاض محمد یعقوب۔　　29- منقول از بیاض مملوکہ پروفیسر ضیا محمد۔

30- یہ صاحب غالباً انعام اللہ یقین ہیں' جو درد کے شاگردوں میں سے تھے۔

31- منقول از بیاض مملوکہ پروفیسر ضیا محمد۔

32- بیاض مملوکہ پروفیسر ضیا محمد۔　　33- بیاض مملوکہ پروفیسر ضیا محمد۔

34- بیاض مملوکہ پروفیسر ضیا محمد۔　　35- بیاض مملوکہ پروفیسر ضیا محمد۔

(در: اورینٹل کالج میگزین' فروری 1933ء' 46-91)

قاضی فضل حق

پنجاب میں اردو

''اورینٹل کالج میگزین'' بابت فروری 1933ء میں میرا ایک مضمون بعنوان بالا شائع ہو چکا ہے۔ وہاں میں نے ایک اردو نگار پنجابی شاعر اشرف نوشاہی کا مختصر حال درج کیا تھا اور اس کی چند غیر مطبوعہ غزلیں بطور نمونہ دی تھیں۔ اس کے بعد مختلف بیاضوں سے مجھے اس کے ماثر میں سے ذیل کی غزلیں دستیاب ہوئی ہیں، جنھیں ناظرین میگزین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور آخر میں خلدی نام ایک شاعر اور دوسرے چند مجہول الاسم اردو نویسان پنجاب قدیم کا کلام بھی تبرکاً درج کرتا ہوں۔ حاشیے میں پنجابی الفاظ کے معنی اردو میں دیے گئے ہیں۔

مستزاد اشرف

جب پہر[1] قبا تنگ مرا یار کرم سوں — جاتا ہے چمن میں
غیرت سوں پرے داغ سبھی درد والم سوں (کذا) — لالے لے بدن میں
اس حسن (گلو) سوز کی تعریف نہ ہووے — ہر چند لکھوں میں
کہتا ہوں میں یہ بات تیرے آگے قسم سوں — نہیں کجھ فرق سخن میں
کیا کامل استاد[2] دیا سبق جفا کا — اس شوخ میرے کوں
عاشق کوں پکڑ قتل کرے تیغ عدم سوں — اک رمز نین میں
جب شوخ کمر باندھ چلے بانکی دھج سوں — با لشکر غمزہ
رستم کے بدن[3] لرزہ پڑے تیغ وعلم سوں — درگور و کفن میں
اشرف ہمہ شب کرتا ہے یہ نالہ و زاری — در پیش خداوند
یا پیر غلام اپنے کوں دیہ[4] یہ لطف و کرم سوں — آرام وطن میں

غزل ریختہ

آیا نہیں وہ شوخ، نہ جانوں کیا سبب ہے — [5] چر کیوں لگا ہے، اتنا کوئی واسطہ[6] عجب ہے

دن رین ہے یہ جھورا[7] تن کھا گیا وچھوڑا[8] فریاد کر پکاروں پر یار کا ادب ہے
پھیرا نہ یار پایا کی اس کے دل موں آیا ہوں[9] دھوڑ[10] اس چرن کی دل میں یہی طلب ہے
تم اے صبائے جائیو میرا پیام لائیو لکھ سیں مجھے بتائیو آون[11] تمہارا کب ہے
وعدہ کیا تھا پرسوں گئے گذر سال برسوں قیامت تلک بھی آؤ یہ بھی قرار[12] جب ہے
اشرف خودی جو اردو سب دور کر کے ڈارو
پھر آکھ کھول دیکھو سبھی رب رب رب ہے

غزل ریختہ

بہار آئی ہے اے بلبل چمن میں آشیاں کیجیے گلوں کے آونے[13] کی تہنیت ورد زباں کیجیے
چمن میں جام ہے مے ہے جن ہے اور ساقی ہے چلو یارو شتابی سیں چمن میں جا مکاں کیجیے
نہ کچھ بے وفائی سوں غرورت[14] حسن کی ہرگز وفاداری میں ہر لحظہ بہار بے خزاں کیجیے
تلی[15] پرلے کھڑا ہوں جان تیرے کے تصدق پر اگر نہیں مانتا مجھ کوں تو آ کر امتحاں کیجیے
ملامت کا نشانہ ہو رہا اشرف تیرے در پر
نگہ سوں تیر آرش اورابرو کی کماں کیجیے

یہ ملمع غزل بھی اشرف کی تصنیف ہے۔ اس میں اس نے یہ التزام کیا ہے کہ ہر مصرعہ کا ایک حصہ فارسی میں ہے اور باقی حصہ اس کا ترجمہ اردو میں ہے

اے دلبر شیریں سخن میٹھی تمہاری بات ہے
در روز و شب خوانم ترا (یہ ورد دن اور ات ہے)
یک دم گر آئی اے صنم (اک پل میرے دل[16] آئے توں)
دارم تبو یک دو سخن (تجھ ساتھ ایک دو بات ہے)
دیری مکن زودی بیا[17] (جھب آؤ چر[18] لائیں نہیں)
امشب شب قدر است ایں (اج رات کو شبرات ہے)
در ششدر اندیشہ ہا (تھے کے گھسن گھیر میں)
افتاد خصم بانخل (ویری[19] بڑا بذات ہے کذا)
اشرف بگو میرد عدو (کہ تامرے ویری مرا)
ہست ایں خبیث بدصفت (ویری بڑا بد ذات ہے)

غزل عرفانی

محبت میں نہیں لائق طریقہ خود نمائی کا
خودی کوں دور کر دل سوں پھڑو[20] رہ پارسائی کا

جے[21] دل میں دوستی نا ہیں[22] زباں کی کیا محبت ہے
منافق ہو طریقت میں وسیلہ ہے جدائی کا

جے نہ مطلب ہے ملنے کا تاں[23] بے مطلب ہوا اس میں
غرض مطلب کی ہے مانع تری مطلب روائی کا

مربی کی توجہ بن نہیں مرتا نفس کافر
نفس کا تازیانہ ہے یہی نکر[24] گدائی کا

تیری اے شیخ گزری عمر ساری بت پرستی میں
..... بتخانہ میں طعنہ بے حیائی کا

عشق میں محو ہوتا خوب ہے کیا .... پھرتے ہو
نہیں منظور اس رہ میں علم طبع آزمائی کا

جو اس کے غیر عالم[25] میں ہے ہو تو اس سے بیگانہ
کہ ہے اس ساتھ بیگانے کے رشتہ آشنائی کا

پڑھے زاہد جو دوگانہ کرے اس رہ سے بیگانہ
ہزاروں زہد سے بہتر ہے اک دم بے ریائی کا

لیا بوتہ ریاضت میں یہ سیماب نفس یارو
تجھے جے[26] آرزو ہے دل میں کسب کیمیائی کا

کہے اشرف سنبھل کر پار کھو دریاے وحدت میں
نہو مغرور اس دریاہ میں علم آشنائی کا

غزل

سجن نے رخ اوپر وہ زلف پیچا پیچ ڈالی ہے
کہو کیا چاند چودس پر گویا یہ رات کالی ہے

مجھے امید تھی اس ماہ روسیں کام پاؤں گا
نجانا تھا یقین کر کے کہ آخر چاند خالی ہے

تیرے بن باغ میں لگتا نہیں دل آشناواں[27] کا
نظر میں چشم نرگس کے لگا یک دام جالی ہے

مویاں[28] بھی نام دلبر کا نہیں ہوتا جدا دل سیں
کہ دل کی نخل تاب عشق کے پانی سیں پالی ہے

ہزاراں[29] عاشقاں کوں دیکھ اسکوں جاں بلب آوے
کوئی واقف نہیں جاں کا کہ کس بدسیں نکالی ہے

میں اس زلف مسلسل کوں کیا معلوم راز اپنا
بحمد اللہ ہویا[30] واقف کہ یہ قرعہ رمالی ہے

نہیں فہمید جو سمجھو میں ان بزوں کیاں رمزاں[31]
قصیدہ حسن میں جاتا[32] کہ وہ شہ بیت عالی ہے

کہوں ظالم کوں کس مظلوم کا پیتا ہے[33] خون امروز
کہ آگے سے زیادہ ان لباں پر خوب لالی ہے

تیری اس خوش ادائی سیں رقیبوں کو نہیں پروا
کہ اشرف عشق تیرے میں دیوانہ لاابالی ہے

غزل

دیدم شبے در خواب خوش استادہ جاناں یکطرف فریاد عاشق یکطرف شور رقیباں یکطرف
شاید کہ مسجد میں کہیں اس شوخ کیتی[34] ہے گذر زاہد تڑپتا یکطرف تسبیح و قرآں یکطرف
ٹھاکر دوارے میں دکھو ہے عشق اس کا برقرار چیلا گوسائیں یکطرف گھنٹی و مالاں[35] یکطرف
میخانہ میں جا کر دکھا اوس خوبرو کا عشق ہے خم یکطرف مے یکطرف ساقی پریشاں یکطرف
گلزار میں جا دیکھیا[36] اس گلبدن کے واسطے بلبل پکارے یکطرف قمری ہے نالاں یکطرف
لالہ کھڑا ہے باغ میں سینہ میں ان کے داغ ہے سوسن چنبیلی یکطرف نرگس بھی حیراں یکطرف
مکتب سیں جا کر دیکھیا[37] ہے کس طرح سیں وہ خراب چھٹی ملطفہ یکطرف تختی گلستان یکطرف
عاشق بچارہ در اوپر گھائل کھڑا ہے سربسر سر یکطرف پا یکطرف تن یکطرف جاں یکطرف

اشرف جن کے نام پر اپنا دوانہ[38] ہو رہیا[39]
کاغذ سیاہی یک طرف قینچی قلمداں یکطرف

اشرف

اب پیا بن دیکھو سکھی کیا دکھ مجھے[40] جرنا پڑا ڈونگھا[41] سمندر پریم کا اب بابیلی[42] ترنا پڑا
پیا پیالہ پریم کا جیوڑا نہ رہیا واک میں[43] سر اناالحق بول کر سولی اوپر چڑھنا پڑا
جب سے گیا وہ چھوڑ کے نیناں میں نیند آتی نہیں جاؤ سیو گھر آپنے[44] اب بے اجل مرنا پڑا
اب اس پیا کے واسطے جیوڑا کباب اپنا کیا لیلے پیالہ کو پئے[45] یہ خون[46] مد کرنا پڑا
دل بھی حوالے کر دیا پر جان بن راضی نہیں یہ سیس اپنا کاٹ کر اس پاؤں پر دھرنا پڑا
چاہ زنخداں دیکھ کے بر جانہ رہیا[47] دل مرا یارو خدا کیواسطے اس پڑن[48] میں پڑنا پڑا
لے ری حیا اب نہ کیا دوس دیجے غیر کوں قابل کا چاونا[49] سر اٹھا کھڑنا[50] پڑا (کذا)
جس طرف دیکھوں جائے کے دلبر نظر آتا نہیں اوس ماہ کنعانی صفت جا کھوہ میں جھڑنا[51] پڑا
نہ لیاوے[52] مالن باغ سیں یہ گل چنبیلی کیوڑا مجھ کوں پیا بن پیچ[53] پر جو تیج میں سڑنا[54] پڑا
پوتھی کتاباں[55] دیکھیاں[56] مقصد نہ کچھ حاصل ہوا یہ سبق اوکھا[57] پریم کا آخر مجھے پڑھنا پڑا

اشرف نہ کر یہ گفتگو اب اس پیا کے روبرو
مرشد جو کامل عشق[58] دا دامن ایہو پھڑنا[59] پڑا

ذیل کی یہ ناتمام غزل بھی کسی پنجابی شاعر کی تصنیف ہے:

مسافر ہو کے رہتا تھا دنی[60] کا ورد سہتا تھا — سارا دن روز کہتا تھا کہ آخر خاک ہو جانا
جہاں گھر[61] پالکی گھوڑے زری زربفت کے جوڑے — اونہاں[62] کو موت نہ چھوڑے کہ آخر خاک ہو جانا
جہاں گھر جھولتے ہاتھی ہزاروں لوک تھے ساتھی — انہاں کو کھا گئی ماٹی کہ آخر خاک ہو جانا
جہاں کے لاکھ[63] میں پلے وہ خالی دست[64] ہو چلے — اونہاں جا جنگلیں[65] ملے کہ آخر خاک ہو جانا
جہاں کے باغ میں رسے وچھانڈے[66] ریشمی لسے[67] — اوہ بندے کھلوے[68] ہسے کہ آخر خاک ہو جانا
جن کے وال ہیں کالے ملایاں[69] دودھ سیں پالے — اپر سب خاک سیں ڈالے کہ آخر خاک ہو جانا
بنا کر کفن کا چولا اٹھا کر لے چلے ڈولا — نہیں ساتھی بجز مولا کہ آخر خاک ہو جانا

یہ دو شعر بھی ایک بیاض میں سے نقل کیے جاتے ہیں۔ غالباً کسی پنجابی شاعر کے ہیں:

ارے یارو عجب دیدم کراڑی[70] خوب نتھ والی
شنیدم غلغل جھنجر گرفتہ ہاتھ موں تھالی
یکے من نازنین دیدم کہ تھم تھم پیر دھرتی ہے
کمر زنبور سے پتلی وہ آپوں[71] ٹوٹ پڑتی ہے

اس بیاض میں یہ تین شعر بھی درج ہیں۔ مصنف کا نام نہیں دیا گیا، لیکن انداز سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی پنجابی بزرگ کی جولانیٔ طبیعت کا نتیجہ ہیں:

چشم کرتی تجھ دیکھن[72] کو زاریاں
رات دن لیتی لہو میں تاریاں[73]
مسکرا کر مجھ کو رونا زار زار
اور نان[74] کو جا کرے دلداریاں
وعدہ کر کر بے وفا ہوتا صنم
اس طرح ہر گز نہ ہوتیاں[75] یاریاں

پروفیسر شیرانی نے "پنجاب میں اردو" کے ص 127 پر امیر خسرو کی طرف منسوب کی ہوئی ایک غزل بحوالہ بیاض پروفیسر سراج الدین آذر درج کی ہے۔ مجھے اس سے ملتی جلتی ایک اور غزل امیر خسرو کے نام پر ملی ہے۔ وہ بھی درج کرتا ہوں:

نقد دلم وزدیدہ صندوق سینہ پھوڑ کر — پکڑوں قیامت میں تجھے آگے خدا کے چور کر
غرہ مشو بر حسن خود دن پانچ دس مہمان ہے — محبوب یوسف سے گئے وہ زیب و خوبی چھوڑ کر

میرا جو تم نے من لیا تم نے جو لے غم کو دیا　　غم نے مجھے ایسا کیا جیسا پتنگا شمع پر
از بہر تو دیوانہ ام آوارہ گشتہ خانہ ام　　یہ دوست کیا انصاف ہے ہنستا ہمیں منہ موڑ کر
خسرو کہے باتاں عجب دلبر پناوے اک قدر　　قدرت خدا کی یہ عجب میں جی دیا پر لاے کر

تیسرا اور آخری شعر جس میں شاعر کا تخلص ہے، پروفیسر صاحب کے ہاں موجود ہیں اور یہ دونوں شعر ردیف وقافیے کے لحاظ سے باقی تین اشعار سے مختلف ہیں۔

عبدالرحمٰن خلدی کی ایک غزل پروفیسر شیرانی نے اپنی کتاب کے صفحہ 307 پر درج کی ہے اور اس کی دو غزلیں میں اپنے محولہ بالا مضمون میں دے چکا ہوں۔ اس کے بعد مجھے ایک بیاض سے خلدی کی یہ ایک اور اردو غزل ملی ہے، جو اس نے ولی کے تتبع میں لکھی تھی:

آ جدائی نکر خدا سیں ڈر　　غم فیزائی نہ کر خدا سیں ڈر
آگ برہوں کی آگ ہی ہے تیز (کذا)　　اب ہوائی نہ کر خدا سیں ڈر
دلبری دلبراں کوں لائق ہے　　جاں ربائی نہ کر خدا سیں ڈر
تیرے سادے وہ نیں خونی ہیں　　سرمہ سائی نہ کر خدا سیں ڈر
منہ در آیا نہ بول عاشق کوں　　ژاژ خائی نہ کر خدا سیں ڈر
تیغ غمزہ کو قتل کر جاوے　　اب دہائی نہ کر خدا سیں ڈر

سن ولی کا سوال خلدی گفت
"بیوفائی نہ کر خدا سیں ڈر"

حواشی:

1-بچپن　　2-یعنی استاد نے　　3-بدن میں
4-دے　　5-دیر　　6-سبب
7-فکر،تشویش،غم　　8-فراق　　9-اب
10-دھول غبار　　11-آمد،آنا　　12-قرار
13-آنا　　14-غرور　　15-ہتھیلی
16-طرف　　17-جلدی　　18-دیر نہ لگانا
19-بیری،دشمن　　20-پکڑو　　21-جو اگر
22-نہیں　　23-تو　　24-ٹکڑا

25- ماسوی اللہ　26- جو اگر　27- آشناؤں

28- مرنے پر طرح　29- ہزاروں　30- ہوا

31- بڑوں کی رسمیں　32- جاتا　33- پیا ہے

34- کی ہے صحیح معنی کیا ہے　35- ملا　36- دیکھا

37- دیکھا ہے　38- دیوانہ　39- ہوتا

40- برداشت کرتا　41- گہرا　42- تیرنا

43- دل قابو میں ندہا　44- اپنے　45- کوئی

46- شراب　47- ندہا　48- اقرار

49- اٹھانا　50- لے جانا　51- کنوئیں میں گرتا پڑتا

52- لادے　53- بیج　54- جلنا

55- کتابیں　56- دیکھیں　57- مشکل

58- حرف اضافت کا　59- پکڑنا　60- دنیا

61- جن کے گھر میں　62- ان کو

63- جن کے قبضے میں لاکھوں روپے تھے　64- چلے

65- جنگلوں میں جابسیرا کیا　66- بچھاتے

67- بستر　68- دوزمین پر بیٹھے　69- بالائیں

70- ہندو عورت　71- خود بخود　72- تیر سے دیکھنے کو

73- تیرنا سے حاصل مصدر　74- اوروں کو　75- ہوتیں

(در: اورینٹل کالج میگزین، مئی 1937ء، ص 89-96)

قاضی فضل حق

عبدی[1]

تحریر اول:

مولانا عبداللہ عبدی

پروفیسر شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں "عبدی"[2] کے "رسالہ مہتدی" کا ذکر کیا ہے جو 997ھ میں تصنیف ہوا تھا۔ آپ یہ شعر رسالہ سے بطور سند پیش کرتے ہیں۔

نو سو ورہے ستانوے جاں گذرے وچ شمار
پچھے حضرت مصطفیٰؐ تد ان تھیا تیار

وہ اس رسالے کو "اکبری عہد کی تالیفات" میں سے سب سے مقدم قرار دیتے ہیں اور آگے چل کر[3] "مولانا عبدی" کے رسالے "فقہ ہندی" جو 1074ھ میں اورنگزیب کے دور میں تصنیف ہوا تھا، کو اردو کی مقدم ترین کتاب بتاتے ہیں۔ پھر مولوی عبداللہ صاحب "انواع العلوم" کی آخری کتاب "خیر العاشقین" کو مولانا کی آخری تصنیف بیان کرتے ہیں۔[4] آخر میں عبدی کی "فقہ ہندی" اور "رسالہ مہتدی" کا موازنہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "دونوں رسالوں کا مصنف ایک ہی ہے" کیونکہ "دونوں رسالوں کا وزن بھی ایک ہی ہے اور جملوں کی ترکیب اور بندش بالکل پنجابی طرز میں ہے۔"[5] اس کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عبدی نام کے دو شاعر ہوئے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس "عبدی" کا ذکر پروفیسر صاحب کرتے ہیں، وہ 997ھ میں ایک کتاب تصنیف کرتا ہے۔ پھر پورے ستتر (77) برس ہمیں اس کی کوئی خبر نہیں ملتی۔ آخر وہ "فقہ ہندی" کا مصنف ہو کر ظاہر ہوتا ہے۔ شاید پروفیسر صاحب کے علم میں نہ تھا کہ "عبدی" دراصل مولانا عبداللہ صاحب کا ہی تخلص تھا اور وہ مشہور بھی اسی تخلص سے تھے۔ میاں محمد "سیف الملوک" کے آخر میں شعرائے قدیم کی جو فہرست دیتے ہیں، اس میں ہمیں یہ شعر[6] ملتا ہے۔

جس انواع بنائی ہور ہویا کوئی عبدیؔ

کہیوس خوب بیان فقہ دا سمجھاں رحمت ربدی

پھر ان کی کتابوں سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنا نام کبھی عبداللہ لکھتے ہیں۔ کبھی عبد، کبھی عبدالٰہی اور کبھی عبدی۔ میں بطور نمونہ صرف ایک شعر ہی پیش کروں گا حالانکہ میرے اس خیال کی تصدیق ان کے کئی ایسے اشعار سے ہوتی ہے، جن میں مولانا نے عبداللہ کے علاوہ اپنے کئی اور نام بھی لکھے ہیں۔

(1) عبدی خلقت سب سوالی ڈٹھی، خالق ہک غنی [7]

(2) ہر ہر حالت عبد سوالی، خالق تیرے دردا [8]

(3) اوہ مسئلے کتھوں ظاہر ہوئے عبدی آکھ فقیر [9]

(4) ایمان عبد حوالے تیرے، کیتا بے پرواہا [10]

(5) اس تحفہ نام کتاب دا، کہندا عبد فقیر [11]

(6) عاصی عبدالٰہی آندھا، ظاہر آکھ سنا [12]

(7) عبدی ساکھ پکے ہن اوڑک آیا، ساعت گھڑی لوڑ ہندی [13]

یہ فہرست بہت طویل ہے لیکن میرے مندرجہ بالا خیال کو ثابت کرنے کے لیے یہی کافی ہے۔

مولانا عبداللہ کی کتابوں کے مجموعے کا نام "بارہ انواع" مشہور ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس مجموعہ میں بارہ کتابیں شامل ہیں، لیکن توجہ سے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری تین کتب صرف خانہ پُری کے لیے مجموعہ میں شامل کر دی گئی ہیں۔ وہ خود بھی قدرے توقف سے اس امر کو تسلیم کرتے ہیں۔ "انواع العلوم" کے آخر میں ایک نوٹ ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ مولانا عبداللہ لاہوری کے "بارہ انواع" کئی بار شائع ہو چکے ہیں۔ نام سے تو "بارہ انواع" ہیں، لیکن ہیں دراصل کل گیارہ۔ کیونکہ اصل کتاب نہ ملنے پر مولوی محمد شفیع صاحب کا "تحفہ دوم" ساتھ ملا کر گنتی پوری کی گئی ہے۔

کیا وہ گمشدہ کتاب یہی "رسالہ مہتدی" ہی نہیں؟ شاعر کا تخلص بھی عبدی ہے۔ وزن کے اعتبار سے بھی "رسالہ مہتدی" مولانا کی دیگر کتب سے مماثلت رکھتا ہے۔ جملات کا بناؤ سنگھار بھی ایک سا ہے۔ پھر طرز بھی پنجابی ہے، اس لیے یہ تسلیم کر لینے میں تردد نہیں ہوتا کہ یہ "رسالہ مہتدی" بھی مولانا عبداللہ صاحب عبدی لاہوری کی تصنیف ہے اور "انواع العلوم" کے سلسلے ہی کی گمشدہ بارہویں کتاب ہے۔

اب مولانا کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ 997ھ سے لے کر 1074ھ تک پورے ستتر (77) سال لکھنے میں مشغول رہے ہیں۔ یہ کوئی ان ہونی بات نہیں۔ 1051ھ میں مولانا بڑھاپے کے باعث کچھ کمزوری محسوس کرنے لگے تھے۔ اسی زمانے میں آپ لکھتے ہیں ۔

جیوں گھُن کھادی لکڑی پئی ترکھاناں وس

جوہر خوبی میری آہی پیری کھڑیا کھس

مولانا کی کتب سے ان کی زندگی کے احوال کے متعلق کچھ خاص اطلاع فراہم نہیں ہوتی۔ مزید برآں سوائے بعض کتابوں کی تاریخ اشاعت کے اور کوئی تاریخی اشارہ کہیں بھی نہیں ملتا۔ صرف ''حصار الایمان'' ہی ایک ایسی کتاب ہے۔ جس میں تاریخ تصنیف نہیں دی گئی۔ البتہ اس کتاب میں اپنی عمر کے متعلق لکھتے ہیں:

اس تصور اندر گذرے	راہے اندر کھلیاں
گئی جوانی کچھ نہ ہوئیا	جاں اہ ہویاں چلیاں
گئی جوانی خواب وچ	مول نہ آوے وت
قوت نالے بھی گئی	چلاں کھڑے ست

ہم سے پیشتر میاں محمد اپنی کتاب کے آخر میں بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنی کتاب کی بے عیب اشاعت کے سلسلے میں لاہور آئے اور یہاں میاں خدا بخش کے مکان میں تین ماہ قیام کیا۔ اس وقت کی کچھ باتیں جو میاں محمد بخش بیان کرتے ہیں' مولانا عبداللہ اور ان کی آل اولاد کے متعلق کچھ سراغ فراہم کرتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:[14]

شہر لاہور مبارک اندر	صحت کیتی بہہ کے
مولوی عبداللہ جی دے	خانے اندر رہ کے
جس[15] صاحب انواع بنائی	سورج وانگ نورانی
ہر اک تائیں فیض پوچا وے	اندر مسلمانی
عاماں خاصاں اوس بازاروں	جو خواہش سو پایا
دھن محمدؐ شیخ عبداللہ	جس اہ فیض کھنڈایا
عالم عامل فاضل کامل	حافظ سر حقانی
زاہد صوفی متقی صائم	رہبر مسلمانی
حضرت جی دی سنت اتے	قائم رہے ہمیشہ
روون در محبت کنوں	سدا انہا ندا پیشہ
ہانس ملک وچ رہندے آہے	اوّل وقت جوانی
اوہو وطن پیارا کہندے	جیونکر رسم جہانی
پڑھیا علم ہوئے سن عالم	اجڑ چارن جاندے
فخر آیا نہ آہا مولے	کسیوں نہ شرماندے
اجڑ چار دیاں نوں ہک دن	روز مبارک آیا

سرور عالمؑ دی اسواری — اپنا آپ دکھایا

کیتا امر نبی نے جاؤ — شہر لاہور مبارک
نام اللہ دے علم پڑھاؤ — کدی نہ ہوویں تارک
تاں تشریف لاہور لیائے — آ بیٹھے اک تھانویں
مڑ آ کرن گلزار زمیں نوں — کلر ہووے بھانویں
[16]حسن محمدؐ سی اک تیلی — بندہ خاص سائیں دا
اسدے آن بنے ہمسائے — نام نہ یاد جائیں دا
چکی پیہیں کرن مزدوری — کسب حلالوں کھاون
نام اللہ دے علم شریعت — ہر اک کان پڑھاون

بیٹا اس دا نور محمدؐ — کہن مدقق جہنوں
بہت مناقب اسدے حسن — پر یاد نہیں اوہ مینوں
بہت کتاباں اُتے اُسنے — حاشیہ شرح لگائی
لقب مدقق حضرت دتا — ویکھ اُہدی دانائی
اگے بیٹے بہت اُنہاندے — زاہد صوفی بھارے
نقی محمدؐ، تقی محمدؐ — رب دے خاص پیارے
ہک گیا لاولد اُنہاں تھیں — سن رضا خدائی
دوجے نوں رب بیٹا دتا — صاحب صدق صفائی
جہنوں کہن محمد عاشق — لقب مبارک پایا
وچ لوہاری منڈی — اوس نشان لگایا
پشت پشت ہوئے جیو — اِہ گھر وڈا قدیمی
اساں غریباں کرن تواضع — بولن نال حلیمی

حجرے والے پیرا ساڈے — ایس گھر رہے اُتر دے
کہن استاداں دا گھرا سنوں — ادب اسدا بھی کر دے
اے کارن بندہ عاجز — اوسے گھر اُتر دا

نالے خدمت، عزت، الفت کردا صاحب گھر دا
سوہنا مرد لیاقت والا جسنوں بخشش خدائی
بزرگز اوہ مثل شاہزادہ خادم ہے فقرائی

اگے اک داماد اُنہاندا اہل چراغ اندرد نہ
نام محمد دین اُہ حافظ خوش درویش نمونہ
وڈے صاحب جیو دے مدرس جو صاحب سجادہ
اِہ محمد دین اُنہاندا بیٹا نیک ارادہ

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا اصل وطن ہانس کا علاقہ تھا' جو آج کل منٹگمری (ساہیوال) کا ضلع ہے۔ مزید یہ کہ وہ اپنے وقت کے ایک مسلمہ عالم تھے' لیکن اس کے باوجود پیشہ کے لحاظ سے چرواہا تھے۔ ایک دن غلہ چرواتے ہوئے رقت کی حالت طاری ہو گئی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دیدار نصیب ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ اب لاہور جا کر اللہ کی راہ میں لوگوں کو دینی تعلیم سے آراستہ کرو۔ چنانچہ مولانا لاہور آ گئے اور یہاں حسن محمد تیلی کی ہمسائیگی میں قیام پذیر ہوئے۔

وہ خود چکی پیس کر اپنا اور اپنے بال بچوں کا گذارہ کرتے تھے اور لوگوں کو دینی تعلیم فی سبیل اللہ دیتے رہے۔ ایک دن ایک شخص اپنی کتاب میں درستی کروانے آیا اور مولانا کے چہرہ اور داڑھی پر آٹا دیکھ کر ان سے پوچھا کہ آپ کیا کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنے روزگار کے لیے چکی پیس رہا تھا۔ یہ سن کر اس شخص (بزرگ) نے کہا کہ میں آپ کو ایک وظیفہ بتاتا ہوں جس سے آپ کو غیب کی جانب سے ہر روز دو روپے مل جایا کریں گے' لیکن مولانا کا دل سیر تھا' لہٰذا یہ کہتے ہوئے وظیفہ لینے سے انکار کر دیا کہ اللہ کی عبادت مطلق لالچ کے بغیر ہو تو پھر لطف آتا ہے۔ پھر جب ان کے بیٹوں نے اس وظیفہ کے لیے زور دیا تو کہنے لگے:

کہن لگے عبداللہ ہوریں[17] سنو میرے دلبندو
مینوں شرم رب تھیں آیا پڑھیا ناں فرزندو
اتنی عمر گذشتہ ہوئی روزی رہیا پونچاندا
روزی کارن کراں نہ سجدے اِہ ریا ہو جاندا

ان کا ایک فرزند نور محمد مدقق بھی اپنے دور کا ایک مسلمہ عالم تھا۔ اس نے عربی اور فارسی کتابوں کی جو شرحیں لکھیں یا حواشی کا اضافہ کیا، وہ آج کے دور کے علماء کے نزدیک بھی قابل قدر ہیں۔ مدقق کا خطاب بھی مولانا لاہوری ہی نے دیا تھا۔ نور محمد کے دو بیٹے محمد نقی اور محمد تقی تھے۔ اول الذکر تو لاولد وفات پا گیا' لیکن محمد تقی کا بیٹا عاشق محمد ہوا جس نے لوہاری منڈی (لاہور) میں ایک بڑی حویلی اور کئی مکان تعمیر کروائے۔ میاں

عاشق کی گلی ان کے نام پر ہی مشہور ہے۔ ان کے بیٹے کا نام میاں خدا بخش تھا۔ حجرہ ضلع منٹگمری (ساہیوال) کے شاہ مقیم جب لاہور آئے تھے تو انہی کے پاس قیام کیا تھا۔

پروفیسر شیرانی نے "عبدی" کے باپ کا نام "محمد ساکن باتو" لکھا ہے۔[18] اس کی تصدیق مولانا کے ایک شعر سے بھی ہوتی ہے جو کاتب کی مہربانی سے اتنا بگڑ چکا ہے کہ اس کا ٹھیک ہونا ایک ان ہونی بات ہے۔

[19] خالق بخش عبداللہ	پیو او سدا جان محمدؐ ہے
جو طالب خالق شرع موافق	ہر ہر آنجے دا

اب ہم مولانا کی کتب جو "بارہ انواع" کے نام سے مشہور ہیں، کی تفصیلی تاریخ پیش کرتے ہیں۔

1- رسالہ مہتدی۔

997ھ میں لکھا گیا تھا۔[20]

2- تحفۃ الفقہ۔

اس کتاب کا نام "تحفہ" ہے اور یہ بدھ کے دن ۲ محرم الحرام ۱۰۲۵ھ میں لکھی گئی ہے۔

[21] اِہ تحفہ نام کتاب دا	کہندا عبد فقیر
عبداللہ آکھے مومناں	ایمان بخش خدا
ہجرت بعد ہزار یک	پنجویہ سال فنا
سال شروع اٹھیں پچھے	یک روز گیا یک رات
ہو روز دوجا بدھوار دا	ہویا تم نجات

(3) رسالہ نص فرائض۔

ماہ شعبان 1032ھ میں شب برات کے دن تکمیل کو پہنچی تھی۔

[22] بتری ورہے ہزار اک	ماہ اتے شب رات
اِہ ہجرات بعد رسالہ تم	بجھو لہو نجات

(4) خلاصہ معاملات۔

یہ چتر کے مہینے بدھ کے دن 15 ذیقعدہ 1043ھ میں مکمل ہوئی۔

[23] ہزار ہکو ترتالیہ ورہیاں	ساڈھے دہ مہینے
اِہ ہجرت بعد رسالہ	تم کیتا رب نگینے
چیت مہینے بدھ وار	وقت پیشی دا آ
عاصی طاقت سہل کجھ	ہویا فضل خدا

(5) انواع العلوم۔

ماہ شوال 1044ھ میں اختتام پذیر ہوئی۔

[24]ہزار ہکو چوتالیہ ورہیاں ماہ اتے دہ ضم
ہجرت بعد پچھان توں اِہ رسالہ تم

(6) معرفت الٰہی۔

27 ماہ محرم 1045ھ میں لکھی گئی۔

[25]ہزار ہک پنجتالیہ ماہ اتے ہک ضم
تاریخ ستھویں ہجرت بعد اہ رسالہ تم

(7) خیر العاشقین کلاں۔

یہ کتاب بھادوں کے مہینے 1054ھ بوقت ظہر ختم ہوئی۔

[26]چورنجہ ورہے ہزار ہک ہجرت بعد تمام
ہور ماہ بھادوں وقت ظہر اِہ کتاب تمام

(8) فرائض شرح سراجی۔

7 محرم 1058ھ کو بوقت ظہر تکمیل پذیر ہوئی۔

[27]ہزار ہک اٹھونجہ ورہیاں اِکواہ فنا
چھ روز تم ہور ستواں دینہ وقت پیشی وا آ

(9) خیر العاشقین خورد۔

یہ کتاب بدھ کے دن 1065ھ میں ختم ہوئی۔

[28]ہجرت بعد ہزار ہک پینٹھ ورہے ہور ضم
بدھ دہاڑے پیش بعد ایہ رسالہ تم

(10) حصار الایمان۔

اس کی تاریخ تصنیف نہیں دی گئی۔

(11) رسالہ فقہ ہندی۔

۱۰۷۴ھ میں لکھی گئی تھی۔[29]

(12) حمد و ثناء۔

ایک مختصر سا رسالہ ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مولانا کی آخری کتاب ہے' کیونکہ مولانا کی وفات کا وقت نزدیک آجاتا ہے۔

[30]موت عبداللہ نیڑے آئی ساعت گھڑی ٹکانا

جو فرمایا پاک منزہ عزرائیل وکھانا

مذکورہ بالا تمام کتب کے مجموعہ کا نام "بارہ انواع مولوی محمد عبداللہ" ہے۔ اس مجموعہ میں تین مزید مختصر رسالے بھی شامل اشاعت ہیں، جن کے نام ہیں:

(1) صیقل اول۔ (2) صیقل دوم اور (3) تحفہ جدید۔[31]

ان رسائل کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مولوی صاحب کی تصانیف ہیں یا ان کے بعد کسی اور نے مجموعہ میں شامل کر دیے ہیں۔

مولانا نے یہ کتب عام دیہاتی مسلمانوں کے لیے لکھی تھیں جو علم کی دولت سے محروم تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

[32]وچ لاہورے عالم بہتے علم بے پایاں بجھ
اہ کیتے باب صحرائیاں رہا جتھے علم نہ کجھ

مولانا کے نزدیک عام شاعری ایک عالم کی شان کے لائق نہیں۔ نظموں کی "تک بندی" کا خاکہ یوں کھینچتے ہیں:

[33]نظم جنہدا نام ہے باجھوں فقہ اصول
تیں اللہ دی درگاہ وچ ناہیں نظم قبول
فقہ اصول تے وحدانیت نظمی[34] پچھیں ناہیں
راہ حقانی چھوڑ کر رہن ورتن کوڑے راہیں
فقہ اصول نہ سمجھن نظمی انہا شعریں دل پرچایا
ایہ آکھن شعر ملائک لکھن انہاں حق نہ پایا

باوجود اس کے مولانا کے مندرجہ ذیل اشعار لاکھوں پر بھاری ہیں۔ دل کی شان کے متعلق فرماتے ہیں:

[35]دل دریا سمندروں ڈونگھا کون دلے دیاں جانے
وچ بیڑے جھیڑے کپڑ وچ ملاح موہانے
چوداں طبق دلے دے اندر تنبو وانگن تانے
جیکوئی محرم دل دا ہووے سو ای رب پچھانے

شیخ سعدی کا مشہور مصرعہ ہے ع

آنرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد

اس نقطے کو مولانا نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

[36]مہر زبان تہاں دی ہوئی   جہاں تھیا کجھ دلاسا
خام کباب آواز کریندا   جاں جاں پخت نہ خاصا

مولانا نے لاہور میں وفات پائی اور یہیں مدفون [37] ہوئے لیکن افسوس کہ ان کی قبر کا کوئی نشان نہیں ملتا۔

(جنوری 1930ء)

تحریر دوم:

پروفیسر شیرانی [38] نے اپنی کتاب میں ''عبدی'' کے ''رسالہ مہتدی'' کا ذکر کیا ہے جس کا سال تصنیف 997 ہجری ہے اور یہ شعر رسالہ سے بطور سند پیش کیا ہے:

نوسے ورہے ستانویں جاں گذرے وچہ شمار
پچھے ہجرت مصطفیٰؐ تدن تھیا تیار

اور اس رسالے کو ''اکبری عہد کی تالیفات'' میں سے ''سب سے مقدم'' قرار دیا ہے اور آگے چل کر [39] ''مولانا عبدی'' کی تصنیف رسالہ ''فقہ ہندی'' کو جو 1074ھ یہ عہد اورنگزیب عالمگیر لکھا جاتا ہے، اردو کی مقدم ترین کتاب بتایا ہے۔ پھر اس کتاب [40] میں مولوی عبداللہ صاحب ''انواع العلوم'' کی آخری کتاب ''خیر العاشقین'' (جو 1065ھ میں ختم ہوتی ہے) کو مولانا کی آخری تصنیف بتایا ہے۔ پھر عبدی کی ''فقہ ہندی'' (مؤلفہ 1074ھ) اور ''رسالہ مہتدی'' کا مقابلہ کر کے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ''دونوں رسالوں کا مصنف ایک ہی ہے۔'' کیونکہ ''دونوں رسالوں کا وزن بھی ایک جیسا ہی ہے اور جملوں کی ترکیب اور بندش بالکل پنجابی طرز میں ہے۔'' [41] گویا پروفیسر صاحب کا ''عبدی'' 997ھ میں مصروف تالیف نظر آتا ہے اور اس کی آخری تصنیف ۱۰۷۴ھ میں ختم ہوتی ہے۔ ان دونوں تصانیف کے درمیان تقریباً ستتر (77) سال کا فاصلہ ہوتا ہے اور اگر ہم ''فقہ ہندی'' کی متانت و پختگی کا لحاظ رکھتے ہوئے 997ھ میں اس کی عمر کم از کم تیس سال ہی رکھیں اور یہ فرض کر لیں کہ وہ ''فقہ ہندی'' ختم کرنے کے بعد ہی فوت ہو گیا تو اس کی عمر کم از کم ایک سو سال ماننی پڑے گی۔

اس کے برعکس میاں محمد بخش صاحب ''سیف الملوک'' کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ''انواع شریف'' کا مصنف عبدی ہے:

[42]جس انواع شریف بنائی   ہور ہویا کوئی عبدیؔ
کیتوس خوب بیان فقہ دا   سبھناں رحمت ربدی

جو ظاہراً مولوی عبداللہ صاحب کا تخلص ہے۔ اس لیے اگر ہم فرض کر لیں کہ رسالہ ''فقہ ہندی'' کے

مصنف دراصل مولوی عبداللہ ہیں تو بعض اشکالات جو سے "عبدی" مصنف مہتدی سے منسوب کرنے سے پیدا ہوتے ہیں، دور ہو جاتے ہیں' کیونکہ پہلی صورت میں دونوں کتابوں کی تصنیف کا درمیانی فاصلہ ے سال کا ہے جو غیر ممکن نہیں تو غیر اغلب ضرور ہے۔

مگر مولوی عبداللہ کی پہلی اور آخری کتاب میں صرف 49 سال کا فرق ہے۔ مگر درمیانی سال بھی مولانا کی لگاتار مصروفیت کے مظہر ہیں' کیونکہ قریباً ہر سال کے بعد وہ ایک نئی کتاب لکھتے نظر آتے ہیں۔

اس لیے میں دو "عبدیوں" کا وجود تسلیم کرتا ہوں اور اس مماثلت کو جو پروفیسر صاحب کو دونوں کتابیں ایک ہی عبدی کو دینے کا باعث ہوتی ہے، محض معمولی اور اتفاقی سمجھتا ہوں۔

لہٰذا میں ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ حال لکھتا ہوں۔

عبدی ابن محمد

ان کو پنجابی شاعروں کا ابوالآبا سمجھنا چاہیے' کیونکہ ان کا "رسالہ مہتدی" جو 997ھ میں بہ عہد جلال الدین محمد اکبر بادشاہ لکھا جاتا ہے، سب سے قدیم کتاب ہے جو ہمیں معلوم ہے۔ ان کا نام یا تخلص "عبدی" باپ کا نام محمد اور مسکن باتو ہے۔

مولانا عبداللہ عبدی

قدامت میں پہلے عبدی سے دوسرے درجے پر ہیں۔ جہانگیر، شاہ جہاں اور عالمگیر کے عہد میں قریباً ساٹھ سال تک پنجابی زبان کے ذریعے فقۂ اسلامی کی اشاعت کرتے رہے ہیں۔ ان کی تصنیفات کے نام بقید سنہ تصنیف درج ذیل ہیں:

تحفۃ الفقہ (1025ھ)، رسالہ نص فرائض (1032ھ)، خلاصہ معاملات (1043ھ)، انواع العلوم (جو فقہ اسلامی میں بہت معتبر اور مستند کتاب مانی جاتی ہے۔ 1044ھ)، معرفت الٰہی (1045ھ)، خیر العاشقین کلاں (1054ھ)، فرائض شرح سراجی (مسئلہ وراثت پر اسی نام کی فارسی کتاب کا ترجمہ۔ 1058ھ)، خیر العاشقین خورد (1065ھ)، حصار الایمان (تاریخ نامعلوم) اور رسالہ فقہ ہندی (1074ھ)۔

تحریر سوم:

عبدی کے متعلق پروفیسر شیرانی اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں لکھتے ہیں۔[43]

1) عبدی اپنا "رسالہ مہتدی" (پنجابی) 997 ہجری میں تصنیف کرتے ہیں۔

2) "رسالہ مہتدی" اور "فقہ ہندی" (اردو آمیز پنجابی) مصنفہ 1074 ہجری میں قرابت قریبہ

موجود ہے اور پروفیسر صاحب کی رائے میں " دونوں رسالوں کا مصنف ایک ہی شخص ہے۔"[44]
اس کے بعد میں نے اپنے ایک مضمون[45] میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ چونکہ عبدی مولانا عبداللہ صاحب "بارہ انواع" کا تخلص ہے اس لیے "رسالہ مہتدی" کے مصنف مولانا ہی ہیں اور یہ کہ وہ قریباً ستر سال تک تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔

جس وقت میں نے بحولہ بالا مضمون لکھا تھا، اس وقت میں نے "رسالہ مہتدی" دیکھا نہ تھا۔ صرف پروفیسر کے بیان پر اکتفا کر کے اس نتیجے پر پہنچا تھا۔ اس وقت حسن اتفاق سے "رسالہ مہتدی" کا ایک قلمی نسخہ میرے پاس موجود ہے اور علاوہ اس کے اور قدیم پنجابی قلمی کتابیں بھی دستیاب ہوئی ہیں، اس لیے مجھے موادِ حاضرہ کی بنا پر اپنی رائے کو تبدیل کرنا پڑا ہے۔

تحریر چہارم:

سب سے پہلی کتاب جو ہمیں اس موضوع (فقہ) پر نظر آتی ہے، وہ عبدالوہاب بابو کی کتاب "رسالہ مہتدی" ہے جو 997 ہجری میں لکھی گئی تھی۔ پروفیسر شیرانی نے اسے مولوی عبداللہ صاحب مصنف "انواع" سے ملتبس کیا ہے، جن کو وہ عبداللہ بن محمد ساکن باتو بتاتے ہیں۔

مگر "رسالہ مہتدی" کے اخیر میں مصنف کا نام عبدالوہاب بابو دیا ہوا ہے جو شیخ داؤد چہنی وال کے خلفاء میں سے تھے اور جن کا ذکر "منتخب التواریخ" میں بھی آتا ہے۔

ان کے بیٹے کا نام عبداللہ بابو ہے، جن کی کتاب "فرائض بابو" پنجاب کے دیسی مکتبوں میں بچوں کو یاد کرائی جاتی رہی ہے۔ حبیب چودھووالی نے اپنی کتاب میں اپنے پیش رو کے طور پر ان کا ذکر کیا ہے۔
1025ھ سے 1065ھ تک مولوی عبداللہ صاحب "انواع" برابر چالیس سال تک فقہی کتابیں لکھنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان کی کتابیں تحفۃ الفقہ (1025ھ)، نص فرائض (1032ھ)، خلاصۂ معاملات (1043ھ)، انواع العلوم (1044ھ)، معرفت الٰہی (1045ھ)، خیر العاشقین کلاں (1054ھ)، فرائض شرح سراجی (1058ھ)، خیر العاشقین خورد (1065ھ) اور حصار الایمان جن کا مجموعہ "بارہ انواع عبداللہ" کے نام سے مشہور ہے، علم فقہ کی مستند کتاب ہے۔ اس علم میں فارسی اور عربی تمام کتابوں کا خلاصہ درج ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کے پڑھ لینے کے بعد کسی دوسری فقہ کی کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ گویا یہ علم فقہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔

پروفیسر شیرانی کو مولوی عبداللہ کے حالات معلوم نہیں ہو سکے، مگر میں مختلف ذرائع سے ان کے سوانح حیات پر ایک مضمون[46] "پنجابی دربار" میں شائع کرا چکا ہوں۔ ان مولوی عبداللہ صاحب کے متعلق ایک اور غلط فہمی کا ازالہ کر دینا بھی اس وقت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان کا تخلص نہ تو عاصیؔ تھا اور نہ ہی عبدیؔ، بلکہ

یہ لفظ بندہ اور فدوی کی طرح شاعر انکسارانہ اپنے لیے استعمال کرتا تھا کیونکہ اس زمانے کے اکثر بزرگ مثلاً عبدالوہاب بابو، عبداللہ بابو اور حبیب چودہوالی بھی اپنے آپ کو اکثر اسی لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

(اپریل1936ء)

حواشی:

1- ''عبدی'' کے موضوع پر پروفیسر قاضی فضل حق مرحوم کی چار تحریریں زیر نظر کتاب کے مسودے میں موجود تھیں۔ تحریر اوّل پروفیسر قاضی فضل حق مرحوم کے پنجابی زبان میں تحریر کردہ مضمون ''مولانا عبداللہ عبدی'' کا اردو ترجمہ ہے۔ اصل پنجابی مضمون مجلہ ''پنجابی دربار'' میں جنوری ۱۹۳۰ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ تحریر دوم اور تحریر سوم ''عبدی'' کے عنوان کے تحت ہیں۔ یہ دونوں غیر مطبوعہ تحریریں غالباً انہوں نے بعد میں اپنے مذکورہ بالا مطبوعہ مضمون میں تراجم کے طور پر لکھی تھیں۔ تحریر چہارم جوان کے ایک اور مضمون سے اقتباس ہے ۱۹۳۶ء میں لکھا گیا۔ اس غیر مطبوعہ مضمون میں انہوں نے ''عبدی'' کے متعلق چند دیگر وضاحتیں پیش کی ہیں۔ والد مرحوم پروفیسر قاضی فضل حق کی یہ تمام تحریریں اس کتاب میں ''عبدی'' کے عنوان کے تحت پیش کی جا رہی ہیں۔ (مرتب)

2- ''پنجاب میں اردو'' اشاعت اوّل ص 53

3- ''پنجاب میں اردو'' اشاعت اوّل ص220

4- ''پنجاب میں اردو'' اشاعت اوّل ص53

5- ''پنجاب میں اردو'' اشاعت اوّل ص239

6- سیف الملوک مطبوعہ جہلم ص437

7- نص فرائض (مجموعہ انواع) ص3

8- انواع العلوم ص56

9- انواع العلوم ص94

10- خلاصہ معاملات ص180

11- تحفۃ الفقہ ص303

12- تحفۃ الفقہ ص320

13- خیر العاشقین ص335

14- سیف الملوک مطبوعہ جہلم ص443

15- ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس دوران میاں محمد نے ''سیف الملوک'' تصنیف کی تھی انہیں ان باتوں کا علم نہ تھا۔ کیونکہ اس وقت وہ لکھتے ہیں۔

جس انواع شریف بنائی ہور ہویا کوئی عبدی

کوئی کا لفظ کچھ اجنبیت کا اظہار کرتا ہے۔

16- یہ بزرگ قوم کے تیلی اور خاص لاہور کے رہنے والے تھے۔ چوک جھنڈا میں ان کی دکان تھی۔ اس دکان پر اب بھی جھنڈا لگا رہتا ہے اور ہر روز دیا جلایا جاتا ہے۔ جمعرات کے دن بہت سے دیئے جلائے جاتے ہیں۔ شاہ جمال سہروردی (جن کا مزار اچھرہ کے نزدیک دمدمے کے اوپر واقع ہے) کے مرید تھے۔ شیخ حسو کی قبر بھی وہیں ہے۔ ہر سال شوال کے مہینے کی تیسری تاریخ کو وہاں عرس ہوتا ہے۔ شیخ حسو 1002ھ میں انتقال فرما گئے تھے۔

17- سیف الملوک مطبوعہ جہلم ص445

18- پنجاب میں اردو اشاعت اوّل ص53

19- فرائض شرح سراجی۔ ص265

20- پنجاب میں اردو۔ اشاعت اوّل۔ ص53

21- تحفۃ الفقہ۔ ص302

22- رسالہ نص فرائض۔ ص53

23- خلاصہ معاملات۔ ص238

24- انواع العلوم۔ ص178

25- معرفت الٰہی۔ ص379

26- خیر العاشقین کلاں۔ ص358

27- فرائض شرح سراجی۔ ص265

28- خیر العاشقین خورد۔ ص377

29- پنجاب میں اردو' اشاعت اوّل۔ ص225

30- حمد و ثنا۔ ص393

31- تحفہ جدید کسی صاحب محمد شفیع نے خود لکھ کر شائع کروائی۔

32- فرائض شرح سراجی۔ ص239

33- رسالہ نص فرائض۔ ص49

34- پنجاب میں ایک خاص اصطلاح "نظمی" ہے۔ یعنی نظم فارسی کے عالم۔ صرف شاعر مراد نہیں۔

35- رسالہ نص فرائض۔ ص4

36- انواع العلوم۔ ص61

37- سیف الملوک۔ (خاتمہ)

38- پنجاب میں اردو۔ اشاعت اوّل۔ ص53

39- پنجاب میں اردو۔ ص220 و مابعد

40- پنجاب میں اردو۔ ص53

41- پنجاب میں اردو۔ ص239

42- سیف الملوک۔ ص437

43- پنجاب میں اردو۔ ص53

44- پنجاب میں اردو۔ ص239-238

45- مطبوعہ مجلّہ "پنجابی دربار" بابت جنوری 1930ء

46- مضمون "مولانا عبداللہ عبدی" مطبوعہ مجلّہ "پنجابی دربار" جنوری 1930ء۔ (مرتب)

(در: پنجابی علم و ادب میں مسلمانوں کا حصہ از قاضی فضل حق' مرتبہ بذل حق محمود لاہور: سنگ میل' 2004ء' ص34-49)

ڈاکٹر محمد باقر

مثنوی نیرنگ مملکت چین
یا
قصہ دلارام

از غوث ابن عظیم

حال ہی (1940ء) میں جب میں نے پنجاب یونیورسٹی کے مخطوطات کا جائزہ لیا تو اس مجموعے میں مجھے ''مثنوی نیرنگ مملکت چین یا قصہ دلارام'' کا ایک نامکمل مخطوطہ[1] نظر پڑا۔ اس مخطوطے کا اور کوئی نسخہ کہیں نہیں ملتا اور نہ ہی متداول تذکروں میں اس کا ذکر موجود ہے اس لیے اس مخطوطے کے متعلق جو معلومات حاصل ہو سکی ہیں، وہ صرف متن سے ہی اخذ کی گئی ہیں۔ ممکن ہے اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد کوئی صاحب مثنوی یا اس کے مصنف کے متعلق مزید معلومات بہم پہنچا سکیں۔

متن میں کہیں بھی مثنوی کا عنوان درج نہیں، لیکن نفس مضمون کو پیش نظر رکھ کر غالباً کسی کتاب فروش نے پہلے ورق پر مثنوی کا عنوان نیرنگ مملکت چین یا قصہ دلارام درج کر دیا ہے اور میرے خیال میں یہ عنوان موزوں ہے۔ اس لیے میں نے بھی اسے اس عنوان سے موسوم کرنا مناسب سمجھا ہے۔

1- مصنف

قصہ دلارام کا مصنف غوث ابن عظیم ہے اور غوث تخلص کرتا ہے۔

(ورق 4 الف)

بامداد بیچون قادر کریم
نموده رقم غوث ابن عظیم

(ورق 1 ب)

تو کہہ غوث نعت رسولؐ خدا

مثنوی سے مصنف کے حالات اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکے کہ وہ قصبہ میر ووال کے قرب و جوار میں چک علی کا رہنے والا تھا۔ میر ووال ضلع سیالکوٹ (پنجاب) میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ مصنف نہ صرف اپنے بیان کے مطابق پنجابی ہے بلکہ مثنوی کی زبان میں پنجابی کثرت سے استعمال کرتا ہے، جس سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ مصنف پنجابی ہے اور اردو کی یہ مثنوی پنجابی میں لکھی گئی ہے۔ مصنف نے ایک صاحب جان محمد سے اکتساب علم کیا ہے اور اس کی تعریف میں بالخصوص چند اشعار لکھے ہیں۔ مصنف اپنے استاد کی بہت تعریف کرتا ہے اور میر ووال میں اسے مرجع خلائق بتاتا ہے، لیکن جہاں تک مصنف کے کسب فیض کا تعلق ہے، اس کے متعلق تو یہی کہنا پڑے گا کہ مصنف کوئی زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں۔ بہر حال جان محمد سے اپنے تعلق کو یوں بیان کیا ہے:

لکھوں آگے اوستادکی میں ثنا ہوا جو علم میں مراد رہ نما
خدا نے دیا فخر اوس کوں کمال کہ توڑ علی توڑ اس کا جمال

....

کہ جان محمد اسم ہے عجیب ز خوان محمد لیا اوس نصیب
ہوا تب کہ وہ قدوۃ السالکیں جہاں میں ہوا زبدۃ العارفیں

....

ہے منبع فیاضی میرو وال میں کہ فیضی رساں ہیں بہرحال میں
مکاں دار دایم طرف چک علی کہ علماء نہیں بل ولی ہے ولی

....

کیئی جب کرم کی میرے پر نگاہ مجھے تب علم کا دکھایا یہ را

مثنوی سے اس سے زیادہ مصنف کے سوانح حیات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی اور نہ ہی یہ پتہ چل سکتا ہے کہ یہ مثنوی کب تصنیف ہوئی، لیکن میرا قیاس ہے کہ یہ مثنوی انیسویں صدی کے قرن اول یا دوم کی تصنیف ہے۔ مصنف اپنی زبان کو اردو یا ہندی کے نام سے یاد نہیں کرتا بلکہ ریختہ کے نام سے پکارتا ہے:

(ورق 25 الف)

کبھی قصہ یوسف زلیخا پڑے کبھی لیلی مجنوں نظر میں دھرے
پڑے ہے غوث کے شعر یا ریختہ کہ یا درد افسوس آمیختہ

2- وجہ تصنیف

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلوی اور دکنی شاعروں کی طرح غوث کو نہ تو کسی دربار میں رسائی ہوئی اور نہ

ہی کسی رئیس کی سرپرستی حاصل ہوئی اس لیے یہ مثنوی کسی بادشاہ یا رئیس کے ایما پر نہیں لکھی گئی بلکہ قصے کو دلچسپ سمجھ کر غوث نے اسے نظم کیا۔ غوث اپنے دوستوں سمیت ایک رات رنگ رلیوں میں مصروف تھا۔ چودھویں کے چاند کی سیماب وش کرنیں خاکدان ارض کو بقعہ نور بنا رہی تھیں۔ شراب کا دور چل رہا تھا اور دوست دل بہلانے کے لیے مختلف افسانے سنا رہے تھے۔ اس مجلس میں چک علی کا ایک میراثی امام بخش بھی موجود تھا۔ اس نے دل پسند داستانیں سنائیں جن میں سے ایک قصۂ دلارام بھی تھا۔ غوث کو یہ کہانی بہت پسند آئی اور اس نے اسے مثنوی کے قالب میں ڈال دیا۔ میرے سامنے مثنوی کا صرف نامکمل مخطوطہ ہے اس لیے یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اس کی یہ مثنوی کہاں تک مقبول ہوئی۔ مصنف نے تمام واقعہ یوں بیان کیا ہے:

(ورق 3 ب و 4 الف)

عجائب ہے رنگیں میری داستاں ۔۔۔ سنوں کان دھر تم ہے اس کا بیاں
جو اک رات بیٹھے تھے سب یارگار (غار) ۔۔۔ خوشی میں شگفتہ تھے جیوں گل بہار
کھلی چاندنی اور شب چار دہ ۔۔۔ منور کھڑا شاہ پروین ماہ

. . . .

نشے میں خوشی کے جو سرمست تھے ۔۔۔ ہمہ یار دل خوش جو پیوست تھے
سبھی با دل و جان مسرور ہو ۔۔۔ لگے کہنے کچھ اور مذکور ہو
کہ تھا ایک مجلس کے بی درمیان ۔۔۔ امام بخش آں نام دارد زبان
خیر اللہ کا تھا وہ پسر ہوش مند ۔۔۔ کئی داستاناں کرے دل پسند
زقوم میراسی تھا در چک علی ۔۔۔ کرے سخن شیریں بہ ہر یک بلی
اوسی وقت اوس یہ کہانی کہئی ۔۔۔ میرے دل میں خواہش زیادہ ہوئی
کہا میں کہانی یہ ہے دل پذیر ۔۔۔ لکھوں با قلم گرچہ ہو بے نظیر
بامداد نبیوں قادر کریم ۔۔۔ نمودہ رقم غوث ابن عظیم

3- افسانہ

زبان کے لحاظ سے مثنوی جس قدر ناقص ہے پلاٹ کے لحاظ سے اسی قدر اعلیٰ ہے۔ اب دور کی دیگر افسانوی تخلیقات کے علی الرغم مثنوی میں مافوق الفطرت (SUPERNATURAL) عنصر کو بہت کم دخل ہے۔ ڈراما کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے کیونکہ مصنف نے اتفاقی حادثات کے صدور سے مثنوی میں تین معراج (CLIMAXES) پیدا کیے ہیں۔ ایک حادثے کے ختم ہونے پر ہر مرتبہ جب ہیرو اور ہیروئن کا وصال ہوتا ہے تو مثنوی پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ اب افسانہ ختم ہوا چاہتا ہے، لیکن عین اس وقت مصنف نہایت

چابک دستی سے ایک اور حادثے کو وجود میں لاتا ہے اور اس ڈرامائی (DRAMATIC) ارتقا سے قاری کے دل میں افسانے کے اختتام کے لیے انتظار آمیز دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ مخطوطے کے نامکمل ہونے کی وجہ سے یہ تو پتہ نہیں چل سکا کہ درحقیقت افسانہ کتنا طویل تھا، لیکن میرا خیال ہے کہ نامکمل مخطوطے میں جو تیسرا معراج (CLIMAX) ہے، وہ مثنوی کے اختتام سے بالکل قریب ہے اور غالباً مثنوی کے صرف چند آخری اوراق گم ہیں۔

[اس کے بعد مثنوی کا قصہ بیان کیا گیا ہے، ص 174-185 جو حذف کر دیا گیا ہے......م-ا-چ]

متن

کتابت

مثنوی کی کتابت بہت حد تک ناقص ہے۔ کاتب سے جابجا املا کے اغلاط سرزد ہوئے ہیں۔ مندرجہ ذیل الفاظ:

نذر و نیاز۔ مغموم۔ نکاح۔ مقام۔ یار غار۔ بلطف وتلطف۔ مہمیز۔ تماشہ۔ قلندر

بالترتیب مثنوی میں یوں لکھے گئے ہیں:

نظر و نیاز۔ مخموم۔ نکاہ۔ مکام۔ یارگار۔ بلطف وتلفت۔ ہمیز۔ (ورق 24 الف) (25 الف) (33 الف) (35 الف) (3 ب) (4 الف) (7 ب) تاماشہ۔ کلندر (7 ب) (8 الف)۔

کسرۂ اضافت

کاتب نے متن میں کسرۂ اضافت استعمال کرنے کے علاوہ بجا بجا غلطی یا کسی اور وجہ سے کسرہ (زیر) کے بجائے یا (ی) کا استعمال کیا ہے۔ دیگر مخطوطات میں یہ چیز کہیں نظر نہیں پڑی۔ ملاحظہ ہو:

(ورق 35 الف)

اے بادی صبا اب تو جا کر وہیں — شہزادے کو میری یہ حالت کہیں

(ورق 35 ب)

مجھے یاد کرتا وہ ہے یا نہیں — دِلی دوستی بھرتا ہے یا نہیں

(ورق 6 الف)

مبادا کوئی دشمنی سست بخت — کرے قصد اور ملک گیرد بدست

ان اشعار میں "بادصبا" "دم دوستی" اور "دشمن ست بخت" کی بجائے بادی صبا، دمی دوستی اور دشمنی ست بخت لکھا ہے۔

یائے زاید

اس عہد کے دیگر شاعروں کی طرح غوث نے چند الفاظ کے پیچھے کثرت سے یای زاید کا استعمال کیا ہے۔ مثنوی کے پنجاب میں منظوم ہونے کی یہ بھی ایک دلیل ہے کیونکہ پنجاب میں یہ قاعدہ کثرت سے مروج ہے۔ مثلاً بجائے بالترتیب زوری، شتابی، فلانی، حیاتی اور عرضی کو نظم کیا ہے:

(ورق 31 ب)

وگرنہ زبردست دلشوق شاہ — وہ زوری میں اپنا کرے گا بیاہ

(ورق 36 ب)

یہ کر لو شتابی میرا کام ہے — فلانی جگہ جو دلارام ہے

(ورق 38 ب)

حیاتی کی مجھ کو امید ہی نہیں — میں مرنے اوپر دل ٹھہرایا ولی

(ورق 7 الف)

نہ غم کھاؤ اتنا نہ گھبراؤ تم — غریبوں کی عرضی بجا لیاؤ تم

فارسی کا عجیب امتزاج

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، غوث اپنے اشعار کی زبان کو ریختہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ چنانچہ اس مثنوی میں اس نے فارسی کے الفاظ کے کسی ممکن استعمال سے دریغ نہیں کیا۔ در، از، اور ب کے حروف تو کثرت سے بلا تکلف استعمال کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

(ورق 15 ب) ولے وندر روشن چمن سیم ہے

(ورق 19 ب) میں پیدا ہوا یا کہ در خواب ہوں

(ورق 21 ب) دیا پھاڑ پل میں کہ از تن لباس

(ورق 34 ب) مجھے جانا بہتر بخدمت پدر

(ورق 31 الف) کہ در پیرہن وہ سمایا نہ تھا

فارسی کے افعال بھی کہیں کہیں نظم کر لیے ہیں:

(ورق 28 ب)

یا رزاق فتاح قادر وہاب ہماری تو قسمت کا بکشا باب
(ورق 30ب)
یہی سخن کر پڑا در فکر تحیر میں افتاد دے سر بسر
(ورق 39ب)
نگہبان حافظ میرا ہو کریم بہر وقت جویم از حق پناہ

فارسی ضمیر متصل

فارسی ضمائر متصل کا غوث نے کثرت سے استعمال کیا ہے۔ میں صرف چند مثالوں پر اکتفا کروں گا۔
(ورق 15ب الف) دو چشماں صوادش دہن میم ہے
(ورق 24ب) دلم در جدائی جو مخمور ہے
(ورق 4الف) کہو راوی نامش ہے فغفور شاہ
(ورق 5ب) ندانم میری میں چہ تقصیر ہے

پنجابی اثرات

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے' مثنوی زبان کے لحاظ سے بہت ناقص ہے، لیکن غالباً اس لحاظ سے مثنوی کو ضرور اہمیت حاصل ہے کہ پنجاب میں اردو کے اس دور کی تصنیف ہے جس دور کی بہت کم تصنیفات ابھی تک دریافت ہو سکی ہیں اور جو تصنیفات دریافت بھی ہوئی ہیں ان میں شاید ہی پنجابی کے اتنے اثرات موجود ہوں، جو ہمیں اس مثنوی میں نظر آتے ہیں۔ پنجابی کے الفاظ تو اس کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں کہ ان کی فہرست مرتب کرنا بھی بہت طویل کام ہوگا۔ تاہم چند منتخب الفاظ قارئین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔

پنجابی الفاظ

(ورق 26الف) باہمن (برہمن)۔ (ورق 18الف) نسنگ (جھجک کے بغیر)۔ (ورق 17الف) شتابی (جلدی)۔ (14ب) بطک (بطخ)۔ (18ب) اگارے (آگے)۔ (21ب) دارو (بمعنی شراب)۔ (33ب) دردی (غمخوار)۔ (25الف) گل (گلا)۔ (27ب) زہیر (مضمحل)۔ (32ب) پٹاکا (پٹاخہ)۔ (38الف) سڑنا (جلنا)۔ (38ب) پنجویں (پانچویں)۔ (39ب) بلے (جلے)۔ (44الف) لت (لات)۔ (5ب) جلبل ہوا (جل بجھ کر ہوا)۔ (48ب) بسا (اعتبار)۔

پنجابی افعال

پنجابی الفاظ کی کثرت کے علاوہ غوث نے اس مثنوی میں پنجابی کے افعال بھی بہت استعمال کیے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں افعال پنجابی ہیں:

(ورق 18ب)

کہ پریوں کا جس وقت سایہ پیا[2] اسی وقت دلشوق تھا سو گیا

(ورق 22ب)

شہزادے کا جب تک نہ فرمان ہو تو مشکل وہاں بھی تیرا جان ہو

(ورق 25الف)

اے باد صبا اب تو جا کر وہیں شہزادے کو یہ میری حالت کہیں[3]

(ورق 25الف)

کہ رل[4] بیٹھ دونوں پیویں ہم شراب اوٹھا درمیاں میں جو پردہ حجاب

(ورق 27الف)

تو ہر گاؤں ہر شہر میں آ وڑیں[5] جو کوچہ بکوچہ گدائی کریں

(ورق 29ب)

نہ سمجھا تو تجکو نہ جانا[6] مجے کہ ہرگز نہتم نے پچھاتا مجے

(ورق 30الف)

لگا ساتھ چھاتی کے چھاتی وہی وہ ایسے ملے تھے نہ ملیا کوئی

(ورق 31الف)

بندھا سہرا نوشہ کے جب سر اوپر وہیں آئے دیکھن کو شمس و قمر

(ورق 32ب)

کہ کشتی کریں پہلواں اس طرف
کہ دیکھن میں جس کے ہو غم ہر طرف

(ورق 38الف)

نہ ہمدم نہ واقف کوئی راز کا
مجھے ایسی آتش میں سڑنا پڑا

(ورق 40الف)

کیا یا ہروے ماہ میں مجکو بیتاب
ہوا ماگہہ میں بجھ [7] میرا دل کباب
(ورق 43الف)
سنی وزو نے جب عقب سے کلام
تو مڑا [8] آ کھلوتا وہ در زیر بام

پنجابی جمع

غوث نے حتی الوسع افعال واسما کی جمع پنجابی طریق پر بنائی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں بعض الفاظ اس کے شاہد ہیں:

(ورق 31ب)
کہ جس وقت پریاں پلنگ کو اوٹھا شہزادی کوں گھر میں لے گیاں اوٹھا
(ورق 36ب)
لیا ساتھ لشکر کئی لکھ سوار کئی پلٹناں لے کے ہویا تیار
(ورق 35الف)
گئی جب وہ کر کوچ کئی منزلاں یہ گردش فلک کی تھی ساتھی وہاں
(ورق 48 ب)
کہا اس نے داناواں سچ ہے کہا نہ عورت کے عالم کا کچھ ہے بسا [9]

مصنف نے اس مثنوی میں ایک مختصر سا ''بارہ ماہ'' بھی لکھا ہے۔ جس میں ہر مہینے میں پانچ غزل کے اشعار لکھے ہیں۔ اس ''بارہ ماہ'' میں تمام مہینوں کے نام بھی پنجابی میں نظم کیے گئے ہیں:

5-انتخاب

یہ مضمون تشنہ رہے گا اگر قارئین کی خدمت میں مثنوی کا انتخاب پیش نہ کیا جائے۔ ملاحظہ کیجئے: مصنف نے دلشوق کا محل اور باغ الفاظ سے کس طرح تعمیر کیا ہے۔ پنجاب میں مبارک کام کا آغاز زمین پر تیل گرا کر کیا جاتا ہے اور اسے نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ یہ رسم مٹی بھی اس شکل میں موجود ہے کہ جب دولہا دلہن کو بیاہ کر لاتا ہے تو دلہن کی خوشدامن اپنے مکان میں داخل ہونے سے پہلے دلہیز پر سرسوں کا تیل گراتی ہے اور پھر دلہن مکان میں داخل ہوتی ہے۔ غوث نے بھی مندرجہ ذیل اشعار میں اس رسم کا ذکر کیا ہے:

اول فاتحہ خیر بسم اللہ پھر دیا خشت کو شہزادے نے دھر

کہ پھر شیرنی بانڈ اور تیل چو — رکھا کاریگر نے جو بنیاد کو
مرتب لگا ہونے دیوار و در — لگا سیم کا آب اور خشت زر
عجب اک طرح طاق تھے بند کیے — کہ چوگردی طاقوں کے جدول کیے
سبز سرخ دے رنگ کاریگراں — کیے جرت لعلوں کی اوس درمیاں

. . . .

کہ پہلوں میں طاقوں کے کئی مورتاں — کہ معشوق عاشق کیاں صورتاں
کچھ اس طور اوس کاریگر نے بنا — کسی کوں کسی کے دیا گل لگا
کسی نے کسی کا جو پلہ پکڑ — کہے سات میرے تو اک بات کر
کسی نے کسی کے گلے ڈال ہاتھ — کسی سے کوئی کہتی ہس ہس کے بات
کسی کو کوئی کہتی انگل کوں پھیر — پرے دور ہو چل ارے مجھ نہ چھیر
کوئی خود بخود بوسہ بازی کریں — گذشتہ کوئی بات تازی کریں
کسی کے کوئی آگے ہتھ باندھ کر — کرے منت اورعاجزی بیشتر
خوشی سے کوئی بیٹھ پیئے شراب — کوئی سامنے کھاتی کر کر کباب
کوئی چہرہ کوں دیکھتی شیشہ دھر — کوئی مِسّی ملتی تھی دانتوں اپر
لبوں کے اوپر کوئی سرخی ملے — کوئی سیس اپنی کو کنگھی کرے

. . . .

کوئی ساتھ چشموں اشارت کرے — کوئی ساتھ ہاتوں بشارت کرے
کوئی کھیلے شطرنج گنجفہ قمار — کوئی بازی جیتے کوئی دیوے ہار
کوئی ناز ادا سیں چھراوے پلنگ — کوئی سیس اپنے کوں دھوے نسنگ
کوئی بیچ آنکھوں کے سرمہ کرے — کسی کو کوئی بیٹھ چپی کرے
کوئی بیٹھے بر پلنگ تکیہ لگا — عجب مورتوں میں تھی وہ کج ادا
رکھے رب اس غوث کو بے خلل — کہ تیار رنگیں کیا جس محل
لگا دوں میں ہر طرف گلزار کو — بٹھاووں میں اس باغ میں یار کو
لگائے تھے ہر طرف شجرے میوہ دار — کہیں تاق لیموں کہیں تھے انار

. . . .

کہیں بوتے بادام کے بے شمار — کسی طرف انجیر تھی اور انار
کہیں تھے بتنگ اورکہیں سنگترا — کہیں داکھ تھی اور پستہ کھرا

کسی طرف تھے انب آرو کہیں
کہیں کشمش و ناشپاتی کہیں
کہیں لاچیاں اور کہیں قرنفل
سپاری کہیں اور کہیں ناریل

. . . .

کہیں سوسن و مروا تھا گل دوپہر
کہیں تھا جو سنبل بنفشہ کا لہر
کہ گل خیرا ریحان وہ برگ حنا
کہیں کاسنی گیندا صد برگ تھا
گل عباسی گل شبو گل نارون
شقائق خیرہ کہیں نسترن

. . . .

کہیں تھی داؤدی اور کہیں موگرا
کہیں تھی جو نسرین کہیں موتیا
گل عنبر کہیں اور بابونہ کہیں
صنوبر کہیں اور کرنا کہیں

. . . .

"بارہ ماہ" میں سے ایک مہینہ ملاحظہ فرمایئے! دلارام دلشوق کے فراق میں گا رہی ہے:

ماہ ساون

کیا مجھ کو ساون نے اب دل فگار
کہ پنچویں مہینے نہ پایا میں یار
پیا کے بنا میں پریشان ہوں
کروں اپنی آنکھوں سے میں اشکبار
میرا تن بدن جل کے کولا ہوا
نہیں خواب خور مجھ کو لیل و نہار
میں بے ذوق بیٹھی ہوں حیراں ولے
کہ دلشوق بن اب گئی سب بہار
اگر میری آ کر خبر لے سجن
کروں جان و دل اپنا اوس پہ نثار

حواشی:

1- نمبر1442، Ui VI 134، سائز 1/2 5 انچ X 8 انچ، 50 اوراق

(پنجاب یونیورسٹی کے کیٹلاگر (فہرست ساز) نے صرف 148 اوراق گنے ہیں۔ دو ورق دوسرے اوراق سے نسبتاً چھوٹا ہونے کی وجہ سے نظر انداز ہو گئے ہیں۔) فی صفحہ 13 سطور

2- پڑا۔ 3- کہنا۔ 4- مل بیٹھ کر۔

5- آ داخل ہوں۔ 6- جانا پہچانا۔ 7- جل کر۔

8- پھر آ کھڑا ہوا۔ 9- پنجابی، بھروسہ۔

(در: اورینٹل کالج میگزین، نومبر 1940ء۔ نیز در: اردوئے قدیم دکن اور پنجاب میں از ڈاکٹر محمد باقر لاہور 1972ء ص 170-194)

ڈاکٹر محمد باقر

مراد المحبین

(مراد شاہ مراد لاہوری)

قطب عالم شیخ عبدالجلیلؒ چوہڑ شاہ بندگی سہروردی مشائخ میں سے ایک بزرگ گذرے ہیں' جو سلطان بہلول لودھی کے داماد تھے اور اپنی زندگی دینی اور دنیوی طور پر کامیاب اور بامراد گذار کر سنہ 910ھ (1504ء) میں لاہور میں فوت ہوئے[1] اور یہیں مدفون ہوئے۔ اس وقت ان کی خانقاہ ریلوے پولیس لائنز کے جنوب میں ہے۔ شیخ عبدالجلیلؒ کی اولاد اور ان کے اخلاف کا سلسلہ تا ہنوز قائم ہے' جن میں سے میرے نیازمندانہ تعلقات مخدوم غلام دستگیر صاحب نامی سے ہیں جو اس وقت لاہور میں مقیم ہیں اور جن کی عنایات سے آج میں اس بزرگ خاندان کے ایک اہم مصنف کی اہم تصنیف سے قارئین کو روشناس کرانے میں کامیاب ہو رہا ہوں۔ نامی صاحب کے پاس اپنے بزرگوں کی فارسی اور اردو تصنیفات کا ایک گراں قدر ذخیرہ ہے۔ ان تصنیفات میں سے بیشتر غیر مطبوعہ مخطوطے ہیں اور بہت سے کمیاب نسخے ہیں۔ میرے پیش نظر بھی اس وقت ایک غیر مطبوعہ مخطوطہ ہے' جو ''مراد المحبین '' کے نام سے نامی صاحب کے ایک بزرگ حضرت مراد شاہ نے نظم کیا ہے۔

1- مصنف

حضرت مراد شاہ پیر کرم شاہ عرف مستا شاہ کے صاحبزادے ہیں۔ مراد شاہ سے دنیائے ادب پہلی مرتبہ استاذی حافظ محمود شیرانی کے توسط سے روشناس ہوتی ہے' جب وہ ان کا ذکر اپنی گراں قدر تصنیف ''پنجاب میں اردو'' میں کرتے ہیں۔ اس وقت نامی صاحب کی وساطت سے شیرانی صاحب کو جو مواد مراد شاہ صاحب کے متعلق موصول ہوا' وہ کسی حد تک نامکمل تھا۔ بعد میں ان معلومات کی بنا پر میں نے ایک شذرہ ''اورینٹل کالج میگزین'' (فروری سنہ 1941ء) میں سپرد قلم کیا' لیکن اس میں درج کی ہوئی معلومات بھی اب ترمیم طلب ہیں۔ گو اس وقت بھی تفصیلی سوانح حیات مرتب کرنے کی گنجائش نہیں' تاہم جو معلومات بہم پہنچ سکی ہیں۔ وہ ہدیہ قارئین ہیں۔

حضرت مراد شاہ سنہ 1184ھ (1770ء) میں پیدا ہوئے۔ یوں تو کسی ذریعہ سے مراد شاہ کی تاریخ ولادت کا براہِ راست پتہ نہیں ملتا' لیکن آپ کی ایک منظوم تصنیف ''مراد العاشقین'' کے چند اشعار سے میں نے یہ حساب لگایا ہے کہ آپ کی ولادت سنہ 1184ھ (1770ء) میں ہوئی ہوگی۔ ''مراد العاشقین'' 1205ھ (1790ء) کی تصنیف ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہے:

زفیض مرشد و استاد کامل
کہ با طبعم بہرحال است شامل
بسال یک ہزار و دو صد و پنج
تمام این نظم شد بی محنت و رنج [2]

مراد شاہ نے جس وقت یہ فارسی مثنوی نظم کی ہے' اس وقت اس مثنوی میں اپنی عمر کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

زبان بر بندم از رسم کلامی
برون آیم ز قید ننگ و نامی
کہ از عمر طبیعی بیست و یک
شدہ در بازی شش پنج و دو یک
بسر بردم بہر بیہودہ کاری
نہ فکر خود نہ ذکر وصل یاری [3]

ظاہر ہے کہ اگر حضرت مراد شاہ کی عمر 1205ھ (1790ء) میں ''مراد العاشقین'' کی تصنیف کے وقت اکیس سال تھی تو ان کی پیدائش سنہ 1183ھ (1770ء)[4] میں ہوئی ہوگی۔

مراد شاہ پیدا کہاں ہوئے؟ اس کے متعلق مجھے کوئی تفصیل نہیں مل سکی۔ ہاں اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ لاہور سے سنہ 1196ھ (1781ء) میں لکھنؤ تشریف لے گئے تھے۔ مراد شاہ کے بھائی پیر فرح بخش کی تصنیف ''اذکار قلندری'' میں مراد شاہ کے والد پیر کرم شاہ کے نقل مکان کے واقعہ کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

''در وقت ویرانی پنجاب و لاہور خروج سنگھاں بظہور پیوست وطن مالوف گذاشتہ اقامت بندۂ لکھنؤ اختیار داشتہ در سنہ 1196 یک ہزار و یک صد و نود و شش سن ہجرت نبی علیہ السلام مع اہل و عیال عازم بلدۂ مسطور گردید۔''[5]

حضرت مراد شاہ لکھنؤ میں اپنے باپ کے ساتھ چار سال تک رہے۔ سنہ 1200ھ (1785ء) میں پیر کرم شاہ کو آبائی وطن کی محبت نے کھینچا تو اہل و عیال سمیت لکھنؤ سے لاہور کے لیے چل کھڑے ہوئے۔

شاہجہاں پور کے نزدیک قزاقوں سے مقابلہ ہوا اور وہیں سنہ 1200ھ (1785ء) میں گولۂ تفنگ سے شہید ہوئے۔[6] مفتی غلام سرور لاہوری نے پیر کرم شاہ کی تاریخ وفات کا ذکر مندرجہ ذیل اشعار میں کیا ہے:

مکرم شیخ دین کرم شاہ
شہ مسعود رضی اللہ عنہ
ز خورشید عطا دل جست وصلش
دگر فرمود رضی اللہ عنہ

ایضاً

دریغا کرم شاہ رفت از جہان
کہ شاہ مسیحا لقب داشت آن
بیان غمش چوں نگردد تمام
فزوں گشت ماتم بہر خاص و عام
دراں غم ز ہاتف چو کردم سوال
بگوشم چنیں گفت بے قیل و قال
کہ[7] تاریخ آں غازی نیک نام
بجو از کرم شاہ جنت مقام

والد کی ناگہانی وفات کی وجہ سے حضرت مراد شاہ کی وطن کو مراجعت معرض التوا میں پڑ گئی اور ان کے ایک منظوم خط سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ سنہ 1203ھ (1788ء) تک کم از کم لکھنؤ میں تھے کیونکہ اس خط میں انہوں نے واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ وہ سات سال سے لکھنؤ میں ہیں۔ ملاحظہ ہو:

[8] میان لکھنؤ باشم ازیں طور
طپد دل از برائے شہر لاہور

ہمیں لاہور میں جلدی بلاؤ
ولے یہ لکھنو کو بھی دعا دو
کہ حق اس شہر کو آباد رکھے
رئیسوں کو یہاں کے شاد رکھے
اور اطرافوں سے منعم یا گدا ہے

ہر ایک اس شہر میں آ کر بھرا ہے
یہ عالم اس طرح بستا یہاں ہے
کہ جوں بتیس دانتوں میں زباں ہے
تعرض کچھ نہ بد کو نیک سے ہے
کہ بے پروا یہاں اک ایک سے ہے
کچھ اطرافوں میں کچھ اس شہر میں بھی
کٹی ہے سات سال اوقات اپنی

معین طور پر یہ پتہ نہیں چلتا کہ خط لکھنے سے کتنے عرصے بعد حضرت مراد شاہ عازم لاہور ہوئے' لیکن ان کی مندرجہ ذیل رباعیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں لکھنؤ چھوڑنے کا صدمہ بہت ہوا:

افسوس کہ اپنے ماہ رو کو چھوڑا
در اس کے اور اس کے کو کو چھوڑا
کھانا پینا مراد چھوٹا ہم سے
آہ جس روز سے لکھنؤ کو چھوڑا

کل چین سے لکھنؤ میں بستے بستے
تھا نام لیا سفر کا ہنستے ہنستے
دیکھو یارو خدا کی قدرت بچ بچ
جاتے ہیں چلے ہم آج رستے رستے
آتا تھا خیال اپنے جی میں اکثر
نکلیں گے نہ لکھنو سے ہرگز باہر
سو آج سرائے میں پڑے ہیں اللہ
بھٹیاری کی کھاٹ پر مسافر بن کر 9

البتہ آپ کی مذکورہ مثنوی ''مرادالعاشقین'' سے یہ نشان ملتا ہے کہ آپ اس مثنوی کی تصنیف کے وقت یعنی سنہ 1205ھ (1790ء) میں لاہور میں موجود تھے' کیونکہ اس مثنوی میں اپنے مرشد شیخ بدرالدین رحمتی ثم لکھنوی کی مدح لکھتے لکھتے تحریر فرماتے ہیں:

دمے در خدمت آن شیخ بودن

بود فیض دو عالم را ربودن

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

مرا از خدمتش قسمت جدا ساخت
بہ محنت ہائے ہجراں مبتلا ساخت

. . . .

. . . .

بہر شہرے کہ ما را سیرگاہ ہست
سواد لکھنؤ پیش نگاہ است
دل ما را کہ شایق ایں چنیں کرد
نہ شوق آں مکاں عشق کمیں کرد
ز آبایم وطن گو ہست لاہور
ولے چوں ماندہ ام از خدمتش دور
بروئے خانماں خود دہم پشت
کہ ما را فرقت او بے اجل کشت
ولے بس کار صعب و مشکل افتاد
چہ سازم چوں کنم یا در گل افتاد
مگر بر لطف حق ما را یقین است
کہ نامش جامع المتفرقین است[10]

سنہ 1205ھ (1790ء) کے بعد شاید آپ اواخر حیات تک لاہور میں ہی رہے، کیونکہ جیسے آگے چل کر بیان کیا جائے گا آپ نے اپنی آخری مثنوی سنہ 1212ھ (1797ء) میں لاہور شہر میں ہی لکھی اور پھر اس مثنوی کو نامکمل چھوڑ کر 1215ھ (1800ء) میں راہی ملک بقا ہوئے۔ آپ کے چھوٹے بھائی پیر قلندر شاہ نے "کلیات مراد" کے ایک مخطوطہ[11] پر مراد شاہ کی تاریخ وفات کے متعلق مندرجہ ذیل اشعار قلمبند کیے ہیں:

غلام رکن دین شاہ مرادم
کہ معدوم است در دوراں مثالش

. . . .

. . . .

. . . .

بر آمد بست و نہ سال و بے چند
نمودم ۔ چوں حساب سن و سالش
بہ بزم وصل جان چوں از جہاں گشت
دریغا گشت تاریخ وصالش

مفتی غلام سرور نے بھی "خزینۃ الاصفیا" میں غالباً پیر قلندر شاہ کی پیروی کرتے ہوئے مراد شاہ کا سال وفات سنہ 1215ھ مقرر کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

[12] چوں مراد از دار دنیا رخت بست
رفت در گلزار جنت با مراد
سال وصلش گو سخی مقتدا
ہم بخواں شاہ کرامت با مراد

مراد شاہ کی تاریخ وفات کے متعلق مفتی اور پیر قلندر شاہ کے بیانات غالباً صحیح ہوں گے' لیکن اگر پیر قلندر شاہ کا یہ بیان تسلیم کر لیا جائے کہ مراد شاہ سنہ 1215ھ میں فوت ہوئے تھے تو اس حالت میں ان کے بیان کا یہ حصہ درست معلوم نہیں ہوتا کہ مراد شاہ انتیس سال کی عمر پا کر فوت ہوئے' کیونکہ اس حساب سے مراد شاہ کا سنہ ولادت 1186ھ (1772ء) نکلتا ہے' حالانکہ مراد شاہ اپنے بیان کے مطابق 1184ھ (1770ء) میں پیدا ہوئے تھے۔

نامی صاحب کا یہ بیان ہے کہ مراد شاہ[13] 5 محرم الحرام 1215ھ (1800ء) کو اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کر گئے اور آپ کا مزار موضع مردانہ تحصیل شاہدرہ (پنجاب) میں ہے۔

مراد شاہ نے اپنی کوئی اولاد نہ چھوڑی' لیکن آپ کی اولاد معنوی یعنی تصنیفات ابھی تک محفوظ ہیں۔ یہ تصنیفات سب منظوم ہیں۔ بیشتر چھوٹی مثنویاں ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

1- مثنوی مراد العاشقین ⎤
2- ترجیع بند ماریداں ⎦ دونوں فارسی میں ہیں۔
3- دیوان مراد
4- نامۂ مراد
5- مثنوی نگس نامہ

6- مثنوی موش نامہ
7- مثنوی مراد المحبین

''دیوان مراد'' اور مثنوی ''مراد المحبین'' کے سوا مراد شاہ کی دیگر تمام تصنیفات شائع ہو چکی ہیں۔ اس فرصت میں ہم مثنوی ''مراد المحبین'' سے قارئین کو روشناس کراتے ہیں۔

2- ''مراد المحبین'' کی تاریخ تصنیف

قصہ چہار درویش کو افسانوی ادب میں بقائے دوام حاصل ہے۔ اس قصے کو سب سے پہلے فارسی میں لکھنے کا سہرا امیر خسرو دہلوی کے سر باندھا جاتا ہے۔ میر امن لکھتے ہیں:

> ''یہ قصہ چہار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا زری زر بخش جو ان کے پیر تھے اور درگاہ ان کی دلی میں قلعے سے تین کوس لال دروازے کے باہر ٹمیا دروازے سے آگے لال بنگلے کے پاس ہے' ان کی طبیعت ماندی ہوئی تب مرشد کا دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو قصہ ہمیشہ کہتے اور تیمارداری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شفا دی' تب انہوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصے کو سنے گا' خدا کے فضل سے تندرست رہے گا۔ جب سے قصہ فارسی میں مروج ہوا۔''[14]

غالباً میر امن کی روایت پر ایک عرصے سے مشہور بھی چلا آتا ہے کہ فارسی قصے کے مصنف امیر خسرو دہلوی ہیں' لیکن مولوی عبدالحق صاحب کے بقول ''نہ تو ان (خسرو) کی تصانیف میں کہیں اس کا ذکر ہے اور نہ اس (فارسی) قصے میں کہیں اس کا پتہ لگتا ہے۔ فارسی نسخے کے شروع میں جو منظوم حمد ہے' اس کے مقطع میں ''صفی'' تخلص ہے:

صفی را زیر بار منت بال ہما مفکن
ز مشکیں طرۂ بخت سیاہش چتر شاہی دہ[15]

مجھے بھی امیر خسرو کی کوئی تصنیف چہار درویش یا باغ و بہار کے نام سے مشرقی اور مغربی کتاب خانوں میں نہیں ملی' البتہ پنجاب یونیورسٹی کے کتاب خانے میں حکیم محمد علی مخاطب بہ معصوم علی کی ایک فارسی تصنیف ''باغ و بہار'' مخطوطے کی شکل میں موجود ہے۔ مصنف نے تاریخ تصنیف 14 شہر شوال سنہ 15 محمد شاہ[16] یعنی 14 شوال[17] 1146ھ یا 20 مارچ سنہ 1734ء لکھی ہے اور وجہ تصنیف یوں بیان کی ہے:

> ''[18] روزے این غلام مستہام در محفل اقدس و مجلس مقدس خسرو گردوں حاضر و پروانہ آسا براں شمع خورشید نظیر ناظر بود۔ بہ تقریبے حکایتے از دل ریشان درویشاں و سرگزشتے از سرگزشتگان قلندران بزبان ہندی........ عرض ہمایوں رسانید و آن

حکایت مرغوب طبع و پسند خاطر شکل پادشاہ فیروز مند آمد۔ بایں کمینہ یعنی حکیم محمد علی مخاطب بہ معصوم علی خان فرمان فرمائے دل و جان صادر شد کہ آنرا از عبارت ہندی بزبان فارسی ترجمہ نماید۔ بنا علی ہذا اطاعت فرمان واجب الاذعان نمودہ آن حکایت را بالسطر بزبان عجمی نقل نمودہ وھی ہذا۔''

حکیم محمد علی نے کون سی ہندی روایت کا ترجمہ فارسی میں کیا' اس کا پتہ نہیں چلتا' لیکن ان کے بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ میر امن سے بہت پہلے باغ و بہار یا چہار درویش کا قصہ اردو میں بھی زبان زد خلائق تھا۔ گو میر امن سے پہلے اردو میں اس افسانے کا نشان ہمیں صرف محمد حسین عطا خان تحسین کی تصنیف ''نوطرز مرصع'' کی شکل میں ملتا ہے۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ ''نوطرز مرصع'' سنہ 1213ھ (1798ء) کی تصنیف ہے[19] لیکن استاذی حافظ محمود شیرانی اور مولوی عبدالحق صاحب کی تحقیق کے نتائج مختلف ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ''نوطرز مرصع'' سنہ 1188ھ (1775ء) کی تصنیف ہے۔ شیرانی صاحب لکھتے ہیں:

''میر صاحب (میر تقی میر) کے بعد محمد حسین عطا خان تحسین المخاطب بہ مرصع رقم ہیں۔ وہ فیض آباد آ کر نواب شجاع الدولہ کی ملازمت میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک روز انہوں نے امیر خسرو کی چار درویش فارسی کے مجوزہ ترجمے کا ایک حصہ نواب وزیر کو سنایا۔ اس نے بہت پسند کیا اور کتاب کی تکمیل کی فرمائش کی۔ مؤلف نے ہمہ تن مصروف ہو کر اس کام کو سرانجام دیا اور کتاب جس کا نام ''نوطرز مرصع'' تھا' نواب کی خدمت میں پیش ہونے والی تھی کہ سنہ 1188ھ میں شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ تحسین کچھ عرصے خاموش رہا۔ بعد میں دیباچہ کتاب میں ایک قصیدہ نواب آصف الدولہ کی مدح میں داخل کر کے کتاب مذکور نواب کی خدمت میں پیش کی۔ یہ واقعہ ظاہر ہے کہ آصف الدولہ کی نوابی کے ابتدائی دور میں پیش آیا ہوگا[20]۔''

مولوی عبدالحق صاحب رقم طراز ہیں:

''غرض نواب شجاع الدولہ کی وفات کے بعد انہوں (تحسین) نے یہ کتاب نواب آصف الدولہ کے نام سے معنون کی۔ نواب آصف الدولہ کی تخت نشینی سنہ 1775ء میں ہوئی۔ اس وقت یہ کتاب ختم ہو چکی تھی۔ اس کی تالیف باغ و بہار سے تخمیناً 29' 30 برس پہلے ہوئی۔''

ذاتی طور پر مجھے شیرانی صاحب اور مولوی عبدالحق صاحب کی اس تحقیق سے اتفاق ہے کہ ''نوطرز مرصع'' سنہ 1213ھ (1798ء) کی تالیف نہیں بلکہ سنہ 1188ھ (1775ء) میں لکھی گئی ہے۔

بہر صورت اب تک یہ گمان کیا جاتا تھا کہ تحسین کے بعد اردو میں ایک ہی سال میں میر امن اور محمد عوض

زریں نے اس قصے کو ایک ہی نام سے لکھا ہے۔ میر امن نے سنہ 1217ھ (1802ء) سال تحریر یوں معین کیا ہے:

مرتب ہوا جب یہ باغ و بہار
تھے سن بارہ سو سترہ در شمار
کرو سیر اب اس کی تم رات دن
کہ ہے نام تاریخ باغ و بہار

اور محمد عوض زریں نے یوں تاریخ نکالی ہے:

بنا کر یہ گل دستہ روزگار
لکھی اس کی تاریخ باغ و بہار

لیکن مراد شاہ کی تصنیف ''مراد الحسین'' کی دریافت سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اردو میں تحسین کے بعد اردو نظم میں سب سے پہلے مراد شاہ نے اس قصے کو منظوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ ''مراد الحسین'' کا واحد مخطوطہ نامی صاحب کی ملکیت ہے اور ''کلیات مراد'' کا ایک جزو ہے۔ اس مخطوطے کی تقطیع 4.6انچ X10.8 انچ ہے۔ کل 37 اوراق ہیں۔ ہر ایک ورق پر پندرہ سطور ہیں اور ہر ایک سطر چار انچ طویل ہے۔ کاتب کا نام اور تاریخ کتابت درج نہیں' لیکن ملحقہ مثنوی ''مراد العاشقین'' کی تاریخ کتابت 12 ذی قعدہ 1258ھ درج ہے لہٰذا اس مثنوی کی تاریخ کتابت بھی اس کے لگ بھگ ہوگی۔

مصنف نے مثنوی ''مراد الحسین'' کی تاریخ تصنیف یوں لکھی ہے:

بسال غریب و بماہ صیام
بشہر لہانور عالی مقام [22]

اس شعر سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ مثنوی لاہور میں لکھی گئی ہے۔ گو مراد شاہ نے لاہور کو لہانور نظم کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ مثنوی سنہ 1212ھ (1797ء) میں نظم کی جارہی تھی تو میر امن اور محمد عوض زریں کی تصنیفات پر اس کو سبقت ہے۔

3- وجہِ تصنیف

باغ و بہار کے قصے کے تمام مصنفین نے کسی نہ کسی کی فرمائش سے اس قصے کو لکھا ہے اور اپنی محنت کا ثمرہ اس مربی یا سرپرست سے حاصل کیا ہے جس کے ایما پر انہوں نے قصہ لکھا ہے' لیکن مراد شاہ نے کسی انعام یا صلے کے لالچ کے بغیر اپنے قصے کو ایک دوست کی فرمائش پر نظم کرنا شروع کیا تھا۔ یہ دوست لاہور کے مشہور خاندان حکیماں کے ایک بزرگ تھے۔ نام حکیم علیم اللہ ابن محمد حیات تھا۔ اس وقت بھی اس خاندان کے افراد لاہور میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ حکیم علیم اللہ صاحب' حکیم احمد شجاع کے دادا کے بھائی تھے۔ حکیم

احمد شجاع کا نام محتاج تعارف نہیں۔ خاندانی روایات کو قائم رکھتے ہوئے آپ نے اردو ادب کی بہت خدمت کی ہے اور ابھی تک مطالعہ اور تحریر کا شغل جاری ہے۔ انہی حکیم علیم اللہ صاحب کی فرمائش پر اور اپنا غم غلط کرنے کے لیے مراد شاہ نے "مراد المحبین" لکھنا شروع کی۔ واقعات کی تفصیل انہی کی زبان سے سنئے:

که دیوان خانے میں تھا ایک روز
یہ غم دیدہ بیٹھا بصد درد و سوز
فراق برادر سے ماتم زدہ
کیے تن کو آہوں سے آتش کدہ
بہ تن شعلہ زن سوز و دل میں قلق
دم سرد سے ہر نفس سینہ شق
جوانی پہ اس کی یہ افسوس تھا
کہ دل زندگانی سے مایوس تھا

. . . .

. . . .

غرض اس کے غم سے بدن سے یہ جاں
ہوا چاہتی ہے عدم کو رواں
حواس اپنے تھے جا بجا جا پھرے
کہ اتنے میں یک بارگی آ پھرے
محبوں میں اپنے ستودہ صفات
علیم اللہ ابن محمد حیات
حکیم اور ہیں اپنے مخلص قدیم
ہمیشہ محلے کے اپنے مقیم
اگرچہ وہ ہیں صاحب علم و فن
اس احقر سے کرتے ہیں مشق سخن

. . . .

. . . .

محبت جو تھی ان کو مجھ سے کمال
اٹھانے لگے بیٹھ دل کا ملال

گزشتوں کی کچھ سرگزشتیں سنا
بتقریر شائستہ مجھ سے کہا
کہ ہے آپ سے ایک میرا سوال
ضرور اس طرف آپ کیجئے خیال
خیال اس طرف کچھ جو بٹ جائے گا
تو دل سے یہ اندوہ گھٹ جائے گا
ہماری بھی خاطر ہے اس میں تمام
اور اِک فائدہ ہے بہر خاص و عام
یہ قصہ جو ہے چار درویش کا
اگر نظم ہو تو بہت ہے بجا
و لیکن ہو اردو زباں میں بیاں
کہ بھاتی ہے ہر ایک کو یہ زباں

. . . . . .

. . . . . .

بہت سا کیا جب انہوں نے خضوع
کیا ان کی خاطر سے تب میں شروع

. . . . . .

. . . . . .

محبوں کی خاطر ہے اس میں تمام
"مراد المحبین" رکھا اس کا نام

مثنوی کی اس ابتدا سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ رمضان سنہ 1212ھ (مطابق فروری۔ مارچ سنہ 1798ء) میں "مراد المحبین" کا آغاز کیا گیا' لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کب اور کن حالات کے ماتحت مثنوی کو مراد شاہ نے نامکمل چھوڑ دیا۔ پیش نظر مخطوطہ میں صرف پہلے درویش کی مکمل سیر کو نظم کیا گیا ہے اور اس کے بعد بغیر کسی بیان کے مثنوی ختم ہو جاتی ہے۔ قیاس یہ ہے کہ چونکہ ان دنوں مراد شاہ کی صحت اچھی نہ تھی' اس لیے غالباً وہ اس مثنوی کو نامکمل چھوڑ کر ہی راہی ملک عدم ہوئے۔

4- متن

افسانہ:

مثنوی کا قصہ فارسی چہار درویش کا ترجمہ معلوم نہیں ہوتا' بلکہ خفیف سے فرق کے ساتھ تحسین کے "نوطرز مرصع" کی نقل معلوم ہوتا ہے' لیکن مصنف نے خود اس امر کی صراحت نہیں کی کہ انہوں نے افسانہ کہاں سے لیا ہے۔ چونکہ افسانہ بہت مقبول ہے اور مختلف شکلوں میں عام طور پر دستیاب ہو سکتا ہے' اس لیے میں اس کا خلاصہ درج کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔

کتابت:

اس مخطوطے میں کتابت کی چند ایسی خصوصیات نظر آتی ہیں جو آج کل رائج نہیں۔ ان خصوصیات کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(الف) 'ن' زائد کا استعمال: کئی الفاظ کے اختتام پر 'ن' کا استعمال کیا گیا ہے۔ پنجابی کے چند الفاظ میں یہ 'ن' زائد اب بھی موجود ہے' لیکن اردو میں یہ 'ن' اب متروک ہے۔ اس مثنوی میں سے مندرجہ ذیل چند الفاظ مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

توں (تو)۔ کوں (کو)۔ کہیں (کہی)۔ بناں (بنا)۔

نہی دور جانے کوں کوئی مکاں
یہاں ہی ضرورت کو چلنا بناں

(ب) ضمہ کی بجائے 'و' اور کسرہ کی بجائے 'ی' کا استعمال: مندرجہ ذیل الفاظ ایسے نظر پڑے ہیں جن میں ضمہ کی بجائے 'و' اور کسرہ کی بجائے 'ی' استعمال کی گئی ہے۔

اون (ان)۔ اوس (اس)۔ اوٹھ (اٹھ)۔ اودھر (ادھر)۔ ایدھر (ادھر)۔ دیکھاوے (دکھائے)۔ کیدھر (کدھر)۔

(ج) 'یہاں' کو کئی مرتبہ 'ایھاں' اور 'ایہاں' نظم کیا گیا ہے۔

(د) 'آئے' اور 'جائے' کو 'آء' اور 'جاء' لکھا گیا ہے۔

(ہ) اضافت کی بجائے 'ی' کا استعمال: مندرجہ ذیل اشعار میں اضافت کی بجائے 'ی' استعمال کی گئی ہے۔ اس دور کے دیگر مخطوطات میں بھی یہ خصوصیت موجود ہے:

ندے گر وہ چاہے محبت سے آب
کہاں ان گلوں پر رہے آب و تاب

مرا باپ تھا تاجرے مالدار
تجارت میں تھا خوب سا کاروبار
یہ مردہ سا تن گر تجے خاک ہو
تو بہتر ہے خس کم جہاں پاک ہو

تڑپتی ہوں پیاسی مرا پہلے کر
دے آب شمشیر سے حلق تر

ہوا جب بستر ناز پے دراز
تو پاؤں پہ رکھ میں جبین نیاز
لگا کہنے اس مایہ ناز سے
بتے شہر آشوب و طناز سے

لسانی خصوصیات:

لسانی خصوصیات میں ان تمام اسالیب بیان' افعال و اسماء وغیرہ کا ذکر کیا جائے گا جو اس دور کی یادگار ہیں جبکہ یہ مثنوی لکھی گئی۔

(الف) پنجابی الفاظ: گو مثنوی لکھنے والا پنجابی ہے اور مثنوی پنجاب میں لکھی گئی ہے' لیکن مثنوی کی زبان پر پنجابی اثر بہت کم نظر آتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں بسر کیا ہے۔ تاہم جو پنجابی افعال و اسماء اور محاورات وغیرہ میری نظر سے گزرے ہیں' وہ یہاں درج کیے جاتے ہیں:

(ورق 41) ہزاراں درودو ہزاراں سلام
(ورق 45) دیاں خلعتیں سب کو ہو مہرباں
(ورق 44) مرخص ہو یا شاہ سے پھر وزیر
(ورق 51) مویا اس پہ ایسا کہ بس مر گیا
(ورق 53) گیا میں بھی رل مل کے ان میں گزر
(ورق 53) رہا اٹھنے اور بیٹھنے کا نہ ست
(ورق 68) امیروں کیاں لڑکیاں صبح و شام
(ورق 69) گئی کل کی گل لونڈیوں کے جو ہاتھ (بمعنی بات)

(ورق69) یہ کل کیا ہے گویا کہ ہے پھنکناں (بمعنی مسخرہ)

(ورق69) کہا میں بولاؤ بولالائیاں

عجب بازیاں کل نے دکھلائیاں

(ورق76) کہیں اس کو پھر ڑکے ڈھونڈوں بھلا (بمعنی چل پھر کے)

(ورق76) مگراٹھ چلوں ساتھ تیرے کہیں (بمعنی اغوا ہو جانا)

(ب) تذکیر و تانیث: مروج اور مستند قاعدے کے برخلاف اس مثنوی میں مندرجہ ذیل الفاظ نظم کیے گئے ہیں:

مذکر: التماس (ورق 43)۔ آواز (ورق 55)۔ تکرار (ورق 61)۔ راہ (ورق 76)۔ پیش۔ (ورق52)

مؤنث: غور (ورق 49)۔ ہوش (ورق 52)۔ فولاد (ورق 54)۔ ہجوم (ورق 58)۔ مزاج (ورق72)۔ کھیل (ورق73)۔ گلاب (ورق66)۔

(ج) متروک اور ہندی کے الفاظ: ہندی کے ایسے الفاظ مصنف نے کثرت سے استعمال کیے ہیں، جو اب اردو میں متروک ہیں۔ کچھ اور ایسے الفاظ بھی نظر آتے ہیں جو اب اردو میں رائج نہیں، لیکن اس وقت مقبول تھے۔ ان الفاظ کی ایک مختصر فہرست درج ہے:

(ورق40) ڈھڈ ہے۔ سرسبز و شاداب

(ورق40) شہور رکھنا۔ جان سے مار ڈالنا

(ورق43) بھیر۔ ہجوم یا لشکر

(ورق46) ووں۔ اس طرح

(ورق48) کنے۔ لیے، واسطے

(ورق49) ہوشگی۔ ہوش

(ورق50) سنکنا۔ کھسکنا

(ورق52) کٹنے۔ کٹنکنے۔ مکاری، چالبازی

(ورق54) چٹکنا۔ طمانچہ

(ورق57) نہوڑی۔ خوشامد

(د) غیر معروف قافیے اور جمع: جو کے ساتھ دو کا قافیہ نظم کیا گیا ہے (ورق 39)۔ حدیث کی جمع حدیثات (ورق45) اور کوس کی جمع کوساں (ورق38) نظم کی گئی ہے۔

(ہ) کے اور نے کا حذف کرنا: کے اور نے کو حذف کرنے کی کثرت سے مثالیں موجود ہیں۔

میں صرف چند مثالیں درج کرتا ہوں:

غرض ایک حجرہ میں اوس سے لیا
دیا اوس کو انعام راضی کیا

تو کھانے لیے میرے غم کھا نہیں
کہ کچھ کھانے پینے کی پروا نہیں

غرض میں قلم دان اوسے لا دیا
دیا رقعہ لکھ اور بتایا پتا

اسے جوہری ساتھ تھی دوستی
کہ تھا وہ پرانا کوئی پوستی

کلام پر رائے

مثنوی کی زبان سلیس اور بامحاورہ ہے۔ مصنف کو اظہار خیال پر مکمل قدرت حاصل ہے' لیکن یہ دعویٰ آسانی سے نہیں کیا جا سکتا کہ مصنف زورِ بیان میں اپنے ہم عصروں یا پیش رووں پر سبقت لے گیا ہے۔ گو ان کے بھائی قلندر شاہ نے مراد شاہ کو بڑے بڑے شاعروں سے بہتر بتایا ہے۔ قلندر شاہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں' جو اس سلسلے میں انہوں نے نظم کیے ہیں:

ہر چند بدہر شاعران اند
شیریں سخن اند و خوش بیان اند
شعرائے زماں غلام اوبند
روشن بجہاں ز نام اوبند
ممتاز بہند گرچہ میر است
بر درگہ او یکی فقیر است
انگشت گرفتہ خود بدنداں
حیرت زدہ ماندہ است و حیراں
شرمندہ چوں گشت میر حیدر

ترساں بدرید جامہ در بر

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

در سینہ قاصر ایں نہ شور است
در سوز و گداز میر سوز است
امروز بہند آں سخنور
با جامی و خسرو است ہمسر

. . . .

. . . .

او تخت نشیں شہر عشق است
یکتائے زماں بدہر عشق است
آں روز مشیت الٰہی
در قسمت او نمود شاہی
مادر و پدر ز احترامش
کردند مراد شاہ نامش 23

حواشی:

1- مفتی غلام سرور: خزینۃ الاصفیاء، صفحہ 747 اور کنہیا لال: تاریخ لاہور، صفحہ 250۔

2- مراد شاہ: مراد العاشقین، ورق 102

3- ایضاً، ورق 101

4- گو مراد شاہ کے بھائی پیر قلندر شاہ نے مراد شاہ کا سن ولادت سنہ 1186 ہجری معین کیا ہے (دیکھو اورینٹل کالج میگزین فروری سنہ 1941، صفحہ 43) لیکن بھائی کی نسبت مراد شاہ کا اپنا بیان زیادہ صحیح اور درست ہے۔

5- فرح بخش پیر: اذکار قلندری (فارسی)، ص 78

6- غلام دستگیر نامی: تاریخ جلیلہ، ص 195

7- مفتی غلام سرور: خزینۃ الاصفیاء، ص 785

8- مراد شاہ: نامہ مراد، ص 14

9- کلیات مراد، ورق 31، 32

10- مراد شاہ: مراد العاشقین، ورق 87 ب

11- کلیات مراد، ورق 166 ب

12- مفتی غلام سرور: خزینۃ الاصفیاء، ص 786

13- غلام دستگیر نامی: تاریخ جلیلہ، ص 200

14- میر امن: باغ و بہار، ص 3، 4

15- عبدالحق: مقدمات عبدالحق، حصہ دوم، ص 117، 118

16- حکیم محمد علی: باغ و بہار، ورق 1

17- ناصر الدین محمد شاہ کا دور حکومت سنہ 1719ء (1131ھ) تا سنہ 1748ء (1161ھ) (دیکھو Muhammadan Dynasties از لین پول، صفحہ 318)

18- حکیم محمد علی: باغ و بہار، ورق 1، 2

19- ملاحظہ ہو گل رعنا، آب حیات اور داستان تاریخ اردو

20- حافظ محمود شیرانی: اورینٹل کالج میگزین، بابت ماہ مئی سنہ 1929ء، صفحہ 37

21- حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو، صفحہ 90

22- مراد شاہ: مراد المحبین، ورق 41 ب

23- کلیات مراد شاہ، ورق 234، حاشیہ

(در: اردوئے قدیم، دکن اور پنجاب میں از ڈاکٹر محمد باقر، لاہور: مجلس ترقی ادب، 1972ء، ص 256-276۔ اس کے بعد مثنوی "مراد المحبین" کا مکمل متن دیا گیا ہے، ص 277 تا 363، جو زیر نظر کتاب میں شامل نہیں کیا گیا۔ یہ مقالہ پہلی بار رسالہ "اردو" (دہلی) بابت اکتوبر 1942ء) میں طبع ہوا تھا...... م۔ا۔ج)

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

پنجاب کا ایک اور ریختہ گو
پیر قلندر شاہؒ

لودھیوں کے دور حکومت میں سہروردی سلسلے کے ایک بزرگ قطب عالم شیخ عبدالجلیلؒ چوہڑ شاہ بندگی ہو گذرے ہیں، جو روحانی پیشوا ہونے کے علاوہ سلطان بہلول لودھی کے داماد بھی تھے۔ آپ کا انتقال 910ھ میں بمقام لاہور ہوا۔ جناب صاحبزادہ غلام دستگیر صاحب نامی نے (جو ان کی اولاد میں سے ہیں) ان کے مفصل حالات اپنی تصنیف ''تاریخ جلیلہ'' میں دیے ہیں۔ اس کتاب میں اس خانوادہ جلیلہ اور سلسلہ عالیہ کے مفصل کوائف از ابتدا تا ایں دم مندرج ہیں، جن کو پڑھ کر یہ ثابت ہوتا ہے کہ صدیوں سے یہ خاندان مرجع خلائق اور اس کے فیض روحانی کا سلسلہ نہایت وسیع چلا آتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاندان نہ صرف روحانی و مذہبی کمالات اور عظمتوں کا مالک تھا بلکہ علم و ادب کی دنیا میں بھی اس کے بیشتر افراد نام آور ہو چکے ہیں۔ مثلاً سلطان حمید الدین حاکم (متوفی 1174ھ/1336ء) کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے 120 کتابیں لکھیں۔ ان میں سے ''پنج گنج'' (صرف عربی) اور ''گلزار نظم'' فارسی بہت مشہور ہیں۔ حضرت شیخ عبدالجلیلؒ کے تذکرہ نگار حضرت شیخ کی علمی و ادبی قابلیت کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ شیخ جمال الدین ابوبکر جو اسی خاندان عالیہ کے چشم و چراغ تھے اور جن کا انتقال شیر شاہ سوری کے عہد میں ہوا، ''تذکرہ قطبیہ'' اور ''شرح وصایائے امام محمدؒ'' وغیرہ کے مصنف تھے۔ غلام رکن الدین مراد شاہ نے بھی بہت سی کتابیں لکھیں۔ مثلاً مریدان، مراد العاشقین، مراد الحسین اور نامہ مراد۔ حضرت قلندر شاہ (1770ء-1832ء) نے بیان عقائد، معراج المقبول اور حلیہ شریف کے نام سے کچھ تصانیف کیں۔ میر فرح بخش جو مراد شاہ اور قلندر شاہ کے چھوٹے بھائی تھے، کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ مثلاً اذکار قلندری، مثنوی عبداللہ ورادھا، سسی پنوں، جنگ سیالکوٹ۔ اسی طرح پیر نبی بخش اور پیروز یر علی حامی بھی صاحب تصنیف تھے اور اب اس خاندان کے لائق فرد صاحبزادہ غلام دستگیر صاحب نامی کے وجود سے یہ سلسلہ بفضلہٖ قائم ہے۔

خاندان جلیلہ کے تصنیفی کارناموں میں یہ بات خاص ذکر کے لائق ہے کہ اس کے لائق احترام افراد نے پنجاب میں اردو کی تحریک کو بڑی تقویت دی۔

ان خدمت گزاران اردو میں ممتاز ترین نام پیر غلام رکن الدین مراد شاہ کا ہے، جن کے متعلق مخدومی پروفیسر حافظ محمود خان صاحب شیرانی نے ''پنجاب میں اردو'' میں مفصل تذکرہ لکھا ہے اور ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے ''رسالہ اردو'' (اکتوبر 1942ء) میں ان کی مثنوی ''مراد الجبین'' کو بعد تصحیح چھاپا ہے۔ ان کا خط ''نامہ مراد'' (مع موشا مہ وگس نامہ) بھی نامی صاحب نے شائع کرا دیا ہے۔

پیر مراد شاہ اپنے والد کے ساتھ 1196ھ میں لاہور سے لکھنؤ گئے تھے اور 1200ھ تک وہاں رہ کر اپنے والد کے ہمراہ لاہور واپس آ رہے تھے کہ شاہجہاں پور کے نزدیک ڈاکوؤں سے مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے میں ان کے والد پیر کرم شاہ جاں بحق ہو گئے اور مراد شاہ کم از کم 1203ھ تک واپس نہ آ سکے۔ تاہم ان کا لاہور میں 1205ھ تک آ جانا ثابت ہے۔ آپ کا انتقال 1215ھ میں ہوا۔

پیر مراد شاہ کا لکھنؤ سے تعلق پنجاب میں اردو کے حق میں بڑا مفید ثابت ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پنجاب میں اگرچہ سکھوں کی حکومت تھی مگر غلبہ اور نفوذ فارسی زبان کو حاصل تھا۔ سکھوں کی سرکاری زبان بھی فارسی ہی تھی۔ چنانچہ تمام اہم امور اسی میں انجام پاتے تھے اور ادبی اور علمی زبان بھی اگر کوئی تھی تو یہی فارسی۔ اس دور میں تصنیف و تالیف کی زبان بیشتر فارسی ہی نظر آتی ہے۔ خود خاندان جلیلہ کے افراد بھی اس زبان میں بیشتر طبع آزمائی فرماتے ہیں۔ حضرت پیر مراد شاہ اور ان کے والد پیر کرم شاہ کا لکھنؤ تشریف لے جانا اردو کے لیے سرچشمہ ترقی ثابت ہوتا ہے۔ لکھنؤ میں رہ کر اردو ادب سے محبت کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ چنانچہ پیر مراد شاہ کی شاعری اس حقیقت کی تصدیق کرتی ہے۔ ان کا ایک ضخیم دیوان (کلیات میں) نامی صاحب کے پاس موجود ہے۔ ان کی مثنوی ''مراد الجبین'' کا تذکرہ ڈاکٹر باقر صاحب کر چکے ہیں۔ ان تصنیفات سے یہ امر بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ غالباً حضرت مراد شاہ ہی پنجاب میں باقاعدہ ریختہ گوئی کے بانی تھے۔

خانوادۂ جلیلہ کے دوسرے افراد بھی اودھ اور لکھنؤ کے بعض بزرگوں سے تعلق کی وجہ سے ریختہ سے بیگانہ نہ ہوں گے مگر یہ شائد حضرت مراد شاہ کا فیض تھا کہ ان کی وجہ سے اردو میں لکھنے کا ذوق اس خاندان کے دوسرے افراد میں بھی پیدا ہوا۔ انہوں نے نامہ نویسی کے لیے بھی اسی زبان کو اختیار کیا۔ ان کے بھائی پیر قلندر شاہ نے اگرچہ بیشتر فارسی میں لکھا، لیکن ان کے فیض قلم سے اردو بھی محروم نہیں رہی (جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا)۔

عام طور پر دور جدید میں انگریزوں کو ہی پنجاب میں نہال اردو کی کاشت کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے، مگر حضرت پیر مراد شاہ اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد نے انگریزوں سے خاصا پہلے اس پودے کی آبیاری کرنے کی کوشش کی۔ پس اس لحاظ سے حضرت مراد شاہ اور حضرت قلندر شاہ کا شمار پنجاب میں اردو کے بانیوں میں کیا جا سکتا ہے۔

پیر مراد شاہ کے متعلق اس سے پہلے اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ اب کسی قدر گنجائش ہونے کے باوجود

بھی ان کو موضوع بحث بنانا بے ضرورت معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا آج میں صرف حضرت پیر قلندر شاہ صاحب کی ایک نظم (یا قطعہ) بعنوان "حلیہ مبارک" جو اردو میں ہے' کو قارئین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

حضرت پیر قلندر شاہ صاحب کے سوانح حیات نامی صاحب نے "تاریخ جلیلہ" میں بہ تفصیل دیئے ہیں۔ میں اسی کا خلاصہ یہاں نقل کرتا ہوں۔

آپ شاہ عالم ثانی کے زمانے میں 1185ھ میں پیدا ہوئے جیسا کہ سطور بالا میں لکھا جا چکا ہے۔ قلندر شاہ صاحب کے والد پیر کرم شاہ 1196ھ میں مع اہل و عیال لاہور سے لکھنؤ تشریف لے گئے تھے۔ 1201ھ میں کرم شاہ صاحب وطن واپس آتے ہوئے قزاقوں کے ہاتھ سے شہید ہو گئے۔ پسماندگان جن میں پیر کرم شاہ صاحب شامل تھے، واپس بانس بریلی چلے گئے۔ جہاں 1790ء تک رہے' جہاں سے قلندر شاہ کچھ عرصے کے بعد ردولی پھر الہ آباد تشریف لے گئے۔ پھر ڈیڑھ سال محمد آباد بنارس اور اس کی نواح کی سیر کرتے ہوئے 1210ھ (1795ء) میں واپس لکھنؤ تشریف لے آئے۔ 1211ھ میں لاہور کی طرف روانہ ہوئے اور 1797ء میں اپنے بھائی پیر مراد شاہ اور اپنی والدہ سے آ ملے۔ یہ دونوں دو سال قبل لاہور آ چکے تھے۔ قلندر شاہ صاحب نے مراد شاہ صاحب کے انتقال کے بیسویں برس (یعنی 1820ء) میں موضع رتہ پیراں میں (جو انہوں نے اپنے بھائی پیر فرح بخش کے ہمراہ خریدا تھا) اقامت اختیار کی۔ آپ کا انتقال 1832ء میں ہوا۔

پیر قلندر شاہ کی تصانیف

کلیات قلندر شاہ کا جو نسخہ اس وقت پیش نظر ہے' اس میں حسب ذیل تصانیف موجود ہیں:

1۔ دیوان قلندر شاہ (فارسی)

2۔ بیان حق (فارسی)

3۔ حلیہ مبارک (فارسی)

4۔ حلیہ مبارک (اردو)

5۔ معراج المقبول (فارسی)

6۔ خطوط قلندر شاہ بنام میاں امام الدین، فقیر عزیز الدین انصاری آزاد (فارسی و اردو)۔

پیر قلندر شاہ کی توجہ فارسی کی طرف زیادہ رہی۔ اس لیے ان کا فارسی کلام بہت پختہ معلوم ہوتا ہے۔ ذیل میں ان کے فارسی دیوان سے ایک غزل لکھی جاتی ہے:

دلم ربودی و جان می دہم بیاد بگیر ۔۔۔ درین معاملہ اے جان جان مکن تقصیر

بیک دو بوسہ بیا تلخ کامیم بردار ۔۔۔ لب تو قند و نبات است یا شکر یا شیر

بران سرم کہ زنم سر بو ادی مجنون | اگر موافق تدبیر من بود تقدیر
کدام سوختہ جان راشنید فرمودی | کہ جاے آب شرر ریزد از دم شمشیر
غریق لجہ اشکم زجوش گریہ چشم | رسید تا بہ سرم دست طفل دامنگیر
بآہ نالہ پروردی کند زاری | بود کہ در دل بیدرد اوکند تاثیر
چنان بہ شوق تو صبر ازدلم قرار ربود | کہ فوج و لشکر سنگاں زخطہ کشمیر

تو نوجوانی و سرتا بپا ہمہ جانی
مرید عشق تو از صدق دل قلندر پیر

باز بے پردہ شد آن یار بہار است بہار | چشم مشتاق وگر بار بہار است بہار
جوش دیوانگی، ما و ہجوم اطفال | برسر کوچہ و بازار، بہاراست بہار
جامہ رنگین کن لاکن عزم تماشاے چمن | روز نوروز بگلزار بہار است بہار

کلیات قلندر شاہ کے ورق 26 الف ب، 37 الف ب، ق 188 اور ق 247 پر پیر قلندر شاہ کی غزلیات اردو اور صفحہ 187 پر ایک رباعی اردو ہے۔ ان میں سے ایک غزل اردو بطور نمونہ درج ذیل ہے:

دل نکل پہلو سے شب کو زلف میں جاتا رہا
بارہا ہر روز ہر چند اس کو سمجھاتا رہا
ہو بہار وصل یہ برسات اس دلبر کی ہو
دیدہ اشک آرزو چوں ابر برساتا رہا
ہم نے پایا اس کو اپنے دل میں یارو جس کو ہاں
شیخ کعبے میں برہمن بت میں بتلاتا رہا
چھو گیا تک ہاتھ میرا شب کو بارے زلف سے
اف رے ظالم صبح تک کیا بل پہ بل کھاتا رہا
فارسی کو چھوڑ کر ہندی میں کچھ کچھ گاہ گاہ
اے قلندرؔ شوق اظہر مجھ سے کہلاتا رہا

غزل (ریختہ)

اگر گلشن میں جاوہ غیرت گلزار بیٹھے گا | تو ہر گل چشم میں بلبل کے مثل خار بیٹھے گا
خضر بھی آرزو رکھے گا اس جا آشہادت کی | کہ جس جا میرا قاتل پکڑ کر تلوار بیٹھے گا

کرے گا نالہ و فریاد یا آنسو بہاوے گا
نہیں ممکن اگر تجھ سے ذرا بیکار بیٹھے گا
اگر یہ اشک دریا خیز سو طوفان لاوے گا
یہ تیرے عشق کا شعلہ نہیں زنہار بیٹھے گا
اگر یہ ہی تغافل ہے تو کوئی دن میں رو رو کے
تری دوری میں ظالم دیدہ خونبار بیٹھے گا
قلندر حضرت پنجاب. . . . . . .
دلوں پر جا کے خوبی سے مرا دلدار بیٹھے گا

مجھے تسلیم کرنا چاہئے کہ پیر قلندر شاہ کا کلام اردو میں کچھ زیادہ نہیں اور حضرت پیر مراد شاہ کے مقابلے میں تو یقیناً کم ہے، تاہم جو کچھ ہے غنیمت ہے۔ آج جبکہ اردو کے قدیم سے قدیم نمونوں کا سراغ لگایا جارہا ہے اوران کی بناپر زبان اردو کے متعلق نظریے قائم کیے جارہے ہیں۔ میرے خیال میں پنجاب کے ریختہ گوئے قدیم پیر قلندر شاہ صاحب کی اردو نظموں کا شائع کرنا بے محل نہ سمجھا جائے گا۔ حلیہ مبارک (جس کے متن کواشاعت دی جارہی ہے) کی زبان صاف اور رواں ہے اور گو کہ اس میں نظم کے بعض عیوب ذوق سلیم پر گراں گذرتے ہیں اور بعض الفاظ کی ''پنجابیت'' (جو ممکن ہے بعض صورتوں میں، حضرت کاتب کی تحریف یا ''اصلاح'' ہو) کھٹکتی ہے۔ پھر بھی قلندر شاہ صاحب کے اشعار میں پختگی اور متانت موجود ہے۔ اس معذرت کے ساتھ میں پیر قلندر شاہ کا منظوم حلیہ مبارک درج ذیل کرتا ہوں۔

رسالہ حلیہ مبارک ہندی

از

(پیر قلندر شاہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

احمدؐ مختار ہو مجبور اے پروردگار
حمد میں تیری کرے جب عجز کوئی [1] اختیار
پھر کسے مقدور ہے جو آ کے دم مارے یہاں (ق)
عاجزی سے سکو ہے [2] ناچار اس جا کاروبار
عجز میرا کر قبول اور مجھ کو یہ توفیق دے
دمبدم کرتا رہوں نعت رسولؐ نامدار
ہوں صفات اس کی ہمیشہ ورد میرا صبح و شام
وصف میں اس رو و مو کے صرف ہو لیل و نہار
اس سراپا رشک مہ کے شوق میں یارب رہے
دل مرے پہلو میں چون خورشید ہر دم بیقرار
ہوں گل روئے محمدؐ زیب بخش باغ دل
بلبل جان نغمہ سنج ہواپہ مانند ہزار
فارسی حلیہ مبارک کی طوالت کے عوض
یارب اب ہندی میں مجھ سے ہو بہت ہی اختصار
گندمین تھا رنگ اس کا اور ملاحت سے بھرا [3]
تھی صباحت [4] اس پہ کرتی جان کو ہر دم نثار

تھی کشادہ اوسکی پیشانی بہت اور گردسر | تھا بزرگی سے بھرا[5] وہ سر بسر اے ہوشیار
گرد تھا چہرہ مبارک اوس کا اور وہ ریش گرد | خوش نما قبضے برابر اور عجب انبوہ دار
عرض اور طول اس کے لیتا تھا مقرر گاہ گاہ | تانہ بڑھ[6] جائے زیادہ مشت سے بے اختیار
پست رکھتا تھا بروت اپنی کو وہ عالی نژاد | سرفراز دو جہاں ہیں جس کے در کے خاکسار
تھی عجب باریک بینی اوس کی پرنور و بلند | ابروئے خمدار تھے محراب بیت کردگار
ابرووں میں اوسکے تھا اک فرق تھوڑا[7] سا جسے | آہ[8] ندرت سے کہیں معدوم ہی اہل شمار
تھی عجب اوسکی فراخی اور عجب پیوستگی | اور عجب باریک تھی اک رگ[9] انہوں میں جیسے تار
جب غضب کرتا وہ شاہ دین خدا کے واسطے | تب وہ پر ہوتے نظر آتی سبھوں کو آشکار
تھی سیہ وہ چشم اوس کی اور فراخی سے بھری[10] | تھا نہ کچھ مدنظر اوس کا بجز پروردگار
سرخ سرخ آنکھوں میں اوسکے تھے وہ ڈورے[11] خوشنما | تھا خمار ان میں شراب برحق کا آشکار
تھے دراز اوسکے وہ مژگان اور انمیں سرمہ آپ | ڈال چھوڑا تھا قضا کے ہاتھ نے مشاطہ وار
گوشہ چشم سیہ سے دیکھنا معمول تھا | راست وچپ اکثر طرف اوسکے جو رکھتے انتظار
آسماں سے لے کے اکثر تھی نظر سمت زمین | ہاں حیا اور شرم سے یا خاک سے تھا اوسکو پیار
ہے یہ ایک اعجاز اوسکے معجزات چشم سے | پیش و پس کرتی تھی اوسکی دید یکساں کاروبار
اولین اور آخرین اوس کی نگاہ سے پرورش | اب یہاں ثابت ہے بے شک کیا نہاں کیا آشکار
نور افشاں تھا مثال بدر مونہہ اس ماہ کا | تھے وہ[12] برابر صاف صاف آئینہ دار
جلوہ گر ہوتا بخوبی عکس ہر دیوار و در | صاف چون آئینہ اوس رخسار میں بے اختیار
ہر در و دیوار کو دیتا عجب ایک روشنی | کوچہ و بازار میں جس وقت وہ کرتا گزار
وہ نظر بوجہل کی اور دید وہ صدیق کی | فی الحقیقت تھی وہاں صورت یہ اپنی اے نگار
اوس عرق آلود مونہہ پر ماہ کا بہر بہر طبق | گوہر انجم سے ہر دم آسمان کرتا نثار
نکہت عظمت سے تھا پر غنچہ سان اوس کا دہن | گل صفت کھلتا اگر باتوں میں دیکھلاتا بہار
تھا گل معنی کے اندر اور ہی ایک گل میں گل | نغمہ سنج ہر ایک گل پر بلبلیں چہچیں ہزار
ختم اور آغاز تھا باتوں کا اس کا نام حق | گفتگو پر تھی خوشی اکثر اوس کو اختیار
دوش تک آ پہنچتے وہ مو[13] سر شانے کے وقت | اور بنا گوش اوسکی تک رہتے جو رہتے برقرار
روز شانہ ریش میں اور سر میں کرتا بعد روز | تھا عمل اس شاہ دین کا شک نہ لائیو زینہار
بے تکلف جب وہ مو ہوتے پریشاں اوسپہ تب | خاطر مجموع کرتے جان و دل اپنا نثار
گوندنے کے حال میں اور وقت میں دینے کے بل | سرور دیں کے مقرر تھے وہ گیسو چار چار

مفرق سر میں تھے شاہ دین کے کچھ موئے سفید — اور تھے کچھ ریش میں دو تین جا اے کا مگار
راویوں کے اختلافوں سے یہ آخر ہے صحیح — بست تک اونمیں نہیں تھا دخل تعداد و شمار
وہ جو حمرت اوس بیاض مو میں کرتے ہیں بیان — لال ہوتی ہے زباں اپنی یہاں بے اختیار
شاید اوس رنگ حنا کا ہو اثر جو واسطے — درد سر کے رفع کے، سر کو لگاتا تھا نگار

درد سر پیچھے[14] نزول وحی کے کہتے جو ہیں — ہے اگر ہو گا شراب سر حق کا وہ خمار
گردن اوس کی وصف کرنے سے ہے مستغنی بہت — نازکی اور رفعت اوسنے کی غزالوں سے شکار
فاصلہ اچھا بجلا کا ہندووں[15] میں اوسکے تھا — اور تھی مہر نبوت شانیوں[16] میں آشکار
گرد اوسکے دانہ دانہ خوشنما اور شکل میں — خوردو[17] مشت گردسی تھی مایل طرف یسار
تھے پری سے پر وہ بازو دسترس ہاتھوں کی تھی — رانوں تک جس گھڑی ہوتا کھڑا وہ شہریار
تھی فراخی سے پیہری[18] اوس کی ہتھیلی ہاتھ کی — تھا ہمیشہ بخششوں سے اوس کا رہتا کاروبار
اونگلیوں کی نازکی کا اور درازی کا بیان — کیا کروں انگشت حیرت ہے، وہن میں میرے یار
وہ کف دست اوسکی تھی نازک بہت اور نرم نرم — رشک سے اوسکے ہوا جاتا ہے ریشم تار تار
ناخن اس کے تھے ہلال عید سے بھی خوشنما — جان بدر ہوتی ہے اونکو دیکھ کر ریش و فگار
کیا غلط میں نے کہا اوسکے تو اک ناخن سے ہے — معجز[19] شق القمر سارے جہاں میں آشکار
صدر اس صدر الصدور انبیاء کا تھا فراخ — پر شکن تھا وہ شکم اور صاف تھا آئینہ دار
اوس کمر کی نازکی کا ہے بیان ہونا محال — خاموشی ہر ایک نین[20] کی ہے یہاں پر اختیار
ساق سیمین اوس کی دقت سے بھری ہے سربسر — پاؤں تھے ہموار ہاں اور وہ کف پا اے نگار
پچھوڑ میں سے اونچے اونچے رہتے جب وہ شاہ دین — بخشتا رفتار سے روئے زمیں کو افتخار
پاشنہ باریک تھا اور وہ کف پا جیسے تھی — ہاتھ کے اوسکے ہتھیلی خوشنما اور لحم دار
تھا سدا پانو پہرا[21] رہتا پسینا سیت کا — ہے شرف اوس کا زیادہ آب حیوان سے ہزار
جس جگہ اوسکا پسینا آ کے ہوتا بو فروش — مشک اور کافور کا اوس جا نہ رہتا اقتدار
بند بند اوس کے قوی تھے اور تھا پُر وہ بدن — ہے خوش اندامی کو اوس کی بندگی سے افتخار
جو مناسب جا و اعضا میں تناسب وہ وہاں — حسن خوبی نے کیا ہے اوپہ[22] ختم کار
تھا غبار مو سے اوسکا صاف وہ اندام پاک — ہاں مگر دو تین جا تھے بال و ہکلا[23] تے بہار
کا ہندیوں[24] پہ بال اور اس ساعد سیمین پہ تھے — ساق پا پر اور اُس سینے پر اے دانائے کار
تھا خط باریک اوس سینہ سے لے کر تا بناف — موبمو تھا اوس سے سر حق تعالیٰ آشکار

آہ موزونی قیامت اوس قدوقامت کی تھی
ہے بلند و پست کہنا اس کا مجھ کو ننگ و عار

اوس مبارک قد کی موزونی بیاں میں کیا کروں
سر سے لے کر تا قدم تھا عدل اوس میں آشکار

تھا میانہ قد اوسکا لیک اوس کے روبرو
ہر بلند آتا نظر میں پست اے عالی تبار

قوت رفتار اوس کی کیا کروں اس جا بیان
ضعف سے تقریر کو آتا ہے غش ہر دم ہزار

سایہ اوس کا سرفراز دہر تھا اس واسطے
بر سر عرش معلی اس نے جا پکڑا قرار

کیا مجال اوس کے لباس و جسم پر بیٹھے مگس
تھا مگس ران اوس کا دست قدرت پروردگار

تھا توجہ تام اوس کا جس طرف کرتا کبھی
کچھ تو ہوں میں بھی یہاں اب اس گھڑی امیدوار

یا رسولؐ اللہ میرے احوال پر ٹک[25] اک نظر
دو جہاں کے کام میرے ایک پل میں دے سوار[26]

یہ جو کچھ مجکوں مرض ہے اسکا دارو کر شتاب
میں ترا بیمار ہوں اور توں طبیب اے شہریار

شربت دیدار ہو تیرا تو کافی ہے مجھے
شافی مطلق کی میں سوگند کھاتا ہوں ہزار

صد ہزاراں ہو درود اب احمد مختارؐ پر
اور اوس کی آل پر ہو اور جو ہیں اوسکے یار

انقباض دو جہاں کا ہے[27] قلندر ہم بساط
دیکھ[28] ان بیتوں میں کر کے اسم باسط کا شمار

تمام شد بعون اللہ تعالیٰ وتوفیقہ رسالہ حلیہ مبارک بزبان ہندی در بیان تعریف حسن وجمال باکمال آنحضرت خجستہ خصال اعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من تصنیف شیخ المشائخ شاہ صاحب قلندر شاہ جیوؒ 4 ماہ ذی القعدہ تحریر یافت۔ 1258ھ

حواشی:

☆ کلیات مراد شاہ و قلندر شاہ، ورق 208 تا 211

1- اصل میں: بجز کوئی۔
2- اصل: کوئی۔
3- پنجابی تلفظ، بھرا کا۔
4- اصل: صاحب۔
5- بھرا۔
6- اصل: نہو۔
7- تھوڑا۔
8- اصل: نذرت۔
9- اصل: اونہو نہیں۔
10- بھری۔
11- اصل۔ دوری
12- رخسارے چاہیے
13- موئے سر۔
14- اصل: پچھے
15- کاندھوں۔
16- شانوں۔
17- صاف نہیں ہوا۔
18- بھری۔

19- اصل: ہجرے۔
20- تے۔
21- ہجر۔
22- اصل: اوستے۔
23- کرزا: دکھلاتے۔
24- کاٹھوں۔
25- اصل: تک۔
26- سنوار۔
27- اصل: اے
28- باسط کے اعداد 72 ہیں۔ چنانچہ اس آخری شعر کو چھوڑ کر اشعار کی تعداد 72 ہے۔

(در: اورینٹل کالج میگزین اگست 1944ء ص 19-29)

ڈاکٹر عبدالغنی

مقدمہ انتخاب شاہ مراد[1]

شاہ مرادؒ ایک صوفی منش شاعر ہو گذرے ہیں، جو سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے اور 1702ء میں رہگرائے عالم بقا ہوئے۔ آپ کا مدفن تکیہ شاہ مراد (نزد چکوال) ضلع جہلم میں ہے۔ قرب وجوار کے لوگ ان کے بے حد معتقد ہیں اور انہیں مستجاب الدعوات سمجھ کر آج بھی ان کے مزار پر حاضر ہوا کرتے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر 1707ء میں فوت ہوئے۔ ظاہر ہے شاہ مراد ان کے معاصر ہیں۔ شاہ مراد نے فارسی، اردو اور پنجابی زبان میں شعر وسخن کے ذریعے محبت اور شیفتگی کا پیغام اپنے ہم عصر لوگوں تک پہنچایا۔ یہ ان کے مختصر سوانح حیات ہیں، لیکن اگر انہیں مناسب ثقافتی اور تاریخی پس منظر میں جگہ دی جائے تو بعض تعجب خیز اور بصیرت افروز حقائق وکوائف نگاہوں کے سامنے آتے ہیں۔

یہ امر کہ شاہ مراد ایک قادری بزرگ تھے، اس دور کی ایک منفرد مثال کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان ایام میں اس برصغیر میں سلسلہ قادریہ کو غلبہ حاصل تھا اور اس کے طول وعرض میں یہ سلسلہ ایک پُر جوش تحریک کی صورت میں مصروف عمل تھا۔ لاریب شاہ کلیم اللہؒ جہان آبادی (1650 تا 1729 عیسوی) جو شہرہ آفاق تاج محل کے نامور معمار کے پوتے تھے اور جنہوں نے اپنا مکتب شاہ جہان آباد دہلی میں لال قلعہ کے قریب قائم کیا تھا، سلسلہ چشتیہ کی حیات ثانیہ کی نوید بن کر ظاہر ہوئے تھے اور انہی کی تعلیمات باطنی کی بدولت بعد میں ضلع جہلم کے قصبہ جلالپور شریف میں ایک بلند پایہ چشتی بزرگ سید غلام حیدر علی شاہ قدس سرہ العزیز (1838 تا 1908 عیسوی) اپنے فیوض باطنی پھیلاتے رہے، لیکن شاہ مرادؒ کے زمانے میں اس علاقے میں سلسلہ چشتیہ کے اثرات دکھائی نہیں دیتے۔ برصغیر کے اس گوشے میں سہروردی اور نقشبندی سلسلے بھی رسائی حاصل نہیں کر سکے تھے۔ اول الذکر ایک تو ملتان اور بہاولپور کی طرف معروف تھا اور دوسرے مشرق میں بنگال کی طرف، جبکہ ثانی الذکر اگرچہ حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ (1564 تا 1624 عیسوی) کی پُر جوش مساعی تبلیغ کے باعث امتیازی حیثیت حاصل کر چکا تھا، مگر اس نے اپنے اصلاحی کارناموں کا مرکز زیادہ تر مغل دربار[2] کو بنایا ہوا تھا، جہاں شہنشاہ اکبر کے خلاف اسلامی اثرات کے استیصال کے بعد اسلامی تعلیمات کو پوری طرح فروغ دینے کی ضرورت تھی۔ علاقہ دھنی ضلع جہلم اور قرب وجوار کے

علاقوں میں روحانی سلاسل کا یہ خلا جوش انگیز سلسلہ قادریہ نے پورا کیا تھا، جسے پنجاب اور کشمیر میں حضرت میاں میر لاہوریؒ (وفات 1636 عیسوی) اور ان کے خلیفہ مجاز ملا شاہ قادری (وفات 1661ء) کی بدولت نئی توانائی حاصل ہوئی تھی۔ شاہ جہاں اور شاہزادہ داراشکوہ ان کے مرید تھے اور حضرت میاں میرؒ کا مقبرہ اورنگ زیب عالمگیر نے تعمیر کرایا تھا۔ اس عہد کے فارسی زبان کے مشہور شاعر میرزا عبدالقادر بیدل (1646-1720 عیسوی) بھی قادری تھے۔ ان کا مولد وخشا بہار ہے۔ ان کے والد اور اساتذہ معنوی جو اس صوبے میں رہتے تھے، سب کے سب قادری المشرب تھے۔ ضلع جھنگ کے عظیم صوفی حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ (1629-1691 عیسوی) بھی جو مراد کے معاصر بزرگ تھے، قادری سلسلے کے چشم و چراغ ہیں۔ شاہ مراد کے معاصر بزرگ تھے، قادری سلسلے کے چشم و چراغ ہیں۔ شاہ مراد کے پیر طریقت حضرت شیخ محمد ہیں، جو ان کے وطن خان پور (نزد چکوال) سے تقریباً چالیس میل مشرق میں بشندور کے مقام پر رہتے تھے جہاں ان کے قادری بزرگوں کی مشہور خانقاہ تھی۔ یہ مقام جہلم سے بھی کوئی چالیس میل شمال کو واقع ہے۔ ان تمام حقائق سے صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ برصغیر کی باقی اطراف کی طرح جہلم سے لے کر جھنگ تک کا علاقہ اپنے تمام مضافات کے ساتھ قادری سلسلے کے روحانی فیوض سے سیراب ہو رہا تھا اور یہاں ایک ایسا معاشرہ رونما ہو چکا تھا جس کا اعتقاد اس سلسلہ عالیہ کے بانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ العزیز (1078 تا 1166 عیسوی) کی تعلیمات پر سخت محکم تھا۔ پس جہاں تک روحانی خانوادوں کا تعلق ہے، اس علاقے کی ثقافت کی تشکیل میں اول اول سلسلہ قادریہ نے حصہ لیا۔ معاشرے کا یہ رجحان انیسویں صدی عیسوی کے ربع اول تک کارفرما دکھائی دیتا ہے کیونکہ ان ایام میں یہاں کوہستان نمک کی ایک خوش منظر مغربی پہاڑی پر سکیسر کی چوٹی کے عین نیچے ایک رواں دواں چشمہ شیریں کے سامنے، ضلع سرگودھا کے ایک قہستانی گاؤں میں، جو آج کل انب شریف کہلاتا ہے اور ہندوؤں کے زمانے میں اموک نگر تھا، سلطان العارفین میاں عبدالرحیم قادری گذرے ہیں، جن کا سال وفات 1826 عیسوی ہے۔ اب یہ حقیقت بالکل الم نشرح ہو چکی ہے کہ عہد شاہ مراد کو سلسلہ قادریہ کے ساتھ ایک خاص مناسبت تھی اور شہنشاہ، شہزادے، شعرا، علماء اور تقریباً سب کے سب عوام اس سلسلے کے والہ و شیدا تھے اور اپنی خصوصی فکر انگیزی اور جذبات پروری کے ساتھ اس کی روحانی تعلیمات تمام کے قلوب اور اذہان کو بڑی شدت سے متاثر کر رہی تھیں۔

محی الدین ابن العربیؒ (1165 تا 1240 عیسوی) جنھوں نے درس محبت دیا اور واردات توحیدی کے ذریعے عینیت کا نظریہ پھیلایا، قادری سلسلے کے روحانی پیشواؤں میں امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ لہٰذا اجتہادی افکار رکھنے والے یہ صوفی بزرگ خاص طور پر سلسلہ قادریہ کے متوسلین کے لیے ایک روح افروز قندیل بن گئے اسی لیے اس سلسلے کے بعد کے صوفی جب کبھی محبت اور وصال الٰہی کا ذکر کرتے ہیں ان کی زبان پر بے اختیار ابن العربیؒ کے الفاظ رواں ہو جاتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ذات الٰہی کے ساتھ یہ اتحاد ان معانی

میں نہیں جو ویدانت کے نظریہ وحدت الوجود میں بالکل خشک، فلسفیانہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ تو محض ایک تجربہ روحانی ہوتا ہے اور جونہی تجربہ ختم ہوتا ہے یہ پل بھر کی عینیت بھی کافور ہو جاتی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اس تجربے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بھی نہ تو صوفی ''ہو'' بنتا ہے اور نہ ہی ''ہو'' صوفی۔ نہ کسی کمتر درجے میں اور نہ ہی کلی کمیت اور کیفیت کے ساتھ۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی طرح ابن العربیؒ بھی شاعر تھے اور انہوں نے بڑی سرور انگیز لے میں ترانہ محبت گایا۔ بنابریں قادری صوفیائے کرام اگر خود سخن گو نہیں ہوتے تھے تو کم از کم شعر و سخن سے ضرور دلی لگاؤ رکھتے تھے اور محبت و شعر ہی سے ان کا خمیر اٹھتا تھا۔ چنانچہ حضرت سلطان باہوؒ کے دل میں اتر جانے والے اشعار محبت آج تک اس علاقے میں بڑے والہانہ انداز کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں جس کا اب ہم تذکرہ کر رہے ہیں۔ قصور کے سید بلھے شاہؒ (1680 - 1757 عیسوی) بھی، جو حضرت سلطان باہوؒ اور شاہ مرادؒ کے معاصر خورد تھے، قادری سلسلے کے بزرگ تھے، اور ہم تمام جانتے ہیں کہ ان کے نغمات کس قدر پُرسوز، پُرتاثیر اور سحر آفریں ہیں اس لیے اگر شاہ مرادؒ بھی زبان شعر سے اثر آفریں لے میں محبوب ازل کا ذکر کرتے ہیں تو یہ قادری بزرگوں کی روایات کے عین مطابق ہے۔

یہ بات کہ شاہ مرادؒ عہد عالمگیری کے ایک بزرگ تھے اور ایک ایسے گاؤں میں رہتے تھے جو مغل دارالسلطنت سے بہت دور واقع تھا، اس امر کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے کہ ان کا شعر و شاعری سے تعلق مادی ترغیبات سے بے نیاز تھا۔ زمانہ شعراء کو درباری سرپرستی کے مواقع بہم نہیں پہنچاتا تھا۔ شاہ مرادؒ کا ایک گاؤں میں اوقات عزیز بسر کرنا ایک ایسے پھول کی یاد تازہ کرتا ہے جو یکہ و تنہا صحرا میں کھلتا ہے اور اپنی خوشبو باد صحرا کی نذر کر کے مرجھا جاتا ہے۔ وہ شعر گوئی کے لیے فطرتاً مجبور تھے۔ ایک صوفی کی حیثیت سے جو جذبات ان کے سینے میں پرورش پا رہے تھے، شعر گوئی ان کے اظہار کا قدرتی ذریعہ تھا۔ وہ اسلام کے خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے تھے، جو اپنی اخلاقی جرأت کی وجہ سے مشہور ہیں۔ اسلام نے بغداد اور بخارا کی راہ اس برصغیر تک جو سفر طے کیا تھا اس نے اسے تومند فکر اور روحانی جوش عطا کیا تھا۔ شاہ مرادؒ کے ایام میں فکر و فن اور حسن کردار کے ان سرچشموں کی روایات اسلامیان ہند نے ابھی سینے سے لگا رکھی تھیں، اس لیے شاہ مرادؒ کو دل و دماغ کی وہ برتر صفات ورثے میں ملیں جو ان کے آبا و اجداد اپنے ساتھ مدینہ منورہ سے خان پور واقع ضلع جہلم تک پہنچتے پہنچتے عہد بعہد بحفاظت اپنے پہلو میں قائم رکھ کر لائے تھے۔ ایک فطری لگن کے طور پر ان تمام اقدار کا ذکر شاہ مرادؒ کبھی فارسی اشعار میں کرتے ہیں اور کبھی اردو اور پنجابی اشعار میں۔ فارسی تو ان کی مادری زبان بن چکی تھی اور عین ممکن ہے عربی ان کے گھر میں نہ بولی جاتی ہو، لیکن اسے وہ بآسانی مسجدوں اور مکتبوں سے پڑھ سکتے تھے۔ اردو، شرفائے پنجاب سے میل جول کے دوران سیکھ لی ہو گی جہاں یہ نئی زبان فارسی اور عربی کے پنجابی پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے از خود پیدا ہو چکی تھی اور جہاں تک پنجابی کا تعلق ہے یہ ان کی دوسری مادری زبان تھی، کیونکہ جس ماحول میں انہوں نے اپنا عہد طفلی گذارا، وہاں فارسی اور پنجابی

دونوں زبانیں بیک وقت استعمال ہوتی تھیں۔ اول الذکر عہد عالمگیری کے تعلیم یافتہ طبقے کی زبان تھی اور ثانی الذکر عوام کی۔

ابھی ابھی یہ کہا گیا ہے کہ اردو زبان پنجاب میں فارسی اور عربی کے پنجابی پر اثرات کے باعث وجود میں آئی، شاہ مرادؒ کے اردو اشعار کے مطالعے سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اردو زبان کا مولد لاریب پنجاب ہے اور اس کے یہاں ظہور میں برصغیر کے جنوبی یا شرقی علاقوں کے اثرات کا عمل دخل نہیں۔ اپنی موجودہ صورت میں اردو زبان وہی ہے، جس کا سلسلہ تو ارث ولی دکنی (وفات 1742ء) تک پہنچتا ہے۔ ولی کے ہاں عاشق ہمیشہ مرد ہوتا ہے اور معشوق عورت، مثلاً وہ کہتے ہیں:

سودائے زلف خوباں رکھتا ہوں دل میں دائم
زنجیر عاشقی کا دیوانہ ہو رہا ہوں
کیا میں عرض اس خورشیدرو سوں
تو شاہ حسن، میں تیرا گدا ہوں

لیکن پنجابی زبان میں یہ صورت حالات نہیں۔ اس زبان میں ہندی[3] کی طرح معشوق مرد ہوتا ہے اور عاشق عورت۔ مثال کے طور پر پنجابی کے ان اشعار کو دیکھئے:

رانجھا جوگی میں جوگیانی
اس دی خاطر بھرساں پانی
سیاں دیکھ دوائی آکھن کول نہ کائی بہندی
لکھ بدیاں تے سو سو طعنے کن کن سرتے سہندی

اب پنجابی زبان کی یہ روایات شاہ مراد کے اردو اشعار میں بھی موجود ہیں:

دن رات پیا بن سوتی ہوں، دو نین انجو بھر روتی ہوں
مکھ لال شراب سے دھوتی ہوں، نت رونا مجھ دستور ہویا
تیرے درس کی مدماتی ہوں، تیرے کاج سونت براتی ہوں
تیرے گن کی مالا گاتی ہوں، رگ تاراں تن طنبور ہویا

ان اشعار میں پنجابی کے الفاظ سے مزید ثبوت بہم پہنچتا ہے اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو تحریک پنجاب میں اردو کی پیدائش کا موجب بنی اس تحریک سے بنیادی طور پر مختلف تھی جس نے دکن میں اردو کو جنم دیا۔

اب شاہ مرادؒ 1702ء میں فوت ہوئے ہیں اور ولی دکنی 1742ء میں اس لیے زمانی لحاظ سے بھی شاہ مرادؒ کو ولی دکنی پر اولیت حاصل ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو زبان کے مولد کے لحاظ سے

پنجاب کو دکن پر تقدم ہے۔ چند صدیاں پیچھے جائیں تو پتا چلتا ہے کہ حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ بھی اردو میں اشعار کہہ گئے ہیں۔ آپ کا ایک شعر ہے:

وقت سحر وقت مناجات ہے
خیز دراں وقت کہ برکات ہے

حضرت شیخ کا سال وصال 1265ء ہے، اس لیے بالکل اظہر من الشمس ہے کہ جب ولی دکنی نے منجھی ہوئی اردو زبان کا ورثہ بعد میں آنے والے لوگوں کے سپرد کیا تو اس سے کم از کم پورے 477 سال پہلے پنجاب میں اردو زبان مستعمل ہونا شروع ہو گئی تھی۔ کوئی پانچ صد سال تک پنجاب میں اسے اہل علم کا لگاتار استعمال میں لانا اردو زبان کو اس قابل بنا گیا کہ شاہ مرادؒ کے زمانے میں یہ زیادہ منجھی ہوئی اور زیادہ رواں بن چکی تھی۔ اس نقطہ نگاہ سے شاہ مرادؒ اور ولی دکنی کے منقولہ بالا اشعار کا تقابلی مطالعہ کر لیا جائے۔ جیسا کہ پیشتر ازیں کہا جا چکا ہے، شاہ مرادؒ نے پنجابی کے زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں، لیکن اس کے باوجود زبان کی مٹھاس میں فرق نہیں آیا۔ شاہ مرادؒ کے اشعار میں جذبات کا بھی وفور ہے، جبکہ ولی دکنی کے اشعار زیادہ میکانکی نوعیت کے ہیں کیونکہ اکثر و بیشتر وہ فارسی محاوروں کا اردو میں ہو بہو ترجمہ کر دیتے ہیں۔ البتہ دونوں میں ایک مماثلت ضرور موجود ہے۔ دونوں اردو کو ریختہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ شاہ مرادؒ کا مقطع ہے:

یہ شعر عجب استاد سوں ہے
یہ دلبر حسن آباد سوں ہے
یہ ریختہ شاہ مراد سوں ہے
مقبول ہویا منظور ہویا

اب ولی دکنی کا شعر ہے:

یو ریختہ ولی کا جا کر اسے سنایو
رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کی مانند

یہاں یہ امر ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں اردو زبان برصغیر کے طول و عرض میں ریختہ کے نام سے موسوم تھی۔ اس سے یہ بات نگاہوں کے سامنے آتی ہے کہ جو زبان برصغیر کے مختلف حصوں میں مختلف عوامل کی وجہ سے آزادانہ پنپتی رہی تھی، ان ایام میں کل ہند حیثیت اختیار کر چکی تھی اور برصغیر کی مشترکہ زبان میں تبدیل ہو رہی تھی۔

یہ حقیقت کہ سرزمین پنجاب اردو کا مولد ہے، کسی کے لیے استعجاب کا موجب نہیں ہونی چاہیے۔ قدیم ہندو پانچ دریاؤں کی اس سرزمین کو غیر مہذب [illegible] تصور کرتے تھے، لیکن 712ء سے لے کر، جب دنیا کے خورد سال ترین جرنیل محمد بن [illegible] لیے سندھ کا علاقہ ملتان تک فتح کیا،

1186ء تک، جب محمد بن سام نے لاہور کو فتح کر کے آخری غزنوی حکمران خسرو ملک کو گرفتار کرلیا، یہ سرزمین سندھ کے ملحقہ علاقے کے ساتھ اسلام کے تہذیب آفریں اثرات سے لگاتار مستفیض ہوتی رہی۔ قطب الدین ایبک نے دہلی پر 1193ء میں قبضہ کیا اور پھر کاروان اسلام اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ اس دارالسلطنت اور مشرقی علاقوں کی طرف جادہ پیما ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قافلہ اسلام کوئی پانچ صد سال تک سندھ اور پنجاب میں پڑاؤ ڈالے رہا اور اس طویل عرصے میں اسلام نے اپنے ثقافتی اثرات سے یہاں کے ذرے ذرے کو سیراب کر ڈالا۔ اس بات کو ضرور مدنظر رکھا جائے کہ ان ایام میں اسلام ایک تحریک کی حیثیت سے جوش وخروش سے معمور تھا اور اس کے سامنے بڑی سے بڑی طاقت کے پاؤں جم نہیں سکتے تھے، ایک سیل بے پناہ تھا جو ہر شے کو زیروزبر کرتے ہوئے آگے سے آگے بڑھتا چلا جاتا تھا۔ اولیائے کرام، مذہبی رہنما، اہل علم اور اعلیٰ درجے کے ادیب اور شعرا یہاں وارد ہوئے اور مستقل طور پر رہائش پذیر ہو گئے۔ شہر، قصبے اور تعلیمی مراکز پیدا ہوئے اور اس طرح یہاں کی زندگی کا سارا تانا بانا یکسر مبدل ہو گیا۔ اب سندھ اور پنجاب غیر مہذب اور پسماندہ علاقے شمار نہیں ہوتے تھے بلکہ یہاں کے دیہات بھی تہذیبی مشاغل سے گونجنے لگے تھے اور تاریخ شاہد ہے کہ وہ وقت بھی آیا جب سندھ اور پنجاب نے اسلامی ہند کو اعلیٰ درجے کے علماء اور اساتذہ مہیا کیے۔ میرا اشارہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور علامہ شیخ سعد اللہ چنیوٹی ایسے فضلاء کی طرف ہے۔

لیکن یہاں ہمارے سامنے دراصل صرف زبان اردو کی ولادت ہے۔ سندھ میں عربی زبان عرب علماء اور عرب آبادکاروں کے ذریعے پہنچی تھی، اسی لیے سندھ میں عربی زبان کا خاصہ ذخیرہ الفاظ موجود ہے۔ فارسی زبان کا عمل دخل اس وقت شروع ہوا جب یعقوب بن لیث صفاری (وفات 876 عیسوی) نے سندھ کو اپنی مملکت میں شامل کرلیا۔ یعقوب کا خاندان اس وقت حکمرانی سے محروم ہوا جب اس کے بھائی اور جانشین عمرو بن لیث کو 900ء میں اسماعیل بن احمد سامانی نے شکست دی، لیکن سندھ بدستور سامانی سلطنت میں شامل رہا۔ حتیٰ کہ سلطان محمود غزنوی (وفات 1030ء) نے اسے بعد میں فتح کرلیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سندھ میں فارسی زبان پنجاب میں غزنویوں کی سلطنت کے قیام سے کوئی ڈیڑھ صدی پہلے پہنچ چکی تھی۔ غزنویوں نے لاہور کو صدر مقام مقرر کیا۔ ان تاریخی عوامل کی وجہ سے سلطان محمود غزنوی کی آمد سے پہلے ملتان اور منصورہ (اس زمانے میں سندھ کا دارالخلافہ) کے لوگ فارسی زبان میں گفتگو کرتے تھے اور بلوچستان کے شہر قصدار کی ایک خاتون رابعہ بنت کعب فارسی زبان کی شاعرہ تھی اور اس نے شعر گوئی میں فارسی کے عظیم شاعر رودکی (وفات 940ء) کا مقابلہ بھی کیا۔ سلطان محمود غزنوی کی وفات سے لے کر محمد بن سام کے لاہور پر حملہ آور ہونے تک پھر ڈیڑھ صدی کا عرصہ ہے۔ اس دوران میں پنجاب میں فارسی زبان کا غلبہ کسی لسانی مزاحمت کے بغیر جاری رہا۔ بادشاہ، درباری، عسکری، صوفیاء، علمائے دین اور تاجر اور کاروباری لوگ بھی فارسی میں گفتگو کرتے تھے۔ غزنویوں نے اندرون ملک تقریباً ہر گاؤں اور قصبے میں مادری زبان فارسی رکھنے والے علمائے

دین، گماشتے، کارندے اور حاکم بھیج رکھے تھے، اس لیے پنجاب ہی سے مسعود سعد سلمان اور ابوالفرج رونی جیسے فارسی کے شیریں نوا شاعر پیدا ہو گئے۔ اس طرح جب فارسی اور پنجابی بولنے والوں کا ہر کوچہ و بازار اور ہر گوشے میں میل جول قائم ہوا تو جیسا کہ ایسے حالات کا تقاضا ہوتا ہے، ایک نئی زبان خود بخود پیدا ہو گئی جسے ہم اردو کہتے ہیں اور جس کے سب سے پہلے شاعر محولہ بالا مسعود سعد سلمان ہیں، جن کا سال وفات 1121 تا 1131 عیسوی ہے۔ بدقسمتی سے ان کا دیوان اردو انقلابات زمانہ کی وجہ سے ناپید ہو چکا ہے۔ ان کے اخلاف کو اس کی اہمیت کا علم نہیں تھا۔ غالباً اسی لیے کسی نے توجہ نہ کی۔ کسے کیا پتا تھا، اس طفل شیر خوار کا شباب کس قدر رنگینیوں اور رعنائیوں کا حامل ہوگا۔

اگر مسعود سعد سلمان بارہویں صدی کے آغاز میں اور خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ تیرہویں صدی عیسوی کے وسط میں پنجاب میں رہتے ہوئے مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر اردو زبان میں شعر کہہ سکتے ہیں تو سترہویں صدی عیسوی کے اختتام پر حسین تر اردو زبان میں شاہ مراد کا شعر کہہ لینا بڑی معقولیت کے ساتھ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ جب مراد پیدا ہوئے ہیں تو اس زبان کو نشو و نما پانے کے لیے مزید کئی صدیاں مل چکی تھیں اور دھنی ضلع جہلم کا علاقہ، جہاں شاہ مراد پیدا ہوئے ایک گراں قدر ثقافت کا گہوارہ بن چکا تھا۔ سلطان محمود اور محمد بن سام اسی راہ سے گذرے تھے۔ موخر الذکر خان پور (نزد چکوال) سے، جو شاہ مراد کی جائے ولادت ہے، کوئی پینتالیس میل مشرق میں دھمیک کے مقام پر (نزد منڈور ہشند در ضلع جہلم) قتل ہوئے تھے۔ سلطنت مغلیہ کا بانی شہنشاہ بابر بھی اس طرف آیا تھا اور خان پور سے مغرب کی طرف کوئی بیس میل کے فاصلے پر کلر کہار کے پُر فضا مقام پر تخت بابر ایک سنگین چٹان کی صورت میں اب بھی دیکھا جا سکتا ہے، جہاں بابر نے دربار منعقد کیا تھا اور جب سے قافلہ اسلام درہ خیبر کو عبور کر کے اس طرف بڑھا تھا۔ علماء اور صوفیائے کرام اس علاقے میں مصروف کار رہے تھے۔ ان کے مزارات آج تک اِدھر اُدھر دکھائی دیتے ہیں اور مرجع خلائق ہیں۔ وہ تمام عوامل جن کا سطور بالا میں تذکرہ ہوا ہے اور جو پنجاب کو ایک جدید ثقافت عطا کرنے کا موجب بنے تھے، اس علاقے میں بھی مصروف عمل رہے تھے۔ کوہستان نمک نے باقی پنجاب کے درمیان حد فاصل قائم کر دی تھی۔ آب و ہوا خوش گوار تھی، گزران آسان تھی، اس لیے تمدن و معاشرت کو فروغ دینے والے اسباب موجود تھے۔ علاوہ بریں چونکہ یہ علاقہ اس راہ پر موجود ہے جو بخارا، کابل اور غزنی سے لاہور اور دہلی کو جاتا ہے، اس لیے یہ اس تہذیب اور ثقافت سے بخوبی فیض یاب ہو سکتا تھا جو مسلمان اپنے ہمراہ ان حدود میں لائے تھے اور اگرچہ سلطانی اور مغل ادوار میں ہر ایک کا رجحان زیادہ تر دہلی کی طرف ہوتا تھا، لیکن غزنوی دور کے اثرات کے رشتے اس سرزمین میں اس قدر دور پہنچ چکے تھے اور انہیں اس قدر استحکام نصیب ہو چکا تھا کہ یہاں عمدگی سے فروغ پذیر ہوتے رہے، الٹا وقتاً فوقتاً ان میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ معاشی تقاضوں کی بناء پر ان ایام میں تہذیب کا رخ دیہات کی طرف نمایاں طور پر ہوا کرتا تھا۔ بنابریں ایک قادری بزرگ شاہ مراد کا ضلع جہلم کے ایک گاؤں

خان پور میں فارسی اور اردو زبانوں میں شعر کہنا ایک ایسا واقعہ نہیں جس کی توجیہ نہ ہو سکے۔

شاہ مراد پنجابی کے بھی شاعر تھے۔ یہ وہ شیریں زبان ہے جو زمانہ ہائے دراز سے پانچ دریاؤں کی اس سرزمین کے عوام کے احساسات و افکار کا ذریعہ اظہار رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ اکبر نے، جو 1605ء میں فوت ہوئے، اس زبان کا یہ نام رکھا، لیکن اس کا علیحدہ وجود اس وقت سے محسوس ہوتا چلا آیا ہے جب عظیم رزمیہ نظم مہابھارت لکھی گئی تھی اور جب ''بھگوت گیتا'' تصنیف ہوئی۔ یہ رزمیہ نظم پہلے پہل ٹیکسلا میں پڑھی گئی تھی اور اس سنسکرت زبان میں جو ابتدائی ویدوں کی مشکل سنسکرت سے مختلف تھی۔ اسے آسان زبان میں لکھا گیا تھا تا کہ عوام اسے آسانی سے سمجھ سکیں کیونکہ ان کی روزمرہ کی گفتگو میں کلاسیکی سنسکرت کے الفاظ مستعمل نہیں تھے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آریاؤں کی آمد سے پہلے پنجاب، سندھ اور بلوچستان سمیت اس برصغیر میں زیادہ تر دراوڑ لوگ آباد تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بلوچستان کے بروہی لوگ اب بھی دراوڑی زبان بولتے ہیں۔ پنجاب کے قدیمی باشندے جو خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے ہیں اور دراوڑ نسل سے تعلق رکھتے ہیں، اب بھی کسی نہ کسی حد تک یہ زبان بولتے ہیں۔ اب جب آریا لوگوں نے دور فتوحات کے بعد ابتدا میں ان کے ساتھ میل جول قائم کیا تو روزمرہ کی ضروریات کے لیے بتدریج ایک نئی زبان پیدا ہوئی۔ یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی ضروری ہے کہ آریا لوگ فن تحریر نہیں جانتے تھے اور ان کا وسیع ادب قوت حافظہ کے ذریعے بعد کی نسلوں کو ورثے کے طور پر منتقل ہوتا رہا ہے۔ اس حقیقت ثابتہ نے بھی روزمرہ کی گفتگو کے لیے ایک ایسی زبان کو فروغ دیا، جو سودیشی تھی اور اسی سرزمین کی پیداوار تھی۔ اسی بنا پر یہ لازمی قرار پایا کہ مہابھارت ایسی آسان سنسکرت زبان میں لکھی جائے جو عوام کے لیے قابل فہم ہو۔ اب جو دراوڑ لوگ آریاؤں کے ابتدائی ظلم و ستم اور قتل و نہب سے بچ نکلے وہ ہولے ہولے ان کے افکار کو جذب کرنے لگ گئے مگر اپنی مادری زبان کو کلیتہً ترک نہیں کر سکتے تھے اس لیے ان کی زبان طویل صدیوں میں سے بچتی بچاتی اور نہیں تو یہاں مسخ شدہ صورت میں ضرور موجود رہ گئی اس لیے دراوڑی زبان ہی ہماری پنجابی کی اساس ہو سکتی ہے۔

پنجاب میں عوام کی ایک علیحدہ زبان کے وجود کا ثبوت مہاراجہ اشوک کی کتاب سے ملتا ہے۔ اشوک 273 قبل مسیح میں تخت نشین ہوئے اور ان کے کتبے عوام کی زبان میں ہیں، جو پراکرت کہلاتی ہے اور جو سنسکرت کی مقامی صورت (ورنیکلر) ہے۔ ان کتبوں کے دو مختلف رسم الخط ہیں: ایک تو برہمی رسم خط ہے جو موجودہ دیوناگری رسم الخط کی اصل ہے اور دوسرا ''خروشتی'' (Kharoshti) رسم الخط ہے۔ ثانی الذکر گندھارا کا رسم الخط ہے۔ یہ دائیں سے بائیں طرف لکھا جاتا تھا اور ادھر فارس (Persia) سے پہنچا تھا جو سامی الاصل تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عوام کی ضروریات پورا کرنے کا جو رجحان ''مہابھارت'' کی تصنیف سے شروع ہوا تھا، اب ایک مستقل زبان اور مخصوص رسم الخط کی صورت اختیار کر چکا تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس رجحان کو مہاتما بدھ (ولادت 563 قبل مسیح) کی نرم نرم تعلیمات سے بھی تقویت ملی تھی کیونکہ ان کا سلوک غریب

اور کمزور عوام کے ساتھ بڑا ہمدردانہ اور مشفقانہ تھا۔ ہندومت تو صرف اونچی جاتی کے لوگوں کو اہمیت دیتا تھا اور اس کے پروہت عبادات کی روح کو بھلا کر صرف خشک رسوم پر انحصار رکھتے تھے۔ لازمی طور پر مہاتمابدھ کی اصلاحات، مذہب کو عوام الناس کے قریب تر لے آئیں جن کی وجہ سے عوام کی زبان کو پنپنے کا اور بھی زیادہ موقع ملا۔ اس لیے مہاتمابدھ کی عوامی اصلاحات سے عوامی زبان کی تحریک کو جو توانائی حاصل ہوئی تھی اس کی بنا پر اشوک کے زمانے تک اہل علم اور عوام کی زبانیں بالکل جداگانہ صورت اختیار کر گئیں اور پنجاب میں تو عوامی زبان کے حروف تہجی بھی بالکل مختلف تھے۔ وادی سندھ کی تہذیب کے زمانہ قبل تاریخ کے لوگ جو موہنجوداڑو اور ہڑپہ میں رہا کرتے تھے اور جن کے میسوپوٹیمیا (عراق) اور عیلم (دجلہ وفرات کے دہانے پر ساحلی علاقے) کے لوگوں سے روابط تھے، فن تحریر سے آشنا تھے مگر افسوس ہے ابھی تک ان کا رسم الخط پڑھا نہیں جاسکا۔ جب ہخامنشی بادشاہ دارائے کبیر نے 516 قبل مسیح میں پنجاب کو تخت وتاراج کیا تو مذکورہ بالا سامی رسم الخط بھی یہاں پہنچا۔ یہ تمام تاریخی واقعات جہاں برصغیر کے شمال مغربی علاقہ (موجودہ مغربی پاکستان) کو جدید ذخیرہ الفاظ عطا کر رہے تھے وہاں اپنے خیالات کے اظہار اور تحفظ کے لیے فن تحریر سے بھی روشناس کر رہے تھے۔ اشوک کے بعد باختر وہند کے یونانی بادشاہ پنجاب میں کوئی دوسو سال تک اپنے سکوں کی ایک طرف "خروشتی" حروف میں پراکرت کے الفاظ کندہ کراتے رہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پنجاب کے عوام کی زبان اس حد تک نشوونما پاچکی تھی کہ اس کے حکمران اسے نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ ان دوصدیوں میں اس کی زبان اور بھی زیادہ مستحکم ہوگئی اور یونانی کے کچھ الفاظ بھی اس میں شامل ہوگئے۔ گپتا دور (330 تا 544 عیسوی) میں برہمنیت کا پھر احیاء ہوا اور سنسکرت سرکاری زبان قرار پائی۔ اس کا ادب ازسرنو کلاسیکی سطح تک پہنچ گیا مگر پانچ دریاؤں کی ولایت کی زبان جو وقت کی آزمائش پر پوری اتری تھی بدستور عوام کے منہ میں رواں دواں رہی اور سنسکرت کے وہ آسان الفاظ اپنے اندر جذب کرتی رہی، جو اس کی فطرت سے مطابقت رکھتے تھے۔

یہ صورت حالات تھی تو برصغیر کے اس شمال مغربی حصے میں اسلام کا ورود ہوا۔ اب یہاں کی عوامی زبان نے اپنی آغوش عربی، فارسی، پشتو اور ترکی زبانوں کے الفاظ کے لیے وا کر دی اور ان سے وہ الفاظ مستعار لے لیے جو آسانی اس کے اپنے تصور ہوسکتے تھے تاکہ معاشرے کی جدید ضروریات کے مطابق اس کے پاس کافی ذخیرہ الفاظ موجود ہوجائے۔ الفاظ جذب کرنے کا یہ فعل بڑی تیزی سے شروع ہوگیا کیونکہ شروع ہی سے اسلام نے بنیادی طور پر عامتہ الناس کی سماجی اور اخلاقی اصلاح کی طرف توجہ دی ہے۔ یہ تو اصلاً وعملاً عوامی مذہب ہے اور عوامی بہبود کا علمبردار ہے۔ مسلمان رہنمایان مذہب نے بہت جلد عوام کو ان کی اپنی زبان میں خطبات دینے شروع کر دیئے۔ اس ضمن میں ہم شیخ اسماعیلؒ لاہوری (وفات 1056ء) کا نام لے سکتے ہیں جو بخاری الاصل تھے لیکن عہد غزنوی میں لاہور ہجرت کر آئے۔ غیر مسلموں کے سامنے ان کے مواعظ حسنہ کی گونج اب بھی سنائی دیتی ہے۔ اس جوش تبلیغ کا اظہار پنجاب میں ہر جگہ ہوا۔ دیہات میں کیا اور

قصبوں میں کیا۔ میدانی علاقوں میں، دھنی کی سطح مرتفع پر اور اسی طرح قہستانی اور ریگستانی اضلاع میں۔ اس طرح پنجابی زبان نے بڑی تیزی سے نشوونما حاصل کی اور بہت جلد صوفیائے کرام نے پنجابی زبان میں اشعار کہنے شروع کر دیے، جن میں بڑے پاکیزہ خیالات بیان کیے جاتے تھے، مثال کے طور پر میر پور کے ایک صوفی بزرگ سید محمد شاہ کا مندرجہ ذیل قطعہ خیال کی پاکیزگی اور رفعت، خلوص جذبات اور حسن بیان کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ صرف پنجابی کے اشعار، جو ایک فرزند وطن کے احساسات کی صحیح عکاسی کرتے ہیں، اس قدر اثر انگیز ہو سکتے تھے۔ اس میں شاعر نے اس حقیقی شخصیت کا نقشہ کھینچا ہے، جو عمل تصوف کے نتیجے کے طور پر انسان کی ذات میں بیدار ہوتی ہے:

روشن صدق یقین دی روشنی توں اک چراغ ہے بدر منیر وانگوں
میرے نال ہسے، میرے نال رووے، کدی خواب تے کدی تعبیر وانگوں
میری جان وی اے میرا مان وی اے میرے زخم وانگوں ترے تیر وانگوں
محمد شاہ گل عشق دی کون کھولے کر تسخیر تقدیر زنجیر وانگوں

کسی نامعلوم شاعر کا ایک اور بلند پایہ شعر مطالعے کے لیے پیش خدمت ہے۔ ایک عاشق ربانی کی ذات میں فقر کی تکمیل کا اظہار ہوتا ہے:

اج روک نہ زاہد مستاں نوں ساقی دا نظارہ ویکھن دے
جتھے بندہ بندہ نہیں رہندا [4] ہن اوہ وی کنارہ ویکھن دے

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ پنجابی ادب بھی کلاسیکی ادب کی سطح تک پہنچ جاتا ہے۔ صرف اس کو جمع کرنے، محفوظ کرنے اور کسی بلند خیال نقاد کی نگاہ سے گزارنے کی ضرورت ہے۔

مختصر الفاظ میں پنجابی زبان کی تاریخ یہی کچھ ہے۔ ایک ماہر لسانیات مندرجہ بالا خاکے کو سامنے رکھ کر بڑے معنی خیز اور بصیرت افروز انکشافات کر سکتا ہے۔ الغرض جب شاہ مراد خان پوری سترہویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئے تو پنجابی زبان اعلیٰ درجے کی ترقی یافتہ زبان بن چکی تھی کیونکہ ورود اسلام کے بعد اس کا ارتقاء کم و بیش ایک ہزار سال تک جاری رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے علاقائی تغیرات بھی پایہ تکمیل تک پہنچ چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بلھے شاہؒ، وارث شاہؒ اور سلطان باہوؒ ایسے پنجابی زبان کے باکمال شعراء کسی لسانی دقت کے بغیر پورے جوش بیان کے ساتھ شعر کہہ سکتے تھے۔

پنجابی شاعری کی ایک اور حیثیت کو ابھی تک پوری اہمیت نہیں دی گئی۔ ابتدا ہی سے پنجاب میں مسلمان صوفی شعراء بڑے جذبات انگیز پیرائے میں محبت الٰہی اور عشق رسولؐ کے متعلق عوام کی اپنی زبان میں شعر کہتے رہے تھے۔ یہ محبت پرور گیت جب مساجد اور مذہبی اجتماعات میں پڑھے جاتے تھے تو عوام کو مسحور کر لیتے تھے، جو انہیں ازبر کر لیتے اور تنہا یا دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جب ولولہ محبت ابھرتا، ان گیتوں کو سُر سے

روح پرور انداز میں گایا کرتے۔ اس طرح ان کی روحانی پیاس بجھتی تھی اور اللہ اور اللہ کے رسول مقبول کے لیے ان کا جذبہ محبت اور بھی گہرا ہو جاتا تھا۔ الفاظ و معانی میں ضروری تفاوت تو ہوتا تھا مگر لوک گیتوں کی سُریں وہی ہوتی تھیں جن سے پنجابی عوام کے کان قرنہائے دراز سے آشنا تھے۔ صرف اعلیٰ طبقے کے مسلمان فارسی کے اشعار سمجھ سکتے تھے یا ان سے لطف اندوز ہو سکتے تھے لیکن پنجابی کے اشعار قریب الفہم ہونے کی بنا پر نچلے طبقے کے افراد کے دلوں کو بھی چیرتے ہوئے نکل جاتے تھے۔ اس طرح خواجہ فرید الدین شکر گنج (وفات 1265ء) اور شیخ لال حسین لاہوری (وفات 1599ء) اور پنجابی کے باقی صوفی شعراء نے مسلم عوام کے قلوب کو اسلامی خیالات سے لبریز کر کے انہیں دین کی آغوش میں رکھا۔ اسی طرح مولانا عبدیؒ کی قبیل کے شعراء جو جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانے میں زندہ تھے، پنجابی نظم میں اسلامی تعلیمات کے متعلق منظوم کتابیں لکھتے رہے جو کہ ان پڑھ عوام بھی بآسانی سمجھ سکتے تھے۔ بنابریں یہ کہنا درست ہے کہ پنجابی زبان میں شعر گوئی ایک عوامی تحریک تھی جو مذہب کو عوام کے قریب تر لائی اور ان کے دلوں میں روح اسلام کی تپش پیدا کرتی رہی۔ خواجہ فرید الدین شکر گنج ایک عہد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کا وجود مبارک اس حقیقت کی طرف انگشت نمائی کر رہا ہے کہ اسلام کے کم تر درجے کے نام لیوا بھی اپنی استطاعت کے مطابق فریضہ تبلیغ کو انجام دینے کے جوش میں ابتدا ہی سے پنجابی زبان میں شعر کہہ کر عوام کو متاثر کرتے رہے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ دستبرد زمانہ سے ان کا کلام محفوظ نہیں رہ سکا۔ مثلاً راقم کے اپنے اجداد میں سے میاں الٰہی بخشؒ ہو گذرے ہیں، جو عاشق رسولؐ تھے۔ قوال ان کا پنجابی کلام بڑے درد و سوز کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، لیکن آج ان کا ایک شعر بھی کسی کو یاد نہیں۔ اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے تو فوراً واضح ہو جاتا ہے کہ پنجابی ادب بے پناہ مقدار میں شروع ہی سے تعلیمات اسلامی کو فروغ دینے میں مصروف رہا ہے۔

اسلامی تعلیمات سے لبریز پنجابی ادب کی یہ بے پناہ مقدار مسلم عوام کے درمیان بھگتی تحریک کے اثرات کا قلع قمع کرنے میں کامیاب رہی۔ ہم جانتے ہیں کہ بالخصوص بابر کی آمد سے پہلے سلاطین دہلی کے آخری ایام میں بھگتی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ مذہبی نقطہ نگاہ سے ہندوؤں کی اس ہمہ گیر عوامی تحریک نے ہندومت کو مکمل تباہی سے بچا لیا اور سیاسی لحاظ سے اس کے بغیر بالکل غیر اغلب تھا کہ مرہٹے یا سکھ، مغلوں کے خلاف اس قدر عظیم طاقت بن سکتے۔ لاریب ان کی اسی زبردست مزاحمت نے سلطنت مغلیہ کا تانا بانا منتشر کر ڈالا۔ اس تحریک کی تاریخ بڑی طویل ہے۔ اسلامی سلطنت کے زمانے میں اس نے اسلام کی عوامی تعلیمات کے خلاف برہمنیت کی بغاوت کے طور پر زور پکڑا۔ اس نے شخصی اور ذاتی جذبہ عبودیت پر زور دیا اور لوگوں کے درمیان اپنی تعلیمات کی اشاعت عوام کی زبان میں کی۔ اس طرح واردات روحانی سے استفادہ عوام کے لیے بھی ممکن ہو گیا اور وہ بھی وجد و سرور کی بلندیوں تک پرواز کرنے لگے۔ اپنے عقائد کے متعلق بے شمار دیہاتی گھروں میں ہند عوام بھگتی کے یہ عوامی گیت لطف لے کر پڑھا کرتے تھے۔

ان پڑھ کسانوں میں ان کی مقبولیت کی انتہا ہی نہ تھی۔ ظاہر ہے بھگتی تحریک عوام کی تحریک تھی۔ اس تحریک کے قائد نیچی جاتی سے تعلق رکھتے تھے، جو بڑے جوش سے رام اور کرشن کی محبت کے گیت گایا کرتے تھے اور شخصی اور زندہ مذہب کی برکات گھر گھر میں عام کرتے تھے۔

اس طرح ہندو عقائد سے لگاؤ کے جذبات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئے اور ہندو جاتی کے اردگرد انہوں نے حصار کا کام کیا' جسے پیہم حملوں کے باوجود مسلمان پوری طرح نہ توڑ سکے۔ یہ عوامی گیت مسلم عوام کو بھی بآسانی متاثر کر سکتے تھے، کیونکہ ان کی اکثریت نومسلموں پر مشتمل تھی۔ اس طرح ان کے پھر ہندو سماج میں جذب ہو جانے کا خطرہ تھا۔ مگر خوش قسمتی سے صوفیائے اسلام اور مذہبی رہنما ملکی زبانوں کو اشاعت اسلام کے لیے استعمال میں لا رہے تھے۔ جیسا کہ پیشتر ازیں بیان کیا جا چکا ہے، حمد الٰہی اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مشتمل اشعار روح پرور زبان میں پڑھے جاتے تھے۔ یہ عوام کی اپنی زبان ہوتی تھی اور آج بھی صوفی بزرگوں کے تصنیف کردہ اشعار کیف آور لے میں جب مذہبی اجتماعات میں گائے جاتے ہیں تو مسلمانوں پر وجد طاری ہو جاتا ہے اور وہ الہامی کیفیات سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا بھگتی اگر ایک زبردست تحریک تھی تو اس کے لیے تریاق کا کام ان وجد آفریں اشعار نے کیا، جو پنجاب اور برصغیر کے صاحب حال صوفیائے کرام نے تصنیف کیے تھے۔ اس وقت ہمارے سامنے صرف پنجاب کا خطہ پاک ہے اور ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ پنجابی شاعری کا ماضی بے حد شاندار ہے اور اسی طرح اس کا مستقبل بھی بے حد تابناک ہوگا۔ مرور ایام کے ساتھ پنجابی کے اشعار یہاں کے عوام کی روح کے مترادف متصور ہونے لگے ہیں اور جوں جوں ان اشعار کی معنویت بڑھتی جائے گی، عوام کی روح بھی معنی خیز ہوتی جائے گی۔

شاہ مراد کی پنجابی نظموں کا مطالعہ اس پس منظر میں کرنا چاہیے جس کا ذکر ان سطور میں ہوا ہے۔ جب اس صوفی شاعر کے مدفن تکیہ شاہ مراد (نزد خانپور جہلم) کے قرب و جوار میں ہل چلاتے ہوئے اور کھیتوں کی آبپاشی کرتے ہوئے کسان آج بھی اس کے اشعار گاتے ہوئے سنائی دیتے ہیں تو ہمیں ان کے وہ آباؤ اجداد یاد آتے ہیں جو اس علاقے کے رہنے والے ہندوؤں اور سکھوں کی زبانی کبیر، تلسی داس اور گرونانک کے دوہے وغیرہ سن کر شاہ مراد کی سی حرفیاں اور ان کے بارہ ماہے وغیرہ زیادہ جذباتیت کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ یہ بات بتا دینا ضروری ہے کہ علاقہ دھنی میں خان پور، چکوال اور بھون کے قصبات میں ہندو اور سکھ بڑی تعداد میں آباد تھے۔ بھگت کبیر نے تو خصوصی طور پر صوفی شعراء کے اسلوب اور ان کی علامات سے کام لیا تھا۔ شاہ مراد نے بھی پنجابی کے دیگر مسلمان شعراء کی طرح اسی انداز بیان کو اختیار کیا اور اپنے پُرسوز کلام سے اسلام کے اثرات میں ہرگز ہرگز کمی واقع نہ ہونے دی۔ بھگتی تحریک کے گیت مسلمانوں کو مسحور نہیں کر سکتے تھے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ غیر مسلم بھی صوفی بزرگوں کی عوامی تعلیمات اور ان کے شیریں نغمات کو سن کر چلے آتے تھے۔ غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ شاہ مراد کے پنجابی کے اشعار غیر مسلموں کے لیے بھی کشش کا موجب تھے۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے شاہ مراد کا مطالعہ ان مختلف عہد آفریں تحریکوں کی روشنی میں کرنے کی کوشش کی ہے جن سے ان کے معاصر اثر پذیر ہوئے اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ صوفی شاعر صرف اپنے زمانے کی پیداوار ہی نہیں تھا بلکہ اپنی جگہ پر اس نے اپنے زمانے کو متاثر بھی کیا۔ اس لیے ضروری نظر آتا ہے کہ ہم اس کی تصنیفات کو مناسب اہمیت دیں۔ یہ امر موجب اطمینان ہے کہ اردو مجلس چکوال اپنے روشن ضمیر صدر شیخ ریاض حسین ریاض چشتی کی رہنمائی میں نہ صرف شاہ مراد کی برسی بڑے اہتمام سے مناتی ہے بلکہ اس نے کلام شاہ مراد بھی دیدہ زیب طریقے سے طبع کرایا ہے۔ مجھے اردو زبان میں لکھے ہوئے ریاض چشتی، محمد دین ادیب، جمیل ہاشمی اور باغ حسین کمال کے بعض مفید مقالات مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ یہ تمام اردو مجلس چکوال کے ارکان ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ چکوال کے ایک مخیر راجہ سرفراز خان برسی منانے اور کلام شاہ مراد کی طباعت کے سلسلے میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ ان تمام مساعی کی وجہ سے دھنی کی ثقافت یقیناً زیادہ ثمر پرور ثابت ہوگی جبکہ اس کا ماضی بھی بلاشبہ قابل تعریف ہے۔

جہاں تک موجودہ تصنیف (یعنی انتخاب کلام شاہ مراد کا انگریزی ترجمہ) کا تعلق ہے، اس کے مدیر اعلیٰ ریاض چشتی ہیں۔ تقریباً تمام تعارفی تشریحات انہی کے قلم سے ہیں۔ اردو غزلوں کا ترجمہ بھی انہی نے کیا ہے۔ پنجابی اور فارسی کے مشمولہ اشعار کا ترجمہ پیارے انداز میں علی الترتیب پروفیسر کرم حیدری ایم اے اور مسز جمیل ہمدم ایم اے نے کیا ہے۔ ترجمے سے مستفیض اور لطف اندوز ہونے کے لیے متعلقہ تعارفی سطور کا ساتھ پڑھ لینا مناسب ہوگا۔ یہ تصنیف شاہ مراد کو یقیناً وسیع تر حلقوں میں متعارف کرادے گی۔ اس سے اہل نظر کو پتہ چل جائے گا کہ ہمارا تہذیبی اور ثقافتی سرمایہ دیہات میں مختلف مقامات پر بکھرا پڑا ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی عیاں ہو جائے گی کہ روح اسلام جہاں بھی پہنچی اس نے نئے انداز سے اپنی رنگینی اور رعنائی کا مظاہرہ کیا۔

اس مقدمے میں تاریخی پس منظر کافی مقدار میں موجود ہے۔ جہاں تک کلام شاہ مراد کے افکار و تصورات اور اس کی ادبی خصوصیات کا تعلق ہے، مجھے امید ہے کوئی اور صاحب علم انہیں اپنے مطالعے کا موضوع بنائیں گے اور بڑے مربوط انداز میں اپنی تحقیقات کا حاصل پیش کریں گے، اگرچہ اس نقطۂ نگاہ سے ریاض چشتی کے تعارفی اشارات بھی خاص قدر و قیمت رکھتے ہیں۔

حواشی:

1- کلام شاہ مراد کا انتخاب انگریزی ترجمے کے ساتھ اردو مجلس چکوال (جہلم) طبع کرا رہی ہے۔ یہ مقدمہ بھی انگریزی میں ہے جس کا "صحیفہ" کے لیے ترجمہ کیا گیا ہے۔

2- خواجہ محمد معصوم (1598 - 1668 عیسوی) کے فرزند خواجہ محمد سیف الدین (1639 - 1685 عیسوی) یعنی حضرت مجدد

رحمت اللہ علیہ کے پوتے مستقل طور پر دربار عالمگیری میں رہ کر شہنشاہ کو خلوت کے خاص اوقات میں توجہ دیا کرتے تھے اور ان کی روحانی ترقی کی رپورٹ اپنے والد بزرگوار کو سرہند بھیجا کرتے تھے۔ دیکھئے: "A Social History of Islamic India" مطبوعہ بھارت 1958ء مصنفہ ڈاکٹر محمد یاسین، جس میں حضرت مجدد الف ثانی پر نازیبا اعتراضات کیے گئے ہیں۔ ان کے متعلق ہندو اساتذہ کے اس شاگرد رشید کو راقم صرف یہ عرض کرے گا:

داستان عہد گل را بجشو از مرغ چمن!!

3- مثلاً ہندی کا یہ شعر:

پتم ہے میں جان دی پیت کرے دکھ ہو
مگر ڈھنڈورا پٹی پیت کرے نہ کو

4- اس ضمن میں بیدل کا مندرجہ ذیل شعر دلچسپی کا موجب ہوگا:

شب کہ آئینہ آں آئینہ رو گردیدم
جلوہ ای کرد کہ من ہم ہمہ او گردیدم

اسے سمجھنے کے لیے اس ضرب المثل کے مطالب زیر نظر رکھے جائیں:

اذا تم الفقر فھو اللہ

(در: صحیفہ، (جولائی 1968) ص110 - 127)

محمد اکرام چغتائی

پنجاب میں اُردو
(مزید تحقیق)

اردو زبان و ادب کی علاقائی حد بندی کا باقاعدہ آغاز 1923ء سے ہوا، جب نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے ''دکن میں اردو'' شائع کی۔ حافظ محمود شیرانی مرحوم کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' پانچ سال بعد یعنی 1928ء میں شائع ہوئی۔ ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے بعد اور خصوصاً مؤخر الذکر کتاب کی ہمہ گیر مقبولیت کے زیر اثر اردو زبان و ادب کے محققین میں اس طرزِ مطالعہ کی قدر و قیمت اور افادیت کا احساس پیدا ہوا۔ بعد ازاں یہ احساس اتنی شدت اختیار کر گیا کہ پاک و ہند کا شاید ہی ایسا کوئی علاقہ بچا ہو، جس کی اردو خدمات کا تحقیقی اور تنقیدی لحاظ سے جائزہ نہ لیا گیا ہو۔ ہر علاقے کے محققین اور لسانی ماہرین نے وہاں کے قدیم اردو ادب کو بڑی محنت اور جانفشانی سے ادبی دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس ضمن میں 'بہار میں اردو'، 'میسور میں اردو'، 'بھوپال میں اردو'، 'مدراس میں اردو' اور 'یوپی میں اردو' کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس طرز مطالعہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مختلف علاقوں کے قدیم اردو زبان و ادب کا معتدبہ سرمایہ منظرِ عام پر آ گیا۔ اردو کے اکثر قدیم، نامعلوم اور گمنام شعراء کا کلام بھی دستیاب ہو گیا، جو پرانے قلمی نسخوں اور بیاضوں میں بکھرا پڑا تھا۔ علاوہ ازیں مذکورہ تحقیقات کی بدولت اردو کے ماہرین لسانیات کو اردو زبان کی لسانی ہمہ گیری کا بھی احساس ہوا۔ ان وجوہ کی بنا پر یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ اردو ادب اور لسانیات کی تحقیق کے لیے مذکورہ کتب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ اس طرز تحقیق سے بعض نقصانات بھی ہوئے اور بعض ادبی اور لسانی تنازعات نے بھی جنم لیا، لیکن مندرجہ بالا کتب کے فوائد کے پیش نظر ان کے نقصانات ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، پروفیسر شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' 1928ء میں شائع ہوئی، لیکن اس سے قبل 'پنجاب میں اردو' کے موضوع پر تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ راقم کے خیال میں اس مطالعہ کا محرک وہ لسانی اور ادبی جھگڑے تھے، جو بیسویں صدی کے اوائل سے اہل زبان اور پنجاب کے مصنفین کے مابین شروع ہو گئے تھے۔ ابتدا میں یہ ادبی جنگ لسانی اور عروضی اعتراضات تک محدود رہی، لیکن بعد میں یہ بحث ذاتیات اور طعن و تشنیع تک پہنچ گئی۔ دہلی اور لکھنؤ کے مصنفین نے پنجاب کی ان اردو خدمات کو

تسلیم کیا ہے' جو اہلِ زبان مصنفین نے پنجاب میں سرانجام دیں' یعنی محمد حسین آزاد' مولانا حالی اور مولوی کریم الدین پانی پتی کی لاہور میں آمد کے بعد۔ اس کے علاوہ انہوں نے پنجاب کی قدیم اردو خدمات سے صاف انکار کیا' اس لیے اب پنجاب کے مصنفین کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ وہ مذکورہ اعتراض کا مدلل جواب دیں اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ پنجاب کی اردو خدمات کو تلاش و جستجو سے سامنے لائیں اور ٹھوس دلائل کی روشنی میں فریق ثانی کے انکار کو اقرار میں تبدیل کر دیں۔

پنجابی انبالوی کا ایک مضمون بہ عنوان ''اردو پنجاب میں''، علی گڑھ منتھلی (جولائی 1903ء) میں شائع ہوا۔ اس کی تردید میں ایک مضمون ''اردوئے معلّی'' (اگست 1903ء' ص 20-25) میں ''تنقید ہمدرد'' کے قلم سے شائع ہوا۔ اس مضمون میں پنجاب کے بعض اردو شعراء پر زبان و بیان کے اعتبار کچھ اعتراضات کیے گئے تھے۔ اس کے جواب میں پنجابی انبالوی نے ایک مضمون بہ عنوان ''اردو زبان پنجاب میں'' لکھا' جو ''مخزن''، ستمبر 1903ء میں شائع ہوا۔ ''تنقید ہمدرد'' کے مضمون کے جواب میں مولوی ممتاز علی نے ''تالیف و اشاعت'' میں ایک مضمون لکھا' جس کی تلخیص ''اردوئے معلّی'' میں شائع ہوئی (اکتوبر 1903ء، ص 40-41 بہ عنوان ''اردو کے دشمن'')۔ مولوی موصوف کی تردید میں ''تنقید ہمدرد'' نے ایک مضمون بہ عنوان ''اردو کے نادان دوست'' لکھا (اردوئے معلّی۔ اکتوبر 1903ء۔ ص 41-42)۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نے بھی اس بحث میں حصہ لیا اور ''اردو زبان پنجاب میں'' کے عنوان کے تحت ایک مضمون لکھا' جو ''مخزن''، (اکتوبر 1903ء) میں شائع ہوا۔ انہوں نے اہلِ زبان حضرات کے بعض صرفی' نحوی اور عروضی اعتراضات کا مدلل جواب دیا۔ تقریباً ڈیڑھ سال بعد انگریزی روزنامہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' (15 جنوری 1905ء) میں اس بحث کو چھیڑا گیا کہ کیا اردو پنجاب کی دیسی زبان ہے؟ اس کے جواب میں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے ایک مضمون بہ عنوان ''اردو اور دیسی زبان'' لکھا' جو ''مخزن'' (فروری 1905ء) میں شائع ہوا۔ پنڈت کیفی لکھتے ہیں:

''قدیم الایام سے اردو کی پنجاب میں وہی حیثیت رہی اور ہے جو شمال مغربی ہند کے اور صوبوں میں'' (ص 36)

انہی ایام میں پنجاب کے مصنفین کے خلاف ایک اور محاذ کھلا۔ 1907ء میں سکھوں نے خالصہ ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ اس کانفرنس کی تشکیل کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ پنجاب میں اردو کے بجائے پنجابی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ ڈاکٹر پرتول چندر چیٹر جی' وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی' نے سالانہ جلسہ تقسیم انعامات (منعقدہ 22 دسمبر 1908ء) کی افتتاحی تقریر میں یہ قرارداد پیش کی کہ صوبہ پنجاب کے مدارس میں اردو کے بجائے پنجابی کو رائج کیا جائے[1]۔ انجمن ترقی اردو کے امرتسر کے اجلاس میں اس ''تخریب پسندانہ تجویز'' کے خلاف بہت سی تقاریر ہوئیں۔ مقررین میں ڈاکٹر محمد اقبال' علی امام' منشی محبوب عالم اور منشی سراج

الدین تھے[2]۔ اخبارات میں بھی اس تجویز کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا[3]۔ انہی مباحث کے دوران ایس۔ ایم۔ دین ناظر نے ایک مضمون بہ عنوان ''اردو پنجابی'' لکھا۔ جس میں وہ لکھتے ہیں:

''اردو زبان دراصل منجھی ہوئی پنجابی زبان ہے۔ اس کے افعال عموماً پنجابی ہیں' مگر تھوڑی سی نفیس تبدیلی کے ساتھ استعمال میں لائے گئے ہیں''[4]۔

مولوی محمد عزیز مرزا نے اردو کانفرنس بدایوں کی افتتاحی تقریر میں کہا:

''صوبہ ممالک متحدہ آگرہ اودھ اردو زبان کا منبع ہے''[5]

وجاہت حسین جھنجھانوی نے بزم اردو لاہور کے ایک جلسہ (منعقدہ 29 مئی 1910ء) میں ایک مضمون بہ عنوان ''اردو زبان کا مرکز'' پڑھا' جس میں انہوں نے محمد عزیز مرزا کے برخلاف یہ ثابت کیا کہ اردو زبان کا منبع پنجاب ہے[6]۔ اس سے قبل وجاہت حسین اردو کا مرکز دہلی مانتے تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''یہ بات سب مانتے ہیں کہ زبان اردو کا مولد ہندوستان کا قدیم دارالسلطنت شہر دہلی ہے۔''[7]

وجاہت حسین کے مضمون کا جواب بشیر الدین احمد دہلوی (فرزند ڈپٹی نذیر احمد دہلوی) نے دیا[8]۔ مولوی سید احمد دہلوی نے 1911ء میں 'محاکمہ مرکز اردو' لکھا' جس میں انہوں نے وجاہت حسین کے نظریہ کی مکمل طور پر تردید کی[9] اور یہ ثابت کیا کہ اردو کا اصل مرکز پنجاب نہیں' بلکہ دہلی ہے۔ بعد میں ''شیر پنجاب'' نے ''محاکمہ'' کا تلخ لہجے میں جواب دیا' جس کا ذکر آیندہ سطور میں ہوگا۔ خان بہادر مرزا سلطان احمد نے ''زبان اردو'' کے عنوان کے تحت ایک مضمون لکھا جو ''مخزن'' (جون 1919ء) میں شائع ہوا' جس میں وہ لکھتے ہیں:

''..... پنجابی اور اردو الفاظ یا پنجابی اور اردو زبان میں کہاں تک وابستگی اور مشابہت ہے۔ ایسی وابستگی و مشابہت ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ساتھ نہیں ہے۔ مقابلہ کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ اردو زبان پنجابی زبان کی اصلاح یافتہ زبان ہے' یا پنجابی زبان کا ایک دوسرا اصلاح یافتہ رخ۔''[10]

بعد ازاں ''شیر پنجاب'' نے ایک مضمون بہ عنوان ''اردو اور اہل زبان'' لکھا جو بالاقساط ''مخزن'' میں شائع ہوا[11]۔ اس مضمون میں بلاواسطہ طور پر سید احمد دہلوی کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ مضمون نگار نے قابل اعتراض حد تک سخت زبان استعمال کی ہے۔ ان کے مضمون سے دو اقتباسات درج ذیل ہیں:

''ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو یا ہندوستانی یا جو کچھ اس کا نام رکھو' پنجاب میں پیدا ہوئی اور پنجابی اس کے بانی تھے۔''

''اردو کا مولد پنجاب ہے نہ کہ شاہجہان آباد۔''[12]

مضمون نگار نے اپنے نظریہ کو درست ثابت کرنے کے لیے بعض ایسے تاریخی واقعات کو بھی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے' جو پنجاب میں اردو زبان کے آغاز و ارتقاء میں ممد و معاون ثابت ہوئے اور یہ تاریخی دلائل وہی ہیں' جن کو بعد میں پروفیسر محمود شیرانی نے اپنی کتاب میں تفصیل سے بیان کیا۔

حافظ محمود شیرانی ''مخزن'' کے پرانے لکھنے والوں میں سے تھے۔ ابتدا میں ان کی نظمیں اس رسالے میں شائع ہوتی رہیں، لیکن اس رسالے میں ان کے تحقیقی مقالات کی اشاعت 1920ء سے شروع ہوتی ہے۔ ان کا پہلا تحقیقی مقالہ ''قابوس نامہ'' اسی رسالے کے 1920ء کے شمارے میں قسط وار شائع ہوا۔ ''دقیقی'' پر مقالہ بھی اسی سال شائع ہوا۔ ہوسکتا ہے کہ ''مخزن'' میں پنجاب میں اردو کے متعلق مضامین ان کی نظر سے گذرے ہوں، جن سے ان کو اس موضوع پر تحقیقی طور پر لکھنے کی تحریک ہوئی ہو۔

پنجاب میں اردو کے سلسلے میں شیر علی سرخوش کا 'تذکرہ اعجازِ سخن' (حصہ اول) بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس تذکرہ کا سنہ اشاعت کتاب پر درج نہیں، لیکن مولوی عبدالحق کا اس کتاب پر تبصرہ رسالہ ''اردو'' (اپریل 1924ء) میں شائع ہوا تھا، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ 1924ء کی ابتدا میں شائع ہوا ہوگا۔ سرخوش نے تذکرہ کے آغاز میں تیس (30) صفحات کا ایک مقدمہ بھی لکھا ہے، جس میں ''پنجاب میں اردو'' کے وجود کو تاریخی اور لسانی دلائل سے ثابت کیا ہے۔ اس مقدمے کے بعض ضمنی ابواب کی تفصیل یہ ہے: زبان اردو اور اہل پنجاب۔ اہل زبان کی پنجابی زبان سے ناواقفیت۔ اردو اور پنجابی زبان کی مماثلت۔ اردو نظم ریختہ میں زبان پنجابی کا عنصر وغیرہ وغیرہ۔

1925ء میں غلام دستگیر نامی نے مراد شاہ لاہوری کا ایک طویل منظوم اردو خط ''نامۂ مراد'' کے عنوان سے شائع کرایا۔ پنجاب کے قدیم اردو شعراء کے کلام کو پیش کرنے کی یہ ایک مستحسن کوشش تھی۔ پہلی دفعہ پنجاب کے ایک قدیم شاعر کا اردو کلام مطبوعہ صورت میں ہمارے سامنے آیا۔ اس سلسلے میں اس سے قبل بھی کچھ کام ہوا تھا۔ انیسویں صدی عیسوی کے نامور آسٹرین مستشرق اور دہلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر الوئس اشپرینگر (1813ء-1893ء) پہلے محقق ہیں، جنہوں نے مسعود سعد سلمان کے ہندی دیوان کی اطلاع دی[13]۔ پنجاب کے ایک اور شاعر ولی رام ولی کی ایک اردو غزل درگا پرشاد نادر نے اپنے تذکرہ موسوم بہ ''خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم'' (1879ء) میں درج کی۔ حافظ محمود شیرانی نے یہ غزل اسی تذکرے کے حوالے سے ''پنجاب میں اردو'' میں شائع کی ہے، لیکن شیرانی سے بہت پہلے یہ غزل ایک مضمون نگار نور احمد نور اپنے مضمون ''اردو اور بھاشا'' میں نقل کر چکے تھے[14]۔ اس ضمن میں جارج گریرسن کی لسانی تحقیقات کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے۔ انہوں نے اردو اور پنجابی زبان کی گرامر کی بعض مشترکہ خصوصیات کی طرف اشارے کیے ہیں[15]۔ انہوں نے صاف طور پر تو نہیں لکھا کہ اردو کا مولد پنجاب ہے، لیکن اردو اور پنجابی کے جن لسانی رشتوں کے پیش نظر جو نتائج تحقیق پیش کیے ہیں، ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو کا مولد پنجاب ہی کو مانتے ہیں۔

شیرانی سے قبل پنجاب میں اردو کے متعلق جو کام ہوا، اس کی اہمیت تحقیقی لحاظ سے بہت کم ہے۔ اس کے برعکس جذباتی رنگ غالب ہے اور اس جذباتیت کی بنیادی وجہ مرکز اردو کے متعلق وہ اختلافی مباحث ہیں، جن کا ذکر سابقہ سطور میں کیا گیا ہے۔ 1928ء سے قبل پنجاب میں اردو کے متعلق جتنا بھی کام

ہوا، وہ مضامین کی صورت میں دستیاب ہے۔ اس کے باوجود ہم اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کر سکتے' کیونکہ بعد میں اسی کام کو حافظ محمود شیرانی نے تحقیقی انداز سے ایک مبسوط اور مربوط کتاب میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ علاوہ ازیں پنجاب کے قدیم اردو شعراء کا اردو کلام بڑی جاں فشانی سے مختلف قلمی بیاضوں سے جمع کیا۔ اردو ادب کے بعض محققین نے شیرانی کی کتاب کے لسانیاتی حصے پر تنقید کی ہے' لیکن وہ شعراء کے اس حصے کی افادیت سے انکار نہیں کر سکے' چنانچہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ''پنجاب میں اردو'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں''بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اصل مضمون کی تحقیق میں ضمنی باتیں زیادہ کار آمد اور قابل قدر نکل آتی ہیں۔ یہی حال اس کتاب کا ہے۔ فاضل پروفیسر شیرانی کو اگرچہ اصل بحث میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی' لیکن اس ضمن میں انہوں نے ایسی ایسی تحقیق کی ہے' جو نہایت قابل قدر ہے۔ اس میں شمالی ہند اور پنجاب کے قدیم اردو لکھنے والوں کو' جو انہوں نے کھوج لگا کر نکالا ہے' وہ بالکل نئی چیز ہے۔''[16]

شیرانی مرحوم نے اپنی کتاب میں جس تحقیقی ژرف نگاہی سے کام لیا ہے' اس سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب نے اردو کے ہر محقق کو متاثر کیا ہے اور یہ تاثر اس کی اشاعت کے ساتھ ہی پیدا ہو گیا تھا۔ صدر یار جنگ محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی اپنے خطبہ صدارت (آل انڈیا اورینٹل کانفرنس لاہور' اجلاس پنجم' 1928ء) میں فرماتے ہیں۔

''.....ہم کو ممنون اور شکر گزار ہونا چاہئے پروفیسر محمود شیرانی کی جاں فشاں تحقیق کا' جنہوں نے ''پنجاب میں اردو'' لکھ کر تحقیقات کو وسعت بخشی اور بتایا کہ پنجاب نے اپنے دور میں کیا کیا خدمتیں اردو کی تھیں' اس جدید تحقیق سے ایک نیا باب تاریخ اردو میں اضافہ ہوا۔''[17]

اور آخر میں فرماتے ہیں:

''اسی سلسلے میں یہ تجویز شاید بے جا نہ ہو کہ اس' اجلاس شعبہ اردو' کی یادگار میں پنجاب میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم ہو' جو منتقلہ کوشش سے پنجاب میں اردو کی قدیم نشوونما کی تحقیقات کرے اور پروفیسر شیرانی نے جس کام کا آغاز' پنجاب میں اردو' لکھ کر دیا ہے' اس کو انجام تک پہنچائے۔''[18]

اسی کے ساتھ 1928ء ہی سے پنجاب میں اردو کے بعض تاریخی اور لسانیاتی پہلوؤں پر تنقید کا بھی آغاز ہو گیا۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق[19]' سید نجیب اشرف ندوی[20] اور ڈاکٹر مسعود حسین خان[21] کے نام قابل ذکر ہیں' لیکن بعض ماہرین لسانیات نے ان کے نظریے کی تائید بھی کی ہے' جن میں پنڈت کیفی دہلوی کا نام سرفہرست ہے[22]' درحقیقت پروفیسر شیرانی اپنی کتاب میں بعض اہم تحقیق طلب مسائل پر کچھ زیادہ روشنی نہیں ڈال سکے تھے اور اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ متعلقہ مواد یا تو ان دسترس سے باہر تھا یا کمیاب تھا۔ جوں جوں ان کی اصل اور نایاب مآخذ تک رسائی ہوتی گئی' وہ ان تحقیق طلب مسائل پر تفصیل سے لکھتے رہے' جو مذکورہ وجوہ کی بنا پر ''پنجاب میں اردو'' میں تشنہ رہ گئے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کئی تحقیقی مقالات لکھے جو

پہلے "اورینٹل کالج میگزین" کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے اور اب دو جلدوں میں "مقالات شیرانی" کے نام سے شائع ہو گئے ہیں [23]۔ اس لیے "پنجاب میں اردو" کے مطالعہ کے لیے ان مقالات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ اس طرح "پنجاب میں اردو" پر اعتراض کے لیے بہت کم گنجائش رہ جائے گی۔

1928ء کے بعد بھی پنجاب میں اردو کے متعلق کچھ تحقیقی کام ہوا ہے، جس کا اجمالی طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ پروفیسر شیرانی کے بعد قاضی فضل حق نے "پنجاب میں اردو" کے عنوان کے تحت دو مقالات لکھے [24]، جن میں انہوں نے پنجاب کے بعض ان قدیم اردو شعراء کا کلام مختلف قلمی بیاضوں سے درج کیا ہے، جن کا ذکر شیرانی کی تصنیف میں موجود نہیں تھا، اور اگر موجود تھا، تو ان کا نیا کلام پیش کیا۔ اس لحاظ سے ان کے مقالات شیرانی کی کتاب کے اس حصے سے کم نہیں، جو پنجاب کے اردو شعراء کے متعلق ہے۔

ڈاکٹر محمد باقر کے پنجاب میں اردو کے متعلق چند مقالات قابل قدر ہیں۔ انہوں نے پنجاب کے دو شعراء کی قدیم مثنویوں کا تعارف کرایا، جن میں سے ایک غوث ابن عظیم کی مثنوی "نیرنگ مملکت چین یا قصہ دلآرام" ہے [25]۔ مثنوی نگار قصبہ میرووال (ضلع سیالکوٹ) کے ایک چک علی کا باشندہ تھا۔ دوسری مثنوی کا نام "قصہ مہتاب شاہ وشہزادہ صف شکن" [26] ہے، جس کے لکھنے والے صادق ہیں اور یہ 1199ھ اور 1202ھ کے درمیان کی تصنیف ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے مراد شاہ لاہوری کی ایک اردو مثنوی "مراد الحبین" کو بھی شائع کرایا [27]۔ شیرانی کی کتاب کے بعد ڈاکٹر موصوف کے پنجاب میں اردو کے متعلق مقالات خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ غلام دستگیر نامی نے دیوان مراد شاہ لاہوری شائع کرایا [28]۔ بعد ازاں ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک مضمون بہ عنوان "پنجاب کا ایک اور ریختہ گو" لکھا، جس میں مراد شاہ لاہوری کے بھائی پیر قلندر شاہ کے اردو کلام کا انتخاب درج کیا [29]۔ شرافت نوشاہی نے پنجاب کے ایک اور قدیم اردو شاعر مرزا نوشہ کی تصنیف "گنج الاسرار" شائع کی۔ چند سال ہوئے چکوال (ضلع جہلم) کے ایک قدیم شاعر شاہ مراد (م 1114ھ) کا اردو دیوان دستیاب ہیں، جس کا ایک مختصر انتخاب کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے اور اس کے حالات زندگی پر بھی ایک مقالہ لکھا گیا ہے [30]۔

پنجاب میں اردو کے متعلق مذکورہ مقالات اور تصانیف کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن شیرانی کی کتاب کے بعد پنجاب میں اردو کے متعلق اس شوق اور دلچسپی سے کام نہیں ہوا، جس طرح مولوی عبدالحق اور حکیم شمس اللہ قادری کے مقالات کے بعد دکن کے محققین نے دکن کے قدیم اردو شعراء پر کام کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ پنجاب کا بہت سا علمی و ادبی ذخیرہ یہاں کے سیاسی حالات کی خرابی کی وجہ سے دستبرد زمانہ کی نذر ہو گیا۔ اس کے باوجود پنجاب کے بہت سے قدیم اردو شعراء کی تصانیف مخطوطات کی صورت میں موجود ہیں، جو ابھی تک اشاعت کی محتاج ہیں۔

مندرجہ بالا تصریحات کے بعد اب ہم اپنے موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں، جو پنجاب کے

قدیم اردو شعراء کے متعلق ہے۔ پنجاب میں اردو کا ایک بڑا حصہ اور قاضی فضل حق کے مقالات اسی کے متعلق ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے شعراء بھی ہیں' جن کا ذکر پروفیسر شیرانی اور قاضی فضل حق نے نہیں کیا۔ علاوہ ازیں بعض ایسے شعراء کا بھی ذکر ہوگا' جن کا کلام دونوں حضرات نے نقل کیا ہے' لیکن ہمیں ان شعراء کا جو کلام دستیاب ہوا ہے' وہ دونوں حضرات کے نقل کردہ کلام سے الگ ہے۔ پنجاب کے ان قدیم اردو شعراء کا کلام ہمیں ایک پرانی قلمی بیاض سے دستیاب ہوا ہے' جو کتب خانہ دانش گاہ پنجاب' لاہور کے ذخیرۂ شیرانی میں موجود ہے۔ یہ بیاض چھوٹی تقطیع پر ہے۔ اس میں اردو کے ساتھ ساتھ بہت سا فارسی کلام بھی موجود ہے' اس کے علاوہ طبی نسخوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ سنہ کتابت نہیں لکھا گیا' لیکن بیاض کے بعض اوراق پر چند مواہیر ثبت ہیں' جن سے بیاض کے سنہ کتابت پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ "قدرت اللہ مہر" (1113ھ) چار جگہوں پر ثبت ہے[31]۔ عبدہٗ اور حاجی بیگ کی مہریں 1133ھ بھی موجود ہیں[32]۔ بیاض کے آغاز میں فارسی زبان میں ایک قاضی کا قصہ لکھا گیا ہے۔ اور اس کے اختتام پر 1180ھ درج ہے[33]۔ لیکن یہ قصہ کسی دوسرے کاتب کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ راقم کے خیال میں یہ بیاض بارہویں صدی ہجری کے نصف اوّل کی نوشتہ ہے۔ سنہ کتابت کی طرح بیاض نگار کا نام بھی معلوم نہیں ہو سکا' لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نامعلوم الاسم پنجاب ہی سے تعلق رکھتا ہے' کیونکہ اس میں جتنے شعراء کا کلام موجود ہے' اُن کا مولد پنجاب ہی ہے۔ اس بیاض میں جن شعراء کا اردو کلام نقل کیا گیا ہے' ان میں سے بعض کا پنجابی کلام بھی لکھ دیا ہے۔ ان شعراء کے اردو کلام میں بعض ایسے الفاظ اور محاورات موجود ہیں' جو صرف پنجاب ہی سے مختص ہیں۔ بعض شعراء کے تخلص میں پنجابی عنصر نمایاں ہے مثلاً عبدالواحد' عبداللہ وغیرہ۔ بیاض کے آخری ورق پر کسی اور شخص کی مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:

"محمد حسین ولد حاجی احمد بخش لیس باف ٹھیکیداران پولیس پنجاب وممالک....."

اس عبارت کے اوپر لاہور لکھا گیا ہے۔

اب ہم پنجاب کے قدیم اردو شعراء کا کلام پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے جن شعراء کے حالات زندگی دستیاب ہوئے ہیں' وہ بھی مختصراً درج کر دیئے گئے ہیں۔

ناصر علی سرہندی

تیرہویں صدی ہجری کے نصف اوّل کے بعض اردو شعراء کے تذکروں میں ناصر علی سرہندی اور ولی گجراتی کی ادبی چپقلش کا ذکر کیا گیا ہے' جن کا حوالہ بارہویں صدی کے تذکروں میں موجود نہیں ہے۔ قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں:

"گاہے بتقریبے شعر ریختہ ہم از طبع عالیش ریختہ چنانچہ در جواب شاعر شان جلی التخلص بہ ولی کہ

بطریق طنز گفتہ بود:

اوچھل کر جا پڑے جو مصرع برق
اگر مصرع لکھوں[34] ناصر علی کوں
باعجاز سخن گر[35] اوڑ چلے تو
گفتہ ولی ہرگز نہ پہنچے گا علی کوں[36]

خوب چند ذکا مذکورہ اشعار سے قبل لکھتے ہیں:

''گاہے میل توجہ تصنیف ریختہ نفرمودہ مگر در جواب شعر ولی شاعر ریختہ کہ ہمعصر او بود چناں گفتہ''۔[37]

اعظم الدولہ سرور رقم طراز ہیں:

''و در اعتراضات ولی کہ شاعر بود چنیں گفتہ''[38]

فرزند احمد صفیر بلگرامی مذکورہ اشعار نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''مگر شعر مذکور عزیز دکھنی کے دیوان میں درج ہے۔ شاید ناصر علی پر اسے یہ چوٹ بری لگی' اس لیے جواب میں شعر کہہ دیا۔ لوگوں میں ناصر علی کے نام سے مشہور ہو گیا[39]''

نصیر الدین ہاشمی کا خیال ہے کہ مذکورہ شعر ناصر علی کے کسی شاگرد کا ہے[40] اسی سلسلے میں ''شیر پنجاب'' کے تخیل کی بلند پروازی ملاحظہ فرمائیے۔ مندرجہ بالا اشعار نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''ولی کا دیوان موجود ہے' لیکن ناصر علی کا دیوان نہیں ملتا..... ہم کو ایک معتبر بزرگ کی زبانی معلوم ہوا کہ ولی ہندوستانی میں ٹوٹے پھوٹے شعر ضرور کہہ لیا کرتے تھے' لیکن یہ دیوان ان کا کہا ہوا نہیں' بلکہ ناصر علی سرہندی کا ہے۔ ولی نے چند شعروں کے ذریعے سے ناصر علی کا دیوان اڑوایا اور خود مالک بن بیٹھے''۔[41]

ناصر علی سرہند میں پیدا ہوئے۔ مرزا محمد طاہر نصر آبادی اصفہانی نے انہیں کشمیری لکھا ہے[42] جس کی تردید بندرابن داس خوشگو نے کر دی ہے۔[43] کشن چند اخلاص نے لکھا ہے کہ وہ لاہور میں پیدا ہوئے۔[44] سنہ پیدائش 1048ھ ہے۔[45] ابتدا میں محمد افضل سرخوش کے ساتھ مشق سخن کرتے رہے۔ چنانچہ سرخوش لکھتے ہیں:

''از یاران قدیم فقیر بود از خورد سالگی یکجا بہم مشق سخن می کردیم و صحبت ہامی داشتیم''[46]

آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ ناصر علی نے اپنی ابتدائی زندگی میں شیخ محمد معصوم سرہندی بن شیخ احمد سرہندی سے بھی استفادہ کیا۔ چنانچہ اپنی ایک فارسی مثنوی میں فرماتے ہیں:

چراغ ہفت کشور خواجہ معصوم
منور از فروغش ہند یا روم
روا از ماہتاب شرع بردوش

چو صبح از پاکی باطن قصب پوش [47]

اس کے برعکس قدرت اللہ گوپاموی کا خیال ہے کہ ناصر علی صوبہ دار الہ آباد سیف خان کی وفات کے بعد جب سرہند آئے تو اس وقت شیخ محمد معصوم کے مرید ہوئے[48] لیکن یہ درست معلوم نہیں ہوتا' کیونکہ سیف خاں کا سنہ وفات 1098ھ ہے [49] اور شیخ محمد معصوم 1079ھ میں فوت ہوئے۔[50] اس لیے آزاد بلگرامی کا خیال درست ہے۔ ابتدا میں ناصر علی نے مرزا فقیر اللہ المخاطب بہ سیف خاں پسر تربیت خاں کی ملازمت اختیار کی۔ سیف خاں پہلے الہ آباد کا گورنر مقرر ہوا اور پھر کشمیر کا (1079ھ میں)۔ اس دوران میں ناصر علی اس کے ساتھ رہا۔ نواب صمصام الدولہ شاہنواز خاں لکھتے ہیں:

"ناصر علی بہ آں ہمہ آزادی واستغنا باہم صحبتی و شیفتگی داشت چنانچہ می گوید:

گفت و گوی طوطی از آئینہ می خیزد علی

گر نباشد سیف خاں مارا نفس درکار نیست [51]"

سیف خاں کی وفات (1095ھ) کے بعد ناصر علی سرہند واپس آ گئے۔ 1100ھ [52] میں لشکر عالمگیری کے ساتھ بیجاپور پہنچے۔ بیجاپور میں وہ ذوالفقار خاں نصرت جنگ (1067-1124ھ) سے منسلک ہو گئے۔ ان کی تعریف میں ایک غزل بھی کہی' جس کا مطلع یہ ہے:

اے شان حیدری ز جبین تو آشکار

نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار [53]

ذوالفقار خاں 1103ھ میں کرناٹک کی تسخیر کے لیے گئے تو ناصر علی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ارکاٹ کے ایک شہر کنجی [54] میں ایک شاہ حمید الدین مجذوب تھے' اُن سے فیض حاصل کیا۔ مندرجہ ذیل اشعار انہیں کی تعریف میں کہے گئے ہیں ۔

ایک ایک ساقی شیریں رسید

نوبت جام حمید الدین رسید

حلقہ درگاہ نیکوں جام او

از زمیں تا آسماں در دام او

جام او خورشید ربانی بود

انجمن افروز سبحانی بود

گر جمال او بر اندازد نقاب

روزن ہر خانہ گردد آفتاب

در جلالش برکشد تیغ از نیام

غیر او باقی نمائد والسلام

دکن سے دہلی تشریف لائے اور یہیں 20 رمضان المبارک 1108ھ میں فوت ہوئے۔[55] سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ کے روضہ کے قریب دفن ہوئے۔

ناصر علی کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑے میاں علی عظیم تھے۔[56] فارسی کے مشہور شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ عہد محمد شاہ کے آخر میں فوت ہوئے (مخزن الغرائب بحوالہ بوڈلین' ص 355)۔ ان سے چھوٹے علی علیم تھے جو سپاہی پیشہ تھے اور عہد محمد شاہی (1131ھ۔ 1161ھ) کے اوائل میں فوت ہوئے۔ تیسرے بیٹے کا نام علی کریم تھا' جو درویش منش انسان تھے۔[57]

ناصر علی کے چند قریبی دوستوں اور شاگردوں کے اسماء مندرجہ ذیل ہیں: محمد افضل سرخوش (1050ھ۔ 1127ھ)' میر عبدالجلیل واسطی بلگرامی (1071ھ۔ 1138ھ)' رفیع خاں باذل (م۔1123ھ)' شاہ فقیر اللہ آفریں (م۔1154ھ)' میر محمد علی رائج سیالکوٹی (م۔1150ھ) اور ارشد علی رسائی (م۔1144ھ) وغیرہ وغیرہ۔

ناصر علی کے فارسی دیوان کے دس قلمی نسخے کتاب خانہ دانش گاہ پنجاب' لاہور کے ذخیرۂ شیرانی میں موجود ہیں' جن میں سے قدیم ترین 1151ھ کا مکتوبہ ہے (بخط دھنپت رائے)۔ پنجاب پبلک لائبریری' لاہور میں ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ ان کے علاوہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال'[58] اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور[59] اور کرائسٹ کالج کیمبرج[60] کے کتب خانوں میں بھی دیوان ناصر علی کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ ان کی مثنوی ''یوسف زلیخا'' کے قلمی نسخے بھی بعض کتب خانوں میں مل جاتے ہیں۔ نعیم الرحمٰن نے ایک طویل مقالہ ناصر علی کی ایک مثنوی (مکتوبہ سنہ 30 جلوس عالمگیری) پر لکھا ہے[61] ان کی ایک مثنوی ''ساغر کش لطف ازلی'' کے دو قلمی نسخے برٹش میوزیم[62] اور برلین[63] کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ دیوان ناصر علی تین دفعہ شائع ہوا ہے۔[64]

ناصر علی سرہندی کے حالات زندگی کے بعد اب ہم ان کا وہ اردو کلام پیش کرتے ہیں' جو ذخیرہ شیرانی کی زیر نظر بیاض سے دستیاب ہوا ہے۔ پروفیسر شیرانی نے ناصر علی سرہندی کی چند اردو غزلیات درج کی ہیں' لیکن یہ کلام ان غزلیات کے علاوہ ہے۔ بیاض میں انہیں ''ریختہ'' لکھا گیا ہے اور یہ تینوں ریختے چراغ' شمع اور پچیسی کے متعلق ہیں۔

ریختہ چراغ

سجن کے آونے کارن[65] دیا اکھیاں جلاؤں میں
انجھو[66] کا تیل کر ساجن پلک بتی لگاؤں میں

بھکھیا کر 67 آگ برہا کی گندھک ماتے جگر کی کر
دوا کھا 68 بدن کا کر کر اچھا روشن دھراؤں میں
سجن جب فکا آوے میرے بھیتر 69 کے آنگن موں 70
جلا کر تن سارا اپنا تو وارے وار جاؤں میں
صراحی سیس اپنا کر پیالہ خون دل کا بھر
رکابی میہہ اپنی دھر پیارے کوں پلاؤں میں
ہووے جب مست پیو میرا کرے بتیاں..... مجہ سوں
قدم چوموں گے پر پرو(؟) ہر کری سوں کر لگاؤں میں
ٹروں شادی میں گھر اپنے لگاں آویں اسپوں (؟) کوں
دیوں(؟) کے برہ کے توری نئی دلہن کہاؤں 71 میں
علی کہتا جو میں شاعر عجب یہ ریختہ باندھا
بجا کر شعر کے ذکر (؟) سبھی شاعر رجھاؤں میں
(ورق 82الف)

ریختہ شمع

درانجمن سجن کی میں شمع ہو جلوں گی
ایک پانو پر کھڑی ہو دل تیل میں تلوں 72 گی
جل جل میں سر کٹاؤں پل پل میں سر کٹاؤں
سر سر میں تن جلاؤں جلنے سوں نا تکوں 73 گی
ساجن کے عشق متی آتش سیں ہوں میں تتی 74
میں موم کی ہوں بتی مجلس بھیتر بلوں 75 گی
لالن دیکھوں جو اپنا میں سب کا چھوڑوں چھتا
نا نیند مجکوں سپنا ساجن سوں جا رلوں 76 گی
ہی کو پیہ بتاوے اس کوں مجھے ملاوے
مجہ روتی ہساوے ہس ہس میں تب چلوں گی
میں جنم کی ہوں تتی ٹھنڈی نہیں ہوں رتی
میں ست کی ہوں ستی 77 ساری عمر سروں گی

کہتا علی یہ دنیا سب مکر حیلہ فن ہے
جانو سبھی سہاگن جب شہ سجن ملوں گی
(ورق 82 الف ٗ ب)

ریختہ پچیسی

کھیلن کارن پچیسی کے شہ اپنا گھر بلاؤں گی
بساط اپنا بدن کر کر جیا پاسا لر ہاؤں گی
چلوں گی ست کا ستا نظر چیریکی دھر کر کر
جو دیکھوں سارے..... سجن سیں جگ ہو جاؤں گی
اگر آوے سارے میرے پسی مہتی (؟) کے بھیتر میں
نیا والونگی (؟) پگ ساجن میں اندر لال جاؤں گی
اگر جیتے میرا ساجن نہ کچھ غم ہے میرے دل کوں
جو ہاروں گی سجن آگے سجن کی میں کہاؤں گی
اگر جیتوں سجن اپنا ہووے یاری خدا کی مجھ
خدا کی سوں 78 نئے سرسوں سہاگن تب کہاؤں گی
پڑیں جب ہمت دس مجکوں نیاہوں گوت اپنی کوں
کروں شادی جیتیں اوپر دھری اپنی کند ہاؤں گی
کہا شاعر علی نیں 79 یوں کہ جیتن ہار بے معنی
اگر پاؤں ایماں اپنا تو واری وار جاؤں گی

ذخیرہ شیرانی کی ایک اور قلمی بیاض میں علی کا مندرجہ ذیل کلام درج ہوا ہے:

نین کے ساگر تمن کے بھیترا جھوں لباب سوں مل پڑے گا
ہووے گی نرگس تجل چمن سوں گلوں کی انکھیاں سوں کل پڑے گا
دو نین کارے تمیں کے جانی حیران کرتے لوگن کے تائیں 80
خراب ہوگا تمام عالم جب ان نین سوں کجل پڑے گا
ابرو کمان دتی پلک ہے عاجز چو تیر ناوک
نظر غضب کی نہ دیکھ ساجن کوئی بے چارا اوچھل پڑے گا
علی ملاحت ترے سجن کی اگر زلیخا سنے گی کبھو 81

مصر میں سودا دگر ہووے گا درم نہ یوسفؑ کا مُل 82 پڑے گا

ہٹیلے چنچل گھنگٹ لے موکھ پر کوئی مٹیلا فہل پڑے گا
یہ حسن دیکھ کر تمن کے دوارے درس کے کارن غل پڑے گا
ہور در پردہ حسن تیرا قیامت افزا ہوا ہے ظالم
بجے گی صور جب ع برہ کی ملک ملک کے سوں غل پڑے گا
جمن کے گلرخ کی یاد (؟) کدھوں 83 ہووے گی بادصبا سوں ظاہر
خوشی سوں..... دہان غنچہ چمن میں ہس ہس کے کھل پڑے گا
دکھن شہر کے شاعر بلا کر متابعت پر دم جو رکھتے
ارے نمانا 84 کے پگ دھر جو جائے ہو چپے (؟) فہل پڑے گا

ہول وحدت کے کرتب سوں دو پارہ کرائی میں
دوئی سب یک طرف ست 85 کر عجب کشتی بنائی میں
نمن ملاح دوتھانے چاوی حوب (؟) کا اوکوں
محبت کے سمندر میں تو کل کر بہائی میں
یقیں..... ناخدا کر کر صدق دل بادباں لائی
متاع نقد جاں خود بدل سودا بھرائی میں
یکایک قعر دریا ہوں لہرم لہو لہرم (؟) کی لاگی
جمن کی یاد کے لنگر سوں کشتی لنگرائی میں
ہوارا 86 حرص کی ماہی نگر لاؤن کوں آئی تھی
تصور ناخدا کے سوں بہت باتاں بچائی میں
سعی آفاق سب کیتی عقل کی دوربیں سیتی
نفس باد موافق سوں کبھو سکر بات کدائی میں
بجز یاد خدا ہرگز نہ تھا گو آشنا دوجا
علی کے کرم سوں حسب الطلب کشتی بنائی میں
(ورق۔5الف ب)

طائب

اردو شعراء کے تذکروں میں دو شاعروں کا ذکر موجود ہے' جن کے تخلص طائب ہیں۔ عبداللہ طائب شاگرد عبدالرحمان احسان اور مہتاب طائب[87] لیکن یہ دونوں شاعر پنجاب سے تعلق نہیں رکھتے۔ سید نورالحسن نے طائب تخلص کے ایک فارسی شاعر کا ذکر کیا ہے' جو پنجاب سے تعلق رکھتا ہے۔[88]

''تائب۔ محمد اکرم پنجابی ست[89]''

طائب کی جو اردو غزل متذکرہ صدر بیاض میں موجود ہے' اس کے مقطع سے شاعر کے زمانے کا تعین ہو سکتا ہے۔ مقطع مندرجہ ذیل ہے:

طائب ترے اشعار کوں دکھنی[90] عراقی کیا کہیں
شوقی بے چارہ مر گیا ابوالفضل خاقانی نہیں

مصرعہ ثانی میں حکیم افضل الدین خاقانی کا ذکر بضرورت قافیہ استعمال ہوا ہے۔ ان کا زمانہ طائب کے زمانے سے بہت پہلے کا ہے۔ خاقانی کی تاریخ وفات 595ھ[91] ہے۔ اس کے برعکس ابوالفضل' طائب کے قریبی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کا سنہ وفات 1011ھ ہے۔[92]

گیارہویں صدی ہجری میں شوقی تخلص کے دو شاعر بھی موجود تھے' جن کے ناموں میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں دونوں کی وفات کے سنین بھی ایک دوسرے سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک حسن شوقی تھا جس کو مولوی عبدالحق گجری یا گجراتی شعراء کی صف میں شامل کرتے ہیں[93]۔ ان کے صحیح سنہ وفات کا علم نہیں' لیکن ابن نشاطی نے ان کا ذکر مرحوم شعراء کے تحت کیا ہے۔ اپنی مثنوی ''پھولبن'' (سنہ تصنیف 1066ھ[94]) میں لکھتے ہیں:

حسن شوقی اگر ہوتا تو الحال
ہزاراں بھیجتا رحمت منج اپرال[95]

اس شعر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حسن شوقی ''پھولبن'' کے سنہ تصنیف (1066ھ) سے قبل وفات پا چکے تھے۔ چنانچہ دکنی ادب کے تمام محققین نے اسی حوالے سے شوقی کا سنہ وفات لکھا ہے[96]۔ بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ 1041ھ تک زندہ تھے ''مناقب شاہ حبیب اللہ بیجاپوری'' (مولفہ مولانا عبدالقادر' قلمی۔ مخزونہ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد دکن) میں لکھا ہے کہ حسین شوقی' شاہ حبیب اللہ کے مرید تھے اور انہوں نے شاہ صاحب کا مادہ تاریخ وفات ''قطب آخرالزماں'' (1041ھ) سے نکالا' جس کی مقبولیت کے پیش نظر شاہ صاحب کے فرزند نے اپنے والد کے گنبد پر لکھ دیا[97]۔ حسینی شاہد صاحب نے شوقی کی پانچ غیر مطبوعہ غزلیں شائع کی ہیں اور ان پر ایک پُر از معلومات مقدمہ بھی لکھا ہے۔[98]

ابن نشاطی کے علاوہ سید محمد فراقی بیجاپوری (م۔1146ھ) نے مندرجہ ذیل اشعار میں شوقی کا ذکر کیا ہے:

جو شوقی اتھا بہوت اپس شوق کا
کہتا تھا سخن بے بہا ذوق کا
ولے ناؤں اس کا سخن تے رہیا
اپس کے جتے سوں وہ تنہا گیا[99]

شوقی نے غزلیات کے علاوہ مثنویاں بھی لکھی ہیں، جن کے نام "فتح نامہ نظام شاہ" اور "میزبانی نامہ محمد عادل شاہ" ہیں۔ اول الذکر تالی کوٹ کی جنگ (973ھ)[100] کے متعلق ہے اور ثانی الذکر محمد عادل شاہ (1037ھ۔1067ھ)[101] کی اپنے وزیر اعظم مصطفیٰ خاں کی لڑکی کے ساتھ شادی کے متعلق ہے۔

شوقی تخلص کے دوسرے شاعر کا نام میر محمد حسین ہے۔ سادات ساوہ سے تعلق رکھتے تھے۔ والد کا نام میر عزیز اللہ تھا۔ اوائل جوانی میں خواجہ شعیب کاشی کی ملازمت میں رہے[102] جہانگیر کے عہد (1014ھ۔1037ھ)[103] میں ہندوستان آئے[104]۔ بعض تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ وہ فرخ سیر کے عہد (1124ھ۔1131ھ)[105] میں ہندوستان آئے[106]۔ یہاں پہنچ کر شوقی نے اعتماد الدولہ میرزا غیاث بیگ طہرانی[107] پدر نور جہاں بیگم کے ہاں قیام کیا۔ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ:

"بعد چندے سدہ جہانگیر بادشاہ لازم گرفت و بہ تقصیرے مورد عتاب شدہ در حبس افتاد۔"[108]

لیکن قاسم جان[109] جوینی کی کوشش سے رہائی نصیب ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد ایران واپس چلے گئے اور میر جمال سلطان سے منسلک ہو گئے۔ میر محمد حسین شوقی کا سنہ وفات کسی تذکرے میں موجود نہیں۔ سراج اورنگ آبادی نے "منتخب دیوانہا" (سنہ تصنیف 1169ھ) میں ان کا سال وفات 1044ھ لکھا[110] ہے۔ مرتب "آتش کدہ آذر" نے لکھا ہے کہ "ایں شاعر تا روزگار شاہ سلیمان صفوی (1077ھ۔1105ھ) حیات داشتہ"[111] ذخیرہ شیرانی میں ایک مخطوطہ "رسالہ نغمات شوقی" موجود ہے۔ ورق 114 ب پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:

"رسالہ نغمات شوقی در اوائل ذی الحجہ 1127ھ صورت اتمام یافت بخط احقر العباد محمد حسین شوقی"

ورق 130 ب پر مرقوم ہے:

"..... سید شاہ ولی در جواب استاد خود محمد حسین شوقی"

دیگر شوقی تخلص کے شعراء کے اسمایہ ہیں: شوقی تبریزی[112]۔ مولوی غلام غوث شوقی[113]۔ شوقی (معاصر تقی اوحدی)[114]۔ شوقی یزدی[115]۔ محمد فصیح شوقی[116]۔ لالہ سری رام (مؤلف "خمخانہ جاوید") کی مملوکہ ایک قدیم قلمی بیاض میں میر محمد حسین شوقی کی ایک اردو غزل موجود تھی، جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

جن پیم رس چاکھا نہیں امرت پیا تو کیا ہوا
جن عشق میں سر نا دیا جو جگ جیا تو کیا ہوا
تعویذ اور طومار میں ساری عمر ضائع کیتی
سیکھے مگر حیلے گھنے ملا ہوا تو کیا ہوا
جوگی و جنگم سیورا رنگ لال کپڑے پہر کے
واقف نہیں اس حال سیں کپڑا رنگا تو کیا ہوا
جیو میں نہیں پی کا درد بیٹھا مشائخ ہوئے گر
من کا رہٹ پھرتا نہیں سمرن کیا تو کیا ہوا
جب عشق کے دریائے میں ہوتا نہیں غرقاب میں
گنگا بنارس دوار کا پنگھٹ پھرا تو کیا ہوا
مارگ بسی سب چھوڑ کر دل تن سے تین خلوت پکڑ
شوقی پیارے لال بن سب سیں ملا تو کیا ہوا[117]

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ طائب کی غزل میر محمد حسین شوقی یا حسن شوقی کی وفات کے فوراً بعد کہی گئی ہے۔ بہر حال یہ مسلم ہے کہ طائب گیارہویں صدی ہجری کا شاعر ہے۔ طائب کی اردو غزل مندرجہ ذیل ہے:

اے دلبرے ہندو صنم تجکوں مہربانی نہیں
تجھ بے وفا کے جور کا جگ میں دوجا ثانی نہیں
تیرے ستم کوں اے پری مجھ ہوا معلوم یوں
تجھ زلف سوں دل باندھ دیا غیر از پشیمانی نہیں
دل باندھ دیا تجھ زلف سوں باگی ہو ان سیں بے خبر
محراب موں سر کیوں نہ دھرے جس دن مسلمانی نہیں
جس کے آنسو جاری نہیں سو دل سدا ویران ہے
معمور ہو کر کیوں بسے جس گاؤں میں پانی نہیں
طائب ترے اشعار کوں دکنی عراقی کیا کہیں
شوقی بیچارہ مر گیا ابوالفضل خاقانی نہیں

میر صابر

میر محمد صابر[118] لاہور کے رہنے والے تھے۔ ان کی والدہ بھی شاعرہ تھیں اور خفیہ تخلص کرتی تھیں۔

پروفیسر شیرانی نے ان کی ایک اردو غزل درج کی ہے[119]۔ شفیق اورنگ آبادی نے اس غزل کے مندرجہ ذیل ابتدائی دو شعر نقل کیے ہیں۔

[120]اپنا سخن ہے دل میں سمائی ہو جائے گی
جو منہ سے نکلی بات[121] پرائی ہو جائے[122] گی
میرے بوسے سے تیرا تو کچھ[123] گھٹ نہ جائے گا
پر میری عاشقوں میں بڑائی[124] ہو جائے گی

اس زمین میں ان کے لڑکے نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ شفیق نے مندرجہ ذیل پانچ شعر دیے ہیں:

کب جانتے تھے تم سے[125] جدائی ہو جائے گی
غم کی منادی دُکھ[126] کی دوائی[127] ہو جائے گی
گر سینہ صاف ہو کھلے بندوں گلے ملو[128]
اتنے سے[129] دل کی کام روائی ہو جائے گی
راوت بچے گا چشم کا دنبالہ قہر ہے
واقف نہ تھے پھسلنے کی کھائی ہو جائے گی[130]
ابرو کی چین دُور کر آخر ہنسو[131] گے تم
یہ ترشی ایک روز مٹھائی ہو جائے گی
صابر یہ بات جس نے کہی آفریں اسے
جو منہ سے نکلی بات پرائی ہو جائے گی

شفیق لکھتا ہے کہ:

"چوں احمد شاہ ابدالی در سنہ احدی و ستین و مآتہ والف از شہزادہ والا اقتدار یعنی احمد شاہ بادشاہ در میدان سرہند شکست خوردہ بطرف قندھار بگریخت۔ بزبانی بعضے اعزہ معلوم شدہ کہ ایں تاریخ از میر سرزد۔

محمد شاہ کا اب بخت جاگا
ندا ہاتف نے دی افغان بھاگا

طرفہ ایں کہ مادہ تاریخ فارسی ہم کلمہ "آفت رفت" بحساب درست می آید"۔

اس کے بعد شفیق رقمطراز ہے:

"این چند اشعار آبدار او کہ از زبانی حاجی مرقوم مسموع شد دریں جریدہ التقاط یافت، لیکن بعضے اشخاص این جار یختہ ہائے میر صابر را در مولود وغیرہ بنام میر عبدالحئی تاباں می خوانند محض بیجاست۔ زیرا کہ آں اشعار از زبانی

اعزہ معتبرہ کہ بار ملاقات میر صابر یافتہ اند بسمع رسید کہ از مناسبت آں اشعار تا حین تحریر در دیوان تاباں ہم وارد۔"

مندرجہ ذیل تین اشعار دیئے ہیں' جو شیرانی کی کتاب میں موجود نہیں ہیں:

کیوں ہر کسی کے ساتھ دل اپنا لگائیے
ہر بے وفا کے کاہے کو عشق کہائیے
ہم مان مان آئے ہیں پیروں کی منتیں
گر آ ملیں سجن تو نیازیں چڑھائیے
صابر کی بات اپنے تو خاطر میں یاد رکھ
اے یار اپنے دل کو خدا سے لگائیے

میر صابر نام کے ایک اور شاعر بھی تھے۔ اصفہان کے رہنے والے تھے۔ عہد جہانگیر میں ہندوستان آئے[132] اور برہان پور میں سکونت اختیار کی[133]۔ سنہ وفات 1077ھ ہے۔ انہوں نے 1077ھ میں عرفی شیرازی (م۔999ھ)[134] کی ہڈیاں نجف اشرف بھجوائیں[135]۔ اس کے علاوہ صابر تخلص کے ایک اور شاعر عہد محمد خاں میں دہلی میں موجود تھے[136]۔ ان کا نام صابر علی شاہ تھا۔ فدوی لاہوری انہیں کے شاگرد تھے[137]۔ کتاب خانہ دانش گاہ پنجاب' لاہور میں ایک قدیم قلمی بیاض (نوشتہ در پنجاب) موجود ہے' جس میں چند اوراق پر مختلف شعراء کا پنجابی کلام درج کیا گیا ہے۔ پنجابی نظموں اور غزلوں میں بعض بزرگان دین سے عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایک پنجابی نظم کا مقطع یہ ہے:

صابر شاہ سدا متوالا (بہتا[138] وچ مراتب اعلا)

ہو سکتا ہے کہ میر صابر علی شاہ ایک ہی شخص ہو' کیونکہ دونوں کا زمانہ بھی ایک ہے اور دونوں خطۂ پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔

محمود شیرانی نے میر صابر کی ایک غزل اور ایک مخمس کو نمونہ کلام کے طور پر نقل کیا ہے۔ راقم کو صابر کا جو مخمس دستیاب ہوا' وہ شیرانی کی کتاب میں موجود نہیں۔ مخمس درج ذیل ہے:

اب جو منظور نظر تم کوں بجز جور نہیں
چشم پوشی نہ کرو کچھ یہ بھلا طور نہیں
میرے احوال کا اندیشہ نہیں غور نہیں
شاہد اب مصرع بے قید سوا اور نہیں
اے میاں عشق کے مارے کوں کہیں ٹھور[139] نہیں

جو کہ روداد نہ ہونا تھا سو گذرا مجھ پر
داغ اندوہ بدل یار مصیبت برسر

اپنے احوال کا کرتا ہوں گذارش اکثر
بارے معنف ہو بتا جاؤ کوئی جاوے کدھر
اے میاں عشق کے. مارے کوں کہیں ٹھور نہیں

دو نین جاری کبھو ہوتے ہیں جوں چشمہ ابل
آتش دل سوں کبھو سوختہ دل ہو جل بل
دشت دیار کے ہوتا ہوں کبھو میں بیکل
ہو سراسیمہ کبھو جاتا ہوں جنگل کوں نکل
اے میاں عشق کے مارے کوں کہیں ٹھور نہیں

کبھو افسوس کہا تو نے نہ مانا میرا
گوش ہرگز نہ کیا غم کا فسانہ میرا
یوں محبت سوں روا کب تھا ستانا میرا
نہ کوئی گھر نہ مکاں ہے نہ ٹھکانہ میرا
اے میاں عشق کے مارے کوں کہیں ٹھور نہیں

بادہ عشق سوں میں بیخود و مستانہ ہوا
عقل زائل ہوئی اور آپ سوں بیگانہ ہوا
کبھو پھرا ہوش کوں مجنوں ہوا دیوانہ ہوا
فارغ از مسجد آزاد ز بت خانہ ہوا
اے میاں عشق کے مارے کوں کہیں ٹھور نہیں

تجھ کوں مطلق سحر و شام نہیں پاتا میں
گرچہ ہے شہرۂ ایام نہیں پاتا میں
بیقراری سوں دم آرام نہیں پاتا میں
کیا میرا ہوئے گا انجام نہیں پاتا میں
اے میاں عشق کے مارے کوں کہیں ٹھور نہیں

بارہا تیرا تجس کیا ایدھر اودھر[140]
کوچہ کوچہ پھر کیا اور پوچھ[141] میں گھر گھر
خاک بہ سر ہو تجھے ڈھونڈ پھرا ہوں در در
در بدر پھر کے میں غم سوں ہوا اب ششدر

اے میاں عشق کے مارے کوں کہیں ٹھور نہیں

لطف سوں آتا اگر پاس میرے تو کیا ہوتا
ہم بغل ہو کے محبت سوں گلے لگ سوتا تو کیا ہوتا
گر تیرا عشق کا نہ ہوتا مجھے کیوں سدھ کھوتا
یوں نہ کہتا تجھے لاچار نہ ہو کر روتا

اے میاں عشق کے مارے کوں کہیں ٹھور نہیں

بھول مت شیوہ احسان محبت کی قسم
آشنائی کی قسم تجھ کو مودت کی قسم
کان دھر بات میرا سن [142] تجھے الفت کی قسم
مجھ کوں سوگند تری پل کی محبت کی قسم

اے میاں عشق کے مارے کوں کہیں ٹھور نہیں

تابہ کے اپنی مصیبت کرے اظہار کوئی
غم و اندوہ کی کب [143] لگ کرے گفتار کوئی
ایسی باتوں کا کہاں لگ کرے تکرار کوئی
عرض کب لگ تیرے آگے کرے ہر بار کوئی

اے میاں عشق کے مارے کوں کہیں ٹھور نہیں

جلوہ گر ہے تو سدا دیدۂ بیدار کے بیچ
شوق معمور ہے تیرا دل افگار کے بیچ
تاب و طاقت نہ رہی قالب بیمار کے بیچ
زار و نالاں پھروں ہر کوچہ و بازار کے بیچ

اے میاں عشق کے مارے کوں کہیں ٹھور نہیں

بسکہ ہے حادثہ چرخ سراسر آفات
محنت و رنج صعوبات سوں گذار اوقات
غیرفریاد و فغاں کام نہیں اب دن رات
بارہا کہہ چکا تجھ آگے کہ سنو بات کی بات

اے میاں عشق کے مارے کوں کہیں ٹھور نہیں

زندگانی سوں ہوا ہیزؔ جگ سوں بیزار

چاہتا ہوں اجل اپنی کوں خدا سوں لاچار
نہ میرا کوئی ہمدم نہ کوئی ہے غمخوار
دُور پھرا ہوں میں غربت زدہ یار یار
اے میاں عشق کے مارے کوں کہیں ٹھور نہیں

کیا بھلا ہوگا کیوں مجھ کوں بھلایا ازیاد
حیف صد حیف، کر دی ساری مشقت برباد
نہ کیا خاطر ناشاد کوں ہرگز کبھو شاد
نہ سنا تو نے میں ہر چند پکارا فریاد
اے میاں عشق کے مارے کوں کہیں ٹھور نہیں

فی الحقیقت کہ ہوا دل کا اٹکنا جنجال
عشق بازی ہے ستم بلکہ سرو جاں کا دمال
مجکوں آتی ہے نظر اپنی نجات اب اشکال
فال میں کیا ہے کیا مژدہ سناوے رمال
اے میاں عشق کے مارے کوں کہیں ٹھور نہیں

بیقراری سوں کہو کیا کوئی آرام کرے
نیم لحظہ نہیں قسمت سوں جو بسرام کرے
کیا مصیبت سوں کوئی فکر و سر انجام کرے
مخلص عشق کے قضا (؟) اپنا اگر کام کرے
اے میاں عشق کے مارے کوں کہیں ٹھور نہیں

ہم جدا سب سوں ہوئے دُور سبھی
ہم کوں غم کھانا تھا یوں اور ہوئے مسرور سبھی
بے خبر عشق سوں ہیں غیر بدستور سبھی
طعن کرتے ہیں مخالف سبھی مقہور سبھی
اے میاں عشق کے مارے کوں کہیں ٹھور نہیں

رقت دل سوں میں دو چشم کوں تر کرتا ہوں
بارش اشک سوں اب تار (؟) گوہر کرتا ہوں
آؤ میرے پاس کوئی دن کوں سفر کرتا ہوں

آگے سو بار کہا پھر بے خبر کرتا ہوں
اے میاں عشق کے مارے کوں کہیں ٹھور نہیں
کیا کرے گر نہ ہوئے غم سوں مکدر صابر
خاکساری سوں ہے باخاک برابر صابر
کہہ چکا قصہ مصیبت کا سراسر صابر
درد سر کیا تجھے اب دیوے مکرر صابر
اے میاں عشق کے مارے کوں کہیں ٹھور نہیں

عاصی

پروفیسر شیرانی نے میاں احمد کی ایک غزل درج کی ہے جو انہیں 1161ھ کی منقولہ ایک بیاض سے ملی تھی۔ زیر نظر بیاض میں بھی یہ غزل نقل کی گئی ہے لیکن اس کے مقطع میں احمد کے بجائے عاصی تخلص استعمال کیا گیا ہے۔ کتاب خانہ "دانش گاہ پنجاب" کی ایک اور قلمی بیاض میں بھی یہ غزل عاصی تخلص کے ساتھ موجود ہے[144] اس لیے ان دونوں بیاضوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ غزل میاں احمد کی نہیں بلکہ عاصی کی ہے۔
اوّل الذکر بیاض میں عاصی کا کچھ پنجابی کلام بھی موجود ہے[145]۔ ان کی ایک غزل کا مقطع درج ذیل ہے:

عاصی بندہ ڈرتے آیا سر تے رکھ نبیؐ دا سایہ
فضل مولا دا کرے نہال کر کچھ توشہ اپنے نال[146]

عاصی کی غزل حسب ذیل ہے:

چوں شب گذشت صبح چڑھی تب سمجھ پڑی
جاگن نہ ہوا ایک گھڑی تب سمجھ پڑی
جب مرگ کا پیالہ پیا تب خبر بھئی[147]
جب کھاٹ پر جودیہ[148] دھری تب سمجھ پڑی
عمر[149] تمام گذر گئی عمل نہ ہوا
جب اجل آئی شتاب گھڑی[150] تب سمجھ پڑی
جب وقت یار چھوڑ[151] چلے ہم رہے نکو
منکر نکیر پوچھ دھری تب سمجھ پڑی
بھائی عزیز کوئی مدد نہ کرے
سر پر اکیلی آئی تب سمجھ پڑی[152]

حساب کا جو وقت ہوا آنکھ کھل گئی
چٹھی عمل کی آپ پڑھی تب سمجھ پڑی
عاصؔی کی طرف کوئی نہیں جز خدا و رسول
جب فضل پر امید دھری تب سمجھ پڑی

مذکورہ غزل بیاض کے ورق 135 الف پر نقل کی گئی ہے۔ صرف ایک شعر زائد ہے:

تو شک نہالیوں منے کچھ فکر نہ ہوا[153]
زیرِ سر جب اینٹ دھری[154] تب سمجھ پڑی

دوسری بیاض (U1/vii33)[155] میں بعض ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو مذکورہ بیاض اور "پنجاب میں اردو" میں موجود نہیں۔ اس بیاض میں یہ غزل اس طرح درج ہے:

صبح گذشت ہوئی شام پڑی تو سمجھ پڑی
باقی رہی نہ ایک گھڑی تو سمجھ پڑی
گھڑیال باجتا ہے صنم ہر گھڑی گھڑی
جب عمر کی کٹوری بھری تو سمجھ پڑی
واللہ یہ غسل دینے لگے اس وجود کو
تختے اوپر لاش دھری تو سمجھ پڑی
مرقد میں جب اتار دیا اس وجود کو
چاروں طرف سے خاک پڑی تو سمجھ پڑی
مل مل کے یار چھوڑ چلے فاتحہ کہنا
عملوں سے بات آن پڑی تو سمجھ پڑی
روزِ حساب کا جو ہوا جب آنکھ کھل گئی
چٹھی عمل کی ہاتھ دھری تو سمجھ پڑی
عاصؔی کی طرف کوئی نہیں جز خدا رسول
جب فضل پر امید دھری تو سمجھ پڑی

ذخیرۂ شیرانی کی بیاض میں عاصی کا دوسرا ریختہ یہ ہے:

عمر گوایا[156] اے پسر علم عمل تے[157] بے خبر
دنیا تے ہو یوں مبتلا ہے ہے حیاتی بیوفا
سب راہ شیطاں چھوڑ دے کچھ توشہ کر کے نال لے

آخر تو کاری یا خدا (؟) ہے بے حیاتی بیوفا
جو حکم آیا از خدا کرو عمل چھوڑو جفا
مشکل نہ ہووے دن جفا ہے بے حیاتی بیوفا
چہ بادشاہ چہ گدا ہم اولیا و انبیا
آخر جو ہوتا سب فنا ہے بے حیاتی بیوفا
محرم ہوویں اس راہ دا لائق تھیویں درگاہ دا 158
روزِ حشر دیکھیں لقا ہے بے حیاتی بیوفا
عاصی جو ڈرتے آیا سب عیب کر کے بہایا
شفاعت کنندہ مصطفیٰ ہے بے حیاتی بیوفا

عبدالواحد

ان کے 'ریختہ' کے چند اشعار بیاض میں منقول ہیں:

بچھڑ پیا کے دامنے 159 سب درد آئے سامنے
یہ جیونا کیسی 160 بنی کیا حال مجھ بیمار کا
یہ 161 نیدکیا بیرن بھی 162 وہ بھی پیا کے سنگ 163 گئی
سفنہ 164 بھی ناہیں آئے 165 وہی کیا حال مجھ بیمار کا
رو لاگ لاگی ہیہ 166 کوں نا جل بجھاوے جیہ کوں
اور نہ ملا دے پیہ کوں کیا حال مجھ بیمار کا
آنکھوں نے لوہو روئیا پیہ تھا سو وہ بھی کھوئیا
پایا وہی جو بوئیا کیا حال مجھ بیمار کا
اے عبدالواحد گر تجھے دیدار پیہ جیو کا سوجھے
یہ آگ تن کی جل بوجھے کیا حال مجھ بیمار کا

عبداللہ

اے بے وفا سریجن 167 مجھ کوں خبر نہ کر گیے
ایک پلک بھی نہ لاگی کیبارگی بچھڑ گیے
یہ بیوفا ہے لوگاں ان سیں نکو تب (؟) آوے

جن سیں میں عمر کھوئی وہ بات بھی نہ کر گئے
پوچھے کبھی نجومی کچھ ہے علاج میرا
جب فال کھول دیکھی آنسو نین کے دھر گئے
تب آہ مار روئے ماں باپ اور بھائی
چارہ نہیں خدا سوں لاچار ہو وہ گھر گئے
میں دکھ سیں بال پالاں جوتے میں ساتھ لعلاں
وہ دیکھ حال میرا سب خاک موں بکھر گئے
اس مرگ کا میں دارو[168] دنیا منے نہ پایا
جتے[169] طبیب آئے بہتا[170] جتن وہ کر گئے
عبداللہ تو سمجھ کر کچھ کر فکر چلن کا
جن عمل نیک صالح وہ پار بھی اوتر گئے[171]

حافظ

بیاض میں ایک نعتیہ غزل منقول ہے:

ہمیں سے گنہگاروں نے جو پایا گھر محمد ﷺ کا
کہوں سب دوست داروں کے کرم سر پر محمد ﷺ کا
لگا ہے جگ پاؤں سیں پہاڑوں اور دریاؤں سیں
سنا ہم اولیاؤں سیں کہ نام بہتر محمد ﷺ کا
ہمارا جیو برمایا ہے فلک پر جا کے آیا ہے
انہیں نے آس پایا ہے جو چوما جن در محمد ﷺ کا
قدہ تو اولی ہو کر شرع کا راہ ہی سو کر (؟)
کسی کا وہ نہیں نوکر جو چاکر ہے محمد ﷺ کا
جنہوں کی نیک نیت ہے انہوں کو سب جمعیت سے
ہماری یہ نصیحت ہے کہا[172] تو نگر محمد ﷺ کا
کہے حافظ جو لالا ہے نبی کا بول بالا ہے
بخشے گا حق تعالیٰ ہے تو کلمہ پڑھ محمد ﷺ کا

ذخیرۂ شیرانی کی ایک اور بیاض (2091) میں حافظ کی تین غزلیات موجود ہیں:

عشق میں راحت ہوا آزار ہو نا ہو سو ہو
کیا کریں اب ہم ہوئے لاچار ہو نا ہو سو ہو
عشق کے دریاؤ میں ڈوبے ہیں یار وجان یوج[173]
موج ہو یا غرق ہو یا پار ہو نا ہو سو ہو
جس کو جی چاہے سو آنکھوں دیکھ لے اوس کو ذرا
اوس میں یارسوائی ہو یا خوار ہو نا ہو سو ہو
توڑ کر تسبیں[174] کو زاہد مست ہو پی کر شراب
پھاڑ جامہ پھینک دے دستار ہو نا ہو سو ہو
کر گریباں چاک حافظ چل بیاباں کی طرف
دیکھ لے یہ بھی مزا یکبار ہو نا ہو سو ہو

اے باد صبا کی لو یہ پیغام ہمارا
گلشن میں ملے گر تجھے گلفام ہمارا
گلزار میں گل ہو کے بے تم تو چمن میں
یہاں خار جدائی نے کیا کام ہمارا
تم حسن کی خوبی میں ہو خوباں کہائے[175]
یہاں مفت میں بدنام ہوا نام ہمارا
کوچے میں ترے آنے اب مجکو قسم ہے
گر تو ہی خفا ہو گا تو کیا کام ہمارا
قرآں کی قسم کھا کے تو نے نہ ہرگز مانا
حافظ نہ پھرا وہ تب خود کام ہمارا

میرا دل درد کرتا ہے شتابی کچھ دوا بھیجو
دوا ہے پرزہ کاغذ پر اوپر صورت بنا بھیجو
مرا قاصد...... تم سناؤ خبر دلبر کی
حقیقت ہوبہو لکھ کرکے مگر مجکو سنا بھیجو
وہی راتی تہایا دل (کذا) اگر تم کہہ دکھاؤ گے

عمر گذاری ہجر سیتی طبیباں کوں بلا بھیجو
رقیبوں کی کتابت موں نہ لکھ بھیجو دوا مجکو
تو اپنے دیکھنے سیتی مج کاغذ جدا بھیجو
ارے ساجن بدروارے (؟) مورے ساجن سنا اون کو
اگر اون کو سناتے ہو طبیباں کو اوٹھا بھیجو
پئی (؟) کی رمز ہے ایسی لگا نہ جانتا کیسی
پیارا کر پٹی (؟) سے جاروٹھا دلبر منا بھیجو
سنو فریاد غریبوں کی ملے قسمت نصیبوں کی
تو اے غافل..... حافظ خدا سے منگ ذرا بھیجو

زخمی

مخمس:

ہوا ہے جگ میں شہرت حسن و خوبی کا بجن تیرا
عجائب در گوہر اور جواہر ہے بچن تیرا
کہ نرگس سرنگوں ہے جب دیکھا ہے نین تیرا
سبھی غنچے ہوئے شرمندے جب دیکھا دہن تیرا
گلاں حیرت میں ہیں سب دیکھ کر یہ گلبدن تیرا

کہاں ہے تاب جو مجھ دیکھ تیرا آفتاب آوے
کہاں ہے زہ رہ جو برعکس رویت ماہ تاب آوے
اگر اکھیاں تجھے دیکھیں نہیں امکاں کہ خواب آوے
نہیں حد بشر جو پیش گفتارت جواب آوے
مگر افسوس کامل ہے اے من موہن سخن تیرا

بڑا ظلم اور ستم ہے اے پیارے مجھ پیارے پہ
تیری زلفاں نے آ کر پیچ ڈالا دل ہمارے پہ
کیا ہے قصد تم نے صید کا بھرے نظارے پہ
تڑپتے ہیں گے غواصاں کہ جوں ماہی کنارے پہ
پڑا ہے جب سیں دریائے محبت میں قدم تیرا [176]

سریجن جب ستیں کھ 177 اپنے کو تم نے دکھایا ہے
بجز جور و جفا شیوہ تمہارا کچھ نہ پایا ہے
دیکھوں گا فوج فوج آ کر دکھیارے دل پر دھایا ہے
غم ہجراں ترے نے زہر کا پیالہ پلایا ہے
بلائے جانِ مسکیں ہے پکڑ پیارے لگن تیرا

بصد ناز و ادا ستیں جو تو در رہ گذر آوے
ہزاراں جانِ عاشق کوں تجھے دیکھے خطر آوے
کروں اکھیاں میں جا تیرا اگر میری نظر آوے
عجب طالع ہمایوں ہیں کہ تو زخمی کے گھر آوے
کہ اوس کی سینہ جراحت سوں شفا ہے آمدن تیرا

سعداللہ

بیاض نگار نے "ریختہ در بسنت" کے عنوان کے تحت یہ غزل نقل کی ہے:

جان ریاں چلایم حق تے تاں اللہ ہو یم یار یار
دل اندر روشن ہویا میں معنی بجھے تار تار
رب ظاہر باطن جانیا میں واحد ایک پچھانیہ
دل اندر میرے بھانیا میں کلمہ آکھاں بار بار
دو اکھڑیاں بھرائیاں میں کیتیاں بہت برائیاں
بھو ماری تیرا سائیاں جند نہ لگیں بار بار
اس برہ نے اندر ملیا سب ہاؤں کلیجا سلہیا
دو نین دلو ہو چلیا سی ہنجریاں لکھ چار چار
میں رات اندھاری اوتہ یہاں میں سچے صاحب تو کہاں
دیدار تہیدا جی لہاں سب ہوون میرے کار بار
سب سکھیاں جو بن والیاں پر دیسی کنھ سنبھالیاں
میگھ برسے راتی کالیاں اس برہ ماری جار جار
سعداللہ کھو بولیاں میں اللہ او تو کھو لیا
رب جنت دا در کھولیا پگ دھرساں اندر جھاڑ جھاڑ

امر شرع میں خیاں نا .....

میں ہوساں نوشہ دنیا میگھ پوساں برکت چار بار

مذکورہ ریختہ میں ٹھیٹھ پنجابی الفاظ و محاورات استعمال ہوئے ہیں۔ راقم کے خیال میں ایسے کلام کو پنجاب میں اردو کے ابتدائی نمونوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ بارھویں صدی کی ابتدا میں اردو شعراء کا جو کلام دستیاب ہوا ہے' ان کی زبان بہت صاف اور واضح ہے۔ علاوہ ازیں پنجابی زبان کے اثرات بھی بہت کم ہیں' اس لیے مذکورہ کلام کو ہم پنجاب میں اردو کا قدیم ترین نمونہ کہہ سکتے ہیں۔

میر محمود

کہوں[178] وہ برم دیکھا میں کہو ملا ہو ٹھارا ہے
کہوں پھرتا فقل حسبی کہوں ٹھاکر دوارا ہے
کہوں اللہ کہیں اس کوں کہوں پوجیں بھوانی کو
الانسانی ہوا واقع بہر درس اوتارا ہے
کہوں مرلی بجاوے وہ کہوں کاندھے دھرے ڈھولک
کہوں مردنگ موں گاوے کہوں راہ موں نقارا ہے
کہوں لڑتا کہوں مرتا کہوں ڈرتا پچھاویں سوں
کہوں روپا کہوں سونا کہوں گھڑتا سونارا ہے
کہوں عاشق کہایا[179] وہ کہوں معشوق ہو یا وہ
کہوں ہوا موسٹ وہ کہوں مرد بچارا ہے
جہاں دیکھوں تہاں[180] تجکوں ہوا تحقیق جب تجکوں
بنا موجود ہر شے موں ولے سب سوں پیارا ہے

جامی

تیرے شہانے مکھ پر دیکھا میں خیال جب کا
میرے جگر کے اندر روزن پڑا ہے تب کا
نازک بدن ہے تیرا سرخی لوہو کی چمکی
گویا شراب مستی پر شیشہ حلب کا
ہر چند مردے عاقل کر کر رہے نظارا

ثانی کہیں نہ دیکھا اس گلبدن عجب کا
زروی تمہارے مکھ پر کیسی بنی ہے بہتی
مکھ دیکھنے تمہارے تانا[181] سہا ہے سب کا
راکھوں امید دل موں کبھو ولا یہ پاؤں
مشتاق ہوں پیارے مستی تمہارے لب کا
زلفت کہ جا گرفتہ بر روئے قل ہو اللہ
تبت یدا سرا ہے جیسے ابی لہب کا
جانی مراد دل کی سب خاموشی سیں پائی
بسیار گفتگوے شیوا نہیں ادب کا

جانی

جانی کی جو غزل بیاض میں منقول ہے اُس کے چند اشعار میر محمد حسین شوقی کے ضمن میں لکھے گئے ہیں لیکن بیاض کی غزل میں شوقی کی بجائے جانی تخلص استعمال ہوا ہے۔ مکمل غزل حسب ذیل ہے:

جن پیم رس جا کھا نہیں امرس[182] پیا تو کیا ہوا
جن عشق میں سرنا دیا جگ جگ جیا تو کیا ہوا[183]
پاپی پکارے اے پیا پیو پیو جو کر کر جیو دیا
معشوق کوں ظاہر کیا رو رو دیا تو کیا ہوا
اپنے[184] عمل کرتا نہیں اوروں[185] نصیحت تو کرے
اپنے عمل جانے نہیں اوروں کہا تو کیا ہوا
معشوق تیرے پنتھ موں ساری عمر ضائع کری[186]
عالم اور فاضل ہوئے گر قاضی بھیا تو کیا ہوا
دل میں نہیں پیو کا ورد مطلب نہ پایا شیخ کا
ساری کتاباں دیکھ کر بلا بھیا تو کیا ہوا[187]
جوگی جگن ساریو راھمن بیا ٹیکا دیا
پیو کے وصل سوں محرم نہیں سمرن کیا تو کیا ہوا[188]
چٹھی جو باندھوں پنکھ سوں اور ری پر یوا جارتو (کذا)
دل کا رہٹ چلتا نہیں منکا پھرا تو کیا ہوا

اوجھڑی ماری رنگ بھری بیٹھا رہا گلزار موں
پرگھٹ محل جاتا نہیں اوس سیں رہا تو کیا ہوا
جب لگ پیالہ پیم کا تجھ عشق کا چاکھے نہیں
گنگا بنارس دوارکا نہاتا پھرا تو کیا ہوا
واں کافر خونریز من خنجر چناں زد بردلم
.....(عبارت کٹ گئی ہے)..... سنتوں سنا تو کیا ہوا
بوستان گلستاں دیکھ کر مطلب نہ پایا شیخ کا
دل کا کفر ٹوٹا نہیں ہادی ہوا تو کیا ہوا
اس عشق کے ریا منے ثابت نہ کیا دین کوں (کذا)
جانی پیارے لعل بن شہ سیں ملا تو کیا ہوا[189]
سب مل نصیحت یوں کریں یہ عشق تو آسان نہیں
دل کا نہیں محرم کوئی مجنوں کہا تو کیا ہوا

شیرانی نے جانی تخلص کے ایک شاعر کے دو ریختے درج کیے ہیں[190]۔
ریختہ مولود:

ناظر

تیرے درس کی ری جوت ستیں دل میرا کل پرنور ہوا
اس نورن کی لمعات ستیں سب عالم کل معمور ہوا
دن رات پیا بن سوتے ہوں دو نین آنسو بھر روتے ہوں
مکھ لال رت [191] سوں دھوتے نت رونا مجہ دستور ہوا
دن رات جو تیری چاہ مجھے یہ آگ برہ کی ماہ مجھے
نت جلتی ہیری ماہ بجے جل سر ماتن کوہ طور ہوا
جن دیکھا تیرا بار پیا تن اوجڑ سب گھر بار کیا
تیرے درسن کا آدھار [192] کیا وہ چڑھ سولی منصور ہوا
تیرے درسن کا دھ ماتی ہوں تیرے کاج سونت برلاتی ہوں
تیرے گن کی مالا گاتی ہوں رگ تاراں تن تنبور ہوا
اس جاگہ تن کوں چار کروں سب صدقے تیرے وار کروں

تجھ باج نہ دو جا یار کروں یہ ناظر کوں منظور ہوا

اب ہم ایسے شعراء کا ذکر کرتے ہیں' جن کا کلام بیاض میں موجود نہیں' لیکن وہ خطہ پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں اور دونوں شعراء کا ذکر "پنجاب میں اردو" میں موجود نہیں ہے۔

آدینہ بیگ کامل

لاہور کے رہنے والے تھے۔ یہاں سے فرخ آباد چلے گئے۔ ابتدا میں حاتم دہلوی اور بعد میں سودا کے شاگرد ہوئے۔ ان دونوں کا ذکر انہوں نے اپنے کلام میں کیا ہے:

آستاں اوس کے یہ سر کیوں نہ رکھوں میں کامل
ہے سخن کوں مرے حاتم کی نظر کا تکیہ
سودا کو تیرے شعر خوش آتے ہیں کاملا
لے جا تو کہہ کے ریختہ استاد کی طرف

راقم نے کامل کے حالات زندگی اور کلام کو کتب خانہ دانش گاہ پنجاب کی ایک قلمی بیاض سے دریافت کیا ہے اور ایک مقالہ کی صورت میں الگ سے شائع کرا دیا ہے۔[193]

حاجی لاہوری

ان کا مختصر ذکر میر صابر لاہوری کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ شفیق اورنگ آبادی نے حاجی کے تفصیلی حالات لکھے ہیں' اُن کی حاجی سے حیدرآباد دکن میں ملاقات بھی ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں وہ ایک دوسرے کے دوست بھی تھے۔ اس لیے شفیق ان کے حالات کے سلسلے میں ایک مستند اور معتبر راوی ہے۔ مندرجہ ذیل حالات شفیق کے تذکرہ چمنستان شعراء سے ماخوذ ہیں:

لاہور کے رہنے والے تھے۔ نام میر علی اکبر تھا۔ علم رمل میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ لطیفہ گوئی کی بدولت ہر محفل کی رونق تھے۔ اکیس سال کی عمر میں لاہور سے فریضہ حج ادا کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ اکبرآباد اور گوالیر ہوتے ہوئے سرونج پہنچے۔ چھ مہینے یہاں رہائش پذیر رہے' یہاں سے سورت پہنچے اور پھر حج کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب واپس آئے تو دکن کے ایک بزرگ حضرت شاہ تیین نذر یاری نور اللہ مرقدہ کے مرید ہوئے۔ حیدرآباد تشریف لائے۔ یہاں ان کی ملاقات شاہ سامی سے ہوئی۔ سامی خود بھی شاعر تھے۔ حاجی نے مندرجہ ذیل شعر انہیں کی تعریف میں کہا ہے:

میں ہر سخن میں حاجی اب کیوں نہ درفشاں ہوں
استاد مجکو سامی صاحب کمال بس ہے

حیدر آباد سے برہان پور تشریف لے گئے۔ وہاں سید معز الدین سے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر حیدر آباد واپس آ گئے۔ حیدر آباد کے قیام کے دوران میں ان کی شفیق اورنگ آبادی سے ملاقات ہوئی۔ اس کا ذکر شفیق کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

''دراثنائے راہ باراقم سطور ملاقات دست داد۔ فقیر ہم کہ ذلہ بر مائدۂ فصاحت قائل دیدہ خور دادر سلک تلامذہ کشید و در علم رمل ماہر شد۔ وعلم قیافہ واسرار قاسمی در عجائبات وغریبات ہم اخذ نمود۔ مراز راہ کرم رہائی چند کتب متداول رمل مثل سرخاب وزبدۃ الرمل ولب لباب ومفتاح مفاتیح ورضوان الرمل وہدایت الرمل از دستخط خاص نوشتہ بہ فقیر عنایت ساخت وتقویم عمر راقم بہ علم اعجاز در دائرہ ابدخ قلمی نمود جزاک اللہ فی الدارین خیراً۔ القصہ مرد رنگین مزاج وپاکیزہ گفتار ست، حق تعالیٰ دیر گاہ سلامت دارد وخیال خام لاہور از دلش بر دارد'' (ص 150)

شفیق نے حاجی کی علم رمل میں کامل دستگاہ کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔ (ص 158-152)

حاجی کے اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

بھٹکتے باغ میں پھرتے ہو کیوں اے عندلیبو! تم
چمن میں گل ہزاروں ہیں ولے اس گل کو آ دیکھو

رکھتا ہے آج قتل کا دل میں خیال توں
غصے کی تیرے ہم نے یہ نظریں پچھانیاں
رہتی ہیں رات دن ترے بس انتظار میں
روئیں نہیں تو کیا کریں آنکھیں نمانیاں
تن ہوا جل خاک میرا دیکھ کر رنگیں لباس
آتش اب دل کو لگی ہے جامہ گلنار کی
مجھ سے بولا دیکھ کر دل نے دبستاں کی بہار
''مکتبوں میں ہند کے ہے یوسفستان کی بہار''

مذکورہ شعر کے مصرعہ ثانی کو شاہ سامی اور صاحب (شفیق) نے تضمین کیا ہے۔

مصر میں سامی نجاسن حاجی اکبر کا سخن
''مکتبوں میں ہند کے ہے یوسفستان کی بہار

چاہ کنعاں کی عبث صاحب سخن حاجی کا سن
''مکتبوں میں ہند کے ہے یوسفستان کی بہار''

چشم شہلا دیکھ اس کی ہو گیا مخمور دل
کیونکہ بھولے مجھ سے ایسے نرگستاں کی بہار
اس کے دام زلف میں حاجی ہوا پابند آج
ہے پریشاں جس کے آگے سنبلستاں کی بہار

کس کو طاقت ہے جو دم مارے تری چشموں سے اب
ایک آنکھیں سرمہ زا اور دوسرا سرمہ دیا
کوہ کن سا سہل سمجھا تلخی جاں کندنی
تجھ لب کوثر کا جس نے شربت شیریں پیا

جب ستی جا کر ملے ہو صحبت خنداں میں جاں
کس طرح سے ہو گئے ہو شوخ ابتر الحفیظ

کل تو پیارے گھر میں تم آؤ گے یا نہیں
اپنا جمال ہم کو دکھاؤ گے یا نہیں
جلتا ہوں جیوں سپند تمہارے فراق میں
آتش کو دل کی جان بجھاؤ گے یا نہیں
نہ بوجھو اور کچھ تجکو مگر بوجھو تو یہ بوجھو
اے شہنشاہِ ملک خوبروئی تم گدا اپنا

بیاض میں کچھ ایسا کلام بھی موجود ہے، جس میں کسی شاعر کا تخلص موجود نہیں۔ ان نامعلوم شعراء کا ریختہ کلام درج ذیل ہے:

مدح غوث اعظمؒ

ولایت کے ملک کے شاہ محی الدین جیلانی
کروں اوس نام کے اوپر سوتن من جیو قربانی
ہوا روشن نبیؐ کے آل کا گھر تجھ شمع سیتیں 194
محمد ﷺ کے گگن کا چاند تم ہو قطب زمانی

حسن کا باغ تج گل سیں دسے زیبا جگت میانے[195]
حسینی کے چمن کا سرو تو سلطان جیلانی
خدا کے نور کا تارا ہوا تو دین پر روشن
زمین و آسماں سارا ہوا پُرنور نورانی
شریعت تم ستیں جاگی طریقت سب تمہیں چھاجی
حقیقت تم ستیں گاجی سچے محبوب سبحانی
ملائک جن اور آدم تمارے ہیں سبھی خادم
کیا تم دین کو سالم زہے معشوق یزدانی
جس نے تیری ہدایت نے دکھایا راہ جو حق کا
ہوا واصل وہ ربّ ستیں نہ کرتا فعل شیطانی
عرب اور روم ہندوستاں خراساں سب ترے تابع
کریں سلطان عالم کے تیرے دربار دربانی
عرش کے کنگرے اوپر معلق جگمگے کھاندا
دیا سارے ولی کاندھا ایسے تم غوث صمدانی
تمہارے نام کی تسبیح ہمیشہ جو کرے دائم
یقیں کر جان کہ پاوے گا ہمیشہ قرب سلطانی
سدا راکھو کرم اپنا تمہیں تو اے شہنشاہاں
تمہارے لطف سوں پاؤں میں جگت میں امن و امانی

ریختہ مولوو:

روبتا[196] پیا پردیس میں موہ[197] چین نہ آوے
گھر آؤ کبھو ساجنا موہ روت بہاوے
اے ساجن جوتیں[198] کیا ایسا کرے نہ کوئی
ہوں پاپن جتھ سیس دھر بھتیرا روئی
تجھ بن جیو نا کٹھن ہے اے یار پیارے
آؤ پیا کرپا کرو جی بھاگ ہمارے
تیرے کارن ساجنا میں پھروں دوہیلی
لاگی سیج ڈراونے تجھ باج اکیلی

ساجن پرچی (کذا) پریم مت مارو موہے
میری بیری توں بے مت لاگے تو ہے

مدح:

اے شہ چشم نبوت کی ضیا
دے گل گلزار نسل مرتضیٰ
عاجزم کمتر تمہارا خاکپا
ٹک کرم کر مجھ اوپر بہر خدا
در پڑے کی دستگیری کیجیو
ہر دو جگ میں آبرو رکھ لیجیو

میں کہاتا ہوں تیرے در کا گدا
ورد ہے تجھ نام کا مجھ کوں سدا
مجھ کو اپنا جان میرے رہنما
خلق سیں مت ڈال میری التجا
در پڑے کی دستگیری کیجیو
ہر دو جگ میں آبرو رکھ لیجیو

روز و شب از درد زاری ہے مجھے
سخت غم سوں بیقراری ہے مجھے
بے کسی کا درد بھاری ہے مجھے
تم سیں یہ امیدواری ہے مجھے
در پڑے کی دستگیری کیجیو
ہر دو جگ میں آبرو رکھ لیجیو

رات دن مالا جپوں تجھ نام کی
آرزو ہے دل میں تجھ اکرام کی
مجھ سے عاصی بد گو ہر بدنام کی
ہے تمہیں کوں لاج ہر بدنام کی
در پڑے کی دستگیری کیجیو
ہر دو جگ میں آبرو رکھ لیجیو

آبرویم از تفضل ہائے تو
تاج عزم کفش فخرامائے تو
کحل چشم ماست خاکپائے تو
اے قبلہ من لجتہ والائے (کذا) تو
در پڑے کی دستگیری کیجیو
ہر دو جگ میں آبرو رکھ لیجیو

کوئی تو دنیا منے رازدار ہے
اہل دنیاں سیں کسی کوں پیار ہے
اپنی دولت پر کوئی سرشار ہے
میری تو دولت تیرا دربار ہے
در پڑے کی دستگیری کیجیو
ہر دو جگ میں آبرو رکھ لیجیو

عمر ضائع داد در فعل تباہ
حاصلم ناکردہ جز شر و گناہ
بادلے فخر دل باروے سیاہ
آن پکڑی ہے تیرے در کی پناہ
در پڑے کی دستگیری کیجیو
ہر دو جگ میں آبرو رکھ لیجیو

ریختہ:

اب کے جاوے تو تجھ کوں خدا کی قسم
پھیر نہ دیکھے تو مصطفیٰ کی قسم
جو میری بات کو نہ مانے تو
تجھے شاہ کربلا کی قسم
ہوں تیرا میں تو جان مت جان
سانچ 199 کہتا ہوں لافتی کی قسم
جیو جان سوں فدا ہوں میں تیرا
دل ستیں کہتا ہوں حسن رضا کی قسم

دوستی بھی نہیں گئی تم سیں
تم نے کھائی وفا کی قسم
ایتی 200 للو بتو (؟) اب مت کرو
کون مانے ہیں بیوفا کی قسم
جو اگر مرے دل موں کینہ ہو
تو مجھے شاہ مرتضیٰ کی قسم

ریختہ:

محبوب یار دلبر جو کچھ کہو سو زر ہے
مادرٗ پدرٗ برادر جو کچھ کہو سو زر ہے
زر جس کے ہاتھ آوے وہ دین ایمان پاوے
اشراف کو دکھاوے جو کچھ کہو سو زر ہے
زر عیب کو چھپاوے حضرت میاں کہاوے
اللہ سوں لے ملاوے جو کچھ کہو سو زر ہے
سب یار خویش بھائی زر سوں کریں سگائی
بے زر نہ آشنائی جو کچھ کہو سو زر ہے
زر بن نہ میت 201 کوئی زر سوں ہے سرخروئی
بے زر کہوں 202 دھوئی 203 جو کہو سو زر ہے
گر شاہ گر گدا ہے زر کا سبھی فدا ہے
مدہوش مبتلا ہے جو کچھ کہو سو زر ہے
زر کا نہ مان کریے تک سمجھ پانو دھریے
اس بیوفا سوں ڈریے جو کہو سو زر ہے

ریختہ بھنگی:

سنو آئے کر ایک بھنگی کا حال
ہوا ایک دن اوس کو نشہ کمال
نکل گھر سو باہر اوی آن میں
وہ جا بیٹھے درزی کی دوکان میں
وہ بیٹھا ہوا اپنا سیتا تھا کچھ

اُنو نے تصور کیا کچھ کا کچھ
نشہ میں بیٹھے اون کو سوجھی یہ بات
کوئی شخص کرتا ہے نیزہ کے ہات
سمجھ کر یہ بات اونہاں ڈر گئے
نہایت کیتیں لوٹ کر زمین پر پڑ گئے
لگے اوس کو کہنیں[204] یہ ہو کر دراز
کہ سنتے ہو گے میاں نیزہ باز
کہ اس نیزہ بازی کی کون سی ہے جا
کسی کے کہیں آنکھ پھوڑو گے کیا
مت اتنی بی بے امتیازی کرو
تک پرے ہو کر یہ نیزہ بازی کرو
جو درزی دیکھا عجب یہ سیر ہے
لگا کہنے صاحب تمہیں خیر ہے
کہاں ہے نیزہ اور کہاں نیزہ باز
سوئی ہے میرے ہاتھ میں غریب النواز

ریختہ درزی:

تک دور چلو تک دور چلو بازار میں درزی لڑتے ہیں
ہاتھوں میں ظلکیں سویاں ہیں اور خون خرابا کرتے ہیں
کینچی کی تو ڈھال بنائی اور گز کا نیزہ کرتے ہیں
دو آدمیوں کوں تو مار ڈالا دو اوروں کا منہ توڑتے ہیں
تغاویکا (کذا) تو گھر بنایا اور گز کا نیزہ کرتے ہیں
دیکھو یارو خوبی اون کی گر گر نیزہ کھاتے ہیں
ہوا ہوں عشق کا زخمی محبت ہے کفن میرا
نہیں مجہ کام مسجد سیں جو بت خانہ وطن میرا
وطن یہ کر نہ جانوں میں نہ کوئی یار ہے جانی
نہ دفناؤ زمیں بھیتر[205] کہ جاگا ہے چمن میرا
ہوا ہوں میں شہید اکبر دکھو دائم کرو جاری

کفن کی مجھ نہیں خاہش 206 جو گل ہے پیرہن میرا
پیا ہے عشق کا پیالہ ہوا ہوں مست متوالا
غسل کی بھی نہیں حاجت کہ بھیگا گل بہ تن میرا

ریختہ میراں:

دیکھنے پر کیا خیال انکھیاں
کیا کروں کیوں رکھو سنبھال انکھیاں
خوشدیاں ہے مجے کمال انکھیاں
شکر کرتیاں ہیں بال بال انکھیاں
دیکھنے پر کمال حسن بہ جمال
رب سوں مانگتے جمال انکھیاں
جس کو دیکھتیاں ہے اسے دیکھ رہتیاں
دب[207] میں رکھنا چھپا یہ تال انکھیاں
دیکھنے کی بدل کیا میں نے
میریاں مجہ پر ہویاں ہے کال انکھیاں
لیلے کا ہے خیال انکھیاں معنی
پلکیں ہے عندلاں کلال انکھیاں
.... 208 .... تمام میری
میں دیکھیاں پریاں غزال انکھیاں
کیا جانو کیا بلا یہ لیاویں گیاں
چھوڑتیاں ناہیں میرا خیال انکھیاں
آج وصال کی رات ہے بجتی
گشت پھرتیاں دنوں ولال انکھیاں
آج مجلس ہوئی میراں تیری
مد پلاوتیاں دونوں کلال انکھیاں

بیاض کے ورق 124 اب پر ایک اردو غزل حاشیہ کٹ جانے کی وجہ سے پڑھی نہیں جاتی۔ بمشکل چند اشعار پڑھے گئے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

بندا بنایا کند کا شیرا چکھایا قند کا

پردا لگایا قند کا تک بوجھ تن من کو نہیں
توجہ 209 کوں بنایا جاںکو تجھ میں چھپایا اکوں
تو کیا لو بہایا پاک کو تک بوجھ تن من کو نہیں
دنیاں سیں کیا لے جائے گا جب اگے شرمائے گا
آخر بہت پچھتاوے گا تک بوجھ تن من کو نہیں
انت چھوڑ گھر بار کوں لاکھوں کروڑوں ہزار کوں
کون لا دگیا کیا اس شمار کو تک بوجھ تن من کو نہیں
رگ رگ میں آپ دکھایا کہت کہت میں آپ چھپایا
پت پت میں آپ بچایا تک بوجھ تن من کو نہیں
دکن بے میرو 210 تجن موہ تن لگے اس کی لگن
پانی نہ پاوے تجہ دکھن تک بوجھ تن من کو نہیں

ریختہ مولود:

بخشیں یا غفار بدیاں میریاں
ناہیں کچھ شمار صفتاں تیریاں
پئی 211 نقارہ چوٹ جو خبریں آئیاں
پلے ناہیں 212 عمل کیا کریں 213 سائیاں
ستا ہیں تا جاگ رین وہائیاں
کتھوں 214 چمن سیں پھل ولیں کملائیاں
سر تے کالا باز تیتر کیا بولے
کلیں ککھیں بھاونکا کیا دھوئے
کورے لارے لائے عمر گوائیا
ستا ہیں تا جاگ غافل بھائیا
دنیا تے دن چار سب نے جیوناں
ہک دہیہ الست (کذا) مرگ پیالہ پیوناں
انہو مشک اپر گوندھو سہرا
کھڑی او دیکھنے کوں نوشہ کیڑا 215
رل مل یاراں یار گھوڑی چاڑھیا

دبتر ملیس جھپ (کذا) پڑھ تو لاڑا 216

رل مل یاراں یار تختی پایا
پھر شہادت کلمہ غسل دوایا
رل مل یاراں یار کندھے چایا 217
پھر شہادت کلمہ یار لنگھایا 218
رل مل یاراں یار قبریں اوتاریا
اوتے 219 مٹی پائی 220 یار سدہایا
منکر تے نکیر پوچھن آیا
اوتھے دیہہ 221 جواب عمل کیا کمایا

فردیات:

اپنے مکھ سوں عرق کوں دُور نہ کر
حسن کا عطر مجھ کو لینا ہے

بے جا ستم کسو پر وہ شوخ کب کرے ہے
دیتا ہے تانگ اس کوں جو فعل بد کرے ہے

پہیلی:

دونوں ٹانگوں سوں دیوں ٹکا
اور جو ماروں ادھک سوہا
دونوں چاسوں میں ہے کچھ بھیدہ
رسیہ ہو تو پاوے سیدہ

متفرق:

ترازو ہو گیا ہے تیر غم کا میرے سینے سوں
نہ جانو کس پل وہ ابرو کمان آیا
ابرو کمان میر کن تختی ستیں نہ آیا
کوشو میں اس کی خاطر کھینچے ہزار چلے
لیا ہے گھیر تجھ زلفوں نے تیرے کان کا موتی
مگر یہ ہند کا لشکر لگا ہے جا ستارے کو

اگر اس شوخ کو جس کا نہیں گھر گھر کے جانے کا
کبھو کس واسطے پہنا ہے چار خانے کا

مآخذ

کتب:
الف: قلمی

1- بیاض۔ ذخیرۂ شیرانی۔ شمارہ1479
2- بیاض۔ ذخیرۂ شیرانی۔ شمارہ2091
3- بیاض۔ ذخیرۂ شیرانی۔ شمارہ2145
4- بیاض۔ ذخیرۂ پنڈت کیفی' Ui/vii9
5- بیاض۔ مخزونہ کتب خانہ دانش گاہ پنجاب' لاہور' Ui/vii33
6- بیاض۔ مخزونہ کتب خانہ دانش گاہ پنجاب' لاہور' Pi/vii53
7- بیاض۔ مخزونہ کتب خانہ دانش گاہ پنجاب' لاہور' Pi/vii58
8- رسالہ نغمات شوقی۔ ذخیرۂ شیرانی۔ شمارہ15
9- ریاض الشعرا۔ والہ داغستانی۔ ذخیرۂ شیرانی۔ شمارہ1483
10- عیار الشعرا۔ خوب چند ذکا۔ مخزونہ انڈیا آفس۔ لندن۔ مائیکروفلم۔ مخزونہ کتب خانہ دانش گاہ پنجاب' لاہور
11- فرحت الناظرین۔ مخزونہ کتب خانہ' ریاست کپورتھلہ
12- گل رعنا۔ شفیق اورنگ آبادی۔ ذخیرۂ شیرانی۔ شمارہ1490
13- مجمع النفائس۔ آرزو اکبر آبادی۔ ذخیرۂ شیرانی۔ شمارہ1489
14- مخزن الغرائب۔ شیخ احمد علی سندیلوی۔ ذخیرۂ شیرانی۔ شمارہ1482
15- منتخب الاشعار۔ مردان علی خاں جتلا۔ ذخیرۂ شیرانی۔ شمارہ1487
16- نشترِ عشق۔ حسین قلی خاں۔ ذخیرۂ شیرانی۔ شمارہ1487

ب: مطبوعہ

1- آتش کدہ۔ لطف علی بیگ آذر۔ تہران۔ 1337ھ
2- اختلاف اللسان۔ وجاہت حسین جھنجھانوی۔ لاہور 1906ء

3- اردو شہ پارے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ حیدر آباد دکن، جلد اول 1929ء
4- اعجاز سخن۔ شیر علی سرخوش۔ لاہور۔ حصہ اول 1924ء
5- نجمی رامپوری۔ بحر الفصاحت، لکھنؤ۔ 1926ء
6- پھولبن۔ ابن نشاطی۔ مرتبہ عبدالقادر سروری۔ حیدر آباد دکن۔ س۔ن۔
7- پنجاب میں اردو۔ حافظ محمود شیرانی۔ لاہور۔ 1928ء
8- تاریخ فرشتہ۔ نول کشور لکھنؤ۔ دو جلد۔ س۔ن۔
9- تذکرہ بے نظیر۔ میر عبدالوہاب افتخار۔ مرتبہ سید منظور علی۔ الٰہ آباد 1940ء
10- تحفتہ الشعرا۔ مرزا افضل بیگ قاقشال۔ مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل، حیدر آباد دکن۔ س۔ن
11- تذکرہ شعرا۔ غنی فرخ آبادی۔ علی گڑھ۔ 1916ء
12- طبقات شعرائے ہند۔ مولوی کریم الدین وایف۔ فیلن۔ دہلی 1847ء
13- تذکرہ نصر آبادی۔ محمد طاہر نصر آبادی۔ تہران 1317ھ
14- جلوۂ خضر۔ فرزند احمد صفیر بلگرامی۔ آرہ۔ جلد اول 1884ء
15- چمنستان شعرا۔ شفیق اورنگ آبادی۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ اورنگ آباد 1933ء
16- خزانہ عامرہ۔ آزاد بلگرامی۔ لکھنؤ۔ س۔ن
17- خزینتہ العلوم فی متعلقات المنظوم (تذکرہ شعرائے دکن)
درگا پرشاد نادر، لاہور، 1879ء
18- دو تذکرے (تذکرہ عشقی و تذکرہ شورش)
مرتبہ کلیم الدین احمد، پٹنہ۔ دو جلد۔ 1959ء، 1963ء
19- سرو آزاد۔ آزاد بلگرامی۔ لاہور 1913ء
20- سفینہ خوشگو۔ بندرابن داس خوشگو مرتبہ عطا کاکوی پٹنہ۔ 1959ء
21- سفینہ ہندی۔ بھگوان داس ہندی۔ مرتبہ عطا کاکوی، پٹنہ۔ 1958ء
22- شمع انجمن۔ نواب صدیق حسن خان۔ بھوپال 1293ھ
23- صبح گلشن۔ سید محمد علی حسن خان، بھوپال 1295ھ
24- صبح وطن۔ نواب غلام غوث خاں اعظم۔ مدراس۔ 1258ھ
25- عمدہ منتخب۔ اعظم الدولہ سرور۔ مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔ دہلی 1961ء
26- کلمات الشعرا۔ محمد افضل سرخوش۔ مرتبہ صادق علی دلاوری۔ لاہور 1942ء
27- کلیات سراج مرتبہ عبدالقادر سروری۔ حیدر آباد دکن۔ س۔ن

28- کیفیہ۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی۔ لاہور طبع دوم۔ 1950ء
29 ماثر الامرا۔ صمصام الدولہ شاہنواز خاں۔
مرتبہ مولوی عبدالرحیم و مولوی اشرف علی۔ کلکتہ، تین جلد۔ 1888ء، 1891ء
30- مجموعہ نغز۔ قدرت اللہ قاسم۔ مرتبہ حافظ محمود شیرانی۔ لاہور 1933ء
31- محاکمہ مرکز اردو۔ سید احمد دہلوی۔ 1911ء
32- محبوب الزمن۔ آصفی ملکاپوری۔ حیدرآباد دکن۔ دو جلد 1907ء، 1911ء
33- مردم دیدہ۔ حاکم لاہوری۔ مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ لاہور 1965ء
34- مقالات شیرانی مرتبہ مظہر محمود شیرانی۔ لاہور، دو جلد، 1966ء
35- مقالاتِ ہاشمی۔ نصیر الدین ہاشمی۔ لاہور۔ جلد اوّل۔ س۔ن
36- منتخب التواریخ۔ عبدالقادر بن ملوک شاہ۔
مرتبہ کیپٹن ڈبلیو۔ این لیس و منشی احمد علی، کلکتہ۔ دو جلد 1865ء
37- نامہ مراد، مراد شاہ لاہور۔ مرتبہ غلام دستگیر نامی۔ لاہور 1925ء۔ طبع دوم 1951ء
38- نتائج الافکار۔ قدرت اللہ شوق گوپاموی، بمبئی۔ 1336ھ
39- نگارستان سخن۔ سید نور الحسن خان۔ بھوپال۔ 1293ھ

ج: انگریزی

(1) Punjab University Calendar. 1909-10

(2) Linguistic Survey Of India
Grierson, Calcutta, Vol.ix, pt.ii, 1916.

(3) Proceedings And Transactions of the Fifth
Indian Oriental Conference. Lahore, Vol. ii, 1930.

(4) Ain-i-Akbari. Trans. by H.Blochmann
Calcutta, Vol. i, 1973. and Vol.iii,Trans. H.S Garrett.1894

(5) Muntakhab-ut-Tawarikh, Abdul Qadir
Bin Maluk Shah, Trans. by W.H.Lowe Calcutta,2 Vols. 1894

(6) Gazetteer of the Bombay Presidency. Vols. xvii and xxiii.

(7) Bijapur by Henry Cousens. Poona, 1889.

(8) Bijapur and its architectural remains,

Henry Cousens, Bombay. 1916

(9) History of Jahangir, Beni Prasad, Allahabad, 1922.

(10) The Muhammadan Dynasties.
Stanley Lane -Poole, Westminster 1894.

(11) Persian Literature, A Bio-Bibliographical Survey..
by C.A.Storey, Vol, I, Pt.II,London,1953

د: فرانسیسی

(1) Manuel de l' genealogie et de chronologie
pour l'histoire de l' Islam.E.de Zambaur, 2 Vols. ,1927.

(2) Histoire de la Litterature Hindouie et Hindoustanie by Garcin
de Tassy, 2nd. Edit. Paris, 3vols. 1870-71

2-فہارس(Catalogues)

الف۔ اردو:

-1 کتب خانۂ آصفیہ کے اردو مخطوطات۔ نصیر الدین ہاشمی۔
حیدرآباد دکن۔ دو جلد۔ 1962ء

-2 مراۃ العلوم (فہرست نسخ خطی فارسی اورینٹل پبلک لائبریری، بانکی پور)
مرتبہ عبدالمقتدر۔ پٹنہ۔ جلد اول۔ 1925ء

ب۔ انگریزی:

(1) A Descriptive Catalogue of the Oriental Library of the Late
Tippoo Sultan of Mysore.Charles Stewart, Cambridge, 1809.

(2) Catalogue of the Arabic, Persian and Hindustani Mss. in the
Libraries of the Kings of Oudh. By Dr. Aloys Vol.1' Sprenger,
Calcutta, 1854.

(3) Catalogue of the Persian Mss. in the British Museum. Charles
Rieu, London, 3 vols. 1879-1883 and Supplement, 1895.

(4) Catalogue of the Persian, Turkish, Hindustani and Pushto Mss. in the Bodleian Library.Hermann Ethe, Oxford, 1889.

(5) Catalogue of the Persian Mss. in the Library of India Office. Hermann Ethe, Oxford, 1903.

(6) A Descriptive Catalogue of Persian Mss. in the Kapurthala State Library. K.M.Maitra, Lahore, 1921.

(7) A Supplementry hand- list of the Muhammadan Mss. in the Libraries of the University and Colleges of Cambridge. By E.G. Browne, Cambridge, 1922.

(8) A Catalogue of the Persian printed books in the British Museum. By Edward Edwards, London, 1922.

(9) Concise descriptive catalogue of the Persian Mss. in the Asiatic Society of Bengal. By Wladimir Iwanov, Calcutta, 1926.

(10) Catalogue of books registered in the Punjab under act xxv 1867 during the quarter ending the 31st December 1911.

ج۔ جرمن

(1) Die Persischen Handschriften Der Koeniglichen Hof und-Staatsbibliothek in Muenchen (Catalogus) Codioum Manuscriptore (Bibliothecae Regiae Monacensis). Joseph Aumer, Muenchen, 1866.

(2) Verzeichniss der Persischen Handschriften der Koeniglichen Bibliothek zu Berlin. Wilhelm Pertsch, Berlin 1888.

د۔ رسائل:

1-اردو۔اپریل1924ء　　جولائی1928ء

جولائی1929ء　　اکتوبر1946ء

اکتوبر1942ء　　اپریل1954ء

جولائی 1946ء
جنوری 1969ء
2-اردوئے معلٰی۔دہلی۔اگست 1903ء
3-اورینٹل کالج میگزین۔مئی 1928ء
اگست 1928ء
نومبر 1940ء
فروری 1933ء
مئی 1941ء
مئی 1937ء
اگست 1944ء
علی گڑھ منتقلی۔جولائی 1903ء
5-صحیفہ۔لاہور۔جولائی 1968ء
6-فصیح الملک۔لاہور۔جنوری 1909ء
7-قدیم اردو۔حیدرآباد دکن۔جلد اوّل 1965ء
8-مخزن۔لاہور۔ستمبر 1903ء
نومبر 1918ء
اکتوبر 1903ء
جنوری 1919ء
فروری 1905ء
مارچ 1919ء
جولائی 1909ء
اپریل 1919ء
اکتوبر 1911ء
جون 1919ء
9-معارف۔اعظم گڑھ فروری 1928ء
10-نوائے ادب۔بمبئی۔جولائی 1960ء
مارچ 1928ء
جنوری 1967ء
اگست 1928ء

ھ۔اخبارات:

1-پیسہ اخبار۔لاہور 3، 11، 26، 28 جنوری 1909ء
پیسہ اخبار لاہور۔14 اپریل 1910ء
2، 26 فروری 1909ء
3 جون 1910ء
(یکم 26، 12، 16، 17، 19، 24، 25، 29، 31) مارچ 12 جولائی 1909ء
15 جون 1912ء
8، 10 اگست 1909ء
2 اگست 1912ء
2-سول اینڈ ملٹری گزٹ۔لاہور
15 جنوری 1905ء

ہزارداستان۔لاہور۔جلد 8 نمبر 1۔(جنوری 1926ء)

انجمن ارباب علم، پنجاب کے مذکورہ رسالہ میں رکن انجمن پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کا ایک طویل مقالہ بہ عنوان "پنجاب میں اردو" شائع ہوا (ص 24-3) انہوں نے یہ مقالہ انجمن کے ایک جلسہ میں پڑھا، جو شیخ عبدالقادر مرحوم کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔اس مقالے کے ابتدائی تیرہ صفحات صحت زبان اور دیگر لسانی مباحث کے متعلق ہیں، جن کا اصل موضوع کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔اصل موضوع صفحہ 16 سے

شروع ہوتا ہے۔ ہم اس مقالے سے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں' جو پنجاب میں اردو کے متعلق ہیں:

"یہ کہنا قرین انصاف ہے کہ واقعات حاصلہ کو ذہن نشین رکھ کر نہایت حزم و احتیاط سے استدلال کے بعد تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ پنجاب اردو کے قدیمی منسوبات میں سے ہے۔" (ص 17)

"..... پنجاب ان خطوں میں سے ہے جنہیں اردو سے خصوصیت ہے۔ اردو کی ترقی اور توسیع میں پنجاب کا جو مہتمم بالشان حصہ ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔" (ایضاً)

بعدازاں آنجہانی کیفی نے اس لسانی جھگڑے کی وجوہات کا مختصراً ذکر کیا ہے' جو مرکز اردو کے متعلق پنجاب کے اردو مصنفین اور لکھنوی حضرات کے مابین شروع ہو گیا تھا۔

مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی مرحوم نے ایک مضمون بہ عنوان "دہلی اور لکھنؤ کی اردو" لکھا' جو پہلے رسالہ دلگداز' (مئی 1918ء) میں شائع ہوا اور بعد میں ان کے مجموعہ مضامین متعلقہ ادب و تحقیق مسائل (ص 126-127) میں چھپا۔ اس مضمون میں انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اردو کے مرکزوں کے اعتبار سے پنجاب دہلی کا پیرو ہے۔

حواشی:

1- Punjab University Calendar, 1909-10,pp. 515-528.

اس تقریر کے اردو ترجمے کے لیے دیکھئے: روزنامہ پیسہ اخبار (لاہور)' 3' 11' 25' 26' 28' جنوری 1909ء

2- بحوالہ رسالہ فصیح الملک' لاہور' جنوری 1909ء' ص 12-10

3- تفصیل یہ ہے: 'صاحب وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی اور اردو' (پیسہ اخبار 4 فروری 1909ء اداریہ)

"پنجابی بخلاف اردو" ایضاً۔ 26 فروری و یکم مارچ 1909ء (اداریے)

"اردو یا پنجابی" ایضاً۔ 6' 12' 16' 17' 19' 24 مارچ 1909ء (اداریے)

"اردو پنجابی" علی محمد۔ ایضاً 29 مارچ 1909ء

پنجابی زبان: مراسلہ (حافظ عبدالقادر) ایضاً 31 مارچ 1909ء

"اردو اور پنجابی" راستی از رنگون ایضاً۔ 12 جولائی 1909ء

"اردو بمقابلہ پنجابی" ایضاً۔ 8' 10 اگست 1909ء

4- اردو پنجابی' قابل توجہ ہز آنر لیفٹیننٹ گورنر پنجاب: (پیسہ اخبار 25 مارچ 1909ء) ص 3

5- پیسہ اخبار 4 اپریل 1910ء' ص 6

6- ایضاً 3 جون 1910ء ص 4

7- اختلاف اللسان۔ لاہور 1909ء ص 6

8- پیسہ اخبار 11 اگست 1910ء ص 2

9- مطبوعہ دہلی۔ص 17-26 کل صفحات 47

10- مخزن۔جون 1919ء ص5

11- مخزن نومبر 1918ء ص 24-35

ایضاً۔جنوری 1919ء ص 46-51

ایضاً۔مارچ 1919ء ص 18-43

ایضاً۔اپریل 1910ء ص 50-53

12- مخزن۔نومبر 1918ء ص26

13- Journal of the Asiatic Society of Bengal, No. v,1853, pp. 422-444, see also Bodleian Cata. no 526 India Office, Ethe, 1893, vol. 1.p 567; Aumer, p.8.

14- مخزن۔اکتوبر 1911ء ص 1-11

15- Linguistic Survey of India, Calcutta, 1916, vol. ix,pt,i

16- رسالہ اردو بابت جولائی 1928ء ص 374۔تنقیدات عبدالحق۔مرتبہ محمد تراب علی خاں باز۔لاہور۔طبع چہارم 1945ء ص 115

17-Proceedings and Transactions of the fifth Indian Oriental Conference, Lahore, vol.ii, 1930, p.1325.

18- ibid.p.1366.

19- رسالہ اردو جولائی 1928ء ص 369-374

20- رسالہ معارف اگست 1928ء "پنجاب میں اردو" ص 90-115

21- رسالہ اردو۔اکتوبر 1946ء "اردو کی ابتدا کے متعلق پروفیسر محمود شیرانی کے نظریے پر تنقید" ص 433-448

22- کیفیہ۔لاہور۔طبع دوم 1950ء ص 59

23- مقالات شیرانی۔مجلس ترقی ادب لاہور 1966ء

24- اورینٹل کالج میگزین۔فروری 1933ء ص 46-99 و مئی 1937ء ص 89-90

25- اورینٹل کالج میگزین۔نومبر 1940ء ص 3-26

26- ایضاً مئی 1941ء ص 41-93

27- "اردو"۔اکتوبر 1946ء

28- "اردو"۔جولائی 1946ء

29- اورینٹل کالج میگزین۔اگست 1944ء ص 19-29۔چند نئے اور پرانے شاعر۔لاہور 1965ء ص 67-80

30- صحیفہ۔جولائی 1968ء ص 11-127

31- ورق 22 الف، 76 الف، 80 ب، 96 ب

32- ورق 156 ب

33- ورق 9 ب

34- کیوں (عمدہ منتخبہ۔ص 431)

35- گر (معیار الشعراء، ورق 526 الف)

36- مجموعہ نغز۔ مرتبہ حافظ محمود شیرانی لاہور 1933ء جلد دوم ص 17

37- عیار الشعرا۔ قلمی مخزونہ انڈیا آفس لائبریری۔ مائیکروفلم کتب خانہ دانش گاہ پنجاب لاہور۔ ورق 516 الف

38- عمدہ منتخبہ۔ مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔ دہلی 1961ء ص 431

39- جلوۂ خضر۔ حصہ اول۔ آرہ۔ 1884ء۔ ص 61 تحتی نوٹ اور یہی خیال آصفی ملکاپوری کا ہے۔ دیکھئے محبوب الزمن' جلد دوم ص 1140

40- مقالات ہاشمی لاہور۔ ص 138

41- مخزن۔ نومبر 1918ء ص 30' 31

42- تذکرہ نصر آبادی۔ طہران۔ 1317ھ ص 447

43- سفینۂ خوشگو۔ مرتبہ عطا کاکوی۔ پٹنہ 1959ء ص 1

44- تذکرہ ہمیشہ بہار۔ بحوالہ اشپرینگر۔ فہرست کتاب خانہ شاہان اودھ کلکتہ 1854ء ص 162

45- ناصر علی کا سنہ وفات 1108ھ ہے۔ چند تذکرہ نگاروں نے ان کی عمر ساٹھ سال لکھی ہے (سرو آزاد۔ ص 131 و خزانہ عامرہ۔ ص 330۔ نتائج الافکار ص 479۔ و تذکرہ بے نظیر' ص 87)۔ اس طرح ان کا سنہ ولادت 1048ھ ثابت ہوتا ہے۔

46- کلمات الشعرا مرتبہ صادق علی دلاوری۔ لاہور ص 74

47- سرو آزاد لاہور۔ 1913ء ص 149-129

48- تذکرہ نتائج الافکار' بمبئی 1236ھ ص 477۔ آزاد بلگرامی نے خزانہ عامرہ (ص 328) "سرو آزاد" کے خلاف یہی خیال ظاہر کیا ہے۔

49- سرو آزاد۔ ص 130

50- فرحت الناظرین۔ محمد اسلم بن محمد حفیظ پسروری' قلمی (فہرست مخطوطات فارسی' کتب خانہ ریاست کپورتھلہ۔ لاہور 1921۔ ص 17)۔ "فرحت الناظرین" کے علاوہ مشائخ اور شعرا کے متعلق چند اقتباسات مولوی محمد شفیع مرحوم نے شائع کیے تھے (اورینٹل کالج میگزین مئی و اگست 1928ء)۔ شیخ محمد معصوم کی تاریخ وفات کا حوالہ انہیں اقتباسات سے لیا گیا ہے۔ (اگست 1928ء۔ ص 54)

51- مآثر الامراء۔ مرتبہ مولوی عبدالرحیم و مولوی مرزا اشرف علی۔ کلکتہ۔ جلد دوم۔ 1890ء۔ ص 484

52- 1101ھ (سفینۂ خوشگو۔ ص 2)

53- مآثر الامراء۔ جلد دوم۔ ص 104

54- "کنجی شہریست مشہور بر مسافت دوازدہ کروہ از ارکاٹ و یکے از معابد سیعہ ہنود است" (سرو آزاد۔ ص 131)

55- کشن چند اخلاص نے 6 رمضان لکھا ہے (بحوالہ اشپرینگر۔ ص 126)۔ علی ابراہیم خان خلیل نے 1109ھ لکھا ہے (خلاصۃ الکلام بحوالہ بوڈلین ص 298) اور سرخوش کا یہ مادۂ تاریخ نقل کیا ہے۔ گفت آ علی بعالم معنی رفت (کلمات الشعرا۔ ص 75)۔ مادۂ تاریخ میں ایک عدد کے اضافے کی تفصیل کے لیے دیکھئے خزانہ عامرہ۔ ص 330۔ سفینۂ خوشگو۔ ص۔ 4)

56- بیدل کے مادۂ تاریخ کی عبارت 'رنگ ناز شکست' سے 1108ھ برآمد ہوتا ہے اور یہی تاریخ وفات مرآت الخیال' ریاض الشعرا' تاریخ محمدی اور نغمۂ عندلیب میں بھی درج ہے۔ (بحوالہ ریو جلد دوم 699) سفینۂ خوشگو ص 272۔ نتائج الافکار ص 495'

مجمع النفائس بحوالہ تذکرہ سرو دم دیدہ۔ ص 81'82۔ سفینۂ ہندی ص 132۔

57- سفینۂ خوشگو۔ ص 273

58-CONCISE DESCRIPTIVE CATALOGUE OF THE PERSIAN MSS. IN THE ASIATIC SOCIETY OF BENGAL. WLADIMIR IVANOW, CALCUTTA, 1926.

59- فہرست نسخ خطی فارسی اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور کی بہ مراۃ العلوم۔ مرتبہ مولوی عبدالمقتدر۔ پٹنہ جلد اول 1925ء ص 98

60- A SUPPLEMENTARY HANDLIST OF THE MUHAMMADAN MSS. IN THE LIBRARIES OF THE UNIVERSITY AND COLLEGES OF CAMBRIDGE. E.G. BROWNE. CAMBRIDGE. 1922. P.100

61- PROCEEDINGS AND TRANSACTIONS OF THE FIFTH INDIAN ORIENTAL CONFERENCE, LAHORE. VOL. ii, 1930, pp, 1164-----1203

62- SUPPLEMENT TO THE CATALOGUE OF THE PERSIAN MSS. IN THE BRITISH MUSEUM. CHARLES RIEU, LONDON, 1895, p.234

63- VERZEICHNESS DER PERSISCHEN HANDACHRIFTEN DER KOENIGLICHEN BIBLIOTHEK ZU BERLIN.WILHELM PERTSCH BERLIN,1888,p.936

64- مطبوعہ لکھنؤ۔ 1844ء (بحوالہ۔ ریو۔ جلد دوم ص 700) مطبوعہ لکھنؤ 1864ء۔ (مطبوعہ کانپور 1879ء بحوالہ A CATALOGUE OF THE PERSIAN PRINTED BOOKS IN THE BRITISH MUSEUM. EDWARD EDWARDS, LONDON, 1922, p,585)

65- آنے کے لیے 66- آنسو 67- جلا کر

68- پنجابی لفظ ہے۔ دیوار کی اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں دیا رکھا جاتا ہے۔ پنجابی میں اسے آلا بھی کہتے ہیں۔

69- اندر 70- میں 71- کہلاؤں

72- کڑنا پنجابی لفظ ہے جس کے معنی کسی چیز کو تیل میں پکانے کے ہیں۔ 73- پھیکوں

74- گرم 75- بلنا بمعنی جلنا 76- رلنا بمعنی ملنا

77- اکتائی ہوئی 78- پنجابی میں قسم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

79- نے 80- تیں 81- بھی

82- پنجابی لفظ بمعنی قیمت 83- کب 84- دادان (پنجابی)

85- پھینک کر 86- اور

87- مجموعہ نغز حصہ اول۔ ص 134 معیار الشعرا (بحوالہ گارسیں دتاسی۔ جلد سوم ص 2-4)

88- عمدہ منتخبہ۔ ص 165

89- نگارستان سخن۔ بھوپال۔ 1292ھ۔ ص 17

90- یعنی دکھن اور عراق کے شعراء

91- 582ھ (تذکرہ دولت شاہ لفت اقلیم آتش کدہ بحوالہ ریو جلد دوم۔ ص 559) 595ھ (مراۃ الخیال خلاصۃ الافکار بحوالہ ایضاً) 592ھ (نتائج الافکار ص 209)

92- AIN-I-AKBARI. TRANS. BY H.BLOCHMANN, CALCUTTA, 1873, Vol.i-pp-I-xxxv, 2nd Ed. EDITED BY D.C.PHILLOTT, 1929 pp.xxv LIX. SEE ALSO Vol.iii trans. by H.S.Jarret, 1894. Under some accounts of the Author.

93- اردو۔ جولائی 1929ء۔ ص 54-955 وقدیم اردو کراچی۔ 1961ء ص 92-74

94- 1059ھ (فہرست کتب خانہ سلطان ٹیپو۔ میجر سٹیوارٹ 1809ء)۔ 1076ھ (کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات نصیر الدین ہاشمی 1961ء۔ ص 97)

95- پھولبن۔ مرتبہ عبدالقادر سروری۔ حیدرآباد دکن۔ ص 171

96- اردو شہ پارے۔ ص 102

97- اردو۔ 1954ء۔ ص 13

98- رسالہ قدیم اردو۔ مدیر ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن۔ جلد اول 1965ء

99- نوائے ادب۔ جنوری 1967ء

100- (i) تاریخ فرشتہ۔ مطبوعہ نول کشور جلد دوم ص 36، 129-120

(ii) GAZETTEER OF THE BOMBAY PRESIDENCY. Vol. xvii. BOMBAY, 1884, p.368-370

(iii) IBID. Vol. xxiii, pp. 416-417, 678-679

(iv) BIJAPUR. HENRY COUSENS. POONA, 1889, pp. 99-103

(v) BIJAPUR AND ITS ARCHITECTURAL REMAINS. HENRY COUSENS, BOMBAY, 1916, p.9

(vi) مخزن۔ جولائی 1909ء۔ ص 56

101- معارف۔ فروری 1928ء ص 130۔ 6 مارچ 1928ء ص 209-194

102- تذکرہ نصر آبادی۔ مرزا محمد طاہر نصر آبادی اصفہانی۔ طہران 1317ھ۔ ص 231

103- HISTORY OF JAHANGIR. BENI PRASAD. 1922 pp. 130 AND 433 (ii) ZAMBAUR, Vol. i. p.300

104- سفینہ خوشگو۔ قلمی ورق 252ب (بحوالہ بوڈلین۔ ش 233)

105 THE MUHAMMADAN DYNASTIES. STANLEY LANE- POOLE WESTMINSTER 1894, p.328

106- مخزن الغرائب۔ احمد علی ہاشمی سندیلوی۔ بحوالہ بوڈلین ص 343

107- ماثر الامرا جلد اول 1888ء۔ ص 127-131

108- سرو آزاد۔ ص 49

109- ماثر الامرا جلد سوم 1891ء۔ ص 78-82

110- بحوالہ اشپرینگر ص 149۔ اب یہ نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے (برمن اسیتے جلد اول 354) سراج نے اس تذکرہ میں یہ التزام کیا ہے کہ ہر شاعر کے ساتھ اس کی تاریخ وفات بھی لکھ دی ہے۔ (پرشین لٹریچر سٹوری۔ جلد اول حصہ دوم ص 863) "منتخب دیوانہا" کا ایک ناقص الطرفین قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں موجود ہے (کلیات سراج۔ مرتبہ عبدالقادر سروری۔ دیباچہ ص 31) تفصیل کے لیے دیکھیے "شاہ سراج کا منتخب دیوانہا" عبدالقادر سروری (نوائے ادب بمبئی۔ جولائی 1960ء (۔ منتخب دیوانہا کے دیباچہ کی عبارت کے لیے دیکھیے گل رعنا ص 183۔ چمنستان شعرا۔ ص 299۔ تحفۃ الشعراء ص 23۔ مجمع النفائس۔ ذخیرہ شیرانی ورق 152 الف۔۔۔۔۔)

111- آتشکدہ۔ مطبوعہ ایران۔ ص 70۔ تحتی نوٹ

112- نتائج الافکار۔ 369-370

113- نتائج الافکار ص 401-406

114- صبح گلشن۔ سید علی حسن خاں۔ بھوپال۔ 1295ھ۔ ص 228

115- صبح گلشن' سید علی حسن خاں بھوپال۔ 1295ھ۔ ص 229

116- تذکرہ عشقی۔ مشمولہ دو تذکرے۔ جلد دوم ص 31

117- بحوالہ بحر الفصاحت۔ نجم الغنی رامپوری۔ نولکشور 1926ء۔ ص 28۔ یہ غزل زیر نظر بیاض میں بھی ہے لیکن اس میں شوقی' کی بجائے جانی' تخلص استعمال ہوا ہے۔ مکمل غزل آئندہ اوراق میں درج ہے۔ نجم الغنی رامپوری نے شوقی کی جو غزل اور عبارت نقل کی ہے اس کو مولف گخانہ جاوید' یعنی لالہ سری رام سے منسوب کیا ہے لیکن یہ غلط ہے۔ سید جالب دہلوی نے ایک تقریر جولائی 1912ء کی شام کو امرتسر کے مترو الاج کے سالانہ جلسے میں کی تھی جس کا موضوع "اردو زبان اور ہندو مسلمان" تھا۔ بعد میں یہ تقریر پیسہ اخبار' (2 اگست 1912ء) میں شائع ہوئی۔ اس مضمون میں سید جالب دہلوی نے وہی عبارت اور غزل درج کی ہے جو نجم الغنی رامپوری نے لالہ سری رام سے منسوب کی ہے۔ سید جالب دہلوی لکھتے ہیں کہ "ایک پرانی بیاض میں جو اس وقت میرے پاس موجود ہے منشی پیارے لال شوقی کی ایک غزل مندرج ہے جو عہد جہانگیر میں فارسی شاعر تھے اور اردو بھی کہنے لگے تھے" یہی عبارت بغیر کسی لفظی تبدیلی کے "بحر الفصاحت" میں منقول ہے اور اشعار بھی وہی ہیں جو جالب دہلوی نے درج کیے ہیں ویسے بھی مندرجہ بالا عبارت اور اشعار "خمخانہ جاوید" کی پانچوں جلدوں میں موجود نہیں۔

118- میر صابر کے تمام حالات شفیق اورنگ آبادی کے تذکرہ چمنستان شعراء (491-493) سے ماخوذ ہیں۔ انہوں نے میر صابر کے حالات ان کے ایک دوست حاجی میر علی اکبر رسال حاجی لاہوری کے حوالے سے لکھے ہیں۔ شفیق کی حاجی سے ملاقات حیدر آباد دکن میں ہوئی تھی (چمنستان شعراء' ص 150)۔ شفیق نے حاجی کے مفصل حالات زندگی لکھے ہیں (ص 148-158) حاجی کا یہ شعر پیش خدمت ہے ؎

روتی ہے رات دن ترے بس انتظار میں
روئیں نہیں تو کیا کریں آنکھیں نمانیاں

119- پنجاب میں اردو 1928ء ص 263
120- اتنا (ایضاً)
121- جہاں منہ سے بات نکلی (ایضاً)
122- ایضاً۔ پوری غزل میں یہی لکھا ہے۔
123- میرے بلانے سے تیرا کوچہ (ایضاً)
124- پر عاشقاں میں میری بدائی (ایضاً)
125- تو جیوں۔ پنجاب میں اردو 1928ء ص 266
126- دوکھ (ایضاً)
127- دوہائی (ایضاً)
128- کھلے بنداں گلے لگو (پنجاب میں اردو ص 266)
129- میں (ایضاً)
130- یہ شعر "پنجاب میں اردو" میں موجود نہیں۔
131- سنوگے (ایضاً)
132- تذکرہ شعرا۔ غنی فرخ آبادی۔ علی گڑھ 1916ء ص 79
133- محبوب الزمن میں آصفی ملکاپوری (جلد دوم۔ ص 214-213) لکھتے ہیں کہ جہانگیری زمانہ میں وارد ہند ہوئے۔ 1064ھ میں برہان پور میں وفات پائی۔
134- منتخب التواریخ عبدالقادر بن ملوک شاہ۔ مرتبہ کیپٹن ڈبلیو این لیس (Lees) و منشی احمد علی کلکتہ 1865ء۔ جلد دوم۔ ص 375 و انگریزی ترجمہ از کلکتہ۔ 1884ء جلد دوم ص 387
135- عرفی نے اپنے مشہور قصیدہ "ترجمۃ الشوق" میں یہ پیشگوئی کی تھی کہ وہ کہیں بھی مرے اس کا جسد خاکی نجف اشرف پہنچ جائے گا۔

بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم
اگر بہ ہند ملا کم کنی و گر بہ تتار

1027ھ کے واقعہ کی تاریخ رونقی ہمدانی نے عرفی کے مذکورہ شعر کے مصرعہ اولی میں ادنیٰ سا تغیر کر کے نکالی اور ایک قطعہ تاریخ نظم کیا۔ دیکھئے کلمات الشعرا۔ ص 174
136- طبقات شعرائے ہند۔ مولوی کریم الدین۔ 1848ء۔ ص 48
137- مجموعہ نغز۔ جلد دوم۔ ص 40۔ و معیار الشعرا ورق 468 الف و 550 ب و گارسیں دتاسی 'جلد سوم' ص 4
138- زیادہ دے
139- ٹھکانہ۔ دکھنی تصانیف میں ٹھار یا ٹھاؤں بھی استعمال ہوا ہے۔
140- اِدھر اُدھر۔ شمالی ہند کے ابتدائی اردو شعرا نے اسی طرح لکھا ہے۔
141- پوچھا
142- بات کو مذکر لکھا ہے
143- کب تک۔ دکنی زبان میں بھی مستعمل ہے۔
144- بیاض نمبر U-i/vii-33 ورق 3 ب
145- ورق 134۔ الف و 49 ب
146- کھڑ (پنجابی) بمعنی لے جا
147- ع جب مرگ کا پیالہ پیا آ کھ کھل گئی (پنجاب میں اردو۔ ص 262)
148- چودیہ (ایضاً)
149- عمرا (ایضاً)
150- جب عمر کی دو پہر ڈھلی (ایضاً)
151- چھوڑ (ایضاً)
152- یہ شعر "پنجاب میں اردو" میں موجود نہیں۔
153- تو تنگ نہالیوں سے مجھے گر نہ ہوا (پنجاب میں اردو۔ ص 262)

154- جب ایت زیر سیس دھری (ایضاً)

155- اس بیاض میں بہت سا پنجابی کلام منقول ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیاض نگار پنجاب ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ بیاض میں بعض سواہیر بھی موجود ہیں۔ ایک مہر 'عشق پیچ کی۔ عشق پیچ تخلص کے ایک شاعر کی اردو غزل بیاض کی ابتدا میں موجود ہے اور پنجاب کا شاعر معلوم ہوتا ہے۔ دوسری مہر فتح الدین کی ہے۔

156- گنوایا 157- سے۔ دکنی زبان میں بھی مستعمل ہے

158- یہ مصرعہ پنجابی زبان کے بہت قریب ہے۔ دراصل پنجاب کے قدیم اردو شعراء کی غزلیات اور منظومات میں پنجابی الفاظ و محاورات کی بہت کثرت پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ آیندہ سطور میں درج شدہ کلام سے ظاہر ہوگا۔

159- دامن سے 160- کیسے نبھے (؟)

161- نیند۔ قدیم دکنی تصانیف میں بھی اسی طرح مستعمل ہے

162- ہوئی 163- ساتھ 164- پنجابی لفظ بمعنی خواب

165- آنے دے 166- جسم

167- بمعنی معشوق یا محبوب۔ اس طرح کے الفاظ ہندی شاعری کے زیر اثر استعمال ہوتے ہیں۔

168- دوا۔ پنجابی میں دوا دارو بھی استعمال ہوا ہے۔ اس کے علاوہ دارو' بمعنی شراب بھی مستعمل ہے۔

169- جتنے 170- بہت۔ زیادہ

171- بیاض کے ورق 164 الف' ب' پر بھی یہ غزل درج ہے لیکن حاشیہ کٹ جانے کی وجہ سے صرف پہلے دو شعر پڑھے جاتے ہیں۔ دوسرے شعر کا پہلا مصرع اس طرح ہے:

یہ بیوفا ہیں لوگاں ان سیں کو ہت پاؤ

172- کہلا 173- بہ تخفیف 'کر'

174- تسبیح۔ دکنی تصانیف میں تسبی استعمال ہوا ہے۔ عموماً قدیم شعراء بعض الفاظ کو اسی طرح لکھتے تھے جس طرح عام بول چال میں مستعمل تھے۔

175- کہلائے 176- قافیہ تبدیل ہو گیا ہے

177- سے 178- کہیں

179- کہلایا 180- وہاں

181- طعنہ 182- امرت

183- بیاض مملوکہ لالہ سری رام میں یہ مصرعہ اس طرح ہے:

جن عشق میں سر نہ دیا جو جگ جیا تو کیا ہوا

184- خود 185- اوروں کو

186- کی 187- جیو میں نہیں پی کا درد بیٹھا مشائخ ہوئے کر

من کا رہٹ پھرتا نہیں سرن کیا تو کیا ہوا

188- جوگی و جنگم سیوڑا رنگ لال کپڑے پہر کے (بیاض لالہ سری رام)

واقف نہیں اس حال میں کپڑا رنگاتو کیا ہوا (بیاض مذکورہ)

189- جب عشق کے دریائے میں ہوتا نہیں غرقاب میں
گنگا بنارس دوارکا پگھٹ پھرا تو کیا ہوا (ایضاً)

190- مقالاتِ شیرانی۔ جلد دوم۔ ص 85-84

191- زرت بمعنی خون
192- آسرا

193- دیکھیے رسالہ 'اردو' جنوری 1929ء

194- سے
195- میں
196- سوکن

197- مجھے
198- تم
199- کچ

200- کہیں
201- ساتھی، دوست
202- کہیں

203- پنجابی میں بمعنی ٹھکانا یا آسرا مستعمل ہے
204- کہنے

205- اٹھ
206- خواہش
207- ڈب (پنجابی)

208- حاشیہ کٹ جانے کی وجہ سے عبارت پڑھی نہیں جاتی
209- تجھ

210- میرا
211- پڑی
212- پاس

213- کریں
214- کہاں سے
215- کون سا

216- دولہا
217- اٹھایا
218- گزارنا

219- اوپر
220- پڑا لی
221- اٹھ کر دے

(در: فنون (لاہور)، غالب نمبر، 1969ء)

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

پنجاب میں اردو
اردو کی کہانی، شیرانی کی زبانی

"پنجاب میں اردو" پہلی بار 1928ء میں شائع ہوئی۔ حافظ محمود خاں شیرانی اس وقت اسلامیہ کالج لاہور میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ اسی سال یونیورسٹی اورینٹل کالج میں اردو، ہندی اور پنجابی کی ایک ایک لیکچرارشپ قائم ہوئی تو پروفیسر شیرانی یکم اکتوبر 1928ء کو شعبہ اردو کے بانی استاد کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی میں آگئے۔ اب اردو کی تحقیق کا مسئلہ ذوقی ہونے کے علاوہ ان کا منصبی معاملہ بھی بن گیا۔ اپنی مذکورہ بالا اولیں اردو تالیف میں شیرانی نے پنجاب میں اردو کے آغاز کا معرکہ آرا نظریہ پیش کیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے کئی تحقیقی مضامین میں، جو "اورینٹل کالج میگزین" میں چھپتے رہے، لسانی مباحث کا یہ سلسلہ جاری رکھا جس میں اپنے پیش کردہ نظریے کی توثیق کی اور اپنی بعض آراء اور تحقیقات میں ترمیم و اضافہ بھی کیا۔ لسانیات کی تاریخ میں پروفیسر شیرانی کا نظریہ چودھویں صدی ہجری کا اہم ترین علمی تحفہ تھا۔ بعد میں ہونے والی عالمانہ لسانی تحقیقات کا بے لاگ جائزہ لیا جائے تو شیرانی کا یہ علمی تحفہ پندرھویں صدی ہجری اور آنے والے زمانوں میں بھی اپنی تازگی و توانائی کے ساتھ دعوت فکر دے رہا ہوگا۔

شیرانی سے پہلے اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں دو طرح کی آراء ملتی ہیں۔ ایک تو قدیم مصنفین (میرامن سے سرسید تک) کی آراء جن میں اردو کی پیدائش کا رشتہ اکبر اور شاہجہاں بادشاہوں کے درباروں سے ملایا گیا ہے۔ بزرگوں کے ان بیانات کو شیرانی تبرک کے طور پر اپنی کتاب میں درج تو کرتے ہیں، لیکن انہیں سنجیدہ بحث کے لیے قبول نہیں کرتے۔ شیرانی کے نزدیک اردو کی داغ بیل اسی دن سے پڑنی شروع ہو گئی تھی، جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر توطن اختیار کر لیا[1]۔ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد بحث کا موضوع یہ ہو جاتا ہے کہ یہ مرحلہ کب اور کہاں سے شروع ہوا؟ اس مسئلے پر شیرانی سے پہلے ملکی باشندوں میں مولوی محمد حسین آزاد اور مغربی ماہرین میں پروفیسر ہارنل، جان بیمز، جارج ابراہام گریرسن، جیولز بلوخ سمیت کچھ اور لوگ بھی آجاتے ہیں۔ آزاد نے "آب حیات" میں لکھا: "اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔"[2] آزاد نے جس سیاق میں

ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا ہے' اس سے مراد ایک محدود علاقہ ہے۔ آزاد کے اس بیان کی تائید حکیم شمس اللہ قادری تک بعض مصنفوں نے کی[3] لیکن شیرانی کی پُر زور مدلل اور مسکت تردید کے بعد اس نظریے کو خارج از بحث قرار دے دیا گیا۔ مغربی مصنفین نے بھی پہلے تو انہی سطحی روایات ونظریات کو قبول کرنا شروع کردیا تھا۔ پھر وہ دہلی اور نواح دہلی کی بولیوں (کھڑی' ہریانی) میں اردو کے آغاز وارتقا کے نشانات تلاش کرنے لگے۔ اس سلسلے میں سر جارج ابراہام گریرسن کا ''جائزہ لسانیات ہند'' بہت بڑا کارنامہ ہے جو کئی ضخیم مجلدات میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کارنامے کی بنا پر شیرانی انہیں لسانیات ہند کا دیوتا بھی قرار دیتے ہیں[4]۔ گریرسن نے ہندوستان کی موجودہ زبانوں کی ساخت کے بعض پہلوؤں پر یہ مفروضہ قائم کیا کہ آریا یہاں دو گروہوں کی صورت میں آئے۔ گریرسن سے پہلے یہی نظریہ ہارنل 1880ء میں پیش کرچکے تھے' لیکن اس فرق کے ساتھ کہ ہارنل صاحب بعد میں آنے والے آریاؤں کو گنگا وجمنا کی وادی مدھیہ پردیش میں پہنچا دیتے ہیں اور گریرسن صاحب اس کے برعکس نوواردآریاؤں کو مدھیہ پردیش کے اردگرد نیم دائرے کی شکل میں پنجاب' سندھ' وسطی ہند' بہار' اڑیسہ میں پھیلا دیتے ہیں۔ اس طرح ایک اندرونی آریہ بن گئے' دوسرے بیرونی آریہ۔ ہارنل صاحب کی بات مانی جائے تو بیرونی آریہ قدیم ہوئے اور گریرسن صاحب کی بات مانیں تو اندرونی آریہ قدیم ہوں گے۔ بہرکیف اس مفروضے کی بنیاد پر مغرب کے ان ماہرین لسانیات نے ہند آریائی زبانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرکے اندرونی حلقے اور بیرونی حلقے کی زبانیں قرار دے دیا۔ لاہور کے آس پاس خط فاصل کھینچ کر مغربی پنجاب کی زبان کو گریرسن نے لہندا کا نام دیا اور مشرقی پنجاب کی زبان کو مغربی ہندی کی شاخ قرار دیا' لیکن مشرقی اور مغربی پنجابی کو دو الگ الگ زبانیں قرار دینا ایک ایسی عالمانہ بوالعجبی تھی جو شیرانی جیسے باریک بین محقق کی نگاہ سے پوشیدہ نہ رہ سکتی تھی۔ چنانچہ مغربی ماہرین کی اس کمزور رگ پر انہوں نے فوراً ہاتھ رکھ دیا:

> ''مغربی مورخین نے شمالاً وجنوباً ایک خط کھینچ کر مشرقی ومغربی پنجابی میں اسے تقسیم کردیا ہے۔ مشرقی حصہ کی زبان کا نام پنجابی رکھا ہے اور مغربی حصے کی زبان کا نام لہندا۔ پنجابی کو وہ مغربی ہندی میں شامل کرتے ہیں اور لہندا کو بیرونی دائرے میں داخل کرکے سندھی اور کشمیری کا رشتہ دار مانتے ہیں۔ اہل پنجاب یہ فرق تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا بیان ہے کہ پنجابی اور لہندا ایک ہی چیز ہے۔ مغربی اور مشرقی زبان میں جو فرق ہے' وہ اصولی نہیں ہے بلکہ تدریجی اور ضلع ضلع کی مقامی خصوصیات کی بنا پر پیدا ہوتا چلا گیا ہے اور یہ تقسیم ہر حال میں ناجائز ہے۔''[5]

اس اندرونی اور بیرونی گروہی مفروضے کے بارے میں خود مغربی محققین بھی مطمئن نہیں تھے۔ خصوصاً پنجاب کی یہ لسانی تقسیم ان کے مفروضے کا کمزور ترین حصہ تھی' لیکن اکثر غربی مصنفین کا المیہ یہ ہے کہ وہ

ایک لغزش کرنے کے بعد پھر اس کے اثبات کی خاطر مزید لغزشوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اپنے اس استدلال کی کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے ایک عجیب و غریب منطق وضع کی ہے کہ پنجابی زبان کی ہمسایہ ہندوستانی زبان جو مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے' ایک زمانے میں تمام مشرقی پنجاب میں پھیل گئی اور اس صوبے کی اصل زبان لہندا کو ہٹاتی ہوئی یا اس پر چھاتی ہوئی دریائے چناب تک پہنچ گئی' بلکہ بعض اوقات اس کا اثر جہلم تک محسوس ہوتا ہے۔ اس لسانی حرب و ضرب کے نظریے کو ہمارے بعض دیسی جدید ماہرین لسانیات نے اپنے بدیسی مغربی استادوں سے لے کر جنگ چیاول کا جو منظر پیش کیا ہے' وہ مضحکہ خیز ہونے کے باوجود دلچسپ اور قابل دید ہے۔ ذرا اسے ملاحظہ فرمائیے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری' حافظ محمود خان شیرانی کے نظریے کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اردو اور پنجابی ان تمام لسانی مشابہتوں کے باوجود' جن کا ذکر مولانا محمود شیرانی تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں کرتے ہیں' مزاج اور ساخت کے اعتبار سے مختلف زبانیں ہیں۔ ان میں اصلی اور نسلی امتیازات ہیں جو ان کے مختلف النسل ہونے کی گواہی دیتے ہیں اور صاف صاف چغلی کھاتے ہیں کہ یہ زبانیں ایک گھرانے کی نہیں دو گھرانوں کی ہیں۔ ایک نسل کی نہیں دو نسل کی ہیں..... گریرسن نے جدید آریائی زبانوں کے دو گروہ بنائے ہیں جو دراصل ہند آریائی زبانوں کی دو نسلیں ہیں' اندرونی اور بیرونی..... گریرسن پنجابی کو اصل و نسل کے اعتبار سے بیرونی خاندان کا ایک فرد بتاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مغربی پنجابی سے ملتی جلتی کوئی زبان اس علاقے میں رائج تھی جہاں آج پنجابی کا راج ہے۔ پنجاب کے مشرقی گوشے سے لے کر مغربی گوشے تک یہ ملی جلی اور بڑی حد تک یکساں زبان بولی جا رہی تھی کہ اچانک دوآبہ گنگ وجمن کے زیریں علاقے سے موجودہ ہندوستانی (اردو) کی کسی قدیم شکل نے ابھر کر پنجاب پر چھاپہ مارا اور قدیم مغربی پنجابی کو دریائے چناب کے نصف بالائی حصے سے پرے دھکیل کر پنجاب پر قابض ہو گئی۔ پنجابی قدیم ہندوستانی کی اس چیرہ دستی کی پیداوار ہے[6]۔''

ہم 'اہل زبان' کی فاتحانہ یلغاروں کو آج تک ایک ادبی لطیفے کے طور پر سنتے آئے ہیں[7] یہ معلوم نہیں تھا کہ مغربی ماہرین لسانیات اور ان کے بعض دیسی پیروکار اس ادبی چٹکلے کو لسانی تحقیقات جیسے سنجیدہ مسئلے سے یوں چپکا دیں گے کہ یہ مسئلہ ایک بھول بھلیاں بن کر رہ جائے گا۔

ڈاکٹر مسعود حسین خان اس داستان کو بہ انداز دگر یوں رقم فرماتے ہیں:

''پروفیسر محمود شیرانی نے ''پنجاب میں اردو'' لکھتے وقت اس لسانیاتی حقیقت کو بالکل

فراموش کر دیا ہے کہ گجراتی اور راجستھانی کی طرح پنجابی زبان کا تعلق بھی قدیم زمانے میں زبانوں کی بیرونی شاخ سے تھا' جس کے نشانات جدید پنجابی تک میں ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ موجودہ پنجابی کی ساخت اس بات کا بھی پتہ دیتی ہے کہ اس پر کسی زمانے میں اندرونی زبان' مدھ دیش کی زبان (جس کی نمائندہ بولیاں آج کل برج بھاشا اور کھڑی بولی ہیں) کی چھاپ نہایت گہری پڑ چکی ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں اس بات سے ملتا ہے کہ لہندا اور پنجابی کے درمیان خط فاصل قائم کرنا نہایت دشوار ہے۔ دونوں زبانیں اس غیر محسوس طریقہ پر گھل مل جاتی ہیں کہ گریرسن کو یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ دراصل کسی زمانے میں سارے پنجاب پر لہندا کی ایک نہ ایک شکل چھائی ہوئی تھی' جسے اندرونی زبان نے (شاید ہندوستانی کی کسی قدیم شکل نے) پیچھے دھکیلنا شروع کیا اور رچنا دوآب تک ہٹا دیا۔ اس اندرونی زبان کے نشانات لہندا میں سندھ ساگر دوآب تک پائے جاتے ہیں۔ اندرونی زبان کا رنگ' جوں جوں ہم مشرق کی طرف آتے ہیں' گہرا ہوتا چلا جاتا ہے' اسی لیے پنجابی کو گجراتی اور راجستھانی کی طرح ملواں زبان مانا گیا ہے۔ گریرسن نے اپنی بعد کی تحریروں میں صاف طور سے زبانوں کی درمیانی صف میں جگہ دی ہے۔ اس کی تائید میں اس تاریخی حقیقت کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ فتوحات کا بہاؤ ہمیشہ شمال مغرب سے دوآبہ کی طرف رہا ہے' لیکن سیاسی اقتدار کا مرکز ہر عہد میں گنگا جمنا کے میدانوں میں رہا ہے' جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا رہا ہے کہ دوآبہ کی زبانیں اپنے تنگ علاقوں سے نکل کر آس پاس کی زبانوں پر چھاپہ مارتی رہی ہیں اور اس طرح ان پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔ مسلم عہد میں تو پنجاب اور گجرات کی حیثیت ہمیشہ صوبوں کی رہی ہے جو ہمیشہ مرکز سے تمدنی اور لسانی اثرات قبول کرتے رہے ہیں[8]۔''

''مسلم عہد'' سے مراد اگر یہاں مغل عہد ہوتا' تو تمدنی اور لسانی اثرات قبول کرنے کی یہ بات تاریخی واقعات کے لحاظ سے ایک حد تک درست ہوتی' لیکن عہد سلاطین میں پنجاب کی حیثیت محض ایک صوبے کی نہیں تھی' بلکہ طاقت کے سرچشمے کی تھی جو مختلف ادوار میں مرکز سلطنت (دہلی) کو نئی سیاسی قوت سے سیراب کرتا رہا۔ پروفیسر شیرانی اردو کے آغاز وارتقا میں اس تاریخی حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہیں اور مرکز پر پنجاب کے لسانی اثرات کو ان تاریخی واقعات کے حوالے سے بھی دیکھتے ہیں:

''ہند میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سیاسی واقعات کا بہاؤ شمال سے زیادہ تر جنوب کی طرف رہا ہے۔ سیاسی واقعات' نیز مغلوں کے دباؤ کے زیر اثر آٹھویں اور نویں صدی

ہجری میں بڑے بڑے گروہ پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی اور اس کے نواح میں آباد
ہوتے رہے ہیں۔ بارہویں صدی میں سکھ پنجاب سے نکل کر اردو، بانگڑو اور بیکانیری
علاقوں میں گھس جاتے ہیں۔ ان واقعات کے سامنے ہندوستانی زبان کے شمال کی
طرف بڑھنے اور لہندا کو پیچھے دھکیلنے کا کوئی مناسب موقع نظر نہیں آتا۔''[9]

برصغیر کے نامور ماہر لسانیات پروفیسر سنیتی کمار چیٹر جی اس امر میں پروفیسر شیرانی سے متفق ہیں۔ وہ گریرسن اور اس کے پیروکاروں کے اس جنگجویانہ نظریے کے برعکس پنجاب کی سیاسی، تہذیبی اور لسانی بالادستی کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"The stream of linguistic influence has flowed in India generally from the West, from the Panjab, the fountain-head of Aryan influence and expansion in India, to the East; and this predominance is partly traditional, partly due to the energy of the Panjab people, and to some extent to the fact that when Hindi .was evolving, Panjab Muhammadans had a big voice in the centres of Muhammadan rule in North India- at least in the early period of Turki and Indian Muhammadan rule in North India." [10]

اندرونی اور بیرونی آریاؤں کی اس مفروضہ گروہ بندی کا بطلان پروفیسر سنیتی کمار چیٹر جی نے بڑے مسکت لسانی دلائل سے کیا۔ پی' مزمدار بھی ان کے ہم خیال ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے جدید ماہرین لسانیات جو شیرانی کے نظریے کی تردید میں بڑی شد ومد سے کام لیتے ہیں' ایک طرف چیٹر جی کے لسانی استدلال سے بھی متاثر ہوتے ہیں اور دوسری طرف گریرسن کے ان مفروضوں کا بھی سہارا لیتے ہیں' جن کو چیٹر جی اور مزمدار رد کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا ایک اقتباس ہم اوپر پیش کر آئے ہیں جو انہوں نے گریرسن کی پیروی میں لکھا ہے۔ اب ان کی اسی کتاب سے ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیے جس میں وہ چیٹر جی کے استدلال کو قبول کرتے ہوئے گریرسن کے موقف سے انحراف کرتے ہیں:

''گریرسن نے اس سلسلے میں تاریخی استدلال بہت کم پیش کیا ہے۔ صرف مذکورہ بالا
لسانی مفروضات پر وہ زبانوں کی اس گروہ بندی کو صحیح سمجھتا ہے۔ لسانیات کی دنیا میں
گریرسن کی تحقیق کے اس حصے سے جتنا اختلاف کیا گیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آریائی

زبانوں کے نئے محققوں نے مبسوط لسانیاتی دلائل سے گریرسن کے اس نظریے کا بطلان پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر چیٹرجی کا نام پیش پیش ہے۔ بی مزمدار کا خیال ہے کہ گریرسن ہندوستان کی قدیم زبانوں سے کما حقہٗ واقف نہ تھا۔ اس کے لسانی فیصلے قول فیصل کا حکم نہیں رکھتے [11]۔ ان کا خیال ہے کہ گریرسن نے اپنے نظریے کی تائید میں فرہنگ اور صوتیات پر غیر معمولی زور دیا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ زبان کے کینڈے کو سمجھنے میں ان سے کہیں زیادہ اس کی صرفی اور نحوی قاعدوں سے مدد ملتی ہے۔

گریرسن کے بعض لسانی دلائل کا بطلان:

(1) س کا میں تبدیل ہو جانا بیرونی زبانوں کی خصوصیت نہیں ہے۔ اس کی مثالیں خود مغربی ہندی (خالص اندرونی زبان) میں مل جاتی ہیں.....

(2) بیرونی زبانوں کی مغربی ہندی میں بھی علامتوں کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ بنگالی اور مرہٹی کی طرح اس میں بھی بعض اوقات لفظ کو توڑ مروڑ کر علامتوں کا مفہوم نکال لیا جاتا ہے۔ مثلاً اردو میں "آنکھوں" بہ معنی "آنکھوں سے"..... پرانی اردو میں (میں نے) کی جگہ ہمیشہ (میں) استعمال ہوتا تھا۔ اب بھر تش کی یہ روایت میر وسودا کے زمانے تک قائم رہی ہے..... اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ جن لسانی اصولوں کو بیرونی زبانوں کی خصوصیت گردانا گیا ہے وہ تھوڑی بہت اندرونی زبانوں میں بھی پائی جاتی ہیں..... چنانچہ ہمیں یہاں گریرسن سے اختلاف کرتے ہوئے چیٹرجی کی اس رائے سے متفق ہونا پڑتا ہے کہ اندرونی، بیرونی زبانوں کی یہ تقسیم لسانی اعتبار سے اتنی ہی مہمل ہے جتنی کہ تاریخی استدلال سے [12]۔"

طوالت سے بچنے کی خاطر ہم نے مثالیں چھوڑ دی ہیں۔ گریرسن اور چیٹرجی کی مختلف آراء کو ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے حسب منشا استعمال کر کے تضادات کو جس طرح جمع کیا ہے، اس میں ان کا موقف کچھ الجھ کر محض شیرانی کی مخالفت برائے مخالفت ہو کر رہ گیا ہے۔ شیرانی کی یہ مخالفت بعض جدید ماہرین لسانیات کا مسلک بن جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔ پہلے شیرانی کے نقطۂ نظر کو اختصار سے پیش کیا جاتا ہے اور اس سلسلے کی تائیدی شہادتیں ساتھ ساتھ دی جاتی ہیں۔

حافظ محمود خان شیرانی "پنجاب میں اردو" کے مقدمے میں اردو کے آغاز کے سلسلے میں مغربی ماہرین لسانیات (گریرسن وغیرہ) کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"کہا جاتا ہے کہ مغربی ہندی جس کی برج بھاشا، ہریانی، راجستھانی، پنجابی اور اردو شاخیں ہیں، قدیم پراکرت سوراسینی کی یادگار ہے، لیکن جس زبان سے اردو ارتقا پاتی

ہے وہ نہ برج ہے نہ ہریانی اور نہ قنوجی' بلکہ وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ ہمیں بہ تحقیق معلوم نہیں کہ جب مسلمان دہلی میں آباد ہوئے اس وقت اس علاقے میں کیا زبان بولی جاتی تھی؟ آج دیکھا جاتا ہے کہ دہلی کے قریب ہی تین زبانوں میں یعنی ہریانوی' برج اور راجستھانی کا سنگم ہوتا ہے اور گریرسن نے تو صاف دہلی کو ہریانوی زبان کے علاقے میں شامل کر دیا ہے۔ مگر راقم کی رائے میں ہریانوی کوئی علیحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہے بلکہ وہ پرانی اردو ہے۔ یعنی وہی ہے جو گیارہویں صدی ہجری میں خود دہلی میں بولی جاتی تھی۔ اس میں اور اردو میں بہت کم فرق ہے۔ اگر ہم اس کو اردو نہ مانیں تو اردو کی شاخ ماننے میں تو ہمیں عذر نہیں ہونا چاہیے۔ بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ اسلامی دور میں دہلی کے اثرات میں بنی ہے[13]۔

''اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ دہلی میں مسلمانوں کی آمد کے وقت کون سی زبان بولی جاتی تھی؟ یا وہ راجستھانی ہوگی یا برج؟ اس میں شک نہیں کہ آج دہلی' میرٹھ' مظفر نگر' سہارن پور یا دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ دوآبہ میں اردو بولی جاتی ہے' لیکن اب سے تین صدی پیشتر اس علاقے کی یہ زبان نہ تھی' بلکہ یہاں برج کا طوطی بول رہا تھا۔[14]''

اس سوال پر شیرانی یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ:

''اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں' اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں۔''

اپنے اس نظریے کے ثبوت میں کسی قدیم شہادت یا سند کی عدم موجودگی میں پروفیسر شیرانی سیاسی واقعات کے منطقی بہاؤ اور اردو زبان کی ساخت (پنجابی اور اردو کی لسانی مشابہت) کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں اور پھر ''پنجاب میں اردو'' کے بعد لکھے گئے مقالات میں ان کی کوشش یہ رہی کہ اسلامی عہد میں لکھی گئی قدیم فارسی تالیفات (تاریخ' تذکرے' لغات وغیرہ) کی چھان بین اس نقطۂ نظر سے کریں کہ اس سے اردو کی قدامت اور پنجابی سے مماثلت کو بطور شہادت لسانی پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اردو اپنی صرف و نحو میں ملتانی زبان کے بہت قریب ہے۔ دونوں میں اسماء و افعال کے خاتمے میں الف آتا ہے۔ دونوں میں جمع کا طریقہ مشترک ہے۔ یہاں تک کہ دونوں میں جمع کے جملوں میں نہ صرف جملوں کے اہم اجزاء بلکہ ان کے توابعات و ملحقات پر بھی ایک ہی قاعدہ جاری ہے۔ دونوں زبانیں تذکیر و تانیث کے قواعد' افعال مرکبہ و توابع

میں متحد ہیں۔ پنجابی اور اردو میں ساٹھ فیصد سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں[15]۔"

اور اپنے موقف کی تائید میں اردو' پنجابی کی مطابقت و مماثلت اور برج بھاشا سے اختلاف کے بارے میں لسانی نقطہ' نظر سے طویل جرح و تعدیل کے بعد (جس کی مختصر تفصیل آیندہ صفحات پر پیش کی جائے گی) شیرانی یہ نتائج اخذ کرتے ہیں:

"اردو کے لیے اہل پنجاب کی طبعی مناسبت اور قدیم اردو پر پنجاب کا اثر دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اردو پنجاب کے کسی خطے یا ضلع کی زبان تھی؟ اس سوال کا کوئی قطعی جواب ہمارے پاس موجود نہیں' لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ پنجابی اور اردو میں ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں قریب ترین مماثلت موجود ہے۔ ان کی صرف و نحو اہم قواعد و مسائل میں باہم مطابقت ہے اور ساٹھ فیصدی سے زیادہ الفاظ ان میں مشترک ہیں۔ مزید براں جن امور میں یہ زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں' ان میں ہمیں اضافت کو بھی محسوب کرنا چاہیے۔ مثلاً اردو کی اضافت "کا"۔ "کے"۔ "کی" کے بجائے پنجابی میں "دا"۔ "دے" اور "دی" آتا ہے۔ اگرچہ تصریف میں دونوں زبانیں متفق ہیں۔ گویا کاف اردو کے ساتھ اور دال پنجابی کے ساتھ مخصوص ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی اضافت ایک زمانے میں پنجاب میں رائج تھی۔ اس کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم دستاویز موجود نہیں' لیکن جب ہم پنجاب کے دیہات و قصبات پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بیسیوں موضعوں اور قصبوں کے نام کے ساتھ وہ جز و کلمہ بن رہی ہے۔ مثلاً ڈسکا' فاضلکا' امروکا' نتھوکا' پٹھنکا' ویرکا' جاکے' جنڈوکے' خاکے' کالے کے' کاموکے' جن کے' ابھوکے' ماچھی کے' منجو کے' مرید کے' سادھو کے' دیرکے' پنچو کی ملیاں' بدوکی' اردوکی' چتوکی' تارکی' خائی' جھامکی' کیموکی' رحیم کی چوپڑی وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے نام پنجاب میں کثرت کے ساتھ ملتے ہیں۔ یہ امر ظاہر ہے کہ جس تیزی سے زبان بدلتی ہے' اس تیزی کے ساتھ ملک کے جغرافیائی نام نہیں بدلا کرتے' اس لیے ان مقامات کے ساتھ اردو کی اضافت کا موجود ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اضافات پنجاب میں قدیم الایام سے ہیں اور ایک وقت استعمال میں آ رہی تھیں' لیکن جب موجودہ پنجابی کی لہر آ کر ملک پر چھا گئی' پرانی زبان کا شیرازہ بکھر گیا۔ یہ بھی یاد رہے کہ یہ اضافات نہ صرف جغرافیائی اسماء میں ملتی ہیں' بلکہ اور الفاظ میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً "پیکا" باپ کا گھر' اس کا مرادف میکا جس کی ترکیب بھی وہی ہے' اردو میں مستعمل ہے۔ نانکا' ننہیال' دادکا' ددھیال' ان میں تصریف بھی ہوتی ہے یعنی پیکے' نانکے اور دادکے۔

ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم اردو زیادہ تر پنجابی اثرات میں ہے۔ یعنی آج جن باتوں کی تشریح سے اردو عاجز ہے' پنجابی زبان آسانی کے ساتھ ان کی تشریح کر سکتی ہے[16]۔

سیاسی واقعات کے ضمن میں پہلی صدی ہجری کے اواخر میں سندھ اور ملتان کا اسلامی قلمرو میں آنا اور یہاں اسلامی تہذیب و تمدن کے فروغ کا آغاز ایک نمایاں واقعہ ہے۔ اگرچہ اس کے اثرات محدود رہے' لیکن

پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں غزنوی عہد سے اسلامی اثر و نفوذ کی رفتار تیز اور دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے 413ھ (م۔1022ء) میں پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے لاہور میں اپنا والی مقرر کر دیا۔ بقول شیرانی لاہور اس عہد کے مسلم ہندوستان کا مرکز بن گیا تھا۔ مسلمانوں کی نگاہ میں پنجاب ایک فتح کردہ ملک نہیں تھا' بلکہ وہ اس پر وطن کی حیثیت سے نظر ڈالنے لگے تھے[17]۔ علماء و صلحا' شعراء و ادبا اور دوسرے پیشوں کے لوگ یہاں بیگانوں کی طرح رہنے سہنے لگے تھے۔ اس سے شیرانی یہ استدلال کرتے ہیں:

> "آل غزنہ کی حکومت ہندوستان میں کم و بیش ایک سو ستر سال تک رہی ہے۔ اس عرصے میں مسلمان اور ہندو اقوام کی یکجائی سے ایک نئی زبان کا پیدا ہو جانا لازمی بات ہے۔ سرکاری ضروریات کی بنا پر بھی شاہی عہدیداروں اور ملازمین کے لیے اس ملک کی زبان سے واقف ہونا ضروری تھا۔ آخر غزنویوں کے قبضے میں تمام پنجاب' سندھ اور ملتان تھا۔ ہانسی' سرستی اور میرٹھ تک ان کے قبضے میں تھے بلکہ یوں کہیے دہلی کے قریب تک پھیلے ہوئے تھے۔ اتنے بڑے علاقے کے مالی و ملکی انتظام کے لیے عمال کو اس ملک کی زبان سیکھنی ضروری تھی۔ چونکہ لاہور ہند کا دار السلطنت تھا اس لیے ظاہر ہے کہ اس خطے کی زبان کو اس عہد کی حکومت اور مسلمانوں نے ترجیح دی ہوگی۔ یہ خیال کرنا کہ جب تک مسلمان پنجاب میں آباد رہے' انھوں نے کسی ہندی زبان سے سروکار نہ رکھا اور جب پنجاب سے دہلی گئے تب برج بھاشا اختیار کی' ایک ناقابل قبول خیال ہے جو عقل و درایت کے منافی ہے' اس لیے کہ ان کو نہ صرف سرکاری ضروریات کی بنا پر ایسی زبان کی ضرورت تھی بلکہ خود مسلمانوں کی اقوام کو بھی ایک دوسرے سے تبادلہ خیالات کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ تعلیم یافتہ گروہ کے لیے یہ مشکل فارسی نے حل کر دی تھی' لیکن ان کا غیر تعلیم یافتہ طبقہ جو ان کی آبادی کا جزو اعظم تھا' فارسی سے قطعاً نابلد تھا۔ یہ مسلمان چونکہ تازہ ولایت تھے' انھوں نے اس کا نام ہندی رکھ دیا[18]۔"

سلطان معز الدین محمد بن سام نے 582ھ میں لاہور فتح کیا اور ترائن کی جنگ (1192ء) میں رائے پتھورا کی شکست کے بعد دہلی و اجمیر مسلمانوں کے تسلط میں آ گئے۔ قطب الدین ایبک پہلے نائب السلطنت اور 1206ء سے خود مختار سلطان مقرر ہوا۔ شمالی ہند کی فتح کے بعد دار الحکومت لاہور کے بجائے دہلی میں منتقل ہو جاتا ہے۔ شیرانی کے نزدیک اس تبدیلی سے لاکھوں انسان پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی اور اس کے نواح میں آباد ہو گئے اور پھر یہ سلسلہ ایک طویل زمانے تک چلتا رہا۔ سلطنت دہلی پر جب کبھی ابتلا کا وقت آتا' پنجاب سے تازہ خون اس کی رگوں میں دوڑا دیا جاتا۔ خاندان غلاماں کے بعد خلجی' تغلق' سادات' لودھی یہ

سب ایسے حکمران خاندان ہیں جو پنجاب سے نکل کر دہلی جاتے ہیں' اس لیے پنجاب کے سیاسی اور لسانی اثرات صرف قطب الدین ایبک کے زمانے تک محدود نہیں رہتے بلکہ آیندہ دو تین سو سال تک پنجاب مرکز سلطنت دہلی پر چھایا رہا۔ سیاسی واقعات کے اس بہاؤ کے سلسلے میں پروفیسر شیرانی کا استدلال اتنا قوی ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دہلی اور نواح دہلی میں اہل پنجاب کا غلبہ اور وہاں کی زبان پر پنجاب کے لسانی اثرات کا ہونا ایک قدرتی عمل تھا اور اردو کے آغاز و ارتقا میں اس قدرتی عمل کو ایک امر واقع کی حیثیت حاصل ہے۔ پروفیسر سنیتی کمار چیٹر جی کے بیانات اس بارے میں شیرانی کے موقف کی تائید کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ چیٹر جی ''پنجاب میں اردو'' میں شیرانی کے اس استدلال سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ ''انڈو ایرین اینڈ ہندی'' کے سلسلے کے دوسرے لیکچر میں وہ لکھتے ہیں:

"The Turks who conquered Northern India in the 10th- 13th centuries were a group of foreigners who found themselves in an alien land where when they had once settled down they must acclimatise themselves sooner or later. The ruling classes spoke Turki (Eastern Truki or Cagatai dialact) at home, but they had been already sufficiently influenced and softened by their civilised subjects in what is now Afghanistan, viz., by the Persian, of the Eastern Iranian tracts as to have accepted the later's language as their offical and cultural language, to the exclusion of their mother tongue. With the Turkish conquerors came a host of their subjects from outside India, Persian-speaking soldiers and officials. The Pashto speaking Afghans as yet had not attained to an importance and they were, in the 12th century, an insignificant tribe living along the Sulaiman Mountains, who were not yet wholly Islamised. Round about Kabul, and on the Indo- Iranian borderland (in what is now Eastern Afghanistan, along the Indian frontier), the people were Hindus of the same race and language as the people of Western Panjab. These people have now become largely merged among the Pashto and Persian- speaking Muhammadans of Afghanistan.

The Turks and Persians thus came to India, and established themselves permanently with the Persian language; and as soon as they settled down in the country and in a generation began to take Indian wives, their Indianisation began: soldiers in a conquering army do not bring their wives with them. There were soon very few pure Turks and Iranians among these conquerors. In one generation their children were largely half castes, and the progressive Indianisation continues when their wives had to be Indians--- they became quadroons in the third generation, and octroons in the fourth, and their original foreign blood thus became quite negligible. Their Indianisation in speech commenced with the second generation, the mother tongue of sons and daughters of the Turki conquerors by Indian women had to be Indian languages. Numbers of Indians in the Panjab who adopted Islam from the first occupation of the Panjab by the Ghazna house supplied a ground or foothold for the Indianised Turks and Persians to take their stand upon. In those days of long and perilous travel, it is no wonder that people would be cut off from the fountain head of a particular type of culture which originated in a different and distant country. The Indianised foreign Muhammadans, who were also largely Indianised in blood, might cherish and passionately cling to the Persian language, literature and culture of their fathers and grand-fathers, but it was inevitable that they should accept an Indian language.

The language that they first adopted was naturally that current in the Panjab. Even in these days, there is not much difference between the Panjab dialects, particularly those of Eastern Panjab, from those spoken in the Western- most parts of the United Provences; and

eight or nine hundred years ago, we might imagine that the difference was still less. It is even likely that an almost identical speech was current in Central and Eastern Panjab (if not in Western Panjab) and Hindu Afghanistan as well and Western United Provinces.

Mahmud of Ghazna permanently added the Panjab to his empire, leaving the rest of India into which he had led plundering raids. A period of peaceful contact between the Persianising (although at home Turki- speaking) conquerors and the Panjabi people began. Hindus began to study Persian, and like the Hindu Tilak some rose to eminence under the Ghaznavid dynasty. Inspite of the iconoclasm of the Turki invaders, there were highly cultured people among them, like the scholar Al-Beruni, who studied Sanskrit and left a detailed and sympathetic account of India written during the first quarter of the 11th century. Mahmud of Ghazna actually wanted to approach his Indian subjects in their own language in his coins; witness his interesting silver dirham with the translation of the Arabic creed and his name and mint mark and date in the Hijra era, all in Sanskrit: *avyaklam ekam, Muhammada avatara; nrpati Mahamuda; ayam tanko Mahammudapure ghate hato Jinayana-samvat...* The indescribable is one, Muhammad is the incarnation (a rather free rendering of the Muhammadan creed); Mahmud the ruler of men: this coin or rupee has been struck in the mint at Mahmudpur: year... of the passing of the Jina. The translation of the name of the Hijra era (='Flight', i.e. the departure of the prophet,= *Jinayana*, the Arabic *rasul* or *nabi* being rendered by *Jina* in Sanskrit) is notewortthy. This rapprochement was continued by the Pathan ruler Shahabuddin Muhammad Ghori, who in his personal name of Muhammad bin Sam

struck coins employing the Indian Nagari character (Sri Mahamada Sama, Srihamira=amir) imitating the bull and horseman coins of the Hindu kings of Afghanistan, and even with the figure of the goddess Lakshmi. The atmosphere for the assimilation of the Turki and Iranian conquerors among the Indians was there: it did not succeed because of the frequent reinforcements of these conquerors from outside, which continually stiffened their attitude and so made them (at least among the section which led them) cling to their Islamic aloofness in matters religious, disdaining any overt compromise with what they looked down upon the idolatrous religion of an inferior conquered race: but nevertheless the local lanugage triumphed, making Indians of the conquerors and their descendants, and welding them into one people with the upper ranks of the Indians who were converted to Islam.

In the Panjab, the settled foreign conquerors, partly modified by the Indian environment during the 11th - 12th centuries, recevied a fresh influx of their Turki and Persian kinsmen in the 12th-13th centuries, when the Ghori house established itself in India after the defeat of Prithwiraj Chauhan, the last Hindu king of Delhi and Ajmer. The Turki Slave Dynasty began from 1206, when Qutbuddin Aibak became the first Muhammadan ruler of Northern India. Delhi became the capital, and the Panjab fell into the background. But it is likely that Panjabi Muhammadans who came to Delhi as followers of the Turki and Persian conquerors had the greatest importance of all the Indian groups in the new capital. They brought their dialect to Delhi: and their dialect, which agreed with those of the districts to the north and north-west of Delhi in some important matters, gave the tone and supplied some salient characteristics to the new *Verkehrssprache* or

Business Speech which came into being in the new capital city, which the native people of the Midland (Hindustan) and the Indianised Turks and Persians, and Moslemised Panjabis forming a good protion of the new-comers, could all speak."[19]

پروفیسر شیرانی سیاسی واقعات اور ان کے منطقی نتائج پر روشنی ڈالنے کے ساتھ اردو اور پنجابی کی لسانی ساخت (صرف ونحو) پر بحث کرتے ہیں اور ان کے مابین قرابت قریبہ کے شواہد پیش کرتے ہیں۔ شیرانی کے پیش کردہ لسانی شواہد کو اختصار کے ساتھ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

1- مصدر کا قاعدہ دونوں زبانوں میں ایک ہے یعنی علامت ''نا'' امر کے آخر میں اضافہ کردی جاتی ہے۔ قدیم زمانے میں اس کا رسم الخط دونوں زبانوں میں ''ناں'' تھا۔ بارھویں صدی کے اختتام کے قریب ایسے نون غنہ کو ترک کردیا جاتا ہے۔

2- تذکیر و تانیث کے قواعد دونوں زبانوں میں ایک ہیں۔ یعنی:

(الف) اکثر ایسے الفاظ جو ''الف'' پر ختم ہوتے ہیں تالیف کی حالت میں ''ی'' پر ختم ہوتے ہیں مثلاً:

بکرا' بکری' گھوڑا' گھوڑی' چنگا' چنگی' کالا' کالی' بوٹا' بوٹی۔

(ب) جب اسم مذکر حروف علت کے سوا حرف صحیح پر ختم ہو تو دونوں زبانوں میں تانیث کے لیے ''نی'' یا ''انی'' اضافہ کردیتے ہیں۔ مثلاً:

مغل' مغلانی۔ دیور' دیرانی' دیورانی۔ اونٹ' اونٹنی۔ فقیر' فقیرنی۔ ڈوم' ڈومنی۔

(ج) اگر مذکر ''ی'' پر ختم ہو تو مونث میں ''ی'' نون سے بدل جاتی ہے۔ مثلاً:

میراثی' میراثن۔ تیلی' تیلن۔ موچی' موچن۔ بھائی' بھین' بہن۔ جوگی' جوگن۔

3- علوم و اسمائے صفات دونوں زبانوں میں الف پر ختم ہوتے ہیں جبکہ برج بھاشا میں واو مجہول پر ختم ہوتے ہیں۔ مثلاً:

منڈا' لڑکا۔ گھوڑا' گھوڑا۔ چنگا' اچھا۔ نکا' چھوٹا۔ وڈا' بڑا۔ اُچا' اونچا۔

4- اسماء صفات تذکیر و تانیث اور جمع و واحد میں اپنے موصوف کی حالت کے مطابق ہوتے ہیں۔ مثلاً:

اردو= اونچا گھوڑا' میرا لڑکا' چھوٹی لڑکی' بڑے لڑکے' دوڑتے گھوڑے سے' چھوٹی لڑکیاں۔

پنجابی= اچا گھوڑا' میرا منڈا' نکی کڑی' وڈے منڈے' دوڑ دے گھوڑے توں' نکیاں کڑیاں۔

5- خبر تذکیر و تانیث واحد و جمع میں اپنے مبتدا کے موافق آتی ہے۔ مثلاً:

اردو= (1) یہ بات بھلی نہیں (2) یہ باتیں بھلی نہیں[20]

پنجابی= (1) ایہہ گل چنگی نہیں (2) ایہہ گلاں چنگیاں نہیں

6- فعل تذکیر وتانیث، واحد جمع میں اپنے فاعل کے مطابق ہے۔ مثلاً:

اردو=(1) گھوڑا آیا(2) گھوڑے آئے(3) عورت آئی(4) عورتیں آئیں[21]

پنجابی=(1) گھوڑا آیا(2) گھوڑے آئے(3) بڈھی آئی(4) بڈھیاں آئیاں۔

7- اضافت اپنے فاعل کی تذکیر وتانیث اور واحد جمع کے مطابق ہوتی ہے مثلاً:

اردو=اس میں کوٹھریاں رنگ برنگی ہیں۔ بعض چاندی کی، بعض یاقوت سرخ کی اور بعض زمرد کی.....

پنجابی= اودے وچ کوٹھریاں رنگ برنگیاں ہیں۔ بعض چاندی دیاں، بعضیاں یاقوت سرخ دیاں تے بعضیاں زمرد دیاں.....

یہاں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ کوٹھریاں جمع میں ہیں اور اضافت "کی" واحد ہیں، لیکن یہاں پھر اردو نے اپنے پرانے قواعد کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ بارہویں صدی ہجری میں بھی جملہ یوں لکھا جاتا تھا:

"اور اس میں کوٹھریاں رنگ برنگی ہیں۔ بعض چاندی کیاں، بعض یاقوت سرخ کیاں اور بعض زمرد کیاں"۔ (منقول از کتاب ہزار مسائل)

8- ماضی مطلق دونوں زبانوں میں ایک ہے۔ مثلاً:

اردو= وہ آیا۔ وہ آئے۔ تو آیا۔ تم آئے۔ میں آیا۔ ہم آئے۔ وہ آئی۔ وہ آئیں۔

(قدیم اردو "وہ آئیاں").....

پنجابی= اوہ آیا۔ اوہ آئے۔ توں آیا۔ تسی آئے۔ میں آیا۔ اسی آئے۔ اوہ آئی۔ اوہ آئیاں.....

9- ماضی قریب فعل امدادی کی تعریف سے بنتی ہے۔ یہاں پنجابی اور اردو میں کسی قدر اختلاف ہے:

اردو= وہ آیا ہے۔ وہ آئے ہیں۔ تو آیا ہے۔ تم آئے ہو۔ میں آیا ہوں۔ ہم آئے ہیں۔

پنجابی= اوہ آیا اے۔ اوہ آئے نیں۔ توں آیا ایں۔ تسی آئے او۔ میں آیا آں۔ اسی آئے آں۔

10- ماضی بعید بھی توابع کی تصریف سے بنتی ہے:

اردو= وہ آیا تھا۔ وہ آئے تھے۔ تو آیا تھا۔ تم آئے تھے۔ میں آیا تھا۔ ہم آئے تھے۔

پنجابی= اوہ آیا سی۔ اوہ آئے سن۔ تو آیا سیں۔ تسی آئے سو۔ میں آیا ساں۔ تسی آئے ساں۔

11- ماضی ناتمام میں بڑا فرق یہ ہے کہ پنجابی میں جہاں دال ہے، اردو میں نے بن گئی ہے۔

اردو= وہ مارتا تھا۔ وہ مارتے تھے۔ تو مارتا تھا۔ تم مارتے تھے۔ میں مارتا تھا۔ ہم مارتے تھے۔

پنجابی= اوہ ماردا سی۔ اوہ ماردے سن۔ توں ماردا سیں۔ تسی ماردے سو۔ میں ماردا ساں۔ اسی ماردے ساں۔

12- ماضی احتمالی دونوں زبانوں میں بالکل ایک ہے:

اردو= وہ کھاتا ہو۔ وہ کھاتے ہوں۔ تو کھاتا ہو۔ تم کھاتے ہو۔ میں کھاتا ہوں۔ ہم کھاتے ہوں۔

پنجابی= اوہ کھاندا ہوندے۔ اوہ کھاندے ہوں۔ تو کھاندا ہوویں۔ تسی کھاندے ہوو۔ میں کھاندا ہوواں۔ اسی کھاندے ہوئیے۔

13- مضارع دونوں زبانوں میں ایک ہے:

اردو= وہ آئے۔ وہ آئیں۔ تو آئے۔ تم آؤ۔ میں آؤں۔ ہم آئے۔[22]

پنجابی= اوہ آوے۔ اوہ آون۔ توں آویں۔ تسی آؤ۔ میں آواں۔ اسی آئیے۔

14- فعل حال کی تصریف دونوں زبانوں میں ایک ہی اصول پر ہے۔ ماضی ناتمام کی طرح یہاں بھی وال اور نے آپس میں بدلتی ہیں:

اردو= وہ کرتا ہے۔ وہ کرتے ہیں۔ تو کرتا ہے۔ تم کرتے ہو۔ میں کرتا ہوں۔ ہم کرتے ہیں۔

پنجابی= اوہ کردا اے۔ اوہ کردے نے۔ تو کردا ایں۔ تسی کردے او۔ میں کردا آں۔ اسی کردے آں۔

15- مستقبل کا اصول دونوں زبانوں میں ایک ہے۔ یعنی واحد و جمع میں گا اور گے کے اضافے سے بنتا ہے:

اردو= وہ آئے گا۔ وہ آئیں گے[23]۔ تو آئے گا۔ تم آؤ گے۔ میں آؤں گا۔ ہم آئیں گے۔

پنجابی= اوہ آوے گا۔ اوہ آون گے۔ تو آویں گا۔ تسی آؤ گے۔ میں آواں گا۔ اسی آواں گے۔

16- امر کا قاعدہ اردو اور پنجابی میں ایک ہے:

اردو= دیکھ۔ کھا۔ لا۔ دے۔ پی۔ نکل۔ جا

پنجابی= دیکھ۔ کھا۔ لا۔ دے۔ پی۔ نکل۔ جا

جمع مخاطب میں تعظیماً دونوں زبانوں میں ایک واؤ اضافہ کر دیا جاتا ہے:

جاؤ۔ کھاؤ۔ آؤ۔ اٹھو۔ چلو۔

17- مصدر بمعنی امر دونوں زبانوں میں مستعمل ہے:

اردو= پرکھنا۔ سرکنا۔ آنا۔ جانا۔ یاد رکھنا۔

پنجابی= پرکھناں۔ سرکناں۔ آوناں۔ جاوناں۔ یاد رکھناں۔

18- اردو میں امر کے بعد "یے" بڑھا کر مضارع اور امر کا مفہوم ادا کرتے ہیں۔ یہ دستور پنجابی میں بھی موجود ہے۔[24]

اردو= میر:

داد فریاد جا بجا کریے
شاید اس کے بھی دل میں جا کریے

پنجابی= وارث شاہ:

جدوں عشق دے کم نوں ہتھ لائیے پہلاں رب دا نام دہائیے جی
پھر نبی رسول پیغمبراں نوں دم دم درود پہنچائیے جی

اس صورت میں بعض اوقات ''ی'' ''جیم'' سے بدل بھی جاتی ہے اور ''جے'' بنا لیا جاتا ہے اور یہ شکل بھی دونوں زبانوں میں موجود ہے:

اردو= میر:

ملایا رب کہیں اس صید افگن سر بسر کیں کو
کہ افشاں کیجئے خوں اپنے سے اس کے دامن دیں کو

پنجابی= عبدالحکیم:

اکہن	یارو	کائی	تدبیر	کیجے
کدی	باہر	مڑ ہیجے	یار	دیجے

19- ''گا'' پنجابی میں حال کے معنی بھی دیتا ہے۔ اردو میں اگرچہ اب تحریر میں متروک ہے لیکن عوام بولتے ہیں۔ پرانے کلام میں موجود ہے:

اردو= وہ ہے گا۔ وہ ہیں گے۔ تو ہے گا۔ تم ہو گے۔ میں ہوں گا۔ ہم ہیں گے۔

پنجابی= اوہ ہے گا۔ اوہ ہیں گے۔ توں ہیں گا۔ تسی ہو گے۔ میں ہاں گا۔ ہم ہیں گے (ہانگے).....

20- دعائیہ اردو اور پنجابی میں ایک ہی طریق پر ہے:

اردو= تجھے سانپ ڈسے

پنجابی= تینوں سپ لڑے

21- لازمی و متعدی کا دونوں زبانوں میں وہی اصول ہے اور متعدی بالواسطہ کا بھی وہی قاعدہ ہے:

اردو= سیکھنا۔ سکھانا۔ سکھلانا۔ اٹھنا۔ اٹھانا۔ اٹھوانا۔ جگنا۔ جگانا۔ جگوانا۔ گلنا۔ گلانا۔ گلوانا۔

پنجابی= سکھنا۔ سکھاونا۔ سکھلاونا (سکھالنا)' اٹھنا۔ اٹھاونا۔ اٹھواونا' جگنا۔ جگاونا۔ جگواونا' گلنا۔ گالنا۔ گلواونا۔

اردو= ٹوٹنا۔ توڑنا۔ تڑوانا' جلنا۔ جلانا۔ جلوانا' پگھلنا۔ پگھلانا۔ پگھلوانا۔

پنجابی= ٹٹنا۔ توڑنا۔ تڑواونا' جلنا جالنا[25]۔ جلاونا' پگھلنا۔ پگھالنا۔ پگھلواونا۔

22۔ معروف و مجہول کا وہی طریقہ ہے۔ پنجاب میں بھی ''جانے'' کی تصریف سے مجہول بنایا جاتا ہے:

اردو= لڑکی ماری گئی۔ لڑکا مارا گیا۔

پنجابی= کڑی ماری گئی۔ منڈا مارا گیا۔

23- ندائیہ میں دونوں زبانیں متفق ہیں:

اردو= اے لڑکو۔ او لڑکیو۔ اے لڑکے۔ اے بھائیو۔ او بے رحم۔ او گدھے۔

پنجابی= اے یاو منڈیو۔ اے یانی کڑیو۔ او منڈیا۔ اے بھراؤ۔ او بے رحم۔ او کھوتیا۔

24- نفی کے وہی معمولی کلمے مثلاً نہ۔ نا۔ ناں۔ نہیں۔ نیں۔ ناہی۔ ناہیں۔ پنجابی میں بھی آتے ہیں' جو ایک زمانے میں اردو میں بھی مستعمل تھے۔

25- امدادی افعال کے ذریعے سے مختلف مقاصد کے اظہار کے لیے افعال مرکب بنا لینے کا طریقہ دونوں زبانوں میں رائج ہے۔ اردو میں اس کے لیے افعال آنا' ہونا' چکنا' لگنا' سکنا' بیٹھنا' پڑنا' دینا' لینا' ڈالنا' جانا' کرنا' چلنا اور کھانا وغیرہ زیادہ مستعمل ہیں۔ ان میں سے اکثر افعال پنجابی میں بھی یہی مطلب دیتے ہیں۔

عربی و فارسی الفاظ کی ترکیب سے جس طرح اردو میں بیشمار مصادر بنا لیے گئے ہیں' پنجابی میں بھی اسی طرح بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً روشن کرنا۔ قربان کرنا۔ خاموش کرنا۔ ہوش آنا۔ مقصود پانا۔ داغ پانا۔ گرفتار ہونا۔ حیران ہونا۔ سیر کرنا۔ آرام پانا۔ شور کرنا اور فرمان دینا وغیرہ۔

صرف و نحو میں اردو اور پنجابی کے اس اشتراک یا قرابت قریبہ سے پروفیسر محمود خاں شیرانی بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اردو اور پنجابی کی صرف کا ڈول تمام تر ایک ہی منصوبے کے زیر اثر تیار ہوا ہے۔ ان کی تذکیر و تانیث اور جمع اور افعال کی تصریف کا اتحاد اسی ایک نتیجے کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے اور جب سیانی ہو گئی ہیں' تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے۔ ان زبانوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے' وہ اکثر اس وقت واقع ہوا ہے جب اردو کی پرورش شعراء اور تعلیم یافتہ طبقے نے دہلی اور لکھنؤ میں شروع کی ہے۔ انہوں نے اپنی دانست میں اردو کی اصلاح کی۔ مگر اکثر موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ ان کی اصلاح اور ترمیم کے اصول نے ایک صرفی کے نقطۂ نظر سے زبان کے قواعد میں ابتری اور برہمی پیدا کر دی ہے۔ قدیمی اصول جن پر زبان کی تعمیر ہوئی تھی' جامع' مفید اور کار آمد تھے۔ پرانی جمع کے قاعدے کو انہوں نے بالکل بیکار اور باطل کر دیا۔ اقلیم زبان سے حروف علت و نون غنہ کے اخراج میں ہم ان سے متفق ہو سکتے ہیں' لیکن افعال و اسماء سے جمع مؤنث کے ترک کرنے میں ہرگز ہرگز حق بجانب نہیں۔ اس نے زبان سے موسیقیت اور خوش آہنگی کے ایک بڑے عنصر کو برباد کر دیا ہے۔ کیا کوئی شخص میرزا سودا کے ان اشعار کی خوشنوائی سے انکار کر سکتا ہے' جو پرانی طرز میں لکھے گئے ہیں[26]:

خاک و خوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں
اے فلک باتیں تیری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں
وہ رہا دست تاسف کے تئیں ملتا ہوا

جن نے وہ انکھیاں خمار آلودہ ملیاں دیکھیاں

صرفی لحاظ سے اردو اور پنجابی کی قرابت پر روشنی ڈالنے کے علاوہ پروفیسر شیرانی نے ایسے لسانی مواد کی بھی نشان دہی کی ہے جو دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو اور پنجابی میں عام ہے۔ شیرانی نے اس معاملے میں مروجہ اردو سے اعراض کر کے اردوئے قدیم (خصوصاً دکنی اردو جس کے ادبیات کی قدامت اردو میں سند ہے) سے نمونے پیش کیے ہیں۔

اردو اور پنجابی کے جملوں میں جمع کا اثر فاعل بلکہ اس کے متعلقات (اسمائے صفات' اضافات' حالیہ ضمائر افعال اور توابعات) تک پر آمر ہوتا ہے۔ مثلاً اردو کے اس فقرے کو مرنے والی لڑکیوں کی مائیں روتی روتی کہتی تھیں۔ پنجابی اور قدیم اردو میں یوں لکھا جائے گا:

پنجابی= ''مرن بالیاں کڑیاں دیاں ماواں روندیاں روندیاں کیہندیاں سن''

اردو قدیم= مرنے والیاں لڑکیاں کیاں مائیاں روتیاں روتیاں کہتیاں تھیاں''

گویا پورا فقرہ جمع کا گلدستہ بن گیا ہے[27]۔

صیغہ مستقبل کے لیے ''گا'' کے علاوہ پنجابی اور قدیم اردو میں ایک اور مستقبل ہے جو ''سی'' کی تصریف سے بنتا ہے۔ اس کا تعلق زیادہ تر لہندا اور ملتانی سے ہے۔ اس مستقبل کا صیغہ واحد غائب دکنی میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ مثلاً ملاوجہی کی ''سب رس'' میں: ''جس میں عشق کا کچھ درد اس کتاب کو سینے پرے ہلاسی تا اس کتاب بغیر اپنا وقت بہلاسی نا''۔ یہ صیغہ گجراتی اور راجستھانی زبانوں میں بھی ہے' لیکن بایائے مجہول' لیکن دکنی اور ملتانی میں بایائے معروف ہے' اس لیے ظاہر ہے کہ دکنی میں یہ صیغہ گجراتی وغیرہ سے نہیں آیا ہوگا۔

اردو کے بعض محاورے مثلاً مانگا تانگا' چپ چپاتا' دن دہاڑا' الٹا جلنا وغیرہ میں ثانی لفظ کو اردو والے تابع مہمل قرار دیتے ہیں جب کہ پنجابی میں تانگا (مصدر تانگنا سے مشتق اور مانگنا کے مترادف)[28] چپاتا (چپ کا مرادف)[29] دہاڑا (دن کے معنی میں)[30] (جلنا (جل' چلنے کے معنوں میں' ہندکو' پوٹھوہاری میں) بامعنی الفاظ ہیں اور اردو کے برخلاف پنجابی میں تنہا مستعمل ہیں۔ اسی طرح برتن بھانڈا' گوراچٹا' بھلا چنگا' موٹا جھوٹا' سنڈا مسنڈا میں بھانڈا' چٹا' چنگا' جھوٹا' مسنڈا پنجابی کے بامعنی الفاظ اور اردو محاورات میں تابع مہمل ہیں۔

بقول شیرانی اردو کے یہ محاورے ان ایام کی یاد دلاتے ہیں جب کہ مسلمان لاہور سے کوچ کر کے دہلی جا کر آباد ہو گئے ہیں اور اپنی زبان میں دہلی کی زبان کا پیوند لگا رہے ہیں' کیونکہ یہ محاورے ہندی الفاظ اور ان کے مرادف پنجابی الفاظ سے مل کر بنتے ہیں[31]۔

پنجابی زبان کی ایک عالمگیر خصوصیت یہ ہے کہ تمام ایسے الفاظ کہ جن میں ثانی حرف علت ہو' یہ تخفیف حرف علت تلفظ کیا جاتا ہے۔ مثلاً کان' ناک' ہاتھ اور لات پنجابی لہجہ میں کن' نک' ہتھ اور لت بن جاتے ہیں یا یوں کہنا چاہیے کہ ایسے الفاظ میں برج بھاشا میں پہلے حرف کے بعد حرف علت کا اضافہ کر دیا جاتا

ہے۔ مثلاً پگ پنجابی' بھاشا میں جا کر پاگ بن گئی۔ اردو میں جو پنجابی اور بھاشا کے بین بین ہے' اس قاعدہ کا اثر بہت نمایاں ہے اور دونوں زبانوں کا مقلد ہے۔ کبھی برج کی تقلید کرتی ہے اور کبھی پنجابی کی اور کبھی دونوں کی۔ مثلاً اردو میں جگنا بھی بولتے ہیں اور جاگنا بھی' لیکن اکثر موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ اردو کا میلان زیادہ تر پنجابی قاعدہ کی طرف ہے۔ پروفیسر شیرانی نے برج بھاشا' پنجابی اور اردو کے ایسے الفاظ کی ایک طویل فہرست[32] دی ہے' جن میں سے چند الفاظ یہاں درج کیے جاتے ہیں:

برج بھاشا	پنجابی	اردو
بیاکل	بکیل	بکیل
ماکھی	مکھی	مکھی
سانپ	سپ	سانپ
باجنا	بجنا	بجنا
بھانگ	بھنگ	بھنگ
ماچھر	مچھر	مچھر
سانچ' ساچ	سچ	سچ' سانچ
گاندھی	گندھی	گندھی
بادل	بدل	بادل' بدل
کھانڈ	کھنڈ	کھانڈ
کھچڑی	کھچڑی	کھچڑی
پاتھر	پتھر	پتھر
آگ	اگ	آگ
مائی	مٹی	مٹی
بھانڈ	بھنڈ	بھانڈ
مونگ	منگ	مونگ
چھاج	چھج	چھاج
پھول	پھل	پھول
گاڈی	گڈی	گاڑی
ریچھ	رچھ	ریچھ

بوڑھا	بڈھا	بڈھا' بوڑھا
کال	کل	کل
آنب' آم	انب	آم
تال	تل' تلا	تال' تالاب
جاٹ	جٹ	جاٹ
جھاگ	جھگ	جھاگ
کام	کم	کام

اس اصولی فرق کو پیش نظر رکھتے ہوئے پروفیسر شیرانی نے فارسی کی قدیم تصنیفات اور تاریخوں سے ایسے ہندی الفاظ سے جو اتفاقیہ ان میں آ گئے ہیں' اس امر کی توثیق کی ہے کہ خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں پنجابی کا دہلی کی زبان پر خاصا اثر تھا۔ چنانچہ دہلی میں لاکھ کو لک یا لکھ' کھاٹ کو کھٹ' کھانڈ کو کھنڈ' بھانڈ کو بھنڈ' آم کو انب' پاگ کو پگ بولتے اور لکھتے تھے[33]۔ شیرانی کا خیال ہے کہ اردو میں برج لہجہ سے پنجابی لہجے کا سخت مقابلہ رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی وقت میں ایک لفظ دونوں لہجوں میں بولا جا رہا ہے۔ مثلاً بادل اور بدل' بازار اور بزار' جہاج[34] اور جہج وغیرہ۔

پروفیسر شیرانی اس موقع پر ایک اہم مسئلہ اٹھاتے ہیں۔ وہ اس بحث کے اختتام پر لکھتے ہیں:

> ''یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ بالکل ممکن ہے کہ پرانی برج میں اور پنجابی میں کوئی فرق نہ ہو اور برج میں حرف علت کا اظہار بعد کی نشوونما ہو۔ اس کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ پنجابی میں یہ قاعدہ' یعنی حرف علت کی تخفیف' تقریباً مسلمانوں کی ہند میں آمد کے وقت بھی موجود تھا۔ عرب سیاحوں نے بعض ہندی الفاظ کا ذکر کیا ہے' جن میں انب اور زط بھی شامل ہیں۔ پنجاب میں انب آج بھی بولا جاتا ہے۔ باقی رہا زط' یہ پنجابی لفظ جٹ کی معرب شکل ہے۔ اردو میں برج کی تقلید میں جاٹ بولتے ہیں[35]۔''

پروفیسر سنیتی کمار چیٹر جی بھی اپنے ایک لیکچر The Development of New Indo-Aryan میں ہندی (اردو) اور پنجابی زبانوں کے اس صوتی اختلاف پر روشنی ڈالتے ہوئے شیرانی کے ہم خیال ہو کر ہندی پر پنجابی کے اثرات کا (خصوصاً ابتدائی مسلم دور میں) اعتراف کرتے ہیں۔ چیٹر جی ثانی حرف علت کے ہندی (یا برج) میں طویل اور پنجابی میں خفیف ہو جانے کی چند مثالیں بھی دیتے ہیں۔ پنجابی میں اس قسم کے بعض الفاظ کے آخر میں حرف صحیح کے مشدد ہونے کا ذکر کرتے ہوئے چیٹر جی اسے وسطی ہند آریائی دور کی ایک ایسی خصوصیت قرار دیتے ہیں' جسے پنجابی نے اب تک برقرار رکھا ہے' جبکہ ہندی میں نئے ہند آریائی دور میں آ کر ثانی حرف علت تو طویل ہو جاتا ہے' لیکن آخری حرف صحیح مشدد

ہونے کی بجائے اکہرا ہو جاتا ہے[36]۔

سنیتی کمار چیٹر جی مغربی اپ بھرنش کو نئی ہندی بھاشا کی بنیاد قرار دیتے ہوئے اسے پنجاب اور مغربی صوبجات متحدہ کی رائج الوقت زبان قرار دیتے ہیں جو اس زمانے میں اپنی پیش رو پراکرت یا وسطی ہند آریائی دور سے نئے ہند آریائی دور میں داخل ہو رہی تھی' لیکن چیٹر جی کے نزدیک تبدیلی کا یہ عمل ہندوستان میں ہو رہا تھا پنجاب میں نہیں' (اس تخصیص کی بظاہر کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی) اس لیے نئی بھاشا چند صدیوں تک سیال حالت میں رہنے پر مجبور تھی[37]۔

پروفیسر شیرانی نے اردو اور پنجابی کی چند مزید صوتی تبدیلیوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً پنجابی کی ''واؤ'' اردو میں ''بے'' میں بدل جاتی ہے (یہ خصوصیت بھی پنجابی کو غالباً وسطی دور کی پراکرت سے ورثے میں ملی ہے):

پنجابی	اردو	پنجابی	اردو
وچھڑا	بچھڑا	ویاج	بیاج
وال	بال	وجلی	بجلی
ورتاوا	برتاوا	وسنا	بسنا
وچار	بچار	وساکھ	بیساکھ
وگاڑ	بگاڑ	واری	باری
وکاؤ	بکاؤ	ور	بر
وات	بات	وچ	بیچ
وچھانا	بچھونا	ویری	بیری
وچھونا	بچھونا	ویر	بیر
وٹا	بٹہ	وس	بس (زہر)

پنجابی کی ''ہ'' اردو میں ''س'' سے بدل جاتی ہے:

کیہا	کیسا	ورہیا	برسا
جیہا	جیسا	تیہ	تیس
سوہرا	سسرا	چالیہ	چالیس
کوہ	کوس	ورہ	برس

پنجابی کی شروع کی ''ہ'' بعض صورتوں میں اردو میں ''الف'' سے بدل جاتی ہے:

ہک	اک' ایک	ہور	اور

پنجابی کی "دال" اردو میں "تے" سے بدل جاتی ہے:

دہاگا	تاگا	ماردا	مارتا
کردا	کرتا	سکدا	سکتا

اردو اور پنجابی کی ان صوتی تبدیلیوں اور صرفی ونحوی مماثلتوں کو اس زمانے (1928ء) کی دریافت شدہ قدیم تصنیفات کے حوالے سے پیش کر کے شیرانی یہ معقول اور قرین قیاس نتیجہ نکالتے ہیں کہ "اردو پر قدیم زمانوں میں پنجابی لہجہ غالب تھا۔ اس کا ثبوت دینا موجودہ حالات میں بہت دشوار ہے۔ اس لیے کہ ابتدائی زمانوں کے جب کہ مسلمان ہجرت کر کے دہلی میں آباد ہوئے ہیں، نیز اس کے بعد کی تین صدیوں تک کے کوئی کتابی نمونے ہم کو نہیں ملتے۔ نہ ہم کو یہ علم ہے کہ اس عہد کی برج اور پنجابی میں کیا فرق ہے۔ الغرض برج، پنجابی اور اردو کے نمونوں کی عدم موجودگی سے ہمارا کام بہت مشکل ہو گیا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جب مسلمانوں کا کثیر گروہ قطب الدین ایبک کے ساتھ شمال سے ہجرت کر کے دہلی آیا ہے تو اپنے ساتھ پنجاب سے کوئی نہ کوئی زبان ضرور لے گیا ہے۔ آیا یہ زبان موجودہ پنجابی کے مماثل تھی یا اس کی کوئی شاخ تھی، جواب معدوم ہے۔ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ بہر حال یہ زبان برج اور اس کی ہمسائیگی میں ایک عرصہ دراز تک رہنے سہنے کے باعث بدلنی شروع ہوئی۔"[38]

اردو کے آغاز اور تدریجی ارتقا کی اس داستان کی توثیق کے لیے پروفیسر شیرانی نے اپنے بعد کے مطالعہ و تحقیق میں بھی ان امور کو پیش نظر رکھا ہے۔ اگرچہ "پنجاب میں اردو" میں ان کی زیادہ تر توجہ اردو، پنجابی اور برج بھاشا کے تقابلی جائزے پر مرکوز رہی، لیکن انہوں نے دہلی اور نواح دہلی کی بولیوں کو بھی اپنے مطالعے کا محور بنایا، خصوصاً ہریانی اور بانگڑی کے قصبہ جاتی اختلافات پر بھی نظر ڈالی ہے اور اسلامی عہد کے ساتھ ساتھ اردو کی وسعت پذیری ثابت کرنے کے لیے راجستھانی، گجری اور دکنی کے تحریری سرمائے کو بھی شامل مطالعہ کیا ہے۔ اپنے مقالے "شمالی ہند میں اردو دسویں اور گیارھویں صدی ہجری میں" (اورینٹل کالج میگزین، مئی۔ اگست 1931ء) میں برج بھاشا کی امتیازی ادبی حیثیت کا تذکرہ کرتے ہوئے[39] آخر میں اردو پر اس کے اثرات کا ذکر بدیں الفاظ کیا ہے:

> "اردو زبان، مغل دربار میں ابتدا ہی سے موجود ہے۔ اس زبان کے سینکڑوں الفاظ مغلیہ مؤرخین نے اپنی فارسی تاریخوں میں استعمال کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبان ان ایام میں اگرچہ تحریر میں نہیں آئی ہے، لیکن مسلمانوں کے روزمرہ کی بول چال میں ملازموں، گھر کی عورتوں، مسافروں، پیشہ وروں، ہندوؤں اور غیر اقوام کے ساتھ برابر استعمال میں آ رہی ہے۔ اردو کے تحریری نمونے جو اس عہد سے تعلق رکھتے ہیں، آج دستیاب نہیں ہوئے اور نہ ان ایام میں اس زبان میں شعر و ادب پیدا

کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ البتہ گاہے ماہے بعض اہل قلم نے تفنناً کچھ کچھ لکھا ہے۔ مثلاً بابر کا شعر' جمالی اور انوری کے ریختے' سید مبارک اور علامہ سعد اللہ خاں کے فقرے اور سب سے آخر میں محمد افضل کی '' بکٹ کہانی'' ہے جو ہمارے سامنے ان ایام کی اردو کے نمونے پیش کرتی ہے۔ اس '' بکٹ کہانی'' کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد کی اردو پر برج کا اثر ہے۔ یہ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ دسویں صدی ہجری کی ابتدا سے گیارہویں صدی ہجری کے وسط یعنی تقریباً ڈیڑھ سو سال تک دارالسلطنت دہلی سے آگرے میں منتقل ہو جاتا ہے جو شہر گوالیاری یا برج زبان کے علاقے میں واقع ہے۔ یہاں برج نے اردو پر اپنا رنگ چڑھایا ہے۔ ابوالفضل کی '' آئین اکبری'' اور جہانگیر کی '' توزک'' میں بعض موقعوں پر جو ہم دقیق ہندی کا پرتو دیکھتے ہیں وہ زیادہ تر برج کے زیر اثر ہے۔''[40]

'' اردو کی شاخ' ہریانی زبان میں تالیفات'' (مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین نومبر 1931ء فروری 1932ء) میں شیرانی نے ہریانی زبان کے حدود اربع' اس علاقے کی تاریخی اہمیت اور لسانی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس بحث کے چند ضروری حصے یہاں پیش کیے جاتے ہیں' تاکہ اردو کے ارتقا کے سلسلے میں اس کی حیثیت واضح ہو جائے۔

سر جارج گریرسن کے حوالے سے شیرانی ہریانے کا حدود اربع یہ بیان کرتے ہیں۔ '' مشرق میں حد فاصل دریائے جمنا ہے جو اسے بالائی دوآبے سے منفصل کرتا ہے۔ شمال میں ضلع انبالہ' جنوب میں ضلع گوڑگانوہ' مغرب میں ریاست پٹیالہ اور جنوب میں ضلع حصار۔ اس رقبے میں وہ حصہ جو ضلع کرنال و دہلی پر شامل ہے اور جمنا کے مشرقی کنارے پر واقع ہے' کھادر کہلاتا ہے اور وہ علاقہ جو ریاست پٹیالہ میں نروانا سے شروع ہو کر جنوب میں جیند نظامت ضلع رہتک اور نصف مشرقی نظامت داری ریاست جیند اور نصف شمالی حصہ ریاست نابھہ واقع مغرب ریواڑی' بانگڑ کے نام سے موسوم ہے۔ اس تمام علاقے یعنی ہریانہ' کھادر اور بانگڑ میں ایک ہی زبان بادنیٰ تغیر بولی جاتی ہے۔ جغرافیائی بنا پر اس کے دو نام ہو گئے ہیں یعنی ہریانہ میں '' ہریانی'' اور بانگڑ میں '' بانگڑو''۔ مگر تعلیم یافتہ ہریانی نام پسند کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسے 'دیساری' اور 'دیسوالی' بھی کہتے ہیں۔ دہلی میں جاٹو بھی کہتے ہیں۔ سرکاری رپورٹ اور دیگر مصنفین کا بیان ہے کہ اس زبان میں کسی قسم کا علم ادب نہیں ہے۔''[41]

شیرانی کے بقول '' ہریانی پر کئی زبانوں کے اثرات کام کر رہے ہیں' یعنی مشرق میں گوڑگانوے کی سمت برج بھاکا کی وہ شاخ جسے مسٹر ای جوزف اہیرواٹی کے نام سے یاد کرتے ہیں' ٹھیک جھجر پر آ کر اس سے مل جاتی ہے۔ جنوب میں راجستھانی یا مارواڑی سے اسے واسطہ پڑتا ہے اور شمال میں پنجابی سے جہاں پٹیالہ و

دیگر ریاستیں اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر سے قائم ہوگئی ہیں۔"[42]

اردو کے آغاز وارتقا کے ضمن میں اس علاقے کی تاریخ بھی دلچسپ ہے۔ غزنوی عہد میں سلطان مسعود شہید (421ھ۔432ھ) نے ہانسی کو فتح کیا۔ ایک عرصے کے بعد اگرچہ ہانسی غزنویوں کے قبضے سے نکل گیا لیکن سرتی (سرسہ) مسعود ثالث (492ھ۔509ھ) کے دور میں غزنوی مقبوضات میں شامل تھا۔ ہانسی قدیم زمانے میں ہریانے کا صدر مقام تھا۔ اس شہر میں کثرت کے ساتھ مسلمانی آثار اور کتبے جو ہمیں غوریوں کے عہد تک لے جاتے ہیں' ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ شیخ جمال الدین قطب ہانسوی' شیخ قطب الدین منور و دیگر مشائخ کی بنا پر یہ شہر دین داری اور مسلمانی علوم کا سرچشمہ رہا ہے۔ شعرا میں شیخ جمال الدین مذکور کے علاوہ مولانا مغیث ہانسوی نے زیادہ شہرت پائی ہے۔ ان کا زمانہ آٹھویں صدی ہجری ہے۔ پٹھانوں کے عہد سے اس شہر کی اہمیت گھٹ جاتی ہے۔ تاہم عالمگیر کے زمانے میں عبدالواسع ہانسوی نے فارسی میں ناموری حاصل کی ہے۔ نارنول پٹھانوں کے عہد سے مرکزی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ جھجر کو اٹھارہویں صدی عیسوی میں عروج ملتا ہے۔ تغلقوں کے عہد میں فیروز شاہ (752ھ۔790ھ) نہریں لا کر اس علاقے کو سرسبز اور خوشحال بنا دیتا ہے۔ یہ نہریں ستلج اور جمنا سے لائی جاتی ہیں۔ فیروز شاہ فتح آباد اور حصار فیروزہ دو نئے شہر بھی اس نواح میں آباد کرتا ہے۔ ہریانے میں قدیم زمانے سے مسلمان کثرت سے آباد تھے۔ دہلی کے قرب کی وجہ سے ظاہر ہے کہ یہاں مسلمان آبادی بڑی تعداد میں ہوگی۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جن سے ان کی آبادی اس نواح میں کم ہوگئی ہے۔[43]

ان تاریخی حالات کے حوالے سے شیرانی اٹھارہویں صدی عیسوی کے متغیر حالات میں موجودہ ہریانی کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں: "ہمارے عہد کی ہریانی گویا مختلف زبانوں کی رزم گاہ بن گئی ہے۔ برج بھا کا مشرق سے بڑھتی ہوئی عین جھجر کے کنارے آ گئی ہے۔ پنجابی شمال سے اس کے علاقے کے اندر بہت دُور گھس آتی ہے۔ جنوب سے نوآبادکاروں کے ذریعے سے مارواڑی داخل ہوگئی ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ ہریانے کے مختلف دیہات میں مختلف قسم کی بولی سننے میں آتی ہے۔"[44] شیرانی کہتے ہیں کہ اگرچہ فی زمانہ اس زبان میں بہت کچھ ابتری آ گئی ہے' لیکن عالم گیر اور اس کے بعد کے زمانے میں اس کی یہ حالت نہیں تھی۔ اس عہد کی ہریانی باستثنا بعض امور اردو زبان کے بہت قریب تھی۔ نہ 'الف' 'واؤ' سے بدلتا ہے' نہ 'ۃ' 'سین' سے بدلتی ہے اور نہ مفعولی 'نے' نظر آتا ہے۔ نہ اس کی صرف ونحو اور بول چال میں اس قدر اختلاف ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس عہد کی اردو یہی ہے۔[45]

اس کے بعد شیرانی ہریانہ کی اس ادبی اور تعلیمی تحریک کا تذکرہ کرتے ہیں جو اس ابتری سے پہلے عہد عالمگیری میں پروان چڑھی۔ شیرانی اسے اردو کے قدیم سلسلے میں شمار کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"شمالی ہندوستان میں خوش قسمتی سے ہریانہ ہی وہ مقام ہے' جہاں مقامی زبان میں ادبیات کی

اشاعت کی تحریک سب سے پہلے شروع ہوئی ہے۔ ہانسی' جھجر' رہتک' نارنول اور میہم اس خصوص میں قابل ذکر ہیں۔ ہم ان اسباب سے جو اس تحریک کو بروئے کار لاتے ہیں' قطعاً بے خبر ہیں لیکن ان کے آثار سے آگاہ ہیں۔ دیکھا جاتا ہے کہ یہ تحریک مختلف شعبوں میں کام کر رہی ہے۔ اس کا پہلا اثر یہ ہوا ہے کہ مقامی زبان کو تعلیم کا ذریعہ قرار دیا جاتا ہے اور اس مقصد کو مدنظر رکھ کر نئے تعلیمی نصاب تیار کیے جاتے ہیں۔ عالم گیر کے عہد کے مشہور فارسی دان میر عبدالواسع ہانسوی اس نقطہ نظر سے اپنا نصاب سہ زبان جو "صمد باری" کے نام سے مشہور ہے' تیار کرتے ہیں۔ یہ نصاب "خالق باری" کی طرز کی چیز ہے' لیکن "خالق باری" سے کہیں بہتر اور مفید ہے۔" میر عبدالواسع ہانسوی ہندی الفاظ کی ایک فرہنگ بھی "غرائب اللغات" کے نام سے تیار کرتے ہیں جسے بارھویں صدی ہجری کے وسط میں سراج الدین علی خاں آرزو تصحیح و ترمیم و اضافے کے بعد "نوادر الالفاظ" کے نام سے مرتب کرتے ہیں۔ شیرانی کہتے ہیں کہ اس تالیف سے زبان کے سلسلے میں ہمیں کئی مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ خان آرزو عبدالواسع کی زبان کو معیاری زبان نہیں مانتے۔ وہ جگہ جگہ اس کے الفاظ پر اعتراض کرتے ہیں اور ان الفاظ کی بجائے دوسرے الفاظ جو زیادہ تر گوالیاری یعنی برج سے تعلق رکھتے ہیں' پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے بعض وقت مصنف پر چوٹیں بھی کی ہیں۔ سب سے زیادہ جس بات سے تعجب ہوتا ہے' یہ ہے کہ خان دہلی کی زبان اور اردو کو بھی وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ ان کے نزدیک ہندوستانی زبانوں میں سب سے زیادہ شائستہ اور مہذب زبان گوالیاری ہے۔ چنانچہ اسی گوالیاری کے الفاظ اکثر موقعوں پر نقل کیے ہیں اور اردو سے بہت کم سند لی ہے۔ اردو یا زبان دہلی ان کے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور 'ہریانی' زبان تو قابل خطاب بھی نہیں ہے۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو اردو اور ہریانی میں بہت خفیف سا فرق ہے۔"[46]

ہریانے کی اس ادبی تحریک کے متوازی اسی زمانے میں پنجاب کے بعض دوسرے علاقوں میں بھی اردو شعر و ادب کی تخلیق کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب دبستان دہلی ابھی وجود میں نہ آیا تھا۔ شیرانی نے "پنجاب میں اردو" کے مقدمے میں بھی ان علاقوں خصوصاً بٹالہ (ضلع گورداسپور) کے ادبی مرکز کا تذکرہ کیا ہے۔ مقالات میں بھی انہوں نے پنجاب میں اردو کی سرگذشت کے فراموش شدہ اوراق کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس تحریک کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے:

"گجرات و دکن میں اگرچہ اردو تالیفات دسویں صدی ہجری سے شروع ہو جاتی ہیں' لیکن شمالی ہند میں دو صدی بعد تک ان کا پتہ نہیں چلتا۔ دہلی میں بھی اردو دبستان قائم بھی نہیں ہو چکتا ہے کہ پنجاب میں لوگ اردو زبان میں مثنویاں لکھنی شروع کر دیتے ہیں۔ میر پور (کشمیر) کے شیخ غلام محی الدین تصوف میں مثنوی 'گلزار فقر' 1131ھ میں ختم کرتے ہیں۔ بٹالے کے مشہور شیخ غلام قادر 1151ھ سے قبل مثنوی 'رمز العشق' لکھتے ہیں[47]۔ اسی بٹالے کے ایک اور مصنف عاجز تخلص ہیں جو سیف الملوک و بدیع الجمال کا قصہ فارسی سے

اردو میں نظم کرتے ہیں۔ ایک اور بزرگ تحسین ہیں' جو ایک نظم موسوم بہ 'واردات' کے مالک ہیں' جس میں مصنف ایک شاگرد کی دعوت پر' جو دیوان زادوں میں سے ہے' اپنے میرپور کے سفرراہ کی مشقت وصعوبت' میزبان کی بے اعتنائی' وہاں سے واپسی اور گھوڑے کی مذمت و دیگر واقعات بیان کرتا ہے۔ یہ تالیفات جو اند کے از بسیارے و مشتے نمونہ از خروارے کا حکم رکھتی ہیں' خالص پنجاب کی پیداوار ہیں جن پر ہندوستان کا اثر مطلق نہیں ہے۔ یہ لوگ نہ ہندوستان گئے اور نہ اردو دانوں سے تعلق میں آئے' لیکن اردو میں اپنی تالیفات لکھ رہے ہیں۔ ہمیں ستائش کرنی چاہیے ان بزرگوں کی جو دلی در کنار خود پنجاب کے دارالسلطنت لاہور سے بھی فاصلے پر رہ کر ان دور افتادہ مقامات میں جہاں اردو بولنے والا مہینوں کیا بلکہ برسوں بھی ان سے تعلق میں نہیں آ سکتا ہوگا' اردو زبان کی تحریک کو زندہ رکھتے ہیں۔''[48]

پنجاب میں اردو ادبیات کی یہ تحریکیں تو گیارھویں' بارھویں صدی ہجری میں پروان چڑھیں لیکن اردو زبان کا چرچا کئی صدیاں پہلے غزنوی دور سے ملنے لگتا ہے۔ شیرانی نے ہندوی کے پہلے شاعر مسعود سعد سلمان کا تذکرہ ''پنجاب میں اردو'' میں کیا ہے اور بعد میں قدیم عہد کی فارسی تصنیفات میں سے اردو زبان کے الفاظ اور پھر اردو کے فقرے اور دوہرے جو آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تصنیفات میں انہیں ملے' اپنے مقالات میں پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ ''اردو کی قدیم تحریری دستاویزوں کی عدم موجودگی میں ان فقروں اور اشعار سے ہم اس عہد کی زبان کا اور مسلمانوں میں اس کی وسعت اور شاعری کا کسی قدر اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان اقوام نے ہندوستان میں اپنے لیے ایک زبان مخصوص کر لی ہے اور جوں جوں ان کے مقبوضات فتوحات کے ذریعے سے وسیع تر ہوتے جاتے ہیں' یہ زبان بھی ان کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مشرق ومغرب اور شمال وجنوب میں پھیلتی جاتی ہے[49]۔ ''سیر الاولیاء'' کے حوالے سے شیرانی نے اردو کے ایک قدیم ترین مکالمے کو پیش کیا ہے' جس کا تعلق سرزمین پنجاب ہی سے ہے۔ ''شیخ فریدالدینؒ کے مرید شیخ جمال الدین ہانسوی نے 659ھ میں وفات پائی۔ ان کے فرزند شیخ برہان الدین اس وقت خورد سال تھے۔ مرحوم کی ملازمہ مادر مومناں شیخ مرحوم کی وصیت کے مطابق شیخ زادہ برہان الدین کو لے کر شیخ فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ شیخ نے بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا اور شیخ زادے کو اپنی بیعت میں لے لیا۔ کچھ دن اپنی خدمت میں رکھا اور رخصت کے وقت مرحوم جمال الدین کے تمام تحائف یعنی مصلی وعصا وغیرہ شیخ زادے کے حوالے کر دیے اور فرمایا کہ جس طرح جمال الدین ہماری طرف سے مجاز تھے' تم بھی مجاز ہو۔ اس موقع پر شیخ فریدؒ اور مادر مومناں کے درمیان مقامی زبان میں جو مکالمہ ہوا' وہ فارسی عبارت کے اندر ملفوظات کی شکل میں اس طرح محفوظ ہو گیا ہے: ''مادر مومناں بخدمت شیخ شیوخ العالم عرضداشت کرد بزبان ہندوی کہ ''خوجہ برہان الدین بالا ہے'' یعنی خورد است' ایں بار گراں را طاقت نتواند آورد۔ شیخ شیوخ العالم قدس سرہٗ العزیز فرمود بزبان ہندوی کہ ''مادر مومناں! پونیوں کا چاند بھی بالا ہوتا

ہے۔ ''یعنی ماہ شب چہاردھم دراول شب خوردمی باشد کہ بتدریج بہ کمال می رسد۔''[50]

اس مکالمے کی زبان خالص اردو کی صورت پیش کرتی ہے' جس کے لیے قدیم مصنفین ''ہندوی'' کا نام استعمال کرتے ہیں۔ اردو کے ارتقا کی یہ کہانی شیرانی کے مقالے ''اردو زبان اور اس کے مختلف نام'' کے ساتھ اپنے منطقی انجام تک پہنچ جاتی ہے۔ شیرانی لفظ اردو کی حقیقت اور زبان کے پرانے ناموں کی خاصی تفصیلات پیش کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ہندی یا ہندوی اور اردوے معلی اور اردو' یہ نام علی الترتیب خود اردو کے آغاز وارتقا کے مختلف مرحلوں کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ باقی نام اضافی ہیں۔ ہندوی یا ہندی نام مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو سے لے کر مصحفی وغالب کے زمانے تک ملتا ہے[51] اور پھر اس کے ساتھ ساتھ میر وسودا کے زمانے سے اردوئے معلی ایک خاص ادبی معیاری محاورے کے لیے اور پھر صرف ''اردو'' زبان کے لیے رائج ہو جاتا ہے اور ہندی کا نام اردو زبان کے طور پر متروک ہو کر اس زبان کے لیے استعمال ہونے لگتا ہے جو اب بھارت کی سرکاری زبان ہے۔ پرانے نام ہندی اور اردوئے معلی کے یکجا استعمال کا ایک دلچسپ مرحلہ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے ہاں ملتا ہے جو یہ نام زبان اور اسلوب کے طور پر اپنی تالیفات کے لیے لکھتے ہیں۔ مثلاً:

''زبان ہندی میں موافق محاورۂ اردوئے معلی کے عبارت سلیس وخوب' الفاظ رنگین ومرغوب میں ترجمہ کیا اور نام اس کا طوطی نامہ رکھا۔''

(دیباچہ طوطا کہانی' حیدر بخش حیدری)

ان بیانات میں زبان ہندی اردو زبان کے نام کے طور پر آیا ہے جس طرح مصحفی کا ''تذکرۂ ہندی'' اردو شعرا کا تذکرہ ہے اور اردوئے معلی اس معیاری ادبی زبان اور محاورے کے لیے آیا ہے جو ادبی تحریروں میں اختیار کیا جا رہا تھا۔ شیرانی نے اردو کے نام کے سلسلے میں دو قیمتی اسناد بھی پیش کی ہیں' ایک مصحفی کا یہ شعر جو اپنی داخلی شہادت کی بنا پر 1195ھ سے پہلے کا ہے اور اس میں کسی نسبت کے بغیر اردو کا نام زبان کے طور پر آیا ہے:

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

اور شاہ مراد لاہوری کی مثنوی ''نامہ مراد'' (1203ھ) سے یہ سند جس میں اردو اور ہندی کے نام مترادف ہیں:

وہ اردو کیا ہے یہ ہندی زباں ہے
کہ جس کا قائل اب سارا جہاں ہے

اردو کی یہ ارتقائی داستان یہاں پایہ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔

پروفیسر محمود خاں شیرانی کے اس لسانی نظریے کی تاریخی حیثیت کچھ تشنہ رہ جائے گی اگر ہم ان کے معاصر اور بعد میں آنے والے لسانی ماہرین کی آراء کا بھی کچھ تجزیہ پیش نہ کریں۔ شیرانی کی حیات میں ان سے اختلاف کرنا علمی لحاظ سے بڑے جان جوکھوں کا کام تھا اور ان کے بعد جن لوگوں نے ان سے اختلاف کیا ان کی بھی کچھ جذباتی اور نفسیاتی وجوہ تھیں۔ بہرکیف ڈاکٹر زور کا یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی قدیم کتابوں کے منظر عام پر آ جانے کے بعد ان کی روشنی میں اس مسئلے کا از سرِ نو جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ اس سے نہ صرف اردو کی ابتدا اور جائے پیدائش کے مسئلے کی یکسوئی ہو جائے گی بلکہ پنجابی اور پنجاب سے اردو کے دیرینہ اور بنیادی تعلق کے بارے میں جو شبہات عہد حاضر کے ادیبوں اور محققوں کے دماغوں میں نشوونما پا رہے ہیں، ان کی تردید ہو جائے گی اور اردو، ہندی اور پنجابی زبانوں کے ارباب علم کو معلوم ہوگا کہ یہ تینوں زبانیں باہم دگر کتنی پیوست ہیں۔[52]

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا لسانی تحقیقات میں خاص مقام ہے۔ اتفاق سے انہوں نے بھی اسی زمانے میں، جب شیرانی پنجاب میں اردو کی ابتدا کا نظریہ پیش کر رہے تھے، لندن اور پیرس کی جامعات میں اس مسئلے کو اسی زاویے سے دیکھا۔ اگرچہ ان کے مؤقف میں یہ فرق تھا کہ انہوں نے یہ واضح کیا کہ جس زمانے میں اردو پنجاب میں بنی، اس وقت پنجاب اور دوآبہ گنگ وجمن کی زبان میں بہت کم فرق پایا جاتا تھا۔ برج بھاشا، کھڑی بولی اور جدید پنجابی زبانیں بعد کو عالم وجود میں آئیں[53]۔ ڈاکٹر زور نے اپنے اس مؤقف کی توثیق کے سلسلے میں مزید شواہد فراہم کرنے کے لیے شیرانی کی طرح قدیم دکنی شعری و ادبی سرمائے کی فراہمی و تدوین کا کام جاری رکھا۔ ان کے قائم کردہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد نے اس وقت تک خاصا کام کیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے شیرانی کے نظریہ ''پنجاب میں اردو'' کے بعد منظر عام پر آنے والے محققین کی نگارشات کا بھی ایک مضمون میں جائزہ لیا ہے جو پہلے ''اردو اور پنجابی'' کے عنوان سے ''نقوش'' لاہور، شمارہ 23، 24 بابت جولائی 1952ء میں شائع ہوا اور پھر یہی مضمون کچھ ترمیم و اضافے کے بعد ''اردو کی ابتدا'' کے عنوان سے دہلی یونیورسٹی کے تحقیقی رسالہ ''اردوئے معلیٰ'' شمارہ 4، 5 (1961ء) میں شامل ہوا، ہم یہاں ڈاکٹر زور کے ان مضامین سے بھی استفادہ کر رہے ہیں۔

پروفیسر شیرانی کے نظریے کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر زور کے علاوہ جن محققین اور لسانی ماہرین نے اس مسئلے پر اظہار خیال کیا، ان میں سید سلیمان ندوی، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اور پروفیسر سنیتی کمار چیٹر جی کے نام قابل ذکر ہیں۔ پہلے دو حضرات تو صرف ادبی محقق ہیں جب کہ تیسرے صاحب برصغیر کے نامور ماہر لسانیات ہیں۔ سید سلیمان ندوی کی کتاب ''نقوش سلیمانی'' 1939ء میں شائع ہوئی جس میں ان کے مختلف مضامین اور خطبے شامل ہیں۔ 1933ء کے ایک مضمون میں انہوں نے یہ لکھا کہ ''قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں، اس کا ہیولا اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا''[54]۔ اس سے یہ سمجھ لیا گیا کہ

مولانا نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو سندھ ہی میں بنی ہے مگر اس فقرے کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے بظاہر منطقی پیرایہ بیان سے کوئی قطعی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ اوّل تو اس فقرے کی اساس ہی ظن و قیاس پر ہے۔ دوسرے ''ہیولا'' کی منطقی اصطلاح خود کسی شکل کی مظہر نہیں ہوتی اور تیسرے ''وادیِ سندھ'' سے موجودہ صوبہ سندھ مراد لینا بھی درست نہیں' کیونکہ قدیم زمانے میں وادی سندھ سے مراد موجودہ سندھ اور ملتان اور مغربی پنجاب کا بیشتر وہ علاقہ آ جاتا ہے جو دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ اٹک تک چلا جاتا ہے۔ اپنے ایک دوسرے مضمون میں مولانا یہ فرماتے ہیں کہ ''یہ مخلوط زبان سندھ' گجرات' اودھ' دکن' پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ وار زبانوں سے مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی''[55]۔ سید سلیمان ندوی کے یہ عجیب و غریب اور متضاد بیانات کسی تبصرے سے بے نیاز ہیں۔

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی کتاب ''کیفیہ'' 1942ء میں شائع ہوئی جس میں شیرانی کی تائید میں اردو اور پنجابی کے اسماء' افعال اور ضمائر کے قرب و اشتراک کو واضح کر کے ان زبانوں کے نہایت قریبی رشتے کو ظاہر کیا گیا ہے (ص 94-80)۔ پنڈت کیفی دہلوی تھے لیکن زندگی کا طویل حصہ لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں گزارا' اس لیے شیرانی کی طرح ان کا پنجابی زبان کا مطالعہ مشاہداتی تھا۔ مگر اردو کی جائے پیدائش کے بارے میں کوئی قطعی رائے ظاہر کرنے کی بجائے انہوں نے ثالث بالخیر کا چغہ پہن کر یہ صلح کا مؤقف اختیار کر لیا ''راقم کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ کسی خاص مقام یا خطے کو اردو کا مولد ہونے کے امتیاز سے محروم کیا جائے یا یہ طرہ ایک سے چھین کر دوسرے کی دستار سے لٹکایا جائے''[56] حالانکہ نہ کوئی یہ طرۂ امتیاز تھا' نہ کوئی اسے اپنی دستار فضیلت پر لٹکانا چاہتا تھا۔ یہ ایک علمی مسئلہ تھا جسے شیرانی نے غیر جذباتی ہو کر لسانی استدلال سے پیش کیا تھا۔ پنڈت کیفی کی اس گومگو کی روش نے اردو کے مولد کے سلسلے میں بعض دانشوروں کے اس جذباتی رویے کو تحریک دی جو پہلے ہی دہلی اور لکھنؤ کے سوا کسی خطے کی زبان دانی کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔

پروفیسر سنیتی کمار چیٹرجی کلکتہ یونیورسٹی میں لسانیات کے پروفیسر اور بقول ڈاکٹر زور برصغیر کے سب سے بڑے عالم لسانیات اور محقق تھے۔ ان کی تحقیقات نے یورپ کے بڑے بڑے ماہرین اور خاص کر ''لسانیاتی جائزۂ ہند'' کے مرتب سر جارج ابراہام گریرسن کی غلطیوں کو بے نقاب کیا۔ پروفیسر چیٹرجی نے گجرات کاٹھیاواڑ) کی ورنیکلر ریسرچ سوسائٹی کی دعوت پر 1940ء میں ہندی' ہندوستانی کی نشو و نما پر لیکچروں کا ایک سلسلہ پیش کیا۔ یہ لیکچر 1942ء میں ''انڈو آرین اینڈ ہندی'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ ان لیکچروں کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بعد کے اکثر ماہرین لسانیات نے اپنی تصانیف میں ان سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ہند آریائی زبانوں کے آغاز و ارتقا کے مختلف ادوار کے بارے میں چیٹرجی کا تجزیہ خاصا ٹھوس ہے اگرچہ ان کی تاریخی معلومات حقائق سے زیادہ افسانوی روایات کا سہارا لیتی ہیں۔ پروفیسر چیٹرجی جدید ہند آریائی دور کے آغاز (اندازاً 1000ء) کے سلسلے میں اس امر واقع کا اقرار

تو کرتے ہیں کہ "اگر ترک مسلمانوں نے (برصغیر میں) فتوحات نہ بھی حاصل کی ہوتیں، تب بھی جدید ہند آریائی زبانیں پیدا ہوتیں، لیکن انہیں جو سنجیدہ اور باوقار ادبی حیثیت حاصل ہوگئی اس میں ضرور دیر لگتی"[57]۔ مگر اس کی توجیہ وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی فاتحانہ یلغار کے بعد ہندوؤں کے ردعمل نے دیسی بھاشاؤں کو ذریعہ اظہار بنایا اور ان کے پرچارک ملک بھر میں پھیل گئے اور نئی ہند آریائی بھاشا میں اپنے قدیم دھرم کا پرچار کرنے لگے[58]۔ اس طرح ہندی کو نئی زندگی ملی اور مسلمانوں نے سترھویں صدی میں اس نو دریافت زبان کی طرف توجہ کی اور اس طرح اردو کا آغاز ہوا[59]۔ چیٹر جی کے الفاظ یہ ہیں:

"Their life was thus assured. The N.I.A. vernaculars thus had received the onslaught of Muhammadan Turki aggression seeking to impose Islam on the people of India. In the 16th - 17th centuries, Indo-Aryan was taken up by the North Indian Mussalmans with the fervour of a new discovery, and Urdu, a compromise language given birth to by the force of circumstances, came into being during the 17th-18th century as a Mussalman form of Hindi or Hindustani."

پروفیسر چیٹر جی کا یہ بیان ان کے اپنے ہی دوسرے بیانات سے (جن کا حوالہ ہم پہلے دے آئے ہیں) خاصا مختلف ہے۔ دراصل وہ جن حالات میں یہ لیکچر دے رہے تھے، اس زمانے میں اردو ہندی تنازعہ سیاسی لحاظ سے شدید صورت اختیار کر چکا تھا اور علمی گفتگو کرتے ہوئے بھی ذہنوں پر اس کے اثرات اپنا کام دکھا رہے تھے۔ چیٹر جی کے ان لیکچروں کے بین السطور میں بھی ہندو عصبیت اور انڈین نیشنل کانگریس کا لسانی موقف کارفرما ہے۔ بعض جگہ تو وہ بہت کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ اپنے لیکچر میں ایک جگہ اقبال کا یہ مصرع:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں

اور ایک دوسرے شاعر کا یہ شعر درج کر کے:

ترے دیدار کی مشتاق ہے نرگس بہ چشم وا
تری تعریف میں رطب اللساں سوسن زباں ہو کر

اس پر طنز کرتے ہیں کہ یہ زبان یا اسلوب چند صدی پرانا بھی نہیں اور اس کو تمیں صدی سے بھی زیادہ پرانی روایت والی زبان، جس کے پیچھے سنسکرت جیسی وسیع زبان ہے، کی جگہ دینے کی کوشش کرنا احمقانہ بات ہے[60]۔ پروفیسر چیٹر جی جیسے فاضل کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ عام زبان اور ادبی اسلوب کے فرق سے واقف نہیں ہوں گے، لیکن یہاں انہوں نے دونوں کو اس طرح گڈمڈ کر دیا ہے کہ ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے۔ شاید

پروفیسر صاحب اردو زبان کے مزاج اور اس کی تاریخ سے پوری طرح آگاہ نہیں۔ ان کا یہ نقطہ نظر بھی صحیح نہیں کہ جدید ہند آریائی زبانوں کی نشوونما صرف ہندو پرچارکوں کی رہین منت ہے' اس لیے کہ خود مسلمان اور خصوصاً صوفیائے کرام یہاں شروع ہی میں تبلیغ دین کے لیے مقامی زبانوں میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے تھے۔ پروفیسر صاحب اپنے انہی لیکچروں میں ابتدائی رابطوں کا تذکرہ بھی کر چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف ہندوی (اردو) بلکہ بعض دوسری علاقائی زبانیں بھی مسلمانوں کے توانا سہارے سے اس قابل ہوئیں کہ ان میں شعروادب تخلیق ہونے لگا۔ حافظ محمود شیرانی نے اپنے مضامین میں بنگالی اور برج وغیرہ میں مسلمانوں کی خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔ فارسی شعری علامات کا اردو غزل میں استعمال صدیوں کے ہند وایرانی تہذیبی امتزاج کا نتیجہ ہے' لیکن اس ادبی اسلوب کو بنیادی زبان نہیں کہا جائے گا۔ مرزا غالب کے بعض اشعار اتنے فارسی آمیز ہیں کہ چند افعال اور حروف بدل دیے جائیں تو سارا شعر فارسی کا ہو جاتا ہے' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ غالب کا سارا کلام اسی طرح کا ہے اور یہی اردو زبان ہے۔ البتہ یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ بعض ادیبوں اور شاعروں نے (خصوصاً لکھنؤ کے ادبی مرکز نے) اصلاح زبان کے نام پر اردو سے چن چن کر عام فہم ہندی الفاظ نکالے اور ان کی جگہ عربی فارسی الفاظ داخل کیے اور یہی عمل دوسری طرف بھی ہوا کہ ہندو لکھاریوں نے رائج زبان سے چن چن کر عام فہم اور کثیر الاستعمال عربی' فارسی الفاظ کی جگہ سنسکرت الفاظ استعمال کر کے ہندی کو نئی جہت دی۔ اس طرح اردو اور ہندی کے قافلے نئی راہوں پر گامزن ہوئے اور پھر دونوں گروہوں نے حریفانہ انداز میں ایک دوسرے کی زبان کو مصنوعی اور کم عمر قرار دینے کی کوشش کی۔ اس نزاع میں ڈاکٹر گیان چند جین کا یہ مؤقف صحیح معلوم ہوتا ہے:

"گویا دونوں گروہ اپنے حریف کی عمر ڈیڑھ دو صدی قرار دینا چاہتے ہیں جس سے کم از کم یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ انیسویں صدی سے پیشتر دونوں زبانوں کا رنگ روپ جدا نہ تھا۔ دونوں کے راستے علیحدہ نہ ہوئے تھے"[61]۔

پروفیسر چیٹر جی کے لیکچر بڑے عالمانہ ہیں' لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کے لیکچروں کی تان بھی بالآخر کانگریس کے لسانی مؤقف کی ہم نوائی میں ٹوٹتی ہے۔ تاہم نئی بھاشا (ہندوی) کے آغاز کے بارے میں ان کے خیالات بہت حد تک شیرانی کے نقطہ نظر کے قریب ہیں۔ گذشتہ صفحات پر ہم ان کے بیانات کے طویل اقتباسات دے چکے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے بھی اپنے مضمون میں ان کے لیکچروں کے چند اقتباس دے کر ان کے بعض متضاد بیانات کی تنقیح کی ہے۔

اس سلسلۂ بحث میں پروفیسر احتشام حسین' ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کے نقطۂ نظر کا تجزیہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

پروفیسر احتشام حسین نے جان بیمز کی کتاب کا ترجمہ کر کے مع مقدمہ "ہندوستانی لسانیات کا خاکہ"

کے نام سے 1948ء میں شائع کیا۔ بقول ڈاکٹر زوران کا مقدمہ ایک مبسوط مقالے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں احتشام حسین نے اس موضوع کی مطبوعہ تمام کتابوں کے مطالعے کا بہت عمدہ نچوڑ نہایت سلجھے ہوئے انداز میں کیا ہے[62]۔ پروفیسر احتشام حسین نے اردو کے آغاز اور جائے پیدائش کے بارے میں کوئی قطعی رائے تو قائم نہیں کی' تاہم ان کا یہ بیان ایک حد تک متوازن اور شیرانی کے نظریے کی تائید کرتا ہے:

"فارسی بولنے والے مسلمانوں نے پہلے پہل پنجاب میں سکونت اختیار کی اور یقیناً انہوں نے پنجابی بولی اختیار کی ہوگی' جسے امیر خسرو نے لاہوری اور ابوالفضل نے ملتانی کہا ہے اور جب وہ لوگ دہلی کی طرف بڑھے تو انہیں پنجابی سے کسی قدر ملتی جلتی نئی بولیوں سے سابقہ پڑا۔ یہاں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ دو سو سال کی مدت زبان بننے کے لیے کافی نہیں ہوتی' لیکن ایک مخلوط زبان کے خط و خال ضرور ابھر سکتے ہیں۔ چنانچہ ابتدائی اردو (یا مخلوط زبان) میں پنجابی کی کافی آمیزش نظر آتی ہے' لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ خود پنجابی اور بالخصوص مشرقی پنجابی اسی اپ بھرنش سے تعلق رکھتی تھی جس سے مغربی یو پی کی بولیاں' اس لیے ان میں فرق ہونے کے باوجود بہت زیادہ فرق نہ تھا[63]"۔

مذکورہ بالا اقتباس میں ماضی شکیہ کے ساتھ "یقیناً" کا استعمال بہت عجیب معلوم ہوتا ہے' جو پروفیسر احتشام حسین جیسے محتاط مصنف سے بعید ہے۔ پھر یقین کے ساتھ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ اس وقت پنجابی کی شکل کیا تھی جسے امیر خسرو نے لاہوری کہا ہے اور مسعود سعد سلمان کی زبان کے لیے ہندوی کا نام استعمال کیا ہے۔ لاہوری اور ہندوی میں کچھ تو امتیاز ہوگا جسے امیر خسرو جیسے باریک بین فن کار اور زبان شناس نے ملحوظ رکھا۔

اس وقت تک ہم نے جن محققین اور ماہرین لسانیات کی آرا کا جائزہ لیا ہے' انہوں نے براہ راست شیرانی کے نظریے کی نہ تائید کی ہے' نہ تردید کی ہے۔ اب ہم ان مصنفوں کی تحریروں کا جائزہ لیتے ہیں' جنہوں نے شیرانی کی مخالفت کو اپنا مسلک بنایا ہے۔ ان میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں "تاریخ زبان اردو" کے پیش لفظ میں پروفیسر ژول بلوخ کے اس مفروضے پر اپنے نظریے کی بنیاد رکھتے ہیں کہ "اردو کی ابتدا پر کام کرنے والوں کی توجہ نواح دہلی کی بولیوں پر مرکوز ہونی چاہیے[64]"۔ پھر چند قدم آگے چل کر وہ پروفیسر چیٹرجی کے ہم نوا ہو کر یہ فرماتے ہیں: "یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے طلوع کے وقت ہریانی اور پنجابی میں خط فاصل قائم کرنا دشوار تھا[65]"۔ اور ساتھ ہی یہ کہہ کر مکرنی بھی سنا جاتے ہیں: "البتہ شورسینی اپ بھرنش کی جانشین ہونے کی حیثیت سے پنجابی زبان کے مقابلے میں ہریانی اور کھڑی بولی کو زیادہ قدیم ماننا پڑے گا[66]"۔ یہ دروں میے بروں کا

یہی انداز ساری کتاب پر چھایا ہوا ہے۔ فرماتے ہیں: ''اردو کی تہہ میں جو بنیادی بولی ہے اس کا تعلق تو نواح دہلی ہی سے ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ سلاطین دہلی کے عہد میں اس پر پنجاب کی زبان کا گہرا اثر رہا ہے جس کی وجہ سے دو تین صدیوں تک اس کا اپنا کینڈا متعین نہ ہو سکا[67]۔'' پھر وہ چیٹرجی کے تتبع میں ریختہ کی شکل میں کھڑی بولی کے ادبی ارتقا کا آغاز سترہویں صدی عیسوی سے کرتے ہیں[68] اور صدیوں کے خلا کے بعد ایک دم اردو کی ایک مستقل شکل متعین فرما دیتے ہیں: ''ہمارا خیال ہے کہ خسرو کی ''زبان دہلوی'' کا ارتقا شمالی ہند میں یک لخت رُک جانے کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ پایہ تخت دہلی سے منتقل ہو کر آگرہ چلا گیا تھا۔ اورنگزیب کے زمانے سے (بالخصوص جب وہ اپنی فتوحات دکن کے سلسلے میں اورنگ آبادی اردو سے دو چار ہوتا ہے) زبان دہلوی کا باقاعدہ ارتقا پھر شروع ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ ادبیات کی نیو بھی جانے لگتی ہے۔ اس وقت فارسی اور برج دونوں کا افسوں ٹوٹ چکا ہے اور دہلوی زبان پر پنجابی کے اثرات زائل ہو کر اس کی اپنی شکل متعین ہو چکی تھی[69]۔''

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے عجیب و غریب طریق استدلال سے کام لے کر اردو اور پنجابی کے بارے میں شیرانی کی پیش کردہ لسانی مشابہتوں اور مماثلتوں کو رد کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ ''اردو اگر ایک طرف اپنی قواعد کے اعتبار سے پنجابی سے ملتی جلتی ہے' تو دوسری طرف ہریانی سے بھی مماثلت رکھتی ہے[70]'' ۔ اور آخر میں اس سے یہ نتیجہ نکالنا ''اس لیے نواح دہلی کی بولیاں اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہیں اور حضرت دہلی اس کا صحیح مولد و منشا[71]'' جذباتی معاملہ تو ہے' مگر عقلی طور پر درست نہیں۔ اس خلط مبحث میں مولد و منشا کے لغوی مفہوم کو ہی پیش نظر رکھ لیا جاتا' تو شیرانی سے خواہ مخواہ اختلاف کی گنجائش نہ رہتی۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی کتاب پر ماہر لسانیات ڈاکٹر زور کا تبصرہ بہت جامع اور وقیع ہے۔ ہم اس کے ایک حصے کو یہاں پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب میں مسعود صاحب سے ایک اہم فروگذاشت یہ ہوئی ہے کہ انہوں نے موجودہ پنجابی اور موجودہ ہریانی کا مقابلہ قدیم دکنی سے کر کے نتائج اخذ کیے ہیں۔ حالانکہ دکنی اردو نے جس وقت پنجاب میں نشو و نما حاصل کیا اس وقت ہریانی اور کھڑی تو کجا خود برج بھاشا بھی ایک جداگانہ زبان کی حیثیت سے عالم وجود میں نہیں آئی تھی اور خود انہوں نے پروفیسر شیرانی کے اس نظریے کو قبول کیا ہے کہ ہریانی کی پیدائش مسلمانوں کی آمد دہلی کے بعد عمل میں آئی ہے۔'' (ص 131)

ڈاکٹر مسعود حسین مانتے ہیں کہ لاہور کی ترکی ہندی فضا میں خواجہ مسعود سعد سلمان پرورش پاتے رہیں جو ہندوی زبان کے بھی پُر گو شاعر تھے (ص 129-128) اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ''خواجہ مسعود کسی ہندوی زبان میں بھی شاعری کرتے تھے اور شاید ان کا دیوان خسرو کے وقت تک دستیاب تھا'' لیکن یہ نہیں کہہ

سکتے کہ یہ ہندوی زبان کون سی تھی اس لیے قیاس قائم کرتے ہیں کہ یہ زبان لاہوری ہوگی۔

یہ ایک عجیب قیاس ہے۔ جب ہم کو معلوم ہے کہ امیر خسرو ہر جگہ کی زبانوں کا فرق جانتے تھے اور اپنے عہد کے بہت بڑے ماہر و محقق لسانیات تھے' چنانچہ انہوں نے اپنے عہد کی ہندوستانی زبانوں کی فہرست بھی لکھ دی تھی جس کو مسعود صاحب نے بھی ص 137 پر نقل کیا ہے۔ ایسی صورت میں اگر مسعود سعد سلمان کی زبان لاہوری ہوتی تو امیر خسرو اس کو لاہوری ہی لکھتے اور اگر ان کی زبان اور مسعود کے دیوان کی زبان میں فرق ہوتا تو وہ ضرور یہ بھی واضح کرتے کہ میں نے دہلوی میں شاعری کی اور مسعود نے لاہوری میں' لیکن اس کی بجائے انہوں نے اپنی اور مسعود دونوں کی زبانوں کا نام ہندوی لکھا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور بات بھی واضح کر دینی ضروری ہے کہ امیر خسرو نے اپنی زبانوں کی فہرست سے ہندوی کو الگ ہی رکھا ہے' اس لیے کہ یہ زبان بین صوبہ جاتی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ان کے عہد میں یہ کوئی مقامی زبان نہیں رہی تھی اور انہوں نے جن زبانوں کے نام لکھے ہیں' وہ صرف مقامی ہیں اور ان مقامی زبانوں کی فہرست میں برج بھاشا کو انہوں نے دہلوی اور پنجابی کو لاہوری لکھا ہے۔

مسعود صاحب دہلوی ہی کو اردو سمجھتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو خسرو پر یہ الزام رہتا کہ انہوں نے برج بھاشا جیسی اہم زبان کا ذکر ہی نہیں کیا۔

قصہ مختصر یہ کہ ہریانی کو اردو کا ماخذ ثابت کرنے کی کوشش میں ڈاکٹر مسعود حسین کی پوری کتاب ایسے گنجلک اور مبہم و متضاد بیانات سے معمور ہوگئی کہ ان پر ایک سرسری تبصرے کے لیے بھی کافی وقت اور فرصت درکار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب محنت اور تلاش و جستجو سے لکھی گئی ہے اور مصنف نے لسانیاتی مسائل سے گہرے شغف کا ثبوت دیا ہے' لیکن محض ژول بلوخ کی سند پر ایک پورا نظریہ قائم کرنے اور پنجاب میں آغاز اردو کے نظریے کو غلط ثابت کرنے کی سعی میں اپنی ساری قابلیت وقف کر دی ہے[72]۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کا معاملہ اس سے بھی پیچیدہ ہے۔ لسانیات سے انہیں خاص شغف تھا۔ وہ بڑے غالب شناس' نقاد اور محقق تھے۔ لسانی مسائل پر ان کی متعدد مستقل کتابیں اور مضامین ہیں۔ ''اردو زبان کا ارتقا'' ان کا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے جو 1956ء میں ڈھاکہ سے شائع ہوا۔ پھر ''داستان زبان اردو'' اور ''لسانی مسائل'' ان کی تصانیف کراچی سے شائع ہوئیں۔ اول الذکر دونوں کتابوں میں اردو زبان کے آغاز و ارتقا کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے انہیں اس مسئلے سے جذباتی لگاؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔ اکثر موقعوں پر جذبات ان کے شعور پر غالب آجاتے ہیں اور بعض اوقات تو وہ مناظرانہ انداز بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ علمی مسائل کو جذباتی رنگ دے دیا جائے تو وہ پیچیدگی پیدا ہوتی ہے جس کا ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ پھر معاملہ علم اللسان کا نہیں رہتا' علم النفس کا ہو جاتا ہے' جس کا متحمل یہ مقالہ ہو نہیں سکتا۔ اس لیے ہم کوشش کریں گے کہ یہاں ڈاکٹر شوکت سبزواری کے بیانات پیش کر کے ان پر کم سے کم حاشیہ آرائی کریں اور فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیں۔

''اردو زبان کا ارتقا'' مغربی مصنفین کے اقتباسات اور ان کے موقع و بے موقع حوالوں سے معمور ہے۔ کتاب کے آخری ابواب میں اردو کے اکثر الفاظ کے صوتی ولسانیاتی ارتقا پر فنی طریقے سے روشنی ڈالی گئی ہے لیکن اصل مسئلہ کے بارے میں بقول ڈاکٹر زور' شوکت صاحب یورپی مصنفوں کے اقتباسوں اور متضاد بیانات کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ البتہ اس مقالے سے آیندہ تحقیقاتی کام کرنے والوں کے لیے ایک نئے زاویۂ نگاہ سے اردو کے ارتقا پر غور کرنے کا امکان سجھائی دیتا ہے اور وہ ہے پالی زبان سے اردو کا تعلق [73]۔ اس بارے میں شوکت سبزواری کے الفاظ یہ ہیں:

> ''اردو' ہندوستانی یا کھڑی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے جو ترقی کرتے کرتے یا یوں کہیے کہ ادلتے بدلتے پاس پڑوس کی بولیوں کو کچھ دیتے اور کچھ ان سے لیتے اس حالت کو پہنچی جس میں آج ہم اسے دیکھتے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ پالی اس کی ترقی یافتہ ادبی اور معیاری شکل ہے۔ اردو اور پالی دونوں کا منبع ایک ہے [74]''۔

اس قیاس سے تھوڑی دیر پہلے شوکت سبزواری یہ فرما چکے تھے:

''چند ملتی جلتی زبانوں کو دیکھ کر ان کا ایک مشترکہ ماخذ فرض کرنا ایک ایسا فعل ہے' جسے فکر انسانی کی اختراع سمجھنا چاہیے [75]''۔

اس قول فیصل کے بعد اوپر کا نظریہ فکر شوکت کی جدت طرازی ہی کہا جائے گا' لیکن یہ بات ان سے پہلے پروفیسر چیٹر جی بھی لکھ چکے تھے۔ شوکت صاحب نے کوئی نئی بات نہیں کہی' صرف حوالہ دیے بغیر چیٹر جی کی بات کو دہرا دیا ہے۔ چیٹر جی کے الفاظ یہ ہیں [76]:

"One of the ancient Indian Aryan dialects in which the Buddhist scriptures were translated from the original Eastern speech of Buddha was Pali is wrongly believed to be the ancient languagt of Magadha or South Bihar; rather, extending it is a literary language based on the dialects of the Midland from Ujjain to Mathura-- in fact, it was a sort of an ancestor of Western Hindi. Pali, as the language of the Midland, was like Hindi or Hindustani of the present day, the speech of the centre-- of the heart of Aryavarta or Aryan-land which was easy for people of the surrounding East, West and North- West, and South and South-West to understand."

''داستان زبان اردو'' میں شوکت سبزواری صاحب زیادہ جذباتی ہو کر جارحانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ مشترکہ ماخذ کے بارے میں ان کا اپنا فکری تضاد یہاں بھی موجود ہے:

''شمالی ہند کی جدید آریائی زبانوں کا صرفی نحوی سرمایہ بڑی حد تک مشترک ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان زبانوں نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا اور یہ سرمایہ ایک سے دوسرے کے پاس، دوسرے سے تیسرے کے پاس منتقل ہوتا چلا گیا' بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زبانیں متحد الماٰخذ یا قریب الماٰخذ ہیں[77]''۔

اور پھر اس کے برعکس اردو اور پنجابی کے مسئلے میں ان کا نقطۂ نظر مختلف ہو جاتا ہے:

''اردو اور پنجابی ان تمام لسانی مشابہتوں کے باوجود جن کا ذکر مولانا محمود شیرانی تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں کرتے ہیں' مزاج اور ساخت کے اعتبار سے مختلف زبانیں ہیں۔ ان میں اصلی اور نسلی امتیازات ہیں جو ان کے مختلف الاصل ہونے کی گواہی دیتے ہیں اور صاف صاف چغلی کھاتے ہیں کہ یہ زبانیں ایک گھرانے کی نہیں دو گھرانوں کی ہیں' ایک نسل کی نہیں' دو نسلوں کی ہیں[78]''۔

اور یہ دو گھرانے اور دو نسلیں غالباً وہی گریرسن اور ہارنلی کے اندرونی اور بیرونی آریہ گروہوں کے نظریے کے مطابق ہیں جسے چیٹرجی اور مزمدار نے سختی سے رد کر دیا ہے (یہ بحث ہم اس مقالے کے شروع میں پیش کر چکے ہیں)۔

پھر بے یقینی ایک دوسرا پینترا بدلتی ہے۔ اردو اور پنجابی کے مشترکہ لسانی سرمائے کی تردید نہ ہوتی دیکھ کر مناظرانہ استدلال کی یہ صورت ملاحظہ ہو:

''پنجابی بھی تو آخر کسی قدیم زبان سے ارتقا پاتی ہے۔ اگر یہ سرمایہ پنجابی کا ہے تو اسے اپنی اصل یا ماخذ سے ملا ہوگا۔ کیا اردو اس قدیم زبان سے ترقی پا کر نہیں بن سکتی[79]''۔

اب اس مسئلے کے ایک دوسرے پہلو کی طرف آیئے۔ اس تاریخی حقیقت کو سب محققین تسلیم کرتے ہیں کہ جدید ہند آریائی زبانوں کے آغاز میں مسلمانوں کی فاتحانہ آمد کو ایک اہم محرک کی حیثیت حاصل ہے' بالکل اسی طرح جس طرح قدیم ہند آریائی کا آغاز آریاؤں کی ہند میں آمد کے بعد ہوا' لیکن شوکت سبزواری صاحب سب سے الگ ہو کر یہ اعلان فرماتے ہیں:

''یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اردو کی ابتدا کا مسلمانوں سے یا سرزمین ہند میں ان کے سیاسی اقتدار کے قیام و استحکام سے کیا تعلق ہے[80]''۔

جب انسان جذبات کی رو میں بہہ جائے تو واقعی اجلی حقیقتیں بھی نگاہوں سے غائب ہو جایا کرتی ہیں۔ ہم اس کا جواب انہی کے ہم مسلک ڈاکٹر مسعود حسین کے لفظوں میں دینا پسند کریں گے' جو فرماتے ہیں:

''اندازاً کہا جا سکتا ہے کہ جدید زبانوں کا طلوع 1000ء سے ہوتا ہے۔ یہ بہت بڑے سیاسی الٹ پھیر کا زمانہ تھا۔ مسلمان آناً فاناً شمالی ہند کو زیر کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے جلو میں ایک نیا تمدن اور ایک نئی زبان آ رہی تھی۔ انہوں نے سنسکرت کے فسوں کو توڑ کر بہت جلد ہندوستان کی نئی زبانوں کو اپنے بل پر کھڑا ہونا سکھایا[81]۔''

شوکت سبزواری کا اس پر یہ استدلال بھی خاصا عجیب و غریب ہے:

''اردو مسلمانوں کے فتح دہلی سے پہلے دہلی اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی اور برج یا اودھی کے مقابلے میں گری پڑی 'پسماندہ اور بر خاک افتادہ زبان سمجھی جاتی تھی۔ مسلمانوں نے اٹھا کر اسے سینے سے لگایا اور نوک پلک سے درست کر کے اس قابل بنایا کہ اس کے ذریعے شاعرانہ خیالات کا اظہار ہو سکے[82]۔''

گویا مسلمانوں کو شاعرانہ خیالات کے اظہار کے علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا اور پھر اس کے بعد یہ تکرار فرماتے ہیں:

''اردو کا نشو و نما مسلمانوں کی سرپرستی اور ان کے سیاسی اقتدار کے زیر سایہ ہوا' لیکن زبان خود مسلمانوں کی دہلی میں آمد سے پہلے دہلی میں موجود تھی اور بازار ہاٹ میں بولی جاتی تھی[83]۔''

اس تضاد بیانی کا بھی جواب نہیں۔ یہ تو قدرتی بات ہے کہ دہلی کے بازار ہاٹ میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی لوگ تھے اور وہ کوئی زبان بھی بولتے ہوں گے' لیکن وہ زبان کون سی تھی؟ شوکت صاحب اسے ''ہندوستانی'' کہتے ہیں' لیکن یہ ان کی ذہنی اختراع ہی کہی جا سکے گی۔ امیر خسرو کے بیانات کی موجودگی میں ان کی اس جدت طرازی کی وقعت کیا رہ جاتی ہے؟

دراصل شوکت صاحب کا سارا استدلال ان کے اس جذبے کے ارد گرد گھومتا ہے کہ اردو دہلی اور میرٹھ (مدھیہ دیش یعنی یو پی) کی زبان ہے جو بقول ان کے مغربی ہندی کے مرکز اور قدیم زمانے سے علم ثقافت اور شائستگی کے گہوارے ہیں۔[84] ان کا یہ جذبۂ وفاداری بشرط استواری' کے بموجب لائق تحسین ہے اور اس میں شک نہیں کہ ہندو آریہ تہذیب نے بھی ایک زمانے میں یہاں عروج حاصل کیا اور مسلم تہذیب کے نقوش بھی دہلی' آگرہ اور لکھنؤ میں اجاگر ہوئے لیکن خود چیٹر جی بھی تسلیم کرتے ہیں اور احتشام حسین بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ آریہ تہذیب کا پہلا گہوارہ پنجاب تھا' مدھیہ دیش کو بعد میں اہمیت حاصل ہوئی اور یہی صورت مسلم عہد میں پیش آئی۔ آخر پنجاب کو اپنے محل وقوع کے اعتبار سے تاریخ میں جو مقام حاصل رہا ہے اس سے ایسا بدکنے کی کیا ضرورت ہے۔ سبزواری صاحب کی یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ ''اردو آج ہم اس زبان کو کہتے ہیں جو دہلی اور مغربی اضلاع میں عام طور سے بولی جاتی ہے''[85] ان کا یہ فرمانا بھی بجا ہے کہ ''اردو آج کی زبان ہے''[86] ان کا یہ قول بھی صحیح ہے ''ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اردو اپنے نکھار سنگھار کے ساتھ

دہلی اور یوپی کے مغربی اضلاع میں بولی جاتی ہے [87]" مگر بے یقینی کے ساتھ ان کا یہ فرمانا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے "لیکن ہمیں یہ علم نہیں کہ اس زبان کا آغاز انہی اضلاع میں ہوا یا کسی اور مقام میں جہاں سے اسے دہلی اور یوپی کے مغربی اضلاع میں لایا گیا [88]"۔ "قدیم زبان (ہندوی) کے بارے میں ان کا رویہ یہ ہے کہ "اردو کا آغاز اس وقت مان لیا گیا جب اردو نہ تھی اور اس مقام سے مان لیا گیا جہاں اردو کا تخم نہیں ڈالا گیا [89]"۔ اور آخر میں ان کا روٹھ جانے والا یہ انداز کہ "اردو میرٹھ اور دہلی کی زبان ہے اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں [90]"۔ چلو چھٹی ہوئی!

اب شوکت صاحب کے مناظرانہ استدلال اور منطقی مغالطے کی بھی ایک مثال دیکھتے جایئے۔ لکھتے ہیں: "مولانا آزاد نے فرمایا اردو برج سے نکلی اس کے مقابلے میں مولانا شیرانی کی آواز آئی اردو پنجابی کی بیٹی ہے [91]"۔ اس فقرے کے دونوں حصوں کا تجزیہ کیجئے طرز استدلال کی ملمع سازی کھل جائے گی۔ محمد حسین آزاد نے یہ ضرور فرمایا کہ "اردو برج سے نکلی!" (آب حیات) لیکن شیرانی کی یہ آواز کہاں سے آئی کہ "اردو پنجابی کی بیٹی ہے!" شیرانی نے تو اپنی تحریروں میں کہیں یہ بات نہیں لکھی۔ پھر سبزواری نے یہ بات کہاں سے سنی؟ ایک غلط مفروضے پر انہوں نے استدلال کی عمارت کھڑی کی ہے۔ شیرانی نے اس بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ گذشتہ صفحات (24'25'35'41) پر درج ہو چکا ہے۔ اسے دیکھئے اور فیصلہ خود کیجئے۔

پروفیسر سنیتی کمار چیٹر جی سے تو یہ شکایت عبث ہے کہ انہوں نے آریاؤں کی ہند میں آمد کے بعد ہند آریائی زبانوں کے مختلف ادوار پر عالمانہ روشنی ڈالتے ڈالتے اور مسلمانوں کی آمد کے بعد جدید ہند آریائی کے آغاز کا تذکرہ کرتے کرتے آخر میں کانگریس کے لسانی موقف کا پرچارک بن کر اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے ڈالا اور یہ بھول گئے کہ یہ بات خود ان کے پہلے بیانات سے متصادم ہے۔ اگر وہ سیاسی مصالح اور قومی تعصبات سے بلند ہو کر ہندوی' ہندی اور اردو کے فطری ارتقا کو دیکھتے تو انہیں انیسویں صدی کے شروع تک اس میں کوئی اختلاف کی صورت نظر نہ آتی اور وہ اس نتیجے پر پہنچتے کہ یہ زبان ہند میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندو مسلم یکجائی کا ایک قدرتی ثمر اور اتحاد کا ایک مؤثر ذریعہ تھی جسے دور حاضر میں سیاسی مفادات اور قومی تعصبات کی بھینٹ چڑھانے کی بھرپور کوشش کی گئی۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی اگر مدھیہ پردیش سے اپنی جذباتی وابستگی کو الگ رکھتے ہوئے اور گریرسن کے دو گروہی نظریے کے چکر میں نہ پڑتے ہوئے مولد و منشا کے مفہوم کے مطابق پروفیسر شیرانی کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو انہیں اختلاف کی گنجائش کم ہی نظر آتی' اس لیے کہ شیرانی نے بھی اردو کی نشوونما میں دہلی یا لکھنؤ کے سابق تہذیبی مرکزوں کی اہمیت کا انکار نہیں کیا۔ ان کا موقف تو صرف اتنا ہے کہ اردو کا آغاز پنجاب میں ہوا' پھر یہ بین صوبہ جاتی زبان دہلی' آگرہ' دکن' گجرات' لکھنؤ اور بہار وغیرہ مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی توسیع سلطنت کے ساتھ ساتھ سفر کرتی' نشوونما کے مراحل طے کرتی اس

معیار کو پہنچی جسے اردوئے معلیٰ اور پھر صرف اردو کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اس طرح ''حضرت دہلی'' کی اہمیت کچھ کم نہیں ہو جاتی' بلکہ اردو کو ایک معیاری ادبی زبان بنانے میں اس گذشتہ تہذیبی مرکز کی خدمات اپنی جگہ بڑی گراں بہا ہیں۔

پروفیسر شیرانی نے یہ مسئلہ غیر جذباتی ہو کر' علمی انداز میں' قدیم فارسی تاریخوں' تذکروں' مخطوطات اور مسکوکات کی مدد سے پیش کیا۔ نئی معلومات کے منظر عام پر آنے کے بعد اس میں مزید تحقیق کی راہیں بھی کھلتی ہیں' لیکن اختلاف برائے اختلاف بے سود ہے۔

کتب حوالہ

1- آزاد' محمد حسین' آب حیات' طبع لاہور' 1957ء
2- احتشام حسین' پروفیسر' ہندوستانی لسانیات کا خاکہ' طبع لکھنؤ' 1948ء
3- برج موہن دتاتریہ کیفی' کیفیہ' طبع دہلی' 1942ء
4- زور' محی الدین قادری' ہندوستانی لسانیات' طبع لاہور' 1961ء
5- سدھیشور ورما' آریائی زبانیں' طبع لاہور' 1960ء
6- سلیمان ندوی' سید' نقوش سلیمانی' طبع کراچی' 1951ء
7- شمس اللہ قادری' اردوئے قدیم' طبع لکھنؤ' نولکشور' 1930ء
8- شوکت سبزواری' ڈاکٹر' اردو زبان کا ارتقا' طبع ڈھاکہ' 1956ء
9- شوکت سبزواری' ڈاکٹر' داستان زبان اردو' طبع کراچی' 1960ء
10- شوکت سبزواری' ڈاکٹر' اردو لسانیات' طبع کراچی' 1966ء
11- عتیق صدیقی' گلکرسٹ اور اس کا عہد' طبع علی گڑھ' 1960ء
12- محمود خان شیرانی' پروفیسر' پنجاب میں اردو' لاہور' طبع چہارم' 1972ء
13- محمود خان شیرانی' پروفیسر' مقالات حافظ محمود شیرانی' جلد 1' طبع لاہور' 1966ء
14- محمود خان شیرانی' پروفیسر' مقالات حافظ محمود شیرانی' جلد 2' طبع لاہور' 1966ء
15- محمود خان شیرانی' پروفیسر' مقالات حافظ محمود شیرانی' جلد 7' طبع لاہور' 1976ء
16- مسعود حسین خان' ڈاکٹر' مقدمہ تاریخ زبان اردو' طبع لاہور' 1966ء
17-Grierson, Sir George Abraham: Linguistic Survey of India, vols.8,9
18-Suniti Kumar Ghatterji: Indo-Aryan and Hindi, Calcutta, 1942

رسائل:

نقوش' لاہور' شمارہ 24-23' جولائی 1952ء
اردوئے معلیٰ' (دہلی یونیورسٹی)' جلد سوم' شمارہ 5-4' (1961ء)

حواشی:

1- پنجاب میں اردو' ص 52
2- آبِ حیات' ص 76
3- اردوئے قدیم' ص 6
4- مقالات شیرانی' جلد ہفتم' ص 330
5- پنجاب میں اردو' ص 76
6- داستان زبان اردو' ص 74
7- پطرس بخاری' "لاہور کا جغرافیہ" میں لکھتے ہیں: "لاہور تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں لیکن دو ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ ایک پشاور سے آتا ہے اور دوسرا دہلی سے۔ وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے راستے اور یو پی کے حملہ آور دہلی کے راستے وارد ہوتے ہیں۔ اول الذکر اہل سیف کہلاتے ہیں اور غزنوی اور غوری تخلص کرتے ہیں۔ موخر الذکر اہل زبان کہلاتے ہیں۔ یہ بھی تخلص کرتے ہیں اور اس میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔"
8- مقدمہ تاریخ زبان اردو' ص 52-51
9- پنجاب میں اردو' ص 76
10- Indo-Aryan and Hindi. p.115.
11- بنگالی زبان کی تاریخ: پی۔ مزمدار' ص 7 بحوالہ تاریخ زبان اردو' ص 41
12- مقدمہ تاریخ زبان اردو' ص 40 تا 42
13- پنجاب میں اردو' ص 16
14- ایضاً' ص 17
15- ایضاً' ص
16- پنجاب میں اردو' ص 248-246
17- پنجاب میں اردو' ص 57
18- ایضاً' ص 60-59
19- Indo-Aryan and Hindi, Suniti Kumar Chatterji, pp.166-169
20- اردو کے دوسرے جملے میں خبر اپنے مبتدا کے مطابق نہیں۔ باتیں جمع ہے اور بھلی واحد' جب کہ پنجابی میں مبتدا اور خبر دونوں جمع ہیں' لیکن یہ جدت طرازی بعد کی اصلاح زبان کا نتیجہ ہے۔ پرانی اردو میں یہ جملہ یوں لکھا جاتا "یہ باتیں بھلیاں نہیں" بلکہ "یہ باتاں بھلیاں نہیں' جو پنجابی سے بالکل موافق ہے۔ سودا کا یہ شعر دیکھیے:

دوانہ ہو گیا سودا تو آخر ریختہ پڑھ پڑھ
نہ میں کہتا تھا اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

21- پرانی اردو میں "عورتاں آئیاں" اردو میں عورتاں سے منصرف کر کے عورتیں بنالیا گیا۔
22- پرانی اردو میں بھی آوے اور آویں ہی مستعمل تھا۔ آنا در اصل آونا تھا۔ اس سے مضارع آوے اور آویں تھیں۔
23- قدیم اردو میں آوے گا اور آویں گے بولتے تھے۔ بعد میں یہاں بھی اصلاح ہوئی اور آئے گا' آئیں گے ہو گیا لیکن جمع مخاطب کی واو برقرار رہی۔
24- پروفیسر شیرانی: "مغربی مصنفین کہتے ہیں کہ "ہے" پنجابی میں اردو سے آئی ہے لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ پنجابی کی مضارع

اور ماضی احتمالی میں یہ شکل پہلے سے موجود ہے اور صیغہ جمع متکلم میں ملتی ہے۔ پھر اسے اردو سے لینے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابتدا میں یہ صرف جمع متکلم کا صیغہ تھا۔ بعد میں اس کا استعمال جمع مخاطب اور واحد مخاطب پر بھی تعظیماً ہونے لگا۔"

25- اردو میں بھی "جلنا" "پالنا" وغیرہ کا رواج تھا جواب متروک ہے۔

26- پنجاب میں اردو طبع چہارم 1972ء لاہور ص 92-93

27- ایضاً ص 95

28- نہیں لیکن کسے دی تانگھ او سنوں   عزیز مصر لائی سانگھ او سنوں
ستائی عشق تیری بانگھ او سنوں   رہے ہر دم تساڈی تانگھ او سنوں

29- جدن یعقوب اس گل نوں پچھاتا   عذرا کہن کنوں ہویا چپاتا

30- آیا چوتھے دہاڑے قافلہ گھیر   شہر دین کنوں اس کھوودے پھیر
(عبدالحکیم: یوسف زلیخا)

31- پنجاب میں اردو ص 103   32- ایضاً ص 104 تا 106

33- پنجاب میں اردو ص 122   34- پنجاب میں اردو ص 124

35- سنیتی کمار چیٹر جی کے محولہ بالا خطبے کا متعلقہ حصہ درج ذیل ہے:

"In phonetics as in other matters, the normal development according to the speech-habits of the locality in a particular linguistic area has been frequently interfered with by the introduction of words and forms from a neighbouring language, or even from a distant one. Thus Hindi has been dominated by Punjabi in certain matters, and Bengali has been influenced by the Upper Indian languages, by the Bihari dialects, themselves under the suzerainty of Hindi or Hindust(h)ani. In Punjabi, for instance, the double or long consonants of MIA, still survive---e.g. *camm* (<*carma*), *kall* (<*kalya*) (*sacc* (<*satya*), *kujjh* (=*kincit*) *hatth* (<*hasta*), *natth* (<*nasta* `nose-ring`), *ratti* (<*rahtiha*) `a red berry, used as a weight`, etc; and *caddar*, *nmmed* for Persian *casder* `sheet of cloth`, *umed* `hope` while in Hindi these have been simplified to single ones; yet in Hindust(h)ani (High Hindi and Urdu) we have *cam* and *hath*, but *kal*, *sac*, *kuch*, *nath*, *ratti* and *caddar* beside *caddar*, *ummed* as an alternative pronunciation of *umed*, instead of the expected *kal*, *sac*, *kuch*, *nath*, *rati*. and only *cadar*, and *imed*. The Hindi *kal*, *sac*, etc; are just borrowed or imposed Punjabi forms with short a: the long consonant at the end being not suitable for the basic phonetics of Hindi, it was shortened to a short or single consonant."

(Indo- Aryan and Hindi,pp. 114-115.)

36- سنیتی کمار چیٹر جی کی اصل عبارت درج ذیل ہے:

"The basis of such a *Verkehrssprache* was found in Western Apabhramsa as

current in the Punjab and Western United Provinces, and Apabhramsa was at that time in a state of transition from the earlier Prakrit or Middle Indo-Aryan to the later vernacular or New Indo-Aryan stage in Hindustan, though not in the Punjab. The new *Verkehrssprache* was thus bound to be in a fluid state for some centuries."

(Indo-Aryan and Hindi, p.169)

37- پنجاب میں اردو' ص117
38- مقالات حافظ محمود شیرانی' جلد دوم' ص48
39- ایضاً' صفحہ70
40- Linguistic Survey of India, vol ix, p.66
41- مقالات حافظ محمود شیرانی' جلد2' ص353
42- ایضاً جلد2' ص353تا356
43- ایضاً' ص356
44- ایضاً' صفحہ358
45- ایضاً' جلد2 صفحہ360تا364
46- شیخ غلام قادر شیخ محمد فاضل بٹالوی (متوفی 1151ھ) کے فرزند تھے جن کے بارے میں شیرانی "پنجاب میں اردو" کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ: "اردو کی تحریک ان کے مبارک ہاتھوں سے پروان چڑھی۔" (ص23)
47- مقالات حافظ محمود شیرانی' جلد2 صفحہ128
48- ایضاً' جلد1' صفحہ132
49- سیر الاولیا' ص183' بحوالہ مقالات حافظ محمود شیرانی' جلد اول' صفحہ139
50- شاہ اسماعیل شہید (1821ء کے قریب) "تقویۃ الایمان" میں لکھتے ہیں: "ان آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ اس کے حاصل معنی کا بیان زبان ہندی سلیس میں کر دیا تا کہ عوام اور خواص اس سے فائدہ برابر لیویں۔"
51- اردوئے معلیٰ (لسانیات نمبر)' ص72
52- اردوئے معلیٰ (لسانیات نمبر)' ص59
53- نقوش سلیمانی' ص31
54- ایضاً' ص251
55- کیفیہ' ص28
56- انڈو آرین اینڈ ہندی' ص98۔ انگریزی متن درج ذیل ہے:

"If there had been no Turki-Muhammadan conquest, the modern Indo-Aryan vernaculars might have had their formal birth, but their recognition for serious literary pruposes, it would seem, would have been delayed."

57- انڈو آرین اینڈ ہندی' ص100-101
58- ایضاً' ص102
59- ایضاً' ص129
60- اردوئے معلیٰ (لسانیات نمبر)' ص135' گزشتہ صفحات (47-48) پر اردو ہندی کے مترادف نام بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ کم و بیش یہی بات انیسویں صدی میں جان بیمز نے کہی تھی جب اردو اور ناگری ہندی کے مابین لسانی تنازعہ سیاسی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا: "کوئی یہ نہ کہے کہ اردو ہندی سے الگ کوئی زبان ہے" A Comparative Grammar of the Modern Aryan Languages بحوالہ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ' ص14

61- اردوئے معلّی (لسانیات نمبر) ص 67   62- ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ص 52

63- بحوالہ تاریخ زبان اردو ص 3 ۔ پروفیسر ٹرول بلوخ نے یہ بات 1928ء میں اپنے ایک مضمون میں کہی۔ ڈاکٹر زور اسے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: "ہندوستانی کے آغاز و ارتقا پر غور کرتے وقت دہلی کے اطراف و اکناف کی بولیوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔" (اردوئے معلّی ص 67)

64-'65- تاریخ زبان اردو ص 4   66- ایضاً ص 92

67- تاریخ زبان اردو ص 130 ۔ ورنیکلر ہندوستانی کے عنوان سے چٹر جی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر مسعود حسین اور شوکت سبزواری نے انہی کی بنیاد پر اپنے نظریات استوار کیے ہیں۔ پروفیسر چٹر جی کے بیان کا متن درج ذیل ہے: (ص 153 "انڈو آرین اینڈ ہندی")

"Vernacular Hindustan'-- these are regional dialects of the Western U.P. and Eastern Panjab (current in the Rohilkhand and Meerut Divisions of U.P. and the Ambala district of E. Punjab) with the related Bangaru dialect (current in Karnal and part of Rohtak districts, and in part of Jind state, with most of the Delhi tract to the west of the Jamna); they supplied the basis on which the grammar of Khari Boli of Hindustani, of High Hindu, and of Urdu, so to say -- developed, in the Delhi court and city". p.153.

68- تاریخ زبان اردو ص 154   69- ایضاً ص 157

70- ایضاً ص 203   71- اردوئے معلّی (لسانیات نمبر) ص 70-69

72- ایضاً ص 71   73- اردو زبان کا ارتقا ص 87

74- ایضاً ص 83   75- انڈو آرین اینڈ ہندی ص 161

76- داستان زبان اردو ص 52   77- ایضاً ص 74

78- ایضاً ص 82   79- ایضاً ص 44

80- ایضاً ص 44   81- ایضاً ص 32

82- ایضاً ص 42   83- ایضاً ص 42

84- اردو زبان کا ارتقا ص 50

85- داستان زبان اردو ص 21 (مغربی اضلاع سے ان کی مراد غالباً یو پی کے مغربی اضلاع ہیں)

86- ایضاً ص 39   87- ایضاً ص 21

88- ایضاً ص 21   89- ایضاً ص 27

90- ایضاً ص 94   91- ایضاً ص 55

(در: اورینٹل کالج میگزین، شیرانی نمبر، 1980ء)

خورشید احمد خاں

نوشہ گنج بخشؒ سے منسوب اردو کلام کی اصل حقیقت

(1)

منفرد اشعار کا غلط انتساب تو کوئی بات نہیں، ہمارے یہاں تو ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ ایک شاعر کا پورا دیوان دوسرے شاعر سے منسوب کر دیا گیا۔ اس کی ایک تازہ مثال ضلع گجرات (پنجاب) کے ایک صوفی بزرگ حاجی محمد قادری المشہور نوشہ گنج بخش کی ہے، جو سلسلہ قادریہ کی ایک شاخ نوشاہیہ کے بانی تھے۔ کسی قدیم اور مستند سوانح میں ان کے شاعر ہونے کا ذکر نہیں [1]۔ مگر ان کی وفات [2] کے تقریباً اڑھائی تین سو سال بعد ان کے تذکروں میں چند اردو اشعار ان کے نام سے منسوب کیے جانے لگے۔ یہاں تک کہ 1964ء میں 109 اشعار کی ایک مثنوی [3] ان کے نام سے طبع ہو گئی۔ قدرتی طور پر اب ''گنج الاسرار'' کا ذکر بھی اردو ادب کے تذکروں میں داخل ہونے لگا [4]۔ یہ مثنوی ایم اے اردو کے نصاب میں بھی شامل ہو گئی [5]۔ 1975ء میں ایک اور کتاب ''انتخاب گنج شریف'' [6] چھپ کر آئی تو پتہ چلا کہ حضرت نوشہ گنج بخشؒ صرف ایک مثنوی کے مالک ہی نہیں بلکہ ''اردو اور پنجابی کے پہلے صاحب دیوان شاعر'' ہیں [7]۔ تاریخ ادب اور خصوصاً پنجاب میں اردو کے ہر طالب علم کے لیے یہ خبر بڑی خوش کن اور چونکا دینے والی تھی مگر بوجوہ ذہن اسے آسانی سے قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔

(2)

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ صرف تین سو سال قبل کے ایک صوفی بزرگ اور تصوف کے ایک سلسلے کے بانی کی شخصیت تاریخی طور پر دھندلائی ہوئی ہے اور حالات کے بارے میں متضاد بیانات سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس وقت ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے [8] کہ ان کا نام حاجی محمد [9] تھا یا نعمت اللہ [10]، وہ سید [11] تھے یا علوی [12]۔ اگر علوی تھے تو حضرت عباس [13] کی اولاد تھے یا حضرت مناف [14] کی۔ کھوکھر [15] تھے یا گکھو [16]۔ فی الحال ہمیں اس سے بھی غرض نہیں کہ وہ 1064ھ [17] میں فوت ہوئے یا 1103ھ [18] میں۔ ان کا مزار ساہن

پال 19 ہے یا زُمل 20 میں۔ان کے سجادہ نشین ان کے بڑے بیٹے محمد برخوردار 21 ہوئے یا چھوٹے بیٹے محمد ہاشم 22۔اس وقت تو ہمیں صرف یہ فیصلہ کرنا ہے کہ" گنج الاسرار" اور" انتخاب گنج شریف" (جیسا کہ دعویٰ کیا گیا ہے) واقعی حضرت نوشہ گنج بخش کا کلام ہے؟ اگر نہیں تو اس کا اصل مالک یا مالکان کون ہیں۔

(3)

" گنج الاسرار" دوسری کتاب سے دس سال پیشتر چھپی تھی اس لیے ہم پہلے اس کا جائزہ لیں گے۔

109 اشعار کی اس مثنوی 23 کی تکمیل و ترتیب کے بارے میں فاضل مرتب فرماتے ہیں:"میں نے نہایت جستجو کے ساتھ خاندان کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور بزرگان نوشاہیہ کی قلمی بیاضوں کو ملاحظہ، اور کافی تلاش و جستجو سے ان سب اشعار کو متفرق تحریروں سے جمع کر کے یہ جامع اور مکمل نسخہ" گنج الاسرار" مرتب کیا ہے۔اس کا ماخذ یہ نسخے ہیں۔حروف ابجدی سے ان کے اشارے مقرر کر دیے ہیں:..........

	سال تصنیف	تعداد اشعار
(الف) لطائف گل شاہی	1150ھ	18
(ب) نسخہ مکتوبہ مولوی علم الدین بہلولی	1280ھ	57
(ج) زمزمہ نوشاہی	1335ھ	87
(د) مجموعہ وظائف قادری نوشاہی	1337ھ	36
(ھ) سبیل سلسبیل	1342ھ	29
(و) گلزار نوشاہی	1344ھ	44
(ز) کشکول نوشاہیہ	1350ھ	44

ان میں سے میں نے نسخہ' الف' اور' ج' کو اصل قرار دیا ہے" 24۔

مثنوی کے مفصل مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ فاضل مرتب (شرافت نوشاہی) نے صرف ان نسخوں پر ہی اکتفا نہیں کیا' بلکہ ایسے اشعار بھی درج کر دیے ہیں' جو ان میں سے کسی نسخے میں بھی نہیں 25۔ پھر فاضل مرتب نے کہیں یہ نہیں بتایا کہ آیا مندرجہ بالا تمام کتب قلمی نسخوں کی شکل میں ہیں یا مطبوعہ۔اگر قلمی نسخے ہیں تو کہاں ہیں۔بہر حال نسخہ' و' (گلزار نوشاہی 26) تو مطبوعہ شکل میں ہے۔اس میں کسی ماخذ کی نشاندہی کیے بغیر 44 اشعار حضرت نوشہ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں۔جن دو نسخوں کو اصل قرار دے کر بنیاد بنایا گیا' ان میں سے نسخہ' الف' (لطائف گل شاہی) کا مخطوطہ ہم نہیں دیکھ سکے' البتہ اس کا ایک مبینہ مبیضہ 27 چند لمحوں کے لیے دیکھنے کو مل گیا تھا۔اس میں اٹھارہ اشعار درج تو ہیں' مگر شاعر کا نام کہیں نہیں لکھا گیا۔

" گنج الاسرار" کا آخری شعر بھی، جس میں تخلص استعمال ہوا ہے، اس بیاض میں نہیں ہے۔البتہ

شرافت صاحب نے خود اپنے قلم سے وہاں فارسی میں ایک نوٹ لکھا ہے، جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ "میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ یہ اشعار حضرت نوشہ گنج بخش کے ہیں۔" ظاہر ہے کہ اس شکل میں یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ نسخۂ 'الف' کے اٹھارہ اشعار حضرت نوشہ ہی کے ہیں۔ بقایا نسخوں تک ہماری رسائی نہیں ہوئی مگر چار نسخوں میں (جن میں اصل نسخۂ 'ج' بھی شامل ہے) کوئی بھی چالیس سال سے زیادہ پرانا نہیں 28۔ تین سو سال سے بھی قبل وفات پانے والے بزرگ کے کلام کے لیے ان مخطوطات کو ثبوت کے طور پر کیسے تسلیم کرلیا جائے جب کہ ان میں یہ اشعار بھی بغیر کسی مستند حوالے کے درج ہوں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس مثنوی کی زبان تین چار سو سال قبل کی معلوم نہیں ہوتی 29۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بہت ریاضت محنت طاعت — دل حاضر راکھے ہر ساعت
فضل خدا کا ار توفیق — جب سالک کوں ہووے رفیق
تب پہنچے اس راہ سعادت — علم موافق کرے عبادت
طاعت اوہ جو پیر فرماوے — اپنا کیا کچھ کام نہ آوے
دارو وہ جو دیوے حکیم — آپ دارو کیا کرے سقیم
جو آویں بندیوں کے کام — دین دنیا میں ہوویں تمام
سب قرآن مجید میں آئے — حق تعالیٰ نے آپ فرمائے

"گنج الاسرار" کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ اشعار بے ربط ہیں اور ان میں مضمون اور مطالب کا تسلسل بھی نہیں۔

(4)

اب صرف یہ بتانا باقی رہ گیا کہ ان اشعار کا اصل مالک کون ہے۔ حافظ محمود شیرانی مرحوم نے اردو کی ایک مثنوی "گلزار فقر" کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

"دہلی میں ابھی اردو دبستان قائم بھی نہیں ہو چکتا کہ پنجاب میں لوگ اردو زبان میں مثنویاں لکھنی شروع کر دیتے ہیں۔ میر پور (کشمیر) کے شیخ غلام محمد الدین تصوف میں مثنوی "گلزار فقر" 1131ھ میں ختم کرتے ہیں"30۔

مثنوی "گلزار فقر" از غلام محی الدین ولد قطب عالم شیخ محمد یوسف ساکن میر پور، میر پور فی زمانا گذشتہ صدی کے سیاسی خلفشار کے باعث داخل کشمیر ہے، لیکن مغلیہ عہد میں داخل پنجاب تھا۔ مثنوی ہذا 1131ھ میں لکھی جاتی ہے۔ ہم مصنف کے حالات زندگی سے بالکل تاریکی میں ہیں۔ ان کے بیان سے اس

قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک صادق العقیدہ صوفی تھے۔ چنانچہ تصوف کے مضمون پر یہ مثنوی انہوں نے لکھی ہے۔اس کی ابتدا ہے:

سنوں سادھو اک من کی بات — جس سیں پسپائی ذات صفات
کہے فقیر غلام محی الدین — دین دار کو چاہئے چین
دین دار کوں دین پیارا — واری دین پر عالم سارا
دین دار کا اوچا پایا — چوداں طبق میں اوسکی چھایا

''گلزار فقر'' اسی سال لکھی جاتی ہے، جس سال دہلی میں بہ تتبع ولی دکنی کے تغزل کی بنیاد پڑتی ہے [31]۔

ذخیرہ شیرانی، کتب خانہ دانش گاہ پنجاب لاہور میں ''گلزار فقر'' کے دو قلمی نسخے [32] موجود ہیں۔ ''گنج الاسرار'' کے ساٹھ سے زائد اشعار اسی مثنوی سے ماخوذ ہیں۔ مقابلہ کریں تو ''گنج الاسرار'' میں اشعار کی بے ربطی اور عدم تسلسل کے برعکس ''گلزار فقر'' میں پورا پورا ربط اور تسلسل موجود ہے۔ذیل میں دونوں مثنویوں کے چند مشترک اشعار کا تقابلی نمونہ پیش کیا گیا ہے تا کہ قارئین کرام اس بات کا بذات خود اندازہ لگا سکیں کہ ''گنج الاسرار'' نام کی تصنیف دراصل کس کی ہے:

نمبر شمار	گنج الاسرار (اشعار 1-4)	شعر نمبر	گلزار فقر (اشعار 30-33)
1	جس ذات کا اللہ ناوں اس کا تجھے بتاوں تھاوں	30	جس ذات کا اللہ ہے ناوٗ تس کا مجھے بتاوٗ تھاوٗ
2	کم ایک سے تین ہزار اتنے نام دھرے کرتار	31	ایک کم سوں اور تین ہزار اپنے نام دھرے کرتار
3	اتنے ہوں جس کے ناوں کیونکر چھپتا اس کا تھاوں	32	ایتے ہوون جس کے ناوٗ کیونکر چھپیا اس کا تھاوٗ
4	ظاہر دسے عالم کچا کیونکر چھپتا صاحب سچا	33	ظاہر دستا عالم کانچا کیونکر چھپیا صاحب سانچا
	گنج الاسرار (اشعار 5 - 20)		گلزار فقر (اشعار 242-257)
5	حق ہے باقی عالم فانی فانی کی ناں رہی نشانی	242	حق باقی اور عالم فانی فانی کی نا رہے نشانی
6	وحدت نوں توں کر تحقیق اس کوں من سوں کر تصدیق	243	غیر نہی کر تحقیق اس کوں من سوں کر تصدیق

7	ایس مکان کوں پہنچن مشکل سخت راہ ہے دور ہے منزل	244	پر اس مقام کوں پہنچن مشکل سخت ہے راہ دور ہے منزل
8	بہت ریاضت محنت طاعت دل حاضر راکھے ہر ساعت	245	بہت ریاضت محنت طاعت دل حاضر راکھے ہر ساعت
9	فضل خدا کا ار توفیق جب سالک کوں ہووے رفیق	246	فضل خدا کا اورتوفیق جب سالک کوں ہووے رفیق
10	جب پہنچے اس راہ سعادت علم موافق کرے عبادت	247	تب پہنچے اس راہ سعادت علم موافق کرے عبادت
11	طاعت اوہ جو پیر فرماوے اپنا کیا کجھ کام نہ آوے	248	پیر طاعت وہ جو پیر فرمائے اپنا کیا کچھ کام نہ آوے
12	دارو وہ جو دیوے حکیم آپ دارو کیا کرے سقیم	249	دارو وہ جو دیوے حکیم آپ دارو کیا کرے سقیم
13	کلام خدا کی دارو کھاناں جس جاناں برحق کرماناں	250	کلام خدا کی دارو خانا جس جانا برحق کرمانا
14	جو اذکار افکار افعال جو اوراد وظائف اعمال	251	جو اذکار افکار اشغال جو اوراد وظائف اعمال
15	جو حروف کلمات عظام جو آیات اسماء کرام	252	جو حروف کلمات عظام جو آیات اسماء کرام
16	جو آویں بندیوں کے کام دین دنیا میں ہویں تمام	253	جو آوے بندیوں کے کام دنیاں دین میں ہووے تمام
17	سب قرآن مجید میں آئے حق تعالیٰ نے آپ فرمائے	254	سبھ قرآن مجید میں آئے حق تعالیٰ آپ فرمائے
18	توں کیا جانیں میرے کام کون آیت ار کون ہر نام	255	توں کیا جانے میرے کام کون آیت اورکون ہے نام
19	کون شغل ار کونسا ذکر کونسا عمل ار کونسا فکر	256	کون شغل اور کون ذکر کون عمل اور کون فکر
20	توں اندھلا مجھ کوں کیا سوجھے	257	توں اندھلا تجکوں کیا سوجھے

بھلے برے کوں توں کیا بوجھے　　　بھلے برے کوں توں کیا بوجھے

''گنج الاسرار'' کا آخری شعر (نمبر 109) اس طرح ہے:

یہ سالک عابد کے کام = نوشہ ظاہر کیے تمام

''گلزار فقر'' میں اس شعر کا نمبر 298 ہے اور یہ یوں لکھا گیا ہے:

یہ سالک عابد کے کام = جو سبھ ظاہر کیے تمام

ان دونوں اشعار کے متن میں فرق صرف اتنا ہے کہ دوسرے مصرعے میں ''جو سبھ'' کی بجائے ''نوشہ'' تحریر کر دیا گیا ہے۔ ممکن ہے یہ تبدیلی شرافت صاحب کے کسی قلمی یا مطبوعہ ماخذ میں موجود ہو اور انہوں نے وہاں سے بعینہٖ نقل کر دیا ہو۔ اغلب یہی ہے کہ لفظ تبدیل کر کے اس کو نوشہ سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

''گنج الاسرار'' کے بقیہ پچاس اشعار کے متعلق پتہ نہیں چل رہا تھا کہ یہ کہاں سے آ گئے کہ شریف احمد شرافت نوشاہی کے ایک قریبی عزیز اور ایک جدی بزرگ جناب ابوالکمال برق نوشاہی کی ایک تحریر نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ فرماتے ہیں۔ ''گنج الاسرار'' سے متعلق تو پہلے بھی مشہور ہے کہ یہ حضرت نوشہ گنج بخش کی تصنیف ہے اور اس کا نام ''رمز العباد'' ہے، لیکن اس کا جو نسخہ جناب شریف احمد ساہنپالی نے مرتب کر کے شائع کیا ہے اُس میں انہوں نے کئی اشعار اپنی طرف سے اضافہ کر دیے ہیں۔''[33]

(5)

شرافت صاحب کی دوسری کتاب ''انتخاب گنج شریف'' 1975ء میں بڑے طمطراق سے شائع ہوئی[34]۔ طمطراق کا لفظ ہم نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ 348 صفحات کی اس کتاب کے ابتدائی 60 صفحات پر چھ حضرات[35] نے مختصات تحریر فرمائے ہیں۔ ہمارا واسطہ ان میں سے دو بزرگوں سے ہے۔ ایک تو اس کے مرتب جناب شرافت نوشاہی ہیں جنہیں 2265 اشعار کی تدوین و ترتیب پر تین سال صرف کرنے پڑے[36]۔ دوسرے جنابِ محمد اقبال مجددی جنہوں نے اسے حضرت نوشہ گنج بخش کا کلام ثابت کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی[37] اور 36 صفحات پر مشتمل ایک مبسوط مقدمہ تحریر فرمایا[38]۔ ہمیں فیصلہ یہ کرنا ہے کہ کیا ''انتخاب گنج شریف'' حضرت نوشہ گنج بخش کا کلام ہے یا نہیں اس لیے قدرتی طور پر سب سے پہلے اسی مقدمے کا جائزہ لینا ہوگا۔

جناب شرافت نوشاہی تو خیر پرانی وضع کے بزرگ ہیں مگر جناب محمد اقبال مجددی نے بھی زیر نظر مقدمے میں احتیاط سے کام نہیں لیا اور جو معیار تحقیق پیش کیا ہے اُس سے ہمیں بڑی مایوسی ہوئی۔

مقدمے کی ابتدا حاجی نوشہ گنج بخش کے حالات زندگی سے ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم اس مضمون کی ابتدا میں بتا چکے ہیں کہ فی الحال ہمیں اس بحث میں نہیں الجھنا چاہیے مگر ایک دلچسپ حوالے کی وضاحت

مناسب ہوگی۔ صاحب مقدمہ حضرت نوشہ کے اسم گرامی کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سید جلال الدین شیرازی نے نسب نامہ سادات قلمی میں آپ کا نام نعمت اللہ بتایا ہے، نام اوشان نعمت اللہ و نوشہ گنج بخش و نوشہ ہادی بھوراوا'' نسب نامہ سادات قلمی ورق 70-71 ذخیرہ شیرانی دانش گاہ پنجاب لاہور نمبر 2209 (اس کے مصنف نے حضرت نوشہ کو گیلانی حسنی سادات میں شمار کیا ہے [39])۔

چونکہ پروفیسر صاحب نے مخطوطے کا صحیح نام اور حوالہ نمبر دیا تھا اس لیے وہ آسانی سے مل گیا۔ پوری عبارت (مع سیاق و سباق) ملاحظہ ہو۔

> ''نسب نامہ سادات گیلانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ابنہ سید عبدالوہاب ابنہ سید صفی اللہ ابنہ سید ابو صالح صوفی ابنہ سید احمد ابنہ سید مسعود ابنہ شاہ علی ابنہ سید شاہ مبارک قادری ابنہ سید شاہ معروف ابنہ سید شاہ سلیمان حضرت [40] از نوشہ حاجی از نوشہ ابن بخش بزرگوار ہستند اول خواجہ دوئم شاہ محمد سوئم نور محمد چہارم حاجی عبدالرحمٰن پنجم محمد صالح ششم پیر محمد سچیار۔ کیفیت ایشاں حاجی الحرمین لقب ایشاں حاجی گدائی نام اوشان نعمت اللہ و نوشہ گنج بخش و نوشہ ہادی بھوراوالہ۔ چوں حضرت قدوۃ السالکین و زبدۃ العارفین سراج العاشقین حضرت شیخ اللہ گراتمایہ از بغداد ارزانی فرمودند۔'' [41]

معلوم ہوتا ہے پروفیسر صاحب حضرت نوشہ کے شجرہ طریقت سے واقف نہیں، ورنہ وہ اس عبارت سے ہرگز مذکورہ بالا نتیجہ نہ نکالتے۔ جو شخص حضرت نوشہ گنج بخش اور سلسلہ نوشاہیہ سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہو اس نسب نامے [42] کو دیکھتے ہی فوراً سمجھ جائے گا کہ یہ شجرہ نسب نہیں شجرہ طریقت ہے۔ شاہ مبارک اور شاہ معروف باپ بیٹے نہیں پیر اور مرید ہیں [43]۔ اسی طرح شاہ معروف اور شاہ سلیمان دونوں نہ تو سید ہیں اور نہ باپ [44] بیٹے۔ ان کا رشتہ بھی پیر اور مرید کا ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے انہیں باپ بیٹے اور سید تسلیم کر بھی لیا جائے تو بھی مندرجہ بالا عبارت سے حضرت نوشہ گنج بخش کو حسنی سادات میں کیسے شمار کیا جا سکتا ہے۔ شاہ مبارک اور شاہ سلیمان کے اسم ہائے گرامی کے درمیان تو ''ابنہ'' کا لفظ موجود ہے مگر شاہ سلیمان اور حضرت نوشہ کے درمیان تو وہ بھی نہیں۔ حیرت ہے کہ فاضل مقدمہ نگار نے اس عبارت سے یہ نتیجہ کیسے اخذ کر لیا۔

صفحہ 19 پر حضرت نوشہ گنج بخش کی تصانیف کی ایک فہرست دی ہے مگر حیرت کی بات یہ ہے اس میں دس سال قبل شائع ہونے والی کتاب ''گنج الاسرار'' کا کہیں ذکر تک نہیں۔ کیا فاضل مقدمہ نگار اسے حضرت نوشہ کی تصنیف تسلیم نہیں کرتے؟

پروفیسر صاحب نے حضرت نوشہ کے تین مشائخ کو شاعر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے آخر میں بڑا عجیب و غریب نتیجہ اخذ کیا ہے۔

''آپ نے اپنے مشائخ عظام کو شعر کہتے سنا اور دیکھا اس لیے ناگزیر تھا کہ آپ خود شعر کہیں

اور آپ کے معتقدین بھی طبع آزمائی کریں۔[45]"

ذرا غور فرمائیں کہ مذکورہ بالا تین مشائخ میں ایک تو مخدوم سید محمد غوث حسنی جیلانی اوچی (متوفی 923ھ [46]) ہیں، جو حضرت نوشہ گنج بخش کی پیدائش سے بھی 36 سال قبل وفات پا چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ نوشہ صاحب انہیں شعر کہتے کیسے دیکھ اور سن سکتے تھے۔ دوسرے "شیخ" شاہ سلیمان بھلوالی ہیں جن کا صرف ایک موزوں مصرعہ نقل کیا ہے۔ یا پھر دو شعر "بیاض خاندان فقیر صاحبان قلمی مخزونہ کتب خانہ دانش گاہ پنجاب لاہور" سے دیے ہیں، مگر اس "بیاض" کا حوالہ نمبر، صفحہ وغیرہ کچھ نہیں بتایا[47]۔ تیسرے "شیخ" حضرت نوشہ کے والد ہیں جن کے متعلق دعویٰ کیا گیا ہے کہ ان کی ایک فارسی غزل کسی بیاض میں موجود ہے۔ گویا ایک موزوں مصرعے کے مالک اور صرف ایک فارسی غزل کہنے والے "مشائخ شعراء" کو دیکھ کر حضرت نوشہ کو بھی اردو اور پنجابی کا صاحب دیوان شاعر بننے پر مجبور ہونا پڑا۔

آگے صفحہ 27-28 پر "اندرونی شہادتیں" کے عنوان سے پروفیسر موصوف لکھتے ہیں:

(الف) کتاب کے متعدد اشعار میں آپ نے نوشہ، حاجی نوشہ اور نوشہ قادری بطور تخلص استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

1۔ مرشد دے ہس ہس لبھیا حاجی نوشہ کہے پکار (رسالہ صفت پروان)

2۔ کلمہ جیہا متر نہ کوئی حاجی نوحہ کرے بیان (کلمہ پختہ)

3۔ حاجی نوشہ چڑھیا بیچ جہاز تے (موج لہر)

4۔ انت نہ پایئے کت ول جایئے حاجی نوشہ کہے پکار (وحدت پروان)

یہ بات بخوبی واضح ہے کہ قادری سلسلے میں "حاجی نوشہ" نام کا کوئی دوسرا شخص نہیں ہوا۔ نیز جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے کہ "حاجی" آپ کے نام کا جز تھا۔[48]

زیر نظر کتاب "انتخاب گنج شریف" میں شاعر نے تقریباً 560 جگہ اپنا تخلص استعمال کیا ہے۔ اس میں سے 507 مرتبہ نوشہ، 46 مرتبہ نوشہ فقیر، فقیر نوشہ اور صرف 7 مرتبہ نوشہ قادری لکھا ہے۔ پوری مطبوعہ کتاب میں حاجی نوشہ کہیں نظر نہیں آیا۔ "رسالہ صفت پروان" ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ تمام کتاب دیکھ لی۔ توحید پروان، رسول پروان، مرشد پروان غرضکہ اٹھارہ اقسام کے "پروان" تو مل گئے مگر "صفت پروان" اور "وحدت پروان" کہیں نظر نہیں آئے۔ یہی حال "کلمہ پختہ" کا ہوا۔ "موج لہر" تو کہیں نظر نہیں آئی البتہ یہ مصرعہ "حاجی نوشہ چڑھیا بیچ جہاز تے" "بیاض فقیر غلام محی الدین نوشہ قادری[49] میں مل گیا۔ ہم پوری عبارت نقل کر دیتے ہیں تاکہ پتہ چل جائے کہ شاعر نے اپنے تخلص کے ساتھ "حاجی" کا اضافہ کیوں کیا:

"چڑھیا پور جہاز تے حاجی چلے حج
آکھے نوشہ قادری کے والے یوں لج

حج جہاز تیار ہے نوشہ کہے پوکار
جس کے طلب خدایدی سو ہوئے جہاز سوار
حاجی نوشہ دا جہاز تیار ہے
مردوں جس حضور پہنچنا سو آویں
حاجی نوشہ چڑھیا بچ جہاز تے
چلیا حج گزارن نال نیاز دے'' 50

(ب) اس کے بعد چند ایسے مصرعے جن میں ''نوشہ قادری'' تخلص استعمال ہوا ہے' نقل کرنے کے بعد مجددی صاحب فرماتے ہیں۔ ''اسی طرح اس کتاب میں سیکڑوں مرتبہ نوشہ قادری آتا ہے اور ظاہر ہے کہ قادری خاندان میں سوائے حضرت نوشہ گنج بخش کے اور کوئی بزرگ نوشہ نام نہیں گزرا۔'' 51

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ پوری مطبوعہ کتاب میں صرف سات مرتبہ نوشہ قادری آتا ہے۔ اس لیے یہ سیکڑوں والا معاملہ تو غلط ہو گیا۔ پروفیسر صاحب سیکڑوں کی ایک صفر کم کر دیں تو اس کی مہربانی۔ دوسری بات بھی ٹھیک نہیں۔ صاحب بیاض فقیر سید غلام محی الدین نوشہ قادری نوشاہی برقندازی المعروف ''نوشہ ثانی'' 52 کے نوشہ اور قادری ہونے پر پروفیسر صاحب کو کیا اعتراض ہے۔

(ج) صاحب مقدمہ لکھتے ہیں۔ ''اپنے مرشد کی تعریف میں جا بجا اشعار کہے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

1- مہر مرشد کی کیمیا پربت کرے روال
برکت شاہ سلیمان دی نوشہ بھیا نہال

(اقرار پروان)

2- حضرت کے اصحاب امرا تن کے اگوانی اور فقرا
ان میں ایک نوشہ فقیر جس کا پیر پیر دستگیر
مرشد حضرت شاہ سلیمان جا کی دھانک ہند خراسان

(منت شہانا)

3- شاہ معروف معروف جگ اندر ولی شاہ سلیمان قلندر
نوشہ طالب ہے درگاہی خام مرشد پاک نگاہی

(کرسی نامہ)

4- مرشد شاہ مبارک تارک مرشد شاہ، معروف
مرشد شاہ سلیمان قلندر سب صفتاں موصوف'' 52

(کرسی نامہ)

نمبر 1 کا شعر ہمیں مطبوعہ کتاب میں کہیں نظر نہیں آیا۔ نہ "اقرار پروان" میں ملا۔ نمبر 2 کے اشعار ایک منتشر کے شعر ہیں۔ ویسے بھی صاحب "بیاض فقیر" غلام محی الدین نوشہ قادری نے اپنے فارسی کلام[53] میں جا بجا حضرت سلمان کو اپنا مرشد لکھا ہے۔ اس سے ان کی مراد حضرت سلمان فارسیؓ سے ہے۔ اپنے فارسی اشعار میں انہیں کبھی سلمان اور کبھی سلیمان بھی لکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ ان اشعار میں نوشہ پیر دستگیر (حضرت غوث الاعظم محبوب سبحانی سید عبدالقادر جیلانیؒ) کو بھی اپنا پیر لکھا ہے۔ کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ شاعر کوئی ایسا شخص ہے جس نے خود حضرت پیر دستگیر کے دست مبارک پر بیعت کی ہے۔ نمبر 3 اور 4 کے لیے مجددی صاحب نے "کرسی نامہ" کا حوالہ دیا ہے۔ مطبوعہ کتاب میں تو "کرسی نامہ" کہیں نہیں ملا البتہ مخطوطہ محولہ بالا کے صفحہ 179 سے ہم مکمل "کرسی نامہ" (کچھ سیاق وسباق سمیت) نقل کرتے ہیں:

سجدا کروں اے پربھ میرے توں مالک ملک سبھ تیرے

تیری کہوں صفت ثنا تیری صفت کیسے ہوے۔ بھلا

تیری صفت کرے سو ترے نوشہ تیرا کلمہ بھرے[54]

یاد

کرسی نامہ

1۔ اول فقر حضرت نوں آیا جتھوں فقر حیدر نے پایا

2۔ حسن بصری فقر حقاناں حبیب عجمی درویش برہاناں

3۔ داؤد طائی فقری پائے معروف کرخی پائے اولیائے

4۔ پاک فقیر جنید بغدادی شیخ شبلی درویش تے ہادی

5۔ عبدالواحد درویش سچاناں ابوالحسن فقیر شہاناں

6۔ بوسعید سچا ولی الٰہی شاہ جیلانی دی سدا بادشاہی

7۔ عبدالوہاب سید جیلانی سید صفی الدین حقانی

8۔ سید احمد قادر دا پیارا سید مسعود درویش سنہارا

9۔ سید علی فقر دا پورا شاہ میر دا سدا ظہورا

10۔ شاہ محمود فقر دا سائیں شاہ مبارک دا فقر سبھ جائیں

11۔ شاہ معروف معروف جگ اندر ولی شاہ سلیمان قلندر

12۔ حضرت نوشہ ولی پاک نگاہی پیر محمد سچیار نوشاہی

13۔ حافظ قائم سچا سچیاری شاہ عبدالغفور انصاری

14۔ حضرت شاہ امانت سائیں جیوے ہووے جگاں تائیں [55]

دوہرہ

در امید کے آگ موں جل بل گئے ہزار
اندر بہشت رضا کے توشہ بسیں سچیار
ایک کنارے خوف ہے ایک کنارے آس
آدھ بیچ ایمان ہے تسوں ہمرا باس [56]

صاحب مقدمہ نے نمبر 3، پر جو دو شعر "کرسی نامہ" کے دیئے ہیں ان میں پہلا شعر

شاہ معروف جگ اندر ولی شاہ سلیمان قلندر

تو واقعی "کرسی نامہ" کا شعر ہے (دیکھیں کرسی نامہ کا شعر نمبر 11) مگر دوسرا شعر:

نوشہ طالب ہے درگاہی خادم مرشد پاک نگاہی

تو "کرسی نامہ" کا نہیں۔ معلوم نہیں پروفیسر صاحب نے کہاں سے اٹھا کر یہاں چپکا دیا۔ نمبر 4 کا شعر بھی "کرسی نامہ" کا بتایا گیا ہے مگر ہمیں کہیں نہیں ملا۔ "کرسی نامہ" کے مندرجہ بالا اشعار دیکھ کر ہر شخص بتا سکتا ہے کہ یہ کلام حاجی محمد نوشہ گنج بخش کا ہے یا شاہ امانت کے مرید اور بیاض کے مالک فقیر حیدر غلام محی الدین نوشہ قادری نوشاہی کا۔

(د) صاحب مقدمہ کا ارشاد ہے: "حضرت نوشہ کے ایک خلیفہ حضرت پیر محمد سچیار نوشہروی تھے جنہیں حضرت نے جابجا سچیار کے لقب سے مخاطب کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کلام حضرت نوشہ ہی کا ہے۔ ملاحظہ ہو:

1۔ آکھے نوشہ قادری تو سن سچیارا (شریف پرکاس)
2۔ ذکر نہ موہوں آکھنا سن پیارے سچیار (صدق پروان)
3۔ نوشہ کہے پکار سن پیارے سچیار (صفت نامہ) [57]

یہ صرف پروفیسر صاحب کی خوش فہمی ہے ورنہ پنجابی میں سچیار کے معنی "سچ بولنے والا" [58] کے ہیں۔ فقیر نوشہ نے اسے ایک مثالی (Ideal) فرد کے طور پر استعمال کیا ہے جیسے علامہ اقبال کا مرد مومن۔ خدا جانے مجددی صاحب اسے پیر محمد سچیار تک کیسے لے گئے۔ دور کیوں جائیں خود انہوں نے اپنے مقدمہ میں ایسے اشعار نقل کیے ہیں جن سے "سچیار" کے معنی بخوبی واضح ہو جاتے ہیں:

کون سچیار مرشد سچیار کافر کش مرد دیندار
مرد سچیار دین موں رہے کافر ملیچھ کوں لعنت کہے

مرے تو شہید مارے تو غازی — یچیاروں کی کار جنگ بازی[59]
نوشہ کہے سنو یچیارو — چلو دین پر ہمت نہ ہارو[60]

فقیر صاحب نے 'یچیار' جمع کے صیغہ میں بھی استعمال کیا ہے۔ مندرجہ بالا دو اشعار کے علاوہ چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں:

مولا یاد کرو یچیارو — یاد کیے من حبیب سوارو[61]
پانچویں پڑھت مرشد کی چڑھت — یچیاروں کو بڑھت ہے بڑھت[62]
بے دینوں سے کرے نہ یاری — یچیاروں سے کرے دوستداری
من نیچا اور اونچی ہمت — یچیاروں کی ایسی گت
جا کے قول موں شک نہ کوئی — یچیاروں کا مرشد سوئی[63]

یہ تمام اشعار ہم نے مطبوعہ کتاب سے نقل کیے ہیں۔ مخطوطے میں 64 بعض جگہ یہ لفظ خلفائے راشدین کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً "حق چار یچیار" یا "چار یچیار۔ 65"

مطبوعہ کتاب کے صفحہ 154 پر 'وار یچیار' کے عنوان سے متعدد اشعار اور دوہڑے لکھے ہوئے ہیں۔ جناب شرافت نوشاہی نے بجا طور پر یہاں آیت شریف 'وکونوا مع الصادقین' کی سرخی جمائی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ یچیار جو کلمہ پڑھے — لے ہتھیار گھوڑے پر چڑھے
وہ یچیار جو دین پر قائم — رہے ایک سا قائم دائم
وہ یچیار جو ستھرا رہے — وہ یچیار جو جھوٹھ نہ کہے

ایک دوہڑہ ملاحظہ ہو:

نوشہ مرد یچیار کوں کہا بے چون چگوں
لاخوف علیھم و لاھم یحزنون

ایک اور دوہڑہ (ص 155) معاملہ صاف کر دیتا ہے:

کلمہ پڑھے صراط سوں بھیا یار یچیار — نوشہ کون یچیار ہے مومن ہے یچیار

(ہ) اس کے بعد پروفیسر صاحب نے نوشہ کے پنجابی اشعار پر بحث کی ہے مگر کہیں بھی مخطوطہ کے صفحہ وغیرہ کا حوالہ نہیں دیا۔ مطبوعہ کتاب میں چونکہ پنجابی کلام نہیں دیا گیا' اس لیے فی الحال اس پر بحث غیر ضروری ہے۔ اس بیاض کے پنجابی اشعار بھی اسی شاعر کے ہیں، جس کے اردو اشعار، اور بقول جناب ضیغم 66 زبان بھی پھالیہ کے علاقے کی نہیں۔

"گنج شریف پر اجمالی نظر" کے عنوان سے صاحب مقدمہ لکھتے ہیں: "گنج شریف اردو اور پنجابی

کے چھ ہزار چار سو اشعار پر مشتمل ہے۔ جس میں اردو حصہ کے دو ہزار چار سو اور پنجابی کے چار ہزار اشعار ہیں۔"[67]

زیر نظر کتاب کا نام "انتخاب گنج شریف" ہے۔ مقدمے سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ "انتخاب" سے کیا مراد ہے اور انتخاب کا معیار کیا ہے۔ بہر حال شرافت نوشاہی صاحب کی تحریر سے پتہ چلا کہ "اس کا ہندی اردو انتخاب اہل علم کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے"[68] چند سطر بعد ہی انہوں نے اس کا نام مختصر کر کے "اردو انتخاب گنج شریف" لکھا ہے[69] جو سرورق تک پہنچتے پہنچتے صرف "انتخاب گنج شریف" رہ گیا۔ مطبوعہ کتاب 2400 کی بجائے صرف 2265 اشعار پر مشتمل ہے۔ بقایا 135 اشعار کہاں گئے، جناب اقبال مجددی کو وضاحت فرمانا چاہیے تھی۔

اس کے بعد دس صفحات میں کلام کے اوزان، اصناف شعر، محاسن وغیرہ اور حضرت نوشہ کے شیوخ کے حالات بیان کرنے کے بعد صفحہ 42 پر "نسخ خطی" کے عنوان سے پروفیسر موصوف یوں رقم طراز ہیں:

"گنج شریف متعدد قلمی بیاضوں کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔

1۔ خاندانی و آبائی بیاض متفرق محفوظ کتب خانہ ہائے اصحاب سلسلہ نوشاہیہ۔

2۔ بیاض تحسین، مخزونہ کتاب خانہ دانش گاہ پنجاب، لاہور نمبر 1339۔

3۔ بیاض مملوکہ پروفیسر قریشی احمد حسین احمد قلعداری، زمیندارہ کالج، گجرات۔

4۔ بیاض فقیر غلام محی الدین نوشاہی، لاہوری (1166 - 1241ھ/1753 - 1825ء)

یہ بیاض لاہور کے فقیر خاندان کے مورث اعلیٰ فقیر غلام محی الدین بخاری لاہوری نوشاہی برقندازی کی ہے۔ "تشریف الفقرا" اور "کشکول نوشاہی" اسی نوشاہی خاندان کے سلوک پر انہوں نے تصنیف کی تھیں۔ وحدت نامہ (حاشیہ: مثنوی وحدت نامہ قلمی ذخیرہ آذر کتب خانہ دانش گاہ پنجاب، لاہور نمبر 294) بھی تصوف کے موضوع پر ان کی اچھی کتاب ہے....."[70]

گویا یہ چار مآخذ ہیں جن کی بنیاد پر اردو پنجابی کے پہلے "دواوین" کا عالی شان قصر تعمیر کیا گیا ہے۔ پہلا ماخذ مبہم اور غیر معین ہے۔ وہ زمانہ گیا جب صرف "نقلست" یا "قال" سے کام چل جاتا تھا، اس دور میں نہ کوئی سنجیدہ محقق اس طرح کے بے سروپا حوالے دیتا ہے نہ کوئی تسلیم کرتا ہے۔ دوسرا ماخذ "بیاض تحسین" چھوٹے سائز کے چند اوراق پر مشتمل ذخیرہ شیرانی کا نسخہ ہے[71]۔ اس میں حضرت گنج بخش کا کوئی کلام نہیں ہے۔ تیسرا ماخذ بھی مبہم اور غیر واضح ہے۔ قلعداری صاحب کی مملوکہ بیاض کس نے تحریر کی، کس سنہ میں تحریر کی، اس میں سے کتنے اور کون کون سے اشعار نقل کیے گئے، حضرت نوشہ گنج بخش کا کلام ہونے کا کیا ثبوت ہے۔ اس بارے میں پوری مطبوعہ کتاب میں ایک لفظ نہیں ملتا۔ اب صرف ایک ہی ماخذ باقی رہ جاتا ہے یعنی "بیاض فقیر غلام محی الدین نوشاہی لاہور" جس کے بارے میں محولہ بالا عبارت کے علاوہ صفحہ 43 پر جو معلومات فراہم

کی گئی ہیں' ان سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ" گنج شریف کی ترتیب و تدوین میں اس بیاض سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے بلکہ اس کا زیادہ حصہ اس سے منقول ہے..... اس بیاض کی روشنائی اور کاغذ کم از کم دو سو سال قدیم ہے...... یہ بیاض حدود 1186ھ/1772ء میں لکھا گیا...... اس بیاض میں طبی نسخے بھی موجود ہیں...... اس بیاض کے صفحات 408، سطور فی صفحہ 9' 5، 10 x 7۔ اس وقت یہ اہم بیاض کتب خانہ دانش گاہ پنجاب، لاہور میں محفوظ ہے"72۔

معنی خیز بات یہ ہے کہ مجددی صاحب نے جو اپنے اکثر مضامین میں معمولی معمولی (بلکہ بعض اوقات غیر ضروری اور غیر متعلق) معاملات پر بحث کرتے ہوئے مخطوطات کا نام، حوالہ نمبر اور صفحہ نمبر تک تحریر کرنے کے عادی ہیں' نہ تو اس "اہم بیاض" کا حوالہ نمبر دیا ہے' نہ (یونیورسٹی لائبریری کے ریکارڈ کے مطابق) اس کا صحیح نام ہی لکھا ہے۔ صفحہ 49 پر مقدمہ کے ماخذ میں جن مخطوطات کی فہرست دی گئی ہے' وہاں بھی یہی نام بغیر کسی حوالہ نمبر درج ہے۔

(6)

کتب خانہ دانش گاہ پنجاب کا شمار دنیا بھر میں مخطوطات کے عظیم کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ اس میں اٹھارہ ہزار سے زائد مخطوطات ہیں۔ مفصل فہرست کا تو کیا ذکر (عربی، فارسی کے چند مخطوطات چھوڑ کر) تمام مخطوطات کی کوئی مکمل فہرست بھی شائع نہیں ہوئی۔ اردو اور پنجابی کے مخطوطات کی تو کوئی فہرست سرے سے شائع ہی نہیں ہوئی۔ ان حالات میں اس عظیم ذخیرے سے بغیر حوالہ نمبر کسی مخطوطے کو ڈھونڈ نکالنا خصوصاً جب کہ اس کا نام بھی لائبریری رجسٹر کے مطابق نہ ہو' ایک معجزہ ہے۔ اس تلاش میں ہمیں کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، اسے کچھ وہ حضرات ہی سمجھ سکتے ہیں، جو اس کتب خانہ میں مخطوطات سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ 73

دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا مخطوطے کے مصنف کا نام مجددی صاحب کے مقدمے میں سات مرتبہ آیا ہے مگر کہیں بھی نام کے ساتھ تخلص نوشہ اور لقب "نوشہ ثانی" نہیں لکھا گیا۔ اقبال مجددی صاحب یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ فقیر صاحب کے تخلص نوشہ، ان کے لقب "نوشہ ثانی" اور ان کی نسبت قادری سے لاعلم تھے۔ انہوں نے "نقوش"74 (لاہور نمبر) میں حکیم محمد موسیٰ امرتسری کا فقیر صاحب کے بارے میں مضمون ملاحظہ فرمایا ہوگا، اور "صحیفہ"75 میں گوہر نوشاہی کا مضمون "رسالہ از آثار فقیر نوشہ" بھی ضرور پڑھا ہوگا۔ وہ فقیر صاحب کی مثنوی "وحدت نامہ"76 کا بھی مطالعہ کر چکے ہیں جس کے چند اشعار انہوں نے اپنے مقدمہ کے صفحہ 42 پر نقل کیے ہیں۔ انہوں نے "دیوان منور" کا بھی ضرور مطالعہ کیا ہوگا جس میں حضرت فقیر نوشہ ثانی کے مفصل حالات مذکور ہیں۔ ان تمام حقائق کے باوجود ان کی تحریر میں کہیں ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کہ صاحب بیاض

فقیر غلام محی الدین کا لفظ ''نوشہ'' سے کوئی تعلق ہے۔ صفحہ 43 کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

''فقیر غلام محی الدین کا فرزند اصغر خلیفہ نورالدین ف 1268ھ/1852ء رنجیت سنگھ کے عہد میں سیالکوٹ اور جالندھر کا گورنر تھا۔ اس نے اپنے ''دیوان منور''[77] میں پندرہ اشعار کا ایک قصیدہ حضرت نوشہ کی مدح میں لکھا ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

جناب حضرت نوشاہ امجد بود لطف تو بیروں از حد و عد

اس لیے مذکورہ بیاض فقیر غلام محی الدین میر جو حاجی نوشہ کا کلام ہے وہ بے شک وشبہ بانی سلسلہ نوشاہیہ حاجی محمد نوشہ گنج بخش قادری کا ہے۔''[78]

ہم حیران تھے کہ حضرت نوشہ گنج بخش کا سارا علمی ورثہ فقیر خاندان کے اندر ہی محدود ہو کر رہ گیا مگر مطلع میں لفظ ''امجد'' دیکھ کر ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ ''دیوان منور'' کا صفحہ 119 کھول کر دیکھا تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ خلیفہ نورالدین منور نے یہ قصیدہ حضرت نوشہ گنج بخش کی مدح میں نہیں بلکہ اپنے والد نوشہ ثانی کی مدح میں لکھا ہے۔ وضاحت کے لیے ''امجد'' پر نشان حاشیہ لگا کر نیچے حاشیہ میں صاف لکھا تھا۔ شاعر کے والد بزرگوار فقیر سید غلام محی الدین جو بعد میں نوشہ ثانی کے لقب سے مشہور ہوئے''[79]۔ اس صاف صاف وضاحت کے باوجود پروفیسر صاحب نے ''نوشہ ثانی'' کو ''نوشہ گنج بخش'' بنا دیا۔ مخطوطات کے حوالوں میں تو لوگ ممکن ہے گڑ بڑ کر لیتے ہوں، کسی کو اس دیدہ دلیری سے مطبوعہ کتاب کا غلط حوالہ دیتے ہم نے پہلی بار دیکھا ہے۔

(7)

مقدمہ صفحہ 44، 49 پر ''حیات حضرت نوشہ گنج بخش کے اہم سنین'' کے زیر عنوان حضرت نوشہ کے حالات زندگی اور معجزات سن وار بیان کیے گئے ہیں[80]۔ جیسا کہ ہم اپنے مضمون کی ابتدا میں بتا چکے ہیں کہ فی الحال ہم حضرت نوشہ گنج بخش کے حالات زندگی کے متعلق کسی بحث میں نہیں الجھنا چاہتے، تاہم چند امور کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

1۔ یہاں بیان کردہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوشہ کے والد نے سات حج کیے مگر حاجی نوشہ کے کسی سفر حج کا کوئی ذکر نہیں۔ حالانکہ جناب شرافت نوشاہی نے ''گنج الاسرار'' میں حضرت نوشہ سات حج کروائے ہیں مگر ان کے والد کے کسی حج کا ذکر نہیں کیا۔ اس گڑ بڑ میں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ سات حج باپ نے کیے ہیں یا بیٹے نے۔

2۔ 986ھ میں حضرت نوشہ کے پہلی مرتبہ لاہور جانے اور مسجد فرید بخاری میں شیخ عبدالوہاب سے ملاقات کا ذکر تو موجود ہے مگر اس موقع پر شاہی پہلوان سے حضرت کی پنجہ کشی کے واقعہ کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا[81] حالانکہ ''تذکرہ نوشاہی'' اور ''کنز الرحمت'' دونوں[82] میں یہ واقعہ تفصیل سے درج ہے۔

3۔ بیان شدہ حالات کی رو سے حضرت نوشہ کی عمر 105 سال[83] ان کے بڑے صاحبزادے میاں برخوردار کی 108 سال اور چھوٹے صاحبزادے میاں ہاشم کی 97 سال ہوئی۔ مزیدار بات یہ ہے کہ میاں برخوردار کے ہاں جب پہلا بیٹا پیدا ہوا تو اس وقت ان کی اپنی عمر 70 سال دوسرے بیٹے کی پیدائش کے وقت 75 سال اور تیسرے بیٹے کی ولادت پر 78 سال تھی۔ باقی تین بیٹے اس سے بھی بعد میں پیدا ہوئے۔

4۔ حضرت نوشہ کے حالات میں پورے 41 سال (1014ھ۔1055ھ) کے عرصہ کا کوئی واقعہ بیان نہیں کیا گیا۔ اس پر مجددی صاحب نے حاشیہ میں لکھا ہے یہاں 1015 - 1054ھ ایک طویل خلا پایا جاتا ہے' جسے ہم سردست پُر نہیں کر سکتے۔''[84]

(8)

لاہور کے مشہور فقیر خاندان کے مورث اعلیٰ فقیر سید غلام محی الدین نوشہ قادری المعروف نوشہ ثانی کے والد سید غلام شاہ بخاری چونیاں (ضلع لاہور) کے رہنے والے تھے۔ فقیر صاحب تقریباً 1154ھ میں دریائے بیاس کے کنارے رہیلہ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ابھی تین ماہ کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کے والد کے دوست لاہور کے ایک نامور طبیب حکیم عبداللہ انصاری نے ان کی پرورش کی۔ اعلیٰ تعلیم دلوائی اور جوان ہونے پر اپنے بڑے بھائی خدا بخش کی لڑکی سے ان کی شادی کر دی۔ فقیر صاحب نے طبابت اور کتب فروشی کا پیشہ اختیار کیا۔ آپ نے فقیر شاہ امانت قادری کے ہاتھ پر بیعت کی اور غالباً اسی نسبت سے فقیر کا لقب بھی اختیار کیا۔ آپ کا شجرہ طریقت پانچ واسطوں (شاہ امانت قادری، شاہ عبدالغفور جالندھری، حافظ قائم الدین برقنداز، حضرت پیر محمد سچیار، حضرت حاجی محمد نوشہ گنج بخش) سے بانی سلسلہ نوشاہیہ تک پہنچتا ہے۔ فقیر صاحب نے نوشاہ ثانی کا خطاب اور نوشہ تخلص بھی بانی سلسلہ کی عقیدت میں غالباً خود اپنے لیے منتخب کیا۔[85]

اگرچہ فقیر صاحب کا تعلق سادات کے ایک مشہور خانوادے سے تھا جس کا شجرہ نسب مخدوم سید جلال الدین جہانیاں جہاں گشت بخاری اوچیؒ سے جا ملتا ہے مگر آپ اپنے مربی اور منہ بولے باپ حکیم عبداللہ انصاری کی رعایت سے تمام زندگی اپنے آپ کو انصاری لکھتے رہے بلکہ آپ کے نامور بیٹے (فقیر عزیز الدین اور خلیفہ نور الدین' وزرا دربار مہاراجہ رنجیت سنگھ) بھی یہی طرز عمل اختیار کیے رہے۔

(لوح مزار کے مطابق) آپ نے 1229ھ میں بعمر 75 سال وفات پائی۔ فقیر صاحب اعلیٰ درجہ کے عالم، فاضل، طبیب اور صحیح العقیدہ صوفی بزرگ ہونے کے علاوہ فارسی، اردو، ہندی اور پنجابی کے شاعر بھی تھے۔ آپ کی ایک فارسی تصنیف ''وحدت نامہ'' یا ''مثنوی تصوف'' کے دو قلمی نسخے[86] کتب خانہ دانش گاہ پنجاب میں موجود ہیں۔ اس مثنوی کے اشعار میں جا بجا آپ نے اپنا نام' لقب اور تخلص استعمال کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نوشہ ثانی بخاری نژاد
خاکپائے حضرت زین العباد

(ورق 12۔الف)

نوشہ ثانی بخاری النسب
گو غلام محی الدین دارد لقب

(ورق 13۔ب)

عقل نوشہ تا بایں جا کے رسد
آں کسے داند کہ او با وے رسد

(ورق 16۔ب)

اے برادر بشنو از نوشہ فقیر
ناتوانی صحبت نیکاں پذیر

(ورق 21۔الف)

از غلام محی الدین نوشاہ شد
چوں غلامی کر وانگہ شاہ شد

(ورق 28۔ب)

زو غلام محی الدین نوشاہ شد
تاج درویشی گرفت و شاہ شد

(ورق 83۔الف)

نوشہ سلمانی ام روحانیم
کردہ سلماں عارف حقانیم

(ورق 99۔الف)

نوشہ از سلماں رہ توحید یافت
وز محمد مصطفیٰ تائید یافت

(ورق 104۔ا)

(9)

جناب شرافت نوشاہی اور اقبال مجددی اس مثنوی کو فقیر غلام محی الدین نوشہ قادری ہی کی تصنیف

مانتے ہیں۔ 87 مگر آپ کے اردو پنجابی کلام پر مشتمل ضخیم بیاض کے، جو قلمی نسخہ کتب خانہ دانش گاہ پنجاب 88 میں ہے، درج کلام کو فقیر نوشہ قادری کے بجائے حاجی محمد نوشہ گنج بخش کا کلام ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ''انتخاب گنج شریف'' کے جملہ اشعار فقیر صاحب کی اسی خودنوشت بیاض سے نقل کیے گئے ہیں مگر نقل مطابق اصل نہیں۔ مرتب نے مخطوطہ پڑھنے میں بے شمار غلطیاں کی ہیں۔ صرف املا ہی نہیں بدلی بلکہ اپنا مؤقف ثابت کرنے کے لیے جہاں ضرورت محسوس کی اُصل متن میں بھی تبدیلی کرلی ہے۔

ہم اپنے بچپن میں سنا کرتے تھے کہ چودھویں صدی آخری صدی ہے۔ قیامت آنے والی ہے۔ صدی ختم ہوتے ہی امام مہدی ظاہر ہو جائیں گے۔ تیرہویں صدی ہجری کے ادب میں بھی بعض جگہ کچھ اسی قسم کے اشارے ملتے ہیں کہ تیرہویں صدی آخری صدی ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ ہر صدی میں اس قسم کی باتیں مشہور ہیں۔ اب بیاض مذکورہ کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

سن ہجری حضرت جیو کے جب بارہاں سے ہو جاویں گے
ان کے پاچھے بڑے امام محمد مہدی آویں گے

(مخطوطہ، ص171)

چونکہ یہاں ''بارہاں سے'' (بارہ سو) سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ یہ کلام بارہویں صدی کا ہے اس لیے متن میں تبدیلی کے بعد مطبوعہ کتاب (انتخاب گنج شریف) میں شعر کی شکل یہ ہوگی:

سن ہجری حضرت جیو کے جب کتنے سے ہو جاویں گے
ان کے پاچھے بڑے امام محمد مہدی آویں گے

(انتخاب گنج شریف، ص105)

اس قافیہ ردیف کے ایک اور شاعر نے تخلص کی بجائے اپنا نام استعمال کیا۔

اون کے چرن مبارک پر جب واری واری جاویں گے
تو سلطان سویا بل محی الدین جگ میں سینہ کہاویں گے

(مخطوطہ، ص172)

یہاں بھی محی الدین کے الفاظ سے بھانڈا پھوٹنے کا خطرہ تھا۔ لہٰذا شعر کو مشرف بہ تخلص کر کے یوں بنا دیا:

ان کے چرن مبارک پر جب وارے وارے جاویں گے
تو سلطان سو یہ نوشہ جگ میں سینہ کہویں گے

(انتخاب گنج شریف، ص105)

اسی طرح کرسی نامہ 89 (شجرہ طریقت) میں بھی تحریف کی گئی؛ جس کی تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے

ہیں۔ اگر کرسی نامہ 90 صحیح نقل کر دیا جاتا تو فوراً معلوم ہو جاتا کہ اصل شاعر کون ہے۔

(10)

فقیر نوشہ کا عہد شباب (1170-1210ھ) بقول حافظ محمود شیرانی "پنجاب کی تاریخ کا تاریک ترین ورق ہے۔ مغلیہ سلطنت اپنے تنزل کے آخری مراحل طے کر رہی ہے۔ نادر کے بعد احمد شاہ ابدالی نے اپنے مشہور حملے شروع کر دیے ہیں اور سکھ جماعت غارت و رہزنی میں مصروف ہے۔ قتل و خونریزی کا بازار چار سُو گرم ہے۔"91 ہمارے شاعر نے بھی اپنے کلام میں جا بجا سکھوں خصوصاً اکالیوں کی بے راہ روی اور ظلم و ستم کی شکایت کی ہے:

پڑھن سادھاں دیاں بانیاں ہتیا کرن بے انت
جے سنتاں ایہ آکھیا تاں بھٹ پئے اوہ سنت

پھر لوٹ مار اور آتشزنی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مقطع میں کہتے ہیں:

جیہڑے لچے جہاں دے سے سنگھ اکالی
آکھے نوشہ قادری ایہ قوم دجالی

(مخطوطہ ص 126)

غور فرمایئے حاجی نوشہ گنج بخش کا زمانہ (959-1064ھ) تو مسلمانوں کا سنہری دور تھا۔ اس وقت سکھ اتنے طاقتور کب تھے کہ مسلمانوں کو لوٹتے، ان کی بستیوں کو آگ لگاتے اور پھر اس وقت اکالیوں کا تو نام و نشان بھی نہیں تھا۔ یہ فرقہ بارہویں صدی ہجری میں دسویں گورو گوبند سنگھ (متوفی 1118ھ) کے زمانے میں وجود میں آیا۔ ظاہر ہے کہ اس نوشہ قادری کا تعلق جو شاعر ہے' دسویں یا گیارہویں صدی سے نہیں بلکہ بارہویں صدی کے نصف دوم سے ہے' اس لیے فاضل مرتب نے مطبوعہ کتاب میں یہ شعر شامل کرنے سے گریز کیا۔

(11)

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ فقیر صاحب سید ہونے کے باوجود اپنے منہ بولے باپ حکیم عبداللہ انصاری کی رعایت سے اپنے آپ کو انصاری لکھتے رہے۔ چنانچہ بعض اشعار میں فقیر نوشہ قادری کی بجائے فقیر نوشہ انصاری بھی آیا ہے۔ مثلاً

میاں صاحب پھیرا پایا وچ فقیراں آیا
روٹھا ہو یا گروہ فقیراں مہر کر آپ منایا

بھول چوک معاف سبھو سرو پائے بٹھایا
نوشہ کہے فقیر انصاری واہ میاں صاحب دا پایا

(مخطوطہ ص236)

فاضل مرتب نے اس قسم کے اشعار بھی نقل نہیں کیے۔

ہمیں معلوم ہے کہ فقیر سید غلام محی الدین بخاری ایک صوفی اور شاعر ہیں، نوشہ ان کا تخلص ہے اور نوشہ ثانی ان کا لقب۔ ان کا فارسی کلام ہمارے پاس پہلے سے موجود ہے۔ اب اگر ان کی خود نوشت بیاض ملتی ہے جس میں انہوں نے اپنا شجرہ نسب اور شجرہ طریقت نظم کیا ہے اور نوشہ، فقیر نوشہ، نوشہ قادری، نوشہ انصاری بطور تخلص استعمال کیے ہیں۔ کسی دوسرے شخص کا کلام نقل کرنے کا کہیں ذکر نہیں۔ انہی کے عہد کے تاریخی واقعات کا ذکر اشعار میں آتا ہے۔ زبان بھی ان کے عہد کی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ کلام انہیں کا بھی ہے۔ اگر وہ حاجی محمد نوشہ گنج بخش کا کلام نقل کرتے تو ضرور کہیں نہ کہیں اس کا حوالہ دیتے یا ان کا نام ہی لکھتے۔

حواشی:

1۔ شرافت نوشاہی: گنج الاسرار، ساہن پال، انجمن سادات نوشاہیہ 1384ھ، ص 21'22۔

2۔ بقول جناب شرافت نوشاہی انہوں نے 1064ھ میں وفات پائی

3۔ گنج الاسرار، بحوالہ بالا۔

4۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو، جلد اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، لاہور 1975ء ص 627۔

5۔ ''پاکستان کا قدیم اردو ادب۔''

6۔ ''انتخاب گنج شریف''۔ جمع و تدوین شرافت نوشاہی۔ تقدیم محمد اقبال مجددی، لاہور۔ دار المورخین، 1974ء۔

7۔ ایضاً۔ مقدمہ، ص 31۔

8۔ حضرت نوشہ گنج بخش کے حالات زندگی اور صحیح سال وفات کے بارے میں ایک مضمون انشاء اللہ جلد قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔

9۔ انتخاب گنج شریف، بحوالہ بالا، ص 15۔

10۔ سید جلال الدین شیرازی: نسب نامہ سادات قلمی ورق 70، 71 ذخیرہ شیرانی، دانش گاہ پنجاب نمبر 2209۔

11۔ برصغیر پاک و ہند میں سید کا لفظ خاتون جنت سیدہ فاطمہ زہرا کی اولاد کے لیے بولا جاتا ہے۔ عرب ممالک میں انہیں شریف کہتے ہیں۔

12۔ انتخاب گنج بخش بحوالہ بالا ص 16۔ 13۔ ایضاً۔

14۔ محمد اشرف نوشاہی: کنز الرحمت، ونجے ضلع گوجرانوالہ۔ 1911ء ص 31۔

15۔ محمد حیات قادری نوشاہی: گلزار نوشاہی، ص 15۔

16۔حضرت نوشہ گنج بخش کے پڑپوتے اپنی کتاب "تذکرہ نوشاہیہ" (احوال حضرت نوشہ) (تصنیف 1146ھ) میں لکھتے ہیں "میاں نور محمد نام بزرگ از یاران حضرت شاہ حاجی گفتگو میگویند" ملاحظہ فرمائیں مخطوطہ نمبر 618/4۔ذخیرہ شیرانی دانش گاہ پنجاب لاہور۔ورق 75،الف۔

17۔انتخاب گنج شریف محولہ بالا،ص 17۔

18۔مفتی غلام سرور لاہوری: "خزینۃ الاصفیا" لکھنؤ۔نولکشور۔

19۔انتخاب گنج بخش شریف محولہ بالا،ص 18۔

20۔ابو الکمال برق نوشاہی: چہار بہار۔مکتبہ نوشاہیہ ڈنگہ 1979ء مقدمہ،ص 28۔

21۔انتخاب گنج شریف محولہ بالا،ص 21۔

22۔"چہار بہار" محولہ بالا ص 29۔

23۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اشعار کی تعداد 164 لکھی ہے،جو صحیح نہیں۔"تاریخ ادب اردو" جلد اول،لاہور۔مجلس ترقی ادب 1975ء،ص 627۔

24۔شرافت نوشاہی: گنج الاسرار محولہ بالا،ص 27،28 تعداد اشعار سنین،ص 19،21۔

25۔ایضاً،ص 33۔

26۔محمد حیات قادری نوشاہی،گلزار نوشاہی محولہ بالا۔

27۔"شریف التواریخ" جلد اول کی تعارفی تقریب (غالباً اپریل) 1980ء میں پاکستان نیشنل سنٹر لاہور میں منعقد ہوئی تھی۔ اس موقع پر شرافت صاحب نے "مخطوطات" کے نام پر چند صحیفات نمائش کے لیے رکھے تھے۔انہی میں اس بیاض (لطائف گل شاہی) کا صحیفہ بھی شامل تھا۔یاد رہے کہ صاحب بیاض میاں گل محمد نوشاہی حضرت نوشہ گنج بخش کے پڑپوتے ہیں مگر انہوں نے کہیں اپنے پردادا کے شاعر ہونے کا ذکر تک نہیں کیا۔

28۔"گنج الاسرار" 1373ھ میں مرتب ہوئی۔

29۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اس کی زبان بارہویں صدی ہجری کی زبان معلوم ہوتی ہے۔"تاریخ ادب اردو" جلد اول،ص 626۔

30۔مقالات حافظ محمود شیرانی۔جلد دوم،ص 128۔

31۔ماہنامہ "سات رنگ" کراچی۔نومبر 1961ء "قدیم اردو"،ص 6،7۔

32۔ایک اطلاع کے مطابق اس مثنوی کے قلمی نسخے ڈاکٹر احمد حسین احمد قریشی قلعداری (گجرات) اور مولوی عبدالمالک مصنف "شاہان گوجر" (بہاولپور) کے کتب خانوں میں بھی موجود ہیں۔

33۔شیخ محمد ہاشم "چہار باغ" تقدیم سید ابو الکمال برق نوشاہی،ڈنگہ (ضلع گجرات) 1979ء،ص 23-24۔

34۔"انتخاب گنج شریف" دار المورخین،لاہور،1975ء۔

35۔ (i) چند سطور "گنج شریف" کے بارے میں (ڈاکٹر سید عبداللہ) ص 12-14۔

(ii) "تقدیم" (پروفیسر محمد اقبال مجددی) ص 15-50۔

(iii) "وجہ تعارف" (قاضی عبدالنبی کوکب) ص 51-52۔

(iv) ''سخندان چند'' (قریشی احمد حسین احمد) ص 53-55۔

(v) ''گنج شائگان'' (حکیم محمد موسیٰ امرتسری) ص 56۔

(vi) ''روداد تدوین و ترتیب'' (سید شرافت نوشاہی) ص 57-60۔

36۔ ''انتخاب گنج شریف'' محولہ بالا، ص 58۔

37۔ ایضاً، ص 59۔

38۔ ایضاً، ص 15-50۔

39۔ ایضاً ص 15 (حاشیہ)

40۔ یہاں کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ ''حضرت از'' کی بجائے ''از حضرت'' ہونا چاہیے۔

41۔ نسب نامہ سادات قلمی محولہ بالا، ورق 70-71۔

42۔ نسب نامہ کرسی نامہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ فرہنگ آصفیہ جلد چہارم ص 558۔

43۔ انتخاب گنج شریف محولہ بالا، ص 38۔

44۔ ایضاً ص، 38۔ 45۔ ایضاً، ص 27۔

46۔ ایضاً، ص 24۔

47۔ ایضاً ص 25۔

48۔ ایضاً ص 28۔

49۔ فقیر غلام محی الدین نوشہ قادری المعروف نوشہ ثانی ''چند رسائل کشکول نوشاہیہ'' کتاب خانہ دانش گاہ پنجاب۔ ذخیرہ شیرانی، قلمی نمبر 6223۔ 50۔ ایضاً ص۔

51۔ انتخاب گنج شریف محولہ بالا ص 28۔

52۔ ملاحظہ فرمائیں ایضاً ص 28-29۔

53۔ ملاحظہ فرمائیں ''مثنوی تصوف'' (وحدت نامہ) مخطوطہ نمبر Pi,vi, 178/825۔ اور مجموعہ آذر 294/7515 کتب خانہ دانش گاہ پنجاب لاہور۔

54۔ یہ تین اشعار مطبوعہ کتاب کے ص 195 پر موجود ہیں۔

55۔ حاشیہ مذکورہ پائین ملاحظہ ہو۔

56۔ یہ دوہڑہ بھی مطبوعہ کتاب کے ص 145-46 پر نقل کیا گیا ہے۔

57۔ ''انتخاب گنج شریف محولہ بالا۔ مقدمہ ص 29۔

58۔ مختصر پنجابی لغت مرتبہ پروفیسر شریف کنجاہی، ص 224۔

59۔ انتخاب گنج شریف محولہ بالا مقدمہ ص 39۔

60۔ ایضاً مقدمہ ص 40۔

61۔ ''انتخاب گنج شریف'' محولہ بالا، ص 88۔

62۔ ایضاً ص 130۔

63۔ایضاً ص149۔

64۔"چند رسائل" محولہ بالا ص57۔ 65۔ایضاً ص80۔

66۔ سید سبط الحسن ضیغم، پنجابی ادبی بورڈ، لاہور، ص74۔

67۔انتخاب گنج شریف محولہ بالا، ص32۔

68۔ایضاً، ص58۔ 69۔ایضاً، ص58۔ 70۔ایضاً، ص 42۔

71۔کتب خانہ دانش گاہ پنجاب، ذخیرہ شیرانی، قلمی مخطوطہ نمبر 1339۔

72۔"انتخاب گنج شریف" محولہ بالا، ص43۔

73۔لائبریری کے ایکسیشن رجسٹر میں اس کا اندراج "چند رسائل، کشکول نوشاہیہ" اور حوالہ نمبر 6223 کے نام سے ہے۔

74۔حکیم محمد موسیٰ: فقیر غلام محی الدین شاہ در "نقوش" (لاہور نمبر) ص809۔ مزار کے پتھر کی عبارت "مزار حضرت فقیر الی اللہ سید غلام محی الدین شاہ صاحب بخاری القادری نوشاہی الملقب بہ نوشاہ ثانی نور اللہ مرقدہ۔"

75۔گوہر نوشاہی: "رسالہ از آثار فقیر نوشہ ثانی" در صحیفہ، لاہور۔ جولائی 1972ء، ص93، 116۔ اسی شمارے میں محمد اقبال مجددی کا ایک مضمون "شاہ حسین لاہوری کا ایک غیر مطبوعہ فارسی رسالہ تہنیت" بھی شائع ہوا ہے۔

76۔پروفیسر صاحب نے "مقدمہ کے مآخذ" میں بھی اس کا حوالہ دیا ہے۔

77۔حاشیہ میں لکھا ہے۔فقیر نور الدین منور: "دیوان منور"، لاہور 1392ھ، ص119۔

78۔"انتخاب گنج بخش" محولہ بالا، ص43۔

79۔دیوان منور محولہ بالا، ص119 (حاشیہ)

80۔انتخاب گنج بخش، ص44، 49۔

81۔"گنج الاسرار" صفحہ 10۔

82۔ اس میں بھی ایک مصلحت تھی۔

83۔"حیات حضرت نوشہ گنج بخش کے اہم منبع" کا بڑا مآخذ یہی دو کتب ہیں۔

84۔ولادت 959ھ، وفات 1064ھ۔

85۔گوہر نوشاہی "رسالہ از آثار فقیر نوشہ ثانی" در رسالہ صحیفہ لاہور، جولائی 1972، ص102۔

86۔مخطوطہ نمبر 178/825، Pi,vi۔اور مجموعہ آذر 294/7515

87۔انتخاب گنج شریف، ص42۔

88۔مخطوطہ نمبر 6223، ذخیرہ شیرانی۔

89۔انتخاب گنج شریف محولہ بالا، ص29۔

90۔کتب خانہ دانش گاہ پنجاب، مخطوطہ نمبر 6223 ص179۔

91۔حافظ محمود شیرانی "پنجاب میں اردو" طبع اول، ص279۔

(در: اورینٹل کالج میگزین، جلد 58/1-2 شمارہ مسلسل 228-229 (1982)ء، ص1-24)

سید شرافت نوشاہی

حضرت مولانا حکیم محمد اشرف صاحب فاروقی قادری نوشاہی منچری قدس سرہ

نام ونسب

مولانا کے والد بزرگوار کا نام مولانا عزالدین المعروف عزت دین بن میاں معصوم تھا۔ مولانا اپنی کتاب ''کنزالرحمت'' میں لکھتے ہیں:

شد از عزت دین اشرف بنام
ز معصوم او یافتہ انصرام[1]

اس سے اوپر نسب نامہ بیاض خاندان فاروقیہ میں اس طرح لکھا ہے: میاں معصوم بن میاں علم الدین بن میاں شاہ رخ بن میاں شاہ داد بن میاں فتح محمد بن میاں بازی دین بن میاں محمد فاروق (مورث خاندان ہٰذا)۔

بیاض مذکور میں اس سے آگے شجرہ تحریر نہیں ہوا۔ البتہ مولوی حکیم کرم الٰہی (متوفی 1321ھ) بن میاں غلام النبی فاروقی بیگووالیہ نے اپنی تحریرات میں اس سے اوپر شجرہ اس طرح لکھا ہے: میاں محمد فاروق بن شیخ شعیب بن شیخ احمد بن شیخ یوسف بن شیخ محمد بن شیخ شہاب الدین بن شیخ احمد فرخ شاہ بن شیخ نصیرالدین بن شیخ محمد بن شیخ سامان شاہ بن شیخ سلیمان بن شیخ مسعود بن شیخ عبداللہ بن واعظ الاکبر بن شیخ ابوالفتح بن سلطان ابراہیم[2] بن ادہم بن سلیمان بن ناصر[3] بن عبداللہ بن عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہم۔

لیکن تاریخی لحاظ سے میاں محمد فاروق کی ولدیت شیخ شعیب سے صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ شیخ شعیب خواجہ فریدالدین گنج شکر چشتیؒ (م۔664ھ) کے دادا صاحب تھے۔ بقول مفتی غلام سرور لاہوری[4] چنگیز خاں کے حملہ کے وقت شہید ہو گئے اور چنگیز خاں کا عہد حکومت بقول لین پول[5] 603ھ سے لے کر 624ھ تک ہے، تو گویا اسی دوران میں شیخ شعیب کی شہادت واقع ہوئی۔ میاں محمد فاروق محمد اشرف صاحب سے نویں

پشت اوپر ہیں اور اوسطاً تین پشتیں ایک صدی میں گذر سکتی ہیں۔ اس لحاظ سے محمد اشرف صاحب کی وفات 1225ھ سے تین سو سال پہلے 900ھ کے قریب ان کا زمانہ متعین ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ شیخ شعیب کے فرزند نہیں ہو سکتے اور اس نسب کے اعتبار سے فاروقی نہیں کہے جا سکتے کیونکہ شیخ شعیب اور میاں محمد فاروق کے درمیان کم از کم تین سو سال کا بُعد ہے۔ ممکن ہے کہ میاں محمد فاروق (مورث خاندان) کے نام کی نسبت سے ان کی اولاد نے اپنے آپ کو فاروقی کہلانا شروع کیا ہو اور بعد والوں نے اس کو حضرت عمر فاروقؓ کی نسبت سے فاروقی سمجھ لیا ہو۔

وطن اور مقام پیدائش

محمد اشرف صاحب کے آباؤ اجداد کا موطن موضع چک بھارا تھا جو ضلع جھنگ میں ایک گاؤں ہے۔ وہاں سے آپ کے جد بزرگوار ترک وطن کر کے بمقام پانڈو کے آ کر آباد ہوئے جو دریائے چناب سے پانچ میل جنوب کی طرف ضلع گوجرانوالہ میں ایک گاؤں ہے۔ آپ اپنے وطن اور مقام کے متعلق قصہ چاہ میں لکھتے ہیں:

چک بھارے دا آکھدے ساڈا وطن قدیم
آندا پاس جھناں دے حکمت نال حکیم
دانے پانی قسمتی کیتی سانوں کھچ
ہوئی رہائش آئے کہ پانڈو کیاں دے وچ [6]

"کنز الرحمت" میں بھی اپنے باپ دادا کا مسکن پانڈو کی ہی لکھا ہے:

شدہ پانڈو کا وطن ما از قدیم
کہ بودند اجدادم آنجا مقیم [7]

آپ کی پیدائش تقریباً 1155ھ میں اسی گاؤں میں ہوئی۔ اس زمانے میں یہ گاؤں موضع بچہ چٹھہ [8] کے پرگنہ میں شامل تھا۔

تعلیم و تربیت

آپ نے دینی علوم میں کافی مہارت حاصل کی۔ فقہ و نحو صرف اور طب پڑھنے کا خود ذکر کیا ہے:

خواندی اشرف علم فقہ و نحو صرف و طب تمام
از کتاب عشق باید خواند اکنون یک دو باب [9]

آپ نے فن کتابت نسخ و نستعلیق بھی سیکھا تھا۔ آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب "کنز الرحمت"

قلمی جو آپ نے اپنے چھوٹے لڑکے میاں محمد کے لیے لکھی تھی۔[10]

منچر چٹھہ میں قیام

محمد اشرف کا زمانہ طوائف الملو کی کا زمانہ تھا۔ مختلف علاقوں پر مختلف خاندان قابض اور خودسر حاکم تھے۔ چنانچہ پانڈو کے متصل موضع منچر چٹھہ میں چودھری غلام محمد[11] بن پیر محمد چٹھہ خود مختار حکومت کرتا تھا اور اس تمام علاقے پر اس کا قبضہ تھا۔ وہ علم دوست اور علماء و فضلاء کا قدردان تھا۔ وہ آپ کو اپنے پاس موضع منچر چٹھہ میں لے گیا اور آپ کو ایک علیحدہ حویلی میں قیام کرایا۔ آپ نے کچھ عرصہ امن اور چین سے وہاں گذارا۔ قصہ چاہ میں لکھتے ہیں:

رہی ہمیشہ خلفلی ، بھاجڑ پوندی نت
ویکھ قضیہ خلق دا رہے اداسی چت
نظری دے آوندا منچر وچ آرام
لے حویلی وکھری کیتا جا مقام[12]

''کنزالرحمت'' میں لکھتے ہیں:

بہ منچر مرا قسمتم پروریہ
قبائے غم و اندوہ آنجا درید
ندیدم در آنجا رخ درد و غم
چو بلبل نشستیم شاداں بہم[13]

''مناقب نوشاہی'' میں لکھتے ہیں:

اشرف عاصی کہے وچارا
پانڈو کا ہے وطن ہمارا
کیتا منچر وچ گذارا
پاس جھناں شماری دا[14]

قصبہ منچر ضلع گوجرانوالہ اکبر بادشاہ کے عہد میں کشنو جاٹ قوم چٹھہ نے آباد کر کے اپنے بیٹے کے نام پر اس کا نام منچر رکھا۔ سلطنت مغلیہ کے آخری زمانے تک یہ آبادی قائم رہی۔ جب سردار مہاں سنگھ سکر چلیہ اور غلام محمد چٹھہ کے درمیان لڑائیاں ہوئیں تو سردار مہاں سنگھ فتح یاب ہوا۔ اس کی فوج نے یہ قصبہ لوٹ لیا اور ویران کر دیا۔ چھ ماہ تک ویران رہا۔ سردار مہاں سنگھ نے دوسری آبادی پہلی آبادی سے کسی قدر فاصلے پر کی جو اب تک موجود ہے۔[15]

کالے والہ میں آباد ہونا

اس کے بعد قوم چیمہ کے زمیندار مولانا محمد اشرف کو اپنے گاؤں موضع کالے والہ، ضلع گوجرانوالہ میں لے گئے۔ خصوصاً چودھری مالی، چودھری سوہندا، چودھری عظیم اور چودھری غلام جو گاؤں کے اکابر سے تھے، وہ آپ کے معتقد تھے۔ ایک سکھ جودھ سنگھ نام بھی جو فقیر دوست تھا' آپ کے ساتھ محبت رکھتا تھا۔ آپ قصہ چاہ میں لکھتے ہیں:

کالے والے قسمتی آندا سانوں ٹور
مڈھوں آہی واقفی، گل نہ کائی ہور
مالی، سوہندا چوہدری ہور عظیم، غلام
چارے پنج گراں دے راضی رہن مدام
جاںداری جودھ سنگھ سوریاں دا سردار
لے سادھاں دی آ گیا رکھے نال پیار [16]

ان لوگوں نے آپ کو کچھ زمین گذارے کے لیے دی۔ آپ نے گاؤں سے باہر شمال مشرق کی طرف ایک کنواں لگایا اور اپنے مکانات رہائش وہاں تعمیر کیے اور وہیں رہنے لگے۔

آپ کا منچر سے کالے والہ رہائش تبدیل کرنا 1220ھ کے بعد کا واقعہ معلوم ہوتا ہے' کیونکہ سنہ مذکور میں آپ نے "کنزالرحمت" تصنیف کی۔ اس میں منچر کا نام ہی لکھتے ہیں۔ کالے والہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

سلسلہ طریقت

مولانا محمد اشرف کی خاندان قادری نوشاہی میں شیخ ضیاء اللہ صاحب (م 1206ھ) ساکن جاکے چیمہ، ضلع سیالکوٹ سے بیعت تھی۔ وہ مرید شیخ حافظ رحمت اللہ شاہ المعروف رحمت سائیں (م 1184ھ) ساکن بیگووالہ، ضلع سیالکوٹ کے، وہ مرید شیخ پیر محمد سچیار نوشہروی (م 1119ھ) کے، وہ مرید شیخ الاسلام حضرت سید حافظ حاجی محمد نوشہ گنج بخش علوی قادری ساہن پالوی (م 1064ھ) کے۔

اپنے مرشد صاحب کی وفات کے بعد تربیت و تکمیل میاں غلام مرتضیٰ بن صابر شاہ نظام آبادی (م-1240ھ) سے پائی۔ وہ مرید اپنے جد بزرگوار حافظ رحمت اللہ شاہ موصوف کے تھے۔

محمد اشرف صاحب "کنزالرحمت" میں شیخ ضیاء اللہ صاحب کو اپنا پیر تسلیم کرتے ہیں:

در مناقب ذات پاک شاہ ضیاء اللہ کہ ہست
بندہ را ہر دم پناہ او میان دو جہاں [17]

اور ''فقرنامہ'' میں میاں غلام مرتضی صاحب کے متعلق کہتے ہیں:

فرمود حضرت مرتضی جو ہے ہمارا پیشوا[18]

اور ایک مناجات میں فرماتے ہیں:

شکر خدا کہ رہبر من مرتضی ہویا[19]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شیخ ضیاء اللہ صاحب آپ کے شیخ بیعت اور میاں غلام مرتضی صاحب شیخ صحبت تھے۔

مشائخ سلسلہ سے عقیدت

محمد اشرف صاحب کو اپنے مشائخ سلسلہ سے ازحد عقیدت و تعشق تھا۔ چنانچہ آپ کی تمام عمر ان کی مداحی میں گذری۔ حضرت نوشہ گنج بخش اور ان کی اولاد امجاد اور حضرت سچیار صاحب اور ان کی اولاد پاک کی شان میں مناجاتیں، غزلیں، منقبتیں اور نظمیں لکھیں۔ خصوصاً اپنے دادا مرشد حافظ رحمت اللہ شاہ المعروف رحمت سائیں صاحب سے آپ کو والہانہ محبت تھی۔ ان کی زیارت کا شرف بھی حاصل کیا تھا۔ اپنی تصانیف اور اشعار میں جابجا لفظ ''رحمت'' کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔

حضرت نوشاہ عالی جاہ کی اولاد میں سے حضرت مولانا سید حافظ نور اللہ صاحب فرشتہ صفات بن سید حافظ محمد حیات صاحب ربانی (مصنف ''تذکرہ نوشاہی'') کے ساتھ آپ کو محبت اور عقیدت تھی۔ حافظ صاحب اس وقت قصبہ رسول نگر کے مفتی اعظم، قاضی القضاۃ اور فقیہ تھے۔ مولانا اشرف صاحب ان کے پاس آمدورفت رکھتے۔ ایک دوسرے سے کتابیں لے کر مطالعہ کیا کرتے۔ حافظ صاحب نے کتاب ''سفینۃ الاولیاء'' مصنفہ شاہ زادہ دارا شکوہ قادری مولانا کے کتب خانہ سے لے کر 1192ھ میں اپنے مطالعہ کے لیے نقل کی تھی۔[20]

اشرف کی تصانیف اور شاعری

اشرف فارسی، اردو اور پنجابی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور ان زبانوں میں ان کی تصانیف موجود ہیں۔[21]

1- مثنوی کنز الرحمت (فارسی)

یہ کتاب مشائخ قادریہ نوشاہیہ کے حالات میں 1220ھ میں نظم کی۔ اس کا ماخذ تذکرہ نوشاہی مصنفہ حافظ محمد حیات نوشاہی ہے جو 1146ھ میں تصنیف ہوا۔ اگرچہ اشرف نے اپنے ماخذ کا کہیں ذکر نہیں کیا مگر مطالعہ کرنے والے پر صاف ظاہر ہے کہ اسی تذکرے کی عبارتوں کو آپ نے نظم کا جامہ پہنایا ہے۔

حضرت نوشہ گنج بخش (م 1064ھ) کے ذکر کے بعد اپنے پیران طریقت کے حالات مزید داخل کتاب کیے ہیں جو تذکرہ نوشاہی میں نہیں ہیں۔ اس کتاب میں تمام عنوانات اشرف نے غزل کے طور پر فارسی اشعار میں لکھے ہیں جبکہ باقی مضامین مثنوی کی ہیئت میں ہیں۔ یہ کتاب اشرف کی اولاد میں سے محمد عمر متخلص بہ محمد خوشنویس بن مولوی میراں بخش ساکن اجنکے، ضلع گوجرانوالہ نے 1329ھ / 1911ء میں اسلامیہ سٹیم پریس لاہور سے چھپوائی۔ اس کا ترجمہ پنجابی نظم میں مولوی محمد حبیب اللہ قادری مصنف ''تفسیر نعمانی'' نے کیا اور ملک فضل الدین وچنن الدین لاہور نے چھپوا کر شائع کر دیا، جو عام متداول ہے مگر کئی مقامات پر مولوی صاحب نے ترجمہ غلط کر دیا ہے۔

2- مثنوی مصباح الطب (فارسی)

تشخیص امراض اور ان کے علاج سے متعلق یہ مثنوی اپنے چھوٹے بیٹے میاں محمد کے لیے 1219ھ یا 1220ھ میں منچر میں تصنیف کی۔ جیسا کہ ''در تصریح احوال خود و سبب تالیف کتاب'' میں کہتے ہیں:

ہزار و دو صد بیست ہجری بداں
کہ تالیف این مختصر شد عیاں
اگر پانڈوکا جاے اجداد ماست
وطن قصبہ منچر آباد ماست
پے خواندن نور چشم صغیر
میاں محمد تو نامش بگیر
بتحریر آوردم این مختصر
کہ جزوے ز حکمت بگوید خبر

یہاں خاتمے سے بھی چند اشعار لکھے جاتے ہیں:

بحالم شدہ رحمت پیر بس
کہ در نظم این یافتم دسترس
سگ شاہ جیلاں شدم بالیقیں
برقم آمد این نسخہ دلنشیں
بماہ محرم شدہ ختم آں
بروز سہ شنبہ گہ ظہر آں
پے خاطر قرۃ العین خویش

ببردم بترقیم آن رنج بیش
ہزار و دو صد نوزدہ سال ہم
شدہ طب مصباح از من رقم
بیا اشرف از طب یونانیاں
گذر کن سوے طب ایمانیاں

یہ مثنوی ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔ آپ کی اولاد میں سے مولوی محمد نذیر بن مولوی عمر الدین کے پاس بمقام ابچکے، ضلع گوجرانوالہ اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ اس کا ترقیمہ حسب ذیل ہے: ''نسخہ متبرکہ مسمی بہ مصباح الطب من تصنیفات میاں محمد اشرف چہار جز ازیں نسخہ نوشتہ بابوی صاحب میاں محمد خلف میاں محمد اشرف بدستخط فقیر حقیر مظفر حسین عفی عنہ ولد میاں صاحب فقیر علی ولد میاں صاحب پیر بخش ولد میاں صاحب قل احمد [در] 22 ماہ ربیع الثانی 1320ھ مطابق 14 ماہ ساون سمت 1959 بجہت برخوردار محمد اقبال حسین بوقت عصر بروز سہ شنبہ تحریر یافت۔''

(مصباح الطب کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ 1270ھ، 226 صفحات، گنجینۂ آذر، پنجاب یونیورسٹی لاہور، نمبر 22 M 8228 میں اور دوسرا نسخہ کتب خانہ فقیر مغیث الدین (مرحوم) لاہور، بلا تاریخ کے پاس بھی موجود ہے۔ عارف نوشاہی)

3- کلیات اشرف

کنز الرحمت، مصباح الطب اور مرزا و صاحباں (پنجابی) کے سوا آپ کا باقی کلام مختلف بیاضوں اور سفینوں سے اکٹھا کر کے میں نے 1384ھ میں بنام کلیات اشرف مرتب کیا ہے۔

(اس میں اشرف کا فارسی، اردو اور پنجابی کلام ہے۔ فارسی کلام میں مدائح، مناجاتیں، شجرہ، غزلیں اور رباعیاں ہیں۔ اردو کلام میں ایک طویل نظم ''فقر نامہ'' ہے جو اشرف نے 1207ھ میں میاں غلام مرتضٰی نظام آبادی کے حکم سے تصنیف کیا۔ منقبتیں، مناجاتیں، تضمینیں، ریختے اور غزلیں شامل ہیں۔ پنجابی کلام میں مختلف اصناف سخن میں حسب ذیل نظمیں ہیں: وحدت نامہ (مخمس)، توبہ نامہ (مخمس)، مناقب نوشاہی (مچر میں تصنیف کیا)' شجرہ شریف خاندان نوشاہی، سہ حرفی اشرفی دو عدد، قصہ چاہ، قصہ قند، قصہ چرخہ، قصہ کجلا و دنداسہ، قصہ گربہ و موش، قصہ موش و شتر، قصہ جٹ، قصہ گھوڑی، قصہ ملاں، قصہ مرغ، قصہ کبوتر، قصہ تسبیح، قصہ کنگی و شیشہ، باراں ماہ، دوہڑے، عرض و نیاز، بحر طویل۔ اس کلیات کا نسخہ بخط مرتب، 173 صفحات، کتب خانہ نوشاہیہ، ساہن پال شریف، تحصیل پھالیہ، ضلع منڈی بہاء الدین میں موجود ہے۔ عارف نوشاہی)

فارسی نمونۂ کلام

غزل

دارم بدل پیام بجاناں کہ می برد؟ خبری زمن بیوسف کنعاں کہ می برد؟
کس را مجال نیست کہ بردارم ز خاک گل چوں ز بوفتاد بداماں کہ می برد؟
یک شب بیامد و دل و جانم ہمہ ربود چندی متاع زود خراماں کہ می برد؟
جاناں بدرس غمزہ کند مشق دلبری لوح دلم بسوے دبستاں کہ می برد؟
بلبل چہ شوق نعرہ جاں سوز می کند آثار تحفہ بر گل خنداں کہ می برد؟
اشرف ز در دیار فتادہ بدام غم
بیمار را بشہر طبیاں کہ می برد؟

پنجابی نمونۂ کلام:

ازسی حرفی

الف
آؤ مبارکاں دیو مینوں نوشہ لال دے نال ویاہیاں جی
نک نتھ سوہاگ دی بھاگ میرے ہتھیں چھنکن کنگن باہیاں جی
بھٹھ گھتاں میں ہار سنگھار تائیں نوشہ ساد مراد ڑی چاہیاں جی
اشرف داج میرا سبھ لال ہویا رنگن رتیاں پاک نوشاہیاں جی

الف
آپ اللہ دے نور تھیں جی نوشہ پاک دا نور ظہور ہویا
ساہن پال کمال وصال کولوں جویں موسیٰ کے تائیں کوہ طور ہویا
اک گھٹ شراب پریم والا جس پیتا سوئی منصور ہویا
اشرف سلسلہ پاک نوشاہیاں دا نبی پاک اگے منظور ہویا

سجع مہر

آپ کی مہر کے دو سجع تھے، جو الگ الگ مہروں پر کندہ تھے۔

1۔ در ہر دو عالم محمد اشرف۔
2۔ از نبی آدم محمد اشرف است۔

اہلیہ واولاد

آپ کی اہلیہ کا نام مسماۃ فاطمہ بی بی صاحبہ تھا جو آپ سے آٹھ سال بعد ماہ ذی الحجہ 1233ھ میں فوت ہوئیں[22]۔ ان کے بطن سے آپ کے دو بیٹے ہوئے۔

1۔ میاں قل احمد صاحب (م 1251ھ) فارسی، اردو اور پنجابی کے شاعر تھے۔ ان کے بیاض سے میں نے ان کا اردو اور پنجابی کلام بنام کلیات قل احمد مرتب کیا ہے۔

2۔ میاں محمد صاحب، یہ بھی صاحب علم وفضل اور طبیب تھے۔

وفات

مولانا محمد اشرف صاحب کی وفات بعمر ستر سال 1225ھ/1810ء میں ہوئی۔ کالے والہ، ضلع گوجرانوالہ میں دفن ہوئے۔ آپ کا قطعہ تاریخ آپ کے فرزند اکبر میاں قل احمد صاحب نے اپنے بیاض میں اس طرح لکھا ہے:

تاریخ وفات قبلہ گاہ

محمد اشرف چو شمع پر نور	بود در بزم نوشہی منظور
ہچو پروانہ دیگرے فقرا	جاں نثار و دریں نبود قصور
کرد رحلت ازیں جہاں فانی	خویش و بیگانہ گرد کرد ضرور
سال تاریخ خادمی پرسید	گفت با چشم تر ''ارادہ حضور''

1225ھ

مادہ تاریخ از شرافت: ''شیخ قادری'' 1225ھ

قبر کی موجودہ حالت

اس وقت آپ کی قبر کالے والہ، ضلع گوجرانوالہ میں گاؤں سے شمال مشرق کی طرف قبرستان کے شمالی جانب ایک پرانے چبوترہ پر واقع ہے۔ مشرقی قبر آپ کی اور مغربی آپ کے بیٹے میاں قل احمد صاحب کی ہے۔ آس پاس قبرستان ہے۔ درخت سایہ دار بہت ہیں۔ ایک درویش مجاور رہتا ہے۔ کبھی کبھی عرس بھی کر دیتا ہے، لیکن کوئی خاص تاریخ مقرر نہیں۔

آپ کی اولاد بہت ہے مگر اب ان میں سے کوئی شخص کالے والہ میں آباد نہیں اور جو لوگ متفرق

دیہات میں چلے گئے ہیں ان میں سے کسی شخص کو آپ کی قبر کی زیارت یا حفاظت کا کوئی احساس نہیں بلکہ ان میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جن کو یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کی قبر کالے والہ میں ہے۔

حواشی:

1- کنز الرحمت (فارسی) مطبوعہ لاہور، 1911ء، ص 7۔ مولوی حبیب اللہ قادری نے ''کنز الرحمت'' کے منظوم پنجابی ترجمے میں اشرف کے حسب و نسب سے عدم واقفیت کی بنا پر اس شعر کا ترجمہ یوں کیا ہے:

نام عزیز الدین بلاون اشرف میرے تائیں

چھوٹی عمروں اشرف سدن اللہ شرم دکھائیں

مولوی صاحب کے اتباع میں قاضی فضل حق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور نے اورینٹل میگزین لاہور، فروری 1933ء، ص 88 میں لکھا ہے: ''ان کا اصلی نام عزیز الدین تھا مگر بچپن ہی سے لوگ انہیں اشرف کے نام سے پکارتے تھے۔'' ظاہر ہے کہ دونوں حضرات سے تسامح ہوا ہے۔

2- پیر غلام دستگیر نامی لاہوری نے ''سوانح حیات بابا فرید گنج شکرؒ'' ص 3 میں لکھا ہے کہ سلطان ابراہیم ادہم بلخی ثقہ مورخوں کی تحقیق کے مطابق قریشی نہ تھے۔

3- نامی صاحب نے ''سوانح حیات بابا فرید گنج شکرؒ'' ، ص 3 میں بحوالہ مورخ ابن قتیبہ (م 276ھ) لکھا ہے کہ عبداللہ بن عمر کا کوئی بیٹا ناصر نام اور کوئی پوتا سلیمان نام نہیں تھا۔

4- گنج تاریخ

5- سلاطین اسلام [ترجمہ عباس اقبال، مطبوعہ تہران، 1363، ص 179 -182]

6- کلیات اشرف، مرتبہ شرافت نوشاہی، حصہ پنجابی کلام ص 143۔ یہ حصہ تا حال غیر مطبوعہ ہے۔

7- کنز الرحمت، ص 168۔

8- موضع بچہ جٹھہ مغلیہ عہد میں جائے مہر اور پرگنہ تھا۔ علمی درسگاہ بھی وہاں تھی۔ مفتی محمد صدیق، مفتی شکر اللہ اور حافظ برخوردار شاعر سب اسی بستی میں ہوئے ہیں (جن کا تذکرہ حافظ سید محمد حیات نوشاہی (م 1173ھ) نے ''تذکرہ نوشاہی'' میں کیا ہے۔)

9- کنز الرحمت، ص 97۔

10- میں نے پہلی دفعہ یہ نسخہ 1342ھ میں مولوی عمر الدین خوش نویس ساکن ونجکے، ضلع گوجرانوالہ کے پاس دیکھا تھا۔ تنازعہ نیابت حضرت نوشہ گنج بخش کے مسئلہ میں سادات برخورداریہ کی طرف سے ثالثوں (منصفوں) کے سامنے جلسہ میں پیش ہوا اور نیابت سید حافظ محمد برخوردار بحر العشق اس میں سے ثابت ہوئی۔ بعد میں یہ نسخہ مولوی صاحب مذکورہ کے بیٹے ماسٹر محمد نذیر کی تحویل میں آیا۔ اب میرے کتب خانے میں موجود ہے۔

11- چودھری غلام محمد بن پیر محمد بن نور محمد چٹھہ موضع ٹبر چٹھہ اور اس کے گرد و نواح کے علاقے کا حکمران تھا۔ دادا کے وقت سے ان کے گھر میں حکومت و ریاست چلی آتی تھی۔ قادریہ سلسلہ میں سید عبدالقادر آخرین کیمیا نظر (م 1191ھ) ساکن پیر کوٹ سدھانہ، ضلع جھنگ کا مرید تھا۔ حضرت غوث اعظمؒ سے خاص عقیدت رکھتا تھا۔ ''کنز الرحمت'' میں یہ مصرع ''غلام ور شاہ جیلاں بداؤ'' (ص 168) اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔ اپنے مقبوضہ علاقے میں اس نے حضرت مولانا سید حافظ نور اللہ فرشتہ صفات نوشاہی برخورداری ساہن پالوی (م 1229ھ) کو جو شیخ الاسلام حضرت نوشہ گنج بخش قادری کی اولاد امجاد اور فضلاء وقت سے تھے قصبہ رسول نگر، ضلع گوجرانوالہ میں قاضی اور مفتی کے عہدہ پر مقرر کیا تھا۔ سردار مہاں سنگھ ولد چڑت سنگھ نے چودھری غلام محمد کے

ساتھ لڑائی کی اور 1203ھ میں دھوکہ دے کر اس کو چودھری قطب الدین بن پیر محمد، احمد خان بن نور محمد اور خان محمد بن غلام محمد سمیت شہید کر دیا۔ کتاب "روضۃ الزکیہ" میں حافظ جمال اللہ نامی شاعر سے جو کیلیانوالہ، ضلع گوجرانوالہ کے باشندہ تھے، یہ قطعہ تاریخ شہادت درج ہوا ہے:

برگو جمال از سر صدق و صفائے دم
تاریخ فوت غازی دیں عالی الہمم

مسند نشین منچر چٹھہ شہید خاص
غفران ایزدیش بجان باد دمبدم

چوں قطب دین و احمد و خان محمد است
ہر یک شہید خاص بجنت زدہ علم

آں پور پیر خاں کہ چو اکبر شہید شد
مقتول تیغ ظلم و جفا رفت در ارم

در محفل رسول نخستین شد قرین
گفتند کیست؟ گفت: غلام محمدم

1203ھ

اس کے مختصر حالات پنجاب کی تاریخوں اور تذکروں جیسے جامع القوانین، عمدۃ التواریخ، مخزن پنجاب، تاریخ پنجاب، تاریخ گجرات، وحدیقۃ الاولیاء (غلام سرور لاہوری) اور کنز الرحمت وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ اس نے منچر چٹھہ کو اپنا دار الحکومت بنایا۔ تاریخ گجرات مؤلفہ مرزا اعظم بیگ اور مخزن پنجاب مؤلفہ مفتی غلام سرور لاہوری سے ثابت ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ جوکالیاں، ضلع گجرات، اب ضلع منڈی بہاء الدین کو بھی اپنا دار الحکومت بنائے رکھا۔

12- کلیات اشرف، حصہ پنجابی، ص 143   13- کنز الرحمت، ص 168

14- کلیات اشرف، حصہ پنجابی، ص 126

15- مخزن پنجاب مؤلفہ غلام سرور لاہوری، چار باغ پنجاب مؤلفہ گنیش داس وڈہرہ میں منچر کا ذکر ہے۔

16- کلیات اشرف، حصہ پنجابی، ص 143   17- کنز الرحمت، ص 166

18- کلیات اشرف، حصہ اردو، ص 43   19- کلیات اشرف، حصہ اردو، ص 84

20- یہ قلمی نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس نسخہ کے دستخط میں بتصریح لکھتے ہیں: "از نسخہ میاں صاحب فضیلت وکمالات دستگاہ میاں محمد اشرف جیو سلمہ اللہ تعالیٰ نوشتہ شد۔"

21- شرافت نوشاہی مرحوم نے اشرف کی تصانیف میں ایک فارسی مثنوی یوسف و زلیخا کا ذکر بھی کیا ہے اور اس کا زمانہ تصنیف عہد محمد شاہ بادشاہ (1131 - 1161ھ) لکھا ہے۔ اگر اشرف کی پیدائش 1155ھ میں ہوئی تھی تو محمد شاہ کے عہد میں اس کا اشرف منچری کی تصنیف ہونا ممکن نہیں ہے۔ یہ کسی اور اشرف کی تصنیف ہوگی۔ اس مثنوی کا ایک مخطوطہ 1190ھ کا کتابت شدہ قریشی احمد حسین قلعداری صاحب، گجرات کے پاس موجود ہے۔ اس پر ایک مہر بہ سجع "از نبی آدم محمد اشرف است" ثبت ہے۔ عارف نوشاہی

22- میاں قل احمد صاحب نے اپنے بیاض میں اپنی والدہ صاحبہ کا یہ قطعہ تاریخ لکھا ہے:

فاطمہ بی بی زین جہاں برباد
پائے در سفر عاقبت بنہاد

ماہ ذی الحجہ چار شنبہ روز
مرغ روحش بہ عرش بال گشاد

سال تاریخ از خرد جستم
"رفت در پردہ زین جہاں با داد"

1233ھ

(در: کلیات اشرف (اردو کلام) از محمد اشرف نوشاہی منچری (م-1810ء) مرتبہ ومقدمہ سید شرافت نوشاہی، باہتمام ڈاکٹر عارف نوشاہی، کراچی 2000، صفحہ 15-26)

سید سلیمان ندوی

پروفیسر حافظ محمود خان شیرانی، مرحوم

ہم کو ابھی تک اپنے ملک کے علماء اور محققین کی پوری قدر نہیں ہوئی، کیسے افسوس کی بات ہے کہ ہماری قوم اور ملک کے ایک نامور محقق پروفیسر حافظ محمود خان شیرانی کا انتقال 16 فروری 1946ء کو ٹونک میں ہو گیا اور ہم میں سے بہتوں کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی۔

شیرانی مرحوم کا وطن ٹونک تھا، شیرانی پٹھان تھے اور ان کو اپنے پٹھان ہونے پر فخر تھا، ٹونک ہمیشہ سے علماء اور محققین کا مقام رہا۔ وہاں کا نادر کتب خانہ اکثر محققوں کو اپنی طرف کھینچ کر لے جایا کرتا ہے اور شیرانی کا تو وہ وطن ہی تھا۔ شیرانی صاحب کی انگریزی کی استعداد پوری تھی۔ فارسی کی تعلیم متوسط اور عربی کی معمولی مگر ان میں تحقیق و تلاش کا مادہ فطرتاً تھا۔ تاریخ اور خصوصاً ادب سے ان کو بے حد شغف تھا۔ تاریخ کے ذوق سے ان کو کتبوں اور سکوں کا شوق تھا۔ اسی شوق سے وہ لکھنؤ بھی آتے تھے اور چونکہ ہمارے مدرسہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مدرس اول و شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خان صاحب مرحوم بھی ٹونکی تھے، اس تعلق سے وہ کبھی کبھی ہمارے مدرسہ میں بھی ٹھہرتے تھے اور اسی واسطہ سے میری ان کی ملاقات ہوئی اور اس کے بعد جب وہ لاہور رہتے، تو کئی بار ملنا ہوا۔

مرحوم کا سال پیدائش 1298ھ ہے۔ عمر قریباً سرسٹھ برس تھی۔ 1904ء میں سکول کی تعلیم چھوڑ کر بیرسٹری کے لیے لندن گئے، جہاں سے والد کی وفات پر 1906ء میں واپس آئے پھر فوراً واپس گئے اور 1914ء میں واپس آئے۔ بیرسٹر تو نہیں ہوئے مگر قلمی کتابوں کا شوق پیدا ہو گیا۔ پیرس کے قومی کتب خانہ میں تین ماہ مصروف رہے اور وہیں بعض فرانسیسی اہل علم کے ساتھ مل کر قلمی کتابوں اور تصویروں اور سکوں کی تجارت شروع کی۔ پہلی جنگ 1914ء میں ہندوستان واپس آ گئے۔ 1919ء میں لاہور آئے اور اورینٹل کالج میں اردو کے پروفیسر ہو گئے۔

مرحوم نیک مزاج، کم آمیز، سادگی پسند اور خاموش طبع تھے۔ ان کی طبیعت میں تلاش، محنت، تحقیق و تدقیق کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ تاریخی تحقیقات کے ذوق سے ان کو قدیم بادشاہوں کے سکوں کے جمع کرنے کا جو شوق پیدا ہوا، وہ ان کو نہ صرف ہندوستان کے پرانے شہروں میں بلکہ انگلستان تک ان کو لے گیا اور اس

سلسلہ میں وہاں کے مستشرقین سے بھی ان کے تعلقات قائم ہوئے اور ان کو ان کے طریق تحقیق وتنقید سے بھی واقفیت ہوئی۔

ان کا سب سے پہلا تاریخی اور تنقیدی سلسلہ کا مضمون حضرۃ الاستاذ مولانا شبلی مرحوم کی ''شعر العجم'' کی تنقید ہے، جو رسالہ ''اردو'' میں 1922ء سے نکلنا شروع ہوا اور کئی سال تک نکلتا رہا اور اب انجمن کی طرف سے وہ مستقل کتاب کی صورت میں بھی شائع ہو گیا ہے۔ یہ تنقید درحقیقت صرف ''شعر العجم'' کی نہیں، بلکہ ان فارسی تذکروں کی ہے جو ''شعر العجم'' کا مآخذ ہیں اور شعراء کے حالات میں ان میں تاریخی تحقیق وتنقید سے کام نہیں لیا گیا ہے بلکہ صرف دلچسپی کی مشہور عام باتوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ اس زمانہ میں یورپ کے علمائے مشرقیات نے بعض شعراء پر جو مستقل مضامین لکھے ہیں یا کتب خانوں کی فہرستوں میں ان شعراء کے دواوین کے ضمن میں جو کچھ لکھا گیا ہے یا پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب میں ان منتشر تنقیدی معلومات کو جو یکجا کر دیا ہے، پروفیسر شیرانی نے ان سب کو سامنے رکھ کر اپنی ذاتی تحقیقات کے بہت سے اضافوں کے ساتھ اس سلسلہ کو لکھ کر فارسی ادب کی تاریخ کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔

مرحوم کا دوسرا کارنامہ اردو ادب کی تاریخ کی خدمت ہے اور اس سلسلہ میں ان کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' ذکر کے قابل ہے۔ گو ان کا نظریہ اب بھی محل بحث ہے، تاہم انہوں نے جو سرمایہ ادب فراہم کیا ہے وہ بہت کچھ بصیرت افروز ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک مفید خدمت میر قدرت اللہ قاسم کے تذکرہ شعرائے اردو ''مجموعہ نغز'' کی تصحیح و اشاعت ہے، جس کو مرحوم نے بڑی محنت وجانفشانی سے ایڈیٹ کیا تھا اور پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے شائع ہوا ہے۔

ان کے علاوہ اور دوسرے مختلف لغوی، ادبی اور تنقیدی مضامین بھی خاص چیز ہیں، جو وہ ''اورینٹل کالج میگزین'' میں لکھتے رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مضمون طالب تحقیق کے لیے معلومات کا ذخیرہ ہے۔ ان مضامین میں بہت سی مشہور عام باتوں کی تصحیح اور تنقید کی گئی ہے یا گذشتہ معلومات کے سرمایہ میں نیا اضافہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض مضامین کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ باقی کو بھی اسی طریقہ سے شائع کر دیا جائے۔ مرحوم کے ان تنقیدی مضامین نے ملک میں ان کی خاص حیثیت قائم کر دی تھی، چنانچہ یہ پہلی مثال ہوگی کہ کاغذی سند کی سند پر نہیں بلکہ ان کی عالمانہ تحقیق کی مثالوں کی سند پر پنجاب یونیورسٹی نے اورینٹل کالج میں ان کو اردو کا پروفیسر مقرر کیا تھا، جس خدمت کو وہ بہت دنوں تک انجام دیتے رہے۔ آخر ابھی چند سال ہوئے کہ عمر کی زیادتی کی بنا پر اس سے الگ ہوئے اور ٹونک میں اقامت اختیار کی، جہاں انہوں نے فروری کے وسط میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مرحوم کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، چنانچہ انہوں نے سلطان ٹیپو کا ایک پُر درد مرثیہ لکھا تھا، جو

نوجوانوں کو بے حد پسند آیا اور ان کی محفلوں میں وہ اکثر سنایا گیا، لیکن ان کی شاعری اتفاقی تھی۔

مرحوم کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کی شاندار روایات کا بڑا اثر تھا اور خصوصاً پٹھان بادشاہوں کی علمی، تمدنی خدمات کا پُرجوش تذکرہ ایک دفعہ لاہور میں ان کی زبان سے میں نے سنا تھا۔

حافظ قرآن تھے، یہ خود ایک بڑی نعمت ہے اور وسیلہ مغفرت، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ یہی معاملہ کرے۔

(در: معارف (اعظم گڑھ) اپریل 1946ء ص 311-313)

شیخ عبدالقادر

حافظ محمود شیرانی مرحوم

میں نے شمع علم کے پروانے کئی دیکھے، مگر حافظ محمود شیرانی جیسا سوختہ جان کم دیکھا۔ میں نے انہیں سب سے پہلے انگلستان میں دیکھا، جب میں بھی طالب علم تھا اور وہ بھی۔ پھر وہ مجھے لاہور میں میری واپسی سے کئی سال بعد ملے اور یہیں سالہا سال رہے۔ پھر اس زمانے کے قریب جب وہ پنجاب سے اپنے بزرگوں کے وطن یعنی ریاست ٹونک کو گئے اور پنجاب نے انہیں بادل ناخواستہ رخصت کیا۔ وہ یہاں سے اس طرح گئے جیسے یہ وطن تھا اور وہ پردیس۔

ولایت میں وہ کوئی سات سال رہے۔ پہلے دو تین سال تو انہیں انگریزی سیکھنے میں لگے۔ ہندوستان سے وہ منشی فاضل کا امتحان پاس کر کے گئے۔ اس سے پہلے وہ قرآن شریف حفظ کر چکے تھے۔ فارسی اور عربی منشی فاضل کی پڑھائی کرتے ہوئے حاصل کی تھی۔ میں جب ولایت سے چلا، وہ ابھی انگریزی سیکھ رہے تھے۔ مطالعہ کا شوق بے حد تھا۔ لندن کے کتب خانوں میں جا کر کتب بینی میں مصروف رہتے۔ وہاں مشرقی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ برٹش میوزیم میں ہے اور دوسرا انڈیا آفس میں۔ دونوں میں فارسی، عربی کی قلمی کتابیں بکثرت موجود ہیں اور ان میں سے کئی ایسی نادر کہ اب خود مشرقی کتب خانوں میں ان میں سے بعض کا وجود نہیں۔ اس طرح ہمارے مالی سرمایہ کے ساتھ ہمارا بہت سا علمی سرمایہ بھی دوسرے ملکوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے علمی دولت کو سمیٹنا شروع کیا اور مالی سرمایہ سے یہ بے نیازی اختیار کی۔ ان کے اس ذوق کے باعث انہیں وہاں کے قیام کے آخری سالوں میں برطانیہ کے ایک کتب خانہ کی فہرست کتب کی تیاری کا کام مل گیا اور اس کا کچھ قلیل معاوضہ ملتا رہا۔ فہرست بنانا صرف اسی کو نہیں کہتے کہ کتابوں کے نام ترتیب سے لکھ دیئے بلکہ کتب خانوں کی اصلاح میں فہرست بنانے والے سے یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ کتاب کے مضمون سے بھی کچھ آگہی رکھتا ہو۔ مصنف کے حالات سے بھی باخبر ہو اور یہ بھی جانتا ہو کہ وہ کس زمانے کی تصنیف ہے اور جو نسخہ اس کے سامنے ہے وہ کس زمانہ کی نوشت ہے۔ اس کام سے حافظ محمود صاحب کی دلبستگی کتابوں کی ان تفاصیل کے ساتھ روز بروز بڑھتی گئی اور وہ اس فن کے ماہروں میں شمار ہونے لگے۔

جب لاہور میں مجھے حافظ صاحب پھر ملے تو کسی یونیورسٹی کی ڈگری تو ان کے پاس نہ تھی مگر

معلومات کا ذخیرہ وافر ان کے سینے میں تھا۔ پہلے تو مجھے یہ سن کر مایوسی ہوئی کہ اتنے سال پردیس میں صرف کرنے اور نیک اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے باوجود ان کے پاس کوئی چیز نہیں، جو اقتصادی اعتبار سے قیمت رکھتی ہو۔ مگر جب مجھے ان کی معلومات کی وسعت کا پتہ چلا اور میں نے ان کے بعض تحقیقی مقالے دیکھے، جو انہوں نے اردو میں لکھے تھے، تو وہ مایوسی جاتی رہی۔

حافظ صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ جب اپنے وطن میں پہنچے اور دن رات کتابیں پڑھنے میں مصروف رہے اور نہ گھر سے نکل کر لوگوں سے ملے نہ نواب صاحب بہادر والیٔ ریاست کی خدمت میں سوائے ایک رسمی سلام کے حاضر ہوئے' تو لوگ انہیں تعجب کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور ان کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ یہ شخص کسی غیر معمولی اور صیغۂ راز کی خدمت پر مامور ہے اور اسی لیے گھر میں گھسا رہتا ہے۔ اس بنا پر کسی نے نواب صاحب کے پاس ان کے متعلق بدگوئی کی اور انہیں وہاں چین سے رہنا مشکل ہوا' اس لیے وہ لاہور چلے آئے کہ یہاں اگر کوئی ملازمت ملے تو اس سے بسر اوقات کریں۔ لاہور کے اسلامیہ کالج میں اس وقت فارسی کے لیکچرار کی جگہ خالی تھی۔ کچھ کوشش کے بعد وہ جگہ انہیں مل گئی اور انہوں نے لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔ کالج میں ان کی قابلیت کا اعتراف جلد شروع ہو گیا۔

کتابوں کا شوق انہیں اس حد تک تھا کہ کم سے کم خرچ پر اپنا گزارہ کرتے اور جو کچھ بچتا' اس سے کوئی پرانی قلمی کتاب خرید لیتے۔ کالج میں جب موسم گرما کی تعطیلات آتیں تو محمود شیرانی صاحب انہیں ایسے کسی شہر یا شہروں میں بسر کرتے جہاں انہیں معلوم ہوتا کہ پرانی کتابوں کا ذخیرہ کسی کے ہاں موجود ہے اور مناسب داموں پر مل سکے گا۔ وہاں جا کر وہ کتابوں کا جائزہ لیتے اور جو چیز ان کے مطلب کی ہوتی' لے آتے۔ اس طرح ان کی اپنی خرید کردہ کتابوں کا ایک مجموعہ جمع ہوتا گیا، جو بالآخر ایک معقول کتب خانہ بن گیا اور جسے وہ یہاں سے جاتے وقت پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں لاگت سے بھی کم داموں پر دے گئے۔

اسلامیہ کالج سے تعلق کے زمانے میں انہوں نے کئی مقالے لکھے، جو نئی معلومات سے پُر تھے اور باعتبار طرزِ تحریر عام فہم اور پسندیدہ۔ ان سب میں بہتر ان کی مشہور وہ کتاب تھی جو "پنجاب میں اردو" کے نام سے شائع ہوئی، جس میں انہوں نے یہ ثابت کیا کہ اردو پنجاب کے راستے دہلی پہنچی اور وہاں سے جلا پا کر اردو کہلائی۔ اس نظریہ کے ثبوت میں انہوں نے کئی سو برس کے صوفیوں کے کلام کے نمونے پیش کیے، جو اردو کے اچھے خاصے نمونے تھے۔ یہ نظریہ اب ہندوستان کے دوسرے حصوں کے اربابِ تحقیق کے نزدیک بھی قابل قبول ہوتا جاتا ہے۔ یہ کتاب ایک سے زیادہ دفعہ طبع ہو چکی ہے، لیکن افسوس کہ اب نایاب ہے۔ سنا ہے کہ انجمن ترقی اردو دہلی اسے دوبارہ شائع کرنے کا انتظام کر رہی ہے۔

لاہور کی علمی فضا حافظ محمود شیرانی کو بہت پسند تھی اور وہ اپنے علمی مشغلوں کے لیے اسے مساعد پاتے تھے۔ ان کی ضرورتیں کتابوں کی خرید کے شوق کو چھوڑ کر مختصر تھیں اور طبیعت میں قناعت اس قدر تھی کہ

انہیں کئی دفعہ دوسرے مقامات سے بلاوے آئے اور یہاں جو تنخواہ تھی اس سے بہتر تنخواہیں پیش کی گئیں، مگر انہوں نے جانا پسند نہ کیا۔ البتہ بہت سے سال اسلامیہ کالج میں رہنے کے بعد شیرانی صاحب اورینٹل کالج لاہور میں منتقل ہو گئے تھے اور وہاں ان کی تنخواہ میں بھی ترقی ہوئی اور شہرت میں بھی۔ ان کے معاصر اور دوسرے پروفیسر انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور بہت سے قابل اور مستعد طالب علموں نے ان کے فیض صحبت سے محققانہ انداز تحریر سیکھا اور اب خود ممتاز اہل علم میں شمار ہوتے ہیں۔

پروفیسر شیرانی کو کتابوں کے جمع کرنے کے شوق کے ساتھ پرانے فرامین اور کتبے اور سکے جمع کرنے کا بھی شوق ہو گیا تھا۔ اس میں انہوں نے حیرت انگیز ترقی کی۔ ایسے ایسے نادر سکے بہم پہنچائے اور اس خوبی سے ان کو ترتیب دیا اور سجا کے رکھا کہ دور دور سے لوگ انہیں دیکھنے آتے تھے اور حیران ہوتے تھے کہ باوجود وسائل کی کمی کے ایک شخص کیسے ایسا مجموعہ مہیا کر سکا۔

لاہور سے جانے سے کچھ پیشتر ایک دن شیرانی صاحب نے مجھے اپنے مکان پر بلایا کہ ان کے مجموعہ کے بعض نوادر کو دیکھوں۔ گرمی کا موسم تھا اور دوپہر کے بعد کا وقت۔ میں نے نوادر کو بھی دیکھا اور ان کی داد دی، مگر اس سے زیادہ خود شیرانی صاحب کی داد دی۔ کیونکہ وہ بھی اپنی جگہ داخل نوادر تھے۔ گرمی کی وجہ سے ایک ہلکا سا بنیان پہنے ہوئے تھے اور کمر کے گرد صرف ایک چھوٹا سا تہ بند باندھے بیٹھے تھے۔ پنکھا نہ دستی نہ بجلی کا۔ نہ گرمی سے بچنے کی فکر نہ پروا۔ کتابیں اور وہ۔ گرد و پیش فرامین اور سکے۔ یہ پروفیسر محنت کے لحاظ سے مغربی پروفیسروں سے زیادہ اور آسائش اور ماندو بود میں کسی غریب مسجد کے مُلّا سے زیادہ سادہ تھا۔ شیرانی کی یہ آخری تصویر ہے، جو میرے صفحۂ دل پر منقوش ہے۔ اب وہ دنیا میں نہیں ہیں، لیکن اس کی یاد ان کے مہجور احباب کے دلوں میں موجود ہے اور مرحوم کے لیے دعائے مغفرت ان کے لبوں پر ہے۔

•

(در: اورینٹل کالج میگزین فروری 1947ء ص 4-8۔ نیز در: مقالات عبدالقادر مرتبہ محمد حنیف شاہد لاہور 1986ء)

پروفیسر حافظ محمد اقبال

مرحوم علامہ شیرانی

(1)

میں یہ سطور اپنے مخدوم ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے فرمان کی تعمیل میں لکھ رہا ہوں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دوستی اور یگانگت کا جو رشتہ میرے اور مرحوم کے درمیان تھا' وہ کسی دوسرے کے ساتھ نہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ لاہور کے زمانہ قدیم میں (جو تقریباً بیس برس کا طویل زمانہ ہے) مرحوم کی صحبت میں جتنا وقت میں نے گزارا' وہ یقیناً کسی اور نے نہیں گزارا ہوگا اور میں بہ افتخار کہتا ہوں کہ انہوں نے اپنی خدمت میں بے تکلفی اور گستاخی کے جو حقوق مجھے دے رکھے تھے' وہ کسی اور کو حاصل نہ تھے۔ پھر بھی میں یہ دعوا نہیں کر سکتا کہ ان کی زندگی کے حالات کا سب سے زیادہ جاننے والا میں ہوں۔ وجہ کیا کہ مرحوم کی طبیعت حد سے زیادہ غیور اور خوددار تھی اور بلاضرورت وہ کبھی اپنی سابقہ زندگی کے واقعات کی طرف اشارہ نہیں کرتے تھے۔ مجھے بھی کبھی یہ گمان نہ گزرا تھا کہ ان کے سوانح نگار ہونے کا پُر افتخار فرض مجھے ادا کرنا پڑے گا اس لیے میں بھی کبھی ان کے حالات کو بالتفصیل معلوم کرنے کے درپے نہ ہوا۔ اب صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ وقتاً فوقتاً ان کی زبانی جو باتیں ضمناً مجھے معلوم ہوتی رہیں' وہ لکھ دوں۔ مجھے مرحوم کی جن چیزوں سے زیادہ واسطہ رہا' وہ ان کا محبت بھرا دل' ان کا بے مثال خلوص اور ان کا تبحر علمی تھا۔ ان کی ان خوبیوں کا ذکر مجھے بہت زیادہ مرغوب ہے۔

حافظ محمود خاں صاحب شیرانی کا وطن ٹونک تھا' جہاں وہ اکتوبر 1880ء میں پیدا ہوئے۔ قبیلۂ شیرانی اصلاً پٹھانوں کا قبیلہ ہے' جو سرحد کی طرف سے آ کر ٹونک میں آباد ہوئے۔ ڈیرہ اسماعیل خاں کے علاقے میں اب بھی بہت سے شیرانی آباد ہیں۔ حافظ محمود خاں کے والد محمد اسماعیل خاں صاحب ٹونک میں ایک باحیثیت جاگیردار تھے۔ مرحوم ان کی سخت گیر طبیعت کا کبھی کبھی ذکر کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کسی معمولی سی خطا پر انہیں اتنا مارا کہ کئی ایک چھڑیاں مارتے مارتے توڑ دیں۔ شدید ضربوں کے باعث کئی مہینے بستر پر پڑے رہے اور مرہم پٹی ہوتی رہی' لیکن ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ اپنے سات بیٹوں میں سے ان کو سب سے زیادہ چاہتے تھے اور پوری توجہ اور کوشش کے ساتھ تعلیم بھی انہی کو دلوائی۔ ان کے بچپن کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب کہ

انگریزی تعلیم کو ابھی زیادہ فروغ نہیں ہوا تھا اور مسلمان بالخصوص اس سے بیزار تھے۔ ان وجوہات سے ان کی ابتدائی تعلیم پرانے طریقے سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلے قرآن حفظ کیا' اس کے بعد گھر ہی میں اپنے والد سے فارسی پڑھتے رہے اور خاصی استعداد پیدا کرلی۔ شاید 1895ء میں ان کو تکمیل تعلیم کے لیے لاہور بھیجا گیا کیوں کہ ان دنوں پرانی اور نئی طرز کی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز یہی تھا۔ یہاں آ کر سنٹرل موڈل سکول میں داخل ہوئے' لیکن چوں کہ طبیعت پر مشرقی تعلیم کا رنگ غالب آ چکا تھا اس لیے انگریزی مضامین کے ساتھ لگاؤ پیدا نہ ہوسکا۔ انگریزی زبان اور بالخصوص ریاضی سے ان کی طبیعت سخت نفور تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ ریاضی کا ٹیچر جب کلاس میں آ کر کہتا تھا کہ فرض کرو اب ج ایک مثلث ہے تو میں سخت جھلا جاتا تھا کہ آخر فرض کیوں کریں' صاف دیکھ رہے ہیں کہ اب ج ایک مثلث ہے۔ پھر فرض کرنے کے کیا معنی؟ خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا' حقیقت یہ تھی کہ ریاضی کے ساتھ ان کی طبیعت کو مطلق لگاؤ نہ تھا۔ غرض اسکول سے جی اچاٹ ہوا اور وہاں سے چھوڑ کر اوری انٹل کالج میں آ داخل ہوئے۔ منشی فاضل کی جماعت کو ان دنوں مولوی عبدالحکیم صاحب کلانوری پڑھاتے تھے' جو فارسی کے ایک باذوق عالم تھے۔ کچھ ان کی تربیت سے کچھ اپنے ذاتی جوہر سے مرحوم نے اس جماعت کے طالبعلموں میں بہت جلد برتری حاصل کرلی۔ فارسی میں یہاں تک استعداد بہم پہنچائی تھی کہ بے عیب شعر کہتے تھے' عرفی کے مشہور قصیدے:

ز خود گر دیدہ بر بندی چہ گویم کام جاں بینی

کے جواب میں انہوں نے جو قصیدہ لکھا' اس میں سے اپنے استاد مولوی عبدالحکیم کے صاد کیے ہوئے شعر کبھی کبھی سنایا کرتے تھے۔ خاصا پختہ کلام معلوم ہوتا تھا۔ 1899ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کر کے اپنے وطن واپس گئے۔ اس سے اگلے دو تین برس کا حال مجھے معلوم نہیں۔ 1904ء میں بیرسٹری پاس کرنے کے ارادے سے انگلستان گئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ انہی دنوں اردو زبان کے دو اور زبردست محسن یعنی جناب سر شیخ عبدالقادر اور مرحوم سر محمد اقبال کا بھی ولایت جانا ہوا۔ یہ تینوں بزرگ قیام انگلستان کے زمانے میں تقریباً معاصر تھے۔ مرحوم شیرانی نے بیرسٹری کے دو تین ابتدائی امتحان پاس کر لیے تھے لیکن سوئے اتفاق سے ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور خانگی حالات نے ایسی صورت اختیار کرلی کہ بھائیوں نے خرچ بھیجنا بند کردیا۔ تعلیم کا جاری رکھنا تو درکنار' ہندستان واپس آنا بھی مشکل ہوگیا۔ ایسی اضطرار کی حالت میں سر ٹامس آرنلڈ آں جہانی نے ان کی مدد کی اور ایک قلیل سا وظیفہ کسی فنڈ سے دلوا کر ریسرچ کے کام میں اپنا مددگار بنا کر رکھ لیا۔ مشرقی علوم میں تحقیقات کا شوق ان کو اسی کام کے ذریعے سے پیدا ہوا' لیکن وظیفہ گزر اوقات کے لیے ناکافی تھا اس لیے کوئی اور راستہ ڈھونڈنے پر مجبور ہوئے۔ کتابوں اور خصوصاً قلمی کتابوں کی شناخت تو پیدا ہو ہی چکی تھی' لندن کی مشہور فرم لیوزک کمپنی نے جو مشرقی کتابوں کے تاجر ہیں' ان کو اس کام پر رکھ لیا کہ قلمی کتابیں اور دوسری پرانی چیزیں تلاش کر کے فرم کے لیے خریدیں۔ اس خریداری پر انہیں کمیشن ملتا تھا اور اس میں انہیں

خاصا فائدہ ہوا۔ یہاں تک کہ فرم کے حصے دار ہو گئے۔ یہ کام ان کے مذاق کے عین مطابق تھا اور مالی فائدہ اس کے علاوہ۔ اکثر اس بات پر اظہار تاسف کیا کرتے تھے کہ میں نے بڑی حماقت کی جو یہ کام چھوڑ کر ہندستان چلا آیا۔ 1913ء میں وہ واپس ہندستان آئے لیکن نہ اس خیال سے کہ اب یہیں رہیں گے بلکہ اپنے اعزہ و اقارب سے ملنے اور بھائیوں کے ساتھ جائیداد کی تقسیم کے خیال سے آئے تھے۔ ایک آدھ سال اسی میں گزرا' تا آں کہ 1914ء میں یورپ کی جنگ شروع ہو گئی اور ان کا واپس انگلستان جانا دشوار ہو گیا۔ جنگ کے ختم ہونے کے انتظار میں چند سال گزر گئے' پھر خانگی حالات میں کچھ اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی گئیں۔ غرض نہ جا سکے اور گھر بیٹھے بیٹھے آٹھ برس گزار دیے۔ چوں کہ کوئی خاص مشغلہ اس زمانے میں نہ تھا' اس لیے شکار کا شوق پیدا کیا۔ ٹونک کا علاقہ بہت بڑی شکار گاہ ہے۔ ایسی جگہ رہ کر اس شوق کی پرورش بہت آسان تھی۔ اس کو انہوں نے تادم زیست نباہا۔ شکار کا موقع وہ کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اس کی خاطر گھر کے اور کالج کے ضروری کام بھی چھوڑنا پڑیں تو گوارا کرتے تھے۔

بے شغلی کا ایک طویل زمانہ گزارنے کے بعد 1921ء میں وہ تلاش معاش کے لیے لاہور آئے۔ جناب شیخ سر عبدالقادر اور مرحوم سر محمد اقبال کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات انگلستان کے زمانے میں پیدا ہو چکے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی سفارش سے لاہور کے اسلامیہ کالج میں ان کو ایک سو پچاس روپے ماہوار پر اردو اور فارسی کا لیکچرار مقرر کر دیا گیا۔ اگرچہ یہ مشاہرہ اور یہ عہدہ ان کی لیاقت سے فروتر تھا' لیکن حالت اضطرار میں انہوں نے اس کو بہت غنیمت سمجھا اور منظور کر لیا۔ سات سال تک (1921ء سے 1928ء تک) وہ اس عہدے پر مامور رہے اور اپنے فرائض کو محنت اور خندہ پیشانی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ ان کے علمی کارناموں کے آغاز کا یہی زمانہ ہے۔ رسالہ 'اردو' کے ساتھ ان کا تعلق اسی زمانے میں شروع ہوا اور ان کے نادر علمی مضامین' جو اس زمانے میں رسالہ 'اردو' میں شائع ہوئے ان کی شہرت اور ہر دلعزیزی کا سب سے بڑا سبب ہوئے۔ آخری سال یعنی 1928ء میں پنجاب یونی ورسٹی نے اوری انٹل کالج لاہور میں اردو لیکچرر کی ایک نئی اسامی نکالی۔ حسن اتفاق سے اسی سال مرحوم کی انقلابی تصنیف ''پنجاب میں اردو'' شائع ہوئی جس کی وجہ سے ان کو اس اسامی کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ یہ آخری عہدہ تھا جس پر وہ اپنی زندگی میں جاگزیں ہوئے۔ اوری انٹل کالج میں اس جگہ پر انہوں نے بارہ برس گزارے اور 1940ء میں سبک دوش ہو کر اپنے وطن ٹونک میں خانہ نشین ہو گئے[1]۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان کی علمی زندگی کی ابتدا بھی اوری انٹل کالج سے ہوئی اور انتہا بھی یہیں ہوئی۔ 1938ء سے ان کو دمے کی تکلیف شروع ہو گئی تھی جو رفتہ رفتہ شدید ہوتی گئی۔ آخری چار برس انہوں نے اس بیماری سے سخت تکلیف اٹھائی اور بالآخر اسی کے باعث ان کی جان عزیز نذر اجل ہوئی۔ 15 فروری 1946ء کو پینسٹھ برس اور چار مہینے کی عمر میں حیات فانی کی مدت کو ختم کیا اور اپنی وصیت کے مطابق بناس ندی کے کنارے جو ان کی محبوب نزہت گاہ تھی' سپرد خاک کیے گئے۔

ان کی اولاد میں ان کے فرزندِ یگانہ حضرت اختر شیرانی ہیں کہ یگانہ روزگار بھی ہیں۔ شعر وادب کی دنیا میں ان کا نام اور کلام کسی تعریف و تعارف کا محتاج نہیں۔ اس وقت وہ اپنے وطن ٹونک ہی میں مقیم ہیں اور اپنے لائق باپ کے لائق جانشین ہیں۔ خدا انہیں زندگانی دراز سے بہرہ مند کرے۔

(2)

میں اس بات کو ضروری نہیں سمجھتا کہ مرحوم کی تصانیف اور مضامین کو شمار کروں یا ان کی تحقیقاتِ علمی کی خوبیاں بیان کروں۔ اہلِ ذوق کی نظر سے یہ چیزیں ضرور گزر چکی ہیں اور جو لوگ ان کے مداح ہیں ضرور ہے کہ ان کی تصانیف کو دیکھ کر ہی ان کے مداح بنے ہیں' لیکن یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ انہوں نے اس تحقیقاتِ علمی کی خاطر اپنے مال اور اپنی راحت کو کس حد تک قربان کیا۔ 1921ء میں وہ اسلامیہ کالج لاہور میں ایک سو پچاس روپے ماہوار پر ملازم ہوئے۔ بیس برس کی طویل خدمت کے بعد جب وہ اوری انٹل کالج سے ریٹائر ہوئے تو چار سو روپے ماہوار پا رہے تھے۔ ان کی مالی قربانیوں کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس قلیل تنخواہ میں سے انہوں نے اس عرصے میں تقریباً بیس ہزار روپے کی قلمی اور دوسری نایاب کتابیں جمع کیں اور تقریباً اسی قیمت کے نادر سکے حاصل کیے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے پر انہوں نے اپنی ان تمام کتابوں کا ذخیرہ (جن کی تعداد پانچ ہزار سے زائد ہے) قیمت خرید سے بہت کم رقم پر پنجاب یونی ورسٹی لائبریری کو دے دیا۔ جس وقتِ نظر کے ساتھ انہوں نے یہ ذخیرہ جمع کیا تھا' وہ انہی کا حصہ تھا۔ ہندستان کے گوشے گوشے میں وہ کتابوں کی تلاش میں پھرے اور ہزار ہا روپے جو انہوں نے سفر کرنے میں خرچ کیے' وہ اس رقم میں شامل نہیں جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا۔ ان کی حاصل کردہ کتابوں کی ندرت اور اہمیت کو دیکھتے ہوئے ہم علی الاعلان یہ کہتے ہیں کہ اگر وہ چاہتے تو قیمت خرید سے دُگنی اور تگنی قیمت پر ان کو بآسانی فروخت کر سکتے تھے اور اس نفع سے وہ خاصے مال دار ہو جاتے' لیکن محض اس خیال سے کہ لائبریری میں ان کی کتابیں اہلِ علم اور اہلِ تصنیف کے لیے کارآمد ہوں گی اور ان کا نفع عام ہوگا' انہوں نے ایسے زبردست ایثار سے کام لیا۔ ہر سال گرمی کی چھٹیوں میں ان کا معمول تھا کہ کتابوں اور سکوں کی تلاش میں دُور دُور کا سفر کرتے تھے اور ہر قسم کی تکلیف برداشت کرتے تھے' لیکن ان کوششوں میں ان کا نصیب ایسی یاوری کرتا تھا کہ شاید ہی کبھی ناکام واپس آئے ہوں۔ ہر دورے میں چند اچھی چیزیں ان کو ضرور مل جاتی تھیں۔ آخری سالوں میں ان کے پاس کتابوں اور سکوں کا ذخیرہ اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ ان کے گھر میں رکھنے کی جگہ نہیں رہی تھی' جس کمرے میں دیکھو کتابوں کے صندوق اور الماریاں رکھی ہیں' چارپائی تک کے لیے بھی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ ان صندوقوں اور الماریوں پر بھی انہوں نے بہت رُپیہ صرف کیا تھا اور بالخصوص سکوں کے لیے انہوں نے خاص قسم کے بکس بنوائے تھے جن میں چھوٹے چھوٹے دروازوں میں سکے ایک خاص ترتیب کے ساتھ رکھے گئے تھے۔[2]

ناظرین کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اتنا کثیر رُپیہ صرف کرتے رہنے کے بعد وہ اپنے ذاتی اخراجات کے لیے کیا باقی رکھتے ہوں گے۔ تنخواہ کے علاوہ ان کی اور کوئی مستقل آمدنی نہ تھی' اپنی ذات پر وہ بہت ہی کم خرچ کرتے تھے۔ ایک نہایت مختصر سے مکان میں ان کی رہائش تھی جس میں کسی قسم کی آرائش یا سامان نہ تھا۔ ہمیشہ فرش پر بیٹھتے تھے اور اپنے ملاقاتیوں کو بھی وہیں بٹھاتے تھے اور وہیں بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا سارا کام کرتے تھے۔ نہ ان کو اس بات کا احساس تھا کہ میری زندگی کس قدر سادہ ہے اور نہ کسی دوسرے کے سجے ہوئے گھر اور پُرتکلف سامان کی طرف دھیان دیتے تھے۔ کھانے پینے میں بھی ان کا یہی حال تھا۔ اگر کسی دعوت میں بہت مزے دار چیزیں کھائیں تو واہ واہ نہیں کی اور اگر کہیں پھیکا بدمزہ کھانا ملا' تب بھی ملتفت نہیں ہوئے۔ کوئی دوست ساتھ ہوا اور دعوت سے نکل کر اس نے کہا کہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ کھانا کتنا نفیس تھا تو تعریف میں اس کے ہم زبان ہو گئے اور اگر اس نے کہا کہ لاحول ولاقوۃ کیسا واہیات کھانا تھا تو اکثر کہہ دیتے کہ میں نے تو کچھ خیال نہیں کیا۔ کھانے میں بہت اعتدال سے کام لیتے تھے[3]۔ کسی خاص چیز کے بہت شوقین نہ تھے اور نہ کسی چیز سے نفرت کرتے تھے۔ آخری سالوں میں بیماری کی وجہ سے خاص خاص چیزوں سے پرہیز اختیار کر لیا تھا لیکن مطلق اس بات کی شکایت نہ تھی کہ افسوس میں فلاں چیز نہیں کھا سکتا۔ اپنے وطن ٹونک کے خربوزوں کو البتہ ہمیشہ یاد کیا کرتے تھے۔ لاہور میں جب تک رہے' ان کے کھانے کی حسرت کا اظہار کرتے رہے لیکن آخری پانچ برس میں جو انہوں نے ٹونک میں گزارے' اس نعمت سے خوب بہرہ مند ہوئے اور اپنے سب دوستوں کو خربوزوں کے موسم میں وہاں آنے کی دعوت دیتے رہے' لیکن چوں کہ وہ زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ لاہور کے کالجوں میں چھٹیاں نہیں ہوتیں' اس لیے کوئی بھی نہ جا سکا۔

دوستوں کے انتخاب کرنے میں بہت محتاط تھے۔ جب تک کہ کوئی شخص ان کے اپنے مذاق کا نہ ہو (اس مذاق میں شکار کا شوق بھی شامل تھا) اس کے ساتھ رابطہ نہیں بڑھاتے تھے' لیکن جب ایک دفعہ کسی کے ساتھ لگاؤ پیدا کر لیا تو پھر اس کا نباہ اس طرح کرتے تھے جیسا کہ پرانے وقت کے بزرگوں میں دستور تھا۔ رشتۂ دوستی میں ان کا خلوص مبالغے کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ دوستوں کی خاطر ہر طرح کا ایثار کرنے کو تیار رہتے تھے اور ہر تکلیف برداشت کرنے میں ان کو مسرت ہوتی تھی۔ ان کے دوستوں اور شاگردوں میں ریسرچ کا کام کرنے والے ان سے ہر طرح کی مدد لیتے تھے اور طرح طرح کی بیگاریں ان پر ڈالتے تھے۔ وہ ہمیشہ ایسی خوش دلی اور تن دہی کے ساتھ مدد دیتے تھے کہ خود اپنا کام بھی چھوڑ بیٹھتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ میں ان سے پوچھ بیٹھتا کہ فلاں حکایت یا فلاں تاریخی واقعہ کون سی کتاب میں کہاں ملے گا یا یہ کہ فلاں شعر کس شاعر کا ہے؟ اب وہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہوئے' کتابوں پر کتابیں اور دیوانوں پر دیوان دیکھتے جا رہے ہیں۔ بسا اوقات میں خود سست پڑ جاتا اور جستجو کی خواہش سرد ہو جاتی' لیکن ان کی سرگردانی اور مستعدی میں فرق نہیں آتا تھا اور آخر تلاش کر کے چھوڑتے تھے۔ اس قسم کی علمی امداد تو خیر ان کے اپنے مذاق کی چیز تھی' لیکن اس کے علاوہ بھی کسی

دوست کو تکلیف کے وقت میں عملی یا مالی امداد دینا ان کے حسن اخلاق کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ اپنے محدود ذرائع آمدنی کے باوجود ہر قسم کے کار خیر میں (خصوصاً اگر اس کار خیر میں کوئی علمی خدمت بھی شامل ہو) دل کھول کر چندہ دیتے تھے۔ غریب طالبعلموں کی تعلیم کے لیے مالی امداد دینا اپنا خوش گوار فرض سمجھتے تھے۔ اپنے بھتیجوں اور بھانجوں پر ماں باپ سے بڑھ کر شفقت کرتے تھے' ان میں سے کئی ایک کو وطن سے بلا کر اپنے پاس رکھا اور ان کی تعلیم و تربیت کی کفالت کرتے رہے۔

جن دوستوں کے ساتھ ان کے تعلقات زیادہ گہرے تھے' ان کے گھر کو وہ اپنا گھر سمجھتے تھے اور ان کے بچوں حتیٰ کہ نوکروں کے ساتھ بہت بے تکلفی برتتے تھے۔ میرے ہاں جب کبھی آتے میری طرف بہت کم متوجہ ہوتے تھے' بچوں کو لے کر بیٹھ جاتے۔ ان کے ساتھ دل لگی اور مذاق کی باتیں کرتے۔ انہیں لطیفے اور کہانیاں اور اپنے شکار کے قصے سناتے رہتے اور کبھی نہیں اکتاتے تھے۔ میری انہیں مطلق پروا نہیں ہوتی تھی کہ میں پاس بیٹھوں یا نہ بیٹھوں۔ اکثر ایسا ہوا کہ رات کو وہ میرے ہاں مقیم رہے۔ میں تو سر شام سو گیا اور وہ آدھی آدھی رات تک بیٹھے بچوں کو شیر اور مگرمچھ کے شکار کے واقعات سناتے رہے۔ میرا مکان لاہور سے باہر موڈل ٹاؤن میں ہے۔ جن دنوں ان کا میرے ہاں آنا جانا تھا یہ جگہ بہت غیر آباد تھی اور آس پاس سب جنگل تھا۔ جھاڑیوں میں خرگوش بہ کثرت تھے' کبھی کبھی اپنی بندوق اور شکار کا سامان لے آتے۔ میں خود شکار کے شوق کا مخالف ہوں۔ مجھے 'مہاراج جی' کہا کرتے تھے۔ رات کو بجلی کی مشعل کے ساتھ خرگوش کے شکار کو جاتے۔ بچوں سے کہتے کہ 'مہاراج جی' کو بیٹھا رہنے دو۔ چلو ہم اور تم سب شکار کو چلیں۔ وہ چلے جاتے تو میں تو سو رہتا۔ صبح اٹھ کر رات کے شکار کا ماجرا سناتے۔ کبھی تو میں یہ خوشی سن لیتا اور کبھی دوستانہ ناز کے ساتھ ان پر خفا ہوتا کہ آپ بچوں کی عادتوں کو بگاڑ رہے ہیں۔ نہایت مزے میں سنتے اور ہنستے' مطلب یہ کہ ہم تمہاری کیا پروا کرتے ہیں۔ بچوں کا یہ حال تھا کہ وہ جانے لگتے تو ان سے لپٹ جاتے کہ نہیں جانے دیں گے۔ بعض وقت ایسی ضد کرتے کہ واقعی نہیں جانے دیتے تھے۔ جس دن ان کے آنے کی امید ہوتی تھی تو صبح سے انتظار میں بیٹھ جاتے تھے اور جب وہ آ جاتے تو پھر سب کے سب اپنے گھر اور گھر والوں سے بے نیاز ہو جاتے تھے۔ سلطان میرا ایک ملازم تھا۔ وہ شطرنج اچھی کھیلتا تھا۔ کسی دن جی چاہتا تو باہر ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر آدھا آدھا دن اس کے ساتھ شطرنج کھیلتے رہتے۔ انہیں مطلق احساس نہ تھا کہ ایک ادنا ملازم برابری کے دعوے سے میرے ساتھ شطرنج کھیل رہا ہے۔ بہت دفعہ اس سے ماتیں بھی کھائیں' لیکن ہمیشہ ہنسی اور مذاق کے ساتھ کھیل کو ختم کرتے تھے۔ ''شیرانی صاحب'' کی آمد سے بڑھ کر کوئی چیز ہمارے گھر میں خوشی کا باعث نہیں ہوتی تھی' آج جب یہ باتیں یاد آتی ہیں تو زندگی سے جی اُچاٹ ہوتا ہے۔

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں
کس کی باتوں سے جی کو بہلائیں

ہمارے اس نامبارک زمانے میں اس محبت اور اس اخلاص کے نمونے صحرا میں چشمۂ صافی کا حکم رکھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرحوم کی یہ خوبیاں خاندانی نجابت اور اس کے ساتھ پرانی طرز کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھیں۔ اب خوبیوں کے پیدا کرنے والے اسباب روز بہ روز مفقود ہوتے جاتے ہیں۔ عجب نہیں کہ جلد وہ وقت آ جائے جب کہ ان باتوں کو خوبیاں کہنا لوگوں کے لیے تعجب کا باعث ہو۔

دوست نوازی اور مہر و وفا کی ان خوبیوں سے بڑھ کر مجھے جس چیز نے مرحوم کا گرویدہ بنایا تھا' وہ ان کی خود انکاری اور حد سے بڑھا ہوا انکسار تھا۔ بیس برس کے طویل زمانے میں مَیں نے کبھی کسی موقع پر خلوت یا جلوت میں انہیں ایسی بات کہتے نہیں سنا جس سے معلوم ہوتا کہ انہیں اپنی علمی قابلیت یا کسی اخلاقی خوبی کا ذرا سا بھی احساس ہے۔ ہمیشہ اپنی کم زوریوں کو بیان کرتے تھے' لیکن نہ اس طرح کہ گویا سننے والے سے داد یا تردید چاہتے ہیں' ایسی بات کو بیان کرتے ہی وہ فوراً گفتگو کا موضوع بدل ڈالتے تھے اور کسی قسم کی داد یا تردید کا موقع ہی نہیں دیتے تھے۔ کبھی انہیں پتا چلتا کہ کسی نے ان کے متعلق مذمت کے کلمے کہے تو اس کے کہے کی تصویب کرتے اور اس بات پر زور دیتے کہ اس نے جو کچھ کہا ٹھیک کہا' برعکس اس کے جس دوست نے ان کے ساتھ کوئی ذرا سی بھی نیکی کی' وہ ان کے دل کی گہرائیوں میں لکھی رہتی تھی جس کا وہ ہمیشہ اعتراف کرتے رہتے تھے۔ جناب شیخ سر عبدالقادر صاحب کے توسط سے ان کو اسلامیہ کالج میں جگہ ملی اور بعد میں اورینٹل کالج والی جگہ ان کو اپنے مکرم دوست خان بہادر محمد شفیع صاحب کی کوشش سے حاصل ہوئی۔ ان دونوں بزرگوں کے نام کا کلمہ وہ مرتے دم تک پڑھتے رہے۔ انہیں ذرا سا بھی اس امر کا احساس نہ تھا کہ ان دونوں جگہوں کے حاصل کرنے میں ان کی اپنی قابلیت یا اہلیت کو بھی کوئی دخل تھا۔ بس یہی کہتے تھے کہ اگر یہ بزرگ میری دست گیری نہ کرتے تو میں بھوکا مر جاتا۔ دوست تو دوست وہ پنجاب اور اہل پنجاب کے عمر بھر ممنون رہے کہ غریب الوطنی میں ان لوگوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور میری روزی کا سامان مہیا کر دیا۔ جب انہوں نے اپنی مشہور تصنیف "پنجاب میں اردو" لکھ کر ختم کی اور اس میں اپنے اس نظریے کو ثابت کر دکھایا کہ اردو زبان پنجاب میں پیدا ہوئی تو انہیں اس نتیجے پر بے حد راحت اور اطمینان کا احساس ہوا۔ کہتے تھے کہ میں نے پنجاب کی روٹیاں کھائیں تو الحمدللہ اس کا کچھ تو احسان اتارا۔

مرحوم کی طبیعت حد سے زیادہ حساس تھی اور چوں کہ انہیں اپنی لیاقت یا اہلیت پر مطلق اعتماد نہ تھا اس لیے کسی قسم کی ذرا سی ذمے داری بھی اپنے سر لے لیتے تو ان پر ایک ہول چڑھ جاتا تھا۔ بہت پریشان ہوتے اور اس کو سر سے اتارنے کے لیے اگر چھٹانک بھر کوشش کافی ہوتی تو سیر بھر کا اہتمام کرتے اور اس پر بھی مطمئن نہ ہوتے تھے۔ اپنی کوششوں کی سو فی صدی کام یابی پر بھی ان کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ لاہور میں دو ایک علمی کانفرنسوں کے موقع پر ان کے نادر قلمی نسخوں اور سکوں کی نمائش ہوئی۔ جو لوگ دیکھنے آئے وہ مسحور ہو کر گئے' اخباروں میں تعریفیں ہوئیں' ہر طرف سے مبارک باد کی صدائیں اٹھیں لیکن حضرت شیرانی ہیں کہ ندامت

اور خجالت میں غرق ہوئے جاتے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ افسوس اس میں فلاں کوتاہی رہ گئی اور فلاں بات نہ ہوسکی اور پھر یہ دکھاوے کے لیے نہیں کسی کے سامنے نہیں بلکہ بہت بعد میں کبھی یاد آ یا تو ایسی باتیں کہیں۔

اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری میں بھی وہ اسی انکسار کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ علمی تحقیقات میں جس انہماک اور استقصا کا ثبوت انہوں نے اپنے مقالات اور مضامین میں دیا ہے' اتنی ہی کاوش اور جستجو وہ اپنے لیکچروں کی تیاری میں کرتے تھے' لیکن باوجود اس کے اپنی کم کوشی اور نارسائی کا اعتراف برابر کیے چلے جاتے تھے۔ ایسے مزاج کے آدمی میں شرمیلا پن لازمی طور پر ہوتا ہے اور وہ اپنے نام کے اشتہار کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ مرحوم میں یہ صفت بہ درجہ اتم پائی جاتی تھی۔ پبلک میں اپنی تعریف وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے اور اپنے کسی کارنامے کی اشاعت کے سخت مخالف تھے۔ اسی بنا پر کسی جلسے یا کانفرنس میں ایسا کام انجام دینا جس پر خواہ مخواہ سب کی نظر پڑے' ان کو بہت ناگوار تھا۔ شاید 1937ء یا 1938ء میں ہندستانی اکیڈمی کا جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ شعبہ اردو کی صدارت ان کو پیش کی گئی تو انہوں نے اسی بنا پر اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یوں انہیں ہزار کام سپرد کر دیے جاتے' وہ بہ خوشی ان کو انجام دیتے تھے' لیکن ایسا کام جس پر چاروں طرف سے واہ واہ کا غل ہو' ان کو منظور نہ تھا۔ میں نے اس مضمون کے عنوان میں ان کو علامہ لکھ دیا ہے۔ اگر کہیں ان کی زندگی میں اس لقب سے میں انہیں یاد کر بیٹھتا تو مجھے کبھی معاف نہ کرتے' لیکن میں اپنے ناظرین سے انصاف کا طالب ہوں کہ وہ ان کے مبلغ علم' ان کی وسعت نظر اور ان کے معلومات کی ہمہ گیری کو دیکھ کر مجھے بتائیں کہ اس لقب کے وہ حق دار تھے یا نہیں۔

مرحوم کے تبحر علمی کا اندازہ ان کی تصانیف اور ان کے علمی مقالات کے پڑھنے والوں کو بہ خوبی ہو چکا ہے۔ اس پر تبصرہ کرنا لاحاصل ہے' مجھے صرف یہ بتانا چاہیے کہ مطالعے اور تحقیق علمی میں وہ کن عادات پر کاربند تھے اور شب و روز میں ان کی تقسیم اوقات کیا تھی؟ دن کے وقت انہیں کالج میں تین چار گھنٹے روزانہ صرف کرنے پڑتے تھے۔ ایک آدھ گھنٹہ جماعت کو پڑھانے کے سوا وہ اپنا ذاتی لکھنے پڑھنے کا کام اس وقت میں نہیں کر سکتے تھے۔ ان سے ملنے والے اور بالخصوص ان سے رسمی استفادہ کرنے والے اکثر یہیں آتے تھے اور انہیں گھیرے رہتے تھے۔ اپنا کام سب گھر پر کرتے تھے۔ چھٹی کا دن ہوا تو دن کو ورنہ رات کو عشا کے بعد شروع کر کے بعض وقت صبح کے تین بجے اور چار بجے تک مشغول رہتے تھے۔ دماغی تھکن کی کبھی انہوں نے شکایت نہیں کی۔ سوتے بہت کم تھے۔ اگر لکھنے پڑھنے کا کام نہ بھی ہو تو گیارہ بارہ بجے سے پہلے نہیں سوتے تھے اور صبح کو چار پانچ بجے ضرور اٹھ بیٹھتے تھے۔ مطالعے کے وقت ان کی محویت کا یہ عالم ہوتا تھا کہ کوئی پاس آ بیٹھے یا پاس سے اٹھ کر چلا جائے' انہیں خبر نہیں ہوتی تھی۔ ایک دوست بیان کرتے تھے کہ میں دوپہر کے وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوا' فرش پر بیٹھے کام میں مصروف تھے' تھوڑی دیر میں بھانجے کو آواز دی کہ میرا کھانا لاؤ۔ اس نے پاس آ کر کہا کہ ابھی ابھی تو آپ نے کھانا کھایا ہے۔ حیران ہو کر اس کا منھ دیکھنے لگے پھر کچھ خفت ہوئی۔

چپ ہو گئے اور بات کو ٹال دیا۔ پڑھنے لکھنے کے کام کے لیے ان کو کسی خاص ماحول کی ضرورت نہ تھی' کمرے میں بند ہوں یا کھلی ہوا میں ہوں' ہُو کا عالم ہو یا سر پر ڈھول بج رہے ہوں' میز کرسی پر ہوں فرش پر ہوں کسی درخت کے نیچے کھری چارپائی پر بیٹھے ہوں' کہیں ہوں کسی حال میں ہوں' مطالعے میں ان کی محویت اور یک سوئی میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ لاہور میں ان کا مکان میوہ منڈی کے پاس تھا اور عین سر بازار۔ کبھی ان کے ہاں جانے کا اتفاق ہوتا تو بازار کے شور کے مارے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ سودے والے پکار رہے ہیں' موٹروں کے ہارن بج رہے ہیں' ابھی ایک برات گزر رہی ہے' ابھی سینما کے اشتہار والے باجے بجاتے ہوئے جا رہے ہیں' تانگے والے اور چھکڑے والے ہٹو بچو کا غل مچا رہے ہیں' عین اس بازار کے اوپر ان کا کمرہ تھا اور وہیں بیٹھے اپنا کام کرتے رہتے تھے۔ اس کے مقابلے میں گرمی کی چھٹیاں کبھی کبھی اپنے سسرال کے گانو کھٹو (علاقہ جودھ پور) میں گزارنے جاتے تھے جہاں میلوں تک آبادی کا نام نہیں۔ رات کو آس پاس شیر دہاڑتے تھے۔ دن بھر کوئی ملنے والا نہیں ہوتا تھا۔ گرمی انتہا درجے کی' پنکھا نہیں' برف میسر نہیں' اس عالم میں بھی وہی محویت اور وہی مشغولیت تھی۔ آب و ہوا کی کیفیت ان کو کبھی اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی تھی' شدید گرمی یا شدید سردی سے بہت کم متاثر ہوتے تھے۔ میرے ہاں کئی مرتبہ وہ دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں آئے اور اصرار کر کے اپنی چارپائی برآمدے میں بچھوائی۔ کبھی مئی کے مہینے میں دوپہر کو لُو کے وقت باہر درخت کے نیچے چارپائی ڈلوا کر بیٹھے رہے۔ زندگی کے آخری پانچ برس میں جو انہوں نے ٹونک میں گزارے' وقت کا اکثر حصہ کھلی ہوا میں بسر کرتے رہے' لیکن یہ تفریح کے خیال سے نہ تھا بلکہ دمے کی بیماری نے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بناس ندی کے کنارے ایک جھونپڑا ڈلوا لیا تھا۔ وہاں سارا دن گزارتے تھے۔ دھوئیں اور گرد سے محفوظ رہنے کے باعث ان کی صحت کسی قدر اچھی رہتی تھی۔ 29 اگست 1943ء کو مجھے لکھا تھا:

> "گرمیاں اس سال میں نے ندی میں گزاریں' راتوں کو نہایت پُر لطف موسم ہوتا تھا' گرمی کے چند دن میں نے وہی دیکھے جب میں دہلی اور رام پور میں تھا' ٹونک میں ایک رات بھی گرم مجھے یاد نہیں۔ دہلی سے واپسی کے بعد میں مستقلاً گیارہ بجے دن کے ندی آ جاتا ہوں۔ یہاں دریا کے کنارے کے قریب پھوس کا ایک جھونپڑا ڈلوا لیا ہے۔ آس پاس کھیت ہیں اور بیچ میں مایہ دولت کا جھونپڑا جس میں ہم فرعونِ بے سامان بنے بیٹھے ہیں' دل میں آئی سو گئے ورنہ کتاب دیکھتے رہے یا اپنا کام کرتے رہے۔ عصر سے خنکی ہو جاتی ہے رات کو معلوم نہیں کیا حالت رہتی ہے میں تو مغرب کے وقت یہاں سے رخصت ہو جاتا ہوں اور گھر پہنچ جاتا ہوں۔"

مرحوم کے سب مداحوں کو معلوم ہے کہ انہوں نے اپنی تمام کتابیں اردو ہی میں لکھیں۔ اہل زبان کو ان کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے اردو کو اپنی محنت کے نتائج سے مالا مال کیا۔ ان کا وطن اگرچہ ٹونک تھا لیکن لکھنے اور بولنے میں ان کی اردو وہ تھی جس کو اردوئے معلی کہا جاتا ہے۔ ان کا تلفظ اور محاورہ بالکل اہل

دہلی کا ساتھا' زبان اردو پر انہیں بے انتہا قدرت حاصل تھی۔ جوانی کے ایام میں شعر بھی کہتے رہے اور ان کی بعض نظمیں ان کے انگلستان جانے سے پہلے رسالہ ''مخزن'' میں شائع ہوتی رہیں۔ ان کی طبیعت کا یہ جوہر ان کے فرزند ارشد حضرت اختر شیرانی نے ورثے میں پایا ہے۔ انگلستان میں نو برس ان کا قیام رہا۔ انگریزی کو خوب سیکھا۔ بولنے میں تو زیادہ مشق نہیں کی' لیکن لکھنے میں وہ ایسی صاف انگریزی لکھ سکتے تھے جیسی کہ اعلا درجے کے تعلیم یافتہ ہندستانی لکھتے ہیں۔ اگر وہ اپنی تصانیف کی زبان انگریزی کو قرار دیتے تو آج وہ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہوتے۔ ان کے نئے نئے علمی نظریے اور نرالے نکتے جو اپنی تحقیقات میں وہ پیدا کرتے رہے' اگر انگریزی میں شائع کیے جاتے تو یقیناً ان کو کئی ایک یونی ورسٹیوں سے اعزازی ڈگریاں ملتیں۔ اردو کو اظہار مقاصد کا ذریعہ قرار دینے سے انہوں نے بہت بڑے ایثار سے کام لیا اور اپنی قومی زبان پر بہت بڑا احسان کیا۔ گو اس وقت ان کے کام کی منزلت اور ان کے نام کی شہرت صرف ہندستان کی چار دیواری میں محدود ہے' لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ وقت ضرور آئے گا جب کہ ان کی تصانیف کے ترجمے غیر زبانوں میں ہوں گے اور ان کا نام ہندستان سے باہر نکلے گا۔

یہ چند سطریں میں نے اس خیال سے نہیں لکھی ہیں کہ مرحوم کی دوستی کا حق ادا کروں۔ وہ حق ایسا نہیں ہے کہ اتنی آسانی سے ادا ہو سکے۔ میرے دوستوں کا حلقہ وسیع نہیں ہے' لیکن اگر حد سے زیادہ وسیع بھی ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ مرحوم سے بڑھ کر مخلص دوست مجھے نہیں مل سکتا تھا۔ کہاوت مشہور ہے کہ حد سے زیادہ بے تکلفی بالآخر نفرت پر منتہی ہوتی ہے۔ ہر شخص کو زندگی میں اس کا تجربہ ہوتا ہے' لیکن مجھ پر اگر کسی تجربے نے اس کہاوت کو غلط ثابت کیا تو وہ مرحوم شیرانی کی صحبت تھی۔ بیس سال کے طویل زمانے میں سوائے چھٹیوں کے شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو کہ تین چار گھنٹے میں اور وہ ساتھ نہ رہے ہوں اور بے شمار مواقع ایسے آئے کہ مسلسل کئی کئی دن شب و روز میرا اور ان کا ساتھ رہا' لیکن ایک لحہ بھی مجھے ایسا یاد نہیں کہ میں ان کی صحبت سے ملول ہوا ہوں یا کوئی ذرا سی بھی بدمزگی پیدا ہوئی ہو۔ جب دیکھو متبسم' جب ملو بشاش' شگفتہ رو' ہنسنے ہنسانے پر آمادہ۔ اپنی زندگی کے وہ خوش گوار لمحے جو میں نے ان کی رفاقت میں بسر کیے' ہمیشہ میری یاد کا سرمایہ رہیں گے۔ ان کے ساتھ میرا رشتۂ اتحاد ایک بے بہا نعمت تھی جو خدائے کریم کی طرف سے مجھ کو عطا ہوئی۔ افسوس کہ میرے پاس کوئی ایسی پونجی نہیں جو ان کی یاد پر نثار کر سکوں۔ ایک دعا البتہ ہے جو دل سے نکلتی ہے۔ سو اسی پر اس تحریر کو ختم کرتا ہوں ۔

مثل ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

حواشی:

1- قبلہ مولوی عبدالحق صاحب نے بڑے اصرار سے انہیں انجمن ترقی اردو میں تالیف و تصنیف کے فرائض انجام دینے کے لیے بلا لیا تھا۔ ان کے فرمان کی تعمیل کے طور پر چند مہینے انہوں نے وہاں بسر کیے' لیکن خرابیٔ صحت کی وجہ سے زیادہ عرصہ نہ رہ سکے اور وطن جانے پر مجبور ہو گئے۔

2- مرحوم چاہتے تھے کہ جس طرح انہوں نے اپنی کتابیں نہایت سستے داموں پر لائبریری کو دے دیں اسی طرح ان کے سکے بھی کوئی لائبریری یا میوزیم خرید لے۔ بہت عرصے تک وہ اس انتظار میں ان کی حفاظت کرتے رہے لیکن جب کوئی صورت نہ ہو سکی تو مجبور ہو کر وفات سے چند ماہ پہلے ان کو پٹنہ کے مشہور رئیس سیٹھ رادھا کشن جالان کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

3- صرف ایک چیز جس میں وہ بے اعتدالی کے مرتکب ہوئے' وہ سگریٹ نوشی تھی۔ کئی سال تک تیس چالیس سگریٹ روز پیتے رہے۔ آخر صحت پر اس کا برا اثر پڑا۔ دمے کی تکلیف جب بڑھ گئی تو اس عادت کو چھوڑنا پڑا۔

(در: اردو' بابت اکتوبر 1946ء' ص 391-404)

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع

مرحوم حافظ محمود خاں شیرانی

میری رائے یہ ہے کہ یارانِ رفتہ کی یاد میں آنسو بہانا سہل ہے مگر دو چار سطریں لکھنا مشکل۔ تاہم کوشش کرتا ہوں۔

شیرانی صاحب سے غائبانہ تعارف راقم الحروف کا طالب علمی کے زمانہ میں ہوا۔ رسالہ ''مخزن'' میں اُن کی ایک نظم چھپی تھی ؂

اے نسیم و صبا شمال و دبور ہند پر جب کرو تم اپنا عبور

میرے حلقہ احباب میں اس نظم کا بہت چرچا ہوا۔ کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ اس نظم کے لکھنے والے شیرانی صاحب اورینٹل کالج لاہور سے منشی فاضل پاس کر کے بیرسٹری کے لیے انگلستان گئے ہیں۔ ان دنوں میں یہ بات سب کے لیے موجب تعجب تھی کہ اورینٹل کالج سے حصول سند کے بعد کوئی شخص قانون کی تعلیم کے لیے لندن جائے' اس لیے کہ اورینٹل کالج میں اس زمانے میں انگریزی کی تعلیم کا کوئی قابل ذکر انتظام نہ تھا اور بغیر انگریزی میں کافی استعداد رکھنے کے انگلستان جانا کچھ معنی نہ رکھتا تھا۔

اس واقعہ سے سترہ اٹھارہ برس کے بعد راقم الحروف خود انگلستان سے واپس آیا اور اورینٹل کالج میں پروفیسر عربی کی حیثیت سے متعین ہوا۔ غالباً 1921ء کا ذکر ہے کہ ایک دن شیرانی صاحب مجھے گھر پہ ملے۔ اس وقت وہ اپنے وطن ٹونک سے آئے تھے جہاں اس زمانے میں پڑھے لکھے لوگوں کی ایک جماعت پر خاص عتاب نازل ہوا تھا اور شیرانی صاحب اور اورینٹل کالج کے ایک مولوی صاحب بھی اب معتوبین اور مخرجین میں شامل تھے۔ شیرانی صاحب سے اس موقع پر جو گفتگو ہوئی' اس سے دو باتیں نہایت واضح طور پر سامنے آئیں۔ ایک ان کی شاہنامہ دانی' دوسرے ان کی عروض دانی۔ ''شاہنامہ'' کو مختلف مواقع پر پڑھنے کا اتفاق یوں تو سب فارسی خوانوں کو ہوتا ہی ہے مگر شیرانی صاحب کے سوا ہندوستان میں یا ہندوستان سے باہر کسی ایسے شخص سے میری ملاقات نہ ہوئی جو ''شاہنامہ'' سر بسر نہ صرف متعدد دفعہ پڑھ چکا ہو بلکہ اس کے اسلوب کلام' زبان اور تراکیب سے اس حد تک شناسائی رکھتا ہو کہ یہ کہہ سکے کہ یہ خاص ترکیب یا یہ خاص کلمہ ''شاہنامہ'' میں آیا ہے یا نہیں۔ اسی طرح ان کے عروضی معلومات سے بھی میں بہت متاثر ہوا۔ وہ اس علم کے جزئیات

سے پوری واقفیت رکھتے تھے اور اس کے متعلق مجتہدانہ انداز سے گفتگو کر سکتے تھے۔ نئے نئے بحور کی تخلیق کا تصور ان کو تھا اور عروض خلیل سے باہر نکلنے کی سکت بھی ان میں معلوم ہوتی تھی۔ اسی موقع پر انہوں نے ڈاکٹر ہنری سٹب (Dr. Henry Stubbe) کی کتاب ''بیان ابتداء ونشوونمائے اسلام و بانی سلام "An account of the Rise and Progress of Mohamedanism with the life of Mohamed" کا اڈیشن بھی دکھایا جو انہوں نے غایت درجہ محنت سے مرتب کر کے 1911ء میں لندن میں چھپوایا تھا اور جس میں 16 صفحے کا ایک مختصر دیباچہ اور 44 صفحے (صفحہ 195 تا 238) کا مفصل تتمہ بعنوان "Early Christian Legends and Notions concerning Islam" بھی ملحق کیا تھا اور اس میں دادِ تحقیق دی تھی۔ قدرتی طور پر مجھ کو خیال آیا کہ اس قسم کا فاضل اورینٹل کالج کے سٹاف پر ہونا چاہیے مگر سوئے اتفاق سے اس زمانہ میں کالج میں کوئی ایسی موزوں آسامی خالی نہ تھی جس پر شیرانی صاحب کا تقرر ہو سکے۔ ناچار اسلامیہ کالج کی طرف ذہن منتقل ہوا جس کی منتظمہ جماعت کے ساتھ مجھ کو بھی تعلق تھا۔ جناب سر شیخ عبدالقادر صدر کالج کمیٹی سے شیرانی صاحب کو مدتوں سے نیاز حاصل تھا۔ ان سے وہ خود ملے۔ بعض دیگر اراکین سے بھی ضروری امور طے ہوئے اور 1922ء میں شیرانی صاحب کا تقرر اسلامیہ کالج میں ہو گیا۔

اسلامیہ کالج کی ملازمت کے زمانے میں بھی وہ مہربانی فرمایا کرتے تھے اور ان سے اکثر ملاقات ہوتی اور مباحث علمی پر گفتگو رہتی تھی۔ ایک زمانے میں پنجاب میں اردو کے مقام پر کچھ عرصہ تک بحث ہوتی رہی۔ اس پر شیرانی صاحب نے ''پنجاب میں اردو'' کی معرکۃ الآراء کتاب کی بنا رکھ کر اس مضمون پر مفصل معلومات بہم پہنچائیں اور اپنی پہلی گراں قدر تصنیف شائع کی۔

1924ء میں مرحوم مولوی عبدالحکیم صاحب اورینٹل کالج سے سبکدوش ہوئے تو میں نے چاہا کہ شیرانی صاحب اورینٹل کالج میں آ جائیں مگر یہ کوشش بعض وجوہ سے ناکام رہی اور یہی حشر ان مساعی کا ہوا جو 1927ء میں ان کو ریسرچ سکالر کی حیثیت سے دوبارا انگلستان بھجوانے کے لیے کی گئیں۔ شیرانی صاحب کے والد ماجد محمد اسمٰعیل خاں جو مارواڑ[1] کے رہنے والے تھے اور سید احمد شہید کے قافلہ سے تعلق رکھتے تھے' تجارت اور کاروبار کی وجہ سے ٹونک کے صاحب ثروت لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے شیرانی کو بیرسٹری کے لیے ولایت بھیجا[2] مگر غالباً باپ کی توحید گی کی وجہ سے ان کو وطن سے روپیہ جانا بند ہو گیا اور شیرانی مجبور ہو گئے کہ بیرسٹری کی تعلیم چھوڑ چھاڑ کر فکر معاش میں لگ جائیں۔ چنانچہ انہوں نے لوزک[3] کی مشہور فرم سے تعلق پیدا کیا اور کل دس برس تک انگلستان میں مقیم رہ کر اور بیرسٹری کی سند لیے بغیر وہ ہندوستان واپس آ گئے۔ ارادہ ان کا یہ تھا کہ روپے کا بندوبست کر کے پھر انگلستان واپس جائیں گے مگر یہ نہ ہو سکا۔ سال مذکور میں جب وہ لاہور میں مقیم تھے' پنجاب گورنمنٹ کے اس وظیفہ کے لیے انہوں نے درخواست دی جو ان دنوں میں مشرقی زبانوں کی تحصیل یورپ میں کرنے کے لیے ملا کرتا تھا۔ بالکل ممکن تھا کہ وہ منتخب ہو جاتے' لیکن وہ ایک مرتبہ

طویل مدت تک انگلستان رہ چکے تھے اور لندن یونیورسٹی کے وظیفہ یاب کی حیثیت سے قریباً ایک سال تک وہاں عربی پڑھتے رہے تھے' اس لیے انتخاب کرنے والی کمیٹی نے ایک اور درخواست کنندہ کا حق ان پر فائق سمجھا اور ان کا پہلا سفر انگلستان ان کے لیے مانع ثابت ہوا۔

بالآخر پنجاب یونیورسٹی میں اردو لیکچرار کی اسامی کی تخلیق ہوئی اور یکم اکتوبر 1928ء کو شیرانی صاحب کا تقرر لیکچرار کی حیثیت سے 250-25-400 کے گریڈ میں ہو گیا اور وہ آٹھ سال تک اس عہدے کے فرائض نمایاں قابلیت اور کامیابی کے ساتھ سرانجام دیتے رہے۔ پھر جب 55 سالگی کی بنا پر ان کی ملازمت ختم ہونے لگی' ان کی حسن کارکردگی کے صلے میں ان کی مدت ملازمت میں یونیورسٹی نے دو سال کی توسیع منظور کی۔ زاں بعد 15 اکتوبر 1938ء سے مزید دو سال کے لیے ان کا تقرر اسی آسامی مگر حسب قاعدہ قدرے کم تنخواہ پر دوبارہ ہوا۔ یہ مدت بھی گزر گئی اور بالآخر 15 نومبر 1940ء سے وہ قریباً ساڑھے 8 ماہ کی فرلو پر روانہ ہوئے۔ فرلو کے ختم ہونے پر ان کا سلسلہ ملازمت یونیورسٹی میں بالکل ختم ہوا اور کالج سے سبکدوش ہو کر وہ وطن جانے پر مجبور ہوئے۔ وطن جانے کے تھوڑے عرصہ بعد انہوں نے انجمن ترقی اردو دہلی سے تعلق پیدا کیا اور بالآخر بسبب علالت وطن کا مستقل قیام اختیار کر لیا۔

اگر لاہور کی گرانی مانع نہ آتی تو ان کے احباب ان کو لاہور سے ہرگز جانے ہی نہ دیتے' اس لیے کہ ایسے سبک روح' شریف طبیعت' خوش خلق' خالص الوداد فاضل دوست کی ہم صحبتی دنیا کی بہترین نعمتوں میں شمار ہونے کے لائق تھی۔

مرحوم کے لاہور سے جانے کے بعد پھر ان کی زیارت نصیب نہ ہوئی۔ کئی بار ٹونک جانے کا سامان پیدا ہوا مگر ہر دفعہ کچھ نہ کچھ رکاوٹ پیش آ گئی۔ سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ مرحوم کو اصرار تھا کہ خربوزوں کے موسم یعنی گرمیوں میں میں وہاں آؤں اور میرے لیے گرمیوں میں راجپوتانے کا سفر ناقابل برداشت تھا۔ ایک دفعہ تیار بھی ہو گیا مگر اس سال ٹونک میں محرقہ (ٹائیفائیڈ) بخار پھیل گیا اور مرحوم سے ملاقات ثانیہ کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔

شیرانی مرحوم کی علمی فضیلتوں کا اعتراف سارے ملک نے کیا ہے۔ فن تنقید میں ان کو کمال حاصل تھا۔ نہایت محنت اور عرق ریزی سے صحیح واقعات کو تلاش کرتے تھے۔ فارسی اور اردو میں ان کی وسعت نظر حیرت ناک تھی۔ عموماً رات کی خاموشی میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے اور دیر میں سوتے تھے۔ کالج کی ملازمت کے زمانے میں کالج کے اوقات میں منتظمین کالج ان کو کبھی اِدھر اُدھر پھرتا دیکھتے تو ان کو کبھی کچھ نہ کہتے' اس لیے کہ ان کا نظام اوقات لوگوں کو خوب معلوم تھا اور سب جانتے تھے کہ جو شخص رات کے طویل گھنٹوں میں اتنا کچھ لکھ پڑھ چکا ہو' اس کے لیے لازم تھا کہ وہ دن میں دماغ کو آرام دے۔

جب دیسی زبانوں میں لیکچرار اورینٹل کالج میں آئے تو مسٹر وولنر آنجہانی نے مجھ سے چاہا کہ میں

ان نو وارد لیکچراروں کو ان کے آئندہ کام کا پروگرام تیار کرنے میں مدد دوں۔ چنانچہ شیرانی صاحب نے میری درخواست پر "مجموعہ نغز" یعنی تذکرہ شعرائے اردو از حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ المتخلص بہ قاسم کی تصحیح کا کام اپنے ذمے لیا۔ ان کے مضامین کا سلسلہ جو "اورینٹل کالج میگزین" اور رسالہ "اردو" میں چھپا' وہ پایدار اہمیت اور مستقل قدر و قیمت رکھتا ہے۔ ان مضامین نے اردو مضمون نگاری کے معیار کو طاقِ بلند پر پہنچایا اور طالبانِ علم کے سامنے نئے نئے سرمشق پیش کیے۔

شیرانی صاحب کا اسلوبِ تحریر سادہ اور آرائش سے خالی مگر بغایت پختہ ہے۔ ان کا استدلال قوی اور مسکت ہے۔ وہ مسئلہ زیرِ بحث کو مختلف زاویوں سے دیکھ کر قاری کے دخل ہائے مقدر کو ہر طرح سے رفع کرنے کی سعی کرتے تھے اور مضمون کا ہر طرف سے احاطہ کرنا چاہتے تھے تاکہ اعتراض کے لیے حتی الامکان کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ ان کا بیان متین ہوتا ہے لیکن اگر ہنسنا ممکن ہوتا ہے تو وہ اس سے بھی نہیں چوکتے۔ بعض مضامین مثلاً یوسف زلیخا منسوب بہ فردوسی اور قصیدہ ہجو محمود غزنوی اور دیوان منسوب بہ معین الدین چشتی وغیرہا میں جہاں انھوں نے مشہور عام مزعومات کے خلاف چند امور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے دادِ تحقیق دی ہے۔ ان کی تنقید شعر العجم بھی یہی رنگ لیے ہوئے ہے اور اس سے مجھ کو اکثر پروفیسر گریگوریف کی تنقید بخارا مصنفہ وامبیری یاد آتی ہے (دیکھیں ترکستان از سکائلر Schuyter ضمیمہ دوم ج 1۔ ص 360 بعد) اور شیرانی کی تنقید ترجمہ خزائن الفتوح کو پڑھ کر تو بہت سے مصنفوں کے دل سے دعا نکلتی ہو گی کہ الٰہی! ہماری تحریر کو تنقید نگاروں کے نشتر نما قلم سے محفوظ رکھیو۔

شیرانی صاحب کا ایک شوق ہمیشہ نمایاں طور پر جالبِ توجہ رہا یعنی مخطوطات اور قدیم مطبوعات اور سکوں کی فراہمی کا شوق ان کے نزدیک ہمارا قومی فرض تھا کہ مخطوطات کو اسلاف کے قیمتی آثار ہونے کی حیثیت سے محفوظ کر لیں اور ان کے ذریعہ اپنے سنہری ماضی کی عظمت کو سمجھیں۔ چنانچہ نہ صرف وہ خود اس شغف میں گرفتار رہتے تھے بلکہ جو احباب[5] ان کے حلقۂ اثر میں آتے تھے' ان کو بھی وہ اپنے اس متعدی شوق سے مسلسل متاثر کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح سکوں کو وہ اسلامی تاریخ کی محکم اساس کی حیثیت سے دیکھتے اور ان کے جمع کرنے کے لیے پیہم تگ و دو میں مصروف رہتے تھے۔ وقتاً فوقتاً ان مطالب کے لیے وہ پنجاب' سرحدی صوبہ راجپوتانہ اور یو پی کے مختلف مقامات میں سفر کرتے تھے اور اپنے وسیع ذرائع معلومات سے کام لیتے ہوئے نادر اور کمیاب چیزیں دور افتادہ اور غیر متوقع کونوں سے نکال لاتے تھے۔ خود لاہور میں ان کو ایسے مقام اور ایسے اشخاص معلوم تھے جن کو کم لوگ جانتے تھے اور جن سے وہ قیمتی چیزیں بہم پہنچایا کرتے تھے۔ یہ ایک فن تھا جس میں ان کو کمال حاصل تھا۔ بعض سرکاری اور نیم سرکاری کتاب خانے ان چیزوں کے لیے شاید ان سے زیادہ قیمت دینے کو تیار تھے مگر اکثر ایسا ہوتا تھا کہ پہلے انتخاب کا موقع مرحوم کو اور اس کے بعد دوسروں کو ملتا تھا۔ کثرتِ معلومات' مدت کی مشق اور ذاتی ذہانت کی وجہ سے ان کو کتاب اور سکے کی بہت اچھی پہچان تھی۔ قلمی نسخہ

کو ہاتھ میں لے کر چند منٹوں میں وہ اس کی عمر اور فی الجملہ اہمیت کا صحیح اندازہ لگا لیتے تھے۔ خط کاغذ گلکاری اور ان کی عہد بعہد خصوصیات کا ماہرانہ علم ان کو حاصل تھا اس لیے میں نے کبھی نہ دیکھا کہ انہوں نے اچھی چیز کو ہاتھ سے جانے دیا یا رطب و یابس کو اکٹھا کر لیا ہو۔ اگر چہ وہ مالدار نہ تھے مگر اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لیے صرف کثیر برداشت کر لیتے تھے اور دونوں قسم کے نہایت قیمتی ذخیرے ان کے ہاں جمع ہو گئے تھے۔

جب وہ وطن کو واپس ہونے لگے تو دمہ کی وجہ سے ان کی صحت مخدوش ہو چکی تھی' اس لیے میرے اصرار پر وہ آمادہ ہو گئے کہ اپنا کتاب خانہ اور سکوں اور مہروں[6] کا ذخیرہ اور دیگر نوادر پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے حوالے کر دیں۔ ان کے کتاب خانہ کا اکثر حصہ تو یونیورسٹی کے قبضے میں آ گیا مگر سکوں کے ذخیرہ کے متعلق یونیورسٹی نے چاہا کہ میوزیم اس کو لے لے۔ پنجاب گورنمنٹ کو لکھا گیا مگر وہ اس پر آمادہ نہ ہوئی۔ یہ قیمتی ذخیرہ شیرانی صاحب وطن کو واپس لے گئے اور وہاں سے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے بائیں تئیس ہزار روپے کے عوض وہ یو پی پہنچ گیا۔ اس مجموعہ کے طلائی سکوں کی صحیح تعداد تو مجھ کو معلوم نہیں مگر چاندی کے سکے اس میں پانچ ہزار کے قریب تھے اور تانبے کے دو ڈھائی ہزار۔ 1945ء میں شیرانی صاحب کا اندازہ تھا کہ ان کے چاندی اور تانبے کے سکے دس ہزار کی مالیت کے ہیں۔

شیرانی صاحب کی قلمی کتابوں کی باقاعدہ فہرست اب مرتب ہو رہی ہے اور ایک حصہ (حصہ نظم) چھپ بھی گیا ہے مگر فہرست کے مکمل اور شائع ہونے میں ابھی بہت وقت لگے گا۔ اس کتاب خانے کی اہمیت کے متعلق انہوں نے 29 مارچ 1941ء کو ایک خط میں لکھا:

> ''اکثر کتابیں فارسی کی ہیں اور فارسی کی ورکنگ لائبریری کا مقصد ادا کرتی ہیں۔ ان میں ناقص اور مکمل دونوں طرح کی کتابیں ہیں۔ اکثر کی جلد بندی کی ضرورت ہے۔ میں نے یہ کتابیں ایک ہندوستانی علم پرست کے نقطہ نظر سے جمع کی ہیں جن میں ہندوستانی تالیفات اور ہندوستانی خط قدیم پر ایک خاص نگاہ رکھی ہے۔ بعد خرابی بصرہ میں نے اس خط کا پتہ لگایا ہے اور میری آرزو ہے کہ میں اس خط کو جو مغلوں کی آمد سے قبل تمام ہندوستان میں رائج تھا' رام کہانی سناؤں...... مدت سے میرا ارادہ ہے کہ میں ہندوستان میں اس خط کے ارتقاء کی داستان دنیا کے سامنے پیش کر دوں مگر ضروری نمونوں کے فقدان کی بنا پر میرا ارادہ عملی جامہ نہ پہن سکا...... اس وقت تک میں نے بدقت تمام ساٹھ ستر کے قریب اس مرحوم خط کے نمونے جمع کر لیے ہیں [بیاض دراصل] کے فن پر میں نے خاص کوشش کر کے ایک بڑا ذخیرہ جمع کیا جس کی تعداد قلمی اور مطبوعہ یقیناً ایک سو سے زیادہ ہوگی۔ یہی حالت بچوں کے تعلیمی نصابوں کی ہے۔ ان تینوں گزشتہ امور میں کوئی لائبریری میرے حقیر مجموعہ کا مقابلہ نہیں

کر سکتی۔ لغات' ادب' تاریخ' تذکروں' انشاء اور بیاضوں میں میرا مجموعہ دوسری لائبریریوں سے کسی حال میں کم نہیں۔"

اپنے کتاب خانے کے متعلق اس مجمل بیان کی تفصیل شیرانی صاحب نے ایک تعلیقہ کی صورت میں لکھی جس کو میری درخواست پر انہوں نے قریباً انہی دنوں میں جب اوپر کا خط لکھا گیا تھا' مرتب کیا۔ یہ تعلیقہ انگریزی زبان میں 35 ٹائپ شدہ صفحوں پر ختم ہوا۔ اس کا ملخص درج ذیل ہے:۔

اس ذخیرہ میں دو ہزار ایک سو مخطوطات (2100) اور ایک ہزار سات سو (1700) مطبوعات شامل ہیں۔ یہ کتابیں بیشتر فارسی کی اور کم کم عربی اور اردو کی ہیں۔ مخطوطات میں سب سے زیادہ اہم کتابوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

قرآن مجید (46 نسخے) کتب تاریخ (126) دواوین شعراء (43) بیاضیں (60) شعراء کے تذکرے (23) اولیاء اللہ کے سوانح حیات (50) عروض (13) تعلیمی نصاب بزبان فارسی و اردو و پنجابی (18) ان کے مخطوطات ذیل بھی قابل ملاحظہ ہیں۔ دینیات و مباحثات (20) تصوف (35) انشائیں (17) شروح (19) موسیقی (4) باغبانی (4) جواہرات (2) علاج الخیل (8) شکارنامے اور بازنامے (12) تیراندازی (9)۔

قرآن مجید کے 26 نسخوں میں سے دو خطِ کوفی میں ہیں اور چوتھی یا پانچویں صدی میں ان کی کتابت ہوئی۔ ان میں سے بعض میں بین السطور فارسی ترجمہ موجود ہے۔ ایک نسخہ صرف 60 ورق کا ہے۔ متعدد نسخوں کی کتابت نویں سے بارہویں صدی تک میں ہوئی۔ ایک نسخہ مغربی اور ایک بہاری خط کا اچھا نمونہ ہے۔

تاریخ کتابت کے اعتبار سے ان نسخوں پر نظر ڈالیں تو اقدم نسخہ المدونہ کے عنق ثانی کا ہے جو رق (ورق الغزال) پر 412ھ میں لکھا گیا۔ ایک رسالہ 521ھ کا لکھا ہوا ہے اور غالباً ان کے نسخہ ہائے مخزن اسرار اور قانون بو علی سینا بھی اسی صدی میں نقل ہوئے۔ صحاح جوہری' اشارات اور اخلاق ناصری میں سے ہر ایک نسخہ ساتویں صدی میں لکھا گیا۔ اللباب فی معرفۃ الانساب' کتاب الکفایہ اور ترجمہ فارسی احیا العلوم کی تاریخ کتابت آٹھویں صدی سے متعلق ہے۔ ان کے علاوہ اس ذخیرے میں نویں صدی کی کتابت شدہ 23' دسویں صدی کی 44 اور گیارہویں صدی کی 107 کتابیں ہیں اور 67 کے قریب کتابیں ایسی ہیں جو قیاساً انہی صدیوں سے متعلق کی جا سکتی ہیں۔

اس ذخیرے کی چار کتابیں شاہی کتب خانوں سے آئی ہیں۔ اختیارات قطب شاہی کے نسخہ پر محمد قطب شاہ کی تحریر ہے۔ بوستان سعدی کا نسخہ جو سلطان محمد درویش بہادر کے لیے لکھا گیا تھا' اس پر جہانگیر بادشاہ کی تحریر ہے۔ عشق نامہ کا نسخہ واجد علی شاہ کے لیے لکھا گیا۔ اور شہنشاہ نامہ قاسمی و تیمور نامہ ہاتفی پر محمد قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ کی تحریریں موجود ہیں۔

25 نسخے مصنفوں کے خود نگاشتہ ہیں یا مصنفوں کے ہاتھ میں رہ چکے ہیں۔ ان میں سے طرفہ

الفقہاء رکن الدین (عہد فیروز شاہ تغلق) اور شرح مواقف (تحریر 807ھ) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اکثر کتابیں اس شق میں گیارہویں سے تیرہویں صدی تک کے مصنفوں کی ہیں۔

خطاطی کے لحاظ سے 21 کتابیں قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے کتب ذیل سے خط نستعلیق کی ابتدائی تاریخ اور آٹھویں اور نویں صدی میں اس خط کے ارتقاء کی کیفیت پر روشنی پڑتی ہے۔ دیوان عراقی' کلیات شیخ سعدی' جواہر الذات عطار' تعبیر نامہ از حکیم ابوالفضل حبش بن ابراہیم التفلیسی' کلیات انور' شاہنامہ فردوسی۔

کتب ذیل کی کتابت ان مشہور استادوں نے کی ہے' جن کے نام ان کے سامنے درج ہیں۔

خمسہ نظامی بخط مولانا اظہر' دیوان حافظ بخط محمود بن حسن نیشاپوری شاگرد سلطان علی مشہدی (سنہ کتابت 894ھ' تاریخ امیر بزرگ بخط عطاء اللہ بن محمد بن نظام الدین الحسینی البخاری' اخلاق محسنی (جزء) بخط محمد صالح بن محمد علی الکاتب الخاقانی' یوسف زلیخائی جامی بخط محمود بن نظام ہروی (سنہ کتابت 944ھ)' تحفۃ الاحرار جامی و دیوان اہلی شیرازی بخط خاوند صالح بن میرک' کلمات امیر المومنین علی بخط معجز ہروی (سنہ کتابت 1016ھ)' اختیارات قطب شاہی بخط مجد الدین محمد الحسینی الکاشانی (مکتوبہ 1017ھ)' بوستان سعدی بخط علی الحسینی (مکتوبہ 1010ھ)' اجزای قرآن مجید بخط محمد الکاتب الشیرازی (تاریخ کتابت 959ھ)' قرآن مجید بخط محمد الحاج حسن الحاکم یزدی (تاریخ کتابت 835ھ)' حمائل شریف بخط محمد محسن سندھی (تاریخ کتابت 1130ھ' لوائح جامی بخط محمد صادق طباطبا المعروف بہ عزیز خان (29 جلوس محمد شاہی)۔

اس ذخیرہ میں 34 مخطوطات بہاری خط میں ایسے ہیں کہ جن پر تاریخ کتابت درج ہے۔ یہ وہ خط ہے جو مغلوں کے آنے سے پہلے اور ان کے آنے سے کچھ عرصہ بعد تک ہندوستان میں مروج تھا اور جس کو اکبر کا ایک کتابدار "نسخی زبوں" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ شیرانی صاحب نے اپنے خط میں ساٹھ ستر نمونوں کے جمع کرنے کا ذکر کیا مگر ان میں سے متعدد نسخے جن پر تاریخ کتابت درج نہیں ہے' وہ ان 34 میں شامل نہیں۔ شیرانی صاحب سے میں نے کئی بار کہا کہ اپنے اور میرے ذخیرے کو ملا کر وہ اس خط کے متعلق اپنی معلومات کو قلمبند کریں۔ اورینٹل کالج سے علیحدہ ہونے کے وقت وہ اس کے لیے بھی تیار ہو گئے تھے مگر حالات نے مساعدت نہ کی اور یہ قیمتی معلومات مفصل طور پر ضبط نہ ہو سکے۔

شیرانی صاحب کے اس ذخیرہ میں تیرہ کتابیں مصور ہیں اور 29 ایسی ہیں کہ جن پر نفیس منقش سرلوحیں وغیرہ ہیں۔

اردو کی قلمی کتابیں اس ذخیرے میں تعداد کے لحاظ سے کم اور اہمیت کے لحاظ سے اوسط درجہ پر ہیں۔ ان میں گوجری دبستان کی چھ' ہریانوی یا بانگرو یا بانگری دبستان کی 9 اور پنجابی دبستان کی 15 کتابیں شامل ہیں۔ دکنی اور جدید اردو ادب کی گیارہ کتابیں ان کے علاوہ ہیں۔

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا قلمی اور مطبوعہ کتابوں کا یہ قیمتی ذخیرہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں منتقل

ہوا[8]۔ مجھ کو معلوم ہے کہ ان کتابوں کی جدائی شیرانی صاحب کو بہت شاق گذری۔ اگرچہ ان کے ساتھ یہ شرط تھی کہ ان کی کتابوں میں سے جب اور جتنی کتابیں ان کو مطالعہ کے لیے بکار ہوں گی وہ ہمیشہ ان کو لائبریری بہم پہنچائے گی۔ تاہم جو سہولت گھر پر اپنے کتاب خانے میں بیٹھ کر کام کرنے میں ہوتی ہے وہ دوسرے کتاب خانے میں جا کر یا وہاں سے کتابیں منگوا کر کام کرنے میں کب ہوسکتی ہے اور شیرانی صاحب تو علیل بھی تھے اور اس کے علاوہ لاہور ہی چھوڑ بیٹھے تھے۔ بہرحال وطن پہنچتے ہی پھر فراہمی کتب کا سلسلہ جاری ہوا اور ایک فہرست سے جو اب آئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ کل 954 مخطوطات و مطبوعات ان کے ہاں اب بھی موجود ہیں لیکن بعض کتابیں جو یقیناً ان کے پاس تھیں ایسی بھی ہیں جو نہ یونیورسٹی میں پہنچی ہیں اور نہ ان کے آخری ذخیرہ کی فہرست میں شامل ہیں۔ مثلاً انہوں نے وطن واپس جانے کے بعد مجھ کو اطلاع دی کہ عہد محمد تغلق کا تحریر شدہ قرآن مجید کا ایک نسخہ ان کے پاس پہنچا ہے۔ یہ نسخہ فہرست میں نہیں ہے۔ چند قلمی کتابیں مرحوم ڈپٹی مظفر احمد بھی جو قصور میں ڈپٹی کلکٹر انہار تھے وہاں سے دہلی لے گئے تھے۔ ان میں بعض کتابیں بارہویں صدی کے افاغنہ قصور کی مرتب کردہ یا تحریر کردہ تھیں۔ ڈپٹی صاحب کی جملہ کتب کی فہرست کتب خانہ پنجاب یونیورسٹی میں ہے۔ اس کو دیکھ کر قصور والی کتابیں شیرانی صاحب دہلی سے لے آئے۔ یہ پانچ چھ کتابیں بھی فہرست میں شامل نہیں۔ کچھ معلوم نہیں کہ یہ کتابیں کیا ہوئیں۔

کتابوں کے علاوہ شیرانی صاحب کو اسلامیات کے ایسے میوزیم سے بھی بہت دلچسپی تھی جس میں وہ تمام مواد جمع ہو جس سے تاریخ و ادب فارسی اور تہذیب و تمدن اسلامی کو سمجھنے میں مدد ملے۔ لاہور کے میوزیم کو وہ اس بارے میں بہت ناکافی سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اس سے جے پور کے میوزیم میں عتیقیات کا بہتر مجموعہ موجود ہے۔ راجپوتانے اور مالوے کے آثار قدیمہ کی اہمیت کے بھی وہ بے حد معترف تھے اور احباب کی توجہ ان کی طرف منعطف کراتے رہتے تھے۔ چنانچہ ان کے اصرار پر ایک دفعہ کرسمس میں مَیں ان کے ہمراہ ریاست جے پور کے بعض آثار قدیمہ کے مطالعہ کے لیے روانہ ہوا۔ سوائی مادھو پور کے سٹیشن پر اتر کر ہم لوگ رتھ پر رہ پیما ہوئے اور شام کے وقت جبکہ گاؤں کے آس پاس مور اڑ کر قریب کے درختوں پر بسیرا کرنے کے لیے جارہے تھے شیر پور[9] پہنچے۔ ہم نے مندر کے برآمدہ میں رات کاٹی اور صبح کو سامانِ سفر وہیں چھوڑ کر رنتھنبور کی طرف پیدل روانہ ہوئے۔ شیرانی صاحب کا ایک آدمی جے پور سے ایک ''لنگوٹ دار'' اجازت نامہ قلعدار کے نام لایا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ ہولیا۔ کتبے وغیرہ جو راستے کی بعض عمارتوں پر شیرانی صاحب نے کسی پہلے سفر میں دیکھے تھے وہ اب ناپید تھے۔ تاہم رنتھنبور کے تاریخی قلعے کو دیکھنا ہی بجائے خود زحماتِ سفر کا کافی معاوضہ تھا[10]۔

رنتھنبور کو دیکھ کر ہم لوگ اسی راستے سے واپس سوائی مادھو پور اور وہاں سے جے پور پہنچے۔ سوئے اتفاق سے جے پور کا عجائب گھر ان دنوں میں بند تھا۔ وہ تو نہ دیکھا جاسکا مگر وہاں کے انٹیقہ فروشوں کے ہاں خوب خوب چیزیں دیکھنے میں آئیں اور آنبیر کی سیر بھی ہم نے کی جو جے پور سے قریباً پانچ میل شمال کو ہے اور

جو 1728ء تک جے پور کا دارالسلطنت تھا اور جہاں جے پور والوں کا شاندار محل واقع ہے۔

اس سارے سفر میں شیرانی صاحب کی پوری کوشش یہ تھی کہ کوئی قابل دید چیز رہ نہ جائے اور ہر طرح کا آرام و سہولت مجھے حاصل رہے اور یہی کیفیت اس سفر کی تھی جو شیرانی صاحب نے میرے ہمراہ مخطوطات کی تلاش میں ملتان کا کیا۔ یہ سفر مجھ کو ہمیشہ یاد رہے گا' اس لیے کہ اس میں علاوہ اور قیمتی کتابوں کے "میخانہ عبدالنبی" کا وہ نادر نسخہ ملا جس پر میں نے اپنے ایڈیشن کو مبنی کیا۔

شیرانی صاحب کی شاعری کا ذکر میں نے ان سطور کے شروع میں کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ریسرچ کے شوق میں ان کا شعر لکھنے کا شوق ختم ہو گیا۔ اس لیے کہ گو شعر سے ان کو عمر بھر دلچسپی رہی اور ان کا ابتدائی کلام خاصہ صاف اور زوردار ہوتا تھا مگر بعد میں مَیں نے کبھی نہ سنا کہ انہوں نے شعر گوئی کی طرف دوبارہ رجوع کیا۔ مجھ کو معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کا منظوم کلام کس مقدار میں ہے اور ان کا غیر مطبوعہ کلام محفوظ ہے یا نہیں۔

شیرانی غالباً قافلہ کے حضرات کے معتقدات سے متاثر تھے۔ گو مذہب کو قطعاً زیر بحث نہ لاتے تھے۔ بظاہر وہ نماز کو پابندی سے ادا نہ کرتے تھے مگر اس کوتاہی کے باوجود وہ ایک غیور مسلمان تھے اور اکابر اسلام کی عظمت کے معترف اور ان کے کارناموں کے دل سے مداح تھے۔ یہ رنگ ان کی تحریروں میں بھی حسب موقع نمایاں ہے۔ "خزائن الفتوح" کی تلخ تنقید پر ان کو آمادہ کرنے میں تحت الشعوری طور پر شاید اس امر کو بھی دخل تھا کہ مترجم نے علاؤالدین خلجی اور محمود غزنوی کی تنقیص کی جرأت کی تھی اور محمود وہ شخص تھا جس کے روشن کارناموں نے ان کو مسحور کیا ہوا تھا۔ ایک محمود ہی نہیں ان کو تمام وسط ایشیا والوں کے ساتھ کافی عقیدت تھی جس کا مبنی شاید یہ تھا کہ فارسی ادب کے ابتدائی نشوونما کا گہوارہ وہ صحیح طور پر وسط ایشیا کی سرزمین کو سمجھتے تھے نہ کہ ایران کو۔

غیر زبانوں میں سے شیرانی صاحب کو فارسی سے پورا شغف اور اس کے ادب پر عالمانہ عبور حاصل تھا۔ انگلستان میں دس سال تک رہنے کی وجہ سے گمان ہوتا ہے کہ شاید وہ انگریزی بھی خوب جانتے ہوں گے مگر چونکہ ان کی ابتدائی تعلیم انگریزی کی کمزور رہ گئی تھی' شاید کچھ اس وجہ سے مگر زیادہ تر وطنیت کے جذبے سے متاثر ہو کر وہ انگریزی بہت کم بولتے تھے اور گو انگلستان میں انہوں نے جو کچھ لکھا پڑھا' وہ انگریزی میں تھا۔ یہاں واپس آ کر انہوں نے کوئی چیز انگریزی میں شائع نہ کی۔ ان کی اردو دانی کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے۔ عربی سے غالباً ان کی واقفیت جزوی تھی۔ گو وہ عربی کتابوں سے اپنے ڈھب کی چیز نکال لیا کرتے تھے۔ ان کے کتاب خانے میں قرآن مجید کے سوا اور عربی کتابیں بہت کم تھیں۔ ہندی بھی وہ بقدر ضرورت جانتے تھے' جیسا کہ ان کے چند بردے والے مضمون سے ظاہر ہے۔

شیرانی صاحب کا سلوک اپنے شاگردوں سے بہت اچھا تھا۔ ہمیشہ ان کی کوشش رہی کہ طلبہ میں صحیح ذوق پیدا ہو۔ خاص خاص طالب علم جن کی استعداد بہتر تھی' ان پر وہ بہت محنت کرتے تھے اور ان پر بے دریغ اپنا وقت صاف کرتے تھے۔ ان خواص کے لیے کالج ہی میں ان سے پوچھنے گچھنے کی کوئی پابندی نہ تھی۔ وہ

مرحوم کے گھر پر بھی ان سے مستفید ہو سکتے تھے' سفارش وغیرہ سے وہ ان کی مدد کرتے رہتے تھے اور فراغت تحصیل کے بعد بھی یہ نوجوان ان کی ہمدردی اور توجہ کے اس وقت تک مستحق سمجھے جاتے تھے جب تک ان کو فارغ البالی سے وقت بسر کرنے کے لیے مناسب نوکری نہ مل جائے۔

جوانی میں ان کو شکار کا بہت شوق تھا۔ دور دور تک پیدل نکل جاتے تھے اور بارہا احباب کے ساتھ لاہور سے باہر شکار کھیلنے کے لیے جایا کرتے تھے۔ بناس ندی ان کے وطن ٹونک کے جنوب مشرق سے آ کر شہر کے شمال سے بہتی ہوئی پہلے مشرق کو اور پھر جنوب کو مڑ کر دریائے چنبل میں جا گرتی ہے۔ شیرانی صاحب کو اس ندی سے بہت محبت تھی اور وہ اس کے شیریں گوارا پانی اور اس کے کناروں کی خوش فضائی کے بہت قائل تھے۔ چھٹیوں میں جب موقعہ ملتا اس کے کنارے پہنچ کر وہ دونوں شکار کھیلتے اور تبدیل آب وہوا کی خاطر قیام کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فالیز بھی تھے اور گرمیوں میں یہ بھی ان کے لیے کنار بناس کی دلکشی کا ایک سبب تھا۔ اس زمانے میں ان کی صحت بہت اچھی تھی اور وہ انتھک معلوم ہوتے تھے۔

غذا وغیرہ میں اور عام طور وطریق میں سادگی برتتے تھے۔ گھر میں عموماً فرش پر نشست برخاست رکھتے تھے اور فرش پر ہی بیٹھ کر لکھتے پڑھتے تھے۔

شیرانی کا دفتری لباس ہمیشہ انگریزی مگر ترکی ٹوپی کے ساتھ اور گھر پر سادہ کرتا پاجامہ۔ ان کے گھر کی معاشرت سیدھی سادی تھی۔ سال میں ایک آدھ دفعہ خصوصاً آموں کے موسم میں دعوت احباب ہوتی تھی۔ ان کے گھر کے عین سامنے پھل منڈی تھی۔ عمدہ انتخابی آم وہاں سے آتے تھے اور برف میں لگا کر اور غوریوں[11] میں سجا کر وہ احباب کے سامنے رکھتے تھے۔

چھ سات پرانی غوریاں ان کے ذخیرے میں تھیں۔ یہ ایسے موقعوں پر کام دیتی تھیں۔ لاہور بھر میں بلکہ ہندوستان بھر میں یہ کیفیت شاید ہی اور کسی کو میسر آتی ہو۔

شیرانی کا انداز عموماً سنجیدہ اور متین تھا مگر حسب معمول ان کے کلام میں ظرافت کی چاشنی بھی موجود تھی۔ گو ادب کا پہلو وہ کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ ان کی گفتگو کو میں نے کبھی دلچسپی سے خالی نہ پایا۔ غایت درجہ مصروفیت کے اثناء میں بھی جب کبھی وہ آ گئے' میں گھنٹوں ان کے تکلم سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اگرچہ بعض اوقات ان کے آنے کے فوراً بعد موجودہ کام کا خیال ہوتا تھا مگر جب ان سے بات چیت شروع ہو جاتی تو کام گویا سب بھول بھال جاتا تھا۔ میرے دل میں اس زمانے میں اکثر یہ خیال آتا تھا کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد فرصت کا وقت شیرانی صاحب کی صحبت میں خوب کٹے گا کہ وہ ان کی بھی فرصت کا وقت ہو گا مگر یہ ہوس کبھی پوری نہ ہوئی۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا میری پیہم کوشش کے باوجود اقتصادی وجوہات نے شیرانی صاحب کو لاہور میں ٹھہرنے نہ دیا۔

شیرانی بنہایت خوش خلق وضع کے پابند اور بامروت انسان تھے۔ دوستوں سے تو کیا ان کے بچوں

کے ساتھ بھی وہ نہایت اخلاق سے پیش آتے تھے اور ان کو لکھنے پڑھنے کی ترغیب دیتے تھے۔ ان کا دل بڑھاتے تھے اور ان کے ساتھ گپ شپ کر کے بہت خوش ہوتے تھے۔ اپنے ذاتی معاملات کو احباب کے سامنے کم لاتے تھے۔ حالانکہ احباب کے جملہ حالات میں وہ پوری ہمدردی کے ساتھ شریک رہتے تھے۔ ان کی گفتگو ہمیشہ علمی معاملات تک محدود رہتی تھی۔ اپنے نج کے معاملات کو وہ اپنے ہی تک رکھتے تھے اور ان کو حتی الامکان زبان پر نہ لاتے تھے۔ وہ کنبہ پرور آدمی تھے۔ ان کے بعض اعزہ ان کے ہاں تعلیم پانے کے لیے یا اور وجوہات سے سالوں ٹھہرے رہے اور اکثر ان میں سے کوئی نہ کوئی ان کے ہاں موجود رہتا تھا۔

وہ سب سے انکسار کے ساتھ ملتے تھے۔ صد گونہ فضائل کے باوجود خمول کو پسند کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض علمی مجالس میں جب وہ شامل ہوئے اور فوٹو اتروانے کا وقت آیا تو وہ اِدھر اُدھر ہو گئے۔ بڑے آدمیوں سے وہ دور بھاگتے تھے۔ گو متعدد دفعہ ان کے کاغذات توسیع ملازمت وغیرہ کے سلسلے میں سنڈیکیٹ اور سینٹ میں پیش ہوئے مگر حتی الامکان وہ کبھی کسی سے جا کر نہ ملے اور نہ کسی سے کچھ کہا سنا۔ ان کا ذکر سب نے سنا تھا مگر ان مجالس کے اکابر کو تعجب ہوتا ہوگا کہ شیرانی صاحب اور لوگوں کے معمول کے خلاف ان تک نہ پہنچے تھے اور ان اکابر میں سے بعض نے تو شاید ان کی شکل تک بھی نہ دیکھی تھی ؎

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شیرانی صاحب نے ایک ہی نرینہ اولاد پائی یعنی شاعر مشہور داؤد خان صاحب شیرانی' ان کے علاوہ ایک بچی بھی انہوں نے چھوڑی۔

شیرانی صاحب نے جمعہ کے دن 15 فروری 1946ء کو 64 سال 4 ماہ کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا انا ض اللہ علیہ شآبیب غفرانہ!

یاران موافق ہمہ از دست شدند   در دست اجل یگان یگان پشت شدند
بودند تنک شراب در مجلس عمر   یک لحظہ زما پیشترک مست شدند

حواشی:

1- شیرانی صاحب کے بعض خطوں پر جو انہوں نے مجھ کو گرمائی تعطیلات کے دوران میں لکھے تھے "شیرانیوں کی ڈھانی ریاست جودھ پور مارواڑ راج" کا پتہ درج ہوتا تھا۔ عجب نہیں کہ یہی شیرانی صاحب کا آبائی وطن ہو۔

2- شیرانی کے والد صاحب کے متعلق یہ اطلاعات فاضل جلیل القدر مولوی سید علی صاحب ٹونکی حال مقیم لکھنؤ نے از راہِ کرم ہم پہنچائیں۔

3- Luzac

4- مجموعہ نغز دیباچہ میں لہ پر قاسم کے دیوان کا ذکر ہے۔ یہ دیوان طبع ہو چکا ہے اور اس کا ایک نسخہ اسلامیہ کالج پشاور میں ہے۔

دیکھیں فہرست مکتبہ 350 'نمبر 1862۔ قاسم نے شاہ عبدالعزیز کی 'اسرار الشہادۃ'' کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا۔ اس کا ایک نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ اس کا ذکر ''مجموعہ نغز'' میں نہیں آیا۔

5- ان میں پروفیسر سراج الدین آذر کا شمار بھی تھا جنہوں نے ایک گراں قدر ذخیرہ ملفوظات کا جمع کیا۔

6- ان چیزوں کے علاوہ شیرانی صاحب کے پاس کچھ اور نوادر بھی تھے۔ مثلاً تصاویر' وصلیاں' بدھ کے مجسمے' ایک کاشی کا رائنٹ چینی کے ایک دو پیالے' وغیرہ وغیرہ' یہ چیزیں پہلے تو لائبریری میں امانتاً رکھی رہیں پھر ان کے ایماء کے مطابق 7 فروری 1945ء کو پروفیسر محمد اقبال صاحب کے حوالے ہوئیں۔

7- بظاہر محمد بن الحاج حسن۔

8- یہ کتابیں یونیورسٹی لائبریری نے 1945ء میں خریدی تھیں اور اس مطلب کے لیے ایک گراں قدر گرانٹ پنجاب گورنمنٹ نے یونیورسٹی کو عطا کی تھی۔ ان کتابوں کے علاوہ 199 قلمی کتابیں اور 478 مطبوعہ کتابیں جو پہلے شیرانی صاحب نے اپنے ہی قبضے میں رکھ کر لاہور چھوڑتے وقت امانتاً یونیورسٹی لائبریری کے سپرد کر دی تھیں۔ اواخر 1945ء میں انہوں نے بلا معاوضہ یونیورسٹی لائبریری ہی کو عنایت کر دیں۔ شیرانی صاحب کے پاس ایک مجموعہ قدیم دستاویزات کا بھی تھا جس میں دستانے' خط نامے' اقرار نامے' استشہادات وغیرہا شامل تھے۔ ان کی تعداد 89 تھی اور ان میں کچھ دسویں صدی کے اور زیادہ تر گیارہویں سے تیرہویں صدی ہجری کے کاغذ تھے۔ ان کے علاوہ ان کے پاس 180 مکاتیب تھے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ اور دیگر روسائے پنجاب نے پولیٹیکل ایجنٹ لدھیانہ کے نام لکھے تھے۔ ان کی تعداد 181 تھی۔ یہ دونوں مجموعہ دستاویزات اور مکاتیب ابتدائے 1946ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ان سے خرید لیے۔

9- اس نواح میں ایک مسجد دیکھنے میں آئی جو عہد اکبری کی یادگار تھی اور اس عہد کا کتبہ اس پر تھا لیکن بظاہر نمازیوں سے خالی تھی۔ وہاں کا کنواں البتہ بستی کے مسلمانوں کو پانی کی بہم رسانی کے لیے کام دے رہا تھا۔ لوگ دین سے بے خبر معلوم ہوتے تھے۔ کوئی متمول اور خوش حال مسلمان بستی میں نہ تھا۔ گذریے وغیرہ تھے جو بھیڑ بکری پال کر اپنا پیٹ بھر رہے تھے۔ جس مندر میں ہم مقیم تھے وہیں ایک مسلمان محصل ریاست کی طرف سے آیا ہوا تھا اور ان گذریوں سے چرائی کا ٹیکس وصول کر رہا تھا۔ دریافت کرنے پر ان لوگوں نے بتایا کہ عرصہ ہوا مسجد میں ایک امام تھا جو کسمپرسی کی وجہ سے اب کہیں اور چلا گیا ہے۔ ان جہلاء کے اندازے میں وہ عالم آدمی تھا کیونکہ اس کے پاس ایک آدھ چھپی ہوئی کتاب خطبوں کی موجود تھی۔ انہی بستیوں کے ایک دو آدمی رتھنبور کے راستے میں بھی ملے جو کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ ان کا بیان تھا کہ ان جنگلوں میں شیر بھی کبھی کبھی مل جاتے ہیں اس لیے مسلح ہو کر چلنا پھرنا ضروری ہے۔

10- رتھنبور کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو تزک جہانگیری' مطبع علی گڑھ 1864ء ص 256

11- یہ غوریاں وہ لاہور سے جاتے وقت پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں امانتاً رکھ گئے تھے مگر چونکہ ان کی صحت کی حالت خراب تھی لائبریری والوں نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے ان کو یاد دلایا ہوگا کہ وہ غوریوں کے متعلق کچھ فیصلہ کریں۔ چنانچہ 11 مارچ 1945ء کے ایک خط میں انہوں نے شاکیانہ مجھ کو لکھا: ''غوریاں ساتھ لانے کی زحمت سے بچنے کے لیے میں لاہور چھوڑ آیا تھا مگر آپ کے لائبریرین نے تقاضوں سے میرا ناک میں دم کر دیا۔ مجبوراً مجھے جو قیمت لوگوں نے دی وہ منظور کرنی پڑی یعنی 600 روپے۔ وہی لوگ اپنے خرچ پر بے چوں لائے اور ایک ہفتے کے اندر اندر گیارہ سو میں بیچ دیں''۔

(در: اورینٹل کالج میگزین' بابت فروری 1947ء ص 17-34)

شیخ عبدالعزیز

مرحوم پروفیسر شیرانی کی یاد میں

یہ چند سطور شیرانی مرحوم کی یاد میں لکھ رہا ہوں۔ ممکن ہے دنیا اسے رسمی اظہارِ غم خیال کرے یا یہ سمجھے کہ شیرانی کی تعریف و توصیف محض رسمی اور رواجی ہے مگر میں کیسے یقین دلاؤں کہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ میرے دل کی آواز ہے جو تعریف میرے قلم سے اب نکلے گی۔ مرحوم شیرانی نہ صرف اس کے مستحق تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تعریف ان کے مقام بلند سے کہیں فروتر ہوگی۔ وہ تو ان لوگوں میں سے تھے جن کے متعلق حافظ فرما چکے ہیں ۔

نظیر خویش نہ بگذاشتند و بگذشتند

شیرانی مرحوم سے میری پہلی ملاقات انگلستان میں ہوئی۔ یہ شاید 1905ء کا واقعہ ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب علامہ اقبال، شیخ سر عبدالقادر، عبداللہ المامون سہروردی جیسے اکابر انگلستان میں موجود تھے۔ شیرانی بھی اس جماعت کے ایک فرد تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں ادب و شعر کی خوب خوب مجلسیں ہوا کرتی تھیں۔ علمی چرچے، ادبی ہنگامے، وہ ناقابل فراموش صحبتیں اب تک یاد ہیں۔ ان میں مرحوم بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ شعر و سخن سے اس دور میں انہیں خاص دلچسپی تھی۔ وہ نظمیں اور غزلیں لکھا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض ''مخزن'' میں چھپ چکی ہیں۔ ان نظموں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر مرحوم اتفاق سے اس میدان کی طرف نکل جاتے تو یقیناً شعرائے اردو کی پہلی صف میں ممتاز کرسی پر رونق افروز ہوتے۔

انگلستان جانے کی غرض و غایت بیرسٹری کا ڈپلومہ حاصل کرنا تھا۔ انگریزی کی تعلیم نہ مکمل تھی نہ باقاعدہ، مگر جودتِ طبع کا یہ عالم تھا کہ اپنی بلند ہمتی کے سہارے انگلستان پہنچے اور حصولِ مقصد کے لیے کوشش میں مصروف ہو گئے مگر قدرت کو ان کا بیرسٹر بننا منظور نہ تھا۔ مشیت یہ تھی کہ وہ بیرسٹر بننے کی بجائے فضیلت کی مسند پر بیٹھیں اور بزرگوں کی اس میراث کو (جو لاوارث جائداد کی طرح لٹ رہی ہے اور برباد ہو رہی ہے) سنبھالیں اور آنے والی نسلوں کو اس متاعِ گراں مایہ کی قدر و قیمت کا احساس دلائیں۔ شیرانی مرحوم اگر بیرسٹر ہو جاتے تو ممکن ہے مالی لحاظ سے اچھے رہتے مگر سچ تو یہ ہے کہ بیرسٹر دنیا میں بیشمار اور لاتعداد ہیں مگر شیرانی بہت کم ہیں۔ علمی فضیلت اور بوریا نشینی اکثر ساتھ ساتھ چلتی دیکھی گئی ہے ۔

درویشم و گدا و برابر نمے نہم
پشمیں کلاہ خویش بصد تاج خسروی

قصہ مختصر یہ ہے کہ شیرانی مرحوم کو علمی تحقیق کا شوق کچھ اس طرح دامنگیر ہوا کہ سب قصے چھوڑ چھاڑ اسی کے ہو گئے۔ بعض اسباب ایسے پیدا ہوئے کہ مرحوم کو نوادر کی تجارت کی طرف توجہ کرنا پڑی۔ اس کی وجہ سے انہیں پرانے مخطوطات کے سب ذخیروں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ضمنی طور پر وہ آرنلڈ آنجہانی کے لیے ترجمے کا کام بھی کیا کرتے تھے مگر ان کا زیادہ وقت آثار عتیقہ کی چھان پھٹک میں گزرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پرانی چیزوں کے بے نظیر نقاد بن گئے اور پرانے نوادر کو پرکھنے کا انہیں وہ ملکہ حاصل ہوا جس کی مثال ہندوستان بھر میں موجود نہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہنا مبالغے میں داخل نہ ہوگا کہ ان کی موت کے ساتھ فن تحقیق کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے۔

بطور نقاد اور محقق کے مرحوم کی کیا حیثیت تھی؟ اس کی تفصیل بیان کرنا اس مختصر مضمون میں میرے لیے مشکل ہوگا۔ اس موقع پر میں چند موٹی موٹی باتیں عرض کر سکوں گا۔ آپ کے کمالات تو بے شمار تھے مگر ایک بات جس میں ان کی نظیر مشکل سے ملے گی' یہ تھی کہ آپ ہر نوشتہ' ہر کاغذ اور ہر رسم الخط کو دیکھ کر یہ بتا دیا کرتے تھے کہ اس کا زمانہ کیا ہے اور یہ کس ملک یا سلطنت سے تعلق رکھتا ہے۔ خطاطی کے دقائق پر آپ کو اس درجہ عبور حاصل تھا کہ آپ کاغذ' روشنائی' قلم' تذہیب اور آرائش کی خصوصیات سے اس کے زمانے بلکہ اس کے لکھنے والے کا صحیح پتہ لگا لیتے تھے۔ جب کبھی اس موضوع پر گفتگو چھڑ جاتی تو وہ نہایت ہی دلنشین پیرائے میں ایک عامی آدمی کو بھی اس فن کی خشک باتیں سمجھا دیتے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کے رموز و اوقاف اور دوسری علامتوں کے بارے میں آپ کا علم بے حد وسیع تھا۔ آپ انہیں علامتوں کو دیکھ کر کسی نسخہ قرآن کی کتابت کا صحیح زمانہ متعین کر سکتے تھے۔

شیرانی مرحوم فطرتاً تحقیق کے دلدادہ تھے۔ جو مسئلہ ان کے سامنے ہوتا' اس کے معاملے میں محض حافظے یا علم پر بھروسہ نہ کرتے تھے بلکہ اس کی خوب تحقیق اور چھان پھٹک کرتے تھے۔ انگلستان سے تشریف لانے کے بعد مجھے ان کے ساتھ ہی اسلامیہ کالج میں کافی عرصے تک کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ پھر وہ یونیورسٹی اورینٹل کالج میں چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر بھی علمی اور ذاتی تعلقات کا سلسلہ بدستور قائم رہا۔ جب میں نے مغلیہ تاریخ میں ریسرچ شروع کی تو مجھے کبھی کبھی فارسی محاورات و الفاظ کو حل کرانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس کے لیے میں اکثر شیرانی صاحب اور کبھی کبھی مولانا محمد عمر خاں کی طرف رجوع کرتا۔ اب مولانا عمر خاں تو جھٹ پٹ معنی بتا دیتے مگر شیرانی مرحوم الفاظ کو اپنے پاس نوٹ کر لیتے اور مستند لغات اور فرہنگوں کی طویل ورق گردانی کے بعد کئی کئی دن کے بعد جواب دیتے۔ مولانا عمر پرانی طرز کے جید عالم تھے اور پرانے علوم میں اچھی خاصی دسترس رکھتے تھے مگر تحقیق کی لذت سے نا آشنا تھے۔ ظاہر بین لوگ تو شاید مولانا عمر کو ہی فضیلت میں ترجیح دیتے ہوں گے مگر سچ یہ ہے کہ مولانا عمر خاں کی رائے قطعی اور فیصلہ کن نہ ہوتی تھی۔ بخلاف اس کے

شیرانی کی بات قول فیصل اور حرف آخر کا درجہ رکھتی تھی۔

میں نے بہت کوشش کی کہ مرحوم کو انگریزی زبان اختیار کرنے پر آمادہ کروں اور بظاہر یہ بات کچھ مشکل بھی نہ تھی مگر ایک طرف تو ان کا معیار تحریر بہت بلند تھا اور دوسری طرف وہ اپنی انگریزی دانی کے بارے میں کسی حد تک احساس کمتری کے مغالطے میں گرفتار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری کوششیں بارآور نہ ہوسکیں۔ انگریزی میں نہ لکھنے سے ایک نقصان یہ ہوا کہ ان کے کارناموں سے مغربی دنیا آگاہ نہ ہو سکی، ورنہ وہ بعض معاملات میں فضلائے عالم کی قطار میں بلند جگہ پاتے اور دنیا کو ان کے صحیح مقام سے واقفیت ہو جاتی۔ اس سے نہ صرف ان کی شہرت کو نقصان پہنچا بلکہ مشرق اور وہ نظریات اور علوم بھی نقصان میں رہے، جن کے وہ نمائندہ تھے۔

اگر شیرانی انگریزی میں لکھنے پر رضامند ہو جاتے تو ان کے لیے میرا پروگرام یہ تھا کہ وہ فردوسی کے متعلق اپنی تحقیق کو انگریزی میں شائع کرنے کے علاوہ "شاہنامہ" کا ایک صحیح اور عمدہ ایڈیشن تیار کریں جو ہمارے زمانے کے بہترین ایڈیشنوں کے دوش بدوش جگہ لے سکے۔ انہیں شاہنامے کے جز وکل کے ساتھ گہری واقفیت تھی۔ اس مضمون پر ان کی تحقیق کے نتائج مشرق کے علاوہ مغرب میں بھی ہنگامہ پیدا کر دیتے تھے۔ شاہنامے کے مجوزہ ایڈیشن میں ضمیمے کے طور پر پرانے خوش نویسوں کی کتابت، نیلے اور سنہرے عنوانوں اور حاشیہ اور جدول کے بہترین نمونوں کے عمدہ قسم کے فوٹو شامل کیے جاتے۔ میرا مطمح نظر کچھ کچھ شاہنامے کے اس فرانسیسی ایڈیشن کے متوازی تھا جو 1878ء میں Le Livre des Rois کے نام سے پیرس میں شائع ہوا۔

شیرانی صاحب کے کمالات کا میں حد درجہ مداح تھا۔ بعض اوقات شکایتاً میں ان سے کہا کرتا "بھئی! تم نے نوادر کی تنقید کے متعلق اپنی معلومات کو سائنٹفک طور پر قلمبند نہیں کیا۔ مجھے ڈر ہے کہ تم اس فن کو اپنے ساتھ لے جاؤ گے اور آنے والے اس قیمتی سرمائے سے محروم رہیں گے۔" اس کے جواب میں وہ فرمایا کرتے۔ "میرا فلاں مضمون یا فلاں رسالہ دیکھو۔" مگر سچ یہ ہے کہ میرا اندیشہ درست تھا اور درست نکلا۔ مرحوم اپنے فن کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اتنا غنیمت ہے کہ اورینٹل کالج کے بعض فاضل اساتذہ نے ان کی صحبتوں سے بہت کچھ استفادہ کیا۔ اب ان کا وجود علمی دنیا کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ بس یہی لوگ مرحوم کی علمی اور روحانی یادگاریں ہیں۔ خدا کرے کہ یہ لوگ مرحوم کے کام کو جاری رکھ سکیں۔

شیرانی اگرچہ مالی لحاظ سے کوئی امیر آدمی نہ تھے مگر شوق بھی عجب چیز ہے کہ بعض اوقات انسان کو بڑی بڑی قربانیوں پر آمادہ کر دیتا ہے۔ ان کی آمدنی کچھ زیادہ نہ تھی مگر اسی آمدنی سے انہوں نے پرانے سکوں، قلمی کتابوں اور دوسرے مسودات کا ایک عظیم الشان اور قیمتی ذخیرہ جمع کیا۔ بظاہر ایک متوسط الحال شخص کی اس حیرت انگیز کوشش کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے مگر ان کے علمی ذوق وشوق کا جن لوگوں کو اندازہ ہے، انہیں اس سے مطلق حیرت نہیں ہوتی۔ ان کا کتب خانہ نوادر کے اعتبار سے دنیا کے بہترین کتب خانوں میں شمار ہوسکتا ہے۔ پنجاب کی خوش قسمتی ہے کہ اب یہ عدیم المثال ذخیرہ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ یونیورسٹی نے

یہ قیمتی خزانہ صرف سترہ (17) ہزار روپے میں خریدا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ ان عجائبات کی نصف قیمت بھی نہیں۔ باایں ہمہ اسے غنیمت ہی خیال کرنا چاہیے کیونکہ ملک میں اب جو علمی کساد بازاری ہے' اس کے پیش نظر اس جنس کے گاہک کچھ زیادہ نہیں اور اگر ہوتے بھی تو شیرانی کہاں تجارتی اور کاروباری طبیعت کے آدمی تھے کہ نرخ بالاکن کے اصول پر پھر پھرا کر انہیں فروخت کرتے۔ اس لحاظ سے جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔

گذشتہ پچیس سال کے عرصے میں مجھے کئی یورپ سے ہو آئے ہندوستانیوں سے ملنے کا موقع ملا ہے۔ ان میں ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگ شامل ہیں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ جو طبعی انکسار میں نے مرحوم شیرانی کی طبیعت میں پایا' کسی اور کے ہاں دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہی ایک شخص تھا جو آٹھ نو سال تک یورپ کی زندگی کے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد اپنی زندگی کے کئی سال ایک ایسے کمرے میں گزار دیتا ہے جس میں چٹائی پر ایک چاندنی اور گاؤ تکیے کے سوا کوئی فرنیچر نہ تھا۔ اسی سادہ فرش پر بیٹھ کر اس شخص نے وہ عالمانہ اور فاضلانہ مقالے لکھے کہ بڑے بڑے فضلا کے قلم توڑ دیے۔

اس سادگی کے باوجود مہمانداری میں نہایت تکلف سے کام لیتے اور اس بارے میں ان کے خیالات بہت بلند تھے۔ چونکہ میرے ساتھ ان کے مراسم نہایت گہرے تھے۔ اس بنا پر اگر مجھ سے کوئی فروگذاشت ہو جاتی تو ڈانٹ دیا کرتے کہ تم آئین و تواضع سے بالکل ناواقف ہو۔ اس ضمن میں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے۔ ایک دفعہ یہ ڈھاکہ کو جا رہے تھے۔ راستہ میں کلکتہ میں قیام کا اتفاق ہوا۔ ایک صاحب جن کو ان سے غائبانہ تعارف تھا اور ان کے بڑے مداح بھی تھے' ان سے بہت تپاک سے ملے اور کھانے کے لیے کہا۔ ان کو ضرورت تو تھی ہی۔ انہوں نے دعوت قبول کر لی۔ وہ دوست اپنی قیام گاہ پر کھانے کے انتظام کے واسطے گئے مگر کچھ سرانجام نہ ہو سکا۔ وہاں سے ناکام پھر کر ایک اور جگہ کوشش کی مگر وہ بھی کچھ بار آور نہ ہوئی۔ پھر خدا جانے کس طرح گزر ہوئی۔

کچھ عرصہ کے بعد یہی صاحب ایک تاریخی اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لائے۔ میں ان دنوں لاہور میں مقیم نہیں تھا۔ اس وجہ سے اس جلسے کے دنوں میں مَیں نے بھی لاہور آ کر مرحوم کے ہاں ہی بسیرا کیا۔ مہمانوں کے لیے انہوں نے اپنے مکان کے قریب ہی ایک اور مکان چند روز کے لیے کرایہ پر لے لیا' جہاں ہماری رہائش کا نہایت پُر تکلف سامان تھا۔ ایک ایک آدمی کے پاس ایک ایک کمرہ تھا۔ صبح کے وقت جب کھانا کھانے کے لیے ہم سب مہمان ان کے دولت کدہ پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پہلے سالن آ رہا ہے' پھر پلاؤ ہے اور پھر تلی ہوئی مچھلی وغیرہ اور سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ سالن کے ساتھ کھانے کے لیے روٹی یا نان نہیں بلکہ خوب تلے ہوئے پراٹھوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ اس تکلف کا ہم بڑے حوصلے سے مقابلہ کر رہے تھے۔ جب پراٹھے نازل ہونے شروع ہوئے تو ہمارے بھی چھکے چھوٹ گئے۔ یہ بات میرے جی میں ہی رہی کہ آخر ایسے مرغن کھانوں کے ساتھ پراٹھوں کی کیا ضرورت تھی۔ شام کو خلوت ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا

"بھئ یہ گھی کہیں سے مال یغما میں ہاتھ لگا ہے۔ بہشت میں تو دودھ کی نہریں بہیں گی۔ آپ نے گھی کی نہریں بہادیں۔" اس کے جواب میں متذکرہ بالا قصہ سنایا اور کہا کہ ان صاحب کو ذرا مہمان نوازی کا سبق دینا مقصود تھا جس سے میں بہت محظوظ ہوا۔

قیام انگلستان کے ایک تجربے کی بنا پر فرمایا کرتے تھے کہ "میں کبھی حادثے کی موت نہیں مروں گا۔ فرماتے تھے۔ لندن کے ایک سٹیشن پر سوار ہونے کے لیے آیا۔ وقت تھوڑا تھا۔ جس کمپارٹمنٹ میں مَیں نے سوار ہونے کی کوشش کی وہ مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس گھبراہٹ کے عالم میں مَیں گاڑی سے اتر پڑا اور گاڑی روانہ ہوگی۔ دوسرے دن اخبار سے معلوم ہوا کہ وہ گاڑی پٹڑی سے اتر گئی تھی اور کئی جانوں کا نقصان ہوا تھا۔"

شیرانی کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی' وہ حادثے کا شکار نہ ہوئے بلکہ طبعی موت مرے مگر ہاں ہم ماتم کرنے والوں کے لیے ان کی موت حادثے سے کم نہیں۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ مَوتُ العَالِمِ مَوتُ العَالَم۔ اس حادثے پر ساری علمی دنیا کو ماتم کرنا چاہیے۔ باقی رہا میں' سو میں کیا عرض کروں۔ دعا ہے کہ خدائے تعالیٰ مرحوم کو غریق رحمت فرمائیں۔

(در: اورینٹل کالج میگزین' فروری 1947ء' ص 9-16)

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

پروفیسر شیرانی کا علمی اور تحقیقی کام

میں اس مضمون میں علامہ محمود خاں شیرانی کے ذاتی حالات اور اوصاف سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ یہ بحث اتنی طویل ہو جائے گی کہ یہ مختصر مقالہ اس کا متحمل نہ ہو سکے گا' کچھ یہ بھی اندیشہ ہے کہ کہیں مناقب شیرانی کی داستان میری ہی آپ بیتی بن کر نہ رہ جائے' اس لیے ان کے علمی کام کی تفصیل تک اپنے آپ کو محدود رکھوں گا۔

استاذ مرحوم کا انتقال علمی حادثہ تو ہی ہے' میرے لیے ذاتی حادثہ بھی ہے۔ کل من علیھا فان ویبقیٰ و جا ربک ذو الجلال و الاکرام. انسان مادہ پرست ہو کر جذبات کی دنیا سے منقطع ہونے کی لاکھ کوشش کرے' اس کی زندگی میں پھر بھی کچھ لمحات ضرور ایسے آتے ہیں' جن میں وہ دنیا کی بے ثباتی کا قائل ہو کر زندگی کے اس نظریے کو ماننے لگتا ہے جو بڑے بڑے صوفیوں' حکیموں اور شاعروں نے بار بار پیش کیا' دیکھتے دیکھتے ہمارے عزیز ترین احباب ہم سے رخصت ہو جاتے ہیں' مگر ہم کچھ نہیں کر سکتے' قدرت کا یہ عمل ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ اسی عالم گیر قانون کے ماتحت دنیا کے بڑے بڑے نبی' بڑے بڑے فاتح' عالی قدر مصنف' عالم اور حکیم چشم زدن میں اس خطہ خاک کو خیر باد کہہ گئے اور ہم سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ ہم اس آمد و رفت کا سبب ہی سمجھ سکتے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے یہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

پروفیسر شیرانی 1922ء میں لاہور میں وارد ہوئے۔ سر شیخ عبدالقادر سے دیرینہ نیازمندی تھی' کیوں کہ مرحوم ''مخزن'' کے پرانے مضمون نگاروں میں سے تھے۔ شیخ صاحب کی وساطت سے اسلامیہ کالج لاہور کے لیکچرر بنائے گئے۔ شیرانی صاحب نے اسلامیہ کالج کی ملازمت کے دوران میں اپنے رفقاء میں تحقیقی کام کا خاصا ذوق پیدا کیا۔ مسٹر عبداللہ یوسف علی کالج کے پرنسپل تھے۔ انہیں بھی تصنیف و تالیف کا بڑا شوق تھا۔ شیرانی صاحب کے زیر اثر اسلامیہ کالج میں کام کرنے والوں کی جماعت بھی تیار ہو گئی۔ اس فضا میں شیرانی صاحب کی تحقیقی صلاحیتوں کو ظہور میں آنے کا بڑا موقع ملا۔ ادھر خوش قسمتی سے پنجاب یونی ورسٹی

اورینٹل کالج میں پروفیسر محمد شفیع اور پروفیسر محمد اقبال جیسے فضلا اور محقق موجود تھے' جن کی وجہ سے لاہور میں علمی تحقیق کی تحریک کو بڑی ترقی ہوئی۔ پروفیسر شیرانی کا ورود لاہور جہاں اس علمی چرچے کے حق میں اچھا ثابت ہوا' وہاں یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ لاہور میں آنے کے بعد خود شیرانی صاحب کو بھی قابلیتوں کے اظہار کا عمدہ موقع اور میدان میسر آیا۔ لاہور کی زندگی میں شیرانی صاحب سب سے زیادہ پروفیسر محمد شفیع صاحب کی ناقدانہ قابلیتوں سے متاثر ہوئے۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ پروفیسر شیرانی اپنے ہر علمی مسئلے کو پہلے پروفیسر محمد شفیع صاحب کے سامنے پیش کیا کرتے تھے اور عام طور پر یہ ہوتا تھا کہ شفیع صاحب جب تک مطمئن یا قائل نہ ہو جاتے' شیرانی اپنے خیال کو دنیا کے سامنے نہ رکھتے۔ شفیع صاحب' مرحوم علامہ شیرانی کے بے حد مداح اور قدر دان تھے۔ جہاں تک ان سے ہو سکا' انہوں نے شیرانی صاحب کو فارغ البال رکھنے کی پوری کوشش کی' تاکہ وہ دلجمعی کے ساتھ علمی تحقیق میں مصروف رہیں۔

علمی لحاظ سے علامہ شیرانی مختلف الحیثیات بزرگ تھے اور سچ یہ ہے کہ وہ ہر حیثیت سے یگانہ روزگار تھے۔ مدرس' شاعر' ادیب' عروضی' ماہر آثار عتیقہ' محقق' نقاد' مورخ۔ ہر لحاظ سے ان کا رتبہ بلند نظر آتا ہے۔ بہ طور مدرس' ان کی بعض خصوصیات ایسی تھیں' جو فی زمانا بہت کم نظر آتی ہیں۔ دراصل وہ قدیم تدریسی طریقے کے پابند تھے۔ پڑھاتے کم تھے' مگر ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جتنا پڑھایا جائے اچھی طرح پڑھایا جائے۔ 25-1924ء میں مَیں ایم اے فارسی میں ان کا شاگرد تھا۔ اس زمانے میں انوری کے قصائد نصاب میں شامل تھے۔ جس روز میں پہلے پہل ان کے درس میں شامل ہوا' اس دن پروفیسر صاحب نے وہ قصیدہ شروع کرایا تھا جس کا مطلع یہ ہے ؂

اگر محول حال جہانیاں نہ قضا ست
چرا مجاری احوال بر خلاف رضا ست

پروفیسر صاحب پہلے شعر کے مشکل الفاظ کا ترجمہ اور ان کی تشریح کرتے تھے' پھر سارے شعر کا لفظی ترجمہ کرتے' پھر تشریح کرتے اور مفہوم واضح کرتے۔ اس کے بعد فارسی یا اردو کا کوئی شعر ہم مضمون سناتے تاکہ مطلب واضح تر ہو جائے۔ قصائد میں عام طور پر تاریخی اشارات کی تفصیل اس درجہ سیر حاصل ہوا کرتی تھی کہ طالب علم کو نہ صرف اس قصیدے کے تاریخی متعلقات کا علم ہو جاتا بلکہ اس کی عام تاریخی معلومات میں بڑا اضافہ ہوتا۔

1938ء میں جب مجھے منشی فاضل کلاس کو پڑھانے کا پہلی مرتبہ موقع ملا تو میں نے ان سے نظیری کی غزلیات سبقاً سبقاً پڑھیں اور سچ یہ ہے کہ مجھ پر پہلی مرتبہ نظیری کی عظمت اور شہرت کے وہ اسباب منکشف ہوئے' جن کی بنا پر مغلیہ عہد کے اکثر شعرا اس کے کمال کے اعتراف پر مجبور ہوئے۔ مجھے اپنی طالب علمی کے زمانے میں اکثر یہ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ میرے ہم جماعت پروفیسر شیرانی کے علم و فضل سے پورا پورا فائدہ نہ

اٹھاتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ پروفیسر شیرانی قدیم طریقے کے مطابق پڑھایا کرتے تھے اور یہاں ہمارے کالجوں میں تعلیم کی حالت یہ ہے کہ بڑے بڑے تعلیمی تجربوں کے باوجود طالب علم فارسی کا تو کیا مذکور ان فنون کے مبادی سے بھی واقف نہیں ہوتے جن کے لیے ٹائم ٹیبل کا بیش تر حصہ وقف ہوتا ہے۔ رہی فارسی عربی سو یہ تو ہمارے کالجوں میں ادنا مضامین سمجھے جاتے ہیں۔ جس دن سے یہ مضامین حقیر ہوئے اسی دن سے فارسی کے اچھے استاد ناپید ہو گئے۔اس پر امتحان کے طریقے نے اور مصیبت پیدا کر رکھی ہے۔ نتیجہ یہ کہ علم کے نام سے جہالت پھیلائی جا رہی ہے۔ان حالات میں فارسی عربی کے لائق مدرسوں کی کمی کا شکوہ بے جا ہے ۔

در میانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

نظیری کی تدریس کے بارے میں شیرانی صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ پہلے شعر کی تشریح کرتے تھے پھر کہا کرتے: ''اس شعر کو عرفی' فیضی' غالب' کلیم' صائب' حافظ' فغانی کے فلاں فلاں اشعار کے ساتھ رکھ کر دیکھو'اس کے بعد ان اشعار کا باہمی مقابلہ کیا کرتے اور ہر ایک کے حسن و قبح سے بحث ہوتی۔ عام طور پر ان کا معمول یہ تھا کہ وہ ہر شعر میں سے اس ترکیب یا لفظ کو منتخب کر لیا کرتے تھے جس پر شعر کا حسن قائم ہوتا تھا۔اس سلسلے میں یہ سمجھانے کی کوشش کیا کرتے تھے کہ شعر میں ایک عمدہ خیال کی تلاش ایک ضروری چیز ہے' مگر حسین لفظ کے بغیر شعر بلندی سے گر کر معمولی نثر سے بھی فروتر ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات شعر کی تشریح کے دوران میں بعض الفاظ کی ناموزونیت کی طرف اشارہ کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے کہ اگر شاعر اس کی جگہ فلاں لفظ لاتا تو برمحل اور مناسب ہوتا۔

نظیری کی غزلیات ایک عرصے سے ایم اے کے نصاب میں شامل ہیں۔ بدقسمتی سے اس کا کوئی صحیح نسخہ آج تک شائع نہیں ہوا۔ مطبع نول کشور کا فارسی ادب پر بڑا احسان ہے کہ اس کے ذریعے ہمارے بے شمار نوادر ضائع ہونے سے بچ گئے ہیں' مگر افسوس ہے کہ اس مطبع کی مطبوعات میں متن کی صحت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ چناں چہ غزلیات نظیری میں قدم قدم پر بے شمار فاحش غلطیاں نظر آتی ہیں اور نصاب کی کتابوں کی حالت تو اس سے بھی بری ہے۔ ناشرین کتب ان کے ارزاں سے ارزاں ایڈیشن نکالتے ہیں' ہر بار متن پہلے سے زیادہ غلط ہوتا جاتا ہے۔

پروفیسر شیرانی نے سب سے پہلے غزلیات نظیری کا متن درست کیا۔ بدقسمتی سے نظیری کے قلمی نسخے بہ کثرت نہیں ملتے۔ حالاں کہ نظیری کا کلام آخری مغلیہ عہد میں بے حد مقبول رہا۔ لوگوں نے اس کی غزلیات کا تتبع کیا۔ بہت سے شاعروں (مثلاً فاخر مکیں اور مصحفی) نے اس کے پورے دیوان کا جواب لکھا۔ غالب نے اپنے خطوط میں ''بو علی سینا کی حکمت'' اور ''نظیری کے اشعار'' کا ایک ساتھ تذکرہ کیا ہے با ایں ہمہ نظیری کے قلمی نسخے بہت کم ہیں۔ جو ہیں وہ پرانے نہیں اور کسی شرح کا تو سرے سے پتا ہی نہیں (حالاں کہ عرفی' ظہوری'

ناصر علی، جلال، اسیر کی شرحیں کثرت سے موجود ہیں)۔ حسن اتفاق سے شیرانی صاحب کے کتب خانے میں نظیری کا ایک ناقص نسخہ محفوظ ہے جو معاصر معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک پرانی بیاض میں غزلیاتِ نظیری کا ایک جزو موجود ہے۔ ان سے شیرانی صاحب نے موجودہ نسخوں کا مقابلہ کیا۔ پھر مستند فارسی لغات میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر نظیری کے وہ اشعار نکالے جو لغت نگاروں نے الفاظ کی سند کے طور پر لکھے ہیں۔ یہ کام معمولی نہ تھا مگر پروفیسر شیرانی اس قسم کی جاں کاہی اور محنت کے عادی تھے۔ انہوں نے محض تدریس کی غرض سے ایک ایسا نسخہ تیار کیا جسے ہر لحاظ سے صحیح کہا جا سکتا ہے (یہ نسخہ بعض اور درسی کتابوں کے صحیح شدہ نسخوں کے ساتھ ان کے کتب خانے میں موجود ہے)۔

طوالت کے خوف کے باوجود میں اس موقع پر چند مثالیں شیرانی صاحب کی تصحیح کی پیش کرتا ہوں جن سے یہ معلوم ہوگا کہ غزلیاتِ نظیری کی تشریح و تفہیم کے لیے ان کی تحقیق و جستجو نے کیا عمدہ نتائج پیدا کیے۔ میں مبارک علی ایڈیشن سے چند اشعار لکھ کر وہ الفاظ بھی ساتھ لکھ دیتا ہوں جو شیرانی صاحب کی تصحیح کا نتیجہ ہیں:

عزیزاں جاں فدا کردم سرو ساماں ہبا کر دم
نیر زم گوشہ چشمے نیا رم چیل بازی را

تصحیح: بنازم بے نیازی را

گرسنہ باز شاہنشاہ و ما صیاد بے طالع
دلے کبکی نثار آریم خوے شاہ بازی را

تصحیح: دلے کبلے نثار آریم خور شاہ بازی را

ہمہ روز دست حسرت چو مگس زدور لیتم
کہ سر آستین مہماں بہ شکر بہشت مارا

تصحیح: بشکر نہشت مارا

پیداست رہائی من از ضعف امیدم
نے زود بسرے رسد آواز حزیں را

تصحیح: رہ زود بسری رسد آواز حزیں را

معراج ما نہایت اُفتادگی بود
در عشق قرب صدرہ بود قعر چاہ را

تصحیح: قرب سدرہ

تہ پیالہ چو بر خاک کشتگاں ریزی

مراکہ سوختہ ام مغز استخواں دریاب

تصحیح: تشنگاں بجائے کشتگاں

یہ ہے مشتے نمونہ از خروارے تمام دیوانِ نظیری کو انہوں نے اسی طرح درست کیا اور معنی کی پیچیدگیوں کو دُور کرنے کی کوشش کی۔ انوری اور خاقانی کی تدریس کے وقت بھی انہوں نے یہی طریقہ اختیار کیا مگر نظیری کے معاملے میں ان کا شوق و شغف کچھ زیادہ تھا کیوں کہ انہیں نظیری کی شاعری بہت پسند تھی۔ حافظ کے بعد غزل میں وہ نظیری ہی کو اپنا محبوب شاعر قرار دیتے تھے۔ جب مولانا اصغر علی روحی کی کتاب ''دبیر عجم'' چھپ کر آئی تو اس کے مطالعے سے پروفیسر شیرانی بے حد رنجیدہ ہوئے کیوں کہ اس کتاب میں نظیری کے اشعار پر کچھ اعتراض تھے۔ اس زمانے میں مَیں ایک دن ان سے ملنے کے لیے گیا' اس وقت بگڑے بیٹھے تھے۔ میرے دریافت کرنے پر فرمایا' دیکھو سید! مولانا روحی نے کیا غضب ڈھایا ہے۔ کہتے ہیں نظیری کے اشعار فصاحت و بلاغت سے گرے ہوئے ہیں اور ان میں قواعد کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔ پھر فرمایا'' مجھے فرصت ملی تو میں مولانا کے اعتراضات کا جواب لکھوں گا۔'' افسوس ہے کہ دوسرے معاملات نے جواب لکھنے کی فرصت نہ دی' مگر میں اس قدر جانتا ہوں کہ وہ مرتے دم تک مولانا روحی کی بے انصافی کے شکوہ گزار رہے۔

پروفیسر شیرانی کا یہ تدریسی ڈھنگ درحقیقت نہایت مفید اور نفع بخش تھا۔ اگرچہ اب یونی ورسٹیوں کے طالب علم اور ملک کے فرنگیشیائی نقاد قدیم ادب اور شاعری کو محدود تنگ اور زندگی سے منقطع خیال کرنے لگے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اگر فارسی اردو شاعری کی گہرائیوں تک پہنچانے والے استاد (جیسے کہ پروفیسر شیرانی تھے) ملک میں دو چار بھی موجود ہوں تو پرانے ادب کی خوبیاں بھی لوگوں کے سامنے آتی رہیں اور ''دُم بریدہ'' تعلیم کے حاملین کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے کہ پرانے ادب میں کوئی چیز مطالعے کے لائق نہیں۔ پروفیسر شیرانی اپنے شاگردوں کی تربیت محض منصبی فرض سے مجبور ہو کر نہ کیا کرتے تھے' بلکہ اس کو محبت اور شفقت کا فریضہ جان کر انجام دیتے تھے۔ ہونہار اور مستعد طالب علموں کے افادہ کے لیے وہ ہر وقت آمادہ رہتے۔ ان کے بارے میں کوئی روک ٹوک وقت قاعدے کی پابندی نہ تھی' بے حد تکلیف اور پریشانی میں بھی اس علمی فرض سے غافل نہ رہتے' جن لوگوں کی استعداد پر انہیں بھروسا ہوتا' ان کی تربیت اولاد سے زیادہ کیا کرتے تھے۔ نہ صرف علمی مشکلات بلکہ ان کی ہر قسم کی تکلیفوں کو دور کیا کرتے تھے۔ انہیں سب سے زیادہ اس بات کی دُھن تھی کہ طلبہ کو آباواجداد کے علمی اور کلچرل ورثے سے روشناس کیا جائے اور ان میں اس کی قدر کرنے اور اس کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ وہ طلبہ کو تحقیقی مضمونوں کی طرف خاص طور سے راغب کرتے اور خود ہر وقت رہنمائی کے لیے تیار رہتے بلکہ بعض اوقات مضمونوں کا بیش تر حصہ خود لکھ کر طالب علم کو تکمیل کی رغبت دیتے۔ پروفیسر شیرانی اگرچہ مال دار آدمی نہ تھے مگر ان کا دسترخوان (خصوصاً اپنے طالب علموں کے لیے) اکثر کھلا رہتا تھا۔ وہ اپنے شاگردوں کی بے شوقی کا علاج بعض اوقات ضیافتوں سے کیا کرتے اور تجربہ شاہد ہے کہ میرے جیسے

بدذوقوں اور بے شوقوں کے لیے یہ نسخہ بے حد کارگر ثابت ہوا۔ ہمارا دور..... جسے ترقی پر ناز ہے..... پرانی طرز کے استادوں کی اس شفقت اور مہربانی کے راز کو شاید سمجھ بھی نہ سکے گا' کیوں کہ آج تو "معاوضہ" کی بات پہلے طے ہوتی ہے۔ ہم ایسے اساتذہ کو اب کہاں سے لائیں گے جو گریز پا طالب علموں کو دام شفقت میں اسیر کرنے کے لیے اپنی پونجی تک لٹا دیتے تھے اور اس پر بھی معذرت کیا کرتے۔ بقول نظیری ؎

درس ادیب اگر بود زمزمہ محبتے
جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را

پروفیسر شیرانی شعر و شاعری کی تعلیم و تدریس میں صنائع بدائع سے کہیں زیادہ فن عروض کی طرف توجہ کیا کرتے تھے۔ فن عروض کا جاننا ان کے نزدیک شعر فہمی کی ابتدائی منزل تھی۔ یہ خیال صحیح ہو یا غلط مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ اس کی بہت مشق کرایا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وزن اور بحر کے جانے بغیر کوئی آدمی شعر کی موسیقی سے لطف نہیں اٹھا سکتا۔ ازبس کہ وزن شعر کی بنیادی شرط ہے اس لیے اس کا علم بے حد ضروری ہے۔ علم عروض کی پیچیدگیوں کو دور کرنے کے لیے انہوں نے اپنے طریقے اور گر ایجاد کر رکھے تھے۔ بعض نئی بحریں بھی نکالی تھیں۔ ان میں نظمیں بھی لکھی تھیں مگر ان تجربوں کو مکمل کرنے کے لیے ان کے پاس وقت نہ تھا۔ دوسرے علمی مشاغل نے انہیں اس جانب متوجہ نہ ہونے دیا' پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ فن عروض کی باریکیوں سے جتنے آپ باخبر تھے' اس کی نظیر شاید ہندوستان میں اس وقت نہ مل سکے گی۔ عروضی بحثوں سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ رباعی کے مضمون پر انہوں نے 1940ء میں ایک فاضلانہ مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "رباعی کے اوزان یاد رکھنے کا آسان طریقہ"۔ اس مضمون میں سید سلیمان ندوی کے بعض بیانات سے اختلاف کیا ہے۔[1]

تاریخ و تنقید

یہ سب اوصاف بجائے خود شیرانی صاحب کی شخصیت کو امتیاز بخشنے کے لیے کافی ہیں' مگر ان کو میں ثانوی درجہ دیتا ہوں۔ ان کی قابلیتوں کا اصل میدان فن تاریخ تھا۔ انہوں نے تاریخی تحقیق و تنقید میں حیرت انگیز کام کیے۔ اگرچہ انہوں نے فن تاریخ میں کوئی خاص کتاب نہیں لکھی' مگر انہوں نے جس مضمون پر قلم اٹھایا اس میں ان کا مورخانہ رجحان کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ بہ طور ماہر آثار عتیقہ' بہ طور نقاد' بہ طور مورخ ادب' بہ طور عروضی وہ سب سے پہلے اور سب سے پیچھے مورخ ہی تھے۔ قدیم خطاطی اور نقاشی کی تنقید میں ان کا نقطۂ نگاہ جمالیاتی کم اور مورخانہ زیادہ تھا۔ وہ خط اور تصویر کے محاسن اور عیوب سے اتنی بحث نہ کرتے تھے جس قدر اس سے کہ فلاں خط یا فلاں تصویر تاریخی تدریج کے اعتبار سے کس دور اور کس زمانے سے متعلق ہے۔ بلاشبہ ان امور کے بارے میں بھی ان کی معلومات کچھ کم نہ تھیں' مگر ان کا ذہن ایک مورخ کا ذہن اور ان کی نظر ایک ماہر تاریخ کی نظر تھی۔ ادبی تنقید کے بارے میں بھی یہی ان کا امتیازی رجحان تھا۔ ان میں نقد و جرح کی

بے نظیر قوت تھی، مگر ان کا اسلوب انتقاد مورخانہ تھا۔ تنقید شعر العجم، آب حیات پر نظر اور پروفیسر عبدالغنی کی کتاب ''فارسی ادب مغلوں سے پہلے'' کا تبصرہ ان سب تحریروں میں تاریخ ہر جگہ ان کی رہ نمائی کرتی نظر آتی ہے۔ یہی ان کے لیے مشعل راہ ہے اور یہی ان کا موثر ہتھیار۔ حافظہ غیر معمولی پایا تھا اور سنین کے استحضار پر بڑی قدرت تھی۔ شاہ نامے کی داستانوں سے لے کر جدید ترین واقعات کی حد تک سال اور مہینے ان کے حافظے میں محفوظ تھے۔ اس بارے میں غلطی کرنے والا ان کی گرفت سے بچ کر نہ جا سکتا تھا۔ اِلا کہ ان کی رواداری خود ہی اسے یہ کہہ کر چھوڑ دے ۔

جا چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھ کر

پروفیسر شیرانی کی مصنفانہ زندگی میں ''شعر العجم'' کا واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ علامہ شبلی کی ''شعر العجم'' پر ہاتھ ڈالنا کسی معمولی آدمی کا کام نہ تھا۔ ''شعر العجم'' کی شہرت اور قبول عام' اشعار کا عمدہ انتخاب' تشریح و تعبیر کا دل آویز پیرایہ' مولانا شبلی کی مورخانہ عظمت' شبلی اکیڈمی کا رُعب اور دبدبہ! عام قابلیت کا آدمی قلم اٹھانے کے تصور ہی سے کانپ اٹھتا' مگر پروفیسر شیرانی کو اپنے فن پر پورا پورا اعتماد تھا۔ انہوں نے ''شعر العجم'' کے تاریخی پہلو پر حملہ کیا..... اور یہ وہ پہلو تھا جس پر (واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ) حملہ ہو سکتا تھا۔ مگر اس میں بھی پروفیسر شیرانی محض مورخ تھے' جمالیاتی تنقید یہاں بھی نہیں۔ (یہی حال آب حیات کی تنقید کا ہے)۔

الغرض شیرانی کا ذہن اور نقطۂ نظر از سرتاپا مورخانہ تھا۔ وہ مورخ پہلے تھے اور نقاد بعد میں۔ انہوں نے اپنی تاریخ دانی کو انتقاد کی خدمت میں صرف کیا۔

ان کی تحقیق اور تنقید نے ارزاں تصنیف اور ناقص تحقیق کی سخت حوصلہ شکنی کی۔ شیرانی صاحب کی تنقیدوں کے بعد بڑے بڑے مصنف بھی پوری تحقیق کے بغیر اپنے علمی نتائج کو ملک کے سامنے پیش کرنے سے ڈرنے لگے اور حق تو یہ ہے کہ شیرانی صاحب نے تصنیف اور تحقیق کا معیار بہت بلند کر دیا۔

پروفیسر شیرانی کی طبیعت میں نقد و نظر کا مادہ فطری طور پر موجود تھا' مگر ان کی محنت پسندی اور سخت کوشی نے اس جوہر کو چمکایا۔ وہ ذہن دراک اور طبع خارا شگاف رکھتے تھے۔ لاہور میں وارد ہو کر ان کی اس صفت کو پروفیسر محمد شفیع صاحب کی رفاقت اور صحبت سے بڑی ترقی ہوئی۔ یہ اسی محنت پسندی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنے تنقیدی کام کی خاطر ''شاہ نامہ'' فردوسی کا ایک ایک لفظ پڑھا اور شاید بار بار پڑھا۔ ''کلیات عطار'' کے ہزارہا اوراق کو گہری نظر سے دیکھا۔ انوری' خاقانی' سنائی' عثمان مختاری کے کلام کا ناقدانہ مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی ایسے ایسے محنت طلب کام کیے کہ عام طور پر ہندوستان کی آب و ہوا ان کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی (صدر یار جنگ) نے ایک مرتبہ فرمایا اور کتنا صحیح فرمایا کہ ''شیرانی کی گرفت درشت مگر درست ہوتی ہے خصوصاً کم کوش مصنفوں اور کام چور محققوں کے لیے تو سنگ آمد و سخت آمد

کا مضمون ہے۔"

پروفیسر شیرانی کی گرفت درست بھی ہوتی تھی اور لاکلام بعض اوقات دُرشت بھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی گرفت میں آنے والوں کے لیے "سپر انداختن" کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہ ہوتا تھا۔ شیرانی صاحب کی تنقید کے ساتھ بعض دوسرے اوصاف اس طرح ہم عنان چلتے تھے کہ ان کا حملہ بے پناہ ثابت ہوتا تھا۔ سب سے بڑی صفت ان کی وسعت نظر تھی۔ فارسی اور اردو ادب کے بڑے بڑے شاہ پاروں پر عبور تھا اور ایک مورخ ہونے کے لحاظ سے انہیں "مآخذ" اور مصادر کی کامل واقفیت تھی۔ زبان اور ادب کی عہد بہ عہد تبدیلیوں کے خصوصی رنگوں کو پہچانتے تھے۔ زبان' ادب' لغت' تاریخ اور آثار عتیقہ کا علم ہر وقت ان کی دست گیری کے لیے تیار تھا۔ اس پر حافظہ بلا کا تھا۔ چناں چہ استشہاد میں بیسیوں اشعار حسب ضرورت زبان پر آ جاتے تھے۔ وہ اپنے نقطہ نظر کے اثبات میں بے شمار دلائل لا سکتے تھے۔ ان کے وسیع اور جامع کتب خانے میں اس علمی "حرب و ضرب" کے لیے ہر قسم کے 'اسلحہ' موجود رہتے تھے جن کا استعمال وہ بڑی مہارت اور سلیقے سے کیا کرتے تھے۔ جن دنوں پروفیسر شیرانی اس قسم کے کسی 'جہاد' میں مصروف ہوتے تھے' اس زمانے میں ان کا سب سے بڑا موضوع سخن یہی ہوا کرتا تھا۔ ایسے زمانے میں وہ اپنے موضوع سے متعلق کتابوں کی تلاش میں نکلا کرتے اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ اکثر اپنے مطلوب کے حصول میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ ان کے کتب خانے کی سب سے بڑی صفت یہی ہے کہ اس میں کتابیں اور مخطوطات بعض خاص مباحث اور مضامین کے تعلق میں جمع کی گئی ہیں۔

مختصر یہ کہ پروفیسر شیرانی ہمارے دور کے بہت بڑے نقاد مورخ تھے۔ وہ واقعات کی صحت و صداقت پر جان دیتے تھے اور اس معاملے میں کسی غلطی اور غلط بیانی کو معاف نہ کر سکتے تھے۔ سچائی کی تلاش ان کا ایمان تھا' جس کی خاطر انہوں نے بڑی بڑی شخصیتوں کی بھی پروا نہ کی۔ انہوں نے تاریخ اور ادب کی بڑی بڑی غلطیوں کی اصلاح کی اور ایسے ایسے پختہ نظریوں کے طلسم کو توڑا جن کی جڑیں علمی دنیا میں بہ طور ایک حقیقت ثابتہ کے راسخ اور پکی ہو چکی تھیں۔ ان سب امور میں ان کی تحقیق کے طریقے یکساں تھے۔ تاریخی نقطہ' نظر کا استعمال اور اندرونی شہادتوں سے استدلال تقریباً ہر موقع پر ان کی جرح کی بنیاد قرار پاتا ہے۔ محض روایت پر وہ اعتماد نہ کرتے تھے بلکہ درایت کو بھی کام میں لاتے تھے۔ تاریخ کیا کہتی ہے' مصنف کے بیانات کہاں تک اس کی تائید کرتے ہیں۔ اسلوب بیان اور خصائص زبان کس حد تک تصدیق یا تردید کر رہے ہیں۔ یہ اور اس قسم کے بہت سے اصولی سوالات اکثر و بیشتر ان کے پیش نظر رہتے تھے۔

محمود اور فردوسی

پروفیسر شیرانی کو فردوسی اور محمود دونوں کی زندگی اور کارناموں سے محبت تھی۔ وہ محمود کی شخصیت کے

بے حد مداح تھے اور یہ شاید اسی نفسی مماثلت کا نتیجہ تھا کہ ہمارے محمود نے بھی غزنوی محمود کی طرح ''بت شکنی'' میں ہی نام پایا۔ اگرچہ شیرانی صاحب کے تعمیری کاموں کی کچھ کمی نہیں۔ پھر بھی ادب اور تاریخ کے بہت سے غلط نظریوں اور عقیدوں کو انہوں نے جس شدت اور قوت کے ساتھ توڑا اس کی بنا پر اگر انہیں بھی ''بت شکن'' کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

محمود اور فردوسی کے باہمی تعلقات کی داستان' غلطیوں اور غلط فہمیوں سے بھری پڑی تھی۔ شیرانی صاحب نے عالمانہ تحقیق کے ذریعے افسانہ و حقیقت کا فرق واضح کیا۔

''شاہنامہ فردوسی'' کے بارے میں نیم تاریخی روایات نے آج تک دنیا کو اس فریب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ اس کی ابتدا محمود غزنوی کی فرمائش سے ہوئی۔ محمود کے دربار میں فردوسی کا عنصری کی وساطت سے پہنچنا اس کے بعد محمود کا شاہ نامے کی فرمائش کرنا' شاہ نامے کی تکمیل پر بادشاہ کا اپنے وعدے سے پھر جانا' فردوسی کا اس سے ناراض ہو کر ہجو لکھنا اور غزنی سے بھاگ کر پہلے طبرستان پھر طوس جانا' آخر میں محمود کا پشیمان ہونا اور موعودہ انعام بھیجنا مگر اس کا ایسے وقت پہنچنا جب کہ سوئے اتفاق سے فردوسی کا جنازہ نکل رہا تھا۔ یہ تمام روایات ہمارے دماغ میں اس طرح جڑ پکڑ چکی تھیں کہ ان کی صداقت سے انکار کرنا مسلمات سے انکار کرنے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ مگر شیرانی صاحب نے ان حکایات کا تار پود بکھیر کر رکھ دیا اور محکم دلیلوں سے یہ ثابت کر دکھایا کہ اس افسانے کی بیش تر جزئیات فرضی اور وضعی ہیں جن کی ساخت اور ترتیب فردوسی کے زمانے کے بہت بعد بعض خاص اغراض کے ماتحت عمل میں آئی۔ اس افسانے کی تردید میں شیرانی صاحب نے سب سے زیادہ خود شاہ نامے کی اندرونی شہادت سے کام لیا ہے' جن سے قوی تر اور قابل قبول تر کوئی سند ہو نہیں سکتی۔ شیرانی صاحب نے خود شاہ نامے سے یہ ثابت کیا کہ فردوسی نے اس نظم کو' محمود کی فرمائش سے نہیں' بلکہ محض تفریحاً اپنی بیوی کے ایما سے شروع کیا تھا۔ اس لحاظ سے داستانِ بیون شاہ نامے کی اوّلیں نظم ہے۔

''جب اس نظم نے شائع ہو کر قبول عام کا خلعت حاصل کر لیا تو دوستوں کی تحسین اور سخن فہموں کے اصرار نے فردوسی کو تمام شاہ نامے کی نظم پر آمادہ کیا''۔ دقیقی کی یاد ان دنوں میں تازہ تھی' فردوسی اس کے نقش قدم پر چل کر ویسی ہی ہردلعزیزی اپنے لیے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شاہ نامے کو منظوم کرنے کے خیال سے وہ اپنے وطن سے روانہ ہو کر پہلے بخارا پھر مرو اور ہرات پہنچا' تاکہ دفتر پہلوی کو حاصل کر کے قدیم داستانوں سے واقفیت پیدا کرے۔ اس سفر میں اس کو بعض ایسے سرپرست مل جاتے ہیں جو اسے شاہ نامے کی تکمیل پر ابھارتے ہیں۔ ان کی ترغیب سے فردوسی دربار غزنی میں آنے سے بہت پہلے شاہ نامے کی نظم پر کمربستہ ہوتا ہے۔ داستانِ بیون سنہ 365ھ میں شائع ہو چکی تھی' سنہ 370ھ میں وہ شاہ نامہ لکھنا شروع کرتا ہے' جب اس کا بیشتر حصہ لکھا جا چکتا ہے تو اپنے دوست منصور بن محمد کی نصیحت کے مطابق وہ دربار غزنی کی طرف رجوع کرتا ہے جہاں بالآخر شاہ نامے کی تکمیل ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ فردوسی کو دربار غزنی سے قدر دانی کی جو توقع تھی' وہ پوری نہ ہوئی اس

لیے نہیں کہ محمود نے وعدہ شکنی کی (کیوں کہ محمود کے وعدے اور فرمائش کا عقیدہ تاریخ کے لحاظ سے غلط ثابت ہوا) بلکہ محض اس وجہ سے کہ اس جاں کاہی اور محنت کی بنا پر فردوسی اپنے آپ کو شاہی قدر دانی کا مستحق خیال کرتا تھا' جس سے وہ محروم رہا۔

اب رہا یہ سوال کہ سلطان محمود نے فردوسی کی قدر دانی کیوں نہ کی؟ یا یہ کہ سلطان کو برگشتہ کرنے میں کس کا ہاتھ تھا؟ سو اس کے مختلف جواب دیے جاتے ہیں۔ شیرانی صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ فردوسی کی ناکامی کی ذمہ داری بعض ایسے اتفاقات سیہ پر ہے جو شاہی درباروں میں اکثر رونما ہوتے رہتے ہیں۔ فردوسی کی ناکامی کا اصلی سبب شیرانی صاحب کے خیال میں غریب فضل بن احمد کی تباہی' قید اور ہلاکت سے تعلق رکھتا ہے جو واقعہ شاہ نامے کے اختتام کے قریب زمانے میں رونما ہوتا ہے۔ فضل بن احمد وزیر' فردوسی کا قدر دان تھا۔ آخری زمانے میں وہ حریفوں کی سازشوں کا شکار ہو کر بادشاہ کی نظروں سے گر گیا تھا۔ فردوسی جو اس کا دوست خیال کیا جاتا تھا' وہ بھی معتوب ٹھہرا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادب اور تاریخ کا یہ شاہ کار اس شاہانہ صلے سے محروم رہ گیا جس کی فردوسی کو توقع تھی۔

ہجو کا افسانہ

شیرانی صاحب نے فردوسی کی ہجو کے واقعہ کو بھی بالکل بے اصل ٹھہرایا ہے۔ دلائل ان کے یہ ہیں کہ فردوسی ایک بلند حوصلہ اور عالی ظرف انسان تھا۔ سلطان کی ناقدر دانی کا رنج اسے ضرور ہوا' مگر اس نے اس صدمے کو صبر اور تحمل کے ساتھ برداشت کیا ہوگا۔ "شاہ نامہ ایک عظیم کتاب ہے۔ اس میں فردوسی نے دوست اور دشمن دونوں کا ذکر کیا ہے مگر کوئی موقع ایسا نظر سے نہیں گزرا جہاں فردوسی یاس و قنوط' رنج و غصہ اور طیش میں آکر اپنی متانت اور تہذیب کو ہاتھ سے کھو کر عامیانہ زبان استعمال کرے' چہ جائے کہ وہ زبان جو کہا جاتا ہے کہ فردوسی نے ہجو میں سلطان کے حق میں استعمال کی ہے۔" (چار مقالے' ص 37)

اس کے علاوہ شیرانی صاحب کہتے ہیں "یہاں اس سوال پر بھی غور کر لینا چاہئے کہ آیا فردوسی کو ہجو لکھنے کا حق بھی پہنچتا ہے یا نہیں؟'' اس کا جواب بڑی تفصیل سے دیتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ محمود نے بعض اسباب کی بنا پر بے قدری ضرور کی مگر "یہ ناقدر دانی ہجو کے واسطے وجہ جواز نہیں بنائی جا سکتی"۔ شیرانی صاحب ہجو کے واقعے سے انکار کے لیے خود شاہ نامے کی سند پیش کرتے ہیں:

> "ہجو کے بارے میں عالمگیر اعتقاد کے باوجود میری سوئے ظنی تعجب کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ بالخصوص جب کہ میں اس عقیدے میں بالکل تنہا ہوں اس لیے کہ ہجو سے آج تک کسی نے انکار نہیں کیا ہے اور نہ کسی قسم کا اشتباہ اس پر کیا گیا ہے لیکن جیسا کہ اوپر دکھایا جا چکا ہے' میں محض شاہ نامے کی سند پر اس کے وجود سے منکر ہوں'

اس مسئلے کا بہترین فیصلہ تنقید کے ہاتھ میں ہے۔'' (ص 42)

پروفیسر شیرانی نے ہجو کی تنقید میں جس زورِ استدلال اور تجزیہ و تنقیح کی قوت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس کی مثالیں ہمارے ادب میں بہت کم ملتی ہیں۔ ہجو کی ابتدا اور اس کی عہد بہ عہد تغیر پر واقعات اور تاریخ کی ایسی روشنی ڈالی ہے کہ ہر انصاف پسند آدمی یہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ فردوسی کی ہجو یاروں کی تراشیدہ ہے۔ ابتدا میں ہجو کی کوئی اصلیت نہ تھی۔ اس کا آغاز فردوسی کے زمانے کے بعد ہوا۔ پانچویں صدی ہجری میں سب سے پہلے ہجو کے جراثیم پیدا ہو چکے تھے۔ دیباچہ قدیم پر اس کا پرتو نظر آتا ہے۔ بعد میں تاریخی طور پر ہجو کے اشعار کی تعداد بڑھتی گئی۔ چھٹی صدی ہجری کے وسط میں اس کے کلیم چھے اشعار تھے۔ بعد میں بڑھتے بڑھتے 105 (نول کشوری نسخہ) بلکہ 200 ابیات تک پہنچ گئے۔ شیرانی صاحب کا قیاس یہ ہے کہ محمود کی ناقدردانی کے خلاف فردوسی کے ہجو یا احتجاج کا افسانہ دراصل بعد کے شعرا کا ایجاد کردہ ہے جنہوں نے حفظ نوع کے لیے ایک ہتھیار یہ بھی ایجاد کیا اور اسے ''ہر سلطان اور امیر کے لیے سبق عبرت بنایا گیا کہ شعرا کے ساتھ سلوک مرعی رکھنے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے ورنہ کہیں وہی حشر نہ ہو جو محمود غزنوی کا ہوا''۔ پھر زبان' اسلوب' ترتیب' ساخت' روایت اور درایت غرض ہر لحاظ سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ مروجہ ہجو کا فردوسی سے کوئی تعلق نہیں۔

یہی حال فردوسی کے مذہب کا ہے۔ پرانی روایات اس کو شیعہ بیان کرتی ہیں۔ شیرانی صاحب کا فیصلہ یہ ہے کہ فردوسی کو شیعہ قرار دینا صحیح نہیں' کیوں کہ زیادہ شواہد اس کے تسنن پر دلالت کرتے ہیں۔ ''فردوسی کی حیثیت زیادہ تر ایک دنیادار مسلمان سے ملتی جلتی ہے' جس کو مذہب کا شغف نہ ہو۔ وہ کوئی متقی اور دین دار مسلمان نہ تھا اور نہ فقیہ اور عالم' مذہبی رنگ اس پر نہ کبھی کھلا اور نہ اس میں انہماک رہا''۔ وہ حکمت و فلسفہ کا دلدادہ تھا اور اسی نقطۂ نظر کا اظہار شاہ نامے میں بیش تر موقعوں پر ہوا ہے۔

فردوسی کی یوسف زلیخا

اسی قسم کا ایک اور غلط خیال یہ ہے کہ فردوسی نے شاہ نامے کے بعد ''یوسف زلیخا'' کے نام سے ایک اور کتاب لکھی تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ آج تک اس کو لوگ صحیح تسلیم کرتے آئے ہیں۔ شیرانی صاحب نے لسانی دلائل اور شواہد سے اس خیال کی تردید کی ہے۔ یہ بھی پروفیسر شیرانی کے ناقدانہ [2] کلام کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس میں فارسی زبان کے مختلف اسالیب کو سامنے رکھ کر اور مختلف زمانوں کی زبان کو پیش نظر رکھ کر یہ قطعی نتیجہ نکالا ہے کہ یہ کتاب فردوسی کی نہیں ہو سکتی۔

شاہنامے کا مطالعہ

میں پہلے لکھ آیا ہوں کہ ''شاہنامہ'' پروفیسر شیرانی کی مرغوب ترین کتاب تھی۔ عجم کے اس بے نظیر

رزمیہ کے اکثر اشعار انہیں یاد تھے۔ اس کے متعلقہ مسائل اور واقعات کی معمولی معمولی باتوں کا انہیں علم تھا۔

فردوسی کی ہزار سالہ برسی کی یادگار میں جو کتاب شائع ہوئی ہے اس میں پروفیسر شیرانی کی شاہ نامہ دانی کا بڑے شاندار الفاظ میں اعتراف کیا گیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مرحوم نے شاہ نامے کا مطالعہ جس تنقیدی نظر سے کیا ہے اس کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔

سلطان محمود پروفیسر شیرانی کی محبوب شخصیتوں میں تھا۔ وہ اپنے وسیع مطالعات کے دوران میں اس نامور سلطان کی سیرت اور کارناموں کا بغور جائزہ لیتے نظر آتے ہیں' فردوسی کی ناکامی اور اس کی ہجو کے بارے میں دنیا کو سلطان کے خلاف جو شکایت بلکہ غصہ اور احتجاج تھا' اس کو انہوں نے اپنے تجزیے کی قوت سے بہت حد تک دور کر دیا ہے۔ عطار کی وسیع و عریض کلیات کا مطالعہ کرتے وقت الٰہی نامے میں جب انہیں اپنے محبوب سلطان کی خوش نما تصویر نظر آتی ہے تو وہ بے اختیار اس کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عطار کی حکایات سلطان کو ایک رحمدل' نیک طینت' صاحب تدبیر اور نیکوکار بادشاہ کے رنگ میں پیش کرتی ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ روایات جتنا ہم ماضی کی طرف بڑھتے جائیں' سلطان کی سیرت کو روشن سے روشن تر بنا رہی ہیں جس سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ بعد کے راویوں اور مورخوں نے کسی خاص غرض سے سلطان کو بدنام کیا ہے۔[3]

تنقید شعرالعجم

پروفیسر شیرانی کے تنقیدی کارناموں میں سب سے زیادہ اہمیت "تنقید شعرالعجم" کو حاصل ہے۔ "شعرالعجم" ملک میں جتنی مقبول تھی' شیرانی صاحب کی تنقید کا اسی نسبت سے چرچا ہوا۔ افسوس ہے کہ اس تنقید کے بارے میں جتنی رائیں ظاہر کی گئی ہیں' مخالف اور موافق دونوں فریقوں نے' بنیادی اصول سے کہیں زیادہ اس کو علامہ شبلی کی تنقیص اور تحسین کے معیار سے پرکھنے کی کوشش کی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ شیرانی صاحب کی تنقید کا (خصوصاً ابتدائی مضامین میں) لہجہ تلخ تھا جس کی بنا پر مولانا عبدالحلیم شرر جیسے بزرگ کو بھی "دلگداز" میں یہ کہنا پڑا کہ "تنقید کے جائز اور صحیح ہونے میں کلام نہیں مگر نقاد کا لہجہ بہر حال درشت ہے اور اس میں ذاتی پرخاش کا پہلو نظر آتا ہے" مگر میں کہتا ہوں کہ اس عیب کو تسلیم کر بھی لیا جائے پھر بھی "شعرالعجم" میں تاریخ اور واقعات کی غلطیوں کی اصلاح کی کوشش ہر طرح مستحسن تھی۔ ادب میں نقد و نظر کا سلسلہ ہمیشہ موجود رہا ہے۔ انتقاد کی تلوار سے شیوخ عظام اور آئمہ کبار بھی نہیں بچ سکے۔ من صنف فقد استهدف کا قانون ہر ملک اور ہر صدی میں رائج رہا ہے۔ ایک ابوالقاسم البصری نے عربی ادب کے بلند ترین شاہ پاروں پر جو رد لکھے اور "تنبیہات" کے نام سے کتاب مرتب کی' اس میں جاحظ' المبرّد' جستانی' ابن ولاد مصری اور ابن سلام جیسے باکمال عالم اور ادیب شامل ہیں۔ تنقید کے اس ہمہ گیر احتساب سے علامہ شبلی کو کیسے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔

''تنقید شعر العجم'' اب کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کے پیش کلام اور دیباچے میں پروفیسر شیرانی نے اپنی تنقید کا مقصد خود واضح کیا ہے:

''میں نہایت وثوق کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ تنقید ہذا مولانا شبلی مرحوم کی فضیلت علمی کی منقصت نہیں بلکہ محض احتجاج ہے اس مروجہ روش کے خلاف جس میں ہمارے مصنفین تحقیق کی جگہ تقلید سے اور عقل کی جگہ نقل سے کام لیتے ہیں۔ ہم تاریخی واقعات اور سوانح و حالات لکھتے وقت اس قدر تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ ان کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھ لیں اور ان کی صحت و درستی کے متعلق اپنا اطمینان کر لیں۔ میں ان بزرگوں کے ساتھ بھی اتفاق نہیں کرتا جو ''شعر العجم'' کو حسن و عشق کا صحیفہ کہہ کر اس کے تاریخی پہلو کی اہمیت کو گھٹانا اور تنقید کی ضرورت کو اس سے مٹانا چاہتے ہیں۔''

پھر کتاب کے دیباچے میں اپنے اصول کار کی ان الفاظ میں صراحت کرتے ہیں:

''علامہ شبلی مرحوم زمانہ حال کے ان چند مستند افاضل میں سے ہیں جن کا وجود مسلمانوں کے لیے ہمیشہ مایہ ناز رہے گا۔ ان کی متعدد تصانیف نے ان کو آسمانِ علم پر آفتاب بنا کر چمکایا ہے۔

''مرحوم کا شمار اُن خوش نصیب مصنفین میں کیا جا سکتا ہے جن کے فرزندانِ روحانی نے اُن کے دورانِ حیات میں قرار واقعی قدر و منزلت حاصل کر لی ہے۔ جس کے حقیقت میں وہ مستحق ہیں۔

''مرحوم نے تاریخ نگاری کی بنیاد ایسے زمانے میں ڈالی جب فن تاریخ کا شوق ہمارے دل سے محو ہو چکا تھا۔ اردو زبان تاریخی کتابوں سے بالکل تہی مایہ تھی اور ملک کا مذاق نہایت پستی کی حالت میں تھا۔ ایسے جمود کے وقت میں ان کے قلم نے اس فن کے احیا میں وہ زبردست اور قابل قدر خدمت کی جو صدیوں تک یادگار رہے گی۔

''تاریخ میں ان کی وسعت معلومات کا اندازہ مرحوم کی ان متعدد اور مختلف الموضوع تصانیف سے لگایا جا سکتا ہے جو اردو ادبیات کی چیدہ اور منتخب کتابوں میں مانی جاتی ہیں۔

''فارسی نظم کی تاریخ میں اردو زبان کی بے بضاعتی محسوس کر کے علامہ نے ''شعر العجم'' تصنیف کی۔ اس موضوع پر اب تک فارسی اور اردو میں جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں ''شعر العجم'' ان میں بغیر کسی استثنا کے بہترین تالیف مانی جا سکتی ہے.....''

میں سمجھتا ہوں کہ پروفیسر شیرانی کی جانب سے علامہ شبلی کی خدمات اور ''شعر العجم'' کی اہمیت کا یہ اعتراف حقیقت میں بہت بڑا اعتراف ہے۔ اس سے یہ عام شکایت بڑی حد تک رفع ہو جانی چاہیے کہ شیرانی

صاحب نے یہ سب کچھ علامہ کی تنقیص کے لیے کیا ہے۔ دنیا کے کسی مصنف کی کتاب بے عیب نہیں مانی جاسکتی۔ اس لحاظ سے ''شعر العجم'' بھی بے عیب نہ تھی۔ تاریخی صداقت کا پاس ہر محقق اور مصنف کا فرض ہے۔ اگر ''شعر العجم'' میں اس پہلو سے کچھ کمزوریاں تھیں تو اُن کی اصلاح سے ''شعر العجم'' کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے نہ کہ کمی۔

''شعر العجم'' کے خلاف شیرانی صاحب کو جو شکایتیں ہیں' ان میں سے ایک یہ ہے کہ علامہ شبلی نے بعض اوقات محض دلچسپی اور رنگینی کو اہمیت دی ہے اور اس مقصد کے پیش نظر کافی تحقیق اور چھان بین نہیں کی ''غیر تاریخی افسانوں نے شعر العجم میں قابل عزت جگہ پائی ہے۔'' عام تذکرہ نگاروں کے بیانات کو جرح و تعدیل کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک شاعر کے ابیات دوسرے شاعر کی طرف منسوب کر دیے ہیں۔ بعض ضروری معاملات میں اجتہاد کو استعمال نہیں کیا۔ دو مختلف روایتوں میں ''خوش خلق حاکم کی طرح مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو خوش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔'' اور یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ مولانا اپنے پچھلے بیانات کی آگے چل کر خود ہی تردید کر دیتے ہیں' جو جو اطلاعات آسانی سے مولانا شبلی کی دسترس میں آ سکیں انہیں پر قناعت کی' زیادہ تحقیق و تلاش سے کام نہیں لیا اور سن اور تاریخ کے بارے میں بڑی بے احتیاطی پائی جاتی ہے۔ بس یہی سب سے بڑے اعتراضات شیرانی صاحب کو ''شعر العجم'' کے خلاف ہیں۔ ان کے صحیح اور برمحل ہونے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل مولانا شبلی کی بنیادی مشکل یہ تھی کہ وہ ہمہ داں اور ہمہ فن تھے' ان کی تصانیف ایک فن سے متعلق نہ تھیں۔ ایک ایسے آدمی کی طرح جو زندگی میں بہت سے کام انجام دینے کی آرزو رکھتا ہو۔ انہوں نے اردو کے آنے والے ادب کی عمارت کے مختلف حصوں کی بیک وقت بنیاد رکھنے کی کوشش کی۔ ان کے دماغ میں صرف ایک منصوبہ نہ تھا جس کی وہ یکسوئی کے ساتھ تکمیل کرتے۔ ایک وقت میں بہت سے کام کرنے میں جو خامیاں ہو سکتی ہیں' وہ علامہ شبلی کی تقریباً سب کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان حالات میں تعجب کی بات یہ نہیں کہ ان کی تصانیف میں غلطیاں موجود ہیں بلکہ تعجب اس پر ہے کہ جو ادب انہوں نے پیدا کیا' وہ اتنا قوی اور جاندار کیوں کر ہے اور ملک میں اتنا قبول عام ان کی تصانیف کو کیوں کر حاصل ہوا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ شبلی نے تصنیف و تالیف میں خوشگوار اور دلچسپ اسلوب بیان کو بنیادی مرتبہ دیا ہے۔ وہ عالم اور محقق ہو کر بھی شگفتہ بیان اور صاحب طرز انشا پرداز بننا پسند کرتے ہیں کیوں کہ جو تصنیف ذوق کی تربیت نہیں کر سکتی یا موضوع میں دلچسپی پیدا نہیں کر سکتی' اس کا زندہ رہنا دشوار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ تصانیف شبلی میں ہر جگہ قومیت اور اسلامیت کی روح بیدار نظر آتی ہے۔ یہ امر بجائے خود قبول عام کا باعث ہوا۔ اس کے برعکس پروفیسر شیرانی ایک محقق مورخ کی طرح واقعات میں صداقت کے متلاشی تھے اور یک فن ہونے کی وجہ سے انہیں جو یکسوئی حاصل تھی اس کے طفیل وہ معمولی سے معمولی بات کو ڈھونڈنے اور پرکھنے کے لیے وقت' حوصلہ اور طبیعت رکھتے تھے۔ ''تنقید شعر العجم'' کا ایک ایک صفحہ پروفیسر شیرانی کی وسیع جستجو' تحقیق' تلاش' کوہ کنی اور جاں کاوی کا ثبوت

ہے۔ میری ناچیز رائے میں تلاش، تحقیق اور نقد و جرح کی جو مثال پروفیسر شیرانی نے پیش کی اس میں علامہ شبلی ان کی برابری نہیں کر سکتے۔ مگر ان اوصاف اور کمالات کو دیکھ کر یہ خیال آتا ہے کہ کاش پروفیسر شیرانی ادبیاتِ ایران پر کوئی مستقل تصنیف چھوڑ جاتے کیوں کہ تنقید میں وہ مولانا شبلی کی "شعرالعجم" کے بیانات میں مقید ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کی وسعت معلومات قائم بالذات تالیف کی مقتضی تھی ۔

سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

پروفیسر شیرانی نے اپنی تنقید کے پیش کلام میں لکھا ہے کہ "تنقید کے دوران میں مَیں نے نہ صرف تخریبی پہلو پر نظر رکھی ہے، بلکہ حسب اجازتِ وقت تعمیری کام بھی کیا ہے۔ یوں تو ہر شاعر کے حال میں کم و بیش اس کا پرتو موجود ہے، لیکن انوری، نظامی اور عطار کے تذکرے میں بہت نمایاں ہے۔" فی الحقیقت پروفیسر شیرانی اپنے اس دعوے میں حق بہ جانب ہیں، ان کی "تنقید شعرالعجم" کے بارے میں دنیا جو رائے چاہے رکھے، مگر میں تو یہی کہوں گا کہ اس تنقید کے بغیر "شعرالعجم" مکمل نہ تھی، ناقص تھی۔ فارسی ادب کا مطالعہ کرنے والے دونوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ جب تک "شعرالعجم" زندہ رہے گی، اس وقت تک تنقید بھی زندہ رہے گی۔

پروفیسر شیرانی نے شمس العلماء مولوی عبدالغنی کی کتاب "Persian Literature during the pro-Mughal period." پر بھی تنقید کی ہے اور پروفیسر محمد حبیب (علی گڑھ) کے ترجمے "خزائن الفتوح" پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ ان میں سے ثانی الذکر کا تجزیہ بے حد تفصیلی ہے۔ اگر مترجم کی شہرت کے پیش نظر اس کا امکان نہ ہوتا کہ اس سے انگریزی داں لوگ "خزائن الفتوح" کے مطالب کو غلط سمجھنے لگیں گے، تو پروفیسر شیرانی اس تبصرے پر اتنا وقت ہرگز صرف نہ کرتے (یا بقول خود ان کے "ضائع نہ کرتے") مگر "خزائن الفتوح" کی اہمیت کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے صحیح مطالب مورخین کے سامنے پیش ہوں۔

رہی پروفیسر عبدالغنی صاحب کی کتاب، سو اس کو قابل قدر خیال کرتے تھے کیوں کہ شیرانی صاحب کو خود بھی ہندوستان کے فارسی ادب کے موضوع سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے اپنے شاگردوں کو اس موضوع کے بہت سے حصوں کی تحقیق پر لگایا، قلمی کتابوں کی فراہمی میں بھی یہ موضوع خاص طور پر مدنظر رہا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کتب خانے میں ہندوستان کی فارسی تصانیف اور ہندوستان میں کتابت شدہ قلمیات کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ اس خاص وجہ سے پروفیسر عبدالغنی صاحب کی کتاب ان کے نزدیک حسن استقبال کی مستحق تھی، مگر ہمارے فاضل نقاد کے ناوک تنقید نے اس "مرغ قبلہ نما" کو بھی سلامت نہ چھوڑا۔ کتاب کی غلطیوں کی چن چن کر اصلاح کی مگر حسب معمول تخریبی اصلاحی پہلو کے ساتھ ساتھ تعمیری کام بھی کیا ہے۔ پروفیسر عبدالغنی نے ایک موقع پر محض چند فارسی شاعروں کے کلام کی بنا پر ہندوستان کا ایران پر تفوق جتایا ہے مگر پروفیسر شیرانی لکھتے ہیں:

"ہمیں تعجب آتا ہے کہ شمس العلما چند شعرا کے نام پیش کر کے ان کی بنا پر ہندوستانی

شعرا کی ایرانی شعرا پر فضیلت کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ حالاں کہ جو امور فارسی کے میدان میں ہندیوں کو ایرانیوں پر تفوق دے سکتے ہیں انھی کو پروفیسر نے پس پشت ڈال دیا ہے۔ مثلاً سب سے قدیم تذکرۂ شعرا اسی سرزمین میں تالیف ہوتا ہے۔ ایک جماعت شرح نگاروں کی ہے جس نے فارسی اساتذہ..... کے کلام کا مطالعہ کر کے اس پر شرحیں تیار کیں.....اس سے بھی اہم اور قیمتی کام فرہنگ نگاروں کا ہے.....فی الحقیقت ہم ہندیوں کے واسطے یہ بجا فخر کا موقع ہے کہ مغرور ایرانی خود اپنی زبان کے بارے میں ہمارا منت کش ہے۔" (رسالہ اردو جنوری 1943ء ص 101)

اس تبصرے کے دوران میں پروفیسر شیرانی نے ہندوستان کے فارسی مصنفوں اور شاعروں کی طویل فہرست پیش کی ہے جو شمس العلما کی کتاب میں مذکور نہیں۔ یہاں پہنچ کر ہمیں پھر افسوس کرنا پڑتا ہے کہ استاد مرحوم اپنے اس محبوب موضوع[4] پر بھی کوئی مستقل کتاب نہ لکھ سکے۔ وہ مجھ سے اکثر اس کا تذکرہ کیا کرتے تھے، مگر دوسرے موضوعوں نے فرصت نہ دی۔

اردو ادب اور زبان

اب میں فارسی ادب پر شیرانی صاحب کے کام کو خیر باد کہتے ہوئے اردو ادب میں ان کے کام کا تذکرہ کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں فاضل مرحوم کی تصانیف اور اہم مضامین کی فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے:

(1) "پنجاب میں اردو" (کتاب)

(2) حکیم قدرت اللہ قاسم کے تذکرے "مجموعہ نغز" کی تصحیح مع دیباچہ مبسوط

(3) بچوں کے نصاب کی کتابیں (رسالہ)

(4) "خالق باری" کس کی تصنیف ہے؟ (مضمون)

(5) "اردو" پر سلسلہ مضامین:

1- اردو زبان اور اس کے مختلف نام

2- فارسی تالیفات سے اردو زبان کے وجود کا ثبوت

3- اردو کے فقرے اور دوہرے.....فارسی تالیفات سے

4- اردو مغلوں کے دربار میں

5- اردو جہانگیر کے عہد میں

6- ہریانہ کے اردو ادب پر سلسلہ مضامین

7- "پرتھوی راج راسا" کی تنقید پر مضامین (اب کتاب کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں)

8- ملا دو پیازہ اور جعفر زٹلی کی مروجہ سوانح عمریوں کا جائزہ اور تنقید (مضمون)
9- دائرہ کے مہدویوں کا اردو ادب کی تعمیر میں حصہ (مضمون)
10- تنقید آبِ حیات مولانا محمد حسین آزاد (مضامین)
11- محمد شاہ کے عہد میں جنت فروشوں کا ہنگامہ۔ مخمس از بے نوا سنامی 5

پنجاب میں اردو

اردو زبان اور ادب کے بارے میں شیرانی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ ''پنجاب میں اردو'' کا نظریہ ہے۔ اس معاملے میں بھی وہ بعض دوسرے مسائل کی طرح ''بت شکن'' واقع ہوئے ہیں۔ اردو کی قدامت کے بارے میں یہ خیال مدت سے چلا آتا تھا کہ اس کی پیدائش شاہ جہاں کے زمانے میں ہوئی' لیکن شیرانی صاحب نے تاریخ اور زبان کی شہادتوں نے یہ ثابت کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے کہ اس کا زمانہ اس سے بہت پرانا ہے:

''ہم اردو کے آغاز کو شاہ جہاں یا اکبر کے دربار اور لشکر گاہوں کے ساتھ وابستہ کرنے کے عادی ہیں' لیکن یہ زبان اس زمانے سے بہت زیادہ قدیم ہے بلکہ میرے خیال میں اس کا وجود انہی ایام سے ماننا ہوگا جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں۔''

(مقدمہ ''پنجاب میں اردو'')

عربوں کے بعد شمال کی جانب سے مسلمان حملہ آوروں نے سب سے پہلے پنجاب کو اپنا مرکز بنایا۔ اس بنا پر اردو زبان کا پہلا گہوارہ پنجاب ہی ہونا چاہئے اور یہی شیرانی صاحب کی تحقیق ہے۔ اس کے ابتدائی نقوش پنجاب ہی میں قائم ہوئے' اس کے بعد جب فاتحین کی فوجیں دہلی کی طرف بڑھیں تو وہ اپنے ساتھ پنجاب سے ایک ایسی زبان لے گئیں جو مخلوط قسم کی تھی۔ یہ زبان دہلی سے ہندستان کے گوشے گوشے میں پھیلی اور ہر جگہ مختلف ناموں سے پکاری گئی' کہیں دکنی' کہیں گجراتی' کہیں دہلوی کہلائی' مگر شیرانی صاحب کے بقول یہ یاد رہے کہ:

''اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی میں جاتی ہے۔''
''جس زبان سے اردو ترقی پاتی ہے وہ نہ برج ہے نہ ہریانی' نہ قنوجی بلکہ وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی''۔ ''ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اپنی صرف ونحو میں ملتانی زبان کے بہت قریب ہے''۔ ''پنجابی اور اردو میں ساٹھ فیصدی الفاظ کا اشتراک ہے۔''

شیرانی صاحب سے پہلے بھی بعض لوگ مثلاً پنڈت کیفی اور سرخوش (مصنف ''اعجاز سخن'') پنجاب کو

اردو کا اوّلیں مولد قرار دے چکے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان صاحبوں نے محض قیاس اور طباعی سے کام لیا ہے۔ شیرانی صاحب پہلے مورخ ہیں جنھوں نے زبان کے قواعد اور خصائص کے اشتراک کو سامنے رکھ کر اردو پر پنجاب کے اوّلیں اثرات کا سراغ لگایا ہے۔

''پنجاب میں اردو'' کا نظریہ جب پہلی مرتبہ علمی حیثیت سے ادبی دنیا کے سامنے پیش ہوا تو اس پر طرح طرح کے اعتراضات ہوئے۔ خصوصاً اس گروہ کی جانب سے جو گنگ وجمن کی وادیوں کو اردو کی جنم بھومی قرار دیتا ہے مگر آخرکار شیرانی صاحب کے لسانیاتی شواہد اور تاریخی استدلال نے دلوں میں تصدیق کی کیفیت پیدا کر دی۔ گو زبانیں اس کے اقرار سے اب بھی منکر ہیں۔ پروفیسر گراہم بیلی نے اپنی تصنیف ''تاریخ ادبِ اردو'' میں اس نظریے کی تائید کی ہے اور دوسرے اہلِ علم بھی آہستہ آہستہ اس نقطۂ نگاہ کے قریب آتے جاتے ہیں۔

''پنجاب میں اردو'' کا ردِعمل ایک دوسری صورت میں بھی ظاہر ہوا۔ مختلف صوبوں میں ایک جوابی عصبیت نمودار ہوئی۔ دکن میں اردو، گجرات میں اردو، بہار میں اردو کی طرح کے عنوان اس کا پتہ دیتے ہیں، مگر اہلِ علم جانتے ہیں کہ ''پنجاب میں اردو'' کو جو بات نصیب ہوئی وہ دوسروں میں سے کسی کے حصے میں نہ آئی۔

پروفیسر شیرانی نے مذکورہ کتاب میں ہریانہ کے اردو ادب کا خاص تذکرہ کیا ہے۔ یہ ادب ہریانہ کے علاقے میں ایسے زمانے میں پھلا پھولا نظر آتا ہے، جب کہ دہلی میں ابھی فارسی کے چرچے تھے اور دکن کے ادب سے دہلی ابھی متاثر نہ ہوئی تھی۔ انھوں نے ہریانی ادب کی بہت سی تصانیف جمع کیں اور ان کے مضامین کا سیر حاصل تجزیہ کیا۔ ہریانوی ادب پر اس کتاب سے الگ بھی انھوں نے مضامین لکھے۔ (جیسا کہ گذشتہ صفحات میں پیش کردہ فہرست سے ظاہر ہوگا)۔

اُردو اور ریختہ

شیرانی صاحب نے اپنے مضمونوں میں کچھ اور بھی نئی باتیں پیدا کی ہیں جو اردو زبان اور ادب کے سلسلے میں ہماری معلومات میں بڑا انقلاب پیدا کرنے والی ثابت ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک ''ریختہ'' کا معنی ہے۔ ریختہ کے بہت سے معنی کیے جاتے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی تسلی بخش نہیں۔ شیرانی صاحب نے ریختن بہ معنی موزوں کرنا اور ڈھالنا بتایا ہے۔ اس سے مصرع موزوں اور معنی موزوں:

> ''آخری معنی کے اثرات میں ریختہ نے ساتویں قرن ہجری میں ہندوستانی میں نئے معنی پیدا کر لیے..... ریختہ موسیقی کی بھی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو فارسی خیال ہندوی کے مطابق ہو اور جس میں دونوں زبانوں کے سرود ایک تال اور ایک راگ میں بندھے ہوں اس کو ریختہ کہتے ہیں..... کچھ عرصے کے بعد

ریختہ نے موسیقی سے نکل کر عمومیت حاصل کر لی اور اس کا اطلاق ایسے کلام منظوم پر ہونے لگا جس میں دو زبانوں کا اتحاد ہو..... شروع شروع میں ریختہ نظم کے ساتھ مخصوص ہے۔ ریختہ سے مراد اگرچہ ولی اور سراج کے ہاں نظم اردو ہے، لیکن دہلویوں نے بالآخر اس کو زبان اردو کے معنی دے دیئے۔"

شیرانی صاحب نے لفظ اردو کی بھی بڑی تحقیق کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ:

"لفظ اردو قرن سابع ہجری کے خونیں واقعات کی یاد ہمارے دل میں تازہ کر دیتا ہے۔ جب سنہ 617 ہجری میں چنگیزی لشکروں نے قراقرم سے خروج کر کے اور مختلف دستوں میں تقسیم ہو کر دنیا کی فتح کا بیڑا اٹھایا تھا.....اس کے بعد لفظ اردو ایشیا اور یورپ کی مختلف زبانوں میں رائج ہو جاتا ہے۔ یہ لفظ اصل ترکی میں مختلف شکلوں میں ملتا ہے یعنی اوردا، اوردہ، اوردو اور اردو جس کے معنی فرودگاہ، لشکر اور پڑاؤ نیز لشکر اور حصہ لشکر کے ہیں.....نیز بہ معنی خیمہ، بازار لشکر، حرم گاہ، محل و محل سرائے شاہی اور قلعہ....."

لفظ اردو کی تحقیق شیرانی صاحب نے اپنے ایک مضمون "اردو زبان اور اس کے مختلف نام[6]" میں کی ہے اور ہر عہد میں اس کے معنی اور مفہوم کو شواہد کے ذریعے متعین کیا ہے۔ ہندستان میں عہد مغلیہ میں شاہی لشکر اور شاہی فرودگاہ کے معنے میں مستعمل ہے۔ "اردوے ظفر قرین" کے سکے کی بحث بہت دلچسپ ہے۔ اس کے بعد قاضی اردو، اردو بیگی یا اوردہ بیگی، اردو کا مندر، اردو بازار کی تشریح ہے۔ زبان کے معنی میں اردو کا استعمال شیرانی صاحب کی تحقیق کی رو سے پہلی مرتبہ خانِ آرزو کی تصانیف خصوصاً "نوادر الالفاظ" اور "مثمر" میں ہوا ہے۔ اس کا اطلاق اس زبان پر ہوا ہے جو قلعہ معلی سے متعلق ہے۔ اس لحاظ سے خاص شہر دہلی کی زبان اور قلعہ معلی کی زبان میں بھی فرق ظاہر کیا ہے۔

اردو کی قدامت

اردو کی قدامت کے سوال پر پہلے بحث ہو چکی ہے۔ اس پر اتنا اضافہ اور کیا جاتا ہے کہ شیرانی صاحب نے اردو کی قدامت ثابت کرنے کے لیے البیرونی کی عربی کتابوں کے علاوہ ہندوستان کی فارسی کتابوں سے ہندی محاورے اور ترکیبوں کی ایک طویل فہرست نکالی ہے، جس سے مختلف زمانوں میں اردو کی تدریجی ترقی کا پتا چلتا ہے۔ ہندی نژاد مصنف اپنی فارسی کتابوں میں ٹھیٹھ ہندی محاوروں کے ترجمے کرتے نظر آتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ اسی وقت ایک ایسی زبان وجود میں آ رہی تھی جسے ہندی سے ممیز نام "اردو" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس غرض سے شیرانی صاحب نے ہندستان کے فارسی ادب کی بیسیوں کتابیں دیکھی ہیں۔ ان کی یہ جستجو اور محنت حیرت انگیز ہے۔

نصاب کی کتابیں

اس ضمن میں شیرانی صاحب نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ نویں صدی ہجری میں دیسی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کی تحریک خاص طور پر نمایاں ہوئی۔ اس کا اظہار فارسی' عربی' ہندی نصابوں کی صورت میں ہوا۔ اس زمانے میں بہت سے ایسے فرہنگ لکھے جاتے ہیں جن سے مقصود بچوں کو دیسی زبان کے ذریعے فارسی پڑھانا تھا۔ اس موضوع پر "بچوں کے تعلیمی نصاب" کے عنوان سے ایک طویل اور مفصل مضمون انہوں نے لکھا جو حسب معمول ان کی عالمانہ اور محققانہ تلاش اور تحقیق کا عمدہ نمونہ ہے (روداد ادارہ معارف اسلامیہ منعقدہ اپریل 1933ء)۔

خالق باری

نصابوں کی بحث میں "خالق باری" کی تحقیق خاص ذکر کے قابل ہے۔ یہ کتاب امیر خسرو کی تصنیف سمجھی جاتی تھی' مگر پروفیسر شیرانی کے تنقیدی مطالعے نے یہ بات ظاہر کی کہ اس میں کئی باتیں ایسی ہیں جو زمانی اور لسانی لحاظ سے امیر خسرو کی طرف منسوب نہیں ہو سکتیں اور اب یہ راز کھلا کہ یہ کتاب کسی خسرو شاہ کی لکھی ہوئی ہے جو امیر خسرو سے مختلف اور بہت بعد کا آدمی ہے۔

پرتھی راج راسا

شیرانی صاحب نے "پرتھی راج راسا" کا بھی ناقدانہ مطالعہ کیا ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ ہندی کے قدیم ترین نمونے دستیاب نہیں ہوتے۔ ہندی ادب کے بعض مورخ "پرتھی راج راسا" کو غوری عہد کی چیز کہہ کر چند بردائی نام شاعر کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ پروفیسر شیرانی نے جس زمانے میں "پنجاب میں اردو" لکھی تھی اس وقت ہی انہیں اس انتساب کی صحت پر یقین نہ تھا۔ اس کے بعد جب انہوں نے اس کے مضامین پر غائر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس کے اوراق میں بعض ایسی چیزوں کا ذکر ہے جو عہد مغلیہ سے یا اس کے بعد کے زمانے سے متعلق ہیں۔ اس تحقیق کے نتائج اب کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔

تنقید آبِ حیات

اب صرف "تنقید آب حیات" کا ذکر باقی ہے۔ یہ تنقید مکمل نہیں۔ اردو کے تنقیدی ادب میں بہت قیمتی اضافہ ہوتا اگر پروفیسر شیرانی اس کام کو تکمیل تک پہنچا سکتے۔ افسوس کہ موت کے بے پناہ ہاتھ نے اس سلسلے کو جلد منقطع کر دیا۔ "آب حیات" کی تنقید انہوں نے اپنی زندگی کے آخری دور میں شروع کی تھی۔ یہی وجہ

ہے کہ اس میں وہ جوش اور جامعیت موجود نہیں' جو"تنقید شعر العجم" میں نظر آتی ہے۔ وجہ کچھ تو ضعف طبیعت اور قوتوں کا انحطاط ہے اور کچھ حسن عقیدت' چنانچہ خود کہتے ہیں:

"راقم آب حیات کے تنقید نگاروں میں بادل ناخواستہ شامل ہوا ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ میں غلط صف میں اپنے آپ کو کھڑا دیکھتا ہوں..... مولانا کے ساتھ میری عقیدت دائمی ہے....." (اورینٹل کالج میگزین اگست' 1941ء)

"آب حیات" کے عام نکتہ چینوں کے متعلق فرماتے ہیں: "یہ بزرگ بھول گئے کہ آج سے ساٹھ سال قبل جب آب حیات تالیف ہوئی ہے' ذرائع معلومات نہایت محدود تھے۔"

حقیقت شاید یہ ہے کہ "شعر العجم" کی تنقید میں جو تند و تیز لہجہ شیرانی صاحب نے اختیار کیا تھا' اس پر ملک کے بعض حلقوں میں لے دے ہوئی تھی۔ اب "آب حیات" پر جب قلم اٹھایا تو کچھ سنبھل کر اور اعتدال سے اٹھایا' تنقید کے آغاز میں معذرت کا حق ادا کیا ہے:

"مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں آج ان کے (مولانا آزاد کے) نکتہ چیں کی حیثیت سے آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔ میں اپنی گستاخ روی اور گستاخ تنقید کی ان کی روح سے معافی مانگتا ہوں۔ اگرچہ ندامت گویا ہے ۔

عذر تقصیر ہے تقصیر سے بدتر تقصیر

اس عقیدت اور معذرت کے باوجود شیرانی صاحب کے ناقدانہ احتساب نے "آب حیات" کی لغزشوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ جہاں جہاں انگلی رکھنے کی جگہ ملی ہے' انہوں نے اس کا صاف صاف اظہار کیا ہے۔ تنقید کا تعمیری پہلو اس میں بھی نمایاں ہے۔ چنانچہ بہت سی نئی باتیں اور تازہ معلومات اس کے مطالعے سے حاصل ہوتی ہیں۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو "شعر العجم" کی طرح "آب حیات" آزاد بھی عیوب اور اغلاط سے پاک ہو جاتی۔

کتب خانہ

ناظرین کرام! میں نے اس مقالے میں شیرانی صاحب کے علمی کام کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ اس پر اضافہ ہو سکتا ہے مگر تطویل موجب کلفت ہوگی۔ ہاں اشارۃً یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ مرحوم ایک عظیم الشان کتب خانے کے مالک تھے' جس میں قلمی اور مطبوعہ کتابیں' فرمان اور دستخطی تحریریں پانچ سات ہزار سے متجاوز تھیں۔ یہ کتب خانہ اب پنجاب یونیورسٹی نے خرید لیا ہے۔ میں نے اس کے نوادر پر ایک مضمون لکھا ہے جو "اورینٹل کالج میگزین" (کے غالباً اگست نمبر) میں اسی سال شائع ہوگا۔ کتابوں کے علاوہ قدیم سکوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ شیرانی صاحب نے جمع کیا تھا۔ اس میں بھی جمع آوری کا اصول یہ تھا کہ صرف وہ سکے جمع کیے

ہیں، جن سے کوئی تاریخی عقدہ حل ہوتا ہو (ان کے مسکوکات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اورینٹل کالج میگزین 1934ء)۔

شیرانی صاحب کی کچھ کتابیں انجمن ترقی اردو نے چھاپی ہیں۔ اس کے لیے انجمن ہمارے شکریے کی مستحق ہے۔ امید ہے کہ ان کی باقی کتابوں کو بھی زیورِ طباعت سے جلد آراستہ کیا جائے گا۔

حواشی:

1- اورینٹل کالج میگزین، فروری 1940ء

2- پروفیسر شیرانی صاحب نے تاریخ ادب فارسی کی اس غلطی کی بھی اصلاح کی کہ دیوان معینی جو شیخ معین الدین اجمیری کی طرف غلط طور پر منسوب ہے، دراصل ایک دوسرے صوفی شاعر معین کا ہے۔ یہاں بھی اسلوب اور زبان کی خصوصیات سے رہنمائی حاصل کی گئی ہے۔ اسی طرح شیخ فریدالدین عطار کی طرف بعض مثنویات مثلاً "مظہر العجائب" اور "لسان الغیب" کا غلط طور پر انتساب ہوا ہے۔ اس کی بھی اندرونی شہادتوں سے تردید کی ہے۔ "خالق باری" امیر خسروؒ کی طرف منسوب چلی آتی تھی۔ اس کو بھی بے اصل قرار دیا ہے۔ اسی طرح "پرتھی راج راسا" غوری عہد کے ایک شاعر چند بردائی سے وابستہ کی جاتی تھی مگر محقق شیرانی کی گہری نظر نے یہ نکتہ ڈھونڈ نکالا کہ اس کتاب میں بعض ایسی باتیں اور واقعات درج ہیں جن کا تعلق مغلیہ عہد سے ہو (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو پروفیسر شیرانی کی کتاب "پرتھی راج راسا" مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند)

3- شیخ فریدالدین عطار اور حکایت سلطان محمود (اورینٹل کالج میگزین، فروری 1925ء)

4- اس سلسلے میں چند مضامین سپردِ قلم بھی ہوئے مثلاً منیر لاہوری (اورینٹل کالج میگزین مئی 1927ء) صلائی (ایضاً فروری 1935ء) مخدوم بہاءالدین برناوی (ایضاً اگست 1927ء)

5- یہ سب مضامین "اورینٹل کالج میگزین" میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔

6- اورینٹل کالج میگزین، مئی 1939ء

(در: اردو، اکتوبر 1946ء، ص 405-432)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

حافظ محمود شیرانی

.....مرحوم [حافظ محمود خاں شیرانی] فارسی اور اردو دونوں زبان کی شعر و شاعری اور تاریخ ادب کے نامور محقق اور فاضل تھے۔ ذکاوت و لطافت کے ساتھ قوت حافظہ غیر معمولی تھی۔ قرآن مجید کے حافظ تھے ہی فردوسی کا "شاہنامہ" بھی انہیں از بر یاد تھا۔ یورپ میں ایک مدت تک رہ چکے تھے اور وہاں کے نامور مستشرقین سے روابط رکھتے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کی قلمی کتابوں اور مختلف قدیم اسلامی سلطنتوں کے سکوں کو جمع کرنے کا بڑا شوق تھا اور وہ علمی تحقیق و جستجو کے میدان میں ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے تھے۔ فارسی اور اردو زبان کے شعراء کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکروں اور ان کے مجموعہ ہائے کلام پر ان کی نظر بہت گہری اور وسیع تھی۔ اس کے علاوہ اسلامی تاریخ اور علم عروض میں بھی بڑا درک رکھتے تھے۔ 1920ء میں پنجاب یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ بیس سال تک اس خدمت پر مامور رہنے کے بعد 40ء میں اس سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن ٹونک میں خانہ نشین ہو گئے۔ اس مدت میں آپ نے بحیثیت نقاد ہندوستان کے علمی اور ادبی حلقوں میں غیر معمولی شہرت پائی۔ اس شہرت کا آغاز اس مقالہ سے ہوا جو "تنقید شعر العجم" کے نام سے انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ "اردو" میں کئی سال تک مسلسل نکلتا رہا تھا اور جو اب اسی نام سے کتابی شکل میں چھاپ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آب حیات آزاد، ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب، رباعی کے اوزان وغیرہ پر جو آپ کے تنقیدی مقالات "اورینٹل کالج میگزین" لاہور اور دوسرے رسائل میں شائع ہو چکے ہیں ان میں سے ہر ایک مقالہ معلومات اور تحقیق و ژرف نگاہی کے اعتبار سے فارسی اور اردو ادبیات کے طالب علم کے لیے انمول موتیوں کا ایک خزانہ ہے۔ مستقل تصنیفات میں "پنجاب میں اردو" "فردوسی پر چار مقالے" "پرتھی راج راسا" اور "خالق باری" آپ کے قابل قدر علمی یادگاریں ہیں۔ تنقید کرتے وقت مرحوم کے لب و لہجہ میں کہیں کہیں درشتی اور تلخی ضرور آ جاتی تھی جو بعض مواقع پر کسی ذاتی یا طبقاتی پرخاش کی غمازی کرتی تھی تاہم بحیثیت مجموعی انہوں نے اردو زبان میں فن تنقید کا معیار اتنا اونچا کر دیا کہ مغرب کے ارباب تنقید بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

مرحوم جنھوں نے اپنی تنقید سے بڑے بڑے ارباب تحقیق مصنفوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا، خود ایک عرصہ سے ضیق النفس کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ آخر یہ مرض ان کی جاں لے کر ہی رہا۔ حق تعالیٰ ان کو اپنی رحمتوں سے نوازے اور دامانِ مغفرت میں چھپا لے۔ آمین

(برہان۔ مئی 1946ء ص 259-260)

ڈاکٹر محمد باقر

حافظ محمود شیرانی

(میرے استاد)

(اس سلسلے میں ڈاکٹر باقر کے دو مضامین ''مخزن'' میں پہلے چھپ چکے ہیں۔ پہلا مضمون ڈاکٹر ٹامس گریہم بیلی کے متعلق تھا اور دوسرا سرڈینی سن راس کے متعلق۔ اپنے مغربی اساتذہ کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنے مشرقی معلمین کی طرف توجہ کی ہے۔ مضامین ماسبق کے مقابلے میں پیش نظر مضمون قدرتاً استاد اور شاگرد کے تعلقات کا وہ تصور پیش کرتا ہے جو ہمیں صرف مشرقی روایات میں مل سکتا ہے۔............مدیر)

''کون؟''

''باقر!''

جہاں ریلوے روڈ اور فلیمنگ روڈ ملتی ہیں' لاہور والے اس کو ''برف خانے کا چوک'' کہتے ہیں۔ اس چوک سے فلیمنگ روڈ پر چلتے ہوئے آپ مشرق کی سمت تیس چالیس گز جائیں تو بائیں ہاتھ کو لکڑی کا ایک بڑا دروازہ نظر آئے گا جو شکل کے لحاظ سے لاہور کے قلعے کے پرانے دروازوں سے ملتا ہے' لیکن ان سے بہت چھوٹا ہے۔ لاہور میں یہ دروازے عام طور پر کٹڑوں کو بند کرنے کے لیے لگائے جاتے تھے' لیکن اب کٹڑے نہیں رہے تو یہ دروازے بھی تعداد میں کم ہو رہے ہیں۔ اس دروازے سے اندر داخل ہوں تو سامنے ایک وسیع میدان نظر آتا ہے جس کے گرداگرد سہ منزلہ مکان بنے ہوئے ہیں۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی دائیں طرف گھوم جائیں تو ایک تین چار گز لمبی گلی ملتی ہے جس کے کونے والے مکان کے سامنے کھڑا ہو کر میں ہر چند لمحوں کے بعد دروازے کی کنڈی کھٹکھٹا دیتا تھا اور کنڈی کھٹکھٹا کر پھر کود کر دہلیز سے الگ ہو جاتا تھا کیونکہ برابر کے مکان کے عقبی پرنالے سے پانی گر رہا تھا جس سے بچنے کے لیے دروازے سے ہٹنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ اس پانی کی بو بھی ناقابل برداشت تھی۔ گرمیوں کے موسم میں یہ بو تعفن کی شکل اختیار کر لیا کرتی تھی۔ ایک دفعہ جو میں نے کنڈی زور سے کھٹکھٹائی تو کسی نے تیسری منزل سے جھانک کر کہا۔ ''کون؟''
میں نے منہ آسمان کی طرف کر کے اپنا نام بتایا' لیکن پیشتر اس کے کہ میں دیکھ پاتا' پکارنے والا پیچھے

ہٹ گیا اور پھر " کالے خاں کالے خاں " کی پکار سنائی دی۔ میں منتظر تھا کہ کوئی سیاہ فام ملازم ابھی آ کر مجھے کچھ جواب دے گا۔ پھر طویل سیڑھیوں پر سے اترنے کی آواز آتی رہی اور ایک خوشرو گورے چٹے نوجوان نے آ کر کہا۔

" بابا آپ کو اوپر بلاتے ہیں۔ " اور ساتھ ہی اس نے سیڑھیوں پر چڑھنے کی دعوت ہاتھ کے اشارے سے دی۔ تنگ اور تاریک سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا ایک تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر میرا یہ گورا رہبر کالے خاں ہی تو ہے تو اس کو کالے خاں کیوں کہتے ہیں اور دوسرے یہ کہ اگر بابا نے مجھے اسی منزل پر بلایا ہے جہاں سے انہوں نے جھانکا تھا تو وہاں پہنچتے پہنچتے آدمی ہلکان ہو جائے گا۔ پہلی بات کا جواب تو مجھے آج تک نہیں مل سکا' لیکن دوسری تشویش جلد ہی رفع ہو گئی۔ جب کالے خاں نے دوسری منزل پر پہنچتے ہی مجھے ایک کمرے میں داخل ہونے کے لیے کہا۔ اس کمرے میں پختہ اینٹوں کا فرش تھا اور بازار کی جانب پانچ چھ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ ان کھڑکیوں کے ساتھ ایک پلنگ لگا ہوا تھا جس کے سرہانے گاؤ تکیہ رکھا ہوا تھا۔ اس تکیہ سے ٹیک لگا کر بابا آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سلام عرض کیا۔ پلنگ کے سامنے دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ بابا نے کہا " تشریف رکھئے " اور میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چھوٹے قد کا ایک گہرے گندمی رنگ کا سفید بالوں والا آدمی بنیان پہنے اور تہ بند باندھے پلنگ پر خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ بابا کچھ دیر تک اس پنکھے کو لاابالیانہ انداز میں ہلاتے رہے جو ان کے پاس پڑا ہوا تھا۔ پھر میری طرف بڑھا کر بولے۔

" لیجیے۔ "

میں نے شکریہ ادا کر کے پنکھا لے لیا۔

منڈی ہوئی داڑھی اور سفید تیتری کے مانند چھوٹی مونچھوں پر چند لمحوں میں پسینہ کے قطرے نمودار ہونے لگے۔ میں نے پنکھا پھر آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ " آپ لیجیے' آپ بھی تو گرمی محسوس کر رہے ہیں۔ "

باب نے پنکھے کی طرف توجہ کیے بغیر ایک " ہونہہ " کے بعد پوچھا۔ " آپ کیسے آئے ہیں؟ "

" شیرانی صاحب! میں آپ کا شاگرد ہوں۔ آج ہی ایم اے میں داخل ہوا ہوں۔ "

" ہونہہ! " اور پھر ایک طویل وقفے کے بعد بولے " کچھ لکھنے پڑھنے کا شوق ہے؟ "

میں نے عرض کیا۔ " کوشش تو کرتا ہوں۔ "

" اچھا تو کل کالج میں ملیں گے۔ " مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے انہیں میری بات کا یقین نہ آیا ہو۔ میں کچھ دیر اور بیٹھا رہا اور پھر سلام کہہ کے اینٹوں کے فرش اور تاریک سیڑھیوں سے گزرتا ہوا واپس چلا آیا۔

فلیمنگ روڈ سے یونیورسٹی اورینٹل کالج کے وولنر ہوسٹل تک پہنچتے ہوئے ایک عجیب قسم کی الجھن دامنگیر رہی۔ " پنجاب میں اردو " اس وقت تک شائع ہو چکی تھی۔ یہ 1932ء کا ذکر ہے جب میں اورینٹل کالج میں ایم اے میں آ کر داخل ہوا تھا۔ شیرانی صاحب کی تصنیف " پنجاب میں اردو " سے دنیائے اردو میں ایک ہنگامہ برپا تھا اور میں طالب علمی کے زمانہ میں اکتسابی نقطۂ نگاہ سے اسے دیکھ چکا تھا۔ خیال یہ تھا کہ ایسے خشک

موضوع پر اس قدر خوشگوار تصنیف کی تخلیق کرنے والا آدمی اگر بہت زیادہ ملنسار نہیں تو کم از کم زاہد خشک نہیں ہوگا۔ بالخصوص جب کہ میں عقیدت بھرے دل کو لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو یہ توقع ضرور تھی کہ اس ملاقات میں رسمی تعارف کے بعد کچھ غیر رسمی باتیں بھی ہوں گی' لیکن شیرانی صاحب نے کچھ اس قسم کی بے تعلقی اور بے نیازی کا اظہار کیا کہ مجھے اپنی جرأت پر پشیمانی ہونے لگی۔ یہ شیرانی صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ میرا اندازہ کس قدر غلط تھا۔

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ جس قدر غیر دلچسپ اور غیر مفید ہے' اتنا شاید دنیا کے کسی علمی ادارے میں نہیں۔ غیر دلچسپ تو اس لحاظ سے کہ السنہ شرقیہ کی تعلیم کچھ اس بے جان اسلوب پر کی جا رہی ہے کہ اس عظیم الشان درس گاہ میں بیشتر طالب علم زبان سے کوئی دلی لگاؤ ہونے کے بغیر صرف سند لینے کے لیے آ جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ لوگ نصاب کے ترجموں کو حفظ کرنے پر ہی تمام وقت صرف کر دیتے ہیں اور اس کالج میں ایسے معاشرتی مجمع شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں جہاں لوگ جمع ہو کر زبانوں کے افادی اور لطیف پہلوؤں پر بھی غور کر سکیں' حالانکہ اس کالج سے متعلق یونیورسٹی کا السنہ شرقیہ کا کتاب خانہ ہی ایسا گراں بہا اور نادر علمی اور ادبی ذخیرہ ہے جس کے گرد ہزاروں ہنگامے برپا کیے جا سکتے ہیں۔ غیر مفید میں نے اس لیے کہا ہے کہ تمام دنیا میں کسی زبان کو سیکھنے کا جو اولیں مقصد متمدن دنیا نے قائم کیا ہے' وہ یہاں قطعاً پورا نہیں ہو رہا۔ زبان کے افادی پہلو کو چھوڑ یے۔ اس درسگاہ سے عربی اور فارسی کی اعلیٰ اسناد حاصل کرنے والے طالب علم ان زبانوں میں نہ تو گفتگو کر سکتے ہیں اور نہ آسانی سے ان زبانوں کو لکھ پڑھ ہی سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ڈگری لینے کے بعد ان لوگوں کا زبان سے قلبی تعلق بہت جلد ختم ہو جاتا ہے اور وہ سارا قومی وقت' روپیہ اور سعی جو اس کام پر صرف ہو رہی ہے' بالکل ضائع ہو جاتی ہے۔ میں نے چند دنوں میں صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا کہ اس درسگاہ کے غیر دلچسپ اور غیر مفید ہونے کے باوجود اس میں کوئی خوبی ضرور ہے جو لاکھوں روپے یونیورسٹی اس پر خرچ کر رہی ہے۔ ایک جواب تو مجھے بہت جلد مل گیا اور وہ یہ تھا کہ اس درسگاہ کے شعبہ فارسی عربی میں تین ایسے ٹھوس کام کرنے والے اور کلاسیکی قسم کے استاد موجود تھے جن کے نام علم و فضل اور عمق نظر کے اعتبار سے دنیا کی کسی یونیورسٹی کے اساتذہ کے مقابلے میں فخر کے ساتھ پیش کیے جا سکتے تھے۔ ان میں سے پہلا نام عربی کے استاد پروفیسر محمد شفیع کا ہے۔ دوسرے دو بزرگ میرے استاد ڈاکٹر شیخ محمد اقبال اور حافظ محمود شیرانی تھے۔ میں جب ان دنوں کے اورینٹل کالج کا تصور اپنی آنکھوں کے سامنے لاتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پنجاب یونیورسٹی کی دنیائے تعلیم و تعلم میں یہ صاحب فضیلت بزرگ تین ٹھوس ستونوں کی طرح تھے جن پر ہماری مشرقی زبانوں کی عمارت کھڑی ہوگئی تھی۔ اس احساس کے وجوہ کی تفصیل بیان کروں تو آپ شاید اکتا جائیں۔ بہر صورت میں نے جلد ہی یہ بھانپ لیا کہ اس کالج سے ایم اے پاس کرنا تو ایک ضمنی شغل ہونا چاہیے۔ اصل مقصد علم و فضیلت کے پہاڑوں سے فیض یاب ہونا ہوگا' بشرطیکہ حالات مساعدت

کریں۔ پروفیسر محمد شفیع ان دنوں عربی کے استاد تھے اور وائس پرنسپل بھی تھے۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال شعبہ فارسی کے صدر تھے اور شیرانی صاحب ایم اے کے طلبہ کو نظم کا پرچہ پڑھایا کرتے تھے۔

دوسرے دن شیرانی صاحب سے کالج میں ملاقات ہوئی۔ نظم کی تدریس کا آغاز نظیری کی غزلوں سے ہوا۔ شیرانی صاحب نے ایک سکھ طالب علم سے غزل پڑھنے کے لیے کہا۔ اس نے ایک شعر کچھ اس انداز سے پڑھا کہ ہم سب ہنس پڑے۔ شیرانی صاحب ایک ''ہونھ'' کہہ کر زیر لب مسکرائے اور پھر سرور نیازی کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''نیازی صاحب آپ پڑھیے۔'' سرور (آج کل ریڈیو پاکستان میں سٹیشن ڈائریکٹر ہیں) ہاتھ میں زخمہ لیے ہوئے اس کو انگلی پر چڑھانے اور اتارنے میں مصروف تھے۔ آپ نے کتاب کھولے بغیر کہا۔ ''شیرانی صاحب! اس میں پڑھنے کی کون سی بات ہے۔ اگر کچھ تھی تو وہ سردار صاحب پڑھ چکے ہیں۔'' اس پر جماعت نے پھر قہقہہ لگایا۔ سرور کے تعلقات شیرانی صاحب سے بہت پرانے تھے، اس لیے وہ اکثر جماعت میں بھی بے تکلفی سے کام لیا کرتے تھے، لیکن اس دن شیرانی صاحب اس جواب سے بہت جزبز ہوئے اور ہم کسی نتیجے پر پہنچے اور نظیری کی غزل پڑھنے کے بغیر جماعت سے رخصت ہوئے۔

اگلی ملاقات پر ان واقعات کا اعادہ تو نہ ہوا، لیکن ایک بات واضح اور مستقل اثر کی طرح ذہن نشین ہوگئی کہ شیرانی صاحب سے پڑھنے کے لیے یا تو نظیری کے کلام کے محاسن و معائب اور معانی و مطالب سے کلی طور پر واقف ہونا ضروری ہے اور یا نظیری کو شیرانی صاحب سے سمجھنے کے لیے غیر معمولی زود فہمی کی ضرورت ہے۔ حالات یہ تھے کہ ہم میں سے بیشتر لوگ ان اوصاف سے متصف نہ تھے۔ شیرانی صاحب نظیری کا شعر سننے کے بعد کچھ اس انداز سے تبصرہ فرماتے اور علمی اور ادبی نکات کی طرف اشارے کرتے کہ ہمارے پلے کچھ نہ پڑتا اور ہم صرف حاضر باشی اور وقت گزارنے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس قسم کی درس و تدریس کے قائل ہی نہیں تھے جس کو انگریزی میں ''سپون فیڈنگ'' یعنی منہ میں نوالہ ڈالنا کہتے ہیں۔ وہ ایک جید عالم کی طرح نظیری، اس کے زمانے، اس کے ہم عصروں اور اس کے تاریخی ماحول کی طرف اشارے کرتے ہوئے یہ سمجھ کر آگے بڑھتے چلے جاتے کہ ہم سب کا ذہنی پس منظر ان کے افق ذہن کے مطابق ہے۔ حالانکہ ہم ان سے کوسوں پیچھے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ بحیثیت معلم کے شیرانی صاحب نے اپنے طالب علموں پر کبھی کوئی خوشگوار اثر نہ چھوڑا اور میری ذاتی رائے اُس وقت اور اب بھی یہی ہے کہ وہ درس و تدریس کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئے تھے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ چونکہ محض Researcher (محقق) کی حیثیت سے پروفیسر شفیع صاحب ان کو یونیورسٹی میں لانے کی کوئی سبیل پیدا نہ کر سکے، اس لیے وہ انہیں اردو کے استاد کی حیثیت سے یہاں لے آئے۔ حالانکہ یونیورسٹی میں شیرانی صاحب نے اردو کی تدریس کا کبھی کام نہیں کیا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ شفیع صاحب نے یونیورسٹی کی رسمی پابندیوں سے چھٹکارا پانے کا نہایت خوبصورت حل تلاش کیا اور پنجاب یونیورسٹی اور اردو زبان پر ایک ایسا احسان کیا جس کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا

جائے کم ہے۔ اگر شفیع صاحب شیرانی صاحب کو اردو کا لیکچرر بنا کر یونیورسٹی میں نہ لاتے اور فارسی کی تدریس کے بہانے ان کے وجود کا جواز ثابت نہ کرتے تو ممکن ہے کہ تحقیق و تفحص کا وہ عظیم الشان کام کبھی سرانجام نہ پاتا جو شیرانی صاحب اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔

دو چار ملاقاتوں کے بعد شیرانی صاحب نے ہم سے کچھ لکھنے کا تقاضا کیا۔ ایم اے کے بیشتر طالب علم اس کام سے جی چراتے تھے کیونکہ ہم میں سے اکثر محض زبان سیکھنے کے شوق سے تو کالج میں داخل ہی نہیں ہوئے تھے۔ تفصیل طویل ہوگی۔ صرف اتنا عرض کروں گا کہ ایک صاحب کسی دفتر میں کلرک تھے۔ ان سے ان کے کسی افسر نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ ایم اے کرلیں تو انہیں سپرنٹنڈنٹ بنا دیا جائے گا۔ ایک صاحب میونسپلٹی میں اوورسیئر تھے اور وہاں سے کچھ وقت کے لیے آجاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایم اے کرلیں تو شاید ترقی کی کوئی صورت نکل آئے۔ اور نہیں تو کم از کم یونیورسٹی کے ممتحن مقرر ہو جائیں گے۔ ایک صاحب (نام نہیں بتاؤں گا) کے ہونے والے خسر کا تقاضا تھا کہ وہ ایم اے کریں تو وہ انہیں ای اے سی کرا کے اپنی لڑکی کی شادی ان سے کر دیں گے۔ یہ کبھی کبھار آنکلتے تھے اور ان کے خسر صاحب بھی اس لیے ہمارے ساتھ داخل تھے کہ ہونے والے داماد کی نگرانی کرسکیں۔ ایک صاحب اس لیے اس جماعت میں داخل ہو گئے تھے کہ انہیں لاہور میں قیام گاہ کی ضرورت تھی اور ایک روپے ماہوار کرایہ میں اتنا صاف ستھرا کمرہ یونیورسٹی ہوسٹل کے سوا اور کہیں نہیں ملتا تھا۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ یہ سب لوگ کسی دن کچھ وقت کے لیے جماعت میں آجاتے تھے ورنہ مسلسل حاضری اور ادبی ہنگاموں سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ شیرانی صاحب نے جب تنقیدی مضامین لکھنے کے لیے کہا تو میں نے ایک مضمون خاقانی پر اور ایک نظامی گنجوی پر لکھا۔ اپنی بساط کے مطابق میں نے محنت کی اور ڈرتے ڈرتے دونوں مضمون شیرانی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیے۔ خیال یہ تھا کہ اور لوگ بھی مضمون لکھ کر لائے ہوں گے اور میں نے چونکہ فارسی زبان سکول یا کالج میں کہیں نہیں پڑھی تھی[1] بلکہ نجی طور پر منشی فاضل کر کے ایم اے میں داخل ہو گیا تھا' اس لیے قیاس یہ کہتا تھا کہ میرے مضامین دیگر طلبہ کی بہ نسبت ہلکے ہوں گے' لیکن ہوا یہ کہ اور کوئی صاحب مضمون لکھ کر ہی نہ لائے۔ میں نے دونوں مضمون جب شیرانی صاحب کے سامنے رکھے تو انہوں نے مضمون کے اوراق الٹتے ہوئے اور چشمہ کو ناک پر نیچے کی طرف پھسلاتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا:

''کچھ لکھنے پڑھنے کا شوق ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''میں نے تو آپ سے اس دن بھی عرض کیا تھا۔''

''ہونھ!'' ایک لطیف سی کھنکار کے بعد دریافت کیا۔ ''کس دن؟''

''جس دن میں آپ کے مکان پر حاضر ہوا تھا۔''

''اوہ! تو وہ آپ ہی تھے!''

گویا آپ کے ذہن سے یہ چیز بالکل خارج ہو چکی تھی کہ میں خاص طور پر آپ کے مکان پر آپ کی خدمت میں حاضر ہو چکا تھا۔ مجھے اب کے پھر کچھ صدمہ سا ہوا اور میں چپکا ہو رہا۔ شیرانی صاحب مضامین دیکھتے رہے اور پندرہ بیس منٹ کے جائزے کے بعد بولے۔

"محنت تو اچھی خاصی کی ہے۔"

میں نے دبی زبان سے کہا۔ "جی۔"

اس کے بعد آپ مزید آدھ گھنٹہ بالکل اسی طرح اشاروں میں باتیں کرتے رہے جیسے نظیری پڑھاتے وقت کیا کرتے تھے۔ میں کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا اور "جی ہاں" کہہ کر یا خاموش رہ کر وقت ٹالتا رہا۔ چلتے ہوئے کہنے لگے۔ "نظامی پر آپ کا مضمون تو اچھا رہا' لیکن خاقانی والا مضمون کچھ ہلکا ہے۔ اس پر مزید محنت کی گنجائش ہے۔ بہر صورت آپ دیکھ لیجئے۔ اگر مکمل ہو جائے تو اسے بھی کہیں چھپوا دیجئے۔"

میں رخصت لے کر چلا آیا۔ مضامین پر محنت کی گنجائش ضرور تھی' لیکن محنت کرنے کا شعور کسے تھا۔ شیرانی صاحب کی ہدایات تو ایسے اشارے تھے جن میں کوئی ربط پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے دونوں مضمون اٹھائے اور پنڈت دیا نرائن نگم کو "زمانہ" میں شائع کرنے کے لیے بھیج دیے۔ شیرانی صاحب کی دقتِ نظر کا احساس پہلی مرتبہ مجھے اس وقت ہوا جب چند دنوں کے بعد پنڈت جی نے مجھے خاقانی والا مقالہ یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ یہ شائع ہونے کے قابل نہیں اور نظامی گنجوی پر مقالہ آئندہ شمارے میں انہوں نے شائع کر دیا۔ مقالہ شائع ہوا تو میں ان کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا۔ کچھ دیر دیکھ کر بولے:

"کبھی کبھی آ جایا کیجئے۔"

یہ ایک ایسی اجازت تھی جو شاذ و نادر ہی اپنے طالب علموں کو دیا کرتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی تمام زندگی حقیقت شناس اور راست کرداری میں گزری تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جو لوگ محض امتحان پاس کرنے ایم اے میں داخل ہوتے ہیں اور زبان اور ادب سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی' وہ خواہ مخواہ ان کے پاس آ کر یاوہ گوئی میں ان کا اور اپنا وقت کیوں ضائع کریں۔ رواج یہ تھا کہ ایم اے کے تمام استاد ایم اے کے ممتحن بھی ہوتے تھے اور کبھی کبھی کچھ طالب علم کچھ استادوں کے نزدیک ہونے کی اس لیے بھی کوشش کرتے تھے کہ شاید اس سے امتحان میں کوئی فائدہ پہنچ سکے' لیکن شیرانی صاحب بیشتر طالب علموں سے کچھ اس بے اعتنائی سے پیش آتے کہ بلا وجہ کسی طالب علم کو ان کے نزدیک جانے کی جرأت ہی نہ ہوتی۔ حالانکہ بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ وہ ایک نہایت شفیق اور رحم دل استاد تھے اور اپنے پسندیدہ شاگردوں کو بچوں سے زیادہ عزیز جان کر ان کی زندگی کے ہر رخ میں دلچسپی لیتے تھے اور اپنی بساط کے مطابق ان کی مدد بھی کرتے تھے۔ میں صرف چند واقعات کے بیان پر اکتفا کروں گا۔

قانون یہ تھا کہ جو طالب علم منشی فاضل کا امتحان پاس کر چکا ہو وہ کالج میں چھ مہینے رہ کر ایم اے کا

امتحان دے سکتا تھا۔ ان چھ مہینوں (اکتوبر سے مارچ) کے عرصے کو یونیورسٹی ایک سال کی حاضری کے برابر شمار کر لیتی تھی۔ فروری کے اواخر میں ہم جب امتحان کی تیاری کے لیے کالج سے رخصت ہونے لگے تو میں نے خدشہ ظاہر کیا کہ شاید اس سال کافی تیاری نہ ہونے کی وجہ سے امتحان نہ دے سکوں۔ شیرانی صاحب میرا عذر خاموشی سے سنتے رہے' پھر بولے۔

''آپ کلاس میں تو نہایت باقاعدگی سے آتے رہے ہیں۔ اس وقت آپ کو یہ خدشہ کیوں لاحق ہو گیا ہے؟''

میں نے عرض کیا ''اس بہانے سے ایک سال اور آپ کی خدمت میں رہنے کا موقع مل جائے گا اور اگلے سال ایم اے کا ڈویژن بھی بہتر آ جائے گا''۔

آپ نے حسب معمول چشمہ ناک پر سرکاتے ہوئے اور شیشوں سے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پاگل نہ بنو۔ امتحان پاس کرنے کے بعد ساری عمر میرے گھٹنے سے لگے بیٹھے رہنا اور ڈویژن کی فکر نہ کرو' تمہارا ڈویژن اچھا آ ہی جائے گا۔ ایک سال اور بیکار کیوں ضائع کرتے ہو۔''

میں کچھ ہوں ہاں کر کے ہوسٹل میں چلا آیا اور امتحان کی تیاری میں مصروف ہو گیا اور اس بات کو معمولی سا واقعہ سمجھ کر بھول گیا۔ ایک ہفتہ بعد میں صبح مطالعہ کی تیاری میں مصروف تھا کہ کسی نے میرے دروازے پر دستک دی۔ میں نے کہا:

''تشریف لائیے۔''

شیرانی صاحب دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ میں تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا۔ میں نے کرسی آگے بڑھائی اور آپ اس پر بیٹھ گئے۔ آپ نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو میں سامنے پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت تک ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ آپ کو دمہ کا عارضہ لاحق ہے' اس لیے جب وہ کسی قسم کی جسمانی کوفت کے بعد بیٹھنے کے لیے رکتے تو میں ان کی آسائش کی خاطر چند لمحے خاموش بیٹھا رہتا حتیٰ کہ ان کی توانائی عود کر آتی۔ جس وقت وہ کرسی پر بیٹھے' ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے کیونکہ وہ کچھ فاصلہ طے کر کے آئے تھے اور کچھ سیڑھیاں بھی چڑھے تھے۔ ایسی حالت میں وہ کسی قدر ہانپنے بھی لگتے تھے۔ میں چپکا بیٹھا رہا حتیٰ کہ انہوں نے ترکی ٹوپی اتاری۔ پھر رومال سے پیشانی کا پسینہ صاف کیا اور پھر کھنکارتے ہوئے بولے۔

''پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟''

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کس چیز کے متعلق؟''

''آپ امتحان دینا چاہتے ہیں یا نہیں؟''

''جی ہاں! دینا چاہتا ہوں۔''

"تو پھر ٹھیک ہے نا؟"

"جی۔"

آپ نے پھر ترکی ٹوپی سر پر رکھ لی اور دروازہ کھول کر چلے گئے۔ میں تعظیم کی خاطر چند قدم پیچھے لپکا' لیکن آپ ہاتھ کے اشارے سے مجھے آگے بڑھنے سے روکتے ہوئے کالج کی طرف بڑھ گئے۔

اسی امتحان کے سلسلے میں ایک اور واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ جب داخلے کے فارم جانے لگے تو کالج نے بی اے کی ڈگری طلب کی جو میرے پاس نہ تھی۔ وائس پرنسپل شفیع صاحب نہایت سختی سے یونیورسٹی کی لگائی ہوئی اس شرط کے پابند تھے کہ جب تک طالب علم بی اے کی ڈگری نہ دکھائے' اس کے ایم اے کے داخلے کے فارم پر دستخط نہ کیے جائیں۔ ڈگری ملنے والی کانووکیشن پر میں کسی وجہ سے غیر حاضر تھا' اس لیے بی اے کی ڈگری مجھے نہیں ملی تھی اور اس کے بعد کاغذ کے اس پرزے کو حاصل کرنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی' اس لیے یونیورسٹی سے منگوائی بھی نہیں تھی۔ داخلہ بھیجنے میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا تو میں شفیع صاحب سے جا کر ملا اور فارم پر دستخط کرنے کی درخواست کی۔ یونیورسٹی کیلنڈر اور یونیورسٹی کا بھیجا ہوا نتیجہ دکھایا' لیکن آپ کی آئین پسند طبیعت نے کوئی عذر قبول نہ کیا اور میں مایوس ہو کر چلا آیا۔ اب سوال یہ تھا کہ ایک تو پندرہ بیس روپے جرمانہ ادا کر کے یونیورسٹی کو ڈگری کے لیے درخواست دی جائے اور دوسرے یہ کہ کسی طور یونیورسٹی سے ایک دن میں یہ ڈگری حاصل کی جائے۔ مالی زک اٹھانے کے لیے تو میں تیار ہو گیا' لیکن یونیورسٹی کا محمل کاروبار گراں سیر تھا۔ اس کا علاج میرے پاس نہ تھا۔ اس مایوسی کے عالم میں مَیں کالج کے دفتر میں چلا گیا۔ وہاں ہمارے ہیڈ کلرک ایک لالہ جی ہوتے تھے جنہیں بڑھاپے میں بدیشی عریاں تصویریں جمع کرنے کا بہت شوق تھا اور اپنی کاوش اور حسنِ انتخاب کی داد لینے کے لیے وہ اپنے البم مخصوص طلبہ کو بھی دکھایا کرتے تھے۔ جس وقت میں دفتر میں داخل ہوا' لالہ جی اس وقت اپنے نئے شہ پاروں پر تنقید کی دعوت احباب کو دے رہے تھے۔ حسبِ معمول مجھے بھی یہ دعوت دی گئی' لیکن میں اپنی ذہنی الجھن کی وجہ سے ذرا پرے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ لالہ جی نے میرے چہرے پر مایوسی کے آثار دیکھے تو بولے:

"کیوں خیر تو ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"کچھ نہیں کیا؟ کوئی بات بتاؤ تو پتا چلے۔"

میں نے منہ لٹکاتے ہوئے کہا۔ "بس ایم اے کا امتحان نہیں دیں گے۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"شفیع صاحب ڈگری دیکھنے کے بغیر داخلے کے فارم پر دستخط نہیں کرتے اور ڈگری میرے پاس ہے نہیں۔"

لالہ جی نے ہنس کر کہا۔ "بس اتنی سی بات ہے۔ دستخط ابھی ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا" کیسے؟"

لالہ جی میرے قریب آ کر بولے۔" آپ" صابھ" کے پاس چلے جایئے۔ اسے کچھ نہ بتایئے۔ بس اتنا کہہ دیجئے۔ میں نے بھیجا ہے۔" صابھ" دستخط کر دے گا۔"

یہ" صابھ" (صاحب) ڈاکٹر وولنر تھے جو ہمارے کالج کے پرنسپل اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ چونکہ وہ بیشتر وقت یونیورسٹی کے کام میں مصروف رہتے تھے اس لیے وہ کالج کبھی کبھار آتے تھے اور کالج کا نظم ونسق کلی حیثیت سے شفیع صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے لالہ جی کی تجویز بہت پسند آئی۔ کچھ تو اس خیال سے کہ اس طرح پندرہ بیس روپے بچ جائیں گے اور کچھ اس وجہ سے کہ داخلے کا فارم وقت پر پہنچ جائے گا۔ میں لالہ جی کا شکریہ ادا کر کے دفتر سے باہر نکلا تو شیرانی صاحب سے مُٹ بھیڑ ہوئی۔ میں نے سلام کیا۔ آپ حسب معمول ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلاتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ میں بھی ان کے تعاقب میں روانہ ہوا اور ہم دونوں ان کے کمرے میں پہنچ گئے۔ اورینٹل کالج میں چیٹر جی روڈ کی طرف ایک کونے میں آپ کا آخری کمرہ تھا۔ بیٹھنے پر پوچھا۔

"کیا کر رہے ہیں آپ؟"

چونکہ میری پوری توجہ اس وقت داخلے فارم کی طرف تھی۔ میں نے جلدی جلدی تمام واقعات انہیں سنا دیے۔ داخلے کا فارم میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اجازت چاہتے ہوئے اٹھنا چاہا۔ معاً آپ نے فارم میرے ہاتھ سے لے کر کہا۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"وولنر صاحب کے پاس۔"

"آپ یہیں رک جایئے۔"

یہ کہہ کر آپ فارم لے کر کمرے سے باہر نکل گئے اور تھوڑی دیر بعد واپس آ کر بولے۔"میں ان سے مل آیا ہوں۔ جایئے آپ یونیورسٹی میں درخواست دے کر ڈگری لے آیئے۔"

میں نے کہا" آپ کس سے مل آئے ہیں؟ اور یونیورسٹی اگر اسی طرح ڈگریاں بانٹنے لگے تو وہ روپے کس طرح ہم سے بٹورے!"

حسب معمول آپ اشاروں میں باتیں کرتے ہوئے بولے۔" جاؤ جاؤ خدمت کرو۔ ابھی ڈگری مل جائے گی۔"

"لیکن قبلہ یہ تو فرمایئے کہ میں بیس روپے یونیورسٹی کو دینے کے لیے اس وقت کہاں سے لاؤں اور پھر اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ وولنر صاحب ابھی ڈگری دیکھے بغیر دستخط کر دیں گے۔"

"دیکھو اس میں ان کی ہیٹی ہے۔ تم لالہ کی چالوں کو نہیں سمجھتے۔ جاؤ' جاؤ۔"

اُن سے اُن کی مراد شفیع صاحب سے تھی۔ میں اس وقت مایوسی اور غصے کی حالت میں تھا' لیکن شیرانی صاحب کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی' اس لیے چپکا ہو رہا اور دل میں تہیہ کر رہا تھا کہ ان سے گلوخلاصی ہو تو وولنر صاحب سے فارم پر دستخط کرا لوں۔ اتنے میں شیرانی صاحب نے اپنی چیک بک نکالی اور ایک چیک پر دستخط کر کے بولے۔

''اسے لے جایئے۔ ڈگری کی عرضی کے فارم کے ساتھ اسے ٹانک دیجئے' اور خالی جگہ میں جتنے روپوں کی ضرورت ہو' بھر لیجئے۔''

میں کسی بہانے سے وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ چیک واپس کرتے ہوئے میں نے پھر کہا۔

''حضرت چیک تو آپ نے دے دیا ہے' لیکن یہ فرمایئے ابھی ڈگری مجھے کون دے گا؟''

اس وقت کسی قدر برہم ہو کر بولے۔ ''میں جو کہتا ہوں جاؤ۔ ڈگری مل جائے گی۔ انہوں نے رجسٹرار کو ٹیلی فون پر کہہ دیا ہے۔''

میں نے چیک واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے لیے شکریہ۔ اگر آپ کے ارشاد کی تعمیل ضروری ہے تو میں ابھی رجسٹرار سے جا کر ملتا ہوں۔''

''اچھا جاؤ۔'' کہہ کر آپ نے مجھے کمرے سے باہر دھکیل دیا۔ میں رجسٹرار سے ملا۔ اس نے ضروری فیس اور فارم لے کر مجھے اسی وقت ڈگری دے دی جو میں نے شفیع صاحب کو جا کر دکھائی اور اپنے داخلے کے فارم پر دستخط کرا لیے اور یہ قضیہ یوں طے ہوا۔

بظاہر یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے' لیکن صرف اس ایک واقعہ سے شیرانی صاحب کی وضعداری' شفیع صاحب سے دلی عقیدت' اپنے شاگرد کے لیے شفقت اور اس کی تکلیف کو رفع کرنے کا شدید احساس' یہ سب چیزیں ایک ہی مرتبہ میرے دل پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اثر چھوڑ گئیں۔ اگر آج شیرانی مرحوم زندہ ہوتے تو شاید انہیں یہ واقعہ یاد بھی نہ ہوتا' لیکن میری زندگی پر اس ایک واقعہ نے ایک امٹ اثر چھوڑا ہے۔

ایم اے کا امتحان ختم ہو گیا تو میں ہوسٹل ہی میں ٹھہرا رہا کیونکہ لاہور میں اول تو ایک تعلیمی ماہنامہ کی ادارت میرے سپرد تھی۔ دوسرے شیرانی صاحب کا قرب حاصل تھا۔ ایک دن صبح صبح آ نکلے۔

''گجرات چلو گے؟''

میں نے عرض کیا۔ ''آپ کو بیٹھے بیٹھے گجرات جانے کی کیا سوجھی؟''

شیرانی صاحب نے چشمہ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ ہیں نا مارٹن صاحب۔ پادری ہے نا ایک گجرات میں...... اونھ......''

میں سمجھ گیا۔ مارٹن صاحب کے صاحبزادے گورنمنٹ کالج گجرات میں میرے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ میں اکثر ان کے ہاں آیا جایا کرتا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ مارٹن صاحب کو پرانے سکوں کے کاروبار سے

دلچسپی ہے۔ میں مسکرا کر کھڑا ہو گیا تو شیرانی صاحب بولے:

''بس اب چلو گے بھی یا باتیں بناتے رہو گے؟''

میں نے پوچھا۔ ''ابھی چلیں گے یا کچھ دیر ٹھہر کر؟''

''ٹھہر و ہر کر نہیں' ابھی چلیں گے۔ چلتے ہو تو تیار ہو جاؤ۔ تانگہ باہر کھڑا ہے۔ میں نذیر احمد[2] کے پاس بیٹھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر شیرانی صاحب کمرے سے باہر نکل گئے۔

اس گفتگو سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ شیرانی صاحب کو نہ صرف تدریس کے وقت بلکہ مجلسی گفتگو کرتے ہوئے بھی اس کا پس منظر کے حوالہ سے باتیں کرنے کی عادت تھی جو ان کے اپنے ذہن میں ہوتا تھا۔ مثلاً انہیں میرے متعلق معلوم تھا کہ میں گجرات میں طالب علم رہ چکا ہوں اور میری والدہ اب تک وہیں تھیں اور انہوں نے یہ بھی فرض کر لیا تھا کہ مارٹن کا نام لینے سے میرے ذہن میں شیرانی صاحب کے گجرات تشریف لے جانے کی وجہ از خود ابھر آئے گی اور یہ کہ وہ اگر مجھے دفعتہً گجرات چلنے کے لیے کہیں گے تو ان کے احترام کی وجہ سے میں کبھی انکار نہ کر سکوں گا۔

میں چند منٹ میں سفر کے لیے تیار ہو گیا اور مولوی نذیر احمد صاحب کے کمرے سے شیرانی صاحب کو ساتھ لے کر ریلوے سٹیشن پر پہنچ گیا۔ گجرات کے ریلوے سٹیشن سے تانگہ لے کر ہم سیدھے مارٹن صاحب کے مکان پر پہنچے۔ راستہ میں میرا مکان پڑتا تھا۔ میں نے مکان سے گزرتے ہوئے اطلاع دے دی کہ دوپہر کو شیرانی صاحب مکان پر میرے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ مارٹن صاحب نے سکے دکھائے تو شیرانی صاحب نے کوئی سکہ پسند نہ کیا۔ وہاں سے تانگہ لے کر ہم صرافوں کے بازار میں گئے اور شیرانی صاحب نے چند صرافوں کے ہاں سکے دیکھے' لیکن کوئی سکہ پسند نہ آیا۔ اتنے میں کھانے کا وقت ہو گیا۔ کھانے سے فراغت پانے پر ہم پھر سٹیشن کو لوٹ آئے۔ سٹیشن پر آ کر میں نے اجازت چاہی کیونکہ میرا خیال تھا کہ اتفاق سے گجرات پہنچ گیا ہوں' اس لیے دوست احباب سے مل کر دوسرے دن لاہور پہنچ جاؤں گا۔ شیرانی صاحب نے اجازت بخوشی دے دی' لیکن ٹکٹ لینے کے بعد مصر ہوئے کہ میں لاہور تک واپسی کا کرایہ ان سے لوں۔ میں نے بہت انکار کیا' لیکن کچھ پیش نہ چلی بلکہ آپ جھنجلا گئے اور مجھے کرایہ لینا ہی پڑا۔ ابھی گاڑی چلنے میں کچھ دیر تھی۔ میں نے عرض کیا۔

''اگر اجازت ہو تو ایک دو باتیں آپ سے پوچھ لوں؟''

فرمایا ''کہو۔''

میں نے کہا۔ ''میں اس پر متعجب ہو رہا ہوں کہ آپ اتنی دور سے آئے بھی اور آپ نے کوئی سکہ بھی نہیں خریدا۔''

''میرے مطلب کی چیز نہیں تھی۔''

''اگر گستاخی نہ ہو تو میں پوچھ سکتا ہوں کیوں؟ مارٹن صاحب نے آپ کو شاہجہاں' اکبر' جہانگیر سب کے سکے دکھائے لیکن آپ کو پسند نہیں آئے؟''

آپ نے حسب معمول پُر اسرار جواب دیا۔ ''تم ابھی اس کو نہیں سمجھتے۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''آپ سمجھاتے بھی تو نہیں۔''

''کھوٹے سکے تھے اور اکبر کا سکہ تو وہ چیز نہیں تھی جو مجھے چاہیے تھی۔''

یہ بات یہیں ختم ہوگئی۔ بعد میں کسی صحبت میں تفصیلی طور پر گفتگو کرنے سے معلوم ہوا کہ شیرانی صاحب اس کوشش میں مصروف تھے کہ مغلوں کے سکوں کو عہد بہ عہد جمع کر کے ایک ایسا جائزہ لیا جائے جس سے مختلف بادشاہوں کے اخلاقی' سماجی' فنی' ادبی اور علمی رجحانات پر روشنی پڑ سکے۔ ان کے نقطۂ خیال سے سکوں کی ظاہری شکل وصورت' ان کے بیل بوٹوں اور ان پر کندہ کی ہوئی عبارات سے یہ نفسیاتی جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ مثلاً محمود کے متعلق ہندوؤں کے خلاف شدید روایتی تعصب کے سارے پروپیگنڈے کے باوجود اس کے سکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندو رعایا کو خوش کرنے کی سعی بھی کرتا رہا کیونکہ لاہور کے عجائب خانہ میں محمود کے جو سکے ہیں اور جن کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ لاہور ہی میں بنائے گئے۔ ان کے ایک جانب تو عربی عبارت اور سنہ ہجری کندہ ہے اور دوسری طرف اس عربی عبارت کا ترجمہ سنسکرت میں اور بکرمی سنہ کندہ ہے۔ شیرانی صاحب کو معلوم ہوا تھا کہ مارٹن کے پاس اکبر کا ایسا سکہ ہے جو مارٹن کو گجرات کے قلعہ میں ملا تھا اور یہ قلعہ اکبر نے بنوایا تھا۔ شیرانی صاحب کی اطلاع یہ تھی کہ اکبر کے کمیاب سکوں میں سے یہ ایک سکہ تھا اور شیرانی صاحب کے پاس موجود نہ تھا۔ یہ اطلاع ملنے پر آپ گجرات دوڑے گئے اور وہاں جا کر یہ معلوم ہوا کہ سکہ تو وہی ہے جس کی اطلاع آپ کو ملی تھی' لیکن وہ خالص چاندی کا ہونے کے باوجود اصل کی نقل تھی جو اصل سے اتاری گئی تھی۔ شیرانی صاحب کا خیال تھا اور تجربہ سے مجھے بھی معلوم ہوا کہ بعض کمیاب سکوں کا لوگ عجائب خانوں سے گیلی مٹی پر سانچہ اتار لیتے ہیں اور پھر ان سانچوں میں چاندی پگھلا کر ڈال دیتے ہیں جس سے سکہ بظاہر تو اصل کی طرح بن جاتا ہے اور چاندی بھی خالص ہوتی ہے' لیکن اصلی سکے کی عبارت کی طرح ان سکوں کی عبارت کی نوک پلک نہیں نکلتی' جسے تجربہ کار نگاہیں فوراً بھانپ لیتی ہیں اور ہمارے عہد میں اس نوک پلک کو جانچنے اور بھانپنے کی مہارت رکھنے والے آدمی شیرانی صاحب کی طرح کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔

میرے انگلستان جانے کے سب سے پُر جوش محرک شیرانی صاحب ہی تھے اور انگلستان کے قیام کے دوران میں مجھے تحقیقی مواد کے سلسلے میں ہندوستان سے جس مدد کی ضرورت ہوئی' وہ آپ ہی کی وساطت سے مجھے پہنچی۔ میں انگلستان سے واپس آیا تو آپ نے میری ڈگری کی رعایت سے مجھے ''ڈاکٹر صاحب'' کہنا شروع کر دیا۔ شیرانی جیسے جید عالم اور استاد کے علم کے سامنے مجھے اپنی ولایتی ڈگری کا بھرم رکھنا معیوب سا معلوم ہوتا تھا' اس لیے میں نے تکلفاً نہیں بلکہ دیانتداری سے عرض کیا۔ ''آپ میرے استاد ہیں اور جب

آپ مجھے ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں تو ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ کیا آپ سابق لطف و کرم سے کام لے کر مجھے باقر ہی کہہ کر نہیں پکاریں گے؟"

بولے۔ "ڈاکٹر صاحب اگر میں آپ کو عزت سے مخاطب نہیں کروں گا تو دوسرے آپ کا احترام کیسے کریں گے۔ پیراں نمی پرند مریداں می پرانند۔"

میں نے پھر عرض کیا۔ "لیکن یہ ضرب المثل کا استعمال تو آپ نے بے جا کیا۔ آپ بہر صورت میرے استاد ہیں۔"

پیار سے جھنجلا کر بولے "وہ تو میں کبھی آپ کا استاد تھا۔ اب آپ ایم اے کے معلم ہیں۔ اپنے کالج میں شعبے کے صدر ہیں اور میں وہی لیکچرر کا لیکچرر۔"

میں نے اس کے بعد کئی دفعہ اصرار کیا' لیکن لوگوں کے سامنے آپ مجھے ڈاکٹر صاحب کہنے پر مُصر رہے۔

شیرانی صاحب خوش خور اور انتہا درجے کے متواضع انسان تھے۔ مکان پر بیٹھے ہوئے ایک دن کھانے کا وقت ہو گیا۔ آپ نے مجھے بھی دعوت دی۔ کچھ عذر اور انکار کرنے کے بعد میں شامل ہو گیا۔ اتفاق سے بکرے کے پائے پکے ہوئے تھے اور غیر معمولی طور پر اچھے پکے ہوئے تھے اور میں نے کھانا کھانے کے بعد بہت تعریف کی۔ معلوم نہیں اس تعریف کو شیرانی صاحب نے حسن طلب پر کیوں محمول کیا۔ ہر دس پندرہ روز کے بعد آپ کا تقاضا ہوتا۔

"ڈاکٹر صاحب آج دوپہر کو آپ میرے ساتھ چلیں گے۔"

"کیوں شیرانی صاحب؟"

"وہ آپ کھائیں گے نہیں کیا؟"

اور اس سے آپ کی یہ مراد ہوتی کہ میں نے تمہارے لیے پائے پکوائے ہیں' اس لیے تم میرے ہاں کھانا کھانے چلو۔ جہاں تک تحصیلِ لذت کا سوال ہے۔ میں کھانے کے متعلق لاپروا واقع ہوا ہوں۔ ایک دو دفعہ تو میں ازراہ امتثالِ امر اور استاد کی شفقت کی داد دینے کے لیے ان کے ساتھ ہو لیا' لیکن جب دیکھا کہ پائے کھلانے کا محض بہانہ ہی ہے۔ اسی کھانے پر قسم قسم کی دیگر نعمتیں شیرانی صاحب جمع کر دیتے ہیں اور ان کی وضعداری نے دعوتوں کا یہ سلسلہ پابندی سے قائم کر دیا تو میں نے ایک دن شوخی سے کہا۔ "بابا (ہم بے تکلفی سے انہیں اسی نام سے پکارتے تھے) آپ نے کوئی منت تو نہیں مان رکھی کہ ہر پندرہ روز کے بعد آپ مجھے کھلاتے ہیں۔ اگر آپ کو میرے زہد و اتقاء پر کوئی حسن ظن ہے تو آپ غلطی پر ہیں۔"

اس سے آپ کچھ آزردہ سے ہو گئے' لیکن برہم نہیں ہوئے۔ پھر تھوڑی سی کوشش کرنے پر آپ مسکرانے لگے اور بولے۔ "اچھا لینگے اب تمہیں کبھی کھانے پر نہیں بلائیں گے حتیٰ کہ تم ماسٹر [3] کی طرح میری خوشامد نہ کرو۔"

کہنے کو تو انہوں نے یہ کہہ دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ جب تک لاہور میں رہے دعوت دینے پر منصر رہے۔

آپ کے اخلاق و عادات کی تصویر مکمل کرنے کے لیے ایک آخری واقعہ عرض کروں گا۔ میں نے انگلستان کے قیام کے دوران میں وہاں کے کتاب خانوں میں کچھ ایسے مخطوطات دیکھے جن سے معلوم ہوا کہ اردو اور فارسی کے متعلق آج تک جو تحقیقی کام ہو چکا ہے اس میں ان مخطوطات کی نایابی کی وجہ سے کچھ کمی رہ گئی ہے اور چونکہ اتفاق سے میں نے چند مخطوطات فرانس اور انگلستان میں پہلی مرتبہ دیکھے تھے اور ان کے متعلق "معارف" اور دیگر جرائد میں لندن ہی سے متفرق مضامین شائع کرا چکا تھا' اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس نئی تحقیق کو یکجا شائع کر دیا جائے۔ مواد میرے پاس موجود تھا لیکن معاملہ ذرا نازک سا تھا کیونکہ اس تحقیق کے دوران میں عمداً انگشت نمائی سے احتراز کرنے کے باوجود شیرانی صاحب' ڈاکٹر سید محی الدین زور اور سید شمس اللہ قادری جیسے مستند محققین پر حرف گیری کا پہلو نکلتا تھا۔ میں نے ازراہ احتیاط اس مضمون کے چند صفحے لکھے اور پرنسپل محمد شفیع صاحب (جو یونیورسٹی اورینٹل کالج میگزین کے ایڈیٹر بھی تھے) کی خدمت میں بھیج دیے کہ وہ ان کو دیکھ لیں اور اگر پسند فرمائیں تو یونیورسٹی کے جریدہ میں اشاعت کے لیے مضمون مکمل کیا جا سکتا ہے۔ شفیع صاحب نے مضمون پسند فرما کر اسے مکمل کرنے کی تاکید کی۔ میں نے مضمون کے آغاز میں نہایت ادب اور احترام سے یہ واضح کر دیا کہ "بسا اوقات مصنفین کی رسائی تحقیق کے صحیح مواد تک نہیں ہو سکی اور اس وجہ سے ان سے کہیں لغزش سرزد ہو گئی ہے۔" لیکن جب مضمون فروری 1941ء میں شائع ہوا تو دوسرے دن میں نے شیرانی صاحب کو مکمل قطع تعلق کے مزاج میں پایا۔ پہلے تو کچھ پتا نہ چلا لیکن جب آپ نے کہا۔ "باریش بابا ہم بازی....." تو میں فوراً سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو اس مضمون نے یہ ستم ڈھایا ہے۔ چند دن تک تو میں اس کوشش میں رہا کہ شیرانی صاحب کسی طرح مان جائیں لیکن ان کی آزردگی رنجیدگی میں تبدیل ہو گئی۔ یہاں تک کہ عند الملاقات انہوں نے میرے سلام کا جواب دینا بند کر دیا۔ اس وقت وہ کالج سے الگ ہو چکے تھے اور وطن جانے کی فکر میں تھے۔ مجھے ہر وقت یہ احساس دامن گیر رہتا کہ اگر وہ اسی برافروختگی کی حالت میں مجھ سے رخصت ہو گئے تو نہ جانے پھر عمر بھر ان سے تعلقات استوار کرنے کا موقع ملے یا نہ ملے اور پھر اس عمر مستعار کا اعتبار؟ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ واقعات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ ان کے لاہور سے جانے کے بعد میں کئی دفعہ کوشش کرنے کے باوجود پھر ان کی قدم بوسی کی سعادت حاصل نہ کر سکا۔ انہی ایام میں اتفاق سے میں ایک دن موچی دروازے کے اندر اپنی سسرال والوں کے ہاں گیا ہوا تھا۔ مکان پر بیٹھے ہوئے میں نے سنا' کسی پھیری والے نے ہانک لگائی۔ "کھیس لے لو کھیس۔" معاً مجھے ایک خیال آیا اور میں نے لپک کر اسے پکارا۔ کھیس والا آ گیا۔ میں نے کھیس دیکھے اور دو اپنی پسند کے خرید لیے۔ پھر یہ کھیس لے کر شیرانی صاحب کے مکان پر پہنچا۔ حسب معمول کنڈی کھٹکھٹائی تو آپ نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور کہا۔ "کون؟"

مجھے دیکھ کر جھکے، لیکن پھر خود ہی سیڑھیوں سے اتر کر مجھے ساتھ لے گئے۔ ایک کرسی پر مجھے بٹھا دیا اور بالکل خاموش چارپائی پر حسب عادت آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ میں نے خیریت پوچھی جس کا جواب ایک غرغراتی ہوئی "ہونھ" سے ملا۔ میں نے بیٹھتے ہی کھیس پلنگ کی پائتی پر رکھ دیے۔ اس وقت ہاتھ کے پنکھے کی جگہ بجلی کا پنکھا لے چکا تھا۔ آپ ایک دفعہ اٹھے اور پنکھے کا رخ میری طرف کرتے ہوئے بولے "کہیے کیسے آنا ہوا؟"

میں نے عرض کیا۔ "آپ کے لیے یہ کھیس لایا ہوں۔"

کچھ سوچ کر برہم انداز میں بولے۔ "مجھے نہیں چاہئیں۔"

میں خاموش ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ شیرانی صاحب کو عمدہ قسم کے کھیس جمع کرنے کا بھی بہت شوق ہے۔ وہ کھیس کی بناوٹ کی خوبیوں کو جمالی نقطہ نظر سے دیکھا کرتے تھے اور اس فن کو وہ مسلمانوں کے ان ترقی یافتہ فنون میں سے سمجھتے تھے، جن میں مسلمانوں نے اسلام کی حدود کے اندر رہ کر فنون لطیفہ کے ذوق کی تسکین کی تھی۔ رنگوں کے حسین و جمیل امتزاج، بیل بوٹوں کی نفاست اور تانے بانے کے سوت کو پرکھنے کا انہیں خاص ملکہ تھا اور ان کی صحبت میں رہ کر اکتسابی طور پر میں نے بھی اس کام میں شد بد پیدا کر لی تھی۔ میرے خریدے ہوئے کھیس معیاری لحاظ سے تو کچھ اتنے اچھے نہ تھے، لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ اس قیمت پر شیرانی صاحب کو بہت پسند آئیں گے۔ کچھ دیر سوچ کر میں بولا۔

"میرا خیال تھا آپ اس طرز کے کھیس پسند کرتے ہیں۔"

"لیکن آپ کو اس سے کیا؟"

"اگر مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں تو اور کسے ہو سکتا ہے۔" پھر میں نے ذرا جرأت آمیز انداز میں کہا۔ "بابا میں آپ سے کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ اس مضمون کی اشاعت سے آپ کی توہین مقصود نہ تھا لیکن خدا جانے آپ اس پر کیوں یقین نہیں کرتے۔ اب اس قصے کو چھوڑیے۔ فرض کیجیے کہ میں نے قصور ہی کیا ہے تو یہ قصور ایسا نہیں جسے آپ معاف نہیں کر سکتے۔ لیجیے میں آپ کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں آپ کے پاؤں چھونے کے لیے آگے بڑھا تو انہوں نے دونوں پاؤں اندر سکیڑ لیے اور دونوں ہاتھوں سے مجھے روک دیا۔ میں پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس کے بعد میں نے شیرانی صاحب کی ایک عجیب کیفیت دیکھی۔ میں خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ اضطراب انگیز انداز میں کھیسوں پر پھیر رہے تھے۔ ان کی آنکھیں چارپائی پر گڑی ہوئی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ میں چند لمحے چپکا بیٹھا رہا اور پھر بولا۔ "اچھا چھوڑیے اب اس قصے کو۔ کھیس دیکھیے آپ کو پسند ہیں یا نہیں؟"

آپ نے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں پسند ہیں۔ آپ کو کہاں سے ملے؟"

میں نے تفصیل بیان کی تو آپ نے کالے خاں کو بلا کر اسی وقت قیمت ادا کر دی۔ میں دیر تک بیٹھا

رہا۔ نئی حاصل کی ہوئی کتابیں دکھاتے رہے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں رخصت ہونے لگا تو فرمایا:
"اچھا تو کب آئیں گے وہ کھانے؟"
میں نے عرض کیا۔"اب میں نہیں آؤں گا۔ اب آپ کو آنا ہوگا۔"
آپ نے ہنس کر جواب دیا۔"اچھی بات ہے۔" اور میں سلام عرض کر کے چلا آیا۔

حافظ محمود خاں صاحب شیرانی کا آبائی وطن شیرانیوں کی ڈھانی' ریاست جودھ پور' مارواڑ راج تھا۔ ان کے والد محمد اسمٰعیل خاں سید احمد شہید کے قافلہ سے تعلق رکھتے تھے اور تجارت اور کاروبار کی وجہ سے ٹونک کے صاحب ثروت لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ شیرانی صاحب کی ابتدائی تعلیم یہیں ٹونک میں ہوئی اور یہیں انہوں نے قرآن شریف حفظ کیا۔ فارسی اور عربی کی تحصیل منشی فاضل کا امتحان پاس کرتے ہوئے کی۔ باپ نے شیرانی صاحب کو لندن بیرسٹری کی تعلیم کے لیے بھیجا مگر غالباً باپ کی وجہ سے ان کو وطن سے روپیہ جانا بند ہو گیا اور شیرانی صاحب مجبور ہو گئے کہ بیرسٹری کی تعلیم چھوڑ چھاڑ فکر معاش میں لگ جائیں۔ چنانچہ انہوں نے لوزک کی مشہور فرم سے تعلق پیدا کیا اور دس برس انگلستان میں رہ کر بیرسٹری کی سند لیے بغیر ہندوستان واپس آ گئے۔ البتہ جس مطالعہ کا شوق یہاں سے ساتھ لے کر گئے تھے اس پر لندن کے کتب خانوں میں وقت گزار کر خوب جلا کی۔ 1921ء میں آپ لاہور تشریف لائے اور 1922ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔"پنجاب میں اردو" اس زمانے کی معرکتہ الآراء تصنیف ہے۔ یکم اکتوبر 1928ء میں آپ پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے' جہاں سے وہ 15 نومبر 1940ء میں فارغ ہوئے۔ یونیورسٹی سے سلسلہ ملازمت ختم ہونے پر آپ نے انجمن ترقی اردو دہلی سے تعلق پیدا کیا لیکن علالت کی وجہ سے آپ مستقل طور پر اپنے وطن ٹونک میں جا کر مقیم ہو گئے۔

جب وہ وطن جانے لگے تو دمہ کی وجہ سے ان کی صحت مخدوش ہو چکی تھی۔ پرنسپل محمد شفیع صاحب کے اصرار پر وہ آمادہ ہو گئے کہ اپنا قیمتی کتب خانہ اور سکوں اور مہروں کا ذخیرہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے حوالے کر دیں۔ یونیورسٹی نے کتب خانہ تو سترہ ہزار روپے میں خرید لیا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ ان عجائبات کی نصف قیمت بھی نہیں' لیکن سکے شیرانی صاحب اپنے ساتھ لے گئے جنہیں حکومت یو۔ پی نے تیئس ہزار روپے کے عوض خرید لیا۔

شیرانی صاحب کی اولاد میں ایک ہی صاحبزادے تھے یعنی شاعرِ مشہور داؤد خاں صاحب اختر شیرانی۔ ان کے علاوہ ایک صاحبزادی بھی انہوں نے چھوڑی۔ اختر شیرانی کا بھی اب انتقال ہو چکا ہے۔

شیرانی صاحب نے جمعہ کے دن 15 فروری 1946ء کو 64 سال 4 ماہ کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے متعلق حافظ علیہ الرحمۃ نے کہا تھا:

نظیر خویش نہ بگذاشتند و بگذشتند

شیرانی صاحب کے علمی، تحقیقی اور ادبی مشغلوں اور کارناموں کے ذکر کے لیے ایک الگ صحبت درکار ہے' اس لیے اس کام کو کسی اور فرصت پر اٹھا رکھتا ہوں۔ اس سلسلے میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ وہ ایک نہایت بلند پایہ محقق' نقاد اور صاحب ذوق انسان تھے۔ شاعری کا چسکا کچھ دیر جوانی میں رہا' لیکن بعد میں شعر نہیں لکھے۔

حواشی:

1- میں نے بی اے ریاضی کے ساتھ پاس کیا تھا۔

2- مولوی نذیر احمد صاحب اس وقت وولنر ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے مہتمم ہیں۔

3- ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب کو وہ اسی طرح پکارا کرتے تھے اور ڈاکٹر صاحب قبلہ انہیں بابا کہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا قاعدہ تھا کہ جب کسی نئے پھل کا موسم شروع ہوتا تو شیرانی صاحب سے تقاضا کرتے کہ شیرانی صاحب انہیں وہ پھل اس لیے کھلائیں کہ وہ میوہ منڈی کے پاس رہتے ہیں۔ شیرانی صاحب پہلے تو مذاق میں ٹالتے رہتے۔ بالآخر دعوت میں پھلوں کے ٹوکرے لا کر احباب کے سامنے رکھ دیتے۔

(در: مخزن' بابت نومبر 1949ء ص 3-16)

عبدالمجید سالک

حافظ محمود شیرانی

بیرون پنجاب کے جن فضلاء و ادبا کے علمی احسانات سے اہل پنجاب کی گردنیں ہمیشہ خم رہیں گی، ان میں علامہ حافظ محمود شیرانی مرحوم کا نام نہایت ممتاز ہے۔ ''پنجاب میں اردو'' حضرت علامہ کے آفتاب تحقیق کی صرف ایک شعاع ہے، لیکن اس ایک شعاع سے زبان اردو کے ماخذوں کا گوشہ گوشہ منور ہو گیا اور جو محققین و طلبہ ایک صدی سے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مار رہے تھے، ان کو ایسی روشنی مل گئی، جو ہمیشہ ان کے لیے چراغ راہ بنی رہے گی۔

''پنجاب میں اردو'' پر دیباچہ لکھنا نہ تو میرا منصب ہے، اس لیے کہ علمی تحقیق کے میدان کا مرد نہیں ہوں۔ علاوہ بریں اس کی ضرورت بھی نہیں، اس لیے کہ اس پر خود مصنف کا لکھا ہوا مقدمہ موجود ہے۔ اس میں مطالب کتاب کا تعارف ایسے انداز میں کر دیا گیا ہے جس سے بہتر ممکن نہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ قارئین کتاب کو مصنف کے سوانح حیات اور ان کی شخصیت سے روشناس کر دیا جائے۔

قوم اور خاندان

حافظ محمود خاں شیرانی کے والد محمد اسماعیل خاں کا اصلی وطن ریاست جودھ پور مارواڑ تھا، جہاں ''شیرانیوں کی ڈھانی'' کے نام سے ایک بستی آباد ہے۔ محمد اسماعیل خاں حضرت سید احمد شہید کے اہل قافلہ سے تعلق رکھتے تھے اور ٹونک میں جاگیر کے مالک ہونے کے علاوہ کاروبار تجارت بھی کرتے تھے۔ شیرانی سرحدی پٹھانوں کا ایک قبیلہ ہے، جو ڈیرہ اسماعیل خاں کے ضلع کے متصل جنوبی وزیرستان کے جنوب میں آباد ہے۔ اس قبیلے کے بعض خاندان راجپوتانہ میں آباد ہو گئے تھے۔ انھی میں حافظ محمود خاں شیرانی کے اجداد بھی تھے۔

ولادت اور تعلیم

حافظ صاحب مرحوم اکتوبر 1880ء میں بمقام ٹونک پیدا ہوئے۔ چونکہ اس زمانے میں انگریزی تعلیم کا رواج نہ تھا، خصوصاً قدامت پسند خاندان تو اس کے قطعاً روادار نہ تھے، اس لیے شیرانی صاحب نے پہلے

قرآن حفظ کیا۔ اس کے بعد اپنے والد محترم سے فارسی پڑھتے رہے۔ غالباً 1895ء میں تکمیل تعلیم کے لیے لاہور بھیجے گئے۔

سنٹرل ماڈل سکول میں داخل ہوئے، لیکن انگریزی اور ریاضی وغیرہ کے مضامین سے ان کی طبیعت کو لگاؤ پیدا نہ ہو سکا۔ چنانچہ سکول چھوڑ کر اورینٹل کالج لاہور میں داخل ہو گئے اور مولوی عبدالحکیم کلانوری سے فارسی کی تکمیل کی۔ 1899ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کر کے اپنے وطن ٹونک واپس چلے گئے۔

حافظ صاحب انگلستان میں

1904ء میں جب قدامت پرستی کی قوتیں بڑی حد تک مغلوب ہو چکی تھیں۔ حافظ صاحب کے والد محترم نے اپنے ہونہار بیٹے کو بیرسٹری کی تعلیم کے لیے انگلستان بھیج دیا۔ حسن اتفاق سے اس زمانے میں سر عبدالقادر اور ڈاکٹر اقبال بھی وہیں موجود تھے۔ چنانچہ ان حضرات سے حافظ صاحب کی خوب صحبتیں رہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ المامون سہروردی بھی اس زمانے میں انگلستان ہی میں مقیم تھے۔

حافظ صاحب نے انگلستان پہنچتے ہی سب سے پہلے انگریزی پڑھنی شروع کی، کیونکہ اس سے قبل وہ اس زبان سے قریب قریب بے بہرہ تھے۔ ابھی دو تین ابتدائی امتحان ہی پاس کیے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ بھائیوں نے خرچ بھیجنا بند کر دیا۔ اب تعلیم تو جاری نہ رہ سکتی تھی، لیکن حافظ صاحب مزید عرصے تک انگلستان میں رہنے کے بے حد خواہش مند تھے۔ بعض احباب کی سعی سفارش سے سر ٹامس آرنلڈ نے ان کی دستگیری کی اور کسی فنڈ سے وظیفہ دلوا کر تحقیق علمی کے کام میں اپنا مددگار مقرر کر لیا۔

یہاں سے حافظ صاحب کو مشرقی علوم والسنہ کی تحقیقات کا ایسا چسکا لگا جو مدت العمر شریک حال رہا۔ وظیفے کی رقم قلیل تھی، جس میں گذر اوقات مشکل تھی۔ چنانچہ لندن کی مشہور تاجر فرم لیوزک کمپنی نے حافظ صاحب کو مشرقی مخطوطات اور دوسری قدیم اشیاء کی خرید پر مامور کر دیا۔ اس پر کمیشن بھی ملتا تھا جس سے حافظ صاحب کی مالی پریشانیاں بڑی حد تک رفع ہو گئیں۔

ہندوستان میں واپسی

لیکن 1913ء میں وہ دفعتاً ہندوستان واپس آ گئے۔ واپسی کا مقصد یہ تھا کہ آٹھ نو سال کے بعد اپنے اعزہ سے بھی مل لیں اور بھائیوں کے ساتھ تقسیم جائیداد کی بات چیت بھی کر یں۔ خیال یہ تھا کہ چند ماہ میں ان امور سے فراغت حاصل کرنے کے بعد واپس انگلستان چلے جائیں گے، لیکن 1914ء میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی جو چار سال تک جاری رہی اور حافظ صاحب انگلستان نہ جا سکے۔ پھر خاندانی پیچیدگیوں میں کچھ اور عرصہ گذر گیا۔

اسلامیہ کالج لاہور میں ملازمت

آٹھ سال کی خانہ نشینی کے بعد 1921ء میں حافظ صاحب تلاش معاش میں لاہور پہنچے۔ یہاں ڈاکٹر اقبال اور سر عبدالقادر جیسے ذی اثر دوست موجود تھے جن کی کوشش سے حافظ صاحب اسلامیہ کالج میں ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر اردو اور فارسی کے لیکچرر مقرر ہو گئے۔ اگرچہ مشاہرہ بہت کم تھا، لیکن درویش طبع محمود خاں نے اس کو قبول کر لیا اور سات سال اسلامیہ کالج ہی میں گزار دیے۔ اسی زمانے میں ان کے متعدد محققانہ مقالے رسالہ "اردو" (حیدرآباد، دکن) میں شائع ہوئے، جن سے علمی حلقوں میں حافظ صاحب کی تحقیق علمی کی دھوم مچ گئی۔

1928ء ہی میں آپ کی یہ کتاب "پنجاب میں اردو" شائع ہوئی۔ چنانچہ اسی کتاب کی وجہ سے پنجاب یونیورسٹی کے ارباب اختیار کی نظر انتخاب حافظ صاحب پر پڑی اور وہ اورینٹل کالج لاہور میں اردو کے لیکچرر مقرر کیے گئے۔

اورینٹل کالج سے سبکدوشی

جب حافظ صاحب کو اورینٹل کالج لاہور میں آٹھ سال گزر گئے تو 55 سال عمر ہو جانے کی وجہ سے ان کی سبکدوشی کا سوال پیدا ہوا، لیکن یونیورسٹی نے ان کی کارکردگی کے باعث ملازمت میں دو سال کی توسیع منظور کر لی۔ اس کے بعد 1938ء میں مزید دو سال کے لیے اسی اسامی پر، لیکن کسی قدر کم مشاہرہ پر حافظ صاحب کا تقرر کر دیا گیا۔ آخر 15 نومبر 1940ء کو وہ ساڑھے آٹھ ماہ کی فرلو پر روانہ ہوئے جس کے بعد ان کی ملازمت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

مولوی عبدالحق صاحب نے حافظ صاحب کو تصنیف و تالیف کی غرض سے انجمن ترقی اردو (دہلی) میں بلا لیا تھا، لیکن چند ہی مہینے وہاں کام کر پائے تھے کہ خرابی صحت کی وجہ سے اس تعلق کو ترک کر کے وطن جانے پر مجبور ہو گئے۔

وقتِ آخر

حافظ صاحب 1938ء سے ضیق النفس میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ہر قسم کے علاج کے باوجود اس مرض میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ خصوصاً آخری چار برس بہت تکلیف میں بسر ہوئے۔ بالآخر وقت آخر آن پہنچا اور 15 فروری 1946ء کو یہ یگانہ روزگار فاضل پینسٹھ برس اور چار مہینے کی عمر پا کر رہگرائے عالم جاودانی ہوا۔ اناللہ و انا الیہ راجعون۔

اختر شیرانی

حافظ محمود شیرانی مرحوم و مغفور کے اکلوتے فرزند محمد داؤد خاں اختر شیرانی تھے جو اردو زبان کے نہایت نغز گو شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ افسوس کہ وہ بھی اپنے والد مرحوم کی وفات سے کوئی ڈھائی سال بعد بمقام لاہور انتقال کر گئے، رہے نام اللہ کا۔

مخطوطات و نوادر کی جمع آوری

حافظ محمود شیرانی نے ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر ملازمت شروع کی اور سبکدوشی کے وقت چار سو روپے پا رہے تھے، لیکن آمدنی کی اس قلت کے باوجود انہوں نے اپنے بست سالہ زمانہ ملازمت میں کم و بیش بیس ہزار روپے کی قلمی اور پرانی کتابیں جمع کیں اور تقریباً اسی مالیت کے پرانے سکے فراہم کیے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہے کہ ان نوادر کی جمع آوری کے لیے انہوں نے ہزاروں روپے سفر پر بھی خرچ کیے ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انہوں نے ہمیشہ نہایت سادہ زندگی بسر کی۔ ایک معمولی سے مکان میں رہتے تھے جس کے زیادہ تر کمرے کتابوں اور سکوں کی الماریوں سے پٹے پڑے تھے اور ایک گوشے میں فرش پر حافظ صاحب مطالعہ و تصنیف میں مصروف رہتے تھے۔ گرمی ہو، جاڑا ہو، برسات ہو، شور و غوغا ہو کوئی چیز ان کی علمی مصروفیتوں میں حائل نہ ہوتی تھی۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے پر انہوں نے پانچ ہزار کتابوں کا نایاب ذخیرہ معمولی رقم کے معاوضے میں پنجاب یونیورسٹی کے سپرد کر دیا، حالانکہ اگر وہ چاہتے تو ان نایاب نوادر کو فروخت کر کے لاکھوں روپے فراہم کر سکتے تھے۔

حسنِ اخلاق

جن لوگوں کو حافظ شیرانی کی دوستی کا شرف حاصل رہا ہے یا جنہیں ان کی فضیلت علمی کے آگے زانوے تلمذتہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے یا جو لوگ ان سے وقتاً فوقتاً نیاز حاصل کرتے رہے ہیں، وہ سب اس امر پر متفق ہیں کہ حافظ صاحب علم و تحقیق کی جلالت قدر کے باوجود انتہا درجے کے منکسر مزاج، متواضع، نیک دل اور مخلص انسان تھے۔ دوستوں پر تو جان چھڑکتے تھے اور شاگردوں کے حق میں آیہ رحمت سے کم نہ تھے۔ عام ملنے والوں سے بھی ان کا سلوک ایسا تھا کہ ہر ملنے والا ان کے حسن اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

علمی کارنامے

اس مضمون میں یہ گنجائش کہاں کہ حافظ صاحب مرحوم کے تمام علمی کارناموں پر تبصرہ کیا جا سکے۔ وہ صرف مدرس نہ تھے بلکہ شاعر، ادیب، محقق، نقاد، مورخ، ماہر آثار عتیقہ، عروضی اور خدا جانے کیا کچھ تھے۔

علامہ شبلی کی ''شعر العجم'' فارسی شاعری پر تنقید کا ایک لازوال کارنامہ ہے اور خود حافظ صاحب کو اس کا اعتراف تھا، لیکن مورخانہ اعتبار سے وہ اس کتاب کے اکثر بیانات کو پایہ تحقیق سے ساقط جانتے تھے۔ چنانچہ انتہائی جرأت سے جو ہمیشہ علم صحیح ہی سے پیدا ہوتی ہے انہوں نے ''شعر العجم'' پر فاضلانہ تنقید کی جس کا کوئی جواب کسی سے بن نہ آیا۔ انہوں نے سلطان محمود غزنوی اور شاہنامے کے متعلق مشہور حکایت کا بت اس طرح سے توڑا کہ اس کے پرخچے اڑ گئے اور سلطان محمود کا دامن ناقدردانی کے دھبے سے پاک صاف ہو گیا۔ حافظ صاحب کے زور استدلال اور تحقیق و تنقیح نے فردوسی کی طرف منسوب ہجو کو بالکل مصنوعی و الحاقی ثابت کیا۔ انہوں نے ''پرتھی راج راسا'' کے متعلق تحقیق پیش کی کہ چند بردائی سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور اس دعوے کے ثبوت میں ایسی داخلی شہادتیں پیش کیں کہ ہندی کے کسی نقاد کو بھی اس کی تردید کی جرات نہ ہوئی۔ ''آب حیات'' کی تنقید اگرچہ نامکمل رہی، لیکن اس میں بھی حافظ صاحب نے مولانا آزاد کے متعدد بیانات کو پایہ استناد سے ساقط ثابت کر دیا۔ ''خالق باری'' کو لوگ امیر خسرو کی تصنیف بتاتے تھے، لیکن حافظ صاحب نے ثابت کر دیا کہ اس کتاب میں اکثر شواہد ایسے ہیں کہ یہ کتاب لسانی اور زمانی اعتبار سے امیر خسرو سے کوئی تعلق نہیں رکھتی بلکہ یہ کسی اور شخص خسرو شاہ کی لکھی ہوئی ہے، جو امیر خسرو سے بہت بعد ہوا ہے۔

اس کے علاوہ حافظ صاحب نے بیسیوں تحقیقی مقالات اردو زبان اور اس کے متعلقہ مسائل کے متعلق لکھے۔

پنجاب میں اردو

''پنجاب میں اردو'' حافظ محمود شیرانی کا ایک لازوال ادبی کارنامہ ہے۔ اس میں آپ نے متعدد داخلی و خارجی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ اردو صرف شاہجہاں کے زمانے سے شروع نہیں ہوئی۔ جیسا کہ عام نقاد لکھتے چلے آئے ہیں اور نہ اس کا اساسی تعلق برج بھاشا سے ہے، بلکہ اس زبان کا وجود اس زمانے سے ہے جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہوئے۔ اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی میں جاتی ہے۔ جس زبان سے اردو ترقی پاتی ہے وہ نہ برج ہے نہ ہریانی نہ قنوجی بلکہ وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اردو زبان اپنی صرف و نحو میں ملتانی زبان کے بہت قریب ہے۔ پنجابی اور اردو میں ساٹھ فیصدی الفاظ کا اشتراک ہے۔

حافظ صاحب کے نزدیک اردو اسی وقت بننی شروع ہو گئی تھی جب محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور شمال مغربی سرحد سے مختلف قومیں ہندوستان میں داخل ہونے لگیں۔ انہوں نے اس ملک کی اس زبان میں، جو پنجاب میں بولی جاتی تھی، اپنی زبانوں کے الفاظ داخل کیے اور وہ چونکہ ملتانی تھی اس لیے اردو زبان بنیادی اعتبار سے پنجابی ہی ہے، جس کو دہلی پہنچ کر سرکاری دربار کے تعلق کی وجہ سے موجودہ شکل نصیب ہوئی۔ حافظ

صاحب نے اپنے دعوے کے ثبوت میں جو شہادتیں فراہم کی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا وجود بہت قدیم ہے۔ پھر پنجابی اور اردو کے سینکڑوں مشترک الفاظ اور اسماء افعال کا ذکر کیا ہے۔ قدیم اردو پر پنجاب کا اثر واضح کرنے کے لیے اردو کے بے شمار پرانے فقروں اور شاعروں کے تذکرے قلمبند کیے ہیں۔ آخر میں گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری کے متعدد پنجابی شعراء کا ذکر فرمایا ہے' جن میں سے اکثر نہایت صاف ستھری اردو میں شعر کہتے تھے اور پنجاب کے بعض شہروں میں اردو کا ویسا ہی چرچا ثابت کیا ہے جیسا بعد میں دہلی اور لکھنؤ میں ہوا۔ یہاں تک کہ ایک دو نثر نگاروں کی اردو عبارت کے نمونے بھی مہیا کر دیے ہیں حالانکہ اس وقت اردو میں نثر بہت ہی کمیاب تھی۔

یہ چند سطور میں نے محض بر سبیل تذکرہ قلمبند کر دی ہیں' ورنہ قارئین کتاب کو کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اس میں فاضل مصنف نے نہ صرف مباحث کی سیر حاصل تفصیل دے دی ہے بلکہ خود اپنے قلم سے ایک مقدمہ بھی تحریر کر دیا ہے' جس کے بعد کسی اور دیباچے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ میرے نزدیک اہل پنجاب پر اور اردو زبان پر حافظ محمود شیرانی کا یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ ہم اس کے شکریہ سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ جب تک اردو زبان باقی ہے' اہل پنجاب اس امر پر ناز کرتے رہیں گے کہ یہ ہماری زبان ہے اور اس کا سرچشمہ ہماری ہی سرزمین سے پھوٹا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمیں اس فخر و ناز کا موقع حافظ صاحب ہی کی علمی تحقیق سے حاصل ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی روح پر اپنی ہزاروں ہزار رحمتیں نازل کرے۔

(در: پنجاب میں اردو۔ لاہور: معین الادب، 1949ء۔ دیباچہ)

ڈاکٹر محمد باقر

حافظ محمود خاں شیرانی: تحقیق کا طریق کار اور معیار

بعض آدمی یہ کہتے سنے گئے ہیں کہ شبلی کی ''شعر العجم'' زندۂ جاوید کتاب ہے اور شیرانی کی ''تنقید شعر العجم'' کے باوجود تا ابد زندہ رہے گی لیکن ''تنقید شعر العجم'' کی عمر کوئی لمبی نہیں ہے۔ راقم ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ یہ دونوں معروضات کا ملاً درست نہیں ہیں۔ جو لوگ فارسی شاعری کی ادبی چاشنی سے لذت اندوز ہونا چاہیں گے اور سرسری طور پر اس کے تاریخی پس منظر سے شناسائی چاہیں گے، وہ ہمیشہ ''شعر العجم'' سے استفادہ کرتے رہیں گے لیکن جو طالب علم صدق وحقائق کی تلاش میں نکلیں گے، وہ ''تنقید شعر العجم'' سے ضرور صحیح راہ تلاش کریں گے۔ اس حیثیت سے یہ دونوں آثار فارسی علم و ادب کے میدان میں معرکۃ الاراء تخلیقات ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جہاں ایران میں ''شعر العجم'' کا فارسی ترجمہ شائع کیا گیا ہے، وہاں ''تنقید شعر العجم'' کو بھی فارسی لبادہ اڑھایا گیا ہے اور شیرانی کے کسی دعوے کو آج تک جھٹلایا نہیں جا سکا۔

استاد گرامی حافظ محمود خاں محمود شیرانی اپنے دور کے غالباً سب سے بڑے محقق تھے جنہوں نے پاک و ہند اور ایران سے متعلق فارسی میں محفوظ علم و ادب اور تاریخ اور اردو زبان پر اس تحقیقی قطعیت کے ساتھ قلم اٹھایا کہ اس کی مثال نادر کالشاذ ہے۔ اردو کے شعراء اور ادباء تاریخ ادب اردو کی تدوین میں ایک عرصے سے مشغول ہیں۔ انہوں نے تنقید و تبصرہ کے میدان میں بعض دفعہ عمدہ کام کیا ہے، لیکن لسانی تحقیق میں بہت کم کام ہوا ہے۔ اس سنگلاخ وادی میں غالباً سب سے پہلے شیرانی صاحب اترے ہیں اور انہوں نے غیر پنجابی ہونے کے باوجود پنجاب سے اردو کے قدیم رشتوں کو تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ کام بڑا کٹھن تھا کیونکہ عام تجربہ یہ ہے کہ تحقیق کرنے والے معروف اہل زبان چونکہ زبان کی پیدائش کے علاقے پنجاب کو نہیں پہچانتے، جس کے ایک حصے کا نام دو تین صدیاں پہلے پنجاب پڑ گیا تھا، اس لیے وہ لسانی اعتبار سے تحقیقی کام کرنے کی استعداد اور اہلیت بھی پیدا نہ کر سکے، لیکن مرحوم شیرانی نے ان پیدائشی Drawbacks کے باوجود بڑی پامردی سے اس میدان میں قدم رکھا اور اردو پر لسانی تحقیقات کرنے والوں کو کئی نئی راہیں سجھائیں۔

آج کی صحبت میں مَیں اس میدان میں کام کرنے والوں کے لیے اپنے استاد شیرانی مرحوم کے طریق کار کو پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ ہمارے معاصرین اور ہم سے بعد میں آنے والے حضرات کو معلوم ہو سکے

کہ وہ اتنے اعلیٰ معیار کی تحقیق کس طرح کیا کرتے تھے۔

شیرانی صاحب دراصل وکالت کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ اس زمانے میں میٹرک پاس طلبہ کو بیرسٹری میں داخلہ مل جاتا تھا۔ حافظ صاحب مرحوم کی یہی تعلیم تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا ہوا تھا۔ بدقسمتی سے اپنے والد کی وفات کی وجہ سے وہ انگلستان میں اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لیے انہوں نے فارسی عربی کا مطالعہ شروع کیا۔ یہ روشن نہیں کہ مجوزہ تعلیم کا منصوبہ ترک کرنے کے بعد کن لوگوں سے ان کے روابط استوار ہوئے' لیکن ایک بات واضح ہے کہ معیاری تحقیق کا جذبہ اسی وقت بیدار ہوا۔

وطن واپس پہنچے تو سر شیخ عبدالقادر کی سفارش پر انہیں اسلامیہ کالج لاہور میں استاد کی حیثیت سے کام ملا' لیکن تدریس کی بجائے ان کا تمایل تحقیق کی طرف زیادہ تھا اور وہ سوچنے لگے تھے کہ اردو کی پیدائش کیسے اور کہاں ہوئی؟ ان کا اولین معیار تحقیق یہ تھا کہ جب تک قوی شواہد موجود نہ ہوں' اس وقت تک بات قیاسی رہ جاتی ہے اور پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔

پھر شواہد کی تلاش میں وہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے اور اس کے لیے وہ بساط بھر صرف مال و جان کرتے رہے' مثلاً ایک سکے کے سوا اکبر کے سکوں کا پورا سلسلہ ان کے پاس موجود تھا۔ یہ بات میں بعد میں بیان کروں گا کہ شہنشاہوں کے سکوں کے کامل سلسلے بہم پہنچانے میں ان کے ملحوظ خاطر کیا ہدف تھا اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنے شاگردوں کی تربیت کیسے کی۔ فی الحال صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے ایک دن مجھے اس صورت حال سے آگاہ کیا اور اپنے ساتھ گجرات چلنے کے لیے کہا۔ میں اس وقت (1933ء) میں ان کا طالب علم تھا اور اس سے پہلے گورنمنٹ کالج گجرات میں زیر تدریس رہنے کی وجہ سے شہر گجرات کے جغرافیہ اور اشخاص سے مانوس تھا۔ گجرات میں اس وقت ایک پادری مارٹن صاحب سکے جمع کر کے بیچا کرتے تھے۔ ہم ریلوے سٹیشن سے تانگہ لے کر مارٹن کے گھر پہنچے۔ پادری بڑی تواضع سے پیش آیا اور حافظ صاحب نے مطلوبہ سکے کا مطالبہ کیا تو وہ فوراً اندرون خانہ سے سکہ لے آیا۔ شیرانی صاحب نے اس چمکتے ہوئے سکے کو ایک نظر دیکھا تو چارپائی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مارٹن مول تول کرنے کی تجاویز کر رہا تھا لیکن شیرانی صاحب اس کی کسی بات کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ واپسی پر راستے میں انہوں نے بتایا کہ اس آدمی کے پاس اکبر کا اصلی سکہ یا موجود ہے یا اس کی دسترس میں ہے لیکن یہ اس کی مجہول تیار کر کے بیچ رہا ہے اور جب تک یہ کافی جعلی سکے فروخت نہ کر لے گا' اس وقت تک یہ اصلی سکے کی نشاندہی یا فروخت کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا' اس لیے اس سے اس وقت سودا کرنا بیکار ہے۔ ہم مارٹن کے مکان سے صرافہ بازار میں پہنچے۔ وہاں شیرانی صاحب نے مختلف زرگروں سے استفسار کیا اور پھر ایک سنار کی دکان پر دھرنا مار کر بیٹھ گئے۔ اس نے ایک چیتھڑے میں بندھے ہوئے تانبے اور چاندی کے سکے ڈھیر کر دیے۔ شیرانی صاحب نے ان کو ایک نظر الٹ پلٹ کر دیکھا اور

سنار سے سودا کرنے کے بعد یہ طے پایا کہ چاندی کے تمام سکے چاندی کے بھاؤ تول کر لیے جائیں گے اور تانبے کے چار آنے فی سکہ کے حساب سے۔ زرگر نے سکے تول دیے اور شیرانی صاحب نے قیمت ادا کر دی۔

دوپہر کا کھانا میرے مکان پر گجرات میں تھا' وہاں آپ نے پھر چھتڑے کو کھولا اور ایک سکہ نکال کر اسے غور سے دیکھنا شروع کیا۔ پھر مسکراتے ہوئے میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ساتھ ہی فرمایا "تم نے سنا' مارٹن صاحب اسی زرگر کا ذکر کر رہے تھے اور غالباً اسی زرگر سے اکبر کے اس سکے کی نقلیں بنوا رہے تھے۔ پھر نقل کی قیمت دس گنا مانگ رہے تھے۔ میں نے اصل سکہ چاندی کے وزن کے حساب سے خرید لیا ہے۔" وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

سکوں اور خطی نسخوں کی تلاش کے وقت شیرانی صاحب نے متعدد مرتبہ مجھے ہمرکابی کا شرف بخشا۔ انہیں جب معلوم ہو جاتا کہ ہندوستان کے فلاں شہر میں فلاں شخص کے پاس ایک نادر نسخہ یا سکہ ہے تو وہ ہر قیمت پر اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ ان کے پاس خطی نسخوں کا ایک نادر ذخیرہ موجود تھا اور مغل شہنشاہوں کے سکوں کے سونے اور چاندی کے کامل سلسلے بھی تھے۔

شواہد اور ثبوت کے متعلق بھی شیرانی صاحب کا معیار نہایت عالمانہ تھا۔ وہ یہ صحیح طور پر سوچتے تھے کہ تاریخی واقعات کی صحت جانچنے اور پرکھنے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ:

معاصر تاریخوں سے ثبوت اور دلیل مہیا کی جائے۔ بعد کی تواریخ کتنی بھی مقبول کیوں نہ ہوں' اس تاریخ کے برابر نہیں ہو سکتیں جو معاصرین نے مرتب کی ہیں کیونکہ ہر مورخ جب سنی سنائی یا اپنے سے پہلے لوگوں سے تاریخی واقعات نقل کرتا ہے تو اس کا امکان موجود رہتا ہے کہ اس شک اور ظن کی بدولت حقیقت مسخ ہو جائے۔

شیرانی صاحب اس مطمح نظر کو پیش نظر رکھ کر کتابوں کے معاصر خطی نسخے اور سکے جمع کیا کرتے تھے تاکہ واقعات کی چھان بین کے لیے صحیح طور پر استناد ہو سکے۔ ایک مثال عرض کروں گا۔

امیر خسرو کی بے حد کمیاب مثنوی "تغلق نامہ" مجلس مخطوطات فارسی حیدر آباد (دکن) کی طرف سے 1933ء میں شائع ہوئی۔ یہ مثنوی مولوی رشید احمد مرحوم نے کتاب خانہ حبیب گنج کے ایک قلمی نسخہ سے نقل کی تھی۔ مرحوم کی بے وقت موت کے بعد یہ مثنوی سید ہاشمی فرید آبادی نے ایک دیباچہ اور خلاصہ مثنوی کے اضافے کے ساتھ شائع کی۔ اس دیباچے اور مقدمے پر سید مقبول احمد صمدانی نے ہندوستانی اکیڈمی کے تماہی رسالہ (اشاعت جولائی 1934ء) میں تنقید و تبصرہ کیا۔ شیرانی صاحب کو اس تنقید سے اختلاف تھا۔ انہوں نے مجھ سے اس کی تردید لکھنے کے لیے کہا۔ میں اس وقت تک ان سے تربیت حاصل کر کے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ میں ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ ہاشمی صاحب نے "تغلق نامہ" کی تاریخی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس مثنوی سے بہت سے تاریخی واقعات کی تفاصیل بہم پہنچتی ہیں اور

کئی ایک مورخین کے غلط بیانات کی تصحیح ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے قطب الدین مبارک کے قتل کی تاریخ جمادی الاخر 270ھ کی چاندرات امیر خسرو کے ذیل کے اشعار سے اخذ کی:

چو تاریخ عرب شد ہفصد و بیست
ثبات قطب شد کم جانب زیست
جماد دومین را شد پدیدار
ہلال تیرہ و تاریک دیدار
شد آن مہ برہمہ گیہان مبارک
مگر بر طالع سلطان مبارک

اور پھر غازی ملک تغلق کی تخت نشینی کی تاریخ پہلی شعبان 720ھ ذیل کے شعر سے نکالی:

چو صبح غرۂ شعبان فرخ
نمود از تخت گاہ آسمان رخ

سید مقبول احمد اس پر معترض تھے اور مشہور مستشرق بیل (Beale) ''اورینٹل بیاگریفکل ڈکشنری'' کے مصنف اور معروف مورخ فرشتہ کے حوالے سے اس پر مُصر تھے کہ خلجی سلطان قطب الدین مبارک کا قتل اور غازی ملک تغلق کی تخت نشینی 720ھ میں نہیں بلکہ 721ھ میں ہوئی تھی۔ شیرانی صاحب نے میری راہنمائی کرتے ہوئے کہا کہ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ فرشتہ اور بیل دونوں قطب الدین مبارک سے بہت بعد کے آدمی ہیں۔ ان کی بات بدون تامل نہیں مانی جاسکتی۔ ''تاریخ فیروز شاہی'' کا مصنف برنی اس عہد کے قریب اور معاصر ہونے کی وجہ سے زیادہ قابل اعتماد ہے۔ چنانچہ میں نے برنی کو دیکھا تو اس نے حروف میں تغلق شاہ کا سنہ جلوس 720ھ بیان کیا ہے۔

اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ایسے مواقع پر شیرانی مرحوم سکوں سے بھی مدد لیا کرتے تھے اور سکے جمع کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ تاریخی واقعات کی جانچ پرکھ کے لیے انہیں استعمال کیا جائے' چنانچہ راقم نے بھی ان دونوں بادشاہوں کے سکے تلاش کرنے شروع کیے۔

ہندوستان میں سلاطین دہلی کے جو سکے اس وقت موجود تھے ان کی مفصل فہرستیں شائع ہوچکی ہیں۔ ان میں قطب الدین مبارک کے سونے' چاندی اور تانبے کے دستیاب ہونے والے سکوں کی جو تفصیل درج ہے وہ سب کے سب 717ھ اور 720ھ کے بین بین مسکوک ہوئے ہیں۔ 721ھ کا کوئی سکہ نہیں ملتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قطب الدین مبارک کا عہد 721ھ سے پہلے ختم ہو چکا تھا اور وہ 721ھ میں زندہ نہیں تھا لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ 721ھ کے سکے دستیاب نہ ہوئے ہوں۔

اس کے بعد مجھے ناصر الدین خسرو خاں کے سکے تلاش کرنے پڑے۔ یہ غدار وزیر اور قطب الدین

مبارک کا غلام اپنے آقا کو قتل کر کے تخت دہلی پر متمکن ہو گیا تھا۔ دہلی کی ٹکسال کا ایک سکہ دستیاب ہوا' جو خسرو خاں نے بنوایا تھا اور اس کے حاشیے پر 720ھ کا سال حروف میں درج تھا۔ ظاہر ہے کہ خسرو خاں اپنے بادشاہ کی موجودگی میں اپنے نام کا سکہ نہیں چلا سکتا تھا اور اس وقت مبارک کا قتل ہو چکا تھا۔ راقم نے پھر غیاث الدین تغلق شاہ کے سکے تلاش کیے تو اس کے بھی 720ھ کے متعدد سکے مل گئے۔ ان سے بھی ثابت ہوا کہ خسرو خاں کے بعد تغلق شاہ بھی 720ھ میں تخت پر بیٹھ گیا تھا۔ میری یہ ساری تحقیق ''معارف'' (اعظم گڑھ) میں شائع ہوئی اور شیرانی صاحب اسے دیکھ کر بہت مطمئن ہوئے۔

شیرانی مرحوم کا تحقیقی معیار یہ بھی تھا کہ وہ سند کے بغیر کسی دعوے کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتے تھے۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے جب ان سے ''تنقید شعرالعجم'' لکھوائی تو ''شعرالعجم'' کی جا بجا تصحیح کے لیے انہوں نے صرف ایک ہی طریقہ اختیار کیا کہ شعراء کے اپنے کلام اور معاصر تواریخ سے شواہد اور دلائل فراہم کیے۔ انہوں نے مولوی شبلی نعمانی کی علمیت اور فضیلت کو تسلیم کرتے ہوئے تحقیق کے میدان میں ان کے روایتی ٹھاٹھ کو وقعت نہ دی اور مستند حوالوں سے انہیں جو کچھ دستیاب ہوا' اس کے بل پر شبلی کی تصحیح کی۔

مختصراً شیرانی مرحوم کا طریق کار یہ تھا کہ موضوع زیر بحث پر تحقیق کرنے کے لیے سب سے پہلے مستند مواد جمع کیا جائے۔ تاریخی' لسانی اور ادبی مواد میں وہ صحیح معاصر خطی نسخوں' سکوں' فرامین اور تاریخ دار ظروف' کتبوں' پارچات اور چوبی شواہد وغیرہ کو اولیت کا درجہ دیتے تھے۔ پھر اگر روایت کے تواتر کے شواہد ہاتھ آتے تو وہ انہیں ثانوی حیثیت سے سنین کے قریب و بعید کے مطابق درجہ دے کر استعمال کرتے۔ اس سلسلے میں انہوں نے تجربے کی کثرت اور تاریخ کے عمیق مطالعہ میں اتنی مہارت پیدا کر لی تھی کہ وہ اصل اور نقل میں آسانی سے تمیز کر لیتے تھے اور بسا اوقات کاغذ دیکھ کر خطی نسخے کی عمر معین کر لیتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مغل شہنشاہوں کے دور میں شاہجہاں کا زمانہ کثرت ثروت کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہم اور عمدہ وقت ہے' لہٰذا اسی دور میں ہندوستان میں کاغذ بھی عمدہ بننا شروع ہو گیا تھا۔ اسی طرح سے شاہجہان کے زمانے میں جب ہندوستان میں قالین بافی شروع ہوئی تو ہندوستان کے بنے ہوئے قالین ایرانی قالینوں سے زیادہ قیمت پر بکنے لگے۔ شیرانی مرحوم کا خیال تھا کہ ہندی مسلمانوں نے جہاں کتابت' مصوری اور معماری میں عدیم المثال اور نادر نمونے پیش کیے ہیں' وہاں پارچہ بافی اور قالین بافی میں بھی اپنے نبوغ ہنر کی حسین و جمیل نمائش کی ہے اور ثروت اور وسائل کی تکثیر و تقلیل کے ساتھ ہنر کاری مفید اور تزئینی ہنروں کا معیار بدلتا رہا ہے۔ انہوں نے خود بڑے خوبصورت اور حسین کھیس جمع کر رکھے تھے اور قدیم کپڑوں کی عمر بھی وہ ہنر کے معیار کو جانچ کر مقرر کر سکتے تھے' یعنی ان کے مطالعہ اور تحقیق کا عملی اور مثبت پہلو یہ تھا کہ وہ اپنے علم سے ماضی کے دریچوں میں بہ وثوق جھانک سکتے تھے۔ افسوس ہے کہ شیرانی کی روایت بہت دور اور بہت دیر تک نہ چلی۔ استقلال پاکستان سے ذرا پہلے ان کا قیمتی کتب خانہ تو پنجاب یونیورسٹی کے قبضے میں آ گیا' لیکن پاکستان کی

مخطوطات مقتدرہ کی عدم توجہی کی وجہ سے ان کے سکے تول کر ایک ہندو مارواڑی ہندوستان لے گیا۔ ان کے دام غالباً 25 ہزار پڑے۔ وزن کے حساب سے بھی یہ اب 25 لاکھ کے ہوں گے' لیکن قدر کے اعتبار سے شاید انمول ہیں۔ اتلاف کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ پاکستان کی تاریخ اور ثقافت سے متعلق پرزے اغیار خرید کر اپنے ملک میں لے جا رہے ہیں اور یہاں جن لوگوں کے پاس پڑے ہیں وہ ضائع ہو رہے ہیں' کیونکہ یہاں تحقیق کرنے والے جاندار انسانوں کا کوئی پرسان حال نہیں۔ بے جان کتابوں' سکوں' فرامین اور دیگر وثائق کو کوئی کیا کرے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہاں بہت سے شیرانی پیدا ہونے بھی ختم ہو گئے ہیں۔

(در: اورینٹل کالج میگزین۔ 1974ء خصوصی شمارہ
بتقریب جشن صد سالہ تاسیس اورینٹل کالج۔ لاہور' ص 113-120)

مولوی عبدالحق

پنجاب میں اردو

یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ ہر صوبہ اردو کو اپنی زبان بتاتا ہے اور مدعی ہے کہ یہ زبان وہیں بنی اور وہیں سے نکلی۔ سب سے پہلے یہ صدا دکن سے اٹھی اور اسے اس کا حق تھا' اس لیے کہ ابتدا میں اسی نے اس کی نشوونما کی اور اس کی ادبی حیثیت کو فروغ دیا۔ اس کے بعد یہ آواز پنجاب سے آئی۔ اسے بھی حق حاصل ہے کیونکہ زمانۂ حال میں پنجاب نے اردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ پنجاب کے بارے میں اس سے قبل بھی دو ایک صاحبوں نے ایسا خیال ظاہر کیا تھا' لیکن وہ محض قیاس ہی قیاس تھا۔ اب پروفیسر محمود شیرانی صاحب نے اس پر ایک مستقل کتاب لکھ ڈالی ہے۔

قابل مصنف اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ ''یہ (اردو) زبان اسلامی دور میں دہلی کے اثرات میں بنی ہے۔'' امیر خسرو اور ابوالفضل اس زبان کو دہلوی کہتے ہیں۔ اب اس پر سے وہ یہ قیاس کرتے ہیں کہ چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی گئے' اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں۔ یہ پروفیسر صاحب کا قیاس ہے' لیکن ساتھ ہی وہ ازروئے انصاف یہ بھی کہتے ہیں کہ ''اس نظریہ کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم شہادت یا سند نہیں' لیکن سیاسی واقعات اور اردو زبان کی ساخت نیز دوسرے حالات ہمیں اس عقیدے کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔''

سیاسی واقعات کی بنیاد صرف اس قیاس پر ہے کہ پنجاب سے مسلمان ہجرت کر کے گئے' اس لیے جو زبان وہ وہاں سے ساتھ لیتے گئے' وہی دلی میں بولی جانے لگی اور یہ وہی زبان تھی جو اب اردو کہلاتی ہے۔ یہ کسی صورت سے بھی قابل تسلیم نہیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو شخص پنجاب سے ہو کر یا وہاں رہ کر دہلی آئے تو وہ اپنی زبان دہلی میں رائج کر دے گا۔ اول تو یہ قیاس ہی صحیح نہیں کہ مسلمانوں کی ہجرت پنجاب سے یکبارگی اس کثیر تعداد میں ہوئی کہ وہ دہلی پر اس طرح چھا گئے کہ انہیں کی زبان رائج ہو گئی اور سب اہل دہلی اور نواح دہلی نے اسے اختیار کر لیا۔ دوسرے پنجاب کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہاں کوئی زبان مستقل طور سے بن سکتی۔ وہ اس زمانے میں اس قدر پامال رہا اور اس کی حالت ایسی ناقابل اطمینان تھی کہ وہاں اس کی توقع ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ باقی رہا یہ امر کہ بعض الفاظ پنجاب سے آئے اور وہ دہلی میں رائج ہو گئے تو اسے تسلیم کرنے میں کسی کو عذر

نہیں ہو سکتا۔ یہ ہر زبان میں ہوا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ دنیا کی کوئی زبان یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ آ کر نہیں مل گئے۔ کسی زبان کے بننے کے لیے امن' استقلال حکومت اور تہذیب و شائستگی کا ہونا ضروری ہے اور یہ دہلی ہی میں میسر ہوا۔

مسلمان جو غزنی' ترکستان اور ایران سے آئے تھے' ان کی اپنی زبان فارسی تھی اور آپس میں یہی بولتے تھے۔ خاص ضرورت کے وقت یا نوکر چاروں سے جو مقامی زبان میں ایک آدھ فقرہ بول لیا جاتا ہے' اس کی حالت جیسی کچھ ہوتی ہے' وہ ظاہر ہے۔ جسے اس کی شان دیکھنی ہو وہ کسی انگریز کو اردو بولتے ہوئے دیکھ لے۔ ایک افغانی' ترکی یا ایرانی کے لیے یہاں کی زبان ایسی ہی اجنبی تھی جیسے انگریز کے لیے۔

پگ' منھ' انب' گاڈی' گڈی' تل وغیرہ الفاظ کے لیے آٹھویں اور نویں صدی کی کتب تاریخ و لغات کی شہادت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب بھی یہ الفاظ کسی طرح دیہات اور بعض شہروں میں برابر بولے جاتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں کہ آٹھویں نویں صدی میں یہ الفاظ پنجابی سے آئے اور اب اہل ہندوستان انہیں پاگ' ماٹ' آم' گاڑی' گڑیا' تالاب بولنے لگے۔ ان الفاظ کی اصل ایک ہے' دونوں طرح بولے جاتے تھے۔ ایک صورت ادبی زبان میں متروک ہوگئی' دوسری رہ گئی لیکن بول چال میں اب تک یہ الفاظ دونوں طرح بولے جاتے ہیں۔ اصل ایک ہی ہے۔ البتہ مختلف مقامات میں آوازوں میں اختلاف ہوگیا۔ مثلاً آم کو سنسکرت میں انبہ کہتے ہیں۔ اسی سے انب ہوا اور اسی سے آم بنا۔ مونگ سنسکرت میں مدگ ہے۔ اسی سے مونگ اور منگ بن گیا۔ جامن کو سنسکرت میں جمو کہتے ہیں۔ اسی سے جامن اور جمو ہوگیا۔ سنسکرت میں لوک ہے۔ پہلے لوک ہی لکھتے اور بولتے تھے۔ بعد میں لوگ کہنے لگے۔ پرانی اردو کی کتابوں میں لوک ہی آتا ہے۔ اکھنا جو پنجابی اور پرانی (دکنی' گجراتی) اردو میں استعمال ہوتا ہے' سنسکرت کا اکھیان ہے۔ جس سے دیا کھان بھی بنا ہے۔ ان لفظوں کو پنجابی قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

فارسی لغات بھی اس معاملے میں مستند نہیں ہو سکتیں۔ انہوں نے فارسی الفاظ کے مقابل ہندی کے مقامی الفاظ لکھ دیے ہیں۔ اردو یا ہندی اس وقت سیال حالت میں تھی اور فصیح اور غیر فصیح کا کوئی معیار قرار نہیں پایا تھا' یہ سب باتیں بعد کی ہیں۔ مثلاً کبھیں' کبھو' کبھی تینوں استعمال ہوتے تھے۔ کبھو اب تک استعمال ہوتا ہے اور اب بھی بعض بعض مقامات پر بولا جاتا ہے لیکن ادبی زبان میں غیر فصیح قرار پایا اور کبھی عام طور پر استعمال ہونے لگا یا ''جاے ہے اور جاتا ہے'' ذوق و غالب کے وقت تک بولے اور لکھے جاتے تھے۔ اب ''جاے ہے'' متروک ہوگیا۔ اس کے یہ معنے نہ ہوں گے کہ یہ لفظ جو اب فصیح مان کر استعمال ہونے لگے ہیں' کہیں دوسری جگہ سے آ گئے ہیں۔

اس معاملے میں اسماء و صفات کی شہادت سند نہیں ہو سکتی۔ البتہ افعال خاص طور پر قابل لحاظ ہوتے ہیں۔ یہ خیال کہ پنجابی افعال کے آخر الف آتا ہے اور اردو میں بھی یہی۔ اسی لیے اردو پنجابی سے بنی ہے' صحیح

معلوم نہیں ہوتا۔ ہندی کی کئی شاخوں میں یہ صورت قدیم سے چلی آ رہی ہے اور اس کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

ہیم چندر سوری نے اپنی کتاب سدہ ہیم شبدانشاسن (نحو) میں سمبت 800' 900 کی اب بھرامش (بگڑی) بھاشا کا جو نمونہ دیا ہے اس میں ایک یہ شعر:

بھلا ہوا جیو ماریا بھینی مارا کنتو لجے جنتو ویسی ہو جد بھگا گھر ایتو

اس میں ماضی مطلق وہی ہے' جواب بھی استعمال ہوتی ہے۔ امیر خسرو اور کبیر کے ہاں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ مثلاً

بھید پہیلی میں کہی سن لے میرے لال عربی فارسی ہندی تینوں کرو خیال

(امیر خسرو)

رات گنوائی سوئے دوس گنوائیو کھائے ہیرا جنم انمول تھا کوڑی بدلے جائے

(کبیر)

دھن راجا تویں راج بھسینکھا جہ کی جانس سب کچھ دیکھا

(ملک محمد جائسی)

دوسرے افعال:۔

کبیر گرو نہ کیجئے کال کہے کر کیس ناجانو کت ماری ہے کیا گھر کیا پردیس

(کبیر)

سائیں اتنا دیجئے جا میں کٹ سمائے میں بھی بھوکا نا رہوں اور سادھو نہ بھوکا جائے

(کبیر)

آیا ہے سو جائے گا راجا انک فقیر ایک سنگھاسن چڑھ لے ایک بندھے جنجیر

(کبیر)

کبیر اور میرا بائی دو ایسے شاعر ہیں' جو عوام کی بول چال میں سادہ ہندی لکھتے ہیں اور اس لیے ان کی زبان سند ہو سکتی ہے:

درد کی ماری بن بن ڈولوں وید ملیا نہیں کوئے
میرا کی پر بھو پیڑ مٹے گی جب وے سانولیا ہوئے

(میرا)

بھائی چھوڑیا' بندھو' چھوڑیا' چھوڑیا سگا ہوئے

(میرا)

آج کہے کل بھجوں گا کالے کہے پھر کال
آج کال کے کرت ہی او سر جا سی چال
(کبیر)

سی علامت مستقبل ہے۔ پنجاب کے بعض ضلعوں میں بھی مستقبل کی یہ صورت مستعمل ہے لیکن یہ علامت پنجاب سے نہیں آئی بلکہ اس کی اصل سنسکرت سے ہے۔

سنسکرت میں لفظ شیشی علامت مستقبل ہے' جو آگے چل کر سیتی بھی ہوگیا ہے اور پھر ہندی کی مختلف (شاخوں) زبانوں میں یہ لاحقہ مختلف شکلیں اختیار کرلیتا ہے۔ گجراتی میں یہ جا کر مفرد کے لیے ایش ہو جاتا ہے اور جمع کے لیے (شے) جیسے کہیش (کہے گا) اور جائیش (جائے گا) اور کرشے (کریں گے) اوشے (آئیں گے)۔ پنجابی میں یہ "سی" ماضی متعدی اور مستقبل کے لیے مستعمل ہے۔ مشرقی راجستھانی میں بھی مستقبل کے لیے آتا ہے۔ (اے سی' سوں' ساں' سو) اسی طرح ریوائی اور بھوج پوری زبانوں میں بھی لہجے کے کسی قدر اختلاف کے ساتھ اس کا استعمال مستقبل کے لیے اب تک رائج ہے اور پراکرت میں یہ لاحقہ سنس' سامی' ہسی وغیرہ کی صورت میں استعمال ہوتا تھا۔ سواپتی میں بھی جس سے برج بھاشا گجراتی وغیرہ زبانیں نکلی ہیں' یہ لاحقہ اس صورت میں پایا جاتا ہے۔ اپ بھرنشا (بگڑی ہوئی پراکرت) میں اس کی صورت سوں' سسوں' سی' سسے' سئی وغیرہ ہے۔ پرانی دکنی میں بھی یہ "سی" فعل مستقبل کے لیے اسی طرح استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ "سب رس" اور بعض دوسری کتابوں نیز شاہ برہان وغیرہ کے کلام میں بلاتکلف استعمال ہوا ہے جیسے کرسی' جاسی' ہمیں نا کرسیں' نادیکھسوں' کرسوں' کہسوں وغیرہ۔

اب پنجابی کے دوسرے افعال دیکھیے۔ جاوندا' کھاوندا (جانا' کھانا) آیا سی' گیا سی (آیا تھا' گیا تھا) کردا اے (کرتا ہے) ان صورتوں کا کوئی تعلق اردو سے نہیں۔

اسی طرح ضمائر میں فرق ہے۔ اسی (ہم) تسی (تم) اردو سے بالکل اجنبی ہیں۔

پنجابی اور اردو کے اکثر الفاظ کی تذکیر و تانیث کی مشابہت بھی کوئی ثبوت اس کا نہیں کہ پنجاب سے اردو پہنچی ہے۔ قدیم اردو کو دیکھا جائے تو اس میں تذکیر و تانیث کے معاملے میں بڑی آزادی تھی اور آج کل کی طرح تشدد نہ تھا۔ اس وقت یہ ثبوت پیش کرنا کچھ مفید نہیں ہو سکتا بلکہ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کا اثر پنجابی پر پڑا ہے۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ پنجابی میں جو تھوڑی بہت مشابہت اردو سے پائی جاتی ہے' وہ اردو کا اثر ہے نہ پنجابی کا۔ اردو مسلمانوں کی ایک عام زبان ہوگئی تھی اور اس لیے ہر صوبے کے نامور شاعر اسی زبان میں شعر کہتے تھے تاکہ ان کے کلام کو زیادہ شہرت اور مقبولیت ہو۔ چنانچہ دکن' گجرات نیز پنجاب میں اس کا رواج ہو گیا تھا۔ اسی طرح ہندوؤں میں ہندی عام زبان تھی اور دوسرے مقامات کے لوگ بھی ہندی میں شعر کہتے تھے۔

مثلاً مرہٹوں میں کئی نامور شاعر ایسے گزرے ہیں جن کا کلام ہندی میں بھی پایا جاتا ہے' حالانکہ ہندی ان کی مادری زبان نہ تھی۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اصل مضمون کی تحقیق میں ضمنی باتیں زیادہ کارآمد اور قابل قدر نکل آتی ہیں۔ یہی حال اس کتاب کا ہے۔ فاضل پروفیسر شیرانی کو اگرچہ اصل بحث میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی' لیکن اس ضمن میں انہوں نے ایسی ایسی تحقیق کی ہے جو نہایت قابل قدر ہے۔ اس میں شمالی ہند اور پنجاب کے قدیم اردو لکھنے والوں کو جو انہوں نے کھوج لگا کر نکالا ہے' وہ بالکل نئی چیز ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے ادبی اور لسانی نکات ایسے پائے جاتے ہیں جو ہر لحاظ سے لائق تحسین ہیں۔

پروفیسر شیرانی کی یہ کوشش اردو داں طبقے کے لیے قابل فخر ہے۔

(در: اردو' جولائی 1928ء' ص 469 بعد۔ نیز در: تنقیدات عبدالحق مرتبہ محمد تراب علی خان باز' حیدرآباد دکن' 1934ء' ص 126-133)

سید نجیب اشرف ندوی

پنجاب میں اردو

اگر یہ حقیقت صحیح ہے کہ پرانے کھنڈر' بوسیدہ عمارتیں' زنگ خوردہ اسلحہ' قدیم کپڑے' عہد ماضی کے ظروف' تاریخی سکے' کتبے اور دوسری اثری چیزیں ہم کو ایک قوم کے عہد ماضی کے تمدن و تہذیب' معاشرت و عمرانیت' علوم و فنون' صنعت و حرفت کو بتاتی ہیں تو اس سے صحیح تر حقیقت یہ ہے کہ ایک قوم کی تاریخ' اس کی ادبیات اور اس کے ذہنی کارنامے ان سے کہیں واضح تر طریقہ سے ان نتائج تک ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ پنجاب کے مشہور محقق انشاء پرداز جناب پروفیسر محمود شیرانی نے اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر اپنی زیر تنقید پُر از معلومات تصنیف میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان کی مشترک زبان ''اردو'' نے اپنا ابتدائی دور' ارتقاء پانچ دریاؤں والی سرزمین میں گذارا ہے اور ابتدائی اردو کو پنجابی سے بہت کچھ مناسبت' مشابہت اور مماثلت ہے۔ چنانچہ وہ اپنے عرض حال میں اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> ''اردو زبان کے آغاز کا سرزمین پنجاب سے منسوب ہونا کوئی نیا نظریہ یا عقیدہ نہیں ہے۔ اس سے پیشتر پنڈت کیفی (بعقیدہ خود مذاق کے طور پر) اور شیر علی خاں صاحب سرخوش اپنے پُر لطف تذکرہ ''اعجاز سخن'' میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں مگر اس کتاب میں اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ نظر ڈالی گئی ہے[1]۔''

کتاب کی ترتیب یہ ہے۔ سب سے پہلے ایک مقدمہ (ا۔ط) ہے' اسے اجمالاً کتاب کا خلاصہ کہنا چاہیے۔ اس کے بعد اردو کے مختلف ناموں' ان کی وجہ تسمیہ اور اردو کے نام سے موسوم ہونے کا ذکر ہے۔ (1-23) تیسرے باب میں ہندوستانی زبان کے فارسی پر اثر کے ساتھ ہی ابتدائی اسلامی حکومتوں کے پنجاب سے تعلق پر بحث کی گئی ہے (24-50)۔ چوتھا باب پنجاب ہے اور اس میں مشاہیر پنجاب' پنجاب و لہندا کی وحدانیت اور پنجابی کے مصنفین پر مختصراً اظہار خیال کیا گیا ہے (50-55)۔ اس کے بعد پانچواں باب جس کو اس کتاب کی جان کہنا چاہیے' شروع ہوتا ہے اور اس میں اردو اور پنجابی کے صرفی و نحوی قواعد کی یکسانیت اور بعض توابع کا پنجابی میں بامعنی ہونا دکھایا گیا ہے اور اس طرح دونوں زبانوں کو ایک ہی قسم کا ثابت کر کے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ چونکہ یہ دونوں زبانیں یکساں معلوم ہوتی ہیں' اس لیے یقیناً اردو پنجابی ہی سے نکلی ہے

(96-65)۔اس کے بعد والے باب کو باب ماسبق کا ضمیمہ سمجھنا چاہیے کہ اس میں قدیم اردو پر پنجاب کا اثر بتایا گیا ہے(104-97)۔ پھر برج بھاشا(107-105) برج کی بعض خصوصیات (109-107) مسلمان اور ہندی زبانیں(121-110) کے عنوان سے تین باب ہیں۔ اس کے بعد کوی چند کی ''پرتھی راج راسا'' پر تنقید ہے۔ پھر پندرہ پرانے مسلمان انشاء پردازوں کے حالات اور ان کی تحریروں کے نمونے ہیں اور امیر خسرو کے ضمن میں ''خالق باری'' پر ایک سیر حاصل تنقید (جو ''اردو'' رسالہ میں عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہے) بھی ہے (203-121)۔ اس کے بعد 6 لغاتی وطبی تصانیف سے اردو کی قدامت کی شہادت مہیا کی گئی ہے (220-205)۔اور اس کے بعد آخری باب پنجاب میں اردو (جس کی مناسبت سے کتاب کا بھی نام رکھا گیا ہے) میں حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ سے غلام قادر جلال پوریہ تک 134 اشخاص کی نظموں اور دو صاحبوں کی نثر کے نمونے دیے گئے ہیں (311-223) اور اس طرح یہ کتاب تقریباً 325 صفحات پر مشتمل ہے۔

جناب پروفیسر محمود شیرانی صاحب آج سے چند سال قبل تک ادبی دنیا میں بہت کم معروف تھے اور ان کی تنقید ''شعر العجم'' سے پہلے شاید پنجاب سے باہر ہندوستان کے بہت ہی کم لوگ ان کی وسعت تحقیق، فراوانیٔ معلومات اور خداداد علمیت و ذہانت سے واقف تھے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ میں بھی علمی تحقیق و مطالعہ میں صرف کیا ہے اور اسی بنا پر ان کی ہر تحریر ادبی دنیا کے لیے ایک بیش قیمت ملکیت اور اصحاب فکر کے لیے ایک گراں بہا دولت ہوتی ہے اور ان کا ایک ایک حرف نہایت افادی شوق اور طالب علمانہ ذوق سے پڑھا جاتا ہے۔ وہ جس چیز پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس میں تحقیق و معلومات اور فلسفیانہ تنقید و نتائج کے دریا بہا دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر تحریر خاص توجہ کے ساتھ دیکھی جاتی ہے۔

اس کتاب میں لائق مصنف نے ایک خاص خیال کو پیش نظر رکھ کر ایک خاص ترتیب کی پیروی کی ہے اور اپنے مطلوبہ نتائج تک پہنچنے کے لیے جو شکلیں مرتب کی ہیں، وہ اگرچہ اصولاً نہایت ہی صحیح ہیں مگر اس کے ساتھ ہی اس عام حقیقت سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ جب ایک شخص کسی چیز کو ثابت کرنا چاہتا ہے تو وہ ہر واقعہ کو ایک ایسی روشنی اور ایسے الفاظ میں پیش کرتا ہے کہ اس سے اس کے دعویٰ کی تائید ہوتی ہو اور پروفیسر صاحب موصوف نے بھی ایسا کرنے سے گریز نہیں کیا جس کا ثبوت ہم آگے چل کر دیں گے۔ اب ہم کتاب کی ترتیب کے مطابق اس سے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

پروفیسر صاحب موصوف اردو کے لفظ کے استعمال پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ہندوستان میں اس لفظ کا استعمال بابر کے عہد سے ہونے لگا ہے[2]۔''

اور اس کے ثبوت میں عبد الرحیم خان خاناں کے ''تزک بابری'' کے فارسی ترجمہ سے ایک عبارت نقل کی ہے، لیکن اگر ہم اس عہد سے پہلے کی کتاب ''تاریخ فیروز شاہی'' مصنف شمس عفیف کا جس سے لائق مصنف نے

کثرت سے استفادہ کیا ہے' مطالعہ کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ یہ لفظ اس میں موجود ہے اور دو جگہ مورخ نے اسے لکھا ہے' لیکن چونکہ دونوں عبارتیں ایک ہی صفحہ پر ہیں' اس لیے بہت ممکن ہے کہ ان کی نظر اس پر نہ پڑی ہو' بہر حال ہم دونوں عبارتوں کو دے دیتے ہیں:

(1) ''بآوازۂ بذل وعطا از ہر چہار جانب خلق متوجہ اردوے اوگردید۔''

(2) ''در ہر دو لشکر اخبار مختلف مذکور می شد کہ خواجہ جہان برآن قرار دادہ کہ چون لشکر سلطان بدہلی رسد' امرا کہ درارد وے ظفر قرین اند اتباع آنہارا دیدہ در پلہ منجنیق نہادہ خواہد انداخت۔''

اسی طرح زبان کے معنی میں اس کا رواج پروفیسر صاحب کے خیال میں تحسین نے کیا ہے۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

''ادبیات میں سب سے پیشتر میر عطا حسین خاں تحسین نے یہ نام اختیار کیا۔
چنانچہ ''نوطرز مرصع'' تالیف 1213ھ کا یہ فقرہ ہے[3]۔''

لیکن میرا خیال ہے کہ میر صاحب نے اپنی سوانح عمری ''ذکر میر'' میں جو 1197ھ میں تحسین کی کتاب سے تقریباً 15 سال پہلے کی تصنیف ہے' اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب اس وقت تک شائع نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے بہت ممکن ہے کہ پروفیسر صاحب کو اس کے استفادہ کا موقع نہ ملا ہو۔ میر صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''بعد از چندے باسعادت علی نام سیدے کہ از امروہہ بود برخوردم آن عزیز مرا تکلیف موزون کردن ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبان اردوے معلی بادشاہ ہندوستان دوران وقت رواج داشت کرد[4]۔''

اسی سلسلہ میں یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہی ''اردو'' کا لفظ ہورڈے (Horde) کی شکل میں یورپ کے مختلف ممالک میں مغل فوج' قبیلہ یا غیر منتظم جماعت کے معنی میں مستعمل ہے[5]۔

یہ سچ ہے کہ اردو کی جگہ ریختہ' ہندی یا ہندوی کا لفظ عہد قدیم سے استعمال ہوتا آیا ہے' لیکن اس کے ساتھ ہی ہم کو امیر خسرو کا ایک ایسا بیان ملتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنسکرت کو بھی ''زبانِ ہند'' کے نام سے استعمال کرتے ہیں اور چونکہ دوسری زبانیں اسی سے نکلی ہیں اور وہ اس وقت متروک ہیں' اس لیے ان کے بیان کرتے وقت وہ ہندی یا زبانِ ہند کو کسی ایک خاص خطہ کی زبان نہیں بتاتے۔ چنانچہ اپنی مشہور مثنوی ''دول رانی خضر خاں'' میں لکھتے ہیں۔

زبانِ ہند ہم تازی مثال است — کہ آمیزش در آنجا کم مجال است
گر آئین عرب نحوست دگر صرف — ازان آئین درین کم نیست یک حرف[6]

لیکن اس کے ساتھ ہی ''غرۃ الکمال'' کے دیباچہ میں انہوں نے مسعود سعد سلمان کے متعلق ''ہندوی'' کا ذکر کیا ہے۔ عوفی بھی ہندوی ہی کہتا ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انشا بھی عربی وفارسی الفاظ

سے معرّیٰ عبارت کو "ہندوی" ہی کے نام سے یاد کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ زبانِ ہند سے سنسکرت مراد لے جاتی تھی اور پراکرت کے لیے "ہندوی" کا لفظ تھا اور یہی لفظ کثرتِ استعمال سے "ہندی" ہو گیا۔ انشا کے الفاظ یہ ہیں:

"ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھ آئی' کوئی کہانی ایسی کہیے
جس میں ہندوی چھٹ اور کسی بولی سے نپٹ نہ ملے[7]۔"

چونکہ عوفی اور خسرو کی عبارتیں کتاب میں موجود ہیں' اس لیے ان کو نقل نہیں کیا گیا۔ بعد میں ہندی و ہندوی دونوں استعمال ہونے لگے اور پھر صرف ہندی رہ گیا۔

سنسکرت کے لیے "ہندی" کے استعمال کے متعلق ایلیٹ کی تاریخ میں بھی کافی مواد موجود ہے۔ چنانچہ سنسکرت اور مسلمان کے عنوان سے جو ضمیمہ شامل کیا گیا ہے' اس میں اس موضوع پر اس طرح اظہار خیال کیا گیا ہے۔

"جب اس عہد (عہد اکبری) کا مسلمان "ہندی" کا لفظ استعمال کرے تو وہ مشتبہ معنی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً نظام الدین کا بیان ہے کہ عبدالقادر نے ہندی کی متعدد تصانیف کا ترجمہ کیا ہے۔ اب ہم کو معلوم ہے کہ عبدالقادر نے دوسری تصانیف کے علاوہ رامائن اور سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ بہت زیادہ ممکن ہے کہ یہ کتابیں ہندی کی جگہ سنسکرت کی ہوں۔ عبدالقادر اور فرشتہ دونوں ہم کو بتاتے ہیں کہ مہابھارت کا ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ اول الذکر اس کو نقیب خاں کی طرف منسوب کرتا ہے اور موخر الذکر فیضی کی طرف۔ یہاں بھی بہت ممکن ہے کہ اس سے سنسکرت ہی مراد ہو۔ ایک دوسری جگہ عبدالقادر کہتا ہے کہ اتھروا وید کا ہندی سے ترجمہ کرنے کے لیے کہا گیا لیکن چونکہ طرز و معنی سخت مشکل تھے' اس لیے اس نے اس سے انکار کیا اور بعد میں حاجی ابراہیم سرہندی نے نہایت ہی اطمینان بخش طریقہ پر اس کام کو انجام دیا۔ یہاں پر یہ بہت صاف ہے کہ ہندی سے سنسکرت کے سوا کوئی دوسری چیز مراد نہیں ہو سکتی[8]۔"

اسی مضمون میں ایک اور جگہ ہے:۔

"اس عہد (عہد فیروز شاہ تغلق) میں سنسکرت سے ایک عام واقفیت ضرور پیدا ہو گئی تھی کیونکہ لکھنؤ کے شاہی کتب خانہ میں ایک کتاب علم بیطاری پر ہے۔ یہ غیاث الدین محمد شاہ خلجی کے حکم سے سنسکرت سے ترجمہ کی گئی تھی۔ اس کتاب کا نام کرۃ الملک ہے اور سن 703ھ/ 1381ء میں سالوتر سے ترجمہ کی گئی تھی۔ یہ ایک ہندوستانی برہمن کا جو سرتا کا استاد تھا' نام ہے۔ دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس کا "وحشیانہ ہندی" سے

سلیس فارسی میں اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے کہ آئندہ کفار سے استصواب کی ضرورت پیش نہ آئے [9]۔"

اس ابتدائی بحث کے بعد پروفیسر صاحب موصوف نے اردو کے مختلف ناموں ہندی اور ریختہ پر بحث کرتے ہوئے نہایت ہی مدلل طریقہ سے یہ بات ثابت کی ہے کہ کس طرح ریختہ موسیقی کی اصطلاح سے ترقی کرتا ہوا اردو کے معنی میں آ گیا اور انہوں نے اس کے متعلق جو نظریہ قائم کیا ہے اور اس کے متعلق جو ثبوت بہم پہنچائے ہیں' ان سے ان کی وسعت معلومات کا پتہ چلتا ہے۔ اب تک کسی نے بھی اس مرتب و مدلل طریقہ سے اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا تھا اور عام طور سے ریختہ کے لفظی معنی کے اعتبار سے اس کی تشریح کر دی جاتی تھی۔ رہا میر تقی میر کے اقسام ریختہ کی بحث' سو انہوں نے تو بجائے چار کے چھ قسمیں بتائی ہیں [10] لیکن آخری دو قسموں کو لفظی اعتبار سے ریختہ کی قسم نہیں کہا جا سکتا اور لائق مصنف نے اسی لیے نہایت صحیح طریقہ سے چار ہی صورتوں کو لیا ہے مگر پروفیسر ممدوح کا یہ بیان کہ:

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقریب میر صاحب کی اپج ہے اور عام طور پر رائج نہیں تھی [11]۔"

اور اس کے بعد ہی ان کا یہ جملہ کہ:۔

"ریختہ کی غزلوں میں یہ تقسیمیں مخلوط شکل میں عام طور پر ملتی ہیں [12]۔"

ایک عام پڑھنے والے کے لیے ایک مجموعہ اضداد پیش کر دیتا ہے۔ اردو میں اپج کے معنی یہ ہیں کہ کوئی ایسی بات کہی جائے جس کا سرے سے وجود ہی نہ ہو۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے بلکہ انہوں نے تمام شعراء کا کلام دیکھ کر یہ تقسیم اسی مجتہدانہ طریقہ سے کی ہے جس طرح ایک نحوی ایک زبان کے تمام الفاظ دیکھ کر ان کو اسماء' افعال اور حروف پر تقسیم کرتا ہے۔ بہر حال یہ کوئی اہم معاملہ نہیں ہے اور اسے نہایت ہی آسانی سے نظر انداز کر دیا جا سکتا ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ میر صاحب نے ریختہ کو عربی بنا لیا ہے اور مشاعرہ کی جگہ مراختہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں' چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"گاہ گاہ در مجلس مراختہ و این لفظ بوزن مشاعرہ تراشیدہ اند ملاقات میشود [13]۔"

یہاں پر ایک اور بات میرے ذہن میں آتی ہے اور بہت ممکن ہے کہ وہ قریب صحت ہو' میر صاحب نے ریختہ کی چھ قسمیں بیان کی ہیں۔ ان میں پانچویں ایہام بتائی اور چھٹی کے متعلق لکھا ہے:۔

"ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم و آن محیط ہمہ صنعتہا است [14]۔"

اب یہ بات قابل غور ہے کہ آخر ایہام بھی تو ایک صنعت ہے تو پھر میر صاحب نے اسے ایک خاص قسم کیوں قرار دی اور پھر اس کی تشریح کیوں کی۔ ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد میں جس نتیجہ تک پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اس قسم سے میر صاحب کی مراد وہ کلام ہے جس کی بنیاد بعض ایسے ذو معنی الفاظ پر ہوتی ہے جن کے

فارسی وارددو دونوں معنی ہوتے ہیں۔ اس کی دو مثالیں یہ ہیں:

رفتم بہ تماشا بکنارے جوے　　دیدم بلب آب زن ہندوئے
گفتم صنما چیست بہائے مویت　　فریاد بر آورد کہ در در موئے

دیگر:

حجام پسر بخوبی و رعنائی　　دی آئینہ بنمود بدان زیبائی
گفتم صنما در برت ایم۔ نایم　　فریاد بر آورد کہ نائی نائی

یہ وہ مثالیں ہیں جن میں فارسی وارددو کا ایہام پیدا کیا گیا ہے۔ خالص اردو کی مثالیں دیکھیے جو ذو معنی ہیں:

نو خصم گن کر مشعلچن نے کیے
تو بھی نہیں رہتی دو شاخہ بن دے

یہ مصدی نہیں ملتے اگر بھانڈوں سے راتوں میں
تو کیوں پیسے کماتے ہیں یہ نقلیں کر براتوں میں

دیکھو پکوان والی کی مزاجنن　　خصم کے روبری دیتی ہے شاخیں

تم بادشاہ پسند ہو ہم کمتریں تمہارے
کئے بیرہم کو دو گے نازک بدن پیارے

اس لیے اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ میر صاحب نے چھ قسمیں صحیح طور سے بیان کی ہیں اور صرف چار پر اکتفا کرنا ایک سرسری مطالعہ کا نتیجہ ہے تو کوئی دوراز حقیقت بات نہ ہوگی۔

اس کے بعد لائق مصنف نے یہ بتایا ہے کہ اردو کے لیے دوسرے صوبوں میں کیا کیا الفاظ مستعمل تھے۔ اس میں انہوں نے دہلوی دکنی اور گجری کا تذکرہ کیا ہے۔ دہلوی کا لفظ بہت کم مستعمل رہا ہے۔ گوجری یا زبان گجرات یا ''بولی گجرات'' کا اس سے زیادہ اور دکنی کا سب سے زیادہ۔

تمام گجرات سے عموماً اور اس کے ساحلی مقامات سے خصوصاً مسلمانوں کا تعلق پنجاب سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ تجارتی تعلقات نے اس کو بھی ایک بڑا بازار بنادیا تھا' اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں کی زبان جسے مصنفین گجری یا گجراتی سے تعبیر کرتے ہیں' اس عہد کی زبان خود دہلی کی زبان سے صاف ہے۔

پروفیسر صاحب نے "خوب ترنگ" مصنفہ 986ھ کا حوالہ دے کر اس کے اشعار نقل کیے ہیں۔ "مرأۃ سکندری" نے اس سے 18 سال قبل کا ایک شعر نقل کیا ہے۔ یہ شعر سلطان احمد گجراتی کے قتل کی تاریخ ہے۔ صاحب "مرأۃ سکندری" نے لکھا ہے:

شاعر ہندی کہ بزبان گجراتی تاریخ گفتہ نوشتہ می شود

احمد خاں کس برہ کس بس چھورا ساتھ
بابو پوچھے جو نچی کہین دو شنبہ رات [15]

اسی کے ساتھ ہم کو ان جملوں کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے جو مختلف اوقات میں مختلف مشائخ گجرات کی زبان سے نکلے ہیں کہ ان سے خود اردو کے مختلف حالات کا پتہ چلتا ہے۔ "مرأۃ احمدی" نے اس قسم کے چند جملے نقل کیے ہیں۔

اس میں دو جملے شیخ برہان الدین کے ہیں:۔

کیا ہے' لوہا ہے کہ لکڑی ہے کہ پتھر ہے [16]
بھائی محمود خوش ہوا سان تھین وڈا تا تھین

وڈا اسانڈے گھر جلال جہانیاں آیا [17]

تیسرا جملہ یہ ہے:۔

راجن جی بکرو قی بدل بکرو [18]

چوتھا جملہ یہ ہے:۔

چشتیوں نے پکائی انے بخاریوں نے کھائی

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ سلاطین کے قلب اور بزرگوں کے نام تک ایسے ہی ہوتے تھے۔ سلطان محمود کا لقب "بیکڈہ" تھا۔ مشائخ کے نام موسیٰ سہاگ' سید بڈا' شیخ راجو' شیخ ڈوشن' شاہ بھیکن وغیرہ وغیرہ۔

"زبان ہندوستان" کی ماتحت سرخی کے ماتحت لائق مصنف تحریر فرماتے ہیں:۔

"پرانے مغربی مصنفین کبھی اس کو لینگوج آف اندوستان یا ہندوستان اور بعد میں ہندوستانی کہنے لگے۔ ہمارے ہاں عام خیال یہ ہے کہ انگریزوں نے یہ نام دیا ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ خود ہمارے اسلاف کو اس کی زبان ہندوستان یا بولی ہندوستان کہتے ہیں [19]۔"

پرانے مغربی اشخاص نے اس کے صرف یہ دو نام ہی نہیں رکھے تھے۔ وہ جس طرح ہر مسلمان کو

''مور'' (Mooe) کے نام سے یاد کرتے تھے' اسی طرح ان کی زبان کو بھی ''مورس'' (Moors) کہتے تھے۔ چنانچہ مسٹر ایچ ٹی کولبرک (H.T.Colebrook) جو بعد میں ایک محقق و مستشرق کی حیثیت سے ممتاز ہوئے' جب ہندوستان آنے لگے تو ان کے والد نے ان سے یہاں کی زبانوں کے سیکھنے کی ہدایت کی تھی۔ چنانچہ یہاں پہنچ کر انہوں نے یہاں کی زبانوں کے متعلق جس خیال کا اپنے ایک خط میں اظہار کیا ہے' اس میں یہاں کی زبان کو مورس ہی کے نام سے یاد کیا ہے' وہ لکھتے ہیں:۔

''آپ کہتے ہیں کہ میں زبانوں کے سیکھنے میں محنت کروں۔ میرا خود بھی یہی ارادہ ہے لیکن اس بات کا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ مجھے اس میں زیادہ محنت کرنا پڑے گی۔ ان میں سے ایک جو بے حد ضروری ہے یعنی مورس' چونکہ لکھی نہیں جاتی' اس لیے اس پر پوری توجہ کا موقع نہیں۔ رہی دوسری فارسی سو وہ اتنی خشک ہے کہ وہ میری توجہ کو جذب نہیں کر سکتی اور نہ اس کی زیادہ ضرورت ہی ہے' اس لیے میں نہایت اطمینان سے اس کو سیکھ رہا ہوں[20]۔''

رہا ہمارے اسلاف کا معاملہ سو وہ ان اصطلاحوں کے علاوہ ہندوستانی کا لفظ بھی استعمال کرتے تھے اور اگر عبدالحمید لاہوری کا بیان صحیح مان لیا جائے اور اس کے غلط ہونے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی تو یہ بات بھی تسلیم کرنا پڑے گی کہ خود شاہجہاں کے دربار میں اس ''ہندوستانی'' کے شاعر و نثر نگار موجود تھے۔ اورنگزیب نے ہاتھی کی لڑائی میں جو بہادری دکھائی تھی' اس کی خوشی میں جو جشن منایا گیا تھا' اس کے متعلق عبدالحمید لکھتا ہے:

''سخن طرازانِ فارسی و ہندوستانی بنظم و نثر داستانِ آن رستم آثار بر گذار دند و دامن امید بجواہل عطایا برآمودند[21]۔''

اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ عبدالحمید ہندوستانی کو اس وقت کی اردو ہی کے متعلق استعمال کرتا ہے اور برج بھاشا کو ہندی کے لفظ سے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

''یمین الدولہ روز نار دار ترتیبی از نظر اقدس گذرانیدہ معروض داشت کہ این ہر دو دہ بیت ہندی را کردہ شاعر بتازگی گفتہ باشند و گوش زد ہیچ کس نشدہ باشد بیک شنیدن یاد می گیرند و آنِ ابیات را بہمان ترتیبے کہ شعراء گفتہ و خواندہ باشند از بر خواندہ دہ بیت دیگر بہمان وزن و مضمون در بدیہہ می گویند[22]۔''

عبدالحمید نے ہندوستانی کے متعلق اپنی دوسری جلد میں بہت مفصل طریقہ سے اظہار خیال کیا ہے اور جو صاحب اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں' اس کو دیکھ سکتے ہیں[23]۔

اردو کے آغاز اور اس کے متعلق ہمارے بزرگوں کی رائے کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے' وہ لفظ بلفظ صحیح ہے مگر یہاں پر میں اپنا نظریہ پیش کرنا چاہتا ہوں جو میری ذاتی ''اپج'' ہے اور اس کو اس کتاب کی تنقید

سے کوئی واسطہ نہیں اور وہ یہ ہے کہ مغلوں کے زمانہ تک یہاں جو زبان بولی جاتی تھی ''ہندی'' ''ہندوی'' یا ''دہلوی'' وغیرہ کے نام سے مستعمل تھی' لیکن مغلوں کے وقت سے یہ زبان اردوئے معلیٰ یا 'اردو' کے نام سے موسوم ہوئی اور ہمارے بزرگ اردو سے جس زبان کو مراد لیتے ہیں' وہ یہی ''ہندی'' ہے جو مغلوں کے زمانہ میں بولی جانے لگی تھی اور جس کی بڑی خصوصیت فارسی الفاظ کی بھرمار ہے۔ چنانچہ شیخ باجن کا جو کلام ص 21 پر دیا گیا ہے' اس میں صرف ایک لفظ ''خاصے'' ہے اور بس۔

اردو کے برج سے نکلنے کے متعلق بھی جو خیال ظاہر کیا گیا ہے' وہ بڑی حد تک صحت پر مبنی ہے لیکن اس کے ساتھ مصنف کے ان الفاظ کو بھی یاد رکھنا چاہیے۔

''برج سے چند ترمیمیں قبول کر لینا یا الفاظ کا مستعار لینا دوسری بات ہے[24]۔''

مسلمانوں نے محمد بن قاسم کے وقت سے فاتحانہ طریقہ سے ہندوستان پر اپنا اثر ڈالنا شروع کیا لیکن تجارتی حیثیت سے ان کے تعلقات اس سے قدیم تر ہیں۔ بری اور بحری دونوں راستے کھلے ہوئے تھے اور عرب اور ایرانی تجار کثرت سے ساحلی مقامات پر آتے جاتے تھے اور یونانیوں کی طرح انہوں نے بھی بعض مقامات کو اپنا لیا تھا۔ اسلامی فتوحات کے بعد تو ملتان' ملاحدہ و قرامطہ کا مرکز بن گیا تھا اور چونکہ ان کا سب سے بڑا مرکز ایران ہی تھا' اس لیے اس کے اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا' اسی لیے اگر ہم فارسی شعراء کے کلام میں ہندی کے الفاظ پائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ عہد اسلامی کی فارسی تصانیف اور شعراء کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں حکومت کو زمانہ گذرتا جاتا ہے' ہندی الفاظ بکثرت مستعمل ہوتے جاتے ہیں حتیٰ کہ اگر ''آئین اکبری'' کے تمام الفاظ جمع کیے جائیں تو ایک چھوٹا سا لغت تیار ہو سکتا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ جو ایرانی شعراء مغلوں کے دربار میں آتے ہیں' وہ بھی ہندی کے الفاظ استعمال کرنے لگتے ہیں۔ امیر خسرو سے ہندی کے الفاظ کثرت سے استعمال ہونا شروع ہوتے ہیں بلکہ اگر ہم عوفی کی ''جامع الحکایات'' کو صرف مجموعہ قصص نہ سمجھیں تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ محمود غزنوی سے بہت پہلے گجرات میں بھی مسلمانوں کی آبادی تھی اور وہاں کے لوگ ہندی بولتے تھے۔ چنانچہ جب وہاں کے باشندوں نے مسلمانوں کو ستایا اور وہاں کی مسجد منہدم کر دی تو وہاں کے امام و خطیب نے جو درخواست پیش کی' وہ ایک ہندی قصیدہ کی شکل میں تھی[25]۔ اس موضوع پر انشاءاللہ آگے چل کر اگر موقع ہوا تو مفصل طور سے عرض کیا جائے گا۔

غزنوی عہد کے لیے بیہقی اور عتبی سے قریب تر شاید کوئی تصنیف مل سکے مگر عتبی کی تاریخ ہندوستان کے معاملہ میں ہمارے کام کی نہیں حتیٰ کہ اس میں دہلی اور لاہور تک کا تذکرہ نہیں۔ اب صرف بیہقی ہمارے پاس ہے اور اس کے بیان کردہ واقعات کی روشنی میں ہم بہت کچھ حال حاصل معلوم کر سکتے ہیں۔ لائق پروفیسر نے مسعود شہید کے زمانہ میں صرف ہانسی کی فتح پر اکتفا کر کے بنارس وغیرہ فتح کرنے کا سہرا سلطان ابراہیم کے سپہ سالار ابوالنجم کے سر باندھا ہے حالانکہ بیہقی نے احمد نیالتگین کے واقعات میں صاف طور سے اس کے

بنارس پر قبضہ کرنے کے حالات لکھے ہیں[26] مگر اس کے ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ غزنویوں کی یہ فتوحات دیرپا نہ ہوتی تھیں بلکہ یہ ایک موسمی سیلاب ہوتا تھا کیونکہ اس عہد کی تاریخ صاف بتاتی ہے کہ وہ بادشاہ کے طور پر کبھی بھی پنجاب سے آگے نہ بڑھے اور لاہور ہی ان کا دارالسلطنت رہا۔ یہ تو غوری تھے جنھوں نے دہلی کو مستقل طور سے فتح کیا اور بعد میں دارالسلطنت بنایا۔

412ھ سے لاہور اسلامی ہند کا دارالسلطنت بنتا ہے اور اس کے بعد سے مسلمان وہاں آباد ہونا شروع ہوتے ہیں۔ ان میں شعراء بھی ہیں' ان میں مسعود رازی اور ابوالفرج رونی بھی ہیں۔ تذکروں نے ان دونوں کا حال لکھا ہے۔ ''چہار مقالہ'' کے حاشیہ پر ان کے مزید حالات بھی لکھے ہیں لیکن یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ ابوالفرج رونی' مسعود رازی کا بیٹا تھا یا مسعود رازی' ابوالفرج کا باپ تھا۔ عوفی نے اگرچہ ابوالفرج کے باپ کا نام مسعود دیا ہے' لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ وہ مسعود رازی ہے[27]۔

اسی طرح شیخ اسمٰعیل لاہوری کے متعلق لکھا ہے کہ وہ 395ھ میں لاہور تشریف لائے اور تین ہفتوں کے اندر 1750 ہندوؤں کو مسلمان بنا دیا۔ لاہور اس وقت ہندو حکومت کا مرکز تھا۔ اس کے والی سے اور محمود کے باپ ہی سے لڑائی چلی آ رہی تھی' ایسی حالت میں سمجھ نہیں آتا کہ ایک دشمن اسلام بادشاہ نے کس طرح اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ اس مذہب کی علانیہ تبلیغ کریں۔ لاہور 412ھ میں فتح ہوتا ہے اور قیاس چاہتا ہے کہ وہ اس کے بعد گئے ہوں گے۔ پروفیسر صاحب موصوف نے اپنی تمام کتاب میں ماخذوں کے حوالہ کی طرف نہ معلوم کیوں بہت کم توجہ کی ہے' حالانکہ ان کے جیسے مصنف کے لیے لازمی تھا کہ وہ ایک ایک کتاب کا حوالہ دیتے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے اس میں بہت سی ایسی کتابوں سے واقعات لیے ہیں جو اب تک عام طور سے متعارف نہیں ہیں اور اس طرح ہم کو بہت سی کام کی کتابوں کے نام معلوم ہو جاتے۔ بہر حال ہم ان کے اس نتیجہ سے متفق ہیں کہ ''لاہور ان ایام میں ایک بارونق اسلامی شہر اور مرجع علم و فضل بن گیا تھا'' اور اس کے ساتھ یہ رائے بھی صحیح ہے کہ مسلمانوں نے عہد غزنویہ میں ہندوستان کی کوئی زبان کچھ نہ کچھ ضرور سیکھی۔

ایسے ہندوؤں میں جو محمود کے عہد سے غزنوی حکومت میں ممتاز رہے' بیہقی نے تین کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں ایک تو سیوندرائے ہے جسے مسعود نے حامیانِ شہزادہ محمد کے تعاقب میں بھیجا تھا' دوسرے تلک ہے اور تیسرے بیجی رائے ہے[28]۔ یہ لوگ ملکی' علمی اور فوجی ہر سہ خدمات انجام دیتے تھے۔ محمود کی ہندی دانی کا حال تو معلوم نہیں۔ البتہ جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' اس کے متعلق تمام مورخین کا یہ بیان ہے کہ جب راجہ کالنجر کا شعر محمود کے پاس آیا تو اس نے اس کو ہندو فضلا کے سامنے پیش کیا اور ان کی تعریف پر صلہ دیا۔

اسی طرح لائق پروفیسر کا یہ خیال ہے کہ حکیم سنائی ہندوستان آئے ہیں' بالکل غلط ہے۔ اردو کے

ایک لفظ ''پانی'' کا استعمال کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح عثمان مختاری کے یہاں دو لفظوں کا استعمال کوئی عجیب بات نہیں ہے کیونکہ ہم تاریخوں میں پڑھتے ہیں کہ محمود نے اتنے ہندوستانی غلام اور لونڈیاں غزنی بھیجے کہ ہر شخص کے پاس کئی کئی ہندوستانی غلام تھے۔ ایسی حالت میں لاکھوں ہندوستانیوں کی موجودگی میں کسی شاعر کا ایک دو لفظوں کو استعمال کر دینا کوئی بڑی حیرت انگیز مثال نہیں ہے۔ انگلستان کا مشہور شاعر و فسانہ نگار گولڈ اسمتھ ہندوستان کبھی نہیں آیا لیکن اس نے اپنے افسانہ ''ویکر آف ویکفیلڈ'' میں ''نواب'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

مسعود سعد کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے' وہ صحیح ہے اور اس سے کم از کم اس کا ثبوت ضرور مل جاتا ہے کہ اس عہد کے مسلمان ہندی سے نہ کہ ملتانی پنجاب سے واقف تھے اور یہ اس نظریہ کا ایک ثبوت ہے کہ مغربی ہندوستان کی ایک شاخ نے نصف پنجاب پر قبضہ کر رکھا تھا اور آج بھی جو زبان بولی جا رہی ہے' اسی کی ایک صورت ہے۔

شہاب الدین غوری نے شمالی ہندوستان کو فتح اور دہلی کو دار السلطنت بنا کر یقیناً مستقل حکومت کی بنا رکھی اور اسی وقت سے مسلمانوں کے مستقل مسلسل فتوحات کا آغاز ہوتا ہے' لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہنا کہ اس میں پنجابی عنصر غالب تھا' زیادہ صحیح نہ ہوگا۔ ضیاء الدین برنی اور شمس عفیف وغیرہ نے جو نام گنائے ہیں' ان کے دیکھنے اور ان کا اوسط نکالنے کے بعد کثرت کے متعلق مایوسی ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ دعویٰ کہ پنجاب نے تنہا تین حکمران خاندان دیئے' ایک شاعرانہ گفتگو ہوگی کیونکہ اس تاریخی حقیقت سے تو کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ جو لوگ مختلف صوبوں کے والی بنا کر بھیجے گئے تھے اور جنہوں نے واپس آ کر دہلی کے تخت کو زینت بخشی' وہ دہلی ہی سے گئے تھے' البتہ خضر خاں صرف ایک ایسا شخص ہے جو شروع سے آخر تک ملتان میں رہا۔ اس طرح دہلی کا اثر پنجاب پر پڑتا ہے۔ دوسرے دہلی کے اسی اثر کو خود مصنف نے ان الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔

''دہلی کے مسلمان اس سے بیشتر بھی کوئی ایسی ہی زبان بول رہے تھے جو ان دیبال پوریوں کی زبان کے بہت قریب تھی [29]۔''

دکن میں اردو کے رواج سے متعلق پروفیسر صاحب کا نظریہ بالکل صحیح ہے اور اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

صفحہ 50 سے 55 تک پر پنجاب کی ابتدائی اسلامی تاریخ پر بحث کی گئی ہے۔ اس عہد کے جن علماء و فضلاء کا تذکرہ کیا گیا ہے' ان میں مولانا حسن بن محمد بن حسن بن حیدر الصغانی لاہوری اور مولانا عبداللہ تلنبی وغیرہ کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

اسی باب میں ایک بہت ضروری بحث پنجابی اور لہندا کے باہمی تعلقات کی ہے۔ اگرچہ پنجاب کی ایک بڑی جمعیت صرف اس سیاسی غرض سے کہ موجودہ سیاسی پنجابی کو علیٰ حالہ باقی رکھا جائے اور دو زبانوں کو تسلیم کر کے اس کے دو ٹکڑے نہ کیے جائیں' پنجابی اور لہندا کو ایک مانتی ہے لیکن تقریباً وہ تمام اصحاب جنہوں

نے اس موضوع کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے حتیٰ کہ لسانی پیمائش کے مہتمم اعلیٰ سر گریرسن بھی اس رائے سے متعلق ہیں کہ پنجابی مغربی ہندوستان کی ایک شاخ اور ہریانی کی بہن ہے۔ اگر ہم پنجابی کی جگہ لہندا کا اردو سے مقابلہ کریں تو یہ فرق واضح ہو جائے گا اور اسی بنا پر مصنف موصوف اس بحث کو صرف نو سطروں میں ختم کر کے چپ چاپ نکل جاتے ہیں۔ لہندا کا سندھی اور کشمیری سے جو تعلق ہے وہ اس کی پنجابی کے سوا دوسری زبان ہونے کا مزید ثبوت ہے۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا میں اس موضوع پر مفصل بحث موجود ہے۔

اس کے بعد پنجابی مصنفین کا حال دیا گیا ہے اور پھر شعراء کا تذکرہ ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جن مصنفین اور شعراء کا حال دیا گیا ہے ان میں سے ایک بھی عہد مغلیہ سے پہلے کا نہیں ہے اور اس کے معنی یہ ہوئے کہ پنجابی میں اس وقت تک تصنیف و تالیف کی صلاحیت نہ تھی اور نہ اس کے اپنے حروف تہجی تھے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان اس کو عربی خط میں لکھتے ہیں اور سکھ اس کے صحیح تلفظ کے لیے اپنے گرو کے ایجاد کردہ حروف سے کام لے کر اسے گرمکھی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی بہت زیادہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس عہد کی جتنی بھی پنجابی نظمیں ہیں وہ ہندی بحر جھولنا چھند میں ہیں اور وہ 40 ماترا پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ مسٹر ٹمپل جنہوں نے ''انڈین اینٹی کویری'' میں پنجابی گیت شائع کیے تھے لکھتے ہیں:

> ''گرنتھ جو صاف طور سے کبیر اور ہندی بھگتوں کی پیروی کرتا ہے تمام پنجابی سکھ اور ہندو شاعری کی بنیاد ہے اور مسلمانوں کی دیسی زبان کی شاعری بھی اسی پر مبنی ہے بلکہ دوسرے الفاظ میں یہ بیان کرنا چاہیے کہ تمام پنجابی شاعری کا یہی حال ہے۔''[30]

ہم اسی مضمون سے پنجابی کی تین مشہور نظموں کی مثال نقل کر دیتے ہیں:

ہیر ورانجھا:۔ (وارث شاہ)

مٹھی مٹھی ایہہ گل نہ کرو اریو
جتاں سن دیاں ایں مر گئی جیئے
تساں ایہہ جد دکی چاگل کیتی
کھلی تلی ہی میں لہو گئی جیئے

پورن بھگت:۔

نی پھیر کہیا غصے ہوئے پورن
تیں نوں وگ کی گئی ہے بان مائے
جدھی انتری توں اوہی باپ میرا
توں تون شکم تھیں جمیا جان مائے

سسی و پنوں:۔(ہاشم شاہ)

مان فراق سسی دے مارے نیند آرام نہ آوے
ہر دم وانگ یعقوب پیغمبر روئے روئے حال دن جاوے

کیاان نظموں کے پڑھنے کے بعد مغربی ہندوستان کے اثر سے انکار کیا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد وہ اہم ترین باب شروع ہوتا ہے، جس کو اس کتاب کی جان کہنا چاہیے۔ اس باب میں اردو و پنجابی' صرف ونحو اور بعض دوسری چیزوں کی مماثلت اور یکسانی پر بحث کی گئی ہے' لیکن اس بحث میں پڑنے سے پہلے ہم کو مندرجہ ذیل چیزوں کو پیش نظر رکھ لینا چاہیے۔ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پاس پنجابی زبان کی جو قدیم ترین تصانیف بھی موجود ہیں' وہ عہد مغلیہ سے پہلے کی نہیں ہیں اور ان میں بھی زیادہ عہد عالمگیری سے بعد کی' لیکن تاریخی حیثیت سے جو اثر دکھایا گیا ہے وہ قبل از مغل عہد پر محدود ہے' حالانکہ منطقی اور اصولی طریقہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ اس عہد کی دہلی اور لاہور کی زبانوں کے نمونے پیش کیے جاتے اور پھر بتایا جاتا کہ پنجابی زبان کا یہ اثر ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ایسا کرنے میں یہ بات بہت واضح ہو جاتی کہ موجودہ پنجابی نے دہلی کی زبان کو متاثر کرنے کی بجائے خود اس سے اثر قبول کیا ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس پورے باب کو اس بات کے ثبوت میں پیش کردے کہ اردو یا ہریانی کا پنجاب پر اتنا اثر ہے تو شاید اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہ نکلے گی اور عصبیت صوبہ کے علاوہ شاید کوئی دوسری چیز ماہرین السنہ کے نظریہ کے قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہیں کر رہی ہے' پھر اگر ماہرین کی یہ رائے صحیح ہے تو اس کوہ کندن وکاہ برآوردن سے کوئی فائدہ نہیں' لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ دلی کی ہریانی پنجابی سے متاثر نہیں ہوئی۔ اس سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا بلکہ یہ تو مذہبی بات ہے کہ دہلی کی زبان ایک طرف پنجابی' دوسری طرف برج اور تیسری طرف اودھی یا بھوجپوری زبانوں سے متاثر ہوتی ہے بلکہ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھائے اور چونکہ شمالی و مغربی اور ایک بڑی حد تک مرہٹہ علاقہ کی زبانیں سرسوتی ہی سے نکلی ہیں' اس لیے ان کا ایک بڑی حد تک متحد القواعد اور مشترک الالفاظ ہونا بسا ضروری ہے۔ اگر ہر زبان کی علیحدہ علیحدہ تحصیل کی جائے تو ایک کی بہت سی چیزیں دوسری میں مشترک پائی جائیں گی۔

سر جارج اے گریرسن نے آج سے تقریباً 48 سال پہلے اسی خیال کو ان الفاظ میں پیش کیا تھا:

"اردو اپنے قواعد اور الفاظ دونوں کے لحاظ سے ایک مرکب عام مشترک زبان ہے۔ اس میں شمالی ہندوستان کی تمام ملکی زبانوں کے علاوہ عربی' فارسی' ترکی اور تلگو زبان کے الفاظ ہیں اور اس کے قواعد نے شمالی ہند کے ہر خرمن سے خوشہ چینی کی ہے' اس لیے یہ کہنا بالکل ناممکن ہے کہ وہ کسی ایک خاص زبان سے نکلی ہے۔ مثلاً جہاں ہم اردو کی علامات اضافت "کا۔ کے۔ کی" کو برج بھاشا کے "کو۔ کے اور کی" سے

ماخوذ بتا سکتے ہیں، وہیں اس کی علامت فاعلی "نے" کے متعلق اختلاف رائے ہو جائے گا کہ آیا یہ مرہٹی سے آئی یا مضافات دہلی کی زبان سے۔ البتہ اتنا یقینی ہے کہ یہ لفظ بھاشا میں اس معنی میں کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ اتنا کہنا یہ بتانے کے لیے کافی ہوگا کہ اردو کبھی بھی' خواہ قواعد خواہ الفاظ' کسی اعتبار سے کسی خاص قوم کی زبان نہیں رہی ہے[31]۔"

اسی سلسلہ میں یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پنجابی میں بھی "نے" کا استعمال ہے۔ چنانچہ ایک نہر کے متعلق ایک پنجابی کا شعر ہے:-

سوے پنڈ ان وچ بھی' کڈھے باجھ شمار
پانی دیہہ زر اعتان' ہوئی باغ بہار
گردی گردی شہر دے باغاں وچ پچھان
نہر پھرے صاحب نے' نال عقل دے تاں

پس اگر ہم یہ حقیقت پیش نظر رکھیں کہ مغربی ہندوستان کی ایک زبان نصف پنجاب میں پھیل گئی تھی اور چونکہ پنجاب کہرام و دہلی کے بعد ہی شروع ہوتا ہے' اس لیے یقیناً یہی زبان پنجاب میں پھیلی ہوگی۔ ہم کو پنجاب اور موجودہ اردو کے جو اکثر قواعد بتائے گئے ہیں' ان کے لحاظ سے اگر ہندوستان کی دوسری زبانوں کو دیکھیں تو کسی نہ کسی زبان میں کوئی نہ کوئی قاعدہ جاری وساری نظر آئے گا۔ مثلاً تذکیر و تانیث کا پہلا ہی قاعدہ علاقہ چھتیس گڈھ میں بھی رائے ہے:

تذکیر	مونث
ڈوکرا (مرد)	ڈوکری (عورت)
ٹورا (لڑکا)	ٹوری (لڑکی)

سندھی اور لہندا میں بعض وقت صرف اعراب کے تغیر سے اس قسم کا تغیر پیدا کیا جاتا ہے مثلاً "چوہڑ" (لڑکا) اور چوہر (لڑکی)

لائق مصنف کا تیسرا قاعدہ یعنی:-

"اعلام و اسماء اور اسمائے صفات دونوں زبانوں میں الف پر ختم ہوتے ہیں[32]۔"

ایک عاجلانہ تعمیم معلوم ہوتا ہے' ورنہ کیا ان زبانوں میں ایسے سینکڑوں اعلام و اسماء نہیں ہیں جو الف کے علاوہ دوسرے حروف پر بھی ختم ہوتے ہیں۔

پانچواں[33] قاعدہ بھی ہندی میں رائج تھا۔ چنانچہ انشاء نے ہندی کا جو افسانہ لکھا ہے اس میں یہ شعر ہے:

آتیاں جاتیاں جو سانسیں ہیں

اس کے بن دھیان سب ہی بھانسیں ہیں 34

آگے چل کر اسی قصہ میں وہ لکھتے ہیں:

''بہت مہاراجوں کے کنوروں کی باتیں آئیاں' پر کسی پران کا دھیان نہ چھڑھا 35''

یہیں پر یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قدیم اردو کا جو اثر پنجابی پر پڑا اس کو پنجابی نے تو باقی رکھا مگر اردو میں چونکہ وہ عام وعلمی زبان ہوگئی' ضرورت کے موافق تصرف کا سلسلہ جاری رہا اور اب بھی ہے' اس لیے مصنف کو موجودہ پنجابی کے لیے قدیم اردو کی مثالوں کی ضرورت پڑی۔

ماضی مطلق میں نہ صرف اردو اور پنجابی بلکہ برج کا بھی وہی حال رہا۔ ماضی قریب' ماضی بعید اور ماضی ناتمام جہاں تمام تر توابع کا مسئلہ در پیش ہوتا ہے' دونوں زبانوں میں اختلاف ہے۔ فعل حال کا بھی یہی حال ہے۔

مضارع میں بھی برج' اردو اور پنجابی یکساں ہیں۔ چنانچہ میوات کے مشہور شاگرد گرو لالجی کہتے ہیں:

لال جی سادھو ایسا چاہیے دھن کما کر کھائے

ہر دے ہر کی چاکری پر گھر کبھونا جائے

دیگر

کیا مانگنے کا سامان ہے' مانگے ٹکڑا کھائے

کتے جو ہاندت پھرے جنم اکارت جائے

اسی طرح مستقبل کا جمع کا صیغہ بھی برج میں ملتا ہے اور اس کی مثال خود مصنف نے دی ہے۔

تجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے

بدھنا ایسی رین کر بھور کدھی نہ ہوئے

امر کا قاعدہ بھی پنجابی کی طرح دوسری زبانوں میں موجود ہے۔ چنانچہ مرہٹی میں بھی مثلاً ایکڑے آ (ادھر آ) اوکڑے جا (اودھر جا) توڑ دھو (منہ دھو) اسی طرح تعظیماً جو ''واؤ'' بڑھایا جاتا ہے' وہ بھی برج میں موجود ہے۔

''لال جی گھر کر دتو ہل کر و سنو ہماری سیکھ''

اسی طرح دکھایا جا سکتا ہے کہ جو چیزیں پنجاب میں مشترک ہیں وہ دوسری زبانوں میں بھی موجود ہیں' لیکن اس کے ساتھ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اردو اور پنجابی پر ایک دوسرے کا اثر یقیناً ہوا ہے۔ یہ چند مثالیں صرف اس لیے دی گئیں کہ یہ بتا دیا جائے کہ یہ کہنا زیادہ صحیح نہیں ہے کہ جو چیزیں اردو اور پنجابی میں یکساں ہیں' وہ پنجابی ہی کے اثر کا نتیجہ ہیں ورنہ افغانیوں' خلجیوں اور ترکوں کا جن میں سے کسی ایک کی زبان بھی کسی ہندوستانی زبان سے تعلق نہیں رکھتی' دہلی پر نحوی وصرفی اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ چنانچہ کا کی جگہ سی کے

استعمال کو خود مصنف نے تسلیم کیا ہے کہ راجپوتانہ سے دکن میں پہنچا ہے اور اسی طرح تھا کے لفظ کو خواہ مخواہ تھیونا سے بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ ہر زبان میں بعض ایسے مشتق بن جاتے ہیں' جن کے لیے کوئی قاعدہ نہیں بتایا جاسکتا اور وہ مستثنیات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اب اسی لفظ ہونا کے انگریزی مترادف to be کو لیجئے' اس کا ماضی was & were حال am, is, are کس قاعدہ سے بنے ہیں' اسی طرح اردو میں ''جانا'' سے ماضی ''گیا'' ہے۔ اس کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بہار کی مگدھی کے لفظ ''گیس'' سے بنا ہے۔ تھیا کا لفظ اب بھی بہار کے دیہاتوں میں بولا جاتا ہے۔

اردو میں جن دوسرے الفاظ کو اب تابع مہمل کہا جاتا ہے' وہ دراصل ایسے الفاظ ہیں جن کے خود اردو میں کوئی معنی نہیں ہیں۔ اگر کسی عہد میں بھی اس کے کوئی معنی ہوتے تو کوئی نہ کوئی شخص اس کو ضرور استعمال کرتا۔

قدیم اردو پر پنجابی کے اثر سے بحث کرنے سے پہلے ہم کو دو باتیں طے کر لینا چاہئیں۔ اول تو یہ کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ جو زبان دہلی اور اس کے اطراف میں بولی جاتی تھی' اس میں پنجابیوں کے آنے سے پہلے ہی سے یہ لفظ اسی طرح استعمال میں نہیں تھے اور دوسرے یہ کہ پنجابی میں یہ الفاظ ہریانی زبان سے نہیں لیے گئے۔ ان دونوں اہم ترین مباحث پر کتاب خاموش ہے۔ لائق مصنف نے اس باب میں فیروز شاہ کی دونوں تاریخوں سے بہت زیادہ مدد لی ہے۔ میں نے بھی ایک سرسری نظر سے ان میں اردو کے جو الفاظ مل سکتے ہیں' ان کو جمع کیا ہے۔ چنانچہ یہاں پر ان کو اس لیے لکھتا ہوں تاکہ معلوم ہو کہ ضیاء الدین برنی اور شمس عفیف جن کی تقریباً تمام عمر دہلی اور جوار دہلی میں گذری' کونسی زبان سے متعارف تھے اور ان کے بعد امیر خسرو کی ایک آدھ مثنوی سے کچھ الفاظ لکھوں گا۔ شمس عفیف نے اس سندھی زبان کے جملہ کے علاوہ جو ص 321 کی جگہ ص 231 میں ہے' ایک شخص کا ایک جواب بھی لکھا ہے۔ فیروز شاہ نے اپنے افسر ملک قبول کو سلطان سکندر کے پاس بنگال بھیجا تھا۔ جب اس نے دریافت کیا کہ ''چہ نام داری'' تو ملک قبول نے ''بزبان ہندی'' جواب دیا کہ ''تورا باند''[36] (تیر اغلام)۔ یہ الفاظ اس عہد کی دہلی کی زبان کو بتاتے ہیں۔

ضیاء الدین برنی نے اپنی کتاب کے مختلف مقامات میں یہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔

چبوترہ یا چوترہ' ڈیواڑی' ڈھول' تھانہ' لکھی' بجرہ

''دو لکھ آدمی از سوار و پیادہ و پائک و دھانک و کہار دکیوائی''

چودھری' کھٹ (کھاٹ)' ٹھگ' لونڈی' لت (لات)' ٹیکہ' مندل (مندر) (یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بہاری میں بھی ہندی کی ''ر'' اکثر ''ل'' سے بدل جاتی ہے۔ مثلاً پھل سے پھر' گالی سے گاری وغیرہ)۔ بیڑہ' دگلہ' موزہ' چھپر' بگنی و بنگ (بھنگ)' لوندہ (لونڈا) پٹواری' اکھل' سوندھار (اودھار)' لترہ (لتیرہ) لی' بھنگڑی' بھنگی' کروڑ' النگ' چنڈہ' مندی' رانگھ' موٹھ' ننو' ڈیوڑی' کنیزک کناری (کنواری)' بیاری' بھٹ' دھادا' منڈہ' گھٹی' پاگی' ڈیوٹ' گھائی' مہنت۔

جس طرح برنی کا پھلوں کے متعلق ایک جملہ درج کیا گیا ہے۔ اسی قسم کا ایک جملہ صاحب "مرآۃ سکندری" نے بھی لکھا ہے' وہ یہ ہے۔

"وکثرت کثرۂ اشجار میوہ دار مثل انبہ وانار وکھرنی' جانبو' وکولر وناکیبر وبیل ومہوہ وغیرہ کہ...... درعرصہ گجرات واقع است 37۔"

شمس عفیف نے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں:۔

چودھری' بی بی' چوڈول' پلنگ' گھڑیال' چھتر' لکھرہ' سدا پھل' جنھوری' پونڈا' کہار' ڈولہ' ڈھول' مہتون' مہتواڑہ' پاتر (پتر)' جگناتھ' جوالا مکھی' کنڑہ' یک سیر کچھڑی' چوکی' راج (مزدور) لکھوک اور لکھوکہ' دانگ' آدھ بیگ' سمدھی' گھور (گھر)' بھرگر (بھرکہ) چوکھنڈی (چار پاش) پگ' ٹٹ۔

امیر خسرو نے اپنی مثنوی "دول رانی وخضر خاں" میں بھی پھلوں اور دوسری چیزوں کے نام استعمال کیے ہیں اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے دیول رانی کو جس طرح عربی ڈول کے سانچے میں ڈھالا ہے' اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اکثر بیچ کا حرف علت اگر دو ہوں تو ایک اور ایک ہو تو وہی دہلی کی زبان میں گرا کر اس کو معرب ومفرس بنالیتے تھے بلکہ بعض اوقات تو آخری ہ جو عہد عالمگیر سے الف ہوگئی ہے' یا ی گرا دی جاتی تھی مثلاً مرہٹہ سے مرہٹ' پانی سے پان' اگنی گر سے اگن گر' کلال باری سے کلال بار' نذرباری سے نذربار

امیر خسرو کے مذکورہ بالا اشعار یہ ہیں:۔

دول رانی کہ ہست اندر زمانہ — زطاؤسان ہندستان یگانہ
برسم ہندوی از مام و بابش — دراول بود دیول دی خطابش
بنام آن پری چون دیورہ داشت — فسوں بندہ از دیوش نگہداشت
چنان رسم بدل کردم مراعات — کہ آن ہندی علم برزد زہندات
یکے علت و رو افگندم از کار — کہ دیول رادول کردم بہنجار 38

اسی مثنوی میں کنولا دیوی سے کنولادی' اور پھر کنولادی بننا بھی قابل غور ہے۔ خسرو کی اس مثنوی میں یہ الفاظ بھی ہیں۔

بیل = بیلہ سکھاسن = سنگھاسن جاے = جوہی کیورہ = کیوڑہ
چنپہ = چنپا ماول لری' سیوتی' دونہ' کرنہ

یہاں پر ہم کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اگرچہ اودھ' گجرات' دکن وغیرہ کی زبانیں اب تک ہندوی' ہندی' ریختہ وغیرہ کے نام سے یاد کی گئی ہیں لیکن لاہوری یا پنجابی کو کبھی ان ناموں سے یاد نہیں کیا گیا ہے۔ امیر خسرو وغیرہ کو جانے دیجیے' اکبر کے زمانہ میں بھی دونوں میں اختلاف تھا۔ چنانچہ ابوالفضل ایک لفظ کے معنی کی تشریح میں لکھتا ہے۔ "بزبان پنجاب کیل نامند دیار دہلی بنجر خوانند 39" اور جہاں پر ہندوستان کی

زبانیں گنائی ہیں، لکھتا ہے:

"درفراختائے ہندوستان بفراوان زبان سخن سرایندہ۔ آن اختلاف کہ از فہمیدگی یکدگر بازندارد از شمارہ بیرون وانچہ نیازند دریافت دہلی، بنگالہ، ملتان، مارواڑ، گجرات، تلنگانہ، مرہٹ، کرناٹک، سندھ، افغان، شال، بلوچستان، کشمیر 40"

کیا اس سے یہ بھی نتیجہ نہیں نکلتا کہ پنجابی ایسی زبان تھی جسے دہلی والے آسانی سے سمجھ لیتے تھے اور پنجابی کی یہ حالت اس اثر کا نتیجہ تھا جو مغربی ہندوستان کی ایک بولی کے پنجاب تک وسعت پذیر ہونے کی وجہ سے عالم وجود میں آیا تھا۔

اس کے بعد مصنف نے "برج بھاشا" اور اس کے خصائص پر روشنی ڈالی ہے اور موجودہ اردو اور برج بھاشا میں جو نحوی وصرفی فرق ہے، وہ بتایا ہے۔ پھر وہ باب شروع ہوتا ہے جو آج کل کی فرقہ وارانہ ذہنیت کے لیے ہندو بھائیوں کے ایک سوال کا مسکت جواب ہو سکتا ہے اور اس میں نہایت تحقیق سے بتایا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان کی ملکی زبانوں کے ساتھ کس قدر شغف رکھا ہے اور کس طرح یہ انہی کی برکت تھی کہ سنسکرت کی بہت سی کتابیں بنگلہ اور دوسری زبانوں میں آ گئیں۔ اس فہرست میں ہم چند ناموں کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ اکرم فیض مارواڑ کا رہنے والا تھا۔ اس نے ایک "برتلا کا دیا" لکھی اور "ورتی وتناگر" کا 1130ء و 1188ء کے بیچ میں ہندی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس نے "نورک" اور "چند" کے افسانہ کو ہندی نظم میں لکھا ہے۔ چندر بن جونا خان کے لیے لکھی گئی ہے، بنگالی شاعر علاول کے متعلق اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس نے اپنے مربی وزیر ارکان کی فرمائش سے "پدماوت" کا بنگلہ ترجمہ کیا تھا اور دولت قاضی کی کتاب "گور چندرانی" نہ کہ "لور چندرانی" کی تکمیل کی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کبیر کالڑکا کمال بھی ہندی کا شاعر تھا، چنانچہ بہت سے شعر اس کی طرف منسوب ہیں۔ عبدالرحیم خان خاناں کی ہندی کی مندرجہ ذیل تصانیف ہم تک پہنچی ہیں۔

(1) رحیم ست سائے (2) رامائن (3) رس پنسا دھیائی (4) سرنگار سورتھ (5) مدماشتک

زہری اور بانا کے علاوہ اجنبش اور کوئی گنگا بھی عہد اکبری کے شعراء میں قابل ذکر ہیں۔ شاہجہاں کی سرکاری تاریخوں میں کسب اندر کا نام بھی درباری شاعر کے نام سے آتا ہے۔ اورنگزیب کے نام سے بھی متعدد ہندی کی کہاوتیں مشہور ہیں، لیکن اس کو کوئی درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی اولاد کو اس سے خاص دلچسپی تھی چنانچہ "تحفۃ الہند" اس کی زندہ یادگار ہے۔

اگر اس خان مسلم کو ہندو بنانے کی کوشش کی گئی ہے تو ہم ایک برہمن کو عالم کے نام سے مسلمان ہوتے دیکھتے ہیں۔

بلگرام کا خطہ اس حیثیت سے ممتاز ہے۔ اس میں سب سے پہلے سید مبارک ہیں۔ ان کی دو کتابیں (1) الک سنک (2) تلک سنک ہم تک پہنچی ہیں۔ دوسرے مولانا عبدالجلیل ہیں اور اس کے

بعد ایک عام جماعت۔

قادر بخش اور جمال کوی ہر دوئی ضلع کے دو مشہور ہندی شاعر تھے۔ طاہر کا نام بے محل نہ ہوگا جس نے کوکا سجا کے نام سے ایک نظم لکھی ہے' آخر میں ہم ذوالفقار یوسف خاں اور محمد کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان تینوں نے بہاری ستسان کی کنڈ لیاس بحر میں شرح لکھی تھی۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے یہاں پر دو باتیں اور عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ ان میں سے ایک دہلی اور متھرا کا اثر پنجاب پر ہے۔ اگر ہم تاریخ کا بغور مطالعہ کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں جتنے قدیم مذہب ہیں' ان میں سے کوئی بھی پنجاب میں پیدا نہیں ہوا' بلکہ وہ سب کے سب بہار سے لے کر متھرا تک کے علاقہ میں عالم وجود میں آئے ہیں۔ پنجاب کے ہندو انہی مذاہب کے پیرو تھے اور اگر جدید سکھ مذہب کو نکال دیا جائے تو اب بھی اس کے ماننے والے وہاں ہیں۔ گوتم بدھ کی تعلیم پورب ہی سے چل کر پچھم تک پہنچتی ہے۔ رام و کرشن کے فدائی ساحل ''گنگ وجمن'' ہی سے اٹھ کر پنجابی علاقہ تک پہنچتے ہیں۔ جین مذہب کا درخت بھی یہیں اُگ کر پنجاب تک اپنی گھنیری شاخوں کو پھیلاتا ہے اور سب سے آخر میں جب شنکر اچاریہ بودھ مت کو مٹانے کے لیے چلتا ہے تو وہ پنجاب سے نہیں اٹھتا بلکہ اس کا سیلاب بھی پورب سے پچھم کی طرف بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ ایسی مسلسل و منظم کوششیں ہیں جن کی موجودگی میں اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ یہی انسانی سیلاب تھے جنہوں نے پنجاب کی قدیم زبان کو بالکل بدل دیا اور وہاں ہریانی ہی پنجابی لہجہ میں رائج ہوگئی۔ پورب کا عموماً اور اطراف دہلی کا عموماً یہی لسانی اثر ہے جو پنجابی کو دہلی کی زبان سے اس قدر مماثل بناتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھئے کہ ہندوؤں کی جتنی تصانیف تھیں' ان میں سے ایک بھی پنجابی میں نہ تھی۔

دوسرا مسئلہ حرف علت کے گرانے کا ہے۔ یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ برج اور سنسکرت وغیرہ میں بولتے وقت عموماً آخری حرف کو ساکن کر دیتے ہیں لیکن لکھتے وقت اس کو باقی رکھتے ہیں اور اشعار میں تو ان کو کسی صورت سے بھی ساکن نہیں کر سکتے اور آج بھی محتاط لوگ اسی طرح ان کا استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ مدراس کے علاقہ میں یہ صورت تلفظ بہت نمایاں ہے اور وہاں رام کو رام یا راما' سوراج کو سوراجیہ' لکشمن کو لکشمنا بولتے ہیں۔ مسلمانوں نے سنے ہوئے الفاظ کو استعمال کرنا شروع کیا اور اسی طرح آخر سے عموماً اس قسم کے اعراب یا حرف علت کو گرا دیا۔ رہا سہ حرفی اجوف کے بعض الفاظ کی تعلیل سو وہ دہلی کی زبان میں بھی اسی طرح رائج تھی جس طرح پنجاب میں اور یہ بھی دہلی کی زبان ہی کا اثر تھا۔

حواشی:

1- پنجاب میں اردو' ص 3   2- پنجاب میں اردو' ص 1

3- تاریخ فیروز شاہی' سراج عفیف' ص 53-54

4- پنجاب میں اردو ص 2 5- ذکر میر ص 67

6- وبسٹر ڈکشنری ص 1043 7- دول رانی خضر خاں ص 42

8- انشا کی کہانی رسالہ اردو جلد 22 ص 269

9- الیٹ: تاریخ ہندوستان جلد 5 ص 571

10- ایضاً ص 573-74

11- نکات الشعراء ص 186-7 12- پنجاب میں اردو ص 16

13- پنجاب میں اردو ص 19 14- نکات الشعراء ص 156

15- نکات الشعراء ص 187 16- مرآۃ سکندری ص 344

17- مرآۃ احمدی جلد 2 ص 17 18- مرآۃ سکندری ص 18

19- مرآۃ سکندری ص 180 20- پنجاب میں اردو ص 23

21- کلکتہ ریویو جلد 1 ص 153 22- بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری جلد 1 493

23- ایضاً جلد 1 ص 268-69

24- ایضاً جلد 2 ص 5-7 25- پنجاب میں اردو ص 28

26- الیٹ جلد دوم ص 162-64 27- الیٹ جلد 2 ص 122-23

28- تذکرہ عوفی جلد 2 ص 241,63 اور چہار مقالہ ص 142 ص 135

29- الیٹ جلد 2 ص 60 30- پنجاب میں اردو ص 45

31- کلکتہ ریویو جلد 39 ص 263 32- کلکتہ ریویو جلد 51 ص 156

33- پنجاب میں اردو

34- پانچویں قاعدہ کے الفاظ یہ ہیں خبر تذکیر و تانیث واحد و جمع میں اپنے مبتداء کے موافق آتی ہے۔

35- رسالہ اردو حصہ 22 ص 268' 272 36- رسالہ اردو حصہ 22 ص 268' 272

37- تاریخ فیروز شاہی شمس عفیف ص 160 38- مرآۃ سکندری ص 78

39- دول رانی خضر خاں ص 24 40- آئین اکبری نولکشوری جلد 1 ص 15

41- ایضاً جلد سوم ص 45

(ورز: معارف (اعظم گڑھ)، اگست 1928ء، ص 90-115)

ایم۔ڈی۔تاثیر

پنجاب میں اردو

(پروفیسر محمود شیرانی کی تازہ ترین محققانہ تصنیف)

مجھے اس کتاب کا تبصرہ کرتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے کہ یہ کام یہ شاندار کام جو بہت جلد تاریخی حیثیت حاصل کرے گا' ایک ایسے شخص نے کیا ہے جس کی مادری زبان پنجابی نہیں' لیکن جب اس کی تکمیل کی نوعیت دیکھتا ہوں تو خوش ہوتا ہوں کہ اسے میرے محترم دوست پروفیسر محمود شیرانی ایسے محقق نے سرانجام دیا ہے کیونکہ بمصداق ہر مردے و ہر کارے۔ ایسی خوش اسلوبی ان کے سوا اور کسی سے ممکن نہ تھی اور پھر اگر کوئی پنجابی یہ نظریہ پیش کرتا تو اسے محض اپنا بھانڈ اصلاحنے کا مترادف قرار دیا جاتا۔

''اردو زبان کا آغاز سرزمین پنجاب سے منسوب ہونا' کوئی نیا نظریہ نہیں۔'' مگر شیرانی صاحب نے اس نتیجہ کا صغریٰ و کبریٰ مرتب کیا ہے اور قیاسات کو واقعات کے مرتبہ تک پہنچایا ہے اور اصل بحث کے علاوہ کئی ایک ضمنی مطالب پر بھی نئی روشنی ڈالی ہے۔

پہلے باب میں ''اردو'' اور ریختہ کے الفاظ پر بحث کی ہے اور آزاد مرحوم و دیگر مصنفین کی تحقیقات سے کہیں زیادہ تسلی بخش توضیحات کی ہیں۔ دوسرا باب ''اردو کا آغاز'' تمام تر تاریخی ہے۔ ہم لوگ اور مورخ بہت چھلانگ مارتے ہیں تو ہندی زبان اور فارسی عربی کے امتزاج کو پرتھی راج کی شکست سے شروع کرتے ہیں لیکن مصنف نے تیسری صدی کے واقعات سے اہم نتائج اخذ کیے ہیں اور اس عہد کی فارسی زبان پر ہندی اثر دکھلایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ ہندی اور ایرانی تمدن کا سنگھم سندھ اور ملتان میں غزنوی عہد سے پیشتر ہو چکا ہے۔ اس کے بعد لاہور بھی ایک عام تجارتی بین الاقوامی مرکز بن گیا۔ شیخ اسمٰعیل لاہوری اور حضرت داتا گنج بخشؒ کی تبلیغی جدوجہد بھی اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمانوں نے ہندی زبان سیکھنے کی ضرور کوشش کی ہوگی۔ محمود کے زمانہ میں تو ہندی زبان کے ترجمانوں کی ایک مستقل جماعت غزنیں میں مقیم تھی۔ تلک جو غزنوی افواج کا ہندو سپہ سالار تھا' اول اول ترجمانی ہی کیا کرتا تھا۔ جب کالنجر کا راجہ نندا سلطان محمود کی مدح میں ہندی شعر لکھ کر بھیجتا ہے تو سلطان تمام فضلاء کو دکھاتا ہے اور سب ان اشعار کی تعریف کرتے ہیں اور سلطان صلہ کے طور پر نندا کو پندرہ قلعوں کا پٹہ لکھ دیتا ہے۔

قدیم فارسی شعرا کا کلام دیکھو۔ ہندی کے الفاظ نظر آتے ہیں۔ حکیم سنائی۔

نہ دراں معدہ حرزہ میدہ　　　نہ درآں دیدہ قطرۂ پانی

خواجہ مسعود سعد سلمان تو ہندی میں صاحب دیوان تھے۔

چو رعد زابر بغرید کوس محمودی　　　برآمد از پس دیوار حصن مارا

غزنویوں اور غوریوں نے مستقل ہندی افواج رکھی ہوئی تھیں اور جب دہلی کی طرف مراجعت ہوئی تو یہ لوگ جوق در جوق دہلی میں آباد ہو گئے اور فوجی ہی نہیں بلکہ تجارت پیشہ لوگ بھی خلجیوں کے عہد میں کپڑے کی تجارت سب کی سب ملتانیوں کے ہاتھ میں تھی اور پنجابی ہی سلطنت کے دست راست تھے۔ بادشاہ غیاث الدین تغلق کی والدہ پنجاب کے جاٹ خاندان سے تھی اور وہ دہلی داخل بھی پنجابیوں کے لشکر کے ساتھ ہوا۔ خضر خاں کی تمام فوج بھی پنجاب سے تعلق رکھتی تھی۔ غرض فاضل مصنف کی محققانہ تفصیلات سے خوب واضح ہوتا ہے کہ سیاسی نقطۂ نظر سے پنجاب کا اثر دہلی پر ہر عہد میں نمایاں رہا ہے۔

یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ سیاسی واقعات کا اثر زبان پر بہت گہرا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ہم اردو اور پنجابی زبانوں کی صرف و نحو ان کے قواعد اور عام ہیئت کا مقابلہ کرتے ہیں تو یہ اثر قدم قدم پر محسوس کرتے ہیں۔

پنجابی اور اردو کا باب بہت ہی اہم ہے۔ اس میں مصنف نے پوری طرح ثابت کر دیا ہے کہ اردو بھاشا سے بھی زیادہ پنجابی سے ملتی ہے۔ اگر مماثلت کی وجہ سے بھاشا کو اس کی اصل قرار دیا جا سکتا ہے تو پنجابی کو یہ حق کیوں نہ دیا جائے کیونکہ فارسیوں اور ہندیوں کا امتزاج (جسے نئی زبان کے بننے کی وجہ قرار دیا جاتا ہے) اول اول پنجاب ہی میں ہوا۔

اول تو ساٹھ فیصدی لغت اردو اور پنجابی کی ایک ہے۔ یہ تھوڑی سی بات نہیں۔ پھر صرف و نحو میں بہت مماثلت ہے۔ مثلاً

(1) مصدر کا قاعدہ دونوں زبانوں میں ایک ہے۔

(2) تذکیر و تانیث کے قواعد ایک ہیں۔ وہی مغل سے مغلانی۔ اونٹ سے اونٹنی۔ میراثی سے میراثن۔ کھتری سے کھترانی۔

(3) اعلام و اسماء اور اسمائے صفات دونوں زبانوں میں الف پر ختم ہوتے ہیں جبکہ برج بھاشا میں واو مجہول پر ہوتے ہیں۔

(4) اسماء صفات تذکیر و تانیث اور جمع و واحد اپنے موصوف کی حالت کے مطابق ہوتے ہیں:

اردو: (1) میرا لڑکا (2) بڑے لڑکے (3) دوڑتے گھوڑے سے۔

پنجابی: (1) میرا منڈا (2) وڈے منڈے (3) دوڑدے گھوڑے توں۔

برج بھاشا میں اس موقع پر میرو چھورا وغیرہ بولیں گے۔

جہاں اس قاعدے سے اختلاف ہے وہ بعد کی ایجاد ہے۔ مثلاً پنجابی میں ہے۔ ''چھوٹیاں کڑیاں'' اردو میں ہے ''چھوٹی لڑکیاں'' مگر قدیم اردو میں صفت بھی جمع تھی۔ احمد دکنی۔

سوچا دون سے پالیاں سو پالیاں نکھیاں

(5) خبر تذکیر و تانیث واحد جمع میں مبتدا کے مطابق ہوتی ہے۔

اردو: (1) یہ بات بھلی نہیں ہے (2) یہ باتیں بھلی نہیں۔

پنجابی: (1) ایہہ گل بھلی نہیں (2) ایہہ گلاں بھلیاں نہیں۔

اردو کے جملہ میں جمع کے متعلق اختلاف ہے مگر سودا کے وقت یہ بے ضابطگی نہ تھی۔

دوانہ ہو گیا سودا تو آخر ریختہ پڑھ پڑھ　　نہ میں کہتا تھا اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

غرض بیسیوں ہی مماثلتیں ہیں جو فاضل مصنف نے پیش کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو اور پنجابی کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے۔ دونوں نے تربیت بھی ایک ہی جگہ پائی ہے۔ جب سیانی ہو گئی ہیں تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے۔ اختلافات اس وقت ہوئے جب دہلی اور لکھنؤ کے شعراء نے اسے لے پالک بنالیا اور ان کی اصلاح و ترمیم ہر موقع پر بہتر نہ تھی۔ مثلاً افعال و اسماء سے جمع مونث کے ترک کرنے سے انہوں نے موسیقیت اور خوش آہنگی کا ایک بڑا عنصر برباد کر دیا۔ سودا کے یہ شعر دیکھو۔ ایک مسلسل ترنم ہے:

خاک دخوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں　　اے فلک باتیں تیری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں
وہ رہا دست تاسف کے تئیں ملتا ہوا　　جس نے وہ اکھیاں خمار آلودہ ملیاں دیکھیاں

اب ان اشعار کو اگر کسی زمانہ حال کے فارسی زدہ پنجابی گو شاعر کے کلام سے ملایا جائے تو یقیناً سودا کے شعر پنجابی سے زیادہ مماثل ہوں گے اور سودا کے شعر ذرا سی تبدیلی سے ٹھیٹھ پنجابی بن سکتی ہیں۔ ایسی پنجابی کہ چودھری شہاب الدین بھی خوش ہو جائیں۔

خاک دخوں وچ صورتاں کیا کیا نہ رلیاں ویکھیاں　　اے فلک تیریاں کوئی گلاں نہ بھلیاں ویکھیاں
اوہ ریہا دست تاسف دے تئیں ملدا ہویا　　جس نے اوہ اکھیاں خمار آلودہ ملیاں ویکھیاں

سب سے زیادہ اہم وہ حصہ ہے جہاں مصنف نے وہ نمونے دکھائے ہیں جو اردو میں متروک ہو گئے مگر پنجابی میں موجود ہیں۔ مثلاً

(1) ''سی'' بمعنی گا۔ ملتانی میں ہے اردو میں نہیں۔ ولی دکنی اردو شاعری کا باوا آدم۔

کہا ہے زہر کا تاثیر اس میں　　نہ چل سی کچھ میرا تدبیر اس میں

(2) پنجابی میں بعض مصادر کی ماضی خلاف قاعدہ آیا کرتی ہے۔ مثلاً کرتے' لینے سے 'کیتا لیتا۔ یہ برج بھاشا اور جدید اردو میں غیر مستعمل ہے لیکن قدیم اردو میں ہے۔

جو کچھ تم نے لیا سو ہم نے لیتا　　جو کچھ تم نے کیا سو ہم نے کیتا

برج بھاشا والے کینا۔ لینا وغیرہ بولتے ہیں۔

(3) پنجابی میں غیر زبان کے آگے ی زائد اضافہ کر دیتے ہیں۔ حیات سے حیاتی' نظر سے نظری وغیرہ قدیم اردو میں ہے۔

ہماری موت اور ان کی حیاتی
اگر ہوتی تو مجھ کو اے خوش آتی

اور تو اور آتش لکھنوی لکھتا ہے:

بہار گلستاں کی ہے آمد آمد
خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

اس شعر کی بنا پر کئی لوگ آتش کو جاہل اور ان پڑھ قرار دیتے ہیں' حالانکہ وہ پنجابی محاورہ کا صحیح استعمال کر رہا تھا۔

فاضل مصنف نے اس سلسلے میں کئی اردو کے مزعومہ توابع مہمل کی توضیح کی ہے اور ایسے الفاظ جو آج تک لغت نویسوں کے لیے بجھارت بنے ہوئے تھے' واضح کر دیا ہے کہ یہ اصل میں پنجابی کے ہم معنی الفاظ ہیں۔ مثلاً دن دہاڑے' مانگے تانگے۔

غالباً سب سے زیادہ مفید وہ مقابلہ ہے جہاں پنجابی بھاشا اور اردو کے الفاظ دیئے ہیں اور بتایا ہے کہ کس طرح اردو بھاشا سے دور ہے اور پنجابی سے قریب تر۔ مثلاً پنجابی زبان کی یہ ضرب المثل خصوصیت سے لیجیے کہ تمام الفاظ جن میں ثانی حرف علت ہو' بہ تخفیف حرف علت تلفظ کیا جاتا ہے۔ مثلاً کان اور ناک کو کن اور نک کہیں گے۔ اس قاعدے میں اردو کبھی پنجابی کی اور کبھی بھاشا کی تقلید کرتی ہے' لیکن زیادہ میلان پنجابی کی اس اصلاحی کوشش کی طرف ہے۔

بھاشا	پنجابی	اردو
باجنا	بجنا۔ وجنا	بجنا
ماچھ	مچھر	مچھر
مائی	مٹی	مٹی
سانچ	سچ	سچ
پاگ	پگ	پگڑی وغیرہ

''پگ'' بھاشا میں قدم کو کہتے ہیں جیسے ''پگ ڈنڈی'' مگر اردو والوں نے ''پگ'' کو اختیار کیا اور اسے چھوٹی پگ کیونکہ ذرا نازک بدن لوگ تھے یعنی پگڑی بنالی لیکن امیر خسرو کے وقت میں وہی ''پگ'' تھی اور کئی حسین لٹ پٹے ''چیرے'' بھی پہنتے تھے۔

اے دہلی والے بتانِ سادہ
پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

ضمنی بحثوں میں ''مسلمان اور ہندی زبانیں'' کا باب نہایت پُر از معلومات ہے۔ ''پرتھی راج راسا'' پر بھی ایک الگ باب ہے اور اندرونی شہادتوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ یہ جعلی تصنیف ہے۔

''خالق باری'' کا باب بھی معنی خیز ہے لیکن سب سے زیادہ تحقیقات آخری باب میں ہے جس کی رعایت سے تمام کتاب کا نام ''پنجاب میں اردو'' ہے۔ فاضل محقق نے بجا فرمایا ہے۔ ''یہ اردو زبان کی تاریخ کا ایک نیا باب ہے جس سے خود اہل پنجاب بھی عموماً بے خبر ہیں۔''

میں جانتا ہوں کہ فاضل مصنف نے یہ مواد کن کن کوششوں سے حاصل کیا ہے اور پنجاب کے لوگوں نے ان کو مدد دینے میں کس قدر سہل انگاری سے کام لیا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ شیرانی نے پنجابی نہ ہونے کے باوجود لغت اور حالات کے متعلق کس قدر صحت برتی ہے۔ مجھے ساری کتاب کے مطالعہ کے بعد پنجابی ادبیات کے متعلق فقط اس رائے سے اختلاف ہے کہ یہ حرفی اور بارہ ماہ آج کل بالکل متروک ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کا اصل بحث سے کوئی تعلق نہیں اور میں نے اس اختلاف کا اظہار محض اتفاق رائے کی وسعت جتانے کے لیے کیا ہے۔

یہ کتاب اسلامیہ کالج کی انجمن ترقی اردو نے شائع کی ہے اور اسی پتہ سے اڑھائی روپے میں مل سکتی ہے۔ یہ کتاب ہر پنجابی، ہر اردو دان، ہر اس شخص کے پاس ہونی چاہیے جو علمی تحقیق کے ذرائع سے واقف ہونا چاہتا ہے۔ عام اس سے کہ اس کو کتاب کے نظریے سے اتفاق ہو یا اختلاف۔

(در: مخزن۔ مئی 1928ء ص 19-24۔ نیز در: مقامات تاثیر
مرتبہ ممتاز اختر مرزا لاہور 1978ء ص 391-397)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

اُردو کی ابتدا سے متعلق پروفیسر محمود شیرانی کے لسانی نظریے پر تنقید

(1) تاریخی پہلو

جوں جوں اُردو زبان کا ڈول اور کینڈا متعین ہوتا گیا' اس کی ابتدا کے متعلق سوال بھی ذہن میں پیدا ہونے لگے۔ علم اللسان سے ناواقف لوگوں کے خیال میں یہ ایک کھچڑی زبان تھی' جو عربی' فارسی' ترکی اور ہندی کے میل سے پیدا ہوئی تھی' جسے کبھی شاہجہانی لشکر سے منسوب کیا جاتا تھا اور کبھی اکبر کے سنہرے عہد سے۔ اردو کی ابتدا کا یہ نظریہ زیادہ تشفی بخش نہ تھا۔ ارتقا کا وہ تصور' جس پر آج فکر انسانی کی بنیاد ٹکی ہوئی ہے' لسانیاتی دنیا میں بھی کار فرما رہا ہے۔ چناں چہ زبان جاننے والوں نے فوراً پہچان لیا کہ اس کھچڑی زبان کی تہہ میں کون سی بولی ہے۔ اس کا سہرا آزاد کے سر ہے' جنھوں نے پہلی بار اردو زبان کی تاریخ لکھی۔ 'مقدمہ' آبِ حیات' اس لحاظ سے منفرد رسالہ ہے۔

ہند آریائی زبانوں پر نئی تحقیق کے باوجود اردو زبان کا آغاز ابھی تک دھندلکے میں ہے۔ زمانۂ حال میں اس کی ابتدا کے متعلق جو نظریے ملتے ہیں' ان میں سے بیشتر محض قیاس آرائیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو کو دکن' گجرات اور مدراس سے جو نسبت ہے' اس کی تاریخی اور ادبی حیثیت مسلّم ہے اور بس۔ لسانیاتی دنیا میں اس عہد کا سب سے بڑا کارنامہ گریرسن کا ''لسانیاتی تبصرۂ ہند'' ہے۔ گریرسن نے سب سے پہلے بالتفصیل ان لسانیاتی قیاس آرائیوں کا ازالہ کیا ہے' جو ہماری زبان کے کینڈے کو بغیر جانے بوجھے اس کے متعلق کی گئی تھیں۔ اس نے نہ صرف ہند آریائی زبان کے تسلسل کی نشاندہی کی' بلکہ جدید آریائی زبانوں کے باہمی رشتوں کو بھی معلوم کیا۔ اسی نے سب سے پہلے کھڑی بولی (یا ہندوستانی) کے حدود اربعہ کو سب سے پہلے متعین کیا' لیکن گریرسن پنجابی' کھڑی بولی اور برج بھاشا کے رشتوں کا صحیح پتا نہ چلا سکا' اسی لیے کھڑی بولی کی علاحدہ حیثیت کو مانتے ہوئے وہ متضاد باتیں لکھ گیا ہے' جن کا خلاصہ یہ ہے کہ کھڑی بولی' برج بھاشا اور پنجابی

کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے۔

گریرسن کی لسانی تحقیقات اردو کی ابتدا کے سلسلے میں حرفِ آخر کا حکم نہیں رکھتیں۔ پروفیسر شیرانی نے فوراً بھانپ لیا۔ پروفیسر شیرانی کو اپنے نقطۂ نظر کے لیے اشارہ خود گریرسن کی تحریروں میں مل گیا، جس نے اردو کے ''پنجابی پن'' پر غیر معمولی زور دیا ہے۔ آزاد کے 'مقدمہ آبِ حیات' کے بعد اردو میں لسانیاتی تحقیق کا سب سے بڑا کارنامہ پروفیسر شیرانی کی ''پنجاب میں اردو'' ہے، جس میں اردو کی ابتدا کے متعلق ایک مدلّل لسانی نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ یہی نظریہ زیرِ نظر مضمون کا مبحث ہے۔

پروفیسر شیرانی داستان کا آغاز لاہور سے کرتے ہیں۔ محمود غزنوی کی فتوحات کے بعد لاہور اسلامی تمدن کا مرکز بن جاتا ہے۔ لاہور مغربی اور مشرقی پنجابی کے مقامِ اتصال پر واقع ہے، لیکن یہاں کی بولی ملتان اور راولپنڈی کی زبان کی بہ نسبت مشرقی پنجاب اور نواحِ دہلی کی بولیوں سے زیادہ قریب ہے۔ لاہور کی اسی ''ترکی، فارسی، ہندی'' فضا میں (محمود غزنوی سے ترکی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، جو سندھ کی اسلامی فتوحات سے معناً اور لساناً کافی مختلف تھا) خواجہ مسعود سلمان پرورش پاتے ہیں۔

مسعود فارسی اور ترکی کے قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ کسی ہندوی زبان (؟؟) کے بھی پُرگو شاعر تھے، جس کی شہادت محمد عوفی صاحب 'لب الالباب' اور حضرت امیر خسرو کی تحریروں سے ملتی ہے۔ نمونے کی عدم موجودگی میں یہ بتانا ذرا مشکل ہے کہ یہ ''ہندوی زبان'' کون سی ہوگی؟ یہ یقیناً حضرت امیر خسرو کی ''زبانِ لاہوری'' ہوگی، جو ان کی ''زبانِ دہلوی'' سے بالکل مختلف تھی۔

1191ء میں بالآخر سلطان شہاب الدین غوری دہلی کے آخری ہندو سمراٹ پرتھوی راج کو شکست فاش دینے کے بعد دہلی اور اجمیر پر قابض ہو جاتا ہے۔ دہلی اس کے بعد اسلامی حکومت کا پایۂ تخت بن جاتا ہے۔ پروفیسر شیرانی اس انتقال پایۂ تخت پر غیر معمولی زور دیتے ہیں۔ حال آں کہ اس کی نوعیت محمد تغلق کے انتقال پایۂ تخت سے بالکل مختلف تھی۔ لاہور اس کے بعد بھی پنجاب کا صدر مقام رہا، اس لیے دہلی بسنے کے یہ معنی نہ تھے کہ لاہور اجاڑ دیا گیا تھا۔ تاریخ سے اس بات کی شہادت نہیں ملتی کہ لاہور کی آبادی نے کبھی بھی بڑے پیمانے پر دہلی کو ہجرت کی ہو۔

گریرسن نے اپنے 'لسانی تبصرۂ ہند' جلد نہم (حصہ اوّل) میں کھڑی بولی کا جو رقبہ مقرر کیا ہے، وہ مغربی روہیل کھنڈ سے لے کر ضلع انبالہ کی مشرقی تحصیلوں تک اور شمال میں دہرہ دون کے میدانی علاقوں سے لے کر جنوب میں دہلی تک پھیلا ہوا ہے۔ پروفیسر شیرانی کے اس نظریے کو اگر تسلیم کر لیا جائے کہ: ''اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چوں کہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے''۔[1]
تو بعض عجیب وغریب نتائج مرتب ہوتے ہیں:

(1) لاہور سے جب پایہ تخت دہلی منتقل ہوتا ہے تو لاہور کی آبادی بڑے پیمانے پر ہجرت کر کے دہلی آ جاتی ہے۔ یہ ہجرت اتنے بڑے پیمانے پر ہوئی ہوگی کہ اس کی بہ دولت دوآبہ گنگ و جمن کے بالائی حصے اور دہلی کے اطراف میں ایک نئی زبان کی داغ بیل پڑ گئی یعنی کھڑی بولی یا گریرسن کی ''ہندستانی'' مسلمانوں کے داخلۂ دہلی کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

(2) چوں کہ بہ قول شیرانی ''ہریانی کوئی علاحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہے بلکہ وہ پرانی اردو ہے یعنی وہ اردو ہے جو گیارہویں صدی ہجری میں خود دہلی میں بولی جاتی تھی[2]۔'' اس لیے ظاہر ہے کہ ہریانی زبان کی پیدائش بھی اس بڑے نقل مکان کے بعد ہوئی ہے۔ اس طرح لاہوری قافلے کی زبان نہ صرف دوآبے کی زبان پر اثر انداز ہوتی ہے، بلکہ صوبہ دہلی، کرنال، حصار (ہریانی کے علاقے) کے اضلاع بھی اس زمرے میں آ جاتے ہیں۔

یہ نتائج مرتب کرنے کے بعد ذہن میں فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہریانی اور کھڑی بولی کا جنم پنجابی قافلے کی دین ہے، تو ان علاقوں میں فتح دہلی سے قبل کون سی زبان رائج تھی؟ پروفیسر شیرانی اس کا جواب یہ دیتے ہیں ''کہ وہ راجستھانی ہوگی یا برج۔ اس میں شک نہیں کہ آج دہلی، میرٹھ، مظفر نگر، سہارن پور یا دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ دوآبے میں اردو بولی جاتی ہے، لیکن اب سے تین صدی پیش تر اس علاقے کی زبان یہ نہ تھی..... بلکہ یہاں برج کا طوطی بول رہا تھا۔ مغلوں کی آمد کے وقت گنگوہ ضلع سہارن پور میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی (متوفی 945ھ) باوجودیکہ ایسے علاقے سے تعلق رکھتے تھے، جہاں آج اردو مادری زبان ہے، لیکن وہ اپنے ہندی اشعار ایسی زبان میں لکھتے تھے، جو برج کے مماثل ہے۔ علیٰ ہذا مخدوم بہاء الدین برناوی، برناوہ ضلع میرٹھ کے ہیں، لیکن ان کے ہندی اشعار قطعاً برج میں ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ دوآبے میں برج زبان ہی مستعمل تھی۔ اردو نے ان علاقوں سے برج کو رفتہ رفتہ خارج کر دیا ہے، جس طرح ہریانہ کے علاقے سے۔[3]''

اس نظریے کے ثبوت میں پروفیسر شیرانی کوئی قدیم شہادت یا سند پیش کرنے سے مجبوری ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے بعد لکھتے ہیں ''لیکن سیاسی واقعات، اردو زبان کی ساخت نیز دوسرے حالات ہمیں اس عقیدے کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔[4]''

جہاں تک سیاسی واقعات کا تعلق ہے، تاریخ سے کوئی ایسی سند نہیں ملتی جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ شہر دہلی اور اس کے اطراف میں کبھی بھی لاہوریوں کا زور رہا ہو۔ اس کے برعکس تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ دہلی پایہ تخت مقرر ہو جانے کے بعد سیاسی اور لسانی لہریں ہمیشہ اس مرکز سے پنجاب کی طرف جاتی رہی ہیں۔ اس کی شہادت گرونانک کے کلام میں مل جاتی ہے، جنھوں نے پنجابی کے ساتھ ساتھ کھڑی بولی کی بیشمار شکلیں اپنے کلام میں استعمال کی ہیں۔

مسلمانوں کی فتح دہلی سے قبل راجپوتی عہد میں جو زبان رائج تھی، وہ نہ تو برج بھاشا ہے اور نہ کھڑی بولی بلکہ اس عہد کی قدیم اپ بھرنش روایات میں جکڑی ہوئی زبان ہے جس پر راجستھانی کا اثر نمایاں ہے۔ دراصل ہندستانی کی جدید بولیوں کی پیدائش صحیح معنوں میں اب تک نہ ہوئی تھی۔ خاص طور سے ادب نے انہیں ابھی منھ نہ لگایا تھا' اسی لیے ان زبانوں کے مستند نمونے سولہویں صدی سے زیادہ پرانے نہیں۔ ''پنجابی کے قدیم ترین تحریری نمونے آدگرنتھ میں محفوظ ہیں.....''[5] یہی نمونے ہر لحاظ سے مستند ہیں۔ گورکھ ناتھ اور گوپی چند کے ''شبد'' اس سے قبل کے (14 ویں صدی عیسوی کے) ہیں' لیکن وہ مشتبہ ہیں۔ برج بھاشا کا بھی یہی حال ہے۔ جس کے متعلق ڈاکٹر دھیریندر ورما بڑی تحقیق کے بعد لکھتے ہیں:

''مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ برج بھاشا کے پندرہویں صدی عیسوی تک کے نمونے نہ ہونے کے برابر ہیں۔''[6]

ہریانی زبان میں اورنگ زیب کے عہد تک کسی قسم کا ادب نہیں ملتا۔ اب رہی کھڑی بولی' اس کی شکل ہندی کے قدیم ادب[7] تک میں پہچانی جاسکتی ہے۔ البتہ مسلمانوں کے ہاتھوں وہ پہلی بار ایک نئے رسم الخط اور نئے عروض پر ڈھلتی ہے' لیکن یہ مسلمانوں کے دہلی میں اچھی طرح متمکن ہوجانے کے بعد ہوتا ہے۔ پروفیسر جولیس بلاک کی رائے ہے کہ ابتدائی سلاطین دہلی کے عہد تک اس شہر کو تمدنی اور لسانی اعتبار سے بہت زیادہ بلند مرتبہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس وقت اس کی حیثیت فوجی چھاؤنی کی زیادہ تھی۔[8]

پروفیسر شیرانی کے لسانی نظریے کا سب سے کم زور پہلو یہ ہے کہ انہوں نے پنجابی مسلمانوں کی آمد سے قبل دوآبے کی زبان کے متعلق قیاس سے کام لے کر بتایا ہے کہ وہ برج بھاشا ہوگی۔ حال آں کہ اس وقت تک برج بھاشا کا ارتقا بھی پوری طرح نہ ہوسکا تھا۔ اس کے ثبوت میں وہ فتح دہلی کے ساڑھے تین سو برس کے بعد دو مصنفوں (شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور مخدوم بہاءالدین) کے کلام کا حوالہ دیتے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ چند اشعار یا فقرے جو ان صوفیوں سے منسوب کیے جاتے ہیں' کہاں تک مستند ہیں۔ لسانیاتی فیصلے چند بولوں یا فقروں کی بنا پر نہیں کیے جاسکتے۔ اس کے لیے زیادہ مستند مواد چاہیے۔ علاوہ ازیں سلاطین مغلیہ کے زمانے تک (جب کہ کھڑی بولی نکھر چکی تھی) اس علاقے کے رہنے والے دھڑلے سے برج بھاشا میں شاعری کرتے تھے۔ سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں دراصل برج بھاشا اپنے سولہویں یا سترہویں ہی سال میں تھی اور اپنی ماں شورسینی اپ بھرنش کی طرح شمالی ہندستان کے بہت بڑے علاقے کی مسلمہ ادبی زبان کی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ راجپوتانے کے بھاٹ قدیم زمانے سے 'ڈنگل' کے ساتھ 'پنگل' (قدیم برج) میں بھی شاعری کرتے تھے۔ ولی کی آمد کے بعد تک دہلی میں سورداس کی بھاشا میں شاعری کرنے والے موجود تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت دہلی کی زبان برج بھاشا تھی۔ برج بھاشا کی دھاک خان آرزو کے عہد تک بیٹھی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی ''تصحیح غرائب اللغات ہندی''[9] میں بارہا

سند اسی زبان سے چاہی ہے۔ لفظ 'آکل' کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''چوبے کہ درویش در انگندتا زود باز نہ شود..... لیکن آکل زبانِ وطن مصنف خود بود و بہ زبانِ گوالیار کہ افصح زبان ہائے ہنداست 'پندہ' گویند وغیرہ۔''

پھر لفظ ''ایوارہ'' کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایوار از بان صاحب رسالہ بود بہ زبان برج و گوالیار کہ افصح است آں را کھرک گویند''

'مصنف' اور 'صاحب رسالہ' سے یہاں مراد میر عبدالواسع ہانسوی ہیں جو اصل لغت کے مصنف تھے اور ہریانہ علاقے کے رہنے والے تھے۔

کھڑی بولی کی قدامت کا مزید تاریخی ثبوت حضرت امیر خسرو (متوفی 765ھ) شیخ باجن (متوفی 912ھ) اور ابوالفضل کی تحریروں سے ملتا ہے۔ تینوں نے دہلوی زبان کی نمائندہ حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ حضرت امیر خسرو لکھتے ہیں:

''چوں کہ میں ہندستان میں پیدا ہوا اس لیے چند کلمات اس کی زبانوں کے متعلق بھی کہنا چاہتا ہوں۔ اس وقت ہر صوبے کی جداگانہ بولی ہے جو اس کی اپنی اور مخصوص ہے اور کسی دوسری بولی سے ماخوذ نہیں۔''
(نہ سپہر)

اس کے بعد زبانوں کی فہرست دی ہے جس میں سندھی' لاہوری وغیرہ کے ساتھ ساتھ ''زبانِ دہلوی'' بھی نظر آتی ہے۔ خسرو اور باجن کا بہ یک وقت 'دہلوی' اور 'لاہوری' زبانوں کا ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان دونوں میں امتیاز بھی کرتے تھے کیوں کہ امیر خسرو نے تو انہی بولیوں کے نام گنائے ہیں جو ''مخصوص ہیں'' اور کسی دوسری بولی سے ماخوذ نہیں۔'' خسرو کا زمانہ سلاطین دہلی کا ابتدائی عہد ہے۔ اگر اردو' پنجاب سے سفر کرتی ہوئی' دہلی پہنچتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پون صدی کے اندر اندر اس میں اتنے حیرت انگیز انقلابات ہو گئے تھے کہ وہ اپنے اصل (یعنی لاہوری زبان) سے بالکل مختلف ہو گئی تھی۔

خسرو کی تقسیم زبان سے دراصل جس لسانی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے' یہ ہے کہ پنجاب سے لوگ جدید پنجابی بولتے ہوئے دہلی میں داخل ہوئے ہوں گے۔ دہلی میں اور اس کے آس پاس ان کی مٹ بھیڑ کئی بولیوں سے ہوتی ہے۔ ادبی حلقوں میں اس وقت راجستھانی کا زور تھا۔ آس پاس کے علاقوں میں ایک طرف ہریانی اور دوسری طرف کھڑی بولی کی قدیم شکلیں مستعمل تھیں۔ چوں کہ کسی قدیم زمانے میں مشرقی پنجابی خود انہی دونوں بولیوں کے زیر اثر پیدا ہوئی تھی اس لیے پنجابی بولنے والوں کو یہ دونوں بولیاں بہ اعتبار صوتیات اور صرف و نحو اپنے سے قریب دکھائی دیں۔ اس طرح ان کی نظر انتخاب انہی بولیوں پر پڑی جنھیں بولنا وہ بہت جلد سیکھ گئے۔

(2) لسانی پہلو

پروفیسر شیرانی کے نظریے کا لسانی پہلو' ان کے بعض تاریخی مفروضات سے (جن کا جائزہ پچھلے صفحات میں لیا جا چکا ہے) زیادہ گراں قدر ہے۔ انہوں نے دکنی اور پنجابی (جدید) کی صرف ونحو کی بعض مشترک خصوصیات پر زور دیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قدیم اردو' پنجابی زبان سے نکلی تھی۔

پروفیسر موصوف نے اپنے لسانی نظریے کو مرتب کرتے وقت اس لسانی حقیقت کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے کہ راجستھانی اور گجراتی کی طرح پنجابی کا تعلق بھی کسی زمانے میں زبانوں کی بیرونی شاخ (ڈاکٹر چیٹر جی کے الفاظ میں شمال مغربی گروہ) سے تھا۔ بعد کو اس پر اندرونی زبان (مدھ دیس کی زبان۔ جس کی نمائندہ بولیاں برج اور کھڑی ہیں) کی گہری چھاپ پڑی۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ مغربی (لہندا) اور مشرقی پنجاب کے درمیان حد فاصل قائم کرنا دشوار ہے۔ یہ دونوں زبانیں اس آہنگی سے گھل مل جاتی ہیں کہ گریرسن کے خیال میں کسی زمانے میں سارے پنجاب پر لہندا (مغربی پنجابی) کا راج تھا۔ رفتہ رفتہ راجپوتی عہد میں دوآبے کی بولی نے اسے پیچھے دھکیلنا شروع کیا اور رچنا دوآب تک ہٹا دیا۔ دوآبے کی زبان کے نشانات سندھ ساگر دوآب تک کی لہندا میں پائے جاتے ہیں[10]۔ جوں جوں مشرق کی سمت آیئے' اس کا رنگ گہرا ہوتا جاتا ہے' اسی لیے گریرسن نے پنجابی کو راجستھانی اور گجراتی کی طرح ''ملواں'' زبانوں کی صف میں جگہ دی ہے۔

ہندستان کی جدید آریائی زبانوں کی پیدائش کے سلسلے میں ہر قسم کا مطالعہ اور تنقید بے سود ثابت ہوگی' جب تک کہ:

(1) ہند آریائی زبان کے ارتقا کی نشان دہی عہد قدیم سے نہ کی جائے۔ بالخصوص عہد اپ بھرنش کی ادبیات کا لسانی جائزہ از بس ضروری ہے۔

(2) جب تک کہ تقابلی مطالعہ تمام ہم سایہ بولیوں سے نہ کیا جائے۔

پروفیسر شیرانی نے اپنی تصنیف ''پنجاب میں اردو'' میں (نمبر 1) کو نظرانداز کر کے اپنے نظریے کو بے بنیاد کر دیا ہے۔ اور (نمبر 2) کا خیال پوری طرح نہ رکھنے کی وجہ سے وہ بعض یکطرفہ لسانی نتائج مرتب کرنے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ پنجابی زبان کی 'ملواں' حیثیت اگر ان کی نظر میں ہوتی تو وہ مشترک خصوصیات پر اتنا زور نہ دیتے۔ ہر دو ہم سایہ بولیوں میں کچھ نہ کچھ خصوصیات مشترک ضرور ہوتی ہیں۔ چناں چہ اردو اگر ایک طرف بعض لحاظ سے پنجابی سے مماثل ہے تو دوسری طرف بعض صرفی ونحوی قاعدوں کے اعتبار سے ہریانی سے ملتی جلتی ہے۔ آج کل کی معیاری اردو لب ولہجے کے اعتبار سے مراد آباد اور بجنور کے اضلاع کی بولی سے قریب تر ہے' لیکن اپنے ارتقا کے ابتدائی دور میں یہ جمنا پار کی ہریانی بولی سے زیادہ قریب تھی۔ قدیم دکنی میں

بعض اثرات پنجابی کے بھی ملتے ہیں' اس لیے صحیح نتائج کے استخراج کے لیے تقابلی مطالعے کا میدان زیادہ وسیع ہونا چاہیے اور جہاں تک ہو سکے پنجابی' اردو' ہریانی اور برج کی ادبیات کے قدیم اور مستند نمونوں پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔

(1) اردو [ا] گروہ والی زبانوں سے تعلق رکھتی ہے' یعنی اس میں اعلام' اسما اور اسمائے صفات الف پر ختم ہوتے ہیں' جب کہ برج بھاشا' بندیلی اور قنوجی میں [و] پر۔ پروفیسر شیرانی کے خیال میں یہ پنجابی سے مخصوص ہے اور اردو اس بارے میں اسی سے متاثر ہے۔ اردو کے اس پنجابی پن کی طرف اشارہ دراصل سب سے پہلے گریرسن نے کیا تھا' لیکن یہاں یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ [ا] اور [و] دونوں شکلیں ازمنۂ وسطیٰ کی پراکرتوں سے نکلی تھیں۔ مغربی ہندی کی تین بولیوں نے [و] شکل کو اپنایا اور باقی ماندہ دو (کھڑی اور ہریانی) نے [ا] کو۔ اس کی مزید توضیح خود اردو کے ایک دیہاتی نام یعنی ''کھڑی بولی'' سے ہو جاتی ہے۔ لفظ 'کھڑی' کے متعلق عجیب و غریب قیاس آرائیاں ہوتی آئی ہیں۔

(الف) ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا خیال ہے کہ ''کھڑی بولی کے معنی ہندستانی میں عام طور پر گنواری بولی کے ہیں' جسے ہندستان کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ وہ نہ کوئی خاص زبان ہے اور نہ زبان کی کوئی شاخ''۔[11]

(ب) پنڈت چندر دھر شرما گلیری کا خیال تھا کہ ''بدیسی مسلمانوں نے آگرہ' دتی' سہارن پور اور میرٹھ کی کسی ''پڑی بھاشا'' کو 'کھڑی' بنا کر اپنے لشکر اور سماج کے قابل بنا لیا۔''[12]

دراصل کھڑی بولی کے صحیح تصور کے لیے برج بھاشا کا پس منظر ضروری ہے۔ ایک کا تعلق [ا] گروہ کی زبانوں سے ہے اور دوسری کا [و] گروہ والیوں سے۔ اگر یہ کہا جائے کہ برج بھاشا کے مقابلے میں یہ بولی کھڑی کھڑی لگتی ہے تو بات ذرا عقلیات کے دائرے سے نکل کر حسیات میں آ جاتی ہے' لیکن یہ احساس بعض لسانی حقائق کی غمازی کرتا ہے۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ بندیل کھنڈ میں اسے ''ٹھاڑ بولی'' اور ماڑواڑ میں ''ٹھاٹھ بولی'' کہتے ہیں۔ 'ٹھاڑ' اور 'ٹھاٹھ' دونوں کے معنی 'کھڑے' کے ہیں۔ زبان کا یہی کھڑا لہجہ پوربی اور برج کے مقابلے میں فصیح سمجھا جاتا ہے۔

(2) فعل امر کے متعلق پروفیسر شیرانی لکھتے ہیں: ''امر کا قاعدہ اردو اور پنجابی میں بالکل ایک ہے'' یعنی علامت مصدر گرا دی جائے تو امر باقی رہ جاتا ہے۔ مثلاً چلنا سے 'چل' کرنا سے کر۔

پروفیسر موصوف کا یہ بیان بالکل صحیح ہے' لیکن امر کا یہ قاعدہ اردو یا پنجابی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ہندستان کی تمام جدید آریائی زبانوں میں امر اسی طور پر بنتا ہے۔ 'چل' اور 'کر' پنجاب سے لے کر بنگال اور بنگال سے دکن تک یکساں طور پر مستعمل ہیں۔ امر بنانے کا یہی قاعدہ گجراتی' مرہٹی میں ملتا ہے۔ اس قسم کے یک طرفہ بیانات عام طور سے اپنے دعوے کی حجت کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

(3) لفظ 'تھا' کی رام کہانی پروفیسر شیرانی نے بڑی دلچسپ بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں ''تھا' اس

غریب کو لغات نگاروں نے مصدر 'ہونا' کا پسر خواندہ بنا دیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ یہ 'ہونا' کی ماضی ہے...... سنسکرت اور پراکرت کی آڑ میں خدا جانے ہم سے کیا کیا قبولوایا جا رہا ہے' لیکن ایک موٹی سی بات یہ ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر لفظ سنسکرت کے مآخذ سے نکالا جائے۔ اب میں بجائے اس کے کہ 'تھا' کو 'ہونا' کے گلے باندھوں اور پھر 'ہونا' کو سنسکرت کے 'بھوُ' سے استخراج کروں' یہ زیادہ موزوں سمجھتا ہوں کہ اس کو ملتانی زبان کے مصدر 'تھیونا' (بہ معنی ہونا) کی ماضی مان لوں۔ ''تھیونا'' کی ماضی 'تھیا' آتی ہے۔ اردو والوں نے اسے یائے اشمام سمجھ کر اڑا دیا اور 'تھا' بنا لیا۔''

اردو کی ابتدا کے سلسلے میں 'کھینچا تانی' کا رجحان عام طور سے علمی تحقیق کو ہلکا کر دیتا ہے۔ اردو کے فعل امدادی (ماضی) 'تھا' کا تعلق سنسکرت کے 'بھوُ' سے نہیں 'ستھ' سے ہے۔ اس کے ارتقا کے مدارج یہ ہیں:
اردو: تھا...... پراکرت: تھای' ٹھای...... سنسکرت استھت۔

پھر یہ کہ 'تھیونا' اور 'تھیا' ملتانی میں مصدر اور فعل ماضی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور 'تھیا' پنجابی یا ملتانی فعل امدادی ماضی کے طور پر مستعمل نہیں۔ پنجابی کی ماضی میں فعل امدادی عام طور سے سان' سی اور سوں آتے ہیں۔[13]

(4) پنجابی میں گا' گی' گے' کے علاوہ مستقبل 'سی' کی تصریف سے بھی بنتا ہے۔ دکنی میں اس قسم کے مستقبل کی مثالیں مل جاتی ہیں' جس کی بنا پر مصنف ''پنجاب میں اردو'' کو یہ خیال ہوا کہ قدیم دکنی نے یہ خصوصیت بھی پنجابی سے لی ہوگی۔ ملا وجہی کی 'سب رس' میں واحد غائب (بھلاسی نا' ص 10) جمع غائب (نا آسیں۔ ص 105) واحد حاضر (نہ ہوسی۔ ص 22) مواحد متکلم (تدبیر نہ کرسوں' ص 215) مل جاتے ہیں۔ لیکن یہ بڑی دل چسپ بات ہے کہ جمع حاضر اور جمع متکلم کے صیغے 'سی' کے ساتھ کہیں نہیں پائے جاتے۔ علاوہ ازیں ''سب رس'' میں یہ اس قدر کمی کے ساتھ ملتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رواج ترک کیا جا رہا تھا۔ پھر یہ کہ یہ 'سی' کی علامت مستقبل لہندا یا پنجابی سے مخصوص نہیں۔ مغربی حلقے کی تمام بیرونی زبانوں کی یہ مشترک خصوصیت ہے۔ راجستھانی کی اکثر بولیوں میں 'گ' کے ساتھ ساتھ 'س' بھی علامت مستقبل کے طور پر مستعمل ہے۔ قرین قیاس یہی ہے کہ زبان دہلوی پر یہ اثر براہ راست راجستھانی کا پڑا ہوگا' بلکہ شاید یہ اپ بھرنش کی آخری شکل کی نمایاں خصوصیت ہوگی کیوں کہ اس کا استعمال پورب کے کبیر داس تک کے یہاں ملتا ہے۔

اردو' دکنی اور پنجابی کے بنیادی اختلافات:

پروفیسر شیرانی نے اردو' دکنی اور پنجابی کی مماثلتوں پر غیر معمولی زور دیا ہے' لیکن ان کی نظر اس طرف بالکل نہیں گئی کہ ان میں ماں بیٹی کا رشتہ قائم کرتے وقت ان کی صرف ونحو کے بعض بنیادی اختلافات کا جواز بھی ڈھونڈھنا ضروری ہوگا۔ خسرو جیسے لسان نے کچھ سمجھ کر ہی 'زبانِ دہلوی' اور 'لاہوری' میں امتیاز کیا ہوگا۔ ان دونوں زبانوں کے بعض بنیادی اختلافات ذیل میں دیے جاتے ہیں' تاکہ پروفیسر شیرانی کے لسانی

نظریے کا دوسرا رُخ بھی اجاگر ہو جائے۔

(1) اردو؍ دکنی اور پنجابی کی صوتیات ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں' لیکن چوں کہ قدیم زمانے کے صوتی ریکاڈ ہمارے پاس موجود نہیں' اس لیے یہ بتانا ذرا دشوار ہے کہ ایک زبان نے دوسری کو کس حد تک متاثر کیا۔ البتہ اردو میں ایک مزید آواز [ڑھ] ہے جو پنجابی میں نہیں ملتی[14]۔ یہ ایک علاحدہ اور مستقل آواز ہے جو جدید دکنی میں بھی پائی جاتی ہے[15] قدیم دکنی میں [ڑھ] کو [ڑ] ہی لکھا جاتا تھا۔

(2) ضمائر:۔ زبان کے کینڈے کو متعین کرنے اور دوسری زبانوں سے اس کے صحیح رشتے بتانے میں ضمائر کو جو اہمیت حاصل ہے' اسے سب قواعد نویسوں نے تسلیم کیا ہے۔ دکنی اور پنجابی کے اکثر ضمائر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مثلاً:

واحد غائب: حالت فاعلی۔ پنجابی (ایہہ)۔ دکنی میں عام طور سے (یو) ملتا ہے۔

حالت اضافی: واحد ہو یا جمع' پنجابی کی حالت اضافی دکنی سے ہمیشہ مختلف ہوگی۔ پنجابی میں (کا' کی کے) کی بہ جائے (دا' دی' دے) آتے ہیں' جس کی ایک بھی مثال دکنی ادب میں نہیں ملتی۔

حالت مفعولی: یہی حال حالت مفعولی کا ہے۔ پنجابی میں یہ "نوں" کے اضافے سے بنائی جاتی ہے۔ ہریانی میں بھی "نوں" ملتا ہے' لیکن اردو ادبیات میں (دکنی ہو کہ شمالی ہند کی اردو) اس کا کہیں پتا نہیں چلتا۔

ضمائر کی جمع میں دونوں زبانوں کے اختلافات اور زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ یہاں دور کی بھی نسبت معلوم نہیں ہوتی۔

فاعلی جمع متکلم: پنجابی میں "اسی" ہے' جو دکنی یا اردو میں کبھی استعمال نہیں ہوا۔ قدیم دکنی میں زیادہ تر "ہمیں" ملتا ہے۔ سب رس میں "ہم" بہت کم ملتا ہے۔

اضافی جمع متکلم: پنجابی: ساڈا دکنی: ہمارا۔ ہمن

فاعلی جمع حاضر: پنجابی: تسی دکنی: تم

اضافی جمع حاضر: پنجابی: تو ہاڈا دکنی: تمارا

ضمائر غائب میں پنجابی [اوہ] کی بہ جائے دکنی میں [وو] یا محض [اُ] (دیکھیے قلی قطب شاہ کا دیوان 62/3 اور 355/2)۔ ان کے علاوہ [اُن ق۔ ق 55/4] اور [اُنے سب رس 51/10] بھی ملتے ہیں۔

ضمائر اشارہ میں پنجابی [اِنا = اتنا] اور [اُنا = اُتنا] دکنی میں نہیں ملتے۔ ان کی بہ جائے [اِتا] اور [اُتا] آتے ہیں۔

(3) افعال: افعال کے اعتبار سے جہاں دکنی اور پنجابی ایک دوسرے کے مماثل ہیں' بعض لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں۔

(الف) پنجابی میں حالیہ ناتمام مادے میں [دا] بڑھانے سے بنتا ہے۔ یہ شکل دکنی یا اردو میں کبھی

رائج نہیں ہوئی، جس کی مخصوص علامت [تا] ہے، جو کھڑی بولی اور ہریانہ کے علاقے سے مخصوص ہے۔ برج بھاشا میں یہ محض [ت] بن کر رہ جاتی ہے۔

مادہ	حالیہ ناتمام پنجابی	حالیہ ناتمام دکنی اور اردو
نکل	نکلا	نکلتا۔ نکلتا
پی	پیندا	پیتا
کہہ	کہندا	کہتا: دکنی۔ کتاوغیرہ

اس سلسلے میں پنجابی کی یہ خصوصیت بھی قابل غور ہے کہ حروفِ علت پر ختم ہونے والے مادوں میں حالیہ ناتمام بنتے وقت 'غنہ' کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جیسے پیندا۔ جیوندا (جیتا) وغیرہ میں یہ اردو اور دکنی میں نہیں ملتا۔

(ب) ماضی میں دونوں زبانوں کے اختلافات اور اجاگر ہو جاتے ہیں۔ پنجابی میں [سا] کی مختلف شکلیں ملتی ہیں۔ دکنی میں [تھا یا اتھا]

واحد		جمع	
پنجابی	دکنی	پنجابی	دکنی
میں ساں	میں تھا (اتھا)	اسی ساں	ہم تھے
توں سائیں	توں تھا (اتھا)	تسی ساؤں	تم تھے
اوہ سی	وو تھا (اتھا)	اون	وو تھے (اتھے)

(ج) حالیہ ناتمام اور افعال امدادی کے مختلف ہونے کی صورت میں مرکب افعال مثلاً ماضی ناتمام (میں کرداساں) بھی لازمی طور پر مختلف ہو جاتے ہیں۔

(د) افعال مرکب: کسی کام کے ختم کر دینے کو پنجابی میں عام طور سے بہنا (بیٹھنا)، رہنا، ہٹنا اور چکنا ظاہر کرتے ہیں۔ اردو اور دکنی میں رہنا، بیٹھنا اور بالخصوص ہٹنا اس طور پر مستعمل نہیں۔ ان میں چکنا زیادہ فصیح اور با محاورہ ہے۔ ''چکنا'' پنجابی میں اردو سے لیا گیا ہے، کیوں کہ یہ صرف شہروں میں رائج ہے۔ دیہاتوں میں شاذ و نادر سننے میں آتا ہے۔[16]

(4) حروف: پنجابی کے بعض عام مستعمل حروف دکنی میں نہیں ملتے۔

توں: کو۔ دکنی کا کو یا کوں۔

وچ: بیچ۔ اردو دکنی میں ''میں'' یا ''بیچ''۔

وچ قدیم و جدید پنجابی سے مخصوص ہے۔

نال: اردو اور دکنی میں اس کی بہ جائے 'ساتھ' اور ''سنگ'' وغیرہ آتے ہیں۔

توڑی تاڑی: پنجابی میں 'تک' کے معنوں میں آتے ہیں۔ دکنی میں یہ 'لگ' ہے جو لاہور سے لے کر

اودھ تک کی بولیوں میں آج بھی ملتا ہے۔

کول، کولے: 'پاس' کے معنوں میں آتا ہے۔ دکنی میں مفقود ہے۔

وانگوں، وانگر: 'مثل' کے معنوں میں آتا ہے۔ دکنی میں سنسکرت کا 'سم' ملتا ہے۔

نیڑے: (نزدیک) پنجابی سے مخصوص ہے۔ دکنی میں ''نزدیک'' 'کن' یا 'کنے' ملتا ہے۔

سمت کے اظہار کے لیے پنجابی میں 'ارا، ول اور سوا وغیرہ آتے ہیں، جو دکنی میں نہیں ملتے۔

ہن: پنجابی میں ''اب'' کے معنوں میں مستعمل ہے۔ دکنی میں ''اب'' اتال'' یا'' ہے'' آتے ہیں۔

پنجابی میں مختلف اوقات کے اظہار کے لیے ''ویلا'' کا اضافہ کر دیتے ہیں مثلاً دھمی ویلا (علی الصباح)۔ یہ شکل دکنی میں نہیں ملتی۔

(5) پنجابی زبان کے بعض عام مستعمل اسما دکنی میں نہیں ملتے مثلاً:

پیو (باپ)۔ بھرا (بھائی)۔ پتر (بیٹا۔ پوت)۔ وا (ہوا)۔ وہٹی، رن (بیوی)۔ دِھی، کاکی، کڑی (بیٹی، لڑکی)۔ ککڑ (مرغ)۔ وال (بال)۔ نکا (چھوٹا) وغیرہ۔

صوتی اعتبار سے دکنی مغربی ہندی کے اس اٹل صوتی اصول کی پیروی کرتی ہے، جس کے تحت [و] کی آواز [ب] میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مثلاً

سنسکرت		برج	کھڑی	ہریانی	قنوجی	بندیلی
وِش =	بس	(				
وینا =	بین	(ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	)
ورن =	برج	(ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	)
وید =	بید	(ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	)

قدیم دکنی کی کتب سے اس رجحان کی تائید ہوتی ہے مثلاً 'دیوان قلی قطب شاہ' 'سب رس' اور 'قطب مشتری' سے حسب ذیل مثالیں جمع کی جا سکتی ہیں:

سنسکرت	دکنی	سنسکرت	دکنی
یون	جوبن	ورن	برن
وچن	بچن	وارتا	بات
وجر	بجر (پتھر)	وست	بست

ان کے برعکس پنجابی میں عام طور سے [و] کی آواز کو برقرار رکھا جاتا ہے۔ جیسے وست (بست: چیز)۔ وِچ (بیچ)۔ وال (بال)۔ وڈائی (بڑائی)۔ ویر (بیر)۔ وچار (بچار)۔ وس (بس) وغیرہ۔ رجحان قدیم پنجابی سے قائم ہے، جس کی مثالیں ''گرو گرنتھ آد'' تک میں مل جاتی ہیں۔

پروفیسر شیرانی مغربی ہندی کی مذکورۂ بالا عالم گیر خصوصیت کی تعبیر ذیل کے الفاظ میں کرتے

ہیں۔ ''پنجاب اور اردو میں'' بعض حروف آپس میں تبدیل ہو جایا کرتے ہیں مثلاً پنجابی کی [و] اردو میں [ب] سے تبدیل ہو جاتی ہے۔'' لیکن اگر پروفیسر موصوف کی نظر آریائی السنہ ہند کے صوتی تغیر و تبدل پر ہوتی تو وہ اس قسم کا بیان نہ دیتے۔ دراصل سنسکرتی آوازیں شمال مغربی ہندستان کی بعض بولیوں میں زیادہ بہتر طریقے سے محفوظ ہیں۔ ان کے برخلاف دوآبے کی بولیاں ارتقائی مدارج طے کرتی ہوئی ان کی شکست و ریخت کر دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی اور عربی تک کے الفاظ کا [و] یہاں کے دیہاتیوں کی بولیوں میں [ب] ہی کے اندر تبدیل ہو جاتا ہے۔

''پنجاب میں اردو'' اس میں شک نہیں' اردو زبان میں لسانی تحقیق کی سب سے جلیل القدر تصنیف ہے۔ ہمارے بڑے محقق نے اردو لسانیات کے جس مسئلے کو اس میں اٹھایا ہے' اس کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں رہنے دیا ہے' لیکن ہند کی جدید آریائی السنہ سے متعلق لسانی نظریہ مرتب کرتے وقت اس کی سخت ضرورت ہے کہ ہندستان کی لسانیاتی تاریخ کو پیش نظر رکھا جائے۔ یہ تاریخی حس تمام علوم و فنون کے لیے ضروری ہے۔ لسانیات کے لیے شاید سب سے زیادہ ضروری۔ اردو اور دکنی کے ''پنجابی پن'' میں غلو کرنے کی شاید اس قدر ضرورت نہ رہے' اگر دوسری ہم سایہ بولیوں کا بھی جائزہ لیتے جائیں اور ساتھ ساتھ اردو اور دکنی کے ''غیر پنجابی پن'' پر بھی روشنی ڈالتے جائیں۔ اردو زبان کی ابتدا کا مسئلہ دھندلکے سے روشنی میں اس وقت تک نہیں آ سکتا' جب تک کہ لاہور سے لے کر الہ آباد تک کے علاقے کی لسانیاتی الٹ پھیر کی مکمل تاریخ مرتب نہ ہو جائے۔

حواشی:

1- 'پنجاب میں اردو' مقدمہ
2- ایضاً
3- ایضاً
4- ایضاً
5- 'پنجابی صوتیات' (انگریزی) بناری داس جین
6- 'برج بھاشا' ویاکرن ص 31
7- دیکھئے گلیری جی کا مضمون ''پرانی ہندی'' پتر کا ناگری پرچارنی سبھا
8- ہند آریائی لسانیات کے بعض مسائل B.S.O.S (1931ء)
9- اس لغت کے دو قلمی نسخے لٹن لائبریری مسلم یونی ورسٹی میں موجود ہیں۔
10- گریرسن: 'لسانیاتی تبصرۂ ہند' جلد نہم حصہ اوّل' ص 614
11- رسالہ 'اردو' جولائی 1933ء' ص 59

12- 'ناگری پرچارنی پترکا' 1978ء ص 242

13- 'مینول آف پنجابی گرامر' ص 323 از نیلی

14- پنجابی اور ہندی کا سامانیہ بھاشا گیان۔ دونی چند

15- 'ہندستانی صوتیات' (انگریزی) ص 93۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور

16- 'پنجابی مینول اور گرامر' از نیلی

(در: اردو، بابت اکتوبر 1946ء ص 433-448)

Baghawat Sarup

Some Reminiscenees of my Association with Prof. Hafiz Mahmud Shairani

My contact with Prof. Shairani began in 1930. When I sought admission to M.A. Persian in Oriental College, Lahore. However, I had heard a lot about his scholarship much earlier from my elder brother, Late Prof. Man Mohan Lal Mathur who passed M.A. Persian from Punjab University in 1924-25. He had joined Islamia College, Lahore and was a contemporary of Prof. Sufi Ghulam Mustafa Tabassum. At that time Prof. Shairani was on the staff of Islamia College. Although punctilious about religious observances, he was absolutely free from bigotry. According to my brother, Prof. Shariani was teaching them *Makhzan-e-Asrar* of Nizami. As a matter of principle, Prof. Shairani taught the book assigned to him from cover to cover. As he found that he could not finish the book in the periods alloted to it in the time-table, he invited all his pupils to come to his house early in the morning. Before starting work he offered each one of them a cup of piping hot tea.

After my admission to the College, I was allotted a cubicle in the Woolner Hostel. Then one day my brother took me to Prof. Shairani's house and told him that I was going to be his new pupil. He remarked, in a rather dry tone, "well sonny, you will have to put in a lot of work". Then he addressed my brother and asked. "Man Mohan,

how much progress have you made in your work?" "Sir, it is nearing completition", was his reply.

Subsequently I learnt that Prof. Shairani had entrusted to my brother the task of editing the *Diwan* of Baba Fughani (died in 925 A.H., 1677A.D.) who had been aknowledged as the inventor of *Tazehgoi*, a new trend in *ghazal*-writing which exercised a profound influence on Persian poets in India and Turkey. The main reason why my brother was assigned this project was that the most authentic and beautifully written manuscript of this *Diwan* was in the private collection of Late Lala Sri Ram, M.A., a *rais* of Delhi, and the author of *Khumkhana-e-Javeed* and my brother used to spend his summer vacation in Delhi, to where the belonged. Very reluctantly Lalaji permitted my brother to come to his Library and copy the manuscript in his presence. After a careful collation of the contents of this manuscript with these of the Khuda Bakhsh Library, Patna and Imperial Library, Calcutta, he presented the draft to Prof. Shairani for his scrutiny. He approved of the work and also retouched the introduction written by my brother. The *Diwan* was published by Sh. Mubarak Ali, Tajir Kutub, inside Lohari Gate in 1930-31. Prof. Shairani was very happy that the project had been executed to his satisfaction. The work of this poet saw the light of day after remaining in oblivion for 250 years.

When I joined the M.A. course in Persian, Prof. Shairani was assigned two books to teach us. One was a selection of *Qasaid-e-Khaqani*, published by Haji Mohammad. Saeed of Calcutta and the other one was Persian Diwan of Ghalib, only *radif Mim* and *Nun*. The latter had been recently published and was almost free from

misprints. The *Qasaid* were full of misprints. He admired Nawal Kishore for bringing out any book of Persian, the manuscript of which was available to him and selling it at a low price to keep alive interest of the people in this language and its literature. But he also conceded the limitations of the publisher in ensuring a perfectly correct text. It was the duty of the teacher who has all the time in the world to correct the text before teaching it.

So he took great pains in teaching the *Qasidas* of Khaqani. Apart from correcting the text, he dealt at length with the historical and geographical allusions which abound in the poetry of Khaqani. I shall confine myself to only one example. While teaching the well known *qasida* of Khaqani in praise of Akhtisan bin Minochahr opening with.

صبح خیزان بین قیامت درجهان انگیخته　　نعره حاشان نفخ صور از حر دهان انگیخته

When he came to the following as printed in the book:

بر سر دریای نیلین تیغ کان روبناس　　تا جزیره روبناس دلیران انگیخته
در جزیره رانده یک دریا ز خون روستان　　موج از آن دریای خون گوه کلان انگیخته

He first gave the correct reading which is as follows:

بر سر دریا ز نیلی تیغ کان روبناس　　تا جزیره روبناس و لعمران انگیخته
در جزیره رانده یک دریا ز خون روسیان　　موج از آن دریای خون گوه کلان انگیخته

After correcting the misprints he proceed to give detailed notes on روبناس and لعمران روبناس is a plant from which red dye used to be prepared. Its Arabic equivalent is فوه and in English it is called Madder, کان روبناس means the mine of Madder, that is, the blood of the enemy. روبناس is also the name of an island in the Caspian Sea and he dictated the following notes on it:

روبناس.... محل صحیح این جزیره به تحقیق معلوم نشده است و به یقین نتوان گفت که مقصود از این کدام

یک جزیرہ از جزایر کنونی دریای خزر است۔ اصطخری (سنہ 340ھ) در مسالک الممالک ذکر جزیرہ میکند کہ در مقابل رودخانۂ کر واقع است و دارای آب و درخت و جنگل است و در آنجا فوہ بدست میآید کہ بہ بردع می برند و فوہ همان روبناس است۔ ابن حوقل مینویسد کہ در نواحی ورثان و بردع و باب الابواب و جزیرۂ کہ در وسط بحر خزر است روناس پیدا میشود کہ از راہ بحر خزر بہ جرجان حمل میشود و از آنجا بہ چار پایان بہ هندی برند۔ ابوالفدا هم در تقویم البلدان در ذکر دریای خزر از جزیرۂ سخن می راند کہ واقع است در محاذی مصب رودخانۂ کر و دارای بیشہ ها و آبها است و جزیرۂ بزرگی است کہ از آنجا روناس زیادی بہ ممالک دیگر می برند۔ امروز هم در مقابل دهانۂ دریای کر جزیرۂ موجود است کہ روناس در آنجا می روید و موسوم است بہ جزیرۂ ساری یا سارا و محتمل است کہ جزیرۂ روبناس کہ خاقانی از آن ذکر می کند و روسها در موقع خروج 570 یا 571 بدانجا پناہ بردہ بودند همان جزیرۂ ساری کنونی باشد۔

لیمران... امروز دهکدۂ بزرگی است واقع در سر راهی کہ از شماخی بہ شوشہ میرود تقریباً در دو فرسخ و نیمی ساحل جنوبی رود کر۔

This is just one illustration of the way of the great teacher approached his task. He laid stress on the historical and geographical background of literature. Thus he not only taught literature but also taught his pupils how to learn and teach.

In the class are often discussed the relative merits of *Sherul Ajam* and Browne's *Literary History of Persia.* We, as students found *Sherul Ajam* more useful as Shibli gives ample space to the criticism of Persian poetry and that is what we needed for our exams. Prof. Shairani advised us to depend on Browne as the latter is factually more authentic. He had the MSS. of all the European libraries at his disposal. Shibli on the other hand was handicapped by his immobility and had to content himself with the restricted number of MSS. available to him. He was a prolific writer with a variety of interest which left him hardly any time to verify his facts. I have made a passing reference to his views on *Sherul Ajam*, for further and full justification of his views on this one should study his *Tanqid-e-Sherul Ajam.*

The other discovery that he had made, was that the authorship at the romance of *Yusuf wa Zulaikha* which has been wrongly attributed to Firdausi. He would not say anything until he had authentic proof. We were therefore surprised when Riza-Zadeh Shafaq in his *Tarikh-e-Adabiyat-e-Iran* published about 1935, included this romance among the works of Firdausi. Prof. Shairani had also made an intensive study of *Shahnameh* and arrived at the conclusion that Nizami Aruzi had blindly assumed that Firdausi wrote the satire against Mahmud. He has adduced in his essay on the subject in controvertible evidence to disprove this theory. In the class-room he only averred that Firdausi was not only a great poet but also a great man. A man of such lofty character would not stoop to satirize even his worst enemy. On this issue also the Persian scholars have completely relied on the testimony of *Chahar Maqala.*

After passing M.A. Persian, I studied for *Munshi Fazil* and then got a temporary job in the Dayal Singh College, Lahore. At that time Prof. Shairani advised me to get myself enrolled for Ph.D. under his supervision. But before I could take any decision in this matter, I got a permanent job in Hindu College, Delhi. It was not feasible to do Ph.D. from the Punjab University while I was in Delhi. So I had to drop the idea.

I had lost almost all hope of ever meeting my old teacher. Fortunately I had taken a house in Darya Ganj, right opposite to the *kothi* of Dr. Ansari, the veteran freedom fighter. Dr. Ansari had died quite a long time back and the sole occupants of that palatial building were Begum Ansari, her only daughter and son-in-law. In the early months of 1938, Mrs. Ansari also passed away. Her son-in-law wanted

to dispose of the *kothi*. About this time the office of Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (Hind) was shifted rom Aurangabad (Deccan) to Delhi and Moulvi Abdul Haq took over this *kothi* for his office-cum-residence. Allama Datatarya Kaifi was also very closely associated with Moulvi Abdul Haq in the work of the Anjuman. Kaifi Sahib had known me from Lahore. I naturally used to pay my respects to him. He introduced me to Moulvi Abdul Haq who treated me with utmost kindness.

In the meantime, Prof. Shairani had retired from the service of the Punjab University and returned to Tonk. His two books Firdausi *par char Maqaley* and *Tanqi-i-Sherul Ajam* had already been published by the Anjuman and now that he had leisure he was invited by Moulvi Abdul Haq to contribute articles to *Urdu*, the organ of the Anjuman. Prof. Shairani mostly wrote reviews on books written on Persian literature. In this connection he often visited the office of the Anjuman. On his very first visit he casually asked Kaifi Sahib about me. He immediately sent for me. It was an extremely pleasant surprise for me. He first asked about the health of my wife and children. My wife had a fragile constitution and often suffered from cardiac trouble. He expressed genuine solicitude about her health and firmly told me to take good care of her health and engage a cook at whatever cost it was available. He also expressed a desire that I should call on him every evening during his sojourn in Delhi. He was always accompanied by Akhtar Shairani, partly because he was old and needed somebody to look after him and partly because he felt some difficulty in writing long articles, so he dictated them to his son who was good at calligraphy. This was the beginning of my close

association with him. We used to talk for hours. One day he said, "you know, Mathur (that was my surname which I used during my students days, but which I had dropped after I had joined the staff of Hindu College), the Oriental teachers are paid low salaries in this country. The post of a Professor of Persian fell vacant in Dacca University and I applied for it. I was called for interview. Out of curiosity I asked "What questions did they put to you." Oh, strange type of people! They asked me about Mazdak, his life and teaching and his fate in the end. I answered their questions. Shortly afterwards, I received the Letter of Appointment. But Prof. Iqbal and Moulvi Muhammad Shafi dissuaded me from accepting the offer. Their argument was that I would be among strangers whose language and culture were different from mine. Moreover, Dacca was not as great a centre of Oriental learning as Lahore. Each visit to Tonk would cost you a big chunk of your income. Their reasoning appealed to me and I declined the offer. Then he paused for a puff at his cigarette and added. "These gentlemen were, however, eager to improve my lot and persuaded the University authorities to create the post of a Lecturer in Urdu to which I was appointed." This appointment marked a significant change in his acadamic activity. He turned his attention to Urdu to justify his designation. When I was at Lahore, he was engaged in research on *Prithwi Raj Rasau*. His contention was that *Rasau* was not written during the reign of Prithwi Raj. I presume his article on this subject must have been already published in some journal. But he continued to teach Persian and guide research in the literature of this language. In early thirties Dr. S. Mohammad Abdullah was pursuing research under his supervision on

his excellent thesis on *Contribution of Hindus to Persian Literature.*

Among his closest friends he counted Prof. Iqbal and Late S.D. Azar who succeeded him at Islamia College. In late thirties Azar came to Delhi and took over as Secretary, Board of Secondary Education from Dr. Azhar Ali of St. Stephen's College. Shairani Sahib was very much impressed by the hospitality of S.D. Azar. This gentleman was closely associated with the activities of the Anjuman. In December, 1939, the Anjuman held an All India Urdu Conference in Delhi. On this Occassion an exhibition of Urdu books, manuscripts and old coins was also arranged. Azar succeeded in presuading Shairani Sahib to bring his collection of rare coins of great numismatic value. While his manuscripts are safe in the Punjab University Library, I wonder what happened to his coins. On this occasion I casually mentioned to him that I would be going to Calcutta to consult some manuscripts in the Imperial Library. He at once advised me to see Prof. Mahfuzul Haq who was a profound scholar of Persian. He also gave me his address. In the following summer vacation I did make it to Calcutta and called on Prof. Mahfuzal Haq. He was happy to meet an old pupil of Prof. Shairani. He observed, "India has produced only one great scholar of Persian. He remained stuck up at Lahore. I wish we could bring him to Calcutta and then send him to Dacca." Then he narrated an incident, which sent my mind back to my student days at Lahore. Once Prof. Sufi Ghulam Mustafa Tabassum read a paper on "Constribution of Mughal Princes to Persian Poetry" in F.C. College Hall. He mentioned one of the Mughal princes who had compiled a *diwan* of his *ghazals*. The only ms. of it was in the U.K. where Prof. Shairani had seen it. Prof.

Mahfuzul Haq had purchased this manuscript for Calcutta University and communicated the news of this acquisition to Prof. Shairani. The latter wrote back to ask, "Is this the same manuscript on the flyleaf of which are written the following verses (and Prof. Shairani noted down those verses)". It was the same manuscript indeed. He had seen the manuscript many years back but so wonderful was his retentive memory that he still remembered those lines.

After his retirement, Prof. Iqbal often invited him to Lahore. Prof. Shairani was very much attached to Iqbal and did not have the heart to decline the invitation. Iqbal's hospitality was fantastic. But the temperaments of the two were in sharp contrast. Iqbal was very tender-hearted. Shairani Sahib's only hobby was hunting. Iqbal would remonstrate why do you kill innocent animals? Shairani Sahib retorted. "The big fish swallows the smaller one; the lion feeds on deer. This is the eternal law of nature. Who can change it?" The Pathan in him could not suppress the urge to use the rifle and, so, in spite of Iqbal's protest, he would take Iqbal's son along and go for hunting. The kill was brought home and cooked. Shairani would eat with gusto but Iqbal would not touch it.

On one of his visits it was early summer, we were all chatting in the drawing room of Moulvi Abdul Haq. Hashmi Sahib remarked addressing Prof. Shairani, "We understand Tonk is famous for its musk-melons". Without uttering a word, Prof. Shairani went to his room, wrote a letter home and asked me to drop it. A few days later, a middle-aged gentleman arrived in a *tonga* at the *kothi* with a sack full of musk-melons. If I recollect correctly, Shairani Sahib addressed him as Nanneh Mian, and saw to it that he was served tea and snacks and

then all the members of the staff of the Anjuman were called. Musk-melons were cut into pieces, and all of us regaled ourselves with that variety of this fruit which was not very different from the musk-melons of Kabul (popularly known as *Sarda*). As I rose to leave Shairani Sahib took me aside and gave me a full size melon for my children.

On the occasion Akhtar Shairani had to do some shopping and Shairani Sahib asked me to take him to Chandni Chowk which used to be and still is one of the main shopping centres of Delhi. On our return Akhtar Shairani presented me with a copy of *Subh-i-Bahar*, the first collection of his beautiful poems.

Once Shairani was in a mood to discuss the way he reviewed books and wrote on literary works. He went on, "My first consideration is truth. A writer must make every effort to ensure the validity of a statement he is going to make. I have no patience with those who write for the sake of writing and do not know what they are leaving for the posterity reflected in some of his criticism". Then he went ahead. "Once Agha Baqir Salmani, the grandson of Azad, requested me to write review on *Ab-i-Hayat*. After my first article had appeard, he came running to me and implored me not to write anything more". Now Agha Baqir Salmani had been his pupil in M.A. Persian, but where facts were concerned he showed no consideration to his personal relations.

His last visit to Delhi was in 1940 or 1941. He had ostensibly came without informing Moulvi Abdul Haq. Both Moulvi Sahib and Allama Kaifi were out of town. The kitchen was closed. Shairani Sahib arrived with Akhtar Shairani by an evening train. The

chowkidar opened a room for them. But there was nobody to cook food. In those days there was no decent hotel or restaurant in that area. So they had to take bread with milk for their dinner. Next day when I had returned from College, my wife told me that there was a message from the office of the Anjuman. I immediately rushed to their room and learnt to my utter dismay that they had subsisted on bread and milk ever since their arrival the previous night. I invited them to dinner at my house. Shairani Sahib at first refused saying milk and bread was a good change. Akhtar Shairani was obviously feeling sick. When I persisted in my request, Shairani Sahib gave in but firmly said, "Look here, Mathur, we shall come on the condition that it should be a single affair. You should not subject your wife to too much strain". I assured him that I would respect his wish. Very reluctantly my wife agreed to reduce the dishes to three: meat, one vegetable and curd with *chapatis*. I had instructed my wife not to allow my daughter and son to come out because I had a lurking suspicion that if the children came before him he would give them some cash gift.

in the evening I brought them to my house and served the frugal meal. While Akhtar Shairani relished the meat and vegetable, Shairani Sahib did not touch the meat and took a couple of *chapatis* with curd and vegetable. In the course of the meal he asked me, "Where are your children"? I assured him that they had fallen asleep. He frowned at me without uttering a word.

As we came out I asked Akhtar Shairani why Professor Sahib did not take meat. "Abba, probably thought, it was not *halal* meat". I told him that in that locality only *halal* meat was on sale. But I felt

very unhappy that I did not give that assurance to him earlier. They had decided to return to Tonk the next day by an evening train. So I took them to a restaurant in the afternoon and we had heavy snacks. On returning to Darya Ganj, he asked me, "Mathur, would you not see us off at the station?" "With great pleasure, Sir" was my reply. So we proceeded to the station. After they had been seated, Shairani Sahib came out of the carriage, took me aside and asked me if I could lend him some money. I placed my wallet before him and said. "As many rupees as you please, sir". He took only one ten Rupee note and resumed his seat. As the train moved he and Akhtar Shairani called out *khuda hafiz*.

As I returned home I felt a sense of guilt that I could not arrange for the scholar and the poet an elaborate dinner. I have always been overawed by his personality.

About a week later I received as insured cover from Prof. Shairani at my College address. The envelope contained three ten rupee notes and in the covering letter he wrote, "Here are three ten rupee note. Ten rupees I borrowed from you and I am returning. The remaining two notes are for your two children. Do not misappropriate them. He, who misappropriates, invites the wrath of God". With what ingenuity he had his own way.

That was his last visit to Delhi. A couple of months later I received a letter from Akhtar Shairani in which he wrote. "Abba had a severe attack of asthma. The medicine prescribed by the doctor is not locally available. Kindly send a phial of it immediately". I went straight to a chemist, purchased a phial and despatched it under registered parcel.

Twenty years later I happened to meet Qazi Abdul Wudud at the residence of Prof. Abidi. He also observed that Shairani was the first scholar of Persian who laid the foundation of sound literary criticism. He wrote without fear of favour. In the early seventies Prof. Fathullah Mujtabai came to India as the Cultural Counsellor attached to Iranian Embassy. He was invited in a function of the Persian Department. When I told him that I had the privilege of studying Persian at the feet of the Prof. Hafiz Mahmud Shairani, his reaction was immediate. He remarked. "A scholar of the calibre of Hafiz Mahmud Shairani has been born neither in Iran nor in Europe". As I look back at my contacts with this intellectual giant, I realize how unfortunate I have been that I could not imbibe even a drop of the sublimity of learning and character with which nature had so liberally endowed him. I can do no better than to conclude with a line from Hafiz.

دریغ قافلۂ عمر آن چنان رفتند   کہ گرد شان بہ غبار دیار ما نرسد

(In:*Oriental College Magazine* (Shairani Number), Lahore, vol.56,nos.3-4,1980 pp.1-10)

مآخذ

(برائے مزید مطالعہ)

کتب ومقالات:

1) مظہر محمود شیرانی (مرتب): مقالات شیرانی۔ سات جلد، لاہور 1966-1987ء، بالخصوص جلد دوم، 1966ء

2) ایضاً: حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی وادبی خدمات۔ دو جلد، لاہور 1995ء

3) ایضاً (مرتب): مکاتیب حافظ محمود شیرانی، لاہور 1981ء

4) محمد بشیر حسین: فہرست مخطوطات شیرانی۔ تین جلد، لاہور 1968ء

5) ایضاً: مخطوطات ذخیرہ شیرانی کا اجمالی جائزہ (اورینٹل کالج میگزین، جلد 56 /3-4، شمارہ مسلسل 222-223، ص 113-132)

6) ڈاکٹر عارف نوشاہی: مخطوطات ذخیرہ شیرانی کا مکرر اجمالی جائزہ (ایضاً، جلد 57 /3-4، شمارہ مسلسل 226-227، ص 89-94)

7) جمیل احمد رضوی: ذخیرہ شیرانی میں اردو مخطوطات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 1986ء

8) آصف زمانی: محققین و معتقدمین زبان و ادبیات فارسی ہند در قرن بیستم، دہلی 1993ء، ص 205-247

9) ظہور الدین احمد: نقد شعر فارسی در پاکستان و ہند، اسلام آباد: مرکز تحقیقات فارسی، 1995ء، ص 83-84

10) مجموعہ سخن رانی ہای نخستین سمینار پیوستگی ہای فرہنگی ایران و شبہ قارہ، جلد اول، تہران 1993ء، ص 343

11) حسن انوشہ (بہ سرپرستی): دانشنامہ ادب فارسی در شبہ قارہ (ہند' پاکستان' بنگلہ دش)' بخش دوم' تہران 1375ش' ص 1552-1554

12) آفتاب اصغر: "بیاد دو ایران شناس در پاکستان و ہند" (آیندہ' سال نہم' شمارہ 7' ص 568-573 و سال ہجدہم' شمارہ 7-12' ص 561-562)

13) ایضاً: "تاثراتی چند در بادۂ شیرانی و خدمت او بہ مسلمانان شبہ قارہ" (اورینٹل کالج میگزین' سال پنجاہ و ششم' شمارہ 3' 4 (1980ء)' ص 89-94)

14) آصفہ زمانی: "نگاہی کوتاہ بر تحقیق و تفحص پروفسور حافظ محمود شیرانی در بارہ فردوسی و شاہنامہ او" (دانش (اسلام آباد)' شمارہ 27-28' پاییز و زمستان 1370ش' ص 65-74)

15) ایضاً: "ویژہ حافظ محمود شیرانی" (ایضاً' شمارہ 53' تابستان 1377ش' ص 79-140)

16) حیدر شہریار نقوی: "معرفی مختصر زندگانی و آثار علمی پروفسور حافظ محمود شیرانی" (ادبیات اصفہان' شمارہ 13' 14 (1355-1356ش)' ص 102-104)

17) شاہد چودھری: "پروفسور محمود خاں شیرانی بزرگترین پژوہشگر شاہنامہ شناس" (چیستا' سال پنجم' شمارہ 8-9 (1367ش)' ص 726-737)

18) رسالہ "اردو" (کراچی)' شیرانی نمبر' جلد 56 شمارہ 4 (1980ء)

(آلات آتش بازی از محمود شیرانی' مع تعارفی نوٹ از مظہر محمود شیرانی' ص 5-51؛ ڈاکٹر نذیر احمد: فارسی زبان و ادب سے متعلق پروفیسر محمود شیرانی کی تحقیقات' ص 42-125؛ ڈاکٹر حکم چند نیّر: اردو میں تحقیق کا اولیں معلم' ص 126-134؛ عبیداللہ قدسی: پروفیسر محمود شیرانی کی تحقیقات کا پس منظر' ص 135-149)

19) ڈاکٹر نذیر احمد: حافظ محمود شیرانی' پٹنہ: بہار اردو اکادمی' 1982ء (شیرانی سیمینار منعقدہ 30' 31 اکتوبر 1980ء میں پڑھے گئے مقالات: شیرانی مرحوم اور اردو میں روایت تحقیق کی تشکیل جدید' ص 12-22؛ رشید حسن خاں: شیرانی کی تاریخی اہمیت' ص 23-33؛ رضوان احمد خاں: حافظ شیرانی اور "خالق باری" ص 233-252؛ مسرت حسین آزاد: حافظ شیرانی کی تحقیقات کی ایک جھلک' ص 253-266؛ عابد رضا بیدار: دو ہم آہنگ محقق' ص 275-306؛ محمود شیرانی کی یاد میں (صدی تقریبات کے موقع پر)' ص 307-311)۔ نیز حافظ محمود شیرانی مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد' دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ۔

20) خواجہ عبدالوحید (مرتب): جائزہ زبان اردو (پنجاب)' اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان' 2005ء' (یہ جائزہ 1934ء میں لیا گیا۔ اس میں چھٹا باب محمود شیرانی کا تحریر کردہ ہے' بعنوان

"پنجاب میں قدیم اردو ادب")

21) ڈاکٹر گوہر نوشاہی (مرتب): مثنوی رمز العشق مع چرخی نامہ، مصنفہ غلام قادر شاہ، لاہور 1972ء

22) ایضاً: لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات، مطبوعہ لاہور۔

23) ایضاً: لاہور میں اردو شاعری کی روایت، مطبوعہ لاہور۔

24) ایضاً: "رسالہ از آثار فقیر نوشہ ثانی" (صحیفہ (لاہور) بابت جولائی 1972ء)

25) "گنج الاسرار" نوشہ گنج بخش پر گوہر نوشاہی کا مقالہ در: صحیفہ (اپریل 1972ء)

26) ڈاکٹر ممتاز گوہر: پنجاب میں اردو ادب کا ارتقاء، لاہور 1997ء

27) غلام دستگیر نامی: تاریخ جلیلہ، لاہور

28) ایضاً: مقالہ در: اردو، بابت جولائی 1946ء

29) خورشید احمد خاں یوسفی: پنجاب کے قدیم اردو شعراء، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 1992ء (ان شعراء میں بعض کا کلام شیرانی مرحوم کی کتاب "پنجاب میں اردو" میں شامل نہیں، مثلاً غلام محی الدین میرپوری، ص 22-29؛ جنگ نامہ حسنین خاں، ص 30؛ داتا گنجاہی، ص 31؛ اشتیاق سرہندی، ص 32؛ بے نوا ساہی، ص 33؛ قطبی رنجکی، ص 34-36؛ شاکر انگی، ص 37-38؛ امام بخش تھانیسری، ص 39-57؛ منظوم ترجمہ پند نامہ سعدی، ص 58-61؛ رضا تھانیسری، ص 62؛ بسمل تھانیسری، ص 63-69؛ شاہ عبدالحکیم بمبی، ص 70-73، نور العین واقف بٹالوی، ص 74-76؛ حاجی لاہوری، ص 77-78؛ رضا لاہوری، ص 79؛ عاجز بٹالوی، ص 88-86؛ غلام غوث بٹالوی، ص 87-97؛ حیات قادری، ص 106؛ امام بخش امامی، ص 107؛ شیخ محمد حاجی، ص 108؛ کاشی بٹالوی، ص 109؛ رائے سنگھ عاقل، ص 110؛ بشیر احمد سرہندی، ص 111؛ اویسی سرہندی، ص 112؛ شائق سرہندی، ص 113؛ مشتاق سرہندی، ص 114؛ حسین چشتی، ص 115؛ خادم کیتھلی، ص 116؛ غلام حسین یاد، ص 117؛ خلیفہ محمد علی سکندر، ص 118-119؛ قناعت لاہوری، ص 120؛ جان محمد، ص 121؛ حافظ مرتضیٰ خویشگی قصوری، ص 122-130؛ سید غلام غوث، ص 131؛ فقیر غلام محی الدین نوشہ قادری، ص 132-142؛ حافظ احسن اللہ احسن لاہوری، ص 143-160؛ میر صادق علی صادق، ص 161-162؛ علیم قادری، ص 163؛ میر قمر الدین منت، ص 164؛ اشرف نوشاہی، ص 165-167؛ غوث ابن عظیم، ص 168-173؛ شاہ غلام جیلانی رنجکی، ص 174؛ تحسین، ص 175-185؛ محمد علی سید میرک، ص 186؛ مرزا پانی پتی، ص 187؛ میر فرزند علی موزوں، ص 188؛ میر باقر علی باقر، ص 189؛ میر بدر الدین بدر،

ص190؛ صادق علی شاہ صادق' ص191؛ سید محمد شاہ بٹالوی' ص192؛ حیدر لاہوری' ص193؛ احمد سرہندی' ص 194-197؛ میر ساجد علی فنائی' ص 198-200؛ خلیفہ عارف قصوری' ص201-205؛ شاہ محمد رمضان مہجی' ص206-208؛ آدینہ بیگ کامل' ص209-210؛ شاہ نیاز سرہندی' ص211؛ حکیم نتھو شاہ لاہوری' ص212؛ پیر قلندر شاہ' ص213-216؛ بھیل قصوری' ص217-219؛ بخش پانی پتی' ص220؛ اختر سرہندی' ص221-222؛ غلام حسین چشتی مہجی' ص223؛ غلام حسین خورم' ص224-225؛ صفدر سونی پتی' ص226؛ خادم پانی پتی' ص227؛ خیال پانی پتی' ص228؛ مولوی احمد یار مرالوی' ص229؛ حب فرید آبادی' ص 230-231؛ رتن چند خورم' ص232؛ عبدالرحمان المعروف عبدرحمان' ص235-238؛ سراج پانی پتی' ص239؛ رونق پانی پتی' ص240؛ فیض لاہوری' ص243-245؛ حافظ امام بخش راز تھانیسری' ص246؛ عبدالقادر توقیر' ص251؛ زیرک پانی پتی' ص252؛ حسرت پانی پتی' ص253؛ میر محمد مشاہد ثروت' ص254؛ مخمور فرید آبادی' ص257؛ جان نثار فرید آبادی' ص258؛ شوق فرید آبادی' ص259؛ عرب تھانیسری' ص260-261؛ محمد بیگ مخوی' ص262؛ تاب پانی پتی' ص263؛ جمیل تھانیسری' ص264؛ صفدر کرنالی' ص265؛ فضل مہجی' ص266؛ ضرورت پانی پتی' ص267؛ عشق پیچہ سیالکوٹی' ص268-272)

30) اخبار اردو (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان)' جلد 20 شمارہ 3'4 (بابت مارچ' اپریل 2004ء) بعنوان "اردو پنجاب میں" صفحات 424 (اس میں محمود شیرانی مرحوم کے چار مقالات بھی شامل ہیں)

31) ڈاکٹر جمیل جالبی: پنجاب اور اردو (در: تاریخ ادب اردو' جلد اول (قدیم دور)' طبع دوم' لاہور 1984ء' ص593-671)

32) محمد اشرف نوشاہی ہجری (م-1810ء): کلیات اشرف' مرتبہ و مقدمہ سید شرافت نوشاہی' بہ اہتمام ڈاکٹر عارف نوشاہی' کراچی' 2000ء (کلام اردو' ص35-152)

33) ڈاکٹر امرت لعل عشرت: پنجاب میں اردو زبان کا نقش اول' در: نذر مقبول' جون 1970ء' ص16-18 (پنڈت چندر بھان برہمن لاہوری (م-1073ھ) کی ایک اردو غزل' جس کے مقطع ہے ۔

برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیا میں
نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے)

34) ڈاکٹر محی الدین قادری زور: "اردو اور پنجابی" (در: نقوش' شمارہ 23'24 (بابت جولائی

1952ء مع ترمیم واضافہ بعنوان "اردو کی ابتداء" ، در: اردوئے معلیٰ (دہلی) شمارہ 4، 5، بابت 1961ء)
35) صوفی غلام مصطفیٰ تبسم: "پنجابی اوراردو" (در: پاکستان میں اردو، مرتبین محمد طاہر فاروقی وخاطر غزنوی، پشاور 1965ء)
36) برق نوشاہی: نوشاہی شعراء، اشاعتی مشن، بریڈ بورڈ (انگلستان) 1979ء
37) مولانا عبدالرحمٰن خلدی: فارسی نامہ (فرہنگ خوش رنگ) (در: اورینٹل کالج میگزین، نومبر 1967ء، صفحات 99)
38) سرعبدالقادر: "پنجاب میں اردو" (ہمایوں، 1922ء)
39) ڈاکٹر سید محمد اکرم: "محمود غزنوی اور محمود شیرانی" (در: مجلہ تحقیق (لاہور) 1999ء، ص 39-47)
40) قدیر انجم: "پنجاب میں اردو — ایک تجزیہ" (صحیفہ، بابت اپریل/ جون 2004ء، ص 28-42)
41) وقار عظیم: اردو کی ابتدا کے متعلق مختلف نظریے (عالمگیر (لاہور) اگست 1934ء، ص 17-19) (شیرانی کے نظریے سے اختلاف کیا ہے)
42) گیان چند: "اردو کے آغاز کے نظریے" (در: حقائق (مجموعہ مضامین) از ڈاکٹر گیان چند، الہ آباد 1978ء)
43) خورشید حرا صدیقی: اردو زبان کا آغاز — مختلف نظریے اور حقائق، دہلی 1993ء "پروفیسر محمود شیرانی کا نظریہ" (ص 93-116)
44) ڈاکٹر سید محمد عبداللہ: پروفیسر محمود شیرانی (نقوش، شمارہ 47-48)
45) ایضاً: کتاب خانہ شیرانی کے نوادر (اورینٹل کالج میگزین، فروری 1947ء، افکار (کراچی) اکتوبر 1980ء)
46) سجاد ملک بجوکہ: حافظ محمود شیرانی - مقالہ برائے ایم-اے - زیرنگرانی ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، یونیورسٹی اورینٹل کالج، 1964ء)

اشاریہ

i: اشخاص

(آ)

(الف)

ii: کتب، رسائل و اخبارات

(آ)

(الف)

(ن)

iii: اماکن

اُردو ادب — تاریخ و تنقید

اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (ستائیسواں ایڈیشن)	ڈاکٹر سلیم اختر
اُردو ادب کی تاریخ: ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک	ڈاکٹر تبسم کاشمیری
تاریخ ادب اُردو	رام بابو سکسینہ، اُردو ترجمہ: مرزا محمد عسکری
تاریخ ادب اُردو (جلد اول: ابتداء سے ۱۸۰۰ء تک) (جلد دوم: ۱۸۰۱ء سے ۱۹۰۰ء تک) (جلد سوم: ۱۹۰۱ء سے ۲۰۰۵ء تک)	محمد اکرام چغتائی
محمد حسین آزادؔ (نے دریافت شدہ مآخذ کی روشنی میں)	محمد اکرام چغتائی
گذشتہ لکھنؤ	عبدالحلیم شرر، ترتیب و تدوین مع اضافات: محمد اکرام چغتا
آبِ حیات	محمد حسین آزادؔ
اُردو کا حال	رضا علی عابدی
اُردو زبان کیا ہے؟	ڈاکٹر سلیم اختر
امیر خسرو کا ہندوی کلام	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
ہندستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
اُردو غزل اور ہندستانی ذہن و تہذیب	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
History of Urdu Literature(rept.)	Ram Babu Saksena

طلسم ہوشربا
ترجمۂ داستان: امیر حمزہ صاحبقران
(۸ جلد)

فسانۂ آزاد
پنڈت رتن ناتھ سرشار
(۴ جلد)

سیرِ کہسار
پنڈت رتن ناتھ سرشار

Rs. 1500.00

www.sang-e-meel.com

ISBN 969-35-1767-9
9 789693 517675